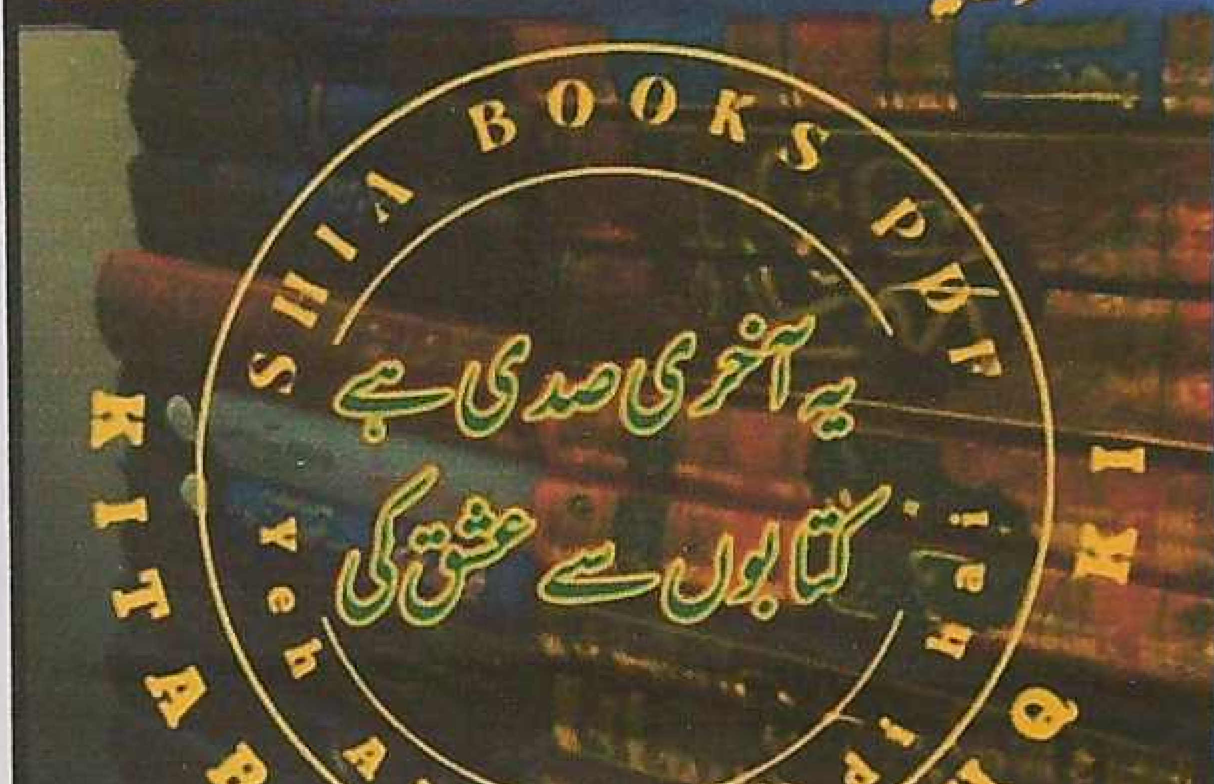
بِسۡمِ اَللّٰہِ اَلرَّحۡمٰنِ اَلرَّحِیۡم

Shia Books PDF منظر ایلیاء



MANZAR AELIYA
9391287881
HYDERABAD INDIA

ترجمہ

تفسیر مجمع البیان

جلد دوم

امین الاسلام ابی علی الفضل بن الحسن الطبرسی

ترجمہ و تلخیص

پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی

زیر نگرانی

مولانا سید تلمیذ حسنین رضوی طاب ثراہ

تنظیم المکاتب

ہندوستان

ترجمہ

تفسیر مجمع البیان

جلد دوم

سورۂ بقرہ آیت ۱۸۳ تا آخر اور سورۂ آل عمران

امین الاسلام

الفضل بن الحسن الطبرسی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۵۴۸ھ)

ترجمہ و تلخیص

پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی

(صدر شعبۂ شیعہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

زیر نگرانی

حجۃ الاسلام مولانا ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ

تنظیم المکاتب

ہندوستان

مفسر

امین الاسلام الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

ترجمہ
تفسیر مجمع البیان (جلد دوم)

منتظر ولیایی

ترجمہ وتلخیص: پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی صاحب

زیر نگرانی: حجۃ الاسلام مولانا ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ

ڈزائن سرورق: مولانا سید علی مہذب خرد نقوی (مبلغ جامعہ امامیہ تنظیم المکاتب، لکھنو)

سنہ اشاعت: دسمبر ۲۰۲۲ء

قیمت:- ₹ 850/-

ایرانین آرٹ پرنٹرس
دہلی

برائے ترحیم

جناب اختر حسین مرحوم ـــ مرحومہ کنیز فاطمہ

جناب مختار بخت مرحوم ـــ مرحومہ شاہ جہاں بیگم

حسب فرمائش

عالیجناب امداد امام صاحب

(البنی، نیویارک، امریکہ)

ناشر: تنظیم المکاتب، لکھنؤ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مطالب

سُوۡرَۃُ الۡبقرہ

منظر ایلیاء

❁❁❁❁❁

عرض تنظیم

پیغمبرؐ ہدایت نے بار بار یہ اعلان فرمایا تھا کہ صرف وہ گمراہ نہ ہوگا جو قرآن واہل بیتؑ دونوں سے وابستہ رہے گا۔ وابستگی کے لئے قرآن واہل بیتؑ کو پہچاننا اور ان کی بات کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کو پہچانے اور ان کو سمجھے بغیر وابستگی کی کوشش قربت کے بجائے دوریاں پیدا کر سکتی ہے اور ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے ہر طالب ہدایت کو ایک طرف قرآن کی عظمت کی معرفت حاصل کرنے کے ساتھ اس کی باتوں کو سمجھنا لازمی ہے اور دوسری طرف اہل بیتؑ کی معرفت اور ان کے فضائل سے انس کے ساتھ ان کے پیغام کو پہچاننا ضروری ہے۔

ہمارے علماء نے انہیں دونوں ضرورتوں کے پیش نظر قرآن مجید کی تفاسیر ہر دور میں اور ہر نہج سے لکھی ہیں اور اہل بیتؑ کی سیرت کو مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ارشادات کو کتب احادیث میں جمع کر کے ان کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔

ان تفاسیر اور شروح کے لکھنے والوں نے بالعموم اپنے علم اور ذوق علمی کے ساتھ ساتھ زمانۂ تحریر کے حالات اور ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا ہے اسی لئے قرآن کے ایک ہوتے ہوئے اس کی متعدد انداز کی تفاسیر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کہیں روایتی انداز اختیار کیا گیا ہے تو کہیں عقلی، کہیں عرفان کو بنیاد بنایا گیا ہے تو کہیں فلسفہ کو، کہیں قرآن مجید کے ادبی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے تو کہیں تربیتی پہلوؤں پر۔ غرض کہ ہر مفسر نے اپنے ذوق، اپنے دور کی علمی تحقیقات اور زمانہ میں رائج ہنروں اور حالاتِ زمانہ سے متاثر ہو کر قرآن سے جو سمجھا وہ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیگر کتب کی طرح تفسیروں میں درج تمام باتیں درست نہیں قرار دی جا سکتیں اس لئے کہ تفسیر کلام خدا نہیں محدود علم والے بندۂ خاطی کا کلام ہے۔ اس لئے نہ کسی تفسیر کو بہت معتبر اور نہ کسی کو بہت غیر معتبر قرار دینا چاہئے۔ یہ

قاری کا کام ہے کہ عقل اور قرآن کی کسوٹی پر ہر اس بات کو پرکھے جسے پڑھے یا سنے۔

زیر نظر تفسیر 'مجمع البیان لعلوم القرآن' چھٹی صدی ہجری کے عظیم عالم، مفسر، متکلم اور فقیہ امین الاسلام جناب ابو علی فضل بن حسن طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم علمی کاوش اور اسلامی علمی خزانہ کا گوہر نایاب ہے۔ بلا تفریق مذہب عالم اسلام کے اکثر مؤرخین اور تاریخ نگاروں نے مفسر عالی قدر کی عظمتوں کا اعتراف کیا ہے اور نیک الفاظ سے یاد کیا ہے۔ آپ کی اس تفسیر میں قرائت، اعراب، لغات، بیان مشکلات، معانی و بیان کے موارد کا ذکر ہے، آیات کے شان نزول اور اس میں وارد حدیثوں اور قصوں کی شرح و وضاحت شامل ہے جو ادبی تفسیر کا کامل نمونہ ہے۔ خاصہ اور عامہ کے اہل علم و نظر اس کے بے مثال ہونے کے قائل ہیں۔

امین الاسلام جناب ابو علی فضل بن حسن طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تفسیر عربی زبان میں لکھی، جس کا فارسی میں برسوں پہلے ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو بولنے والے مومنین اس قیمتی قرآنی ذخیرہ سے محروم تھے لہٰذا اس ضرورت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ اہم علمی ذخیرہ اردو کے قالب میں بھی ڈھال دیا جائے تاکہ اہل ایمان کا اردو زبان معاشرہ بھی اس سے مستفیض ہو سکے۔

اللہ رحمت فرمائے برادر بزرگوار مولانا سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ پر جو برصغیر کے عالم تشیع کے مایہ ناز علماء میں تھے۔ آپ ہمارے لئے چلتی پھرتی لائبریری اور حوالوں کا سافٹ ویئر تھے۔ علوم اسلامی میں صلاحیت کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اللہ کی کتاب کے بعد دیوان ابو طالبؑ جیسی مشکل ترین کتب عربیہ کا بہترین ترجمہ کر چکے ہیں۔ کلمات کی باریکیوں اور ترکیب کی نزاکتوں کے ساتھ ادب اردو پر ترجمہ میں ان کی دقیق نگاہ رہتی تھی جہاں بڑے بڑے چوک جاتے ہیں، انھوں نے اصل عبارت کی پوری بات کو منتقل کرنے میں ترجمہ کی عبارت کو کبھی غامض نہیں ہونے دیا۔

مولانا نے مجمع البیان کا ترجمہ کر کے نشر کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اپنی بے حد مشغولیت کی وجہ سے یہ ذمہ داری مولانا پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا صاحب قبلہ چیئرمین شعبۂ دینیات شیعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالہ کی۔ موصوف نے تفسیر مجمع البیان کے اہم حصوں: اَللُّغَة (الفاظ و معانی)، شان نزول اور اَلْمَعْنی (تفسیر) کا ترجمہ کیا۔ انہیں کے حکم سے ان کے ترجمہ کو جامعہ امامیہ کے اساتذہ مولانا فیروز علی بنارسی صاحب اور مولانا محمد عباس معروفی صاحب نے ایک بار پھر اصل کتاب سے ملایا تاکہ ممکنہ تسامحات کو دور کیا جا سکے اور آخر میں خود مولانا سید تلمیذ حسنین رضوی طاب ثراہ نے نظر ثانی فرما کر ترجمہ کو اعتبار عطا کر دیا۔

قابل ذکر ہے کہ بعد میں کتاب کے بقیہ نمایاں حصوں اَلْقِرَاءَۃ (قرائتوں کا اختلاف) اَلْحُجَّۃ (قرائتوں کے اختلاف کی دلیلیں) اور اَلْاِعْرَاب (کلمات اور جملوں کی نحوی تحلیل یعنی ترکیب) کا ترجمہ ان کی افادیت کے سبب مولانا مرحوم کے حکم پر فاضل عزیز مولانا فیروز علی بنارسی سلمہ نے کیا، جو جامعۂ امامیہ کے قابل فخر افاضل اساتید اور ادارے کے خدمت گذاروں میں ہیں۔ بغیر فکرِ نام ونمود و حصولِ زر خاموشی سے کام کرنا ان کا شیوہ ہے۔

مولانا مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں منظر عام پر آجائے لیکن افسوس کی اجل نے مہلت نہ دی اور دار فانی سے دار بقا کی جانب کوچ کر گئے۔ خداوند کریم ان پر رحمت نازل فرمائے اور قرآن و اہل بیت علیہم السلام کو ان کا شفیع قرار دے۔ آمین

انشاء اللہ یہ نایاب تفسیر علماء وافاضل اور مومنین سب کے کام آئے گی۔ مولانا سید تلمیذ حسنین اعلی اللہ مقامہ اور ان کے فرزند مولانا رضوان ارسلان صاحب حفظہ اللہ کی کرم فرمائی اور والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے علمی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا عزم مصمم ہے کہ ادارہ اسے شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ خادمان و معاونین ادارہ کو اپنی دعاؤں میں مرحومین کو اپنی ترحیم میں شامل رکھنے کی گذارش ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علماء، افاضل اور خدمت گذاران دین بالخصوص فقہاء و مراجع کو صحت کے ساتھ اتنی حیات دے کہ وہ اپنے زمانے کے ولی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ناصروں اور غلاموں میں شامل ہو سکیں۔

والسلام

سید صفی حیدر

سکریٹری تنظیم المکاتب لکھنؤ

۲۴/اکتوبر ۲۰۲۲ء

عرض مترجم

آج سے تقریباً پانچ برس قبل کی بات ہے جب جناب حجۃ الاسلام سید تلمیذ حسنین رضوی صاحب قبلہ (مقیم نیوجرسی امریکہ) نے شیخ طبرسی علیہ الرحمہ کی **تفسیر مجمع البیان** پر میری پی ایچ ڈی تھسس ملاحظہ کی تو مجھے حکم دیا کہ میں **مجمع البیان** کا اردو میں ترجمہ کر دوں۔ چونکہ مجھے اس تحقیقی مقالہ کے لئے مذکورہ تفسیر مکمل دس جلدوں کا مطالعہ کرنا پڑھا تھا لہٰذا میرے سامنے اس کی افادیت واہمیت تھی۔ اس وقت مجھے اور حیرت ہوئی کہ جب میں نے شیخ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے متعلق شیعہ علماء کے علاوہ بزرگ اساطین علماء کے اقوال دیکھے۔ اگرچہ ایسے اقوال کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ہم یہاں پر فقط دو اقوال پر اکتفا کر رہے ہیں:

ا۔ قاضی نور اللہ شوشتری (متوفی ۱۰۱۹ھ) مجالس المؤمنین میں فرماتے ہیں:

عمدۃ المفسرین امین الدین ثقۃ الاسلام ابوعلی الفضل بن الحسن بن الفضل الطبرسی نمایاں ترین مفسر قرآن ہیں۔ آپ کی تفسیر کبیر مجمع البیان اپنی جامعیت اور فضل وکمال میں بیان کافی اور دلیل وافی ہے۔ کتاب لمعہ دمشقیہ کی بحث رضاعت سے ظاہر وعیاں ہوتا ہے کہ آپ مجتہد بھی تھے۔ (کتاب ہدایۃ الاحباب، شیخ عباس قمیؒ، ص ۱۹۶)

۲۔ جامع الازہر کے سابق شیخ الجامع جلیل القدر استاد شیخ محمد شلتوت تفسیر مجمع البیان کی بابت اس طرح تحریر فرماتے ہیں: بلاشبہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ کتاب مجمع البیان کتب تفسیر کے درمیان منفرد و یکتا ہے اس لئے کہ یہ اپنی بحوث کی وسعت، اس کی گہرائی وگیرائی، اپنی ترتیب وتبویب اور تنسیق وتہذیب میں خصوصیت کی حامل ہے۔ یہ چیز کتب تفسیر کے لئے مشہور نہیں تھی، نہ ہی اس کے بعد مشہور ہوگی۔

شیخ مذکور جملہ تفاسیر پر تنقید کرنے کے بعد مزید تحریر کرتے ہیں:

یہ کتاب (مجمع البیان) ایسی پہلی کتاب ہے جو کتب تفسیر کی جامع اور آج تک کامل ترین ہے جس میں غزارت بحث اور درس کی عمیق بحوث جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز استقصا (تلاش وجستجو) میں زحمت شاقہ سے کام لیا گیا ہے۔ یہ منفرد نظم وترتیب جو کہ تقسیم وتنظیم وتفسیر کی خصوصی حفاظت ونگرانی پر مشتمل ہے اور غور طلب

امر یہ ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جس سے قرآن کریم کی خدمت مقصود ہے نہ کہ قرآن کے ذریعہ اہل لغت کی خدمت کرنا، نہ ہی قرآن کے ذریعہ فقہاء کی خدمت کرنا، نہ ہی سیبویہ (نحوی) کے ذریعہ قرآنی آیات کی تطبیق کرنا، نہ ہی عبدالقاہر کی بلاغت کی طرز پر، نہ ہی یونان و رومان کے فلسفہ کی طرز پر قرآنی (نظریات) پر حکم لگانا مقصود ہے۔ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کتاب مجمع البیان کے مؤلف نے کافی حد تک اپنے علمی وفکری اخلاص کو اپنے مذہبی جذبات پر غالب رکھا ہے اگرچہ انھوں نے شیعہ نقطۂ نظر کو اہمیت دی ہے۔ان اختلافی نظریات اور احکام جن میں وہ منفرد ہیں جس سے کبھی کبھی مذہبی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔پھر بھی ہم انھیں ان جذبات میں حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہی انھیں اپنے مخالف پر اپنے نظریہ کا تھوپنے والا دیکھتے ہیں۔اس کتاب کی شخصیت مختلف علوم میں بحث وتمحیص کرنے والی ہے۔آپ کی بیشتر تصانیف ہیں جن کی تعداد دس ہے۔جن میں سے بعض شیعہ مذہب کے موضوعات پر مشتمل ہیں اور بعض میں تفسیر قرآن کو خاص اہمیت دی گئی ہے جو آپ کی عظیم کوشش و ہمت کا شاہکار ہے۔ (مقدمہ مجمع البیان، ص ۲۰، نقل شدہ از مقدمہ جوامع الجامع)

چنانچہ سب سے پہلے مولانا موصوف نے **تفسیر مجمع البیان** کے مقدمہ کا ترجمہ کرنے کے لئے کہا جسے مکمل کرکے میں نے ان کے پاس امریکہ روانہ کردیا جسے انھوں نے پسند کیا اور فرمایا کہ میں اس کا مکمل ترجمہ کردوں۔ چنانچہ میں نے اللہ سے مدد اور معصومین علیہم السلام کی تائید کے بھروسہ پر ۱۹ر فروری ۲۰۱۹ء سے ترجمہ کا آغاز کیا اور ۱۷را پریل ۲۰۲۰ء تک انتہائی محنت وجانفشانی کے ساتھ سات جلدوں کا ترجمہ مکمل کر چکا ہوں جن میں سے دو جلدوں کا کتابت بھی علی گڑھ میں کی گئی ہے۔

جلد اول جو سردست زیور طبع سے آراستہ ہونے والی ہے اس کی تصحیح اور حسب ضرورت جملہ سازی میں قبلہ وکعبہ نے نہایت ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اور میری رہنمائی فرمائی ہے۔اس لئے کہ عربی زبان وادب میں لکھی گئی تفسیر کا ترجمہ نہایت دشوار تھا لیکن قبلہ وکعبہ کی ہمت افزائی سے یہ کام مکمل ہوگیا۔

اس تفسیر کی طباعت کی ذمہ داری حجۃ الاسلام جناب سید صفی حیدر صاحب قبلہ سنبھالی ہے۔لہٰذا خود مولانا اور ادارہ قابل مبارکباد ہے۔

خداوند متعال سے دعا گو ہوں کہ وہ ادارہ اور معاونین ادارہ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔آمین ثم آمین

پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی
صدر شعبۂ دینیات شیعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۸۳﴾
اے ایمان لانے والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، کہ شاید تم متقی بن جاؤ۔ (۱۸۳)

الفاظ و معانی:

لغت میں اَلصَّوْم روکنے کے معنی میں ہے، خاموشی کو بھی صَوْم کہتے ہیں چونکہ کلام سے رکنا ہے۔ ابن درید نے کہا ہے ہر وہ چیز جس کی حرکت ٹھہر جائے اسے صَامَ صَوْمًا کہتے ہیں۔ صَامَتِ الرِّيْحُ یعنی ہوا کارک گئی۔ صَامَتِ الشَّمْسُ یعنی آفتاب نصف النہار کی منزل میں ٹھہر گیا۔ اسی طرح صَامَ النَّهَارَ یعنی دن کی ایک مقدار کا روزہ رکھنا۔

اَلصَّوْم: شترمرغ کی بیٹ کو بھی کہتے ہیں۔ اس کے لغوی معنیٰ امساك کے ہیں اور شریعت میں مخصوص اشیاء سے مخصوص طریقے سے مخصوص صفات کے حاملین کا مخصوص زمانے میں خود کو روکنا ہے۔ یہ شرعی اصطلاح ہے، اس میں لغوی معنی بھی ہیں۔ اَلصِّيَام بمعنی اَلصَّوْم ہے، صُمْتُ صَوْمًا وَ صِيَامًا دونوں بولا جاتا ہے۔

ترکیب:

اَلصِّيَامُ مرفوع ہے نائب فاعل ہے۔ كَمَا كُتِبَ یعنی مِثْلَ مَا كُتِبَ (جیسا کہ لکھا گیا) كَمَا کا مَا، مَا مصدریه ہے اور کلام کی اصل اس طرح ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كِتَابَةً مِّثْلَ كِتَابَتِهٖ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (روزہ تمہارے اوپر اس طرح لکھ دیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر لکھا

گیا تھا جو تم سے پہلے تھا، پس یہاں پر مصدر کو حذف کر کے صفت کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ کاف (کَمَا) یہاں پر اَلصِّیَامُ کا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو اور اصل کلام اس طرح ہوگا: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ مَفۡرُوۡضاً یعنی تم پر روزہ لکھ دیا گیا اس حال میں کہ فرض کیا گیا ہے۔

تفسیر:

روزہ، تقویٰ کا سرچشمہ

خداوند عالم نے دوسرے فریضہ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (اے ایمان لانے والو!) یعنی اے تصدیق کرنے والو! امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (حرف) ندا میں جو لذّت ہے اس سے عبادت کی تکان اور زحمت زائل ہو جاتی ہے۔ حسن نے کہا ہے جب تم خداوند عالم کو یہ فرماتے ہوئے سنو: یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تو اسے غور سے سنو۔ یہ نداء ایک حکم کی خاطر ہے جو تمھیں دیا جا رہا ہے یا نہی کی خاطر ہے جس سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ یعنی تم پر شریعت کی مشہور عبادت فرض کی گئی۔ خطاب کو مومنین سے مخصوص قرار دینے کی وجہ ان کا اسے قبول کرنا ہے، چونکہ عبادت بجز اہل ایمان کے درست نہیں ہے۔ ان پر عبادت کا واجب ہونا غیر مومنین پر وجوب کی نفی نہیں کرتا۔

ارشاد الٰہی: کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ (جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے) اس میں متعدد اقوال ہیں:

اول: خداوند عالم نے ہم پر روزہ فرض ہونے کی گذشتہ امتوں پر روزہ فرض ہونے کی تشبیہ دی ہے یعنی تم پر دنوں کے روزے فرض کیے جس طرح ان لوگوں پر دنوں کے روزے فرض کیے گئے تھے۔ اس میں ہم پر فرض شدہ روزوں کے عدد کی تشبیہ نہیں ہے، نہ ہی ان پر فرض کیے گئے روزوں کے عدد کی تشبیہ ہے، نہ ہی اس کے وقت کی۔ اس قول کو ابو مسلم اور جبائی نے اختیار کیا ہے۔

دوم: یہ کہ ہم پر ماہ مبارک رمضان کے روزے فرض کیے گئے جیسا کہ نصاریٰ پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض تھے جو شدید گرمی اور شدید سردی میں آتے تھے جسے انھوں نے (موسم) ربیع میں تبدیل کر لیا اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا۔ یہ شعبی اور حسن کی روایت ہے۔ کہا گیا ہے ہم پر وقت عِشاء سے وقت

عِشاء تک روزہ فرض تھا، پھر اس میں اختلاف ہو گیا۔ بعض نے کہا نمازِ عشا کے وقت سے (دوسرے دن) نماز عِشاء کے وقت تک کھانا پینا حرام تھا۔ بعض نے کہا سونے کے وقت سے لے کر (اگلے روز) سونے کے وقت تک (کھانا پینا) حرام تھا۔ پھر یہ (حکم) منسوخ کر دیا گیا۔

عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ یہ حسن اور شعبی کے قول کے مطابق ہے اور دیگر مفسرین کے قول کے مطابق اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (کہ شاید تم متقی بن جاؤ) تا کہ روزہ کے ذریعہ گناہوں سے پرہیز کرو۔ جبائی کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے روزہ کے ذریعہ تم پر (اللہ) نے لطف کیا ہے، اس کے سبب تم متقی بن جاؤ، چونکہ یہ گناہوں سے محفوظ رہنے کے قوی ترین وسائل میں سے ہے، جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے آپؐ نے فرمایا: میری امت کے خصوصیات میں روزہ ہے۔ ہ

شام بن الحکم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روزہ کی علت کے بارے میں دریافت کیا، امامؑ نے ارشاد فرمایا: روزہ فرض کیا گیا تا کہ ثروت مند اور فقیر (محتاج) کو برابر قرار دیا جائے، اس لیے کہ ثروت مند کو بھوک کی اذیت کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ فقیر پر رحم کرے۔ اس طرح خداوند عالم نے چاہا کہ دولت مند کو بھوک کی زحمت و اذیت کو چکھا ہے تا کہ کمزور پر اس کا (قلب) نرم ہو اور وہ بھوکے پر رحم کرے۔

❀❀❀❀❀

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

روزے کے دن مقرر ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے اور جن کے لیے روزہ رکھنا دشوار ہو وہ بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور جو اپنی خوشی سے زیادہ بھلائی کرے تو یہ اُس کے حق میں بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ (۱۸۴)

قرأت:

ابوجعفر، نافع اور ابن عامر نے فِدْيَةُ طَعَامِ مِسْكِينٍ، فديۃ کو طعام کی جانب مضاف اور مَسَاكِين کو جمع قرأت کی ہے۔ بقیہ قراء نے فِدْيَةٌ کو تنوین کے ساتھ طَعَامُ کو پیش کے ساتھ اور مِسْكِينٍ کو واحد پڑھا ہے۔

حمزہ اور کسائی نے مَن يَطَّوَّعَ خَيْراً اور باقی نے مَنْ تَطَوَّعَ خَيْراً پڑھا ہے۔ اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔

شواذ میں يُطَوِّقُونَهُ ابن عباس سے منقول ہے، عائشہ، سعید بن مسیب، عکرمہ اور عطا کے برخلاف کہ ان حضرات نے يَطَّوَّقُونَهُ کو يُطَيِّقُونَهُ کے معنی میں پڑھا ہے۔ مجاہد، ابن عباس اور عکرمہ سے يَتَطَيَّقُونَهُ اور يُطَيِّقُونَهُ بھی مروی ہے۔

حجت:

جن قراء نے فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ پڑھا ہے تو انہوں نے طَعَامُ کو فِدْيَةٌ کا عطف بیان قرار دیا ہے۔ مِسْكِينٍ کو واحد لانا صحیح ہے اگرچہ وہ معنی کے لحاظ سے جمع ہے اس لئے کہ مراد ہر ایک پر مسکین کو کھلانا واجب ہے۔

ابوزید نے کہا: یہ بولا جاتا ہے کہ أَتَيْنَا الأَمِيرَ فَكَسَانَا حُلَّةً وَّأَعْطَانَا كُلَّنَا مِئَةً (ہم بادشاہ کے پاس گئے تو اس نے ہم کو پوشاک دی اور ہر ایک کو سو درہم (سو سو درہم) عطا کئے۔

جن قراء کرام نے فِدْيَةَ کو طَعَامِ کی جانب مضاف قرار دیا ہے تو یہ بعض کو بعض کی جانب اضافت دینا ہے اس لئے کہ وہ کھانا جو کفارہ میں دیا جاتا ہے اسے فِدْيَة کہتے ہیں۔ پھر اسی فِدْيَة کو طعام کی جانب مضاف کر دیا جس کے معنی فِدْيَة اور غیر فدیۃ سے عام ہیں اس بنا پر وہ خَاتَمُ حَدِيدٍ کے باب سے ہے۔

جن قراء نے يُطَوِّقُونَهُ پڑھا ہے تو وہ مصدر طاقة سے يُفَعِّلُون۔ (باب تفعیل) سے ہے اور یہ جملہ يُكَلِّفُونَهُ يُجَشِّمُونَهُ کے مانند ہے یعنی اسے اپنی گردن میں طوق کے مانند قرار دیتے ہیں۔

اور يَطَّوَّقُونَهُ يَتَكَلَّفُونَهُ ويَتَجَشَّمُونَهُ کے مانند ہے۔

اور جن قراء نے یَطَّیَّقُوْنَهٗ پڑھا ہے تو وہ دراصل یَتَطَیَّقُوْنَهٗ یَتَفَعَّلُوْنَهٗ کے وزن پر ہے، فرق یہ ہے کہ دو عین الفعل کو یاء سے بدل دیا گیا ہے جیسا کہ عرب نے تصور الجرف میں تہیر کہا ہے۔ یُطَیِّقُوْنَهٗ یہ بھی باب تفعیل سے ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلسَّفَر: کشف ہونا، ظاہر ہونا۔

عَدَّ سے عِدَّۃ، فُعْلَۃ کے وزن پر ہے جیسے طُحْن. مَطْحُوْن کے معنی میں اور حَمْل مَحْمُوْل کے معنیٰ میں ہوتا ہے اسی طرح عِدَّۃٌ مَعْدُوْد کے معنی میں ہے۔ (شمار کیا ہوا)

اَلطَّوْق: طاقت و قوت۔

ترکیب:

اَیَّاماً زجاج نے کہا: اَیَّاماً کے منصوب ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ظرف (مفعول فیہ) ہو۔ گویا اس طرح ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ فِیْ اَیَّامٍ اور اس کا عامل اَلصِّیَامُ ہے گویا مراد یہ ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمْ اَنْ تَصُوْمُوْا اَیَّامًا۔

(۲) بعض علماء نحو نے کہا ہے کہ وہ فعل مجہول کا مفعول ہے جیسے آپ کا یہ کہنا کہ: اُعْطِیَ زَیْدٌ الْمَالَ زجاج نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں پر اَیَّامًا صوم سے متعلق ہے اور زَیْد اور اَلْمَال یہ دونوں اُعْطِیَ کا مفعول بہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان دونوں میں سے جس کو چاہیں نائب فاعل قرار دے سکتے ہیں جبکہ یہاں پر اَیَّامًا صرف صیام کی وجہ سے منصوب ہے۔

ابوعلی نے کہا: اَیَّامًا کے منصوب ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ظرف (مفعول فیہ) کی بنا پر منصوب ہے۔

(۲) جس طرح مفعول بہ وسعت کی بنا پر منصوب ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی منصوب ہے۔ جب ظرف کی بنا پر منصوب ہوگا تو اس میں عامل کُتِبَ بھی ہوسکتا ہے گویا اس طرح ہوگا: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ فِیْ اَیَّامٍ۔ اور اگر چاہیں تو اسے وسعت دے کر مفعول بہ کی نصب کی طرف نصب دے سکتے ہیں۔ اس قول کی بنا پر

اس طرح کہیں گے: یَامَکْتُوْبَ اَیَّامٍ عَلَیْہِ یایَا کَاتِبَ اَیَّامِ الصِّیَامِ کہیں گے اور اسم فاعل یا اسم مفعول کو اَیَّام کی جانب مضاف کرنا جائز ہے اس لئے کہ ایسی صورت میں آپ اسے ظرف ہونے سے باہر نکال رہے ہیں اور اسے اسم فرض کر رہے ہیں۔

اگر اس طرح ترکیب کی جائے گی جسے ہم نے بیان کیا ہے تو ابو اسحاق نے جو منع کیا تھا کہ اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ اَیَّامًا کو اُعْطِیَ زَیْدٌ الْمَالَ کے مانند قرار دیا جائے تو یہ صحیح ہو جائے گا۔ ابو اسحاق نے کہا ہے کہ ایامًا کو الصِّیَام کے ذریعہ نصب دینا صحیح نہیں ہے کہ مراد یہ ہو کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ فِیْ اَیَّامٍ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ معنیٰ کے لحاظ سے یہ ترکیب صحیح ہے لیکن لفظی اعتبار صحیح نہیں ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جب آپ اس کی ترکیب کریں گے تو آپ صلہ اور موصول کے درمیان ایک ایسی چیز کے ذریعہ فاصلہ ڈالیں گے جو ان دونوں سے بے ربط و اجنبی ہے اور وہ یہ ہے کہ اَیَّامًا، صِیَام کا صلہ ہو جائے گا اور آپ ان دونوں کے درمیان کَمَا یعنی کُتِبَ کے مصدر کے ذریعہ فاصلہ ڈالیں گے اس لئے کہ اس کی اصل اس طرح ہوگی: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کِتَابَۃً مِثْلَ کِتَابَۃٍ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ ایسی صورت میں کَمَا کا کاف کُتِبَ سے متعلق ہوگا اور آپ اس کے ذریعہ مصدر اور اس کے صلہ کے درمیان فاصلہ ڈال دیں گے جو کہ نہ مصدر میں سے ہے اور نہ ہی صلہ میں سے۔

میں (امین الاسلام طبرسی) یہ کہتا ہوں: اَیَّامًا، اَلصِّیَامُ کے ذریعہ منصوب ہو سکتا ہے جب آپ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ میں کاف کو بر بنائے حال محلاً منصوب مان لیں یعنی اس طرح کہئے :مَفْرُوْضاً مِثْلَ مَا فُرِضَ عَلَیْہِمْ ۔پس اس صورت میں مَا موصول اور کُتِبَ اس کا صلہ ہوگا اور کُتِبَ کی ضمیر مَا کی جانب پلٹے گی۔ موصول و صلہ محلاً مجرور ہوں گے کاف کے مضاف ہونے کی بنا پر اور کاف محلاً منصوب ہوگا، اس لئے کہ وہ اس محذوف کی صفت ہوگا جو صِیَام کی حال ہے اسی طرح موصول اور صلہ کے درمیان ایک ربط اور اجنبی شے کے ذریعہ فاصلہ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ابو علی نے ذکر کیا ہے۔

فَعِدَّۃٌ مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ۔ گویا اس طرح ہے: فَعَلَیْہِ عِدَّۃٌ۔ پس لفظ عِدَّۃٌ مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر۔ سیبویہ کے قول کے مطابق اور اخفش کے قول کی بنا پر ظرف کی بنا پر مرفوع ہے جیسا کہ ان کا بیان گزر چکا ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہو سکتی ہے: فَالَّذِیْ یَنُوْبُ عَنْ صَوْمِہٖ فِیْ وَقْتِ الصَّوْمِ عِدَّۃٌ مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ایسی صورت میں عِدَّۃٌ مبتدا کی خبر ہے۔

اور اُخَر غیر منصرف ہے اس لئے یہ وصف معدول از الف لام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مثل دیگر الفاظ جیسے صُغَر و کُبَر الف لام کے بغیر استعمال ہی نہیں ہوتے ہیں لہٰذا نِسْوَةٌ صُغَرُ کہنا صحیح نہیں ہے۔

تفسیر:

مریض اور مسافر پر روزہ نہیں

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (روزے کے دن مقرر ہیں) یعنی معلومات، محصور اور معین و منضبط، جس طرح کہا جاتا ہے اَعْطَیْتُ مَالًا مَّعْدُوْدًا یعنی میں نے محصور اور معین مال عطا کیا۔ ممکن ہے اس کے ارشاد: مَّعْدُوْدٰتٍ سے قلیل اور مختصر مراد ہو۔ جس طرح ارشاد الٰہی: دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ سے مختصر اور قلیل درہم مراد ہیں۔

اَیَّامًا کے سلسلہ میں دو قول ہیں:

اول: یہ ایام ماہ رمضان المبارک کے علاوہ ہیں جو ہر ماہ کے تین روز تھے پھر یہ (حکم) منسوخ ہو گیا۔ یہ قول معاذ اور عطا اور ابن عباس کا ہے، اور روایت کی گئی ہے ہر ماہ کے تین دن اور عاشورہ کا روزہ ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ یہ روزہ مستحبی تھا۔ کہا گیا ہے کہ بلکہ واجب تھا، تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے، یہ (روزے) رمضان المبارک کے روزوں کی وجہ سے منسوخ ہو گئے۔

دوم: اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ماہ رمضان ہے۔ یہ ابن عباس اور حسن سے روایت ہے جسے جبائی اور ابو مسلم نے اختیار کیا ہے۔ اسی رائے کو بیشتر مفسرین نے مانا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم نے سب سے پہلے روزہ اجمالی طور پر واجب کیا تھا، وضاحت نہیں فرمائی تھی، ایک دن کا ہے یا دو دن یا اس سے زیادہ، پھر بیان فرمایا وہ معلوم دن ہیں اور اسے مبہم رکھا، پھر اس ارشاد کے ذریعہ وضاحت فرمائی: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ...... (بقرہ: ۱۸۵)

قاضی نے بیان کیا ہے یہ قول بہتر اور اولیٰ ہے، اس لئے کہ جب اثبات نسخ کے بغیر کسی معنی پر حمل کرنا ممکن ہو تو وہی بہتر ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان علماء نے جو کہا ہے کہ وہ ایک اضافی بات ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے) عَلٰی سَفَرٍ جو کہ ظرف ہے کو مَرِیْضًا پر

عطف کیا ہے جو کہ اسم ہے جبکہ ظرف کو اسم پر عطف نہیں کا جاتا ہے تو اس عطف کی وجہ یہ ہے کہ اگر چہ وہ ظرف ہے پھر بھی وہ اسم کے معنیٰ میں ہے: فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَرِيۡضًا اَوۡ مُسَافِرًا پس جو صوم (روزہ) قائم مقام بنے گا وہ دوسرے دنوں میں سے اتنے ہی دن ہیں اس میں دلالت ہے کہ مسافر اور مریض دونوں پر افطار یعنی روزہ نہ رکھنا واجب ہے، اس لیے کہ خداوند عالم نے سفر اور مرض کو قضا کا سبب قرار دیا ہے اور جس نے آیت میں فَاَفۡطَرَ کو مقدر مانا ہے اس نے ظاہر کے خلاف عمل کیا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت نے سفر میں افطار کو واجب قرار دیا ہے جیسے عمر بن الخطاب و عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن عوف، ابو ہریرہ، عروہ بن زبیر۔ یہی چیز ہمارے ائمہ علیہم السلام سے بھی مروی ہے۔

روایت کی گئی ہے کہ عمر بن الخطاب نے ایک شخص جس نے سفر میں روزہ رکھا تھا اسے دوبارہ روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

یوسف بن الحکم نے روایت کی ہے کہ انھوں نے حضرت عمر سے سفر میں روزہ کے متعلق دریافت کیا، عمر نے کہا تم نے نہیں دیکھا اگر تم کسی شخص کو صدقہ دیتے ہو اور وہ اس صدقہ کو تمھیں واپس کرے کیا تم اس پر غضبناک نہیں ہوگے؟ یہ تم پر اللہ کی طرف سے صدقہ ہے جو اس نے تمھیں بخشا ہے۔

عبدالرحمٰن بن عوف نے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلصَّآئِمُ فِي السَّفَرِ كَالۡمُفۡطِرِ فِي الۡحَضَرِ سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں مفطر (روزہ نہ رکھنے والے) کے مانند ہے۔

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: سفر میں افطار (روزہ نہ رکھنا) واجب ہے۔

ہمارے علماء نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے، آپؑ نے فرمایا: ماہ مبارک رمضان میں حالت سفر میں روزہ رکھنے والا حالت حضر میں مروزہ نہ رکھنے والے کے مانند ہے۔ نیز آپؑ نے فرمایا: اگر کوئی شخص سفر کے دوران حالت روزہ میں مر جائے میں اس پر نماز (میت) نہیں پڑھوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے جو شخص سفر کرے وہ روزہ نہ رکھے اور (نماز) قصر پڑھے، سوائے اس کے کہ اس کا سفر شکار کے لیے یا معصیت خدا میں ہو۔

عیاشی نے اپنی سند سے سند مرفوع کے ساتھ محمد بن مسلم کے واسطہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت سفر میں مستحبی اور واجبی روزہ نہیں رکھتے

تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی جب ابر تھا اور آپؐ دوپہر کے وقت سخت گرمی میں مصروف نماز تھے پیغمبرؐ نے ایک برتن منگوایا جس میں پانی تھا جسے آپؐ نے پیا اور لوگوں کو روزہ توڑنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے کہا: دن نکل چکا ہے کاش کہ آج کے دن کا روزہ مکمل کر لیتے! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں گنہگار اور نافرمان کہا چنانچہ ان لوگوں کو اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا یہاں تک کہ حضورؐ کا وصال ہوا۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (اور جن کے لیے روزہ رکھنا دشوار ہو) ہٗ کی ضمیر روزہ کی طرف پلٹ رہی ہے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک یعنی روزہ شدت و زحمت کا باعث ہو زحمت و شدت میں مبتلا تمام افراد کو خداوند عالم نے اختیار دیا کہ وہ روزہ رکھیں اور کفارہ نہ دیں یا افطار کریں اور ہر دن کے عوض مسکین کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کریں، اس لیے کہ پھر سے روزہ نہیں رکھیں گے پھر یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہوگئی: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کہا گیا ہے ہٗ کی ضمیر الفِدَآء (فدیۃ) کی طرف پلٹ رہی ہے۔ یہ حسن اور ابومسلم کا قول ہے۔

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کے معنی میں تین اقوال ہیں:

اول: وہ تمام لوگ مراد ہیں جن کا ذکر ہم نے تخییر اور کے نسخ کے ذیل میں کیا۔ یہ ابن عباس اور شعبی کا قول ہے۔

دوم: یہ رخصت (چھوٹ) حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی خواتین اور ایسے بوڑھے شخص کے لیے ہے جو موت سے نزدیک ہو۔ پھر آیت سے حاملہ عورتیں اور دودھ پلانے والی خواتین منسوخ ہوگئیں اور بوڑھے شخص کے لئے حکم باقی رہ گیا۔ یہ حسن اور عطا کا قول ہے۔

سوم: مراد وہ افراد ہیں جن پر روزہ رکھنا مشقت اور دشواری کا باعث تھا پھر وہ اس طرح ہو گئے کہ دشواری اور شدت جاتی رہی ان سے منسوخ نہیں ہوا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ ہمارے بعض علماء نے اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جن لوگوں پر روزہ دشوار اور مشقت کا باعث تھا پھر وہ بڑھاپے اور (مرض) عطش وغیرہ میں مبتلا ہو جائیں تو ان پر ہر روزہ کے عوض ایک مُد (یعنی پون کلو) خوراک دینا واجب ہے۔ علی بن ابراہیم نے اپنی سند سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ کی تفسیر میں فرمایا: جو شخص ماہ رمضان میں بیمار ہو اور روزہ توڑ دے پھر صحت مند ہو جائے اور چھوٹے روزے کی قضا نہ کرے یہاں کہ دوسرا ماہ رمضان آجائے تو اس پر واجب ہے کہ روزے کی قضا کرے اور ہر دن کے عوض ایک مد طعام دے۔

ارشادالٰہی: فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِينٍ (وہ بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں) اس فدیہ کی مقدار کے سلسلہ میں اختلاف ہے:

اہل عراق نے کہا: ہر دن کے عوض نصف صاع۔

شافعی نے کہا ہے: ہر دن کے عوض ایک مد۔

ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اگر وہ قادر ہے تو ہر دن کے عوض دو مد اور قادر نہیں ہے تو ایک ہی مد کافی ہے۔

فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ (اور جو اپنی خوشی سے زیادہ بھلائی کرے تو یہ اُس کے حق میں بہتر ہے۔) کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ جو ایک مسکین سے زیادہ کو کھانا کھلائے، یہ عطا و طاؤس کا قول ہے اور کہا گیا ہے کہ ایک مسکین کو قدر کفایت سے زائد کھانا کھلائے یہاں تک کہ نصف صاع سے زیادہ ہو جائے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابن عباس کا قول (جو کھانا کھلانے میں اپنی جانب سے نیکی کرے) دونوں قول کا جامع ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو (شخص) پورے دین میں نیکی کرے وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ جو فدیہ کے ساتھ روزہ بھی رکھے۔ یہ زہری کا قول ہے۔

وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ (لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے) یعنی تمھارا روزہ رکھنا تمھارے لیے افطار اور فدیہ سے زیادہ بہتر ہے۔ یہ فدیہ کے جواز کے ساتھ تھا لیکن نسخ کے بعد جائز نہیں کہ اس طرح کہا جائے کہ روزہ فدیہ سے بہتر ہے جبکہ افطار کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں جس کے لیے روزہ مشقت کا باعث ہو اس کے لیے روزہ بہتر ہے اور کفارہ دینے کی بہ نسبت وہ ثواب میں افضل ہے، اس کے لیے جو مجبوری میں افطار کرے۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ یقیناً روزہ تمھارے لیے فدیہ سے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے سب سے برتر عمل کو جانتے ہو تب۔

ارشادالٰہی: وَعَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ میں فعل سے پہلے قدرت و توانائی کے ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

❀❀❀❀❀

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

ماہِ رَمَضَانَ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے، ہدایت کو واضح کرنے والا اور حق و باطل کے فرق کو بتانے والا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس مہینہ کو پالے، اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے، اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرلے۔ اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، دشواری پیدا کرنا مطلوب نہیں۔ اس لیے تمھیں بتایا جارہا ہے کہ روزوں کی تعداد پوری کرلو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار کرو اور شکر گزار بنو۔ (۱۸۵)

قراءت:

ابوبکر سے روایت میں وَ لِتُكَمِّلُوا تشدید کے ساتھ اور بقیہ قراء نے لِتُكْمِلُوا بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے العُسُر اور الیُسُر دونوں میں سین کو ضمہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے سین کو ساکن (العُسْر اور الیُسْر) پڑھا ہے۔

حجت:

جن حضرات نے لِتُكْمِلُوا (بغیر تشدید) کے پڑھا ہے ان کی دلیل آیۂ کریمہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ہے۔

اور جس نے لِتُكَمِّلُوا پڑھا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ فِعَّالَ (باب تفعیل) اور اَفعَل باب افعال)

کو زیادہ تر ایک دوسرے جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

نابغہ نے کہا:

فَكَمَّلَتْ مِئَةً مِنْهَا حَمَامَتُهَا　وَأَسْرَعَتْ حِسْبَةً فِي ذٰلِكَ الْعَدَدِ

الفاظ ومعانی:

اَلشَّھر: مہینہ۔ اس کی جمع اَشْھُر ہے اور جمع کثرت شُھُوْر ہے۔ اس کے اصلی معنی ہلال کے ذریعہ اس کا ظاہر و مشہور ہونا ہے۔

رَمَضَان کی اصل رَمَض ہے یعنی ریت وغیرہ پر شدید دھوپ کا پڑنا۔ اس ماہ کو رمضان اس لیے کہا گیا ہے کہ لوگوں نے مہینوں کے نام ان زمانوں کے اعتبار سے رکھ دیئے جس زمانے میں وہ مہینے واقع ہوتے تھے، چنانچہ رمضان شدید گرمی کے دنوں میں پڑا (اس وجہ سے اس کا نام رمضان رکھ دیا) رَمَضَان کی جمع رَمَضَانَات ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رمضان اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ مجاہد سے روایت کی گئی ہے: (فقط) رمضان نہ کہو بلکہ ماہ رمضان (شھر رمضان) کہو! تم نہیں جانتے رمضان کیا ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی روایات میں وارد ہوا ہے آنحضرتؐ نے فرمایا: جو شخص ایمان اور رضائے الٰہی کے ساتھ روزہ رکھے گا اللہ اس کے گذشتہ گناہوں کو بخش دے گا۔ کہا گیا ہے کہ رمضان اس لیے نام رکھا گیا ہے چونکہ یہ گناہوں کو جلا ڈالتا ہے۔

اَلْقُرآن کے لغوی معنی جمع کے ہیں اور اسی سے قِرَائَۃ اور قَارِی بھی بنا ہے اس لئے کہ وہ حروف کو جمع اور اکٹھا کرتا ہے۔

فُرْقَان یعنی حق و باطل کے درمیان تفریق و جدائی ڈالنے والا۔

اِرَادَۃ: طلب کرنا۔

یُسْر، العُسْر کی ضد ہے۔ یَسَار کے معنی دولت اور وسعت کے ہیں۔ یَسَار کے معنی داہنے ہاتھ کے (بھی) ہیں۔ یَسَر وہ جماعت اور گروہ جوئے میں اونٹنی اور بکری پر اجتماع کرتے تھے۔ یَسَر کی جمع اَیْسَار ہے لغوی معنی سہولت کے ہیں۔ عُسْر کے معنی شدت اور سختی کے ہیں۔

ترکیب:

شَهْرُ رَمَضَانَ (میں شهرُ) کے مرفوع ہونے کی تین وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱) مبتدأ محذوف کی خبر ہے اور اس مبتدا محذوف پر ارشاد الٰہی: اَيَّامًا ولالت کرتا ہے یعنی هِيَ شَهْرُ رَمَضَانَ۔

(۲) شَهْرُ الصِّيَامِ کا بدل ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ شَهْرُ رَمَضَانَ.

(۳) مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اس کی خبر اَلَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ ہے اور اگر آپ چاہیں تو اَلَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ کو شَهْرُ رَمَضَانَ کی صفت قرار دے کر خبر کو پوشیدہ مان سکتے ہیں گویا اس طرح فرمایا ہے: وَفِيْمَا كُتِبَ عَلَيْكُمْ شَهْرُ رَمَضَانَ یعنی صِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ.

لفظ رَمَضَان غیر منصرف ہے اس لئے کہ معرفہ ہے اور الف ونون زائدہ ہیں جو دو الف تانیث کے مشابہ ہیں۔ عربی زبان میں شَهْرَ رَمَضَان (بالنصب) دو وجہوں سے جائز ہے:

(۱) صُوْمُوْا شَهْرَ رَمَضَان (شَهْرَ ظرف یعنی مفعول فیہ ہے)

(۲) اَيَّامًا کا بدل

هُدًى بربنائے حال منصوب ہے یعنی هَادِيًا لِلنَّاسِ (اس حالت میں کہ لوگوں کے لئے راہنما ہے)

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اَلشَّهْرَ منصوب ہے اس لئے کہ ظرف ہے، مفعول بہ نہیں ہے اس لئے کہ اگر مفعول بہ ہوتا تو مسافر پر بھی روزہ اسی طرح واجب ہوتا جس طرح مقیم رکھتا ہے تو اس پر روزہ واجب نہیں ہوتا تو اس کا معنی یہ ہیں کہ تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں وطن میں رہے اس طرح وہ مفعول بہ نہیں ہوگا لیکن اگر آپ یہ کہیں کے: اَحْيَيْتُ شَهْرَ رَمَضَانَ (میں نے ماہ رمضان کو احیاء کیا) تب وہ مفعول بہ ہوگا۔

اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ اگر اَلشَّهْرَ مفعول بہ نہیں ہے تو پھر فَلْيَصُمْهُ میں اس کی ضمیر متصل کیوں کر آتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ظرف استعمال ہونے کے بعد یہ مجازاً منصوب بنزع خافض واقع ہوا ہے۔

جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ میں ظرف (عَلٰى سَفَرٍ) کو اسم (مَرِيْضاً) پر عطف کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ظرف اسم کے معنیٰ میں ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: اَوْ مُسَافِراً جیسا کہ اس آیہ کریمہ: دَعَانَا لِجَنْبِهٖ اَوْ قَاعِداً اَوْ قَائِمًا میں دَعَانَا لِجَنْبِهٖ، دَعَانَا مُضْطَجِعاً کے معنیٰ میں ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا میں لام کے ساتھ عطف کرنے کے سلسلہ میں دو وجہیں ہیں:

(۱) جملہ کو جملہ پر عطف کیا گیا ہے اس لئے کہ اس کے بعد ایک چیز محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ شُرِّعَ ذٰلِكَ یا اُرِيْدَ ذٰلِكَ۔ اسی کے مانند یہ آیت ہے: وَ كَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (سورۂ انعام، آیت ۸۵) یعنی وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ اَرَيْنَاهُ ذٰلِكَ اور تا کہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائیں کہ ہم نے انہیں آسمانوں اور زمینوں کے ملکوت کو دکھایا ہے۔

(۲) محذوف کی تاویل پر عطف ہے کہ جس محذوف پر گذشتہ جملہ دلالت کرتا ہے اس لئے کہ جب یہ فرمایا کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ (اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے ایسا تمہاری آسانی کے لئے کیا ہے۔ لہٰذا وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ کا اس پر عطف ہونا صحیح ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

بَادَتْ وَ غَيَّرَ آيَهُنَّ مَعَ الْبِلٰى　　اِلَّا رَوَاكِدَ جَمْرُهُنَّ هَبَاءُ
وَ مُشَجَّجٌ اِمَّا سَوَاءُ قَذَالِهِ　　فَبَدَا وَ غَيَّبَ سَارَهُ الْمَعْزَاءُ

سَارَهُ یعنی سائرہ۔ اسے تاویل کلام پر عطف کیا ہے گویا اس طرح کہا ہے: بِهَا رَوَاكِدُ وَمُشَجَّجٌ۔ یہ زجاج کا نظریہ اور پہلا فراء کا نظریہ ہے۔

تفسیر:

ماہ رمضان، ماہ نزول قرآن

پھر خداوند عالم نے روزہ کا وقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: شَهْرُ رَمَضَانَ یعنی یہ ایام معدودۃ ماہ رمضان ہیں یا تم پر ماہ رمضان فرض کیا گیا ہے یا ماہ رمضان وہ مہینہ ہے: الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

پس اس آیت نے واضح کر دیا کہ ماہ رمضان میں روزہ واجب کیا گیا ہے اس لئے کہ ماہ رمضان مذکورہ فضائل کا حامل ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآن نازل کیا ہے کہ جس پر دین وایمان کا دارومدار ہے۔

ارشاد الٰہی: الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ میں اختلاف کیا گیا ہے:

کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے شب قدر میں آسمان دنیا پر مکمل قرآن نازل فرمایا پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم پر بیس برس کی مدت میں قرآن کو جستہ جستہ نازل کیا۔ یہ روایت ہے ابن عباس وسعید بن جبیر اور حسن و قتادہ کی اور یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے قرآن کے نزول کا آغاز ماہ رمضان کی شب قدر میں فرمایا۔ یہ ابن اسحاق کا قول ہے

کہا گیا ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں آسمان دنیا پر نازل ہوتا تھا، جتنا اس سال ضروری ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مہینوں اور دنوں میں نازل ہوتا رہا۔ یہ سُدی کا قول جس کی نسبت انھوں نے ابن عباس کی طرف دی ہے۔

ثعلبی نے اپنی سند سے ابوذر غفاری کے واسطہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رمضان کی تین تاریخ کو صُحف ابراہیمؑ نازل ہوئے۔ واحدی کی روایت میں ہے کہ رمضان کی پہلی شب میں نازل ہوئے اور موسیٰ کی توارات چھ ماہِ رمضان کو نازل ہوئی اور حضرت عیسیٰ کی انجیل ۱۳ ماہ مبارک رمضان میں نازل ہوئی اور داؤدؑ کی زبور اٹھارہویں رمضان المبارک کی شب میں نازل ہوئی اور محمدؐ پر فرقان چوبیسویں ماہ رمضان کو نازل ہوا۔

بعینہ اسی روایت کو عیاشی نے امام جعفر صادق علیہ السلام اور آپ کے آباء واجداد کے واسطہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ارشاد الٰہی: اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ سے مراد یہ ہے کہ مخلوق پر اس کے فرض اور روزہ کا واجب ہونا قرآن میں نازل کیا گیا: فِيْهِ. فِيْ فَرْضِهٖ کے معنیٰ میں ہے جس طرح قائل کہتا ہے: اَنْزَلَ اللّٰهُ فِي الزَّكٰوةِ كَذَا تو مقصود یہ ہے کہ خداوند عالم نے زکوٰۃ کے بارے میں اس طرح حکم نازل کیا ہے۔

پھر خداوند عالم نے قرآن کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هُدًى لِّلنَّاسِ (جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے،) یعنی لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور ان کا رہنما ہے جس چیز کا انھیں علوم سے انھیں جن چیزوں کا مکلف بنایا گیا ہے۔

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى (ہدایت کو واضح کرنے والا) ہدایت کی دلالتیں کہا گیا ہے۔ پہلی ہدایت سے گمراہی سے ہدایت مراد ہے اور دوسری ہدایت سے حلال وحرام کا بیان مراد ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ پہلی (ہدایت) سے انھیں علم کا مکلف قرار دینا اور دوسری ہدایت سے انبیاء ان کی شریعتیں اور اخبار پر مشتمل ہدایت مراد ہے اس لئے کہ یہ مذکورہ بالا باتیں قرآن کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی ہیں، یہ

اصم اور قاضی کا قول ہے۔

وَالْفُرْقَانِ (اور حق و باطل کے فرق کو بتانے والا ہے) یعنی جس چیز کے ذریعہ حق اور باطل کے درمیان فرق اور امتیاز کیا جاتا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: قرآن مُجْمَلَةُ الْكِتَاب (یعنی مکمل کتاب) ہے۔ اور فرقان محکم اور واجب العمل ہے۔

حسن بن محبوب کے واسطہ سے ابو ایوب سے انھوں نے ابو الورد کے واسطہ سے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شعبان کے آخری جمعہ میں لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔ حمد وثنائے الٰہی کے بعد فرمایا: اے لوگو! تمہارے اوپر وہ مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے اس میں ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، وہ ماہِ رمضان ہے جس میں اللہ نے روزے فرض کیے ہیں۔ جس کی رات میں مستحبی نماز عام مہینوں کی ستر نمازوں کے برابر ہے اور اس شب میں نیکی کا اجر اس ماہ کے علاوہ اللہ کے فریضہ کے اجر کے برابر قرار دیا، جو شخص اس شب میں اللہ کے فرائض میں سے کوئی فریضہ انجام دیتا ہے وہ ستر فرائض کی ادائیگی کے برابر ہے جو اس ماہ کے علاوہ ہو، یہ صبر کا مہینہ ہے، اس صبر کا ثواب جنت ہے، یہ مواسات (ہمدردی) کا مہینہ ہے، ایسا مہینہ ہے جس میں خداوند عالم مومنین کے رزق میں اضافہ فرماتا ہے جو شخص اس ماہ میں کسی مومن روزہ دار کا افطار کراتا ہے اللہ کے نزدیک اس کا اجر غلام آزاد کرنے اور گذشتہ گناہوں سے مغفرت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی گئی: اللہ کے رسولؐ! ہم میں سے ہر ایک روزہ دار کے افطار پر قدرت نہیں رکھتا۔ ارشاد فرمایا: خداوند عالم کی ذات کریم ہے جو اس کو بھی ثواب عطا فرمائے گا جو تم میں سے فقط روزہ دار کو ایک گھونٹ شیر اور ایک گھونٹ آبِ شیریں پر افطار کرانے پر قادر ہو (بعض) کھجوروں سے زیادہ پر قدرت نہ رکھتا ہو جو اپنے مملوک (غلام اور کنیز) سے نرمی اور سہل انگاری سے کام لیتا ہے خداوند عالم اس کے حساب میں نرمی سے کام لیتا ہے، یہ ایسا مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصّہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ قبولیت (اعمال) اور آتش جہنم سے آزادی کا ذریعہ ہے، تم اس میں چار صفات سے مستغنی نہیں ہو جن میں سے دو صفات سے تم خدا کو راضی کرتے ہو اور دو صفات جن سے تم مستغنی نہیں ہو چنانچہ وہ دو صفات جن سے تم خدا کو خوشنود کرتے ہو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ اور میرے اللہ کے رسول ہونے کی گواہی ہے اور وہ دو صفات جن سے تم مستغنی نہیں ہو وہ یہ ہیں کہ جن میں تم اللہ سے اپنی حاجتیں اور جنت طلب کرتے ہو، ان میں اللہ سے عافیت کا

سوال کرتے ہو اور اس کے ذریعہ آتش جہنم سے پناہ طلب کرتے ہو۔

سلمان فارسیؓ کی روایت میں اس طرح ہے: اس (رمضان المبارک) میں چار صفتیں کثرت سے بیان کرو جن میں دو صفات وہ ہیں جن سے تم اپنے پروردگار کو خوشنود کرتے ہو اور دو صفتوں سے تم مستغنی نہیں ہو جن دو صفتوں کے ذریعہ اپنے پروردگار کو خوشنود کرتے ہو وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی اور اس سے تمھارا استغفار کرنا ہے۔ وہ دو صفتیں جن سے تم مستغنی نہیں ہو سکتے وہ تمھارا اللہ سے جنت کی دعا اور یہ کہ تم اس سے آتش جہنم سے پناہ مانگتے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: روزہ دار کی نیند عبادت، خاموشی تسبیح، دعا مستجاب اور اس کا عمل کئی گنا ہوتا ہے۔

ارشاد: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (لہٰذا جو شخص اس مہینہ کو پالے، اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے) اس کی دو تفسیریں ہیں:

اول: لہٰذا جو تم میں سے شہر میں موجود ہو اور مہینہ سے غائب نہ ہو۔ اَلشَّهْرَ پر الف لام عہد کا ہے جس سے ماہ رمضان مراد ہے۔ لہٰذا وہ تمام مہینہ کا روزہ رکھے یہ وہ معنی ہیں جنکی زرارہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ زرارہ نے کہا: جب امام علیہ السلام سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: جو رمضان کے مہینہ میں حاضر و موجود ہو وہ اس میں روزہ رکھے اور جو اس مہینہ میں سفر کرے وہ روزہ نہ رکھے۔

اسی طرح علی و ابن عباس و مجاہد اور مفسرین کی ایک جماعت سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: جو اس ماہ میں حاضر و موجود ہو یعنی اس پر مہینہ داخل و وارد ہو اور وہ موجود ہو (یعنی مسافر نہ ہو) اس پر تمام ماہ کے روزے رکھنا واجب ہیں۔

دوم: تم میں سے جو (شخص) مقیم اور مکلف ہو وہ اس مہینہ کے روزے رکھے، یہ آیت منسوخ ہوگئی روزہ اور فدیہ کے درمیان اختیار کی بنا پر۔ اگر چہ اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی ہے چونکہ انفصال (جدا ہونا) تلاوت کے وقت شرط نہیں ہے بلکہ وقت نزول کے وقت لازم ہے۔ پہلی تفسیر اقوی ہے۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرلے) اس جملہ کی تفسیر گذشتہ آیت کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

اس مرض کی حد مقرر کی گئی جس میں روزہ نہ رکھنا واجب ہے وہ یہ کہ جس سے انسان کو اس کی بیماری بڑھ

جانے کا خوف ہو۔ ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے مرض کی حد کے متعلق دریافت کیا (جس میں (روزہ دار پر) افطار (روزہ نہ رکھنا) واجب ہے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا: وہ اس پر امین ہے اور مسئلہ کو اس کے حوالے ہے اگر وہ کمزوری محسوس کرے تو روزہ نہ رکھے اور قوت کا احساس کرے تو روزہ رکھے، چاہے جیسی بھی بیماری ہو۔

اسی طرح روایت کی گئی ہے کہ ہر وہ مرض جس میں وہ نماز پڑھنے کی مدت بھر نہ کھڑا رہ سکتا ہو۔ یہ حسن کا قول ہے۔

سفر کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے: وہ سفر جو ہمارے نزدیک روزہ نہ رکھنے کا سبب ہے اسے مباح ہو اور اس کی مسافت آٹھ فرسخ (یعنی) چوبیس (شرعی) میل یعنی ۴۴ کلومیٹر ہو۔ شافعی کے نزدیک سولہ (۱۶) فرسخ ہے۔ ابو حنیفہ کے نزدیک چوبیس (۲۴) فرسخ۔

اَیَّامٍ اُخَر کی تعداد میں اختلاف ہے:

حسن اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ تعداد تنگ قرار دی گئی ہے جب مریض ٹھیک ہو جائے یا مسافر واپس آجائے۔

ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ اس میں وسعت ہے۔

ہمارے (شیعوں) نزدیک دو ماہ رمضان کے درمیان موقت ہے، جائز ہے کہ پے در پے ہو یا متفرق طور پر، پے در پے ہونا بہر حال افضل ہے۔ اگر وہ کوتاہی کرے یہاں تک کہ دوسرا ماہ رمضان آجائے تو اس پر فدیہ اور قضا دونوں واجب ہیں۔ یہی بات شافعی نے کہی ہے۔

ارشاد الٰہی: یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ (اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے) یعنی مریض اور مسافر کو چھوٹ دینے میں جبکہ دونوں پر روزہ واجب نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ اللہ تمھارے تمام امور میں تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے۔

وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (دشواری پیدا کرنا مطلوب نہیں) یعنی تم پر تنگی نہیں چاہتا۔

اس ارشاد میں مجبرہ فرقہ کے عقیدہ کے بطلان پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ وہ مکلفین کے افعال میں جو چیز چاہتا ہے وہ ان کے لیے آسانی ہے اور جس چیز کو وہ نہیں چاہتا وہ ان پر تنگی ہے اور جب اللہ ان سے تنگی و دشواری نہیں چاہتا تو انھیں تکلیف مالا یطاق دینا نہیں چاہتا جو اولیٰ ہے۔

ارشادالٰہی: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (اس لیے تمھیں بتایا جارہا ہے کہ روزوں کی تعداد پوری کرلو) یہ فقرہ گویا اس طرح ہے: اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے تا کہ تم مکمل کرلو یعنی وہ تعداد مکمل کرلو جس میں تم نے یعنی روزے نہیں رکھے ہیں سفر اور مرض کے دنوں میں قضا بجالا کر۔ جب تم مقیم ہو جاؤ اور ٹھیک ہو جاؤ تو افطار کے دنوں کی تعداد کے مطابق روزے رکھو۔

دوسرے قول کے مطابق گویا اس طرح ہے: تعداد مکمل کرنے کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں کہ مہینہ کی تعداد مکمل کرو جو طاقت ہوتے ہوئے اور عدم عذر کے ساتھ اس پر تعداد کا مکمل کرنا آسان ہے جبکہ مسافر اور مریض پر دشوار ہے۔ لہٰذا یہ دوسرے وقت میں اس کی تعداد پوری کریں۔ جس نے کہا ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں ہرگز کمی واقع نہیں ہوگی اس نے وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ کے ذریعہ استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ خداوند عالم نے وضاحت فرمادی ہے کہ ماہ رمضان کی تعداد محصور ہے اس لیے کہ کل روزے واجب ہیں جس میں کمی واقع نہیں ہو سکتی، نہ ہی خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے:

اوّل: تعداد مکمل کرنے سے مراد اس مہینہ کے دنوں کی تعداد مکمل کرنا ہے جس میں تم پر روزے واجب ہیں۔ ممکن ہے یہ تعداد کبھی تیس دن کی ہو کبھی انتیس دن ہو۔

دوم: جو کچھ ہم نے ذکر کیا وہ قضا کی طرف پلٹ رہی ہے جس کی تائید اس طرح ہے کہ خداوند عالم نے اس کا ذکر سفر اور مرض کے ذکر کے بعد کیا ہے۔

ارشاد: وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار کرو)

ہمارے مذہب شیعہ میں اس تکبیر سے شب عید فطر کی تکبیریں مراد ہیں جو چار نمازوں، نماز مغرب، نماز عشا، نماز صبح اور نماز عید کے بعد کہی جاتی ہیں۔

ابن عباس اور ایک جماعت نے کہا: روز فطر کی تکبیر مراد ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم خداوند عالم کی عظمت و بزرگی بیان کرو اس چیز پر کہ اس نے تمھاری احکام دین کی جانب راہنمائی فرمائی ہے۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (اور شکر گزار بنو) تا کہ تم اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو۔

❁❁❁❁❁

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴿۱۸۶﴾

اور (اے نبی) میرے بندے جب بھی آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو انھیں بتا دیجیے کہ میں قریب ہوں۔ جب دعا کرنے والا دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ انھیں چاہئے کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ راہ راست پر آجائیں۔ (۱۸۶)

الفاظ و معانی:

اَجَابَ و اِسْتَجَابَ قَبِلَ و اِسْتَقْبَلَ کے معنی میں ہیں۔ مبرد نے کہا ہے کہ دونوں کے درمیان فرق ہے؛ اِسْتِجَابَۃ میں اذعان (یقین) کے معنی ہیں یعنی یقین کے ساتھ قبول کرنا، جبکہ اِجَابَۃ میں ایسا نہیں ہے۔

ترکیب:

اِذَا ظرف مکان ہے اس فعل کے لئے جس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کر رہا ہے: فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے: فَاَخْبِرْهُ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ بِهٰذِهِ الصِّفَةِ ((اے محمد آپ اسے بتا دیجئے کہ میں اس صفت کا مالک ہوں) اِذَا میں قَرِیْبٌ یا اُجِیْبُ عمل نہیں کر سکتا ہے اس لئے کہ اِنَّ کا معمول جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے پہلے والی چیز میں عمل کرے اس بات کو اس کے مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ اُجِیْبُ محلاً مرفوع ہے اِنَّ کی خبر ہے یہ خبر بعد از خبر ہے۔

شان نزول:

حسن سے روایت کی گئی ہے کہ ایک سائل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: ہمارا پروردگار نزدیک ہے کہ اس سے نجویٰ (سرگوشی) کریں یا دور ہے کہ اسے ندا دیں اور پکاریں؟ اس وقت یہ

آیت نازل ہوئی۔

قتادہ نے بیان کیا ہے کہ اس گروہ کے جواب میں نازل ہوئی جنھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ ہم خدا کو کیسے پکاریں؟

تفسیر:

بارگاہ خدا میں دعا اور تضرع وزاری

خداوند عالم نے روزے کے ذکر کے بعد دُعا، اس کا مقام، منزلت اور اس کی قبولیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ (اور (اے نبی) میرے بندے جب بھی آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں) قریب ترین بات یہ ہے کہ یہ سوال خدا کی صفت کے بارے میں ہے، اس کے فعل کے بارے میں نہیں ہے۔

خداوند عالم کا ارشاد: فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ کی بنا پر اس میں حذف ہے، یعنی فَقُلْ اِنِّيْ قَرِيْبٌ؛ میں نزدیک ہوں۔ یہ بات اس چیز پر دلالت کر رہی ہے خدا کے لیے جگہ و مکان نہیں ہے، اگر اس کے لیے جگہ اور مکان ہوتے تو ہر مناجات کرنے والے سے نزدیک نہیں ہوتا۔

کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ میں دعا کرنے والے کی دُعا کو بہت جلد قبول کرتا ہوں، چونکہ سریع اور قریب باہم نزدیک ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ میں پکارنے والے کی دُعا (آواز) سنتا ہوں جس طرح قریب المسافت سنتا ہے۔ حسنِ بیان کے لیے لفظ قریب آیا ہے چونکہ اللہ کے لیے قریب المسافت ہونا جائز نہیں ہے، یہ اس کے لیے قابل تصور ہے جو کسی جگہ رہتا ہو اور حادث کی صفت ہے۔

ارشاد الٰہی: اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (جب دعا کرنے والا دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں) معنی واضح ہے۔

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ (انھیں چاہیے کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں) ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے انھیں جن چیزوں کی طرف دعوت دی ہے وہ میری باتوں پر لبیک کہیں۔

مبرد و سراج نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جن چیزوں کا میں نے انھیں حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے انھیں

روکا ہے اس کی طلب موافقت میں حق کا یقین رکھیں۔

مجاہد نے کہا: اطاعت کے ذریعہ میری بات کو قبول کریں گے۔

کہا گیا ہے کہ مجھے پکاریں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: عاجز ترین انسان وہ ہے جو دعا کرنے سے بھی عاجز ہو اور بخیل ترین انسان سلام میں بخل کرنے والا ہے۔

وَلْيُؤْمِنُوا بِي (اور مجھ پر ایمان لائیں) یعنی وہ تمام چیزیں جنھیں میں نے نازل کیا ہے ان کی تصدیق کریں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: وَلْيُؤْمِنُوا بِي یعنی یقین حاصل کرلیں جس چیز کی بھی دعا کرتے ہیں میں انھیں عطا کرنے پر قادر ہوں۔

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (تاکہ راہ راست پر آجائیں) تاکہ وہ حق تک پہونچ جائیں اور اس کی طرف ہدایت پالیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اللہ سے دعا کرتے ہیں لیکن ان کی دعا قبول نہیں ہوتی لہٰذا اللہ کے ارشاد: أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (بس پکار کرنے والے کی آواز سنتا ہوں جب بھی مجھے پکارتا ہے) کے کیا معنی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں ہے جو اللہ کو اس کی حکمت کے مطابق پکارے مگر یہ کہ خدا اسے قبول فرماتا ہے چنانچہ جب پکارنے والا اسے پکارتا ہے واجب ہے کہ اس چیز کے متعلق دعا کرے جس میں اس کے دین کی صلاح و بہتری ہو اس میں اس کے اور اس دوسروں کے لیے مفسدہ نہ ہو، شرط ہے کہ اس کی زبان سے ہو یا اپنے قلب کے ذریعہ نیت کرے۔ لہٰذا خداوند عالم اسے قبول کرتا ہے جس کا اس کی مصلحت تقاضا کرتی ہے، اگر تاخیر میں مصلحت ہوتی ہے تو اس کی قبولیت کو موخر کردیا جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جس میں اس کی مصلحت ہوتی ہے وہ اسی چیز کو انجام دیتا ہے لہٰذا دعا اور اس کی قبولیت کے کیا معنی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا اپنی ذات میں خود ایک عبادت ہے جس کے ذریعہ خدا کی عبادت کی جاتی ہے، اس لئے کہ دعا میں خضوع وانکساری اور اطاعت کا اظہار کیا جاتا ہے خدا کے حضور میں، لہٰذا جس چیز کا اس نے دعا کی ہے اس کے واقع ہونے میں مانع نہیں ہے کہ دُعا کے بعد مصلحت ظاہر ہو اور دعا سے قبل مصلحت نہ ہو، لہٰذا دعا میں یہ فائدہ مضمر ہے۔ اس چیز کی تائید ابو سعید خدری کی روایت کررہی ہے وہ کہتے ہیں: پیغمبر صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی مسلمان ایسا نہیں جو خدا کو پکارے (دعا کرے) جس میں نہ تو قطع رحم کے حقوق ہوں نہ ہی گناہ کے بارے میں مگر یہ کہ خداوند عالم اسے تین نیکیوں میں سے ایک نیکی عطا فرماتا ہے یا تو اس کی دعا کو جلد قبول کر لیتا ہے یا آخرت کے لیے اٹھا رکھتا ہے یا اسی کے مانند اس سے بلا اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! پس ہم زیادہ سے زیادہ دعا کریں گے؟ فرمایا: تو اللہ زیادہ سے زیادہ عطا کرے گا۔

انس بن مالک کی روایت میں اس طرح ہے کہ اللہ زیادہ کرتا ہے اور پاک کرتا ہے۔ اسی طرح آپؐ نے تین مرتبہ اس فقرہ کی تکرار فرمائی۔

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بندہ جب اللہ سے دعا کرتا ہے اور اللہ اسے پسند کرتا ہے خدا جبرئیلؑ سے فرماتا ہے، میرے اس بندہ کی حاجت پوری نہ کرنا اسے موخر کر دو مجھے اس کی آواز سننا محبوب اور پسند ہے اور وہ بندہ جس پر اللہ غضبناک ہوتا ہے جب وہ خدا کو (پکارتا ہے) اور اس سے دعا کرتا ہے، خدا فرماتا ہے: اے جبرئیل! اس بندہ کی حاجت جلد سے جلد پوری کر دو، میں اس کی آواز سننا پسند نہیں کرتا۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ نے فرمایا: کبھی بندہ کی قبولیت دعا میں اس لیے تاخیر ہوتی ہے تاکہ سائل کو عظیم اجر اور بہترین بخشش عطا کی جائے جو اس کی امید سے زائد ہو۔

ابراہیم بن ادہم سے عرض کیا گیا: ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں وہ اسے قبول کیوں نہیں فرماتا؟ انھوں نے کہا: تم نے اللہ کو پہچانا لیکن اس کی اطاعت نہیں کی، رسول کو پہچانا ان کی سنت کی پیروی اور اتباع نہیں کیا، تم نے قرآن کی معرفت حاصل کی لیکن اس میں موجود نصیحتوں پر عمل نہیں کیا، اس کی نعمتیں کھاتیں لیکن ان کا شکر ادا نہیں کیا، جنت کو پہچانا لیکن اسے چاہا نہیں، آتش جہنم کو پہچانا لیکن اس سے فرار اختیار نہیں کیا، شیطان کو پہچانا لیکن اس سے جنگ نہیں کی (بلکہ) تم نے اس سے موافقت کی، موت کو پہچانا لیکن خود کو اس کے لیے آمادہ نہیں کیا، مردوں کو دفن کیا لیکن ان سے عبرت حاصل نہیں کی، تم نے اپنے عیوب سے صرف نظر کیا اور دوسروں کے عیوب کے پیچھے لگ رہے۔

❀❀❀❀❀

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

ماہ رمضان میں راتوں کو تمھارے لیے اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، مگر اس نے تمھاری توبہ قبول کر لی اور تمھارا قصور معاف کر دیا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ رات بسر کرو اور جو اللہ نے تمھارے لیے مقرر کر دیا اسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو فجر کی سفید دھاری، سیاہ دھاری سے نمایاں دکھائی دے۔ پھر تم رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں حالت اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے مُباشَرَت نہ کرو یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام صَراحَت کے ساتھ لوگوں کے لیے بیان کر دیتا ہے اس توقع پر کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں گے۔ (۱۸۷)

الفاظ و معانی:

رَفَث کے یہاں معنی جماع کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے حقیقی معنیٰ فحش کلام کے ہیں کہ اس سے جماع کا کنایہ کیا گیا ہے۔

لِبَاس کے معنی کپڑوں کے ہیں جن کا کام جسم کو ڈھانپنا ہے۔

شانِ نزول:

علی بن ابراہیم بن ہاشم نے اپنے والد کے واسطہ سے مرفوعاً امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: ماہ رمضان میں سونے کے بعد کھانا کھانا حرام تھا اور رمضان کے شب و روز میں جماع حرام تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی مطعم بن جبیر، عبداللہ بن جبیر کے بھائی جنہیں آنحضرت نے جنگ احد کے دن پچاس تیر اندازوں کے ہمراہ گھاٹی کے دہانے پر معین فرمایا تھا جن کے ساتھی بھاگ کر چلے گئے تھے صرف بارہ افراد ان کے ساتھ باقی رہ گئے تھے۔ عبداللہ بن جبیر کو گھاٹی کے درے پر قتل کر دیا گیا ان کے بھائی مطعم بن جبیر ایک بوڑھے اور ضعیف العمر شخص تھے، وہ روزہ سے تھے۔ جب ان کی اہل خانہ ان کے پاس افطار سے کھانا لے کر آئے تو وہ سو چکے تھے اور افطار نہیں کیا، جب وہ بیدار ہوئے تو انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا: خدا تعالیٰ نے اس شب مجھ پر کھانا حرام قرار دیا ہے۔

جب صبح ہوئی تو خندق کھودنے میں مصروف ہوگئے اور ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی، جب رسول اللہؐ نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو آپ کا قلب ان کے لیے محزون ہوگیا۔

نیز جوانوں کا ایک گروہ رمضان المبارک کی شب میں چھپ کر جماع کرتا تھا لہٰذا اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا (رمضان کی شب میں جماع اور سونے کے بعد صبح صادق تک کھانا حلال قرار دیا)

علماء (یعنی علماء اہلسنت) نے اس شخص کے نام میں اختلاف کیا ہے جو کہ انصار سے تھا بعض نے قیس بن صرمہ کہا ہے اور ابوصرمہ بھی کہا گیا ہے اور ابوقیس بن صرمہ بھی کہا گیا ہے، صرمہ بن ایاس بھی کہا گیا ہے، قتادہ نے بیان کیا ہے کہ اسی صحابی رسول نے پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی: میں کھجوریں جمع کرنے میں مصروف رہا یہاں تک شام ہوگئی، میرے اہل خانہ میرے لیے کھانا لے کر آئے چونکہ میں تھکا ہوا تھا سو گیا تھا انہوں نے مجھے بیدار کیا، کھانا مجھ پر حرام تھا، شام کے وقت روزے نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔

حضرت عمر نے کہا: میں بھی اپنے بارے میں آپ سے گذارش کر رہا ہوں جو اسی کے مانند ہے میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اپنی زوجہ کے پاس آیا اور دیگر افراد نے بھی اسی طرح کے اعترافات کیے لہٰذا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت ابن عباس اور سدی سے مروی ہے۔

تفسیر:

روزہ کے حکم میں وسعت

پھر خداوند عالم نے روزوں کا وقت اور اس سے متعلق احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (ماہ رمضان میں راتوں کو تمھارے لیے اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے) یعنی جماع۔ ابن عباس نے کہا: خدا باحیا ہے اس نے اپنی بات کو کنایہ میں بیان کیا ہے۔ رَفَث، لِبَاس، مُبَاشَرۃ اور اِفْضَاء یہ سب جماع سے کنایہ ہے۔

زجاج نے بیان کیا ہے کہ کلمۂ رَفَث ہر اس چیز کا جامع ہے جس کا انسان اپنی زوجہ سے خواہاں ہوتا ہے جو پہلے حرمت کا متقاضی تھا جس کو ان سے برطرف کر دیا گیا۔

لَيْلَةَ الصِّيَامِ سے وہ شب مراد ہے جس کی صبح کو روزہ ہوگا۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت ہے کہ ہر ماہ کی پہلی شب میں جماع مکروہ ہے سوائے رمضان المبارک کی پہلی شب کے کہ اس شب جماع کرنا مستحب ہے اس لئے کہ آیت اسی مقام و مورد میں ہے۔ زیادہ مشابہ اس بات سے ہے کہ اس سے پورے ماہ رمضان کی راتیں مراد ہوں۔ خداوند عالم لیلۃ کو واحد لایا ہے اس لئے کہ وہ اسم جنس ہے جو کثرت پر دلالت کر رہا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو) یعنی وہ تمھارے لیے سکون کا سبب ہیں اور تم ان کے لیے باعث سکون ہو۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا یعنی سَكَنًا (ہم نے رات کو لباس یعنی سکون کا ذریعہ قرار دیا) یہ ابن عباس، مجاہد، اور قتادہ سے مروی ہے۔ یعنی تم ایک دوسرے کو سکون پہونچانے کے ساتھ ان سے ہمبستر ہوتے ہو یعنی ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ زوجین ایک دوسرے کی جدائی برداشت کریں۔

کہا گیا ہے کہ خدا نے دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا اس لیے کہ دونوں میں سے ہر ایک کا جسم دوسرے کے جسم سے اس طرح پیوستہ ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے لیے پہننے والے لباس کے مانند ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وقت جماع شوہر و زوجہ ایک دوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں اس لیے دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے دوسرے کے لیے لباس کا نام دیا گیا۔ ربیع نے کہا ہے کہ عورتیں تمھارا لباس ہیں اور تم ان کے لیے لحاف ہو۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے) جب اللہ نے ان پر سونے کے بعد کھانا اور جماع حرام قرار دیا اور ان لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو خداوند عالم نے اس اجازت کے ذریعہ اپنی نعمت کی یاددہانی کرائی ہے جسکے سبب حرمت منسوخ ہوگئی، چنانچہ ارشاد فرمایا: خدا اس سے بخوبی واقف ہے جو تم معصیت کر کے اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے یعنی جماع خود کو روک کر امانت ادا نہیں کرتے تھے۔ بیان کیا گیا کہ 'تَخْتَانُوْنَ' کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے نفسوں کی شہوت میں کمی کرتے ہو اور جس چیز سے میں نے تمھیں روکا ہے اس سے اجتناب کر کے نفس کو اس کی لذتوں سے روکتے ہو۔ اللہ نے تمھارے لیے اس میں آسانی فراہم کی، فَتَابَ عَلَيْكُمْ (اور اس نے تمھاری توبہ قبول کرلی) کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تمھیں اجازت دیدی اور حرمت کو تم سے برطرف کر دیا۔ وَعَفَا عَنْكُمْ (اور تمھارا قصور معاف کر دیا ہے) اس میں دو معنی ہیں:

اول: تمھارے گناہ بخش دیئے۔

دوم: تم سے اس کی حرمت کو برطرف کر دی، یہ ان کے لیے حرمت سے عفوودرگذر ہے۔

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ (اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ رات بسر کرو) شب میں ان (بیویوں) سے مباشرت کرو۔ صیغۂ امر ہے اور مراد مباح ہونا ہے۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (اور جو اللہ نے تمھارے لیے مقرّر کر دیا اسے حاصل کرو) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: اس چیز کو طلب کرو جسے خداوند عالم نے تمھارے لئے مقدر کیا ہے اولاد میں سے ہے۔ یہ حسن اور بیشتر مفسرین کا قول ہے، یہ کہ انسان اپنی بیوی سے اس امید پر مجامعت کرے کہ خداوند عالم اسے ایسا فرزند عطا فرمائے جو اس کی عبادت و تسبیح کرے۔

دوم: اس چیز کو طلب کرو جو خداوند عالم نے حلال میں سے قرآن مجید میں لکھ دیا ہے اور قرآن میں بیان کر دیا ہے اس لئے کہ جیسے خداوند عالم یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے حلال کو ویسے ہی اپنایا جائے جس طرح پسند کرتا ہے کہ واجبات اور فرائض کو اختیار کیا جائے۔

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا (نیز راتوں کو کھاؤ پیو) کھانے اور پینے کی اباحت ہے۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ (یہاں تک کہ تم کو نمایاں دکھائی دے) یعنی تمھارے لیے تحقیق کے ذریعہ ظاہر و مشخص ہو جائے سیاہ دھاگے

سے سفید دھاگا یعنی رات سے دن ظاہر اور واضح ہو جائے، دن کی ابتدا طلوع فجر صادق ہے۔ کہا گیا ہے کہ رات کی تاریکی سے سپیدۂ سحر ہے۔ کہا گیا ہے کہ آخری شب سے اول دن کی سفیدی ہے۔ اَلْخَيْطُ (دھاری) (یعنی دھاگے) سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ سفیدی کی جس مقدار سے افطار حرام ہے وہ دھاگے سے مشابہ ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سیاہی سے زائل ہو جاتا ہے اس کا پھیلنا شرط نہیں ہے۔

مِنَ الْفَجْرِ (فجر کی) مِنَ کے سلسلہ میں دو معنی کے احتمال ہیں:

اول: تبعیض (یعنی بعضیت) کے معنی میں ہو اس لئے کہ فجر کا بعض حصہ مراد ہے، پورا حصہ مراد نہیں ہے۔ یہ ابن درید کا قول ہے۔

دوم: تبیین کے لیے ہے اس لیے کہ خَيْطُ الْاَبْيَضِ (سفید دھاری) (سفید دھاگے) کو بیان فرمایا ہے گویا کہا جارہا ہے کہ سفید دھاگا فجر ہے۔ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ سے عرض کیا: میں نے بالوں سے بنے سفید اور کالے دو دھاگے بنائے اور دونوں کو دیکھتا رہا، میرے لیے کچھ واضح نہیں ہو سکا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح ہنسے کہ آپؐ کے سامنے کے دانت ظاہر ہو گئے پھر آپؐ نے فرمایا: اے حاتم کے فرزند! اس سے دن کی سفیدی اور شب کی تاریکی مراد ہے، روزہ کی ابتدا اسی وقت سے ہوتی ہے۔

پھر خداوند عالم نے انتہا بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (پھر تم رات تک اپنا روزہ پورا کرو) یعنی طلوع فجر ثانی کا وقت جو طول وعرض میں افق پر پھیلتا ہے، جو کہ فجر صادق کا وقت ہے، اس وقت نماز (صبح) واجب ہو جاتی ہے (روزہ تمام کرنے کا وقت) شب کے داخل ہونے تک ہے جو غروب آفتاب کے بعد ہوتا ہے، اس کے داخل ہونے کی علامت حُمرۂ مشرقیہ کے ختم ہونے اور مشرق کی طرف سے سیاہی کا آنا ہے، اس کے علاوہ آفتاب کے غروب ہونے سے جبکہ کشادہ زمین کے اُفق میں ظاہر ہونے پہاڑوں اور ٹیلوں کے نہ ہونے پر شب داخل ہو جاتی ہے۔

ارشاد: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ (بیویوں سے مُباشَرت نہ کرو) اس کے معنی میں دو قول ہیں:

اول: اس سے جماع مراد ہے۔ یہ ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے۔

دوم: جماع اور اس کے علاوہ بوسہ وغیرہ مراد ہے، مالک اور ابن زید سے روایت ہے۔ یہی ہمارا مذہب ہے۔

ارشاد: وَاَنۡتُمۡ عٰكِفُوۡنَ فِي الۡمَسٰجِدِ (جب تم مسجدوں میں حالت اعتکاف میں ہو تو) یعنی جب مسجدوں میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو مباشرت نہ کرو۔

ہمارے نزدیک چار مساجد مسجد الحرام، مسجد پیغمبرؐ، مسجد کوفہ اور مسجد بصرہ میں سے کسی ایک کے علاوہ میں اعتکاف درست نہیں ہے اور دیگر تمام فقہاء کے نزدیک تمام مساجد میں جائز ہے۔ مگر مالک نے کہا ہے کہ اعتکاف جامع مسجد سے مخصوص ہے۔

ہمارے نزدیک روزہ کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہے اور یہی ابوحنیفہ اور مالک کا قول ہے۔ شافعی کے یہاں بغیر روزہ کے بھی اعتکاف ہے۔

ہمارے نزدیک تین روز سے کم نہیں ہوسکتا۔ ابوحنیفہ کے نزدیک ایک دن کا بھی ہوسکتا ہے۔ مالک کے یہاں دس دن سے کم جائز نہیں۔ شافعی کے نزدیک جس قدر بھی چاہے اگرچہ ایک گھنٹہ کا ہی کیوں نہ ہو۔

آیت میں حالت اعتکاف میں شب و روز میں مباشرت کے حرام ہونے پر دلیل موجود ہے چونکہ مباشرت کو اعتکاف کی حالت میں معلق کیا ہے۔

ارشاد: تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ (یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں) تِلۡكَ آیت میں مذکورہ احکام کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کے حدود اللہ کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ یہ حسن کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کے معنی اللہ کی نافرمانیاں ہیں۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ جن چیزوں سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا (ان کے قریب نہ پھٹکنا) انھیں انجام نہ دینا۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ اللہ کے فرائض ہیں مخالفت کرتے ہوئے ان کی قریب نہ جاؤ۔

كَذٰلِكَ مذکورہ بیان کے مانند يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ (اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام صراحت کے ساتھ لوگوں کے لیے بیان کردیتا ہے) ان کی حجتیں اور ادلہ جن کے بارے میں انھیں حکم دیا اور انھیں نہی کی۔

لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ (اس توقع پر کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں گے) تاکہ وہ اللہ کی نافرمانی اور حدود سے تجاوز کرنے سے اجتناب کریں ان چیزوں میں جسے اللہ نے واجب یا حرام یا مباح قرار دیا ہے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ خداوند عالم ہر شخص سے تقویٰ اور پرہیزگاری چاہتا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اور تم لوگ ایک دوسرے کے مال کو آپس میں نہ تو ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ ہی حاکموں کے آگے انھیں اس غرض سے لے جاؤ کہ تم دوسرے لوگوں کے اموال کو ناجائز طور سے خورد برد کر جاؤ جب کہ تم جانتے ہو (کہ یہ تمھارا مال نہیں ہے) (۱۸۸)

الفاظ و معانی:

بَاطِل: ختم اور زائل ہونے والا۔ کہا گیا ہے کہ اَلْبَاطِل وہ ہے جو کسی چیز کے برخلاف (برعکس) سے متعلق ہو چاہے وہ خبر ہو یا عقیدہ ہو یا گمان و خیال ہو۔

حَکَم جو مخالفین کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ جو ہر ایک کو آپس میں جھگڑا کرنے سے روکتا ہے۔

ترکیب:

وَ تُدْلُوْا نہی ہونے کی بنا پر مجزوم اور وَلَا تَاْكُلُوْا پر عطف ہے۔ ممکن ہے کہ ظرف کی بنا پر منصوب ہو اور اس کا منصوب ہونا اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنیاد پر ہو۔

جیسے شاعر کا یہ شعر:

لَا تَنْهَ عَنْ خُلُقٍ وَّ تَأْتِيَ مِثْلَهٗ عَارٌ عَلَيْكَ اِذَا فَعَلْتَ عَظِيْمٌ

(ایسے اخلاق سے منع مت کرو جس کے مانند تم خود انجام دیتے ہو جب تم ایسا کرو گے تو یہ تمھارے لئے بہت بڑا ننگ و عار ہے) یعنی دونوں کو جمع مت کرو۔

تفسیر:

حرام خوری اور رشوت خوری سے منع کرنا

پھر خداوند عالم نے شریعت اسلام کے گذشتہ احکام سے سلسلہ وار حلال و حرام (احکام) بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (اور تم لوگ ایک دوسرے کے مال کو آپس

میں ناجائز طریقے سے کھاؤ) یعنی تم میں بعض بعض کا مال غصب وظلم اور ناجائز طریقہ سے نہ کھائے جیسے یہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے مال لہو ولعب مثلاً جوا وغیرہ کے ذریعہ نہ کھاؤ چونکہ یہ تمام طریقے باطل ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ باطل سے جھوٹی قسم مراد ہے جس قسم کے ذریعہ مال حاصل کیے جاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ قریش اپنے اہل (بیوی بچے) اور مال کے ذریعہ جوا کھیلتے تھے جس سے خدا نے نہی فرمائی ہے۔ خود آیت ان تمام معانی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ (اور نہ ہی حاکموں کے آگے انھیں اس غرض سے لے جاؤ کہ) جنہیں تم قاضیوں کے سامنے پیش کرتے ہو۔ اس میں چند اقوال ہیں:

اول: یہ وہ امانتیں اور وہ چیزیں ہیں جن پر کوئی گواہ نہ ہو۔ یہ روایت ہے ابن عباس، حسن اور قتادہ سے۔

دوم: اس لئے کہ جب اوصیاء سے یتیموں کے مال کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو وہ اسے حکام کے حوالہ کر دیتے تا کہ کچھ حصہ خود لے لیں اور ظاہر میں ان کے لئے دلیل قائم ہو جائے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔

سوم: وہ مال جو جھوٹی گواہی کی غرض حاصل کیا جائے۔ یہ کلبی کا قول ہے۔

اس فقرہ کو مذکورہ بالا تمام وجہوں پر حمل کرنا اولیٰ ہے۔

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ (تم دوسرے لوگوں کے اموال کو ناجائز طور سے تصرف کر جاؤ) تا کہ تم لوگوں کے مال میں سے ایک حصہ ایسے کام کی وجہ سے کھا جاؤ جو گناہ کا سبب ہو جیسے حاکم ظاہر کے مطابق فیصلہ کرے جبکہ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ باوجودیکہ تم جانتے ہو کہ مال کا وہ یہ حصہ تمھارا حق نہیں ہے اور تم باطل پر ہو۔ یہ شدید ترین مذمت ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم جانتا تھا کہ عنقریب ایسے حکام آئیں گے جو خلاف حق فیصلہ کریں گے، خداوند عالم نے انھیں حاکم بنانے (یا ان سے فیصلہ چاہنے) سے نہی فرمائی ہے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ حق کے ساتھ حکم (فیصلہ) نہیں کریں گے۔

یہ فقرہ اس بات دلالت کر رہا ہے کہ صورت حال کو جاننے کے باوجود یا صورت حال کو معلوم کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود نافرمانی کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

اے پیغمبر یہ لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں فرما دیجیے کہ یہ انسانوں کے لیے وقت کی تعیین کرنے اور حج کا وقت معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ نیز اُن سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ یہ نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں عقب سے داخل ہو۔ نیکی تو دراصل ان کے لیے ہے جو پرہیزگار ہوں اور تم گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ (۱۸۹)

قرأت:

ابن کثیر، ابن ذکوان اور کسائی نے اَلْبِیُوت، اَلشِّیُوخ اور ان جیسے دیگر کلمات کے پہلے حرف کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے اَلْعُیُوب کے۔ اور حمزہ، حماد اور یحییٰ نے عاصم سے روایت میں اَلْجُیُوب کے علاوہ اس طرح کے سارے کلمات کو پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور قالون نے ان کلمات میں سے صرف اَلْبِیُوت کو باء کے کسرہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے ان کلمات کے پہلے حرف کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے ان کلمات کے پہلے حرف کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے ایسا یاء کی وجہ سے کیا ہے کہ ضمہ کو کسرہ سے بدل دیا ہے اس لئے کہ ضمہ کے مقابلہ میں کسرہ یاء سے سب سے زیادہ مناسبت و موافقت رکھتا ہے۔ جس طرح عَین اور نَاب کے مصغر بنانے میں عِیَیْنَة و نِیَیْب کی فاء الفعل کو کسرہ دے دیا ہے اگرچہ مصغر کے اوزان میں ایسا کوئی وزن نہیں ہے تو ایسا صرف اس لئے کیا ہے کہ حرکت کو مابعد ((یاء)) سے قریب کر دیں اور جن قراء نے ضمہ دیا ہے تو وہ اصل اور قاعدہ کی بنا پر ہے اس لئے کہ یہ کلمات فُعُول کے وزن پر ہیں۔

الفاظ و معانی:

اَهِلَّة هِلَال کی جمع ہے۔ یہ عربوں کے اس جملہ: اِسْتَهَلَّ الصَّبِيُّ سے مشتق ہے (یعنی ولادت کے بعد بچہ رویا یا چیخا) یا عربوں کا یہ جملہ کہ اَهَلَّ الْقَوْمُ بِالْحَجِّ لوگوں نے حج کے موقعہ پر تلبیہ کی آواز بلند کی۔

تَوْقِيت کے معنی وقت کی تعیین ہے۔ جب بھی اس وقت کو مقدر و معین کیا جائے گا اسے مُوَقَّت کہا جائے گا۔ مِيقَات کے معنی وقت کی انتہا کے ہیں۔ آخرت مخلوق کی میقات ہے، اہلال یعنی مہینہ کی میقات ہے۔

بِرّ: اچھا نفع۔ ظَهْر: چہرہ کا مقابل، پشت۔ بَاب: داخل ہونے کی جگہ۔ بَوَّاب: پہرہ دار اس لئے کہ وہ دروازہ پر ہی رہتا ہے۔ بَقِيَّة: کسی چیز کا ٹکڑا۔

ترکیب:

لِلنَّاس: محلاً مرفوع اَلْمَوَاقِيتُ کی صفت ہے گویا اس طرح ہے: هِيَ مَوَاقِيتُ كَائِنَةٌ لِلنَّاس

بِاَنْ تَأْتُوا میں باء زائدہ نفی کی تاکید کے لئے ہے۔

اَنْ تَأْتُوا باء کی وجہ سے محلاً مجرور ہے۔ جار و مجرور محلاً منصوب ہیں اس لئے کہ لَيْسَ کی خبر ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى کے بارے میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) یہ جملہ گویا اس طرح ہے: وَلٰكِنَّ الْبَرَّ مَنِ اتَّقٰى۔ جیسا کہ ہم نے آیہ کریمہ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ مصدر کو صفت کی جگہ رکھ دیا گیا ہے۔

(۲) گویا اس طرح ہے کہ وَلٰكِنَّ الْبَارَّ مَنِ اتَّقٰى۔

شانِ نزول:

روایت کی گئی ہے کہ معاذ بن جبل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یہودی ہم سے ہلال کے بارے میں بکثرت سوالات کرتے ہیں تو اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

قتادہ نے بیان کیا ہے کہ ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: اس ہلال کو کیوں خلق کیا گیا ہے؟ تو اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تفسیر:

طبیعی اور فطری پیمانے

خداوند عالم نے دوسرا حکم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ (اے پیغمبر! یہ لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں) یعنی ماہتاب کے کم و زیادہ ہونے کے حالات اور اس کی حکمت کے متعلق (آپ سے سوال کرتے ہیں) تو اے محمدؐ! آپ کہہ دیجیے یہ لوگوں کے لیے حج کا وقت بتانے کے اوقات کا ذریعہ ہے لوگ جن کے محتاج ہوتے ہیں اپنے روزوں کے لیے، افطار کرنے کے لیے اور ان کی عورتوں کے عدت کے لیے، قرضوں کی ادائیگی کے وقت اور ان کے حج کے وقت۔

خداوند عالم نے ماہتاب کے کم و زیادہ ہونے کی حکمت کو لوگوں کے دینی و دنیاوی امور و فوائد سے متعلق قرار دیا ہے اس لیے کہ اگر ماہتاب، آفتاب کے مانند ہمیشہ دائرہ کی شکل میں رہتا تو اس سے اوقات معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ روزہ عدد کے ذریعہ ثابت نہیں ہوتا۔ خداوند عالم نے صریحاً وقت کی تعیین اور مہینوں پر دلالت کے لئے اَهِلَّة کو شرط قرار دیا ہے۔ اگر مہینے عدد کے ذریعہ معلوم ہو سکتے تو وقت معلوم کرنے کے لیے عدد سے مخصوص کرتا، نہ کہ رؤیت ہلال سے۔ اس لیے کہ عدد والوں (جو افراد مہینہ کے لیے عدد کو معتبر مانتے ہیں) کے نزدیک وقت شناسی کے لیے رؤیت ہلال کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (نیز اُن سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ یہ نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں عقب سے داخل ہو) اس میں چند تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

اول: مُحرم حضرات اپنے گھروں میں دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ گھروں کی پشت پر نقب لگا کر داخل ہوتے اور وہیں سے باہر نکلتے تھے۔ ان کے اس عمل سے نہی کی گئی ہے۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور عطا سے اس کی روایت ہے۔ اس کی روایت ابوالجارود نے امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ مگر یہ کہ حُمس جو قریش، کنانہ و خزاعہ و ثقیف و جشم اور بنو عامر بن صعصعہ ہیں وہ ایسا نہیں کرتے تھے، دین میں ان کی شدت کے سبب انھیں حُمس کہا گیا۔ حماسہ کے معنی شدت کے ہیں۔ کہا گیا ہے

کہ بلکہ حمس ہی کرتے تھے ان کا یہ عمل اس لیے تھا تا کہ ان کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔

دوم: مراد یہ ہے کہ نیکی، یہ نہیں ہے کہ گھروں میں اس کی غیر جہت (سمت) سے آؤ، مناسب اور سزاوار ہے کہ امور کو ان کی جہات سے انجام دو چاہے جو بھی کام ہو۔ اس کی روایت جابر کے واسطہ سے امام محمد باقر علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے۔

سوم: مقصود یہ ہے کہ نااہل سے نیکی کا مطالبہ کرنا، نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی یہ ہے کہ نیکی کو اس کے اہل سے طلب کیا جائے۔

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ (نیکی تو دراصل ان کے لیے ہے جو پرہیزگار ہوں) اس کے معنی بیان کیے جا چکے ہیں۔

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (اور تم گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ) اس کے معنی گذر چکے ہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: آل محمدؐ اللہ کے دروازے، اس کے راستے، جنت کی طرف بلانے والے، اس کی طرف رہنمائی کرنے والے اور قیامت تک اس پر دلیل ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں شہر علم اور علی اس کا دروازہ ہیں، کوئی شخص شہر میں داخل نہ ہو مگر دروازے سے۔

اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: میں حکمت کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ) یعنی جس چیز سے اللہ نے تمھیں روکا ہے اور کنارہ کش رہنے کے لئے کہا ہے ان سے بچو تا کہ اس کے ثواب تک پہونچ کر تم کامیاب ہو جاؤ جس کی ضمانت اس نے متقین کو دی ہے۔

نظم:

اللہ کے ارشاد: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا سے اس کے ارشاد: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ سے اتصال کی وجہ یہ ہے کہ جب خداوند عالم نے بیان فرمادیا کہ ہلال لوگوں کے لیے اوقات اور حج کے اوقات معین کرنے کا ذریعہ ہے تو جب وہ لوگ احرام باندھ لیتے تھے تو گھروں میں پشت سے داخل

ہوتے تھے، اس پر اس ارشاد کو عطف کیا گیا ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔
بیان کیا گیا ہے کہ جب اس چیز کی وضاحت کر دی گئی کہ ہمارے امور کے اوقات معین ہیں تو اسی سے اس بات کو بھی جوڑ دیا ہے کہ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا یعنی جس طرح تمھارے امور کے اوقات معین ومقدر ہیں اسی طرح تمہارے افعال واعمال کو بھی امر خدا کا اتباع کرتے ہوئے ثابت طریقہ سے جاری وساری ہونا چاہئے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے، نیز ان امور سے رکنا چاہئے جن سے روکا ہے چونکہ جس چیز کا حکم دیا ہے اس کا اتباع کرنا اس کے اتباع سے کہیں بہتر ہے جس کا حکم نہیں دیا ہے۔

❁❁❁❁❁

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۹۰﴾

اور اللہ کی راہ میں تم اُن لوگوں سے جہاد کرو، جو تم سے جنگ کرتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو بلاشبہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۹۰)

قرأت:

حمزہ اور کسائی نے: وَلَا تَقْتُلُوهُمْ، حَتّٰى يَقْتُلُوكُمْ، فَإِنْ قَتَلُوكُمْ سب کو بغیر الف کے پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے الف کے ساتھ پڑھا ہے: لَا تُقَاتِلُوهُمْ، حَتّٰى يُقَاتِلُوكُمْ۔ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ۔

حجت:

جن قراء نے ان افعال کو بغیر الف کے پڑھا ہے تو انہوں نے مصحف کا اتباع کیا ہے اس لئے کہ مصاحف میں یہ افعال بغیر الف کے مرقوم ہیں اور جن قراء نے الف کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کا کہنا ہے کہ لکھنے میں الف کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسا کہ لفظ رَحْمٰن میں ہوتا ہے۔

ترکیب:

لفظ حَيْثُ کو تین طرح سے تلفظ کیا گیا ہے: ضمہ کے ساتھ اس لئے تلفظ کیا گیا ہے کہ وہ غایت سے

حَیْثُ جیسے قَبْلُ بَعْدُ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے مفرد کی جانب مضاف کرنا صحیح نہیں ہے باوجودیکہ اس میں مفرد کی جانب اضافہ کے معنی کا ہونا ضروری ہے اس لحاظ سے مبنی برضمہ ہونے میں وہ قَبْلُ اور بَعْدُ کے مانند ہے اور فتحہ کے ساتھ پڑھنے کی وجہ اس کا مبنی ہونا ہے جس طرح آیْنَ اور کَیْفَ کو فتحہ دیا گیا ہے اور کسرہ اس لئے دیا گیا ہے کہ جب دو ساکن ایک جگہ جمع ہوجائیں تو حرکت دینے کا قاعدہ یہی ہے کہ کسرہ دیا جائے۔

حَیْثُ کے بعد والا جملہ دونوں مقام پر حَیْثُ کے مضاف ہونے کی وجہ سے محلاً مجرور ہے۔

وَ تُقَاتِلُوْا اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ موصول اور صلہ حَتّٰی یعنی اَنْ تُقَاتِلُوْهُمْ کی وجہ سے محلاً مجرور ہیں اور حَتّٰی، تُقَاتِلُوْهُمْ سے متعلق ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْقِتَال اور اَلْمُقَاتَلَۃ: کسی انسان کا ایسے شخص کو قتل کرنے کی کوشش کرنا ہے جو اسے قتل کرنا چاہتا ہو۔

اَلتَّقَاتُلُ: دو دشمنوں کا باہم ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔

اِعْتِدَاء: حد سے تجاوز کرنا۔

شان نزول:

ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس برس نکلے جس میں آپ عمرہ کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کے اصحاب کی تعداد چودہ سو تھی۔ جب آپؐ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین نے آپؐ کو خانۂ کعبہ کی طرف جانے سے روک دیا۔ حدیبیہ کے مقام پر ہی آپؐ نے قربانیاں نحر کر دیں اور مشرکین سے اس بات پر صلح ہوگئی کہ اس برس تو آپ واپس چلے جائیں اور سال آئندہ آئیں گے اور تین دن کے لیے مکہ آپ کے لیے خالی کر دیا جائے گا، خانۂ کعبہ کا طواف کریں، جو چاہے (عبادت) کریں اور فوراً مدینہ واپس چلے جائیں۔

آئندہ برس جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب عمرہ قضا کے لیے آمادہ ہوئے تو اصحاب کو یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو قریش آپ سے کیا وعدہ پورا نہ کریں اور خانۂ کعبہ تک نہ پہنچنے دیں اور آپؐ سے جنگ کریں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حرم میں محترم مہینہ میں قتال کرنا ناپسند تھا چنانچہ خداوند

عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ربیع بن انس و عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے روایت ہے کہ قتال (جہاد) کے بارے میں یہ سب سے پہلی آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اور کوئی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرتا تو آپؐ اس سے جہاد کرتے اور جو ایسا نہیں کرتا آپؐ اس سے رک جاتے (جہاد) نہیں کرتے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ... اور اس آیت کو منسوخ کر دیا۔

تفسیر:

راہ خدا میں جہاد

خداوند عالم نے امر جہاد کی وضاحت کی اور مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَقَاتِلُوا یعنی اور تم اُن لوگوں (کفار) سے جہاد کرو فِي سَبِيلِ اللَّهِ اللہ کی راہ (دین) میں۔ دین وہ راستہ ہے جسے خداوند عالم نے بندوں کے لیے کھولا ہے تاکہ وہ اپنے معاملات میں اسے اختیار کریں اور اسی کی جانب اس نے انھیں دعوت دی ہے۔

الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (جو تم سے جنگ کرتے ہیں) کہا گیا ہے کہ قتال کرنے والوں سے قتال (جہاد) کا حکم دیا گیا ہے، عورتوں سے نہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ اہل مکہ سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آیت کو عموم پر حمل کرنا اولیٰ و بہتر ہے مگر جسے دلیل نے مستثنیٰ کر دیا ہو۔

وَلَا تَعْتَدُوا (مگر زیادتی نہ کرو) یعنی جنگ کرنے والوں سے قتال کرنے میں تجاوز نہ کرو، حد سے بڑھ نہ جاؤ ان لوگوں کی طرف جن سے قتال کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو تم سے قتال کرنے میں پہل نہ کرے اس سے قتال میں تجاوز نہ کرو کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (بلاشبہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

آیت کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ خداوند عالم تجاوز اور زیادتی کرنے والوں پر غضبناک اور ان سے ناراض ہے چونکہ یہ جملہ مذمت کے عنوان سے ہے۔ خدا بندوں سے محبت کرتا ہے اس کے معنی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

اس آیت کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں؟ تو بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ آیت

منسوخ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ ابن عباس و مجاہد سے مروی ہے۔

اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ عورتوں اور قیدیوں سے مخصوص کردی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اہل مکہ کے قتال سے مخصوص ہے۔

ہمارے ائمہ علیہم السلام سے روایت کی گئی ہے کہ مذکورہ بالا آیت، اس آیت کو نسخ کرنے والی ہے: كُفُّوا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (سورۂ نساء، آیت ۷۷؛ جن سے کہا گیا تھا کہ ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو)

اسی طرح یہ ارشاد الٰہی کہ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۱؛ ان سے لڑو جہاں بھی ان سے تمھارا مقابلہ ہو جائے) آیت وَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَدَعۡ اَذٰهُمۡ (سورۂ احزاب، آیت ۴۸؛ اور خبردار کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کیجئے گا اور ان کی اذیت کا خیال ہی چھوڑ دیجئے) کے لئے ناسخ ہے۔

❁❁❁❁❁

وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ وَاَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ اَخۡرَجُوۡكُمۡ وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوۡكُمۡ فِيۡهِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹۱﴾

ان سے لڑو جہاں بھی ان سے تمھارا مقابلہ ہو جائے۔ اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے۔ اور فتنہ، قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور مسجد الحرام کے قریب جب تک وہ تم سے لڑائی نہ کریں تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، مگر جب وہ وہاں پر لڑائی شروع کردیں تو تم بھی ان کی لڑائی کا جواب دو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ (۱۹۱)

الفاظ و معانی:

فِتۡنَةٌ کے لغوی معنیٰ اختبار و آزمائش کے ہیں۔ پھر وہ مختلف معانی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسے:

(۱) ابتلاء، ارشاد ہوتا ہے: فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (یعنی ہم نے تمھاری آزمائش کی آزمائش کرنے کی طرح)

(۲) عذاب، ارشاد ہوتا ہے: جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (سورۂ عنکبوت، آیت ۱۰؛ جب راہِ خدا میں کوئی تکلیف ہوئی تو لوگوں کے تکلیف پہونچانے کو عذابِ خدا جیسا قرار دے دیا)

(۳) دین سے روکنا، ارشاد ہوتا ہے: وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (سورۂ مائدہ، آیت ۴۹؛ اور اس بات سے بچتے رہیں کہ آپ کو بعض احکام الٰہی سے منحرف نہ کرنے پائیں)

اور موردِ تفسیر آیت میں فتنہ سے مراد اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ شرک ہے۔

شانِ نزول:

آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ صحابہ سے ایک شخص نے محترم مہینہ میں کافر کا قتل کر دیا جس پر کفار نے مومنین کی مذمت کی تو خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ دین میں فتنہ جو کہ شرک ہے مشرکین کے محترم ماہ میں قتل سے بہت بڑا ہے اگرچہ جائز نہیں ہے۔

تفسیر:

فتنہ قتل سے بھی بدتر!

خداوند عالم نے مومنین کو کافروں سے قتال کرنے کی کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاقْتُلُوْهُمْ کفار سے لڑو، حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ جہاں بھی تم انھیں پاؤ، وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے) یعنی تم انھیں مکہ سے اسی طرح نکال دو جس طرح انھوں نے تمھیں مکہ سے نکالا تھا۔ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فتنہ، قتل سے بھی بڑھ کر ہے) یعنی ان کا اللہ و رسول کے ساتھ شرک کرنا حرام مہینہ میں قتل کرنے سے بڑا (گناہ) ہے۔ کفر کو فتنہ کہا گیا ہے چونکہ کفر ہلاکت تک پہونچا دیتا ہے جس طرح فتنہ ہلاک کر دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ کفر فساد ہے جو آزمائش کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔

ارشادِ الٰہی: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ (اور مسجد الحرام کے قریب جب تک وہ تم سے لڑائی نہ کریں تم بھی ان سے جنگ نہ کرو) مومنین کو جنگ میں پہل کرنے سے نہی کی

ہے یا حرم میں جنگ کرنے میں پہل کرنے سے منع کیا ہے جب تک کہ مشرکین جنگ کا آغاز نہ کریں۔

فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ. مگر جب وہ وہاں پر تم سے لڑائی شروع کر دیں تو فَاقۡتُلُوۡهُمۡ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ تم بھی ان سے جنگ کرو کہ یہی ایسے کافروں کی سزا ہے۔

اس آیت میں کفار کے مکہ سے نکالنے کے واجب ہونے پر دلیل ہے جیسے یہ ارشاد کہ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ. اس بارے میں حدیث بھی وارد ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: لَا يَجۡتَمِعُ فِيۡ جَزِيۡرَةِ الۡعَرَبِ دِيۡنَانِ. (جزیرۂ عرب میں دو دین یکجا نہیں ہو سکتے)

❀❀❀❀❀

فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۲﴾
پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (۱۹۲)

الفاظ و معانی:

اِنۡتِهَاء: اِمۡتِنَاع (اپنے آپ کو روکنا) اور نَهۡي یعنی صیغۂ لَا تَفۡعَلۡ کے ذریعہ کسی کام سے روکنا اور منع کرنا روکنے والے کی ناگواری اور ناپسندیدگی کے ساتھ۔ امر صیغۂ اِفۡعَلۡ کے ذریعہ کسی کام کی دعوت دیا ان حکم دینے والے کے ارادہ کے ساتھ۔ غدیر یعنی تالاب اس لئے کہ وہ پانی کو بہنے سے روکتا ہے۔ نُہٰی مَنۡع کے مانند ہے۔ نِهَايَةُ الشَّيۡءِ: کسی چیز کی حد۔ نُهٰى، نُهۡيَة کی جمع ہے: عقل۔

مَغۡفِرَة: گناہ کا چھپانا اور ڈھانپنا ہے اس طرح سے کہ گویا واقع ہی نہیں ہوا ہے۔

تفسیر:

اگر باز آگئے۔۔۔!

فَاِنِ انۡتَهَوۡا (پھر اگر وہ باز آجائیں) یعنی توبہ کر کے اپنے کفر سے باز آجائیں۔ یہ مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

شرط کے مقدم ہونے کے باعث کلام میں اختصار کیا ہے اور اس امر پر دلالت ہے کہ عمداً قتل کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے چونکہ خداوند عالم نے وضاحت فرمائی ہے کہ وہ مشرک کی بھی توبہ قبول کرتا ہے

حالانکہ شرک قتل سے بڑا گناہ ہے۔

❀❀❀❀❀❀

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۹۳﴾

تم ان سے جہاد جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے علاوہ اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔ (۱۹۳)

الفاظ و معانی:

دِیْن یہاں پر یقین کے ساتھ اطاعت کے معنی میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دین سے مراد اسلام ہے۔ دین کے لغوی معنیٰ عادت کے ہیں۔ لفظ دین کو اطاعت کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (سورۂ یوسف، آیت ۷۶؛ وہ بادشاہ کی اطاعت کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں روک سکتے تھے) دین اسلام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے: إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۹؛ دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے) چونکہ شریعت کے لیے لازم ہے کہ اس میں مستقل عادت پر جاری رہے۔

تفسیر:

جنگ کب تک؟!

پھر خداوند عالم نے وجوب قتال کا مقصد بیان کرتے ہوئے مومنین سے خطاب فرمایا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ یعنی تم ان سے جہاد جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ یعنی شرک باقی نہ رہے۔ یہ ابن عباس قتادہ اور مجاہد سے مروی ہے۔ اسی چیز کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (اور دین خالص اللہ کے لیے ہو جائے) یعنی تا کہ اللہ کی اور اس کے امر کی اطاعت کی جائے اور کہا گیا ہے کہ اسلام اللہ کے لیے ہو جائے۔ یعنی یہاں تک کہ کفر باقی نہ رہے اور اسلام تمام

اسلام ہی غالب آجائے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا (پھر اگر وہ کفر سے باز آجائیں) اور اسلام پر ایمان لے آئیں تو فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (سمجھ لو کہ ظالموں کے علاوہ اور کسی پر دست درازی روا نہیں) ان پر کوئی سزا نہیں ہے، سزا تو ان کافروں پر قتل کی بنا پر ہوگی جو اپنے کفر پر باقی رہیں گے۔

قتل کو عدوان کا نام دیا ہے اس اعتبار سے کہ عذاب (سزا) عدوان (زیادتی وسرکشی) پر ہوتا ہے اور وہ ظلم ہے جس طرح ارشاد ہوا جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو اور برائی کا بدلہ اسی کے مانند برائی ہے اور اگر وہ تم پر عذاب وعقاب کریں تم بھی ان پر عذاب کرو اور یہ کلام کا ایک حصے سے دوسرے حصے سے مسجع یا قافیہ میں مشابہ ہونے پر بہترین طریقہ ہے جو معنوی طور پر حاصل ہے۔ گویا جملہ اس طرح ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا عَنِ الْعُدْوَانِ فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ، اگر یہ لوگ ظلم و زیادتی سے باز آجائیں تو زیادتی نہیں ہوگی مگر ظالموں پر۔ یہ وجہ قتادہ، ربیع اور عکرمہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ عدوان کے معنی جنگ میں پہل کرنا ہے۔ یہ قول مجاہد اور سدی سے منقول ہے۔

یہ آیت اس گذشتہ آیت کو منسوخ کرتی ہے جو مسجد الحرام میں جنگ نہ کرنے کو بیان کر رہی ہے جب تک کہ مشرکین جنگ کی ابتداء نہ کریں۔ اس لئے کہ اس آیت میں ان سے جنگ ہر حالت میں واجب ہے یہاں تک کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ یہ قول حسن اور جبائی سے مروی ہے۔ اور پہلی آیت میں ہم نے ابن عباس کے واسطے سے جو ذکر کیا وہ غیر منسوخہ ہے۔ لہٰذا یہ آیت ناسخ نہیں ہوگی بلکہ تاکید کنندہ ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر مشرکین حرم میں جنگ کا آغاز کریں تو ان سے جنگ کرنا واجب ہے یہاں تک کہ کفر کا خاتمہ ہو جائے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩٤﴾

ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے۔اور تمام حُرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا لہٰذا جوتم پر ظلم کرے تم بھی اس کی زیادتیوں کے مطابق اس کے ظلم کا جواب دو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ متقین کے ساتھ ہے۔(۱۹۴)

الفاظ ومعانی:

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جو چیزیں دوسرے مہینوں میں حلال ہیں اس ماہ میں حرام ہیں جیسے جنگ وغیرہ۔ اَلْحُرُمَات: حُرْمَة کی جمع ہے وہ یہ ہے کہ جس کی حفاظت واجب ہے اور اس کی توہین و بے عزتی کرنا حرام ہے۔

اَلْقَبِيْح: جس کا انجام دینا ممنوع ہے۔

اَلْحَلَال: جس کے انجام دینے کی اجازت ہے۔

اَلْقِصَاص: مظلوم کے لیے ظالم سے اس کے ظلم وزیادتی کا بدلہ لینا۔

تفسیر:

زیادتی کرنا منع ہے

پھر خداوند عالم نے محترم مہینے میں جنگ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ (ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے) یہاں پر شہر حرام سے مراد ماہ ذی القعدہ ہے جو صلح حدیبیہ کا سال ہے (جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حج کرنے سے مشرکین نے روک دیا تھا) مشہور محترم مہینے چار ہیں جن میں تین مہینے پے در پے ہیں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم، اور ایک الگ مہینہ ماہ رجب ہے جن میں جنگ کرنا حرام سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے قاتل کو دیکھتا تو اسے بھی کوئی گزند نہیں پہونچاتا تھا۔

ذی القعدہ اس لیے کہا گیا ہے کہ عرب اس مہینے میں قتال کرنے سے بیٹھ جاتے تھے (جنگ نہیں کرتے تھے) کہا گیا ہے کہ اس کی تقدیر میں دو وجہیں ہیں:

اول: مراد حرام مہینہ کا قتال یعنی قِتَالٌ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ، بِقِتَالِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ۔ مضاف (قتال) کو حذف کر کے مضاف الیہ (اَلشَّهْرِ الْحَرَامِ) اس کا قائم مقام ہوگیا۔

دوم: کہا گیا ہے کہ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ پہلے سال میں جو چھوٹ دی گئی ہے اس کے عوض کے عنوان سے ہے جس میں تم مکہ میں داخل ہوئے اور عمرہ کیا اور اپنی حاجت پوری کی، ۷ھ میں اور اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ سے مراد ذی القعدہ ۶ھ ہے جس میں تمھیں خانۂ خدا سے اور اپنے مقصد کے حصول سے روک دیا گیا تھا۔

وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ (اور تمام حُرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا) اس میں دو قول ہیں:

اول: حرام شدہ چیزیں خانۂ کعبہ میں حرام مہینہ میں داخل ہونے کا قصاص ہیں۔ مجاہد نے بیان کیا ہے چونکہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماہ ذی الحجہ میں حالت احرام میں بلد الحرام (مکہ) سے واپس کرنے پر فخر کر رہے تھے لہذا خداوند عالم نے آپ کو سال آئندہ ماہ ذی القعدہ میں ہی مکہ میں داخل فرمایا۔ اس طرح آپ نے اپنا عمرہ پورا کیا، ان کے اور اپنے درمیان حائل ہونے والا واقعہ بیان کیا۔ یہی معنی ہیں قتادہ، ضحاک اور عبدالرحمن بن زید کے۔ اسی طرح کی روایت ابن عباس، امام محمد باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

دوم: حرمات حرام ماہ میں قتال کرنے کا قصاص ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے مگر بطور قصاص۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ مشرکین عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپؐ نے ہمیں حرام مہینہ میں قتال سے روکا ہے؟ فرمایا: ہاں! مشرکین (پیغمبرؐ) کو محترم مہینے میں فریب دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے آپؐ سے قتال کیا لہذا خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یعنی اگر حرام مہینہ میں مشرکین نے کسی چیز کو حلال سمجھا ہے تو تم بھی انھیں کے مانند اسے حلال قرار دو۔ یہ زجاج اور جبائی کا قول ہے۔

خداوند عالم حرمات کو جمع لایا ہے اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ اس سے مہینہ کی حرمت، شہر کی حرمت اور احرام کی حرمت ہے اور کہا گیا ہے: تاکہ ہر حرمتوں کو شاملہ ہو جنھیں حلال سمجھا جانے لگے اور یہ مقابلہ کے عنوان سے ہے۔

فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ یعنی جو تم پر ظلم کرے فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ یعنی تم بھی ان کی زیادتیوں کا بدلہ دو اور ان سے مقابلہ کرو انھیں کی طرح۔ دوسری اعتداء درحقیقت یہ زیادتی نہیں ہے پھر بھی اسے اعتداء کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ تو مقابلہ کے عنوان سے ہے اور اسے گذشتہ اعتداء کے مثل

قرار دیا ہے جبکہ پہلی اعتداء ظلم اور دوسری اعتداء عدل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جنس میں اور استحقاق کی مقدار میں اور نقصان دہ ہونے میں اسی کے مانند نقصان دہ ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البتہ اللہ سے ڈرتے رہو) جس کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے اور اس سے تمھیں روکا اور نہی فرمائی ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (اور جان لو کہ بے شک اللہ متقین کے ساتھ ہے ان کی نصرت کے ذریعہ یا اس سے مراد ہے کہ اللہ کی نصرت و مدد ان کے ساتھ ہے اور مَعَ کے لغوی معنی مکان یا زمان میں مصاحبت کے ہیں۔

یہ آیت اس بات پر دلالت ہے کہ جو کسی چیز پر غصب کرتا ہے اور اسے ضائع کرتا ہے اس پر اسی کے مانند چیز کو واپس دینا لازم ہے اور مِثْل ان چیزوں میں ہوتا ہے جن میں ان کے مانند چیزیں پائی جاتی ہیں اور کبھی معنوی لحاظ سے مثل ہوتا ہے جیسے ان چیزوں کی قیمتیں جن کا مثل نہیں ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کا طریقہ اختیار کرو بلاشبہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۱۹۵)

الفاظ و معانی:

اِنْفَاق: کسی چیز کا اپنی ملکیت سے نکال کر دوسرے کی ملکیت میں دینا۔ اگر ختم اور ضائع کرنے کے لیے نکالا تو انفاق نہیں کہا جائے گا۔

اِلْقَاء: کسی چیز کو نیچے ڈالنا۔

تَهْلُكَة اور هَلَاك ایک ہی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ تَهْلُكَة مصدر ہے جو ہلاکت کے معنی میں ہے۔ هَلَاك دراصل کسی چیز کا ضائع اور برباد ہونا ہے، کسی چیز کا اس طرح ہو جانا ہے کہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وہ کہاں ہے؟ اسی وجہ سے کافر کو هَالِك اور میت کو هَالِك کہا جاتا ہے۔ جس پر عذاب کیا جاتا ہے اسے بھی هَالِك کہتے ہیں۔

اِحْسَان: دوسرے تک اچھا نفع پہنچانا۔ ہر اچھا کام کرنے والا مُحْسِن نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ قرض کا پورا حق لینے والا محسن نہیں کہلائے گا اگرچہ اس کا عمل حسن ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ اللہ سزا دینے کی بنا پر

محسن ہے۔ اگرچہ سزا حسن ہے، ہم نے نفع حسن (اچھے نفع) کی شرط لگائی چنانچہ اگر کوئی کسی دوسرے شخص کا برا کرے اور اسے نقصان پہنچائے تو اسے اس پر احسان کرنے والا نہیں کہا جائے گا۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی بِاَیۡدِیۡکُمۡ میں باء زائدہ ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: جَذَبۡتُ الثَّوۡبَ وَ بِالثَّوۡبِ، عَلَّمۡتُهٗ وَ عَلَّمۡتُ بِهٖ، شاعر نے کہا:

وَ لَقَدۡ مَلَأۡتُ عَلٰی نُصَیۡبٍ جِلۡدَهٗ بِمَسَاءَةٍ اِنَّ الصَّدِیۡقَ یُعَاتَبُ

یعنی مَلَأۡتُ جِلۡدَهٗ مَسَاءَةً۔ باء زائدہ ہے۔

کہا گیا ہے کہ باء زائدہ نہیں ہے جملہ دو وجہوں میں سے قاعدہ کے مطابق ہے:

(۱) ہر فعل متعدی کہ جب اس کے بارے میں کنایہ کیا جائے یا اسے مصدر فرض کیا جائے تو اس پر باء داخل ہوتا ہے: آپ ضَرَبۡتُهٗ کہتے ہیں پھر اسی کو کنایہ میں بیان کرتے ہیں تو فَعَلۡتُ بِهٖ کہتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ ضرب کو واقع کیا۔ پس باء افعال متعدی کے قانون کے مطابق آیا ہے۔

(۲) جب مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک مت کرو تو باء داخل ہوتا ہے تا کہ اس مراد پر دلالت کرے اور یہ مراد اس کے برخلاف ہے کہ اس نے اپنے آپ کو دوسروں کے ہاتھوں ہلاک کیا ہو۔

تفسیر:

راہ خدا میں انفاق

جب خداوند عالم نے اپنی راہ میں قتال (جہاد) کو واجب فرمایا تو اس کے ساتھ ہی اس میں انفاق کا بھی ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو) یعنی جہاد اور دین کی راہ میں اپنے مال میں سے خرچ کرو۔ ہر خیر اور نیکی کی راہ جس کا حکم خداوند عالم نے دیا ہے وہ سَبِیۡلُ اللّٰهِ (خدائی راستہ) ہے چونکہ سَبِیۡل راستہ کے معنیٰ میں ہے۔

لہٰذا سَبِیۡلُ اللّٰهِ یعنی اللہ کی طرف اس کی رحمت اور اس کے ثواب کا راستہ ہے۔ البتہ لفظ سبیل کا استعمال کثرت سے جہاد کے معنیٰ میں ہوتا ہے اس لیے کہ راہ خدا میں جان دینا یہ خود سخاوت کی آخری منزل ہے۔

جہاد وہ مرحلہ ہے جس میں انسان اپنی جان کو خطرے میں ڈالتا ہے اور یہ اس کے لیے ایک شرف و امتیاز ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) اس فقرہ سے مراد کیا ہے اس کی متعدد وجوہات بیان کی گئی ہیں:

اول: راہ خدا میں انفاق کو ترک کر کے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاک میں مت ڈالو اس طرح دشمن تم پر غالب آجائے گا۔ یہ ابن عباس اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

دوم: بخشش و مغفرت سے مایوس ہو کر گناہ مت کرو۔ یہ براء بن عازب اور عبیدۃ السلمانی کا قول ہے۔

سوم: دشمن پر غلبہ اور دفاعی طاقت کے بغیر خود کو جنگ کی مشقت میں مبتلا مت کرو۔ یہ ثوری کا قول ہے جسے بلخی نے اختیار کیا ہے۔

چہارم: انفاق میں اسراف نہ کرو جس کا نقصان خود تم کو ہوتا ہے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔ اس سے ملتی جلتی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جو شخص اپنے پاس موجود ہر چیز کو راہ خدا میں انفاق کر دے اس نے نیکی نہیں کی ہے اور نہ ہی وہ کامیاب ہوا ہے اس لئے کہ خداند عالم کا ارشاد ہے: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو)

وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ، نیکی کرو بے شک خداوند عالم نیکی یعنی میانہ روی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ کے متعلق حسن ظن رکھو کہ وہ تمھارے ساتھ بہتر ہی کرے گا۔

عبدالرحمن بن زید نے کہا ہے: محتاج و ضرورت مند کے ساتھ بار بار نیکی کرو۔

آیت کو جملہ مذکورہ بالا وجوہات اور صورتوں پر حمل کرنا بہتر و اولی ہے۔ اس میں کسی طرح کی منافات نہیں ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ ایسا قدم اٹھانا حرام ہے جس سے جان جانے کا خوف ہو۔ اسی طرح اس بات پر بھی دلالت موجود ہے کہ جب جان کا خطرہ ہو تو امر بالمعروف کو ترک کرنا جائز ہے اس لیے کہ ایسی صورت میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اسی طرح آیت میں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ جب امام کو اپنی جان کا یا مسلمانوں کی جان کا خطرہ ہو تو کفار اور باغیوں سے صلح کرنا جائز ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کیا۔ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

ے شخین میں اور امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے اس وقت صلح فرمائی جب آپ کی حکومت منتشر ہو گئی تھی اور آپ کو اپنی جان اور اپنے شیعوں کی جان پر خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

اگر ہم پر اعتراض کیا جائے کہ صرف امام حسین علیہ السلام نے جنگ کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے اس عمل کے دو احتمالات ہیں:

اول: آپؑ کو گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کی قربت کے سبب یہ لوگ آپؑ سے جنگ نہیں کریں گے۔

دوم: دوسری وجہ یہ کہ آپؑ کو گمان تھا کہ اگر آپ نے ان سے جنگ نہیں کی تو ابن زیاد ملعون آپ کو تڑپا تڑپا کر قتل کر ڈالے گا جیسا کہ اس نے آپ کے ابن عم مسلم بن عقیل علیہ السلام کے ساتھ کیا۔ لہٰذا عزت نفس کے ساتھ شہید ہو جانا اور جہاد کرنا آپ کے لیے زیادہ آسان تھا۔

❀❀❀❀❀

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

اللہ کی خوشنودی کے لیے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔ اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے اسے اللہ کی جناب میں پیش کردو۔ اور اپنے سروں کو نہ مونڈو جب تک قربانی اپنی جگہ پر پہنچ نہ جائے۔ لہٰذا اگر تم میں سے کوئی مریض ہو، یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔ پھر جب تمھیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص

حج کا زمانہ آنے سے پہلے عمرہ کا فائدہ اٹھائے (عمرہ تمتع کرے) وہ حسبِ مقدور قربانی دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو حج کے زمانے میں تین دن روزے رکھے اور سات روزے گھر پہنچ کر رکھ لے یہ مکمل دس (روزے) ہو گئے یہ (رعایت) ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجد الحرام کے قریب نہ ہوں، اللہ کے (ان) احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔(۱۹۶)

الفاظ و معانی:

اَلْاِحْصَار کے معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں۔ اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے جسے خوف اور مرض تصرف سے روک دے۔ حَصَر گرفتار ہونے والے شخص کو بھی کہتے ہیں۔ بخیل کو بھی حَصِیْر کہتے ہیں۔ اَلْحَصُوْر اس شخص کو کہتے ہیں جسے عورتوں میں رغبت نہ ہو۔

اَلْهَدْیُ کے سلسلہ میں دو قول ہیں:

اول: اَلْهَدِیَّة سے ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے: اَهْدَیْتُ الْهَدْیَ اِلٰی بَیْتِ اللّٰهِ اِهْدًا یعنی اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے لیے قربانی پیش کی۔

دوم: یہ هِدَایَة سے مشتق ہے جس کے معنی رشاد تک کھینچ کر لے جانے کے ہیں۔ قربانی کو هَدْی اس لئے کہا گیا ہے کہ اسے حرم تک کھینچ کر لے جایا جاتا ہے جو اس کی منزل مقصود ہے۔

اَلْهَدْی کا واحد هَدِیَّة ہے۔

اَلْحَلْق: سر منڈانا۔ مَحَلِّق معنی میں محلِ حلق کا نام ہے۔ جب پرندہ ہوا میں بلند ہو تو اسے حَلَقَ الطَّائِرُ فِی الْهَوَاء کہتے ہیں۔ اَلْحَلْق کھانے اور پینے کے مقام کو بھی کہتے ہیں۔

اَلنُّسُك نَسِیْكَة کی جمع ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ جس جانور بھی اللہ کے لیے ذبح کیا جائے اسے نَسِیْكَة کہیں گے۔ اَلنُّسُك کے معنی عبادت کے بھی ہیں۔ اسی سے رَجُلٌ نَاسِكٌ بنتا ہے یعنی عبادت گذار ہے۔

اَلتَّمَتُّع: لذت حاصل کرنا۔ اَهْلُ الرَّجُل یعنی آدمی کی زوجہ ہے۔ اَلتَّاَهُّل یعنی شادی کرنا۔ اَهْلُ الرَّجُل یعنی اس کے خاص ترین افراد۔ اَهْلُ الْبَیْتِ: مکان کے باشندے۔ اَهْلُ الْاِسْلَام: اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اَهْلُ الْقُرْآن قرآن کی تلاوت کرنے والے اور اس کے فرائض کو بجا لانے والے۔

ترکیب:

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ میں مَا مرفوع ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: فَعَلَيْهِ مَا اسْتَيْسَرَ - یہ بھی ممکن ہے کہ محلاً منصوب ہو اور اس کی تقدیر اس طرح ہو: فَاهْدُوا مَا اسْتَيْسَرَ - رفع دینا زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ اس کے ساتھ بہت سے جملے ہیں جیسے فَفِدْيَةٌ مِنَ اَيَّامٍ - فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ۔ فِي الْحَجِّ مصدر سے متعلق ہے۔ وہ خبر نہیں ہے۔ وہ خبر کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر مرفوع آیا ہے۔

تفسیر:

حج و عمرہ کے اعمال

اس آیت میں خداوند عالم نے فریضہ جہاد کے بعد حج وعمرہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (اللہ کی خوشنودی کے لیے حج اور عمرہ کو پورا کرو) یعنی دونوں (حج وعمرہ) کو ان کے مناسک، حدود و احکام اور جو کچھ ان میں جو کچھ ہے سب کو بجالاؤ۔ یہ ابن عباس ومجاہد کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو کچھ ان دونوں میں موجود ہے اسے آخر تک بجالاؤ۔ یہی بات امیر المومنین علی علیہ السلام، امام علی بن الحسین علیہما السلام، سعید بن جبیر، مسروق اور سدی سے مروی ہے۔

ارشاد الٰہی: لِلّٰهِ حج وعمرہ کے ذریعہ قربت الٰہی کا قصد وارادہ کرو! ہمارے یہاں عمرہ، حج کی طرح واجب ہے۔ شافعی بھی (اپنی کتاب) الجدید میں اسی بات کے قائل ہیں۔ اہل عراق نے کہا ہے کہ عمرہ مستحب ہے۔

افعال حج میں سے ارکان:

ارکان حج یہ چیزیں ہیں: نیت، احرام، وقوف عرفہ، وقوف مشعر، طواف زیارت اور صفا ومروہ کے درمیان سعی۔

وہ فرائض جو حج کے ارکان نہیں ہیں: تلبیہ، دو رکعت نماز طواف، طواف النساء اور اس کی دو رکعت نماز۔ حج کے مستحبی افعال اس کے متعلق لکھی گئی کتابوں میں موجود ہیں۔

عمرہ کے ارکان یہ ہیں: نیت، احرام، طواف زیارت اور سعی ہے۔

وہ احکام جو ارکان نہیں ہیں: تلبیہ، دو رکعت نماز طواف، طواف النساء اور اس کی دو رکعت نماز۔

فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ سے مراد کیا ہے اس بارے میں دو اقوال ہیں:

اول: تمھارے لیے دشمن اور بیماری کا خوف مانع ہو اور اس سے تم رک جاؤ۔ یہ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور عطا سے مروی ہے۔ یہی بات ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے۔

دوم: کوئی ظالم وجابر روکنے والا تمھیں روک دے۔ یہ مالک کا قول ہے۔

فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِ یعنی قربانی میں جو تمھارے لئے آسان اور میسر ہو وہ تمھارے اوپر فرض ہے یا جب تم حالت احرام سے باہر آنا چاہو تو اس وقت جو بھی قربانی میسر آئے اسے قربان کردو۔ قربانی تین طرح کی ہیں: اونٹ، گائے، بکری۔ ان سب میں سب سے آسان بکری ہے۔ علی و ابن عباس، حسن وقتادہ سے یہی مروی ہے۔ ابن عمر و عائشہ سے روایت ہے: اونٹ اور گائے میں سے جو بھی میسر ہو نہ ان کے علاوہ۔ پہلا قول صحیح ہے۔

وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥ (اور اپنے سروں کو نہ مونڈو جب تک قربانی اپنی جگہ پر پہنچ نہ جائے) یعنی تم حالت احرام سے باہر نہیں آسکتے جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر پہنچ نہ جائے۔ نحر ہو جائے یا ذبح ہو جائے۔

قربانی کے محل و مقام کے سلسلہ میں اختلاف ہے، اس میں دو قول ہیں:

اول: حرم ہے۔ اگر قربانی کے روز اسے وہاں ذبح کر دیا تو وہی محل ہو جائے گا۔ یہ ابن عباس، ابن مسعود، حسن اور عطا کا قول ہے۔

دوم: وہ جگہ ہے جہاں پر اسے روکا گیا ہے اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں اپنی قربانیاں نحر کردی تھیں اور اصحاب کو بھی یہی حکم دیا تھا، چنانچہ انھوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ حدیبیہ کا حصہ حرم نہیں ہے۔ یہ مالک کا قول ہے۔

پہلا حکم بیماری کی وجہ سے رک جانے والے کا ہے۔ دوسرا حکم دشمن کی وجہ سے روک دیئے جانے والے کا ہے اور اگر احرام حج ہو تو قربانی کے مقام یوم نحر (عید الاضحیٰ) منیٰ ہے اور اگر احرام عمرہ ہے تو اس کی جگہ مکہ ہے۔

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ بِهِۦٓ أَذٗى مِّن رَّأۡسِهِۦ (لہٰذا اگر تم میں سے کوئی مریض ہو، یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو) یعنی تم میں سے کوئی ایسے مرض میں مبتلا ہو جس میں علاج کی غرض سے سر منڈانا ضروری ہو

یا سر میں جوؤں کے سبب اذیت ہو تو قربانی کی شرط کے ساتھ اس کا سر منڈانا مباح ہے۔ ہمارے علماء نے روایت کی ہے یہ آیت کعب بن عجرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے سر میں جوئیں ہو گئی تھیں۔

ارشاد الٰہی ہے: فَفِدْيَةٌ یعنی اگر اس عذر کی وجہ سے سر منڈاتا ہے تو اس پر فدیہ ہے یعنی اس کے بدلے اور بطور جزا جو اس کا قائم مقام ہو خواہ اس کا تعلق روزے سے ہو یا صدقہ یا ذبیحہ ہو۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے کہ تین روزے رکھے گا، چھ مساکین کو صدقہ دے گا، دس مساکین کی بھی روایت وارد ہوئی ہے اور بکری کی قربانی کرنے کی بھی روایت وارد ہوئی ہے۔ اس بارے میں اختیار ہے۔

ارشاد الٰہی: فَإِذَا أَمِنتُمْ (پھر جب تمھیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ)) یعنی جب تم دشمن اور مرض اور تمام موانع سے محفوظ و مامون ہو جاؤ۔ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (تو جو شخص حج کا زمانہ آنے سے پہلے عمرہ کا فائدہ اٹھائے (عمرۂ تمتع کرے) وہ حسبِ مقدور قربانی دے) پس اس پر جس قدر بھی میسر ہو قربانی واجب ہے۔ تمتع فرض و لازم ہے ہمارے نزدیک اس شخص کے لیے جو مسجد الحرام میں حاضر نہ ہو اور مسجد الحرام کا حاضر وہ شخص ہے جو مکہ سے چاروں طرف میں بارہ میل کے فاصلے پر ہو۔ جو اس حد سے خارج ہو وہ حاضرین میں سے نہیں ہوگا۔

تَمَتُّعٌ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حج کے مہینے میں ہی حج کا احرام باندھے، پھر مکہ میں داخل ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، تقصیر بجا لائے اور احرام سے باہر آ جائے۔ پھر مسجد الحرام سے حج کے لیے دوبارہ احرام باندھے، عرفات کے لیے نکل پڑے، پھر مشعر کے لیے روانہ ہو اور حج کے اعمال بجا لائے جو کتب میں مذکور ہیں۔ مذکورہ بالا اعمال میں سے بعض اعمال کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حج تمتع کے لیے قربانی واجب ہے بغیر کسی اختلاف کے، ظاہر قرآن کے مطابق اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ ہدی نسک (قربانی) ہے یا جبران (کفارہ) ہے؟ ہم شیعوں کے نزدیک یہ نسک ہے۔

فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ (اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو حج کے زمانے میں تین دن روزے رکھے) یعنی جو شخص قربانی نہ حاصل کر سکے اور نہ ہی اس کے پاس قربانی کی رقم ہو تو اس پر حج میں تین روزے واجب ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تین روزے روز ترویہ سے پہلے، روز ترویہ اور روز عرفہ ہیں۔ اگر ماہ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں روزہ رکھے تو یہ جائز ہے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر روز ترویہ اور روز عرفہ روزہ

رکھے تو ایام تشریق گذرنے کے بعد ایک دوسرے دن میں ایک روزہ کی قضا کرے گا۔ اگر اس سے ترویہ کے دن کا روزہ چھوٹ جائے تو ایام تشریق کے بعد پے در پے تین روزے رکھے گا۔

وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ (اور سات روزے گھر پہنچ کر رکھ لے) یعنی جب تم اپنے وطن اور اہل تک واپس پلٹ جاؤ تو سات روزے رکھو۔ اسی چیز کو قتادہ اور عطا نے بیان کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم منیٰ سے پلٹ جاؤ تو سات روزے راستے میں رکھو۔ یہ مجاہد کا قول ہے، ہمارے نزدیک پہلا قول درست ہے۔

ارشاد الٰہی: تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ یہ مکمل دس (روزے) ہو گئے۔ اس میں متعدد اقوال ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ قربانی کو مکمل کرنے والا جب اس کا بدل واقع ہو اس کا ثواب مکمل ہو گا۔ یہ حسن کا قول ہے، یہی چیز امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، اسی کو جبائی نے اختیار کیا ہے۔

دوم: ابہام اور شک دور کرنے کے لیے تا کہ یہ گمان پیدا نہ ہو کہ واؤ اَوۡ (یعنی یا) کے معنی میں ہے کہ اس طرح ہوتا گویا کہا جا رہا ہے: فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ اَوۡ سَبۡعَةٌ اِذَا رَجَعۡتُمۡ. حج میں تین دن کے روزے یا سات دن کے جب تم پلٹ جاؤ۔ چونکہ جب اَوۡ کو واؤ کے معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے تو جائز ہے کہ واؤ کو اَوۡ کے معنی میں استعمال کیا جائے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (سورۂ نساء، آیت ۳؛ اور اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمھیں پسند آجائیں ان میں سے دو، تین اور چار کے ساتھ نکاح کر لو۔۔۔) یہاں پر واؤ بمعنی اَوۡ ہے۔ لہٰذا اس التباس (شک) کو برطرف کرنے کے لیے تلك عشرة كاملة کا ذکر کیا گیا۔ یہ زجاج اور ابوالقاسم بلخی کا قول ہے۔

سوم: كَامِلَةٌ تاکید کے لیے کہا گیا ہے جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

ثَلَاثٌ وَاثۡنَتَانِ فَهُنَّ خَمۡسٌ وَ سَادِسَةٌ تَمِيۡلُ اِلٰى تَمَامِ

ارشاد الٰہی: ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (یہ (رعایت) ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجد الحرام کے قریب نہ ہوں) جس کا ذکر حج تمتع کے عمرہ میں گذر چکا ہے، یہ حکم اہل مکہ اور ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو ان کے حکم میں شامل ہیں۔ (یہ حکم) اس شخص کے لیے ہے جو مکہ میں حاضر وموجود نہ ہو۔ جس کے اور مکہ کے درمیان ہر جانب سے بارہ میل سے زیادہ کا فاصلہ ہو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ کے

(دین) کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو) جن چیزوں کے متعلق اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے اور جن سے تمھیں روکا ہے۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے) اپنی نافرمانی کرنے والوں کو۔

الحدیث:

معاویہ بن عمار نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں دس برس تک قیام فرمایا اور حج نہیں کیا پھر آپ پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاَذِّن فِي النَّاسِ (سورۂ حج، آیت ۲۷) آپ نے اعلان کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ باآواز بلند اعلان کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سال حج کرنے جا رہے ہیں۔ اس بارے میں مدینہ میں موجود بلندیوں پر بسنے والوں اور اعراب (صحرا نشینوں) کو معلوم ہو گیا اور تمام لوگ جمع ہو گئے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت حج کے لیے روانہ ہوئے جب ذی القعدہ میں چار روز باقی تھے۔ جب آپ وادی ذی الحلیفۃ میں پہنچے تو زوال کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے غسل فرمایا اور مسجد شجرہ پہنچے، وہاں آپ نے نماز ظہر ادا کی اور حج کا احرام باندھا۔ پھر آپ روانہ ہو گئے۔

امام علیہ السلام نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعی سے فراغت کے بعد مروہ پر قیام فرمایا اور لوگوں کی جانب متوجہ ہو کر اللہ کی حمد و ثنا کی اور فرمایا: یہ جبرئیل علیہ السلام ہیں (آپ نے پشت کی جانب اشارہ کیا) جنھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں حکم دوں کہ جو قربانی نہیں لایا ہے وہ محل ہو جائے اگر میرے ساتھ بھی یہی ہوتا جو پہلے ہو چکا ہے تو میں بھی وہی کرتا جس کا میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ لیکن میں قربانی لے کر آیا ہوں قربانی لانے والے کے لیے مناسب و سزاوار نہیں ہے کہ وہ محل ہو جائے یہاں تک کہ وہ قربانی اس کے مقام تک پہنچ جائے۔

ایک شخص نے آپ سے عرض کی: ہم حج کے لیے برآمد ہوں اور ہمارے سروں سے پانی کے قطرات ٹپک رہے ہوں؟ آپ نے فرمایا: تم اس پر ہرگز ایمان نہیں لاؤ گے۔

پھر آنحضرت کے سامنے سراقہ بن مالک بن جعشم الکنانی کھڑا ہو کر کہنے لگا: اللہ کے رسول! آپ نے ہمیں ہمارا دین سکھایا گویا آج ہی ہم پیدا ہوئے ہیں، آپ نے ہمیں جو حکم فرمایا ہے کہ یہ (اس) سال کے لیے ہے یا مستقبل کے لیے بھی؟ آنحضرت نے فرمایا: یہ ہمیشہ قیامت تک کے لیے ہے۔ پھر آپ نے اپنی انگشت مبارک ایک دوسرے کے اندر داخل فرمائیں اور فرمایا: میں نے عمرہ کو حج میں قیامت تک کے لیے داخل وشامل کیا۔

تعلیم فرمائی، ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ظہر وعصر کی نماز پڑھیں۔ پھر مقام وقوف کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں وقوف کیا۔لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناقہ کے اردگرد وقوف کرنے لگے تو آپ نے ناقہ کو وہاں سے دور کیا تو لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تو آپ نے فرمایا: اے لوگو! میرا ناقہ جہاں کھڑا ہے صرف یہی جگہ وقوف کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہ پورا علاقہ جائے وقوف ہے۔ پھر آپؐ نے موقف کی جانب اشارہ فرمایا اور لوگ متفرق ہو گئے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی عمل مزدلفہ (مشعر الحرام) میں بھی انجام دیا اور قیام فرمایا یہاں تک کہ طلوع آفتاب ہو گیا۔ پھر آپؐ نے کوچ فرمایا اور لوگوں کو کوچ کا حکم دیا یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچے جو مشعر الحرام ہے وہاں آپ نے نماز مغرب وعشاء ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ ادا کیں، پھر وہیں قیام کیا یہاں تک کہ نماز صبح پڑھی اور بنی ہاشم کے ضعیف افراد نے رات میں عجلت کی۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ جمرۂ عقبہ کی رمی نہ کریں جب تک کہ آفتاب طلوع نہ ہو جائے۔

جب دن روشن ہو گیا تو آپؐ نے کوچ فرمایا یہاں تک کہ میدان منیٰ پہنچے اور جمرۂ عقبہ کی رمی کی، جن قربانیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہمراہ لائے تھے جو چونسٹھ (۶۴) یا چھیاسٹھ (۶۶) یا چھیاسی تھیں اور علی علیہ السلام کے ہمراہ چونتیس یا چھتیس تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھیاسٹھ اونٹ نحر کیے اور حضرت علی علیہ السلام نے چونتیس نحر کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قربانی سے گوشت کا ایک حصہ لینے کا حکم دیا، جسے پتھر کی ہانڈی میں ڈال کر پکایا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام نے تناول کیا اور اس کے شوربے کو بھی استعمال کیا۔ قصاب کو قربانی کی کھالیں، پالان اور قلائد (گلے کی رسیاں وغیرہ) نہیں دی گئیں، انھیں صدقہ کیا گیا۔ پھر آپ نے حلق کیا (سر منڈایا) خانۂ کعبہ کی زیارت کی اور منیٰ کی طرف واپسی کی اور وہاں قیام کیا یہاں تک کہ ایام تشریق کا آخری روز تھا، پھر شیاطین کو کنکریاں ماریں اور وہاں سے کوچ کیا یہاں تک کہ ابطح (مقام) پر پہنچے۔ حضرت عائشہ نے عرض کی کہ اللہ کے رسول! آپؐ کی عورتیں حج وعمرہ کے ساتھ باہم واپس پلٹ جائیں اور میں صرف حج کر کے واپس ہوں اور (مقام) ابطح میں قیام کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ہمراہ عبدالرحمن بن ابوبکر کو تنعیم کی جانب بھیجا۔ حضرت عائشہ نے عمرہ کی نیت کی، واپس آ کر خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز پڑھی، صفا ومروہ کے درمیان سعی کی، پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور آپ اسی روز روانہ ہو گئے۔ نہ تو داخل

مسجد ہوئے، نہ ہی خانہ کعبہ کا طواف کیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی بلندی سے عقبۃ المدنیین (مدنیین گھاٹی) میں داخل ہوئے اور مکہ کی پست جگہ ذی طویٰ سے برآمد ہوئے۔

❁❁❁❁❁

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں، لہٰذا جو شخص ان مقرّرہ مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے آگاہ رہنا چاہیے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور تم جو بھی نیک کام انجام دو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ اور (سفرِ حج کے لیے) زادِ راہ ساتھ لے جاؤ یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ لہٰذا اے عقل مند لوگو! میری نافرمانی سے بچو۔ (۱۹۷)

قرأت:

ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے فَلَا رَفَثٌ وَلَا فُسُوْقٌ رفع کے ساتھ اور وَلَا جِدَالَ فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے ان تینوں کلمات کو رفع وتنوین کے ساتھ اور بقیہ قراء نے تینوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے ان تینوں کلمات کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح فتحہ کے ساتھ پڑھا معنیٔ مقصود سے بہت زیادہ مناسبت رکھتا ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ فتحہ دینا ہر طرح کے رفث و فسوق کی نفی کرنا ہے جیسا کہ خدا نے جب فرمایا ہے: لَا رَيْبَ تو یہ کہہ کہ طرح کے ریب وشک کی نفی کر دی۔ جب رفع اور تنوین دیں گے تو گویا ایک طرح کے رفث وفسوق کی نفی کریں گے جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ سیبویہ اس بات کے قائل ہیں کہ جب یہ کہا جائے کہ: لَا غُلَامٌ عِنْدِيْ وَ لَا جَارِيَةٌ تو یہ اس شخص کے جواب میں ہے جو یہ سوال کرتا ہے کہ اَغُلَامٌ عِنْدَكَ اَمْ جَارِيَةٌ؟ (آپ کے پاس ایک غلام ہے یا ایک

کثیر) پس فتحہ زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ نفی عام اور سب کو شامل ہے اور مراد بھی یہی ہے۔
اور جن قراء نے رفع دیا ہے تو انہیں گفتگو اور مفہوم سے معلوم ہے کہ مراد رفث واحد نہیں ہے بلکہ رفث کی ساری قسمیں مراد ہیں اور نفی واحد کی واقع ہوتی ہے جو حقیقت میں ہر طرح کے رفث کی نفی ہے اگر چہ اس میں اسم لا کے ساتھ مبنی واقع نہیں ہوا ہے جیسے: مَارَجُلٌ فِی الدَّارِ (گھر میں ایک آدمی بھی نہیں ہے)

الفاظ ومعانی:

اَلرَّفَث کے لغوی معنی فحش گفتگو کرنے کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ اَلرَّفَثُ بِالْفَرْجِ کے معنی جماع کے ہیں اور اَلرَّفَثُ بِاللِّسَان کے معنی جماع کا وعدہ کرنے کے ہیں اور اَلرَّفَثُ بِالْعَیْن کے معنی جماع کے لیے اشارہ چشم کے ہیں۔
اَلْفُسُوق کے معنی اطاعت سے باہر ہونے کے ہیں۔
لغت میں اَلْجِدَال، مُجَادَلَة، مُنَازَعَة، مُشَاجَرَة اور مُخَاصَمَة ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔

ترکیب:

اَلْحَجُّ مبتدا ہے اَشْهُرٌ اس کی خبر ہے۔ گویا اس طرح ہے: اَشْهُرُ الْحَجِّ اَشْهُرٌ مَعْلُوْمَاتٌ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی حج نہیں ہے سوائے ان مہینوں کے۔ اس ترکیب کی روشنی میں لفظ اَشْهُر ظروف سے باہر نکل گیا ہے۔
اس بنا پر معنیٰ یہ ہے کہ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ حج ان مہینوں میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وسعت مجاز کی بنا پر حج کو اَشْهُر قرار دیا جائے اس لئے کہ حج انہیں مہینوں میں واقع ہوتا ہے اور اس کو انجام دینے والوں کی جانب سے اس کی کثرت ہوتی ہے جیسا کہ خنساء نے کہا:

تَرْتَعُ مَارَتَعَتْ حَتّٰى اِدَّكَرَتْ فَاِنَّمَا هِیَ اِقْبَالٌ وَّ اِدْبَارٌ

چرتی جاتی ہے یہاں تک کہ اسے یاد آجاتا ہے کہ یہ تو اقبال وادبار (آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا) ہے۔
شاعرہ نے چرنے کو اقبال وادبار قرار دیا ہے اس لئے کہ چرنے میں اقبال (آگے بڑھنا) وادبار (پیچھے ہٹنا) بہت زیادہ ہوتا ہے۔

فَلَا رَفَثَ جب فتحہ دیں گے تو وہ مبنی کی بنا پر ہوگا اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور جب رفع دیں گے تو مبتدا اور اس کے بعد مرفوع کو مرفوع باقی رکھیں گے تو جائز ہے کہ وہ محل پر عطف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ لَا لَیْسَ کے معنیٰ میں ہو جیسا کہ سعد کے اس شعر میں ہے:

مَنْ صَدَّ عَنْ نِیْرَانِهَا فَاَنَا ابْنُ قَیْسٍ لَا بَرَاحُ

(جس نے جنگ کی آگ کو روک دیا تو یاد رکھو کہ میں قیس کا بیٹا ہوں براح نہیں ہوں)

فاء کے بعد جو واقع ہوا ہے وہ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ فاء کے بعد والے فعل مضارع کی جگہ آیا ہے اور فاء اپنے مابعد کے ساتھ محلاً مجزوم ہے یا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ شرط مبنی کا جواب ہے۔

تفسیر:

محرمات احرام

اَلْحَجُّ (حج کے) اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَات (مہینے سب کو معلوم ہیں) یعنی معین مہینے ہیں جن میں تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے تبدیلی و تغیر جائز نہیں ہے، جس طرح ان دونوں میں تغیر و تبدیلی تاخیر کرنے والے کرتے تھے، جن کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے: اِنَّمَا النَّسِیْءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ، (سورۂ توبہ، آیت ۳۷؛ محترم مہینوں میں تقدیم و تاخیر کفر میں ایک قسم کی زیادتی ہے)

حج کے مہینے ہمارے نزدیک شوال، ذی القعدہ اور ماہ ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ جس کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے۔ اسی چیز کی روایت ابن عباس، مجاہد اور حسن وغیرہ نے کی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ مہینے شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ ہیں۔ یہ عطا، ربیع اور طاؤس سے روایت ہے۔ ہماری احادیث میں بھی اس طرح کی روایات ہیں۔

یہ مہینے حج کے لیے اس وجہ سے قرار پائے کہ احرام حج انھیں مہینوں میں درست ہے، اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک جو شخص عمرۂ تمتع کرے اس کا احرام بھی ان مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں درست نہیں ہے۔ جس نے کہا ہے کہ تمام (ماہ) ذی الحجہ حج کے مہینوں میں ہے؛ تو اس کا کہنا ہے کہ اس لئے کہ اس ماہ میں بعض افعال حج مثلاً تین دن کے روزے اور قربانی کرنا واقع ہوتا ہے۔

اور جب یہ کہا جائے کہ دو مہینے اور تیسرے مہینے کے بعض حصہ کو کیونکر اَشْهُر کہا ہے؟ (یعنی لفظ جمع

کیوں استعمال کیا گیا ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی کبھی دو کے لیے بھی لفظ جمع استعمال ہوتا ہے جیسا کہ یہ جملہ ہے:

ظَهْرَاهُمَا مِثْلُ ظُهُوْرِ التُّرْسَيْنِ

اسی طرح فعل کی اضافت کی جاتی ہے وقت کی طرف، اگرچہ فعل (وقت) کے بعض حصہ میں واقع ہوتا ہے اور وقت کی اس کی طرف اضافت ونسبت دی جاتی ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: صَلَّيْتُ صَلَاةَ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَ صَلَاةَ يَوْمَ الْعِيْدِ میں نے روز جمعہ کے دن کی نماز پڑھی۔ میں نے روز عید کی نماز پڑھی، اگرچہ نماز دن کے بعض حصہ میں واقع ہوتی ہے۔ یا آپ کہتے ہیں: قَدِمَ زَيْدٌ يَوْمَ كَذَا (زید فلاں دن آیا) اگرچہ زید دن کے بعض حصہ میں آیا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا جائز وممکن ہے کہ ذی الحجہ کا مہینہ (ماہ حج ہے) اگرچہ حج اس کے بعض مہینہ میں واقع ہوتا ہے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ (لہٰذا جو شخص ان مقرّرہ مہینوں میں حج کی نیت کرے) یعنی جو شخص ان مہینوں میں خود پر حج فرض کرلے یعنی جو شخص ان مہینوں میں حج کا احرام باندھ لے۔ اس تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا ہمارے مذہب کے مطابق حج تمتع کے عمرہ کا احرام باندھ لے۔

فَلَا رَفَثَ (اسے آگاہ رہنا چاہیے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل (سرزد نہ ہو)) ہمارے علماء کے نزدیک رَفَث سے جماع کا کنایہ کیا گیا ہے، یہ ابن مسعود اور قتادہ کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جماع اور عورتوں سے دوری اختیار کرنے پر (ایک دوسرے سے) وعدہ لیا ہے، یہ ابن عباس، ابن عمر اور عطا سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ جماع کی پیشکش ہے، بوس وکنار کے ذریعہ یا وعدہ کے ذریعہ، یہ حسن سے مروی ہے۔

وَلَا فُسُوقَ ہمارے علماء نے روایت کی ہے کہ اس سے جھوٹ مراد ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی تمام نافرمانیاں ہیں، یہ ابن عباس، حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ اور اس قول میں زیادہ عمومیت پائی جاتی ہے اس میں جھوٹ بھی داخل ہے۔ کہا گیا ہے کہ عیب جوئی اور برے القاب سے یاد کرنا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ (سورۂ حجرات، آیت ۱۱؛ اور برے برے القاب سے یاد بھی نہ کرنا کہ ایمان کے بعد بدکاری کا نام ہی بہت برا ہے) یہ ضحاک سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ فسوق سے سب کرنا اور فحش دینا مراد ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوقٌ وَ قِتَالُهُ كُفْرٌ (مومن کو سب وشتم کرنا فسوق یعنی حق وصلاح کے راستے سے ہٹ جانا اور بدکاری ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے) یہ ابراہیم ومجاہد سے روایت ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں پر فسوق سے مراد صرف انھیں چیزوں کو لیا جاسکتا

ہے جن سے محرم کو حالت احرام میں منع کیا گیا ہے جو محل ہونے کی حالت میں اس کے لئے حلال تھیں۔ یہ قول بلا دلیل ایک عام بات کو خاص بنانا ہے، جس طرح قائل کہتا ہے: تمھارے لیے بہتر و مناسب ہے کہ ماہ رمضان میں اپنی زبان کو قابو میں رکھو تاکہ تمھارا روزہ باطل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جب تم روزہ سے ہو تو تمھارے کان اور آنکھ کا بھی روزہ ہونا چاہیے۔ تمہارے روزہ کا دن تمھارے کھانے پینے کے دن کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔

اس کی حرمت کے عظیم ہونے کی بنا پر خاص طور سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (حج میں کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو) ہمارے علماء نے روایت کی ہے کہ "لَا وَاللهِ، وَبَلٰی وَاللهِ" کہنا ہے، چاہے سچ ہو یا جھوٹ۔ اس بارے میں مفسرین کے دو اقوال ہیں:

اول: جدال سے مراد جھگڑا کرنا، گالی دینا، دشمنی کی بنا پر غصہ دلانا اور ہٹ دھرمی کرنا ہے۔ یہ ابن عباس و ابن مسعود اور حسن سے مروی ہے۔

دوم: حج میں جدال نہیں ہے کہ حج کا تعلق ماہ ذی الحجہ سے ہے، اس لیے کہ لوگ مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے لہٰذا حج ذی الحجہ کے علاوہ کسی اور مہینہ میں واقع ہوتا تھا۔ یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللهُ (اور تم جو بھی نیک کام انجام دو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا) یعنی تم جو بھی نیک کام انجام دو گے، خدا تمھیں اس کی جزا و بدلہ دے گا۔ اس سے وہ (اللہ) واقف اور جانکار ہے۔ چونکہ خدا تمام معلومات کا عالم ہے، ہر حالت میں۔ یعنی تمھارے ساتھ جاننے والوں کی طرح کا برتاؤ کرے گا، جب تم سے (عمل) ظاہر ہوگا اس کی تمھیں جزا عطا کرے گا۔ یہ اس بات پر تاکید ہے کہ جزا اور بدلہ صرف فعل پر ہوگا نہ کہ اس پر جسے وہ جانتا ہے اور اس سے واقف ہے کہ وہ ان سے (صادر) ہوگا قبل اس کے وہ اسے انجام دیں۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (اور (سفرِ حج کے لیے) زادِ راہ ساتھ لے جاؤ یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے) اس میں دو اقوال بیان کئے گئے ہیں:

اول: کچھ لوگ اپنا زاد سفر پھینک دیتے تھے اور اپنے آپ کو متوکل یعنی خدا پر توکل کرنے والا کہتے تھے تو ان سے کہا گیا کہ کھانے پینے کے سامنے اپنے ساتھ رکھو اور اپنا بوجھ لوگوں پر نہ ڈالو۔ ان سب کے ساتھ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ یہ حسن، قتادہ اور مجاہد سے مروی ہے۔

دوم: اعمال صالحہ کے ذریعہ زاد سفر اختیار کرو۔

فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ اس چیز کو اعمال حج کے درمیان ذکر کیا گیا ہے چونکہ اعمال میں کثرت کے اعتبار سے جو چیز زیادہ حقدار ہے وہ نیک اعمال ہیں۔

وَاتَّقُونِ (میری نافرمانی سے بچو) یعنی میں نے تمھیں جن چیزوں کا حکم دیا ہے اور تمھیں جن چیزوں سے نہی کی ہے؛ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (اے صاحبان عقل!)

❀❀❀❀❀

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿۱۹۸﴾
اس میں کوئی مُضایقہ نہیں کہ تم (حج کے ساتھ ساتھ) اپنے رَبّ کا فضل بھی تلاش کرو۔ پھر جب عرفات سے روانہ ہو جاؤ تو مَشعرُ الحَرام (مُزدَلفہ) کے پاس (ٹھہر کر) اللہ کو یاد کرو اور اسے ویسے یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں ہدایت کی ہے حال آں کہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔(۱۹۸)

الفاظ ومعانی:

اَلْجُنَاح: دین میں حرج، راہ مستقیم سے انحراف۔

اِبْتِغَاء: طلب کرنا۔

اِفَاضَة ظرف کے بھرنے کے بعد بہنا۔ اِفَاضَة لغت میں جدا جدا ہونے اور کثرت کے معنی میں ہے۔

عَرَفَات مشہور مقام کا نام ہے جہاں پر حج میں روز عرفہ وقوف کرنا واجب ہے۔ عرفات کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے:

بیان کیا گیا ہے کہ چونکہ جناب ابراہیمؑ نے اسے گذشتہ تعریف اور صفت کے ذریعہ پہچانا تھا، اس کی روایت علی اور ابن عباس سے کی گئی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مقام پر آدمؑ وحواؑ جدائی کے بعد یکجا ہوئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تھا۔ یہ ضحاک وسدی سے مروی ہے۔

ہمارے علماء نے بھی اسی طرح کی روایت کی ہے۔کہا گیا ہے کہ اس مقام کے بلند ہونے کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔

اس لیے کہ جبرئیلؑ نے جناب ابراہیمؑ کو (ان کے) مناسک دکھائے تھے تو انھوں نے عَرَفْتُ عَرَفْتُ (میں نے پہچان لیا، میں نے پہچان لیا) کہا تھا۔یہ عطا سے مروی ہے۔

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ جناب ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو ذبح کر رہے ہیں جب صبح ہوئی تو وہ تمام دن اس بارے میں غور وفکر کرتے رہے کہ یہ امر الٰہی ہے یا نہیں؟ اس لیے اس دن کو یَوْمُ التَّرْوِیَة کہتے ہیں۔پھر انھوں نے دوسری شب وہی خواب دیکھا۔جب صبح ہوئی تو انھوں نے جان لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا اس روز کو 'روز عرفہ' کہا گیا۔

یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ اس مقام پر جبرئیلؑ نے جناب آدمؑ سے کہا تھا کہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لو اور اپنے مناسک کو پہچان لو۔چنانچہ آدمؑ نے کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (سورۂ اعراف، آیت ۲۴: پروردگار ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے) اس لیے اس کا نام عرفہ رکھا گیا۔

مَشْعَرُ الْحَرَامِ، مُزْدَلِفَة ہے۔ مَشْعَر نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ حج اور نماز کی علامت ونشانی ہے یہاں پر وقوف کیا جاتا ہے اور شب گذاری جاتی ہے اور دعا کی جاتی ہے جو اعمال حج میں سے ہے۔مَشْعَرُ الْحَرَام کو مُزْدَلِفَة اس لیے کہا جاتا ہے کہ جبرئیلؑ نے عرفات میں جناب ابراہیمؑ سے کہا تھا: اِزْدَلِفْ اِلَی الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (مشعر الحرام روانہ ہو جایئے)

مُزْدَلِفَة کو جمع بھی کہتے ہیں چونکہ یہاں پر نماز مغرب وعشا کو ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ اکٹھا کیا جاتا ہے۔

مِنیٰ کو مِنیٰ اس لیے کہتے ہیں کہ اس مقام پر جناب ابراہیمؑ نے تمنا کی تھی کہ اللہ ان کے فرزند کی جگہ میں دنبہ قرار دے دے جوان کے فرزند کا فدیہ قرار پائے۔

ترکیب:

جُنَاحٌ لَیْسَ کا اسم ہے اور اس کی خبر عَلَیْکُمْ ہے، اَنْ تَبْتَغُوْا اس تقدیر کی بنا پر مجرور ہے کہ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْ اَنْ تَبْتَغُوْا۔جب فِیْ کو گرا دیا گیا ہے تو اس میں جُنَاح کے معنیٰ نے عمل کیا اور

اس کے معنی یہ ہیں کہ لَسْتُمْ تَأْثَمُوْنَ فِیْ اَنْ تَبْتَغُوْا (تم گنہگار نہیں ہو یہ چاہنے میں)

عَرَفَات اسم معرفہ ہے ان مقامات کے لئے جو واحد کے مانند ہیں اس لئے کہ یہ مقامات ایک دوسرے سے متصل اور ملے ہوئے ہیں اگر چہ لفظ عرفات میں غیر منصرف ہونے کے دو اسباب معرفہ اور مؤنث ہونا پائے جاتے ہیں پھر بھی یہ اسم منصرف ہے اس لئے کہ وہ جمع کی حکایت کر رہا ہے۔ پس عرفات میں تنوین مُسْلِمُوْنَ میں نون کے عوض ہے۔ اگر کسی عورت کا نام مُسْلِمُوْنَ رکھ دیا جائے تو یہ نون حذف نہیں ہوگا اور آپ اس طرح کہیں گے: اَقْبَلَتْ مُسْلِمُوْنَ وَ رَاَیْتُ مُسْلِمِیْنَ۔ لفظ عرفات میں تنوین کو حذف کرنا بھی جائز ہے اسے واحد سے مشابہ قرار دیتے ہوئے جب وہ واحد کے لئے اسم ہو ہاں اگر تنوین ساقط ہوجائے تب بھی مکسور رہے گا۔ اس کے مثل امرؤ القیس کے شعر میں اَذْرَعَات ہے۔

قرائت کی زیادہ تر روایتیں تنوین کے ساتھ ہیں۔ شعر میں بغیر تنوین کے کسرہ کے ساتھ بھی آیا ہے۔ پہلے قول کو نحویین کے اختیار کیا ہے اس لئے کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ اسے مُسْلِمُوْنَ کے مانند قرار دیتے ہیں۔ البتہ تاء کو فتحہ دینا غلط ہے۔

وَاِنْ کُنْتُمْ: یہاں پر اِنْ اِنَّ کا مخفف ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے ساتھ لام ابتداء ہے۔ جب اِنَّ مخفف ہو کر اِنْ ہوجائے تو عمل نہیں کرے گا۔

کُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ، اس جملہ کا کوئی محل اعراب نہیں ہے اس لئے کہ وہ غیر عامل حرف کے بعد واقع ہوا ہے۔ اس واؤ نے اس جملہ کو جملہ پر عطف کیا ہے۔

تفسیر:

وقوف مشعر الحرام

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ (اس میں کوئی مضایقہ نہیں کہ تم (حج کے ساتھ ساتھ) اپنے رَبّ کا فضل بھی تلاش کرو) کہا گیا ہے کہ لوگ حج میں تجارت کو گناہ سمجھتے تھے۔ خداوند عالم نے اس لفظ اثم (گناہ) کو حج میں تجارت کرنے والوں سے ہٹالیا۔ یہ ابن عباس، مجاہد، حسن اور عطا سے مروی ہے۔ اس ارشاد میں تجارت کی صریح اجازت ہے۔ یہی بات ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حج میں اجیر اور مزدور ہوتے تھے جن کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ ان کا حج نہیں ہوگا، تو خداوند عالم

نے اس امر کی وضاحت فرمادی کہ ایسے حاجیوں پر کوئی گناہ نہیں جو کسی دوسرے کے لیے اجرت یا مزدوری پر ہوں۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کی مغفرت طلب کرو۔ اس کی روایت جابر نے امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے۔

فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٖ (پھر جب عرفات سے روانہ ہو جاؤ) یعنی اس میں اجتماع کے بعد تم وہاں سے چلے جاؤ۔

فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِ (تو مشعر الحرام (مزدلفہ) کے پاس (ٹھہر کر) اللہ کو یاد کرو) (آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ مشعر الحرام میں وقوف واجب ہے جس کے ہم شیعہ قائل ہیں چونکہ امر، وجوب پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ وقوف مشعر میں اللہ نے ذکر کو واجب قرار دیا ہے اور وقوف میں ذکر کو واجب قرار دینا صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ پہلے مشعر میں وقوف کو واجب قرار دیا جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس نے بھی وقوف مشعر میں ذکر کو واجب قرار دیا ہے اس نے وقوف کو بھی واجب قرار دیا ہے، جس کی تقدیر اس طرح ہے: فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَاتٍ فَكُونُوا بِالۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَ اذۡكُرُوا اللهَ فِيۡهِ. جب تم عرفات سے کوچ کرو تو مشعر الحرام میں وقوف کرو اور وہاں اللہ کو یاد کرو۔

وَٱذۡكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمۡ (اور اسے ویسے یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں ہدایت کی ہے) یعنی (حمد و) ثنا کے ذریعہ خود پر اس کی نعمت ہدایت کے مطابق اس کا شکر ادا کرو اس لیے کہ شکر کا اپنی عظیم منزلت کے اعتبار سے نعمت کے مطابق ہونا واجب ہے۔ اسی طرح اس کی مقدار کے برابر ہونا واجب و لازم ہے اگرچہ نعمت چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ عظیم نعمت اور چھوٹی نعمت کے درمیان برابری اور مساوات ممکن نہیں ہے جس کی تقدیر اس طرح ہوگی: وَ اذۡكُرُوهُ ذِكۡرًا مِثۡلَ هَدَايَتِهٖ اِيَّاكُمۡ؛ اس کا ذکر اس طرح کرو جس طرح اس کی ہدایت تم پر ہے۔

وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ یعنی حال آں کہ اس ہدایت سے پہلے تو تم لوگ۔ کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل، 'ہ' غیر مذکور سے کنایہ ہے، لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ (بھٹکے ہوئے تھے) نبوت و شریعت سے گمراہ تھے (گم گشتہ تھے) اور اس نے اس کی طرف ہدایت کی۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾
پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں تم بھی وہیں سے پلٹو اور اللہ سے معافی طلب کرو، بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔(۱۹۹)

الفاظ و معانی:

اِسْتِغْفَار کے معنی طلب مَغْفِرَة کے ہیں اور المَغْفِرَة کے معنی گناہ کو ڈھانپنے اور چھپانے کے ہیں۔غَفُوْر اور غَافِر کے درمیان فرق ہے: غَفُوْر میں مغفرت کی کثرت کے باعث مبالغہ ہے لیکن غَافِر اس صفت کا مستحق اور حقدار ہے جس سے بخشش واقع ہوتی ہے۔

عَفْو و مَغْفِرَت، دونوں کے درمیان فرق ہے، عَفْو یعنی گناہ پر سزا نہ دینا اور مَغْفِرَة یعنی توبہ قبول کر کے گناہ کو ڈھانپ دینا۔اسی وجہ سے صفات الٰہی میں مَغْفِرَة کی کثرت ہے، بندوں کے صفات میں نہیں ہے۔اس طرح نہیں کہا جاتا: اَسْتَغْفِرُ السُّلْطَانَ بلکہ یہ کہا جاتا ہے: اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ۔

تفسیر:

عرفات سے کوچ کرنا

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ (پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں تم بھی وہیں سے پلٹو) اس میں دو قول بیان کیے گئے ہیں:

اول: اس سے عرفات سے کوچ کرنا مراد ہے۔یہ قریش اور ان کے حلیف (حُمس) کے لیے حکم ہے چونکہ یہ لوگ عرفہ میں دیگر لوگوں کے ساتھ وقوف نہیں کرتے تھے، نہ ہی وہاں سے کوچ کرتے تھے، بلکہ کہتے تھے: ہم حرم الٰہی والے ہیں ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے۔وہ مزدلفہ میں وقوف کرتے اور وہیں سے کوچ کرتے تھے تو خداوند عالم نے انھیں عرفہ میں وقوف کرنے اور وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا (اس طرح کوچ کریں) جس طرح لوگ کوچ کرتے ہیں۔اَلنَّاس سے تمام عرب مراد ہیں۔یہ ابن عباس، عائشہ، عطا مجاہد، حسن اور قتادہ کا قول ہے۔یہی روایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

ضحاک نے کہا ہے کہ تمام حجاج کو حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کوچ کریں جس طرح (حضرت) ابراہیمؑ نے کوچ کیا۔ ضحاک نے کہا ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ امام تھے لہٰذا امت کے مانند تھے، انھیں تنہا کو 'ناس' کہا گیا ہے۔

دوم: اس سے قربانی کے دن مزدلفہ سے منیٰ کی طرف کوچ کرنا مراد ہے، طلوع آفتاب سے قبل رمی اور قربانی کے لیے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ (اللہ کا ارشاد ہے) جب تم عرفات سے کوچ کرو۔ پھر ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَفِيضُوا (پھر تم کوچ کرو) لہٰذا دوسری مرتبہ کوچ کرنا واجب ہے جو اس امر پر دلالت ہے کہ دو مرتبہ کوچ واجب ہے۔

اَلنَّاسُ سے (جناب) ابراہیم (علیہ السلام) مراد ہیں جیسا کہ اس آیت میں: اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۳؛ یہ وہ ایمان والے ہیں کہ جب ان سے بعض لوگوں نے کہا) الناس سے مراد نعیم بن مسعود الاشجعی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اَلنَّاسُ سے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور ان کے بعد والے انبیاء مراد ہیں۔ یہ روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

سوال اگر یہ کہا جائے کہ ثُمَّ ترتیب کے لیے آتا ہے تو یہاں پر ترتیب کے کیا معنی ہیں؟

ہمارے علماء نے اس کے جواب میں روایت کی ہے کہ یہاں پر تقدیم و تاخیر ہے جس کی تقدیر ہے:

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار سے اس کا فضل چاہو پھر کوچ کرو جس طرح لوگ کوچ کرتے ہیں، پس جب تم عرفات سے کوچ کرو تو مشعر الحرام میں ذکر خدا کرو اور اس سے استغفار کرو بلاشبہ خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے)

کہا گیا ہے کہ اَلنَّاسُ سے آدمؑ مراد ہیں۔ یہ سعید بن جبیر اور زہری سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اہل یمن اور بنی ربیعہ مراد ہیں یہ کلبی کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ دین کی واقفیت رکھنے والے علماء مراد ہیں جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ (اور اللہ سے معافی طلب کرو) یعنی اپنے گذشتہ گناہوں پر ندامت کے ساتھ اس سے بخشش و مغفرت طلب کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بے شک اللہ معاف کرنے والا) یعنی بہت زیادہ مغفرت و بخشش کرنے والا ہے رَّحِيْمٌ وسیع رحمت والا ہے۔

❁❁❁❁❁

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾
پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح اپنے آباء واجداد کو یاد رکھتے ہو اسی طرح اللہ کو یاد رکھو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ انسانوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رَبّ! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے، ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ (۲۰۰)

الفاظ و معانی:

القضاء: استحکام کے ساتھ کسی کام سے الگ ہونا، اور یہ کبھی اس کام سے فارغ ہونے پر ہوتا ہے جیسے مناسک کو انجام دینا، کبھی کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے پر ہوتا ہے جیسے یہ ارشادِ الٰہی کہ: فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (سورۂ فصلت، آیت ۱۲؛ پھر ان آسمانوں کو دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے) اور کبھی یقینی طور پر خبر دینے کے ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ یہ ارشاد ہے: وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (سورۂ اسراء، آیت ۴؛ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ اطلاع بھی دے دی تھی) کبھی فیصلہ کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے جیسے قاضی کا لازمی طور پر حکم لگانا اور پابند بنانا۔

اَلْخَلَاق: خیر کا حصہ جو استحقاق کے طور پر ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ الخُلق سے ہے، یعنی وہ حصہ ہے جسے اخلاقِ کریمانہ لازمی قرار دیتا ہے۔

ترکیب:

اَشَدَّ مقام جر میں ہے، غیر منصرف ہے اس لئے کہ اَفْعَل کے وزن پر صفت ہے اور وہ مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر بھی منصوب ہوسکتا ہے۔ یعنی اُذْكُرُوا اَشَدَّ ذِكْرًا۔ ذِكْراً بر بنائے تمیز منصوب ہے۔ فِي الْاٰخِرَةِ جارو مجرور اسی سے متعلق ہے جس سے لَهٗ کا لام متعلق ہے۔ لَهٗ مبتدا کی خبر ہے اور متبدا مِنْ خَلَاقٍ ہے۔ مِنْ زائدہ ہے۔ جار و مجرور مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے، فِي الْاٰخِرَةِ حال ہونے کی بنا پر منصوب بھی ہوسکتا ہے اور اس میں عامل وہی فعل ہوگا جو لَهٗ میں عامل ہے۔

تفسیر:

ذکر خدا کی اہمیت

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنٰسِكَكُمْ یعنی جب تم اپنے مناسک بجالاؤ۔ کہا گیا ہے کہ جب تم اپنے مناسک سے فارغ ہوجاؤ۔ مَنَاسِك مَنْسَك کی جمع ہے۔ ممکن ہے مَنَاسِك نُسُكَ (عبادت) کی جگہ (ظرف مکان) ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصدر میمی ہو۔ لہٰذا اگر ظرف مکان ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو کچھ تم پر واجب تھا اگر تم نے اسے اپنی عبادت کی جگہ پر انجام دے دیا ہو۔ اور اگر لفظ مناسک مصدر ہے تو یہ جمع ہے چونکہ حج افعال واذکار پر مشتمل ہوتا ہے لہٰذا اس کی جمع بنانا صحیح ہے جیسے لفظ اَصْوَات۔ یعنی جب تم افعال حج بجا لاؤ تو ذکر خدا کرو۔ ذکر کے متعلق اختلاف ہے جس میں دو قول ہیں:

اول: اس سے تکبیر مراد ہے جو منیٰ کے ایام سے مخصوص ہے جس میں ایسا ذکر ہے جس میں رغبت ہوتی ہے جس کی ان دنوں میں دعوت دی گئی ہے۔

دوم: ان مقامات کی تمام دعائیں مراد ہیں اس لیے کہ اس مقام پر دوسری جگہ کی بنسبت دعا میں بیشتر فضیلت ہے۔

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ (جس طرح اپنے آباء واجداد کو یاد رکھتے ہو اسی طرح اللہ کو یاد رکھو) سے مراد وہ بات ہے کہ جس کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے کہ لوگ حج سے فارغ ہونے کے بعد وہاں جمع ہوتے اپنے آباء واجداد اور ان کے آثار پر فخر ومباہات کرتے اور ان کے گذشتہ دنوں کے کارناموں کی یاد تازہ

کرتے تھے۔ خداوند عالم نے انھیں اس مقام پر اپنے آباء واجداد کے ذکر کے بجائے اپنا ذکر کرنے کا حکم دیا۔

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (ذکر کرو)) یا اس پر اضافہ کریں کہ وہ خدا کی نعمتوں کو یاد کرکے اس کی نعمتوں کا شکر کریں اس لیے کہ ان کے آباء واجداد ان کے لیے سہارا، پناہ گاہ اور نعمت تھے۔ پس ان پر اللہ کی نعمتیں اس سے کہیں زیادہ عظیم ہیں اور بہت بڑا سہارا اور پناہ گاہ ہے چونکہ خدا کی ذات ان کے آباء واجداد اور خود ان پر ان آثار اور افتخارات کا حقیقی مُنعم ہے اور یہی اس واجب ذکر کی اس سے کم مرتبہ والے ذکر واجب سے تشبیہ کی یہی وجہ ہے۔ یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے حضور استغاثہ کرو اور اس سے اس طرح پناہ طلب کرو جس طرح بچہ تمام امور میں اپنے باپ سے پناہ کا طالب اور فریادی ہوتا ہے اور اس پر شیفتہ و فریفتہ ہوتا ہے اور کہتا ہے: اے بابا جان! یہ عطا کا قول ہے۔ قول اول زیادہ درست اور صحیح ہے۔

ارشادِ الٰہی: فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي الدُّنْيَا (انسانوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رَب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے) خداوند عالم نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ اس سلسلہ میں لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں: ان میں وہ بھی ہیں جو دنیاوی نعمت کے بارے میں دعا کرتے ہیں، آخرت کی نعمت کے متعلق دعا نہیں کرتے چونکہ وہ قیامت اور حشر و نشر پر ایمان نہیں رکھتے۔

وَمَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ، ایسے شخص کے لیے آخرت میں (خیر کا) کوئی حصّہ نہیں ہے۔

❁❁❁❁❁

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾
اور ان میں سے کوئی یہ کہتا ہے کہ اے ہمارے رَب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں آتش جہنّم سے بچا لے۔ (۲۰۱)

الفاظ و معانی:

قول اور کلام کے درمیان فرق ہے؛ قول حکایت پر دلالت کرتا ہے جبکہ کلام ایسا نہیں ہے جیسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ جب تم اس کے بارے میں کلام کے ذریعہ خبر دیتے ہو تو کہتے ہو: تَكَلَّمَ بِالْحَقِّ یعنی حق کے ساتھ گفتگو کی۔

حکایت کی تین قسمیں ہیں:

اول: لفظ اور معنی کی حکایت کرنا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا (سورۂ کہف، آیت ۹۶: لاؤ اب اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا) جب اس کی حکایت وہ شخص کرتا ہے جو اس کے لفظ اور معنی کے بارے میں جانتا ہے)

دوم: لفظ کے ذریعہ حکایت کرنا جب اس کی حکایت اس سے کرے جو اس کے لفظ سے واقف ہو، معنی سے نہیں۔

سوم: معنی کی حکایت کرنا۔

اِیْتَاء عطا کرنا، اس کی اصل اَلْاَتِیْ ہے جو آنے کے معنی میں ہے۔

تفسیر:

خیر دنیا و آخرت کی دعا

جب خداوند عالم نے اس عظیم مقام پر ان افراد کی دعا کا ذکر کیا جو امور دنیا سے متعلق دعا کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا، اس کے فوراً بعد اس مقام پر مومنین کی دعا کا ذکر فرمایا جسے وہ پسند کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا (اور ان میں سے کوئی یہ کہتا ہے کہ اے ہمارے ربّ ہمیں عطا کر، فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں آتش جہنّم سے بچالے) یعنی ہمیں دنیاوی نعمتیں اور اخروی نعمتیں عطا فرما۔ یہ انس اور قتادہ کا قول ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس سے دنیا میں حسن خلق، روزی اور عمر میں وسعت اور آخرت میں رضائے الٰہی اور جنت مراد ہے۔

کہا گیا ہے کہ دنیا میں علم و عبادت اور آخرت میں جنت مراد ہے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ دنیا میں مال اور آخرت میں جنت مراد ہے۔ یہ ابن زید اور سدی سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ دنیا میں نیک بیوی اور آخرت میں جنت مراد ہے۔ یہ علی علیہ السلام سے مروی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو شکر کرنے

والا قلب، ذکر کرنے والی زبان اور ایسی زوجۂ مومنہ عطا کی گئی ہو جو دنیاوی اور اخروی امور میں اس کی مددگار ہو تو اسے دنیا میں بھی نیکی عطا کی گئی ہے اور آخرت میں نیکی عطا کی گئی ہے اور اسے آتش جہنم سے بچا لیا گیا۔

❀❀❀❀❀

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾
یہ لوگ اپنی کمائی کے اعتبار سے (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ جلد ہی سب کا حساب کردے گا۔ (۲۰۲)

الفاظ ومعانی:

اَلنَّصِيْب: حَظّ (یعنی حصہ)۔ اس کی جمع اَنْصِبَاء اور اَنْصِبَة ہے۔ نَصِيْب یعنی خیر یا شر میں سے وہ جزء جو اس سے مخصوص ہو۔

اَلْكَسْب: وہ فعل جس سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے یا ضرر و نقصان کو دور کیا جاتا ہے۔

اَلسَّرِيْعُ مِنَ الْعَمَل: عمل میں سرعت یعنی کام کو کم مدت میں انجام دینا۔

تفسیر:

ہر ایک کو اس کا حصہ!

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا (یہ لوگ اپنی کمائی کے اعتبار سے (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے) ان کی کمائی میں ان کا حصہ ہے جس پر وہ ثواب کے مستحق ہوں گے۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (اور اللہ جلد ہی سب کا حساب کردے گا) اس بارے میں تین اقوال ہیں:

اول: بندوں کو ان کے اعمال کی جلد جزا دینے والا اور وقت جزا بہت قریب ہے اسی جملے کے مانند یہ ارشاد ہے: وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (سورۂ نحل، آیت ۷۷؛ اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ پلک جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی زیادہ قریب) جزا کو حساب سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ جزا عمل کے برابر اور اس کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے، جو اس کا حساب ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے: اَحْسَبَنِي الشَّيْءُ: كَفَانِي میرے لئے وہ چیز کافی ہوگئی۔

دوم: وہ اہل محشر کا نہایت مختصر وقت میں حساب کرے گا۔ اسے کسی ایک کا حساب دوسرے کے

حساب سے غافل نہیں کرے گا جس طرح ایک حالت (کیفیت) دوسری حالت سے غافل نہیں کرتی جیسا کہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ خداوند عالم تمام مخلوقات کا پلک جھپکتے وقت کے برابر حساب کرلے گا اور یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ بکری کے دودھ دوہنے کی مدت بھر میں حساب کرے گا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جو دلالت کرتی ہے کہ خدا جسم نہیں رکھتا نہ ہی وہ کلام کرنے میں کسی آلہ کا محتاج ہے، اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے ایک ہی وقت میں دو مختلف مخاطب سے خطاب کرنا ممکن نہیں تھا اور بعض مخلوق سے خطاب کرنا دیگر مخلوق سے خطاب کرنے سے روک دیتا اور مخلوقات کے اعمال کا حساب کرنے کے لیے طویل مدت درکار ہوتی۔ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مخلوق کا حساب دفعتہً کرے گا جس طرح انھیں رزق عطا فرماتا ہے۔

سوم: خداوند عالم ان لوگوں کی دعا کو بہت جلد قبول کرنے والا ہے اور کسی رکاوٹ کے بغیر مستجاب فرماتا ہے۔

اب بحث اس مقدار کے بارے میں جس کا ہر دعا کرنے والا مستحق ہوتا ہے جس طرح کہ انسان شمار اور حساب کرتا ہے۔ اس معنیٰ سے قریب وہ روایت ہے جسے ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کا حساب نہیں ہوگا بلکہ ان کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمھارے گناہ اور برائیاں ہیں جن سے ہم نے درگذر کیا اور یہ تمھاری نیکیاں ہیں جنھیں ہم نے تمھارے لیے کئی گنا کردیا ہے۔

❀❀❀❀❀❀

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمھیں ذکرِ خداوندی میں گزارنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کرکے دو ہی دن میں واپس ہوگیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی عصیاں نہیں، بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور یہ جان لو کہ تم اس کے حضور اکٹھے کیے جاؤ گے۔ (۲۰۳)

الفاظ و معانی:

حَشر: کسی جگہ پر ہر جانب سے قوم کو جمع کرنا۔ مَحْشَر: وہ جگہ جہاں تمام لوگ جمع کیے جائیں گے۔

ترکیب:

لِمَنِ اتَّقٰی کے لام میں عامل کے سلسلہ میں دو اقوال ہیں:

(۱) اس کی تقدیر یہ ہے: ذٰلِكَ لِمَنِ اتَّقٰی پس جار و مجرور مبتدا کی خبر کے مقام میں ہیں اور مبتدا کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ پہلا جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

(۲) اس میں عامل لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا معنیٰ ہے اس لئے کہ اس میں جَعَلْنَاهُ لِمَنِ اتَّقٰی کے معنیٰ پوشیدہ ہیں۔

تفسیر:

اللہ کو یاد کرو

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں ذکرِ خداوندی میں گزارنے چاہئیں) مکلفین کے لیے خدا کا یہ حکم ہے کہ وہ چند معین دنوں میں اس کا ذکر کریں جو ایام تشریق نحر (قربانی) کے بعد تین دن ہیں۔ ایام معلومات ذی الحجہ کے دس دن ہیں؛ یہ ابن عباس و حسن اور بیشتر اہل علم سے مروی ہے۔ یہی ہمارے ائمہ علیہم السلام سے بھی مروی ہے۔

فراء نے بیان کیا ہے: (ایام) معلومات، ایام تشریق اور ایام معدودات، دس دن ہیں۔ وہ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ پندرہ نمازوں کے بعد یہ تکبیر ہے: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا هَدَانَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مَآ اَبْلَانَا وَاللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا رَزَقَنَا مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔

ہمارے نزدیک پہلی تکبیر یَوْمُ النَّحر (عید قربان کے دن) نماز ظہر کے بعد ہے اور آخری تکبیر عید قربان کے چوتھے دن نماز فجر کے بعد ہے۔ یہ منیٰ میں موجود شخص کے لیے ہے۔ جو شخص منیٰ کے علاوہ کسی

دوسرے شہر میں ہو وہ دس نمازوں کے بعد یہ تکبیر کہے گا، جس کی پہلی نماز عید قربان کی نماز ظہر ہے۔ یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، تکبیر کی ابتداء عید قربان کے دن نماز ظہر سے ہوتی ہے اس بارے میں ابن عباس اور ابن عمر نے ہم سے اتفاق کیا ہے۔

ارشاد الٰہی: فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ (پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی عِصیان نہیں) مراد یہ ہے کہ ایام تشریق کے دوسرے دن کوچ کرنے کے جائز ہونے میں اجازت ہے، افضل یہ ہے کہ آخر نفر یعنی وہاں آخر تک قیام کرے، وہ ایام تشریق کا تیسرا دن ہے اور جب وہ پہلے دن کوچ کرے گا تو زوال کے بعد سے غروب شمس تک کوچ کر سکتا ہے اور اگر سورج غروب ہو گیا تو پھر وہ تیسرے دن کوچ نہیں کر سکتا۔

فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ (تو اس پر بھی کوئی عِصیان نہیں) اس میں دو قول ہیں:

اول: اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اس لیے کہ حج مبرور کے سبب اس کے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ یہ ابن مسعود کا قول ہے۔

دوم: تعجیل و تاخیر میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ گناہ کی نفی اس لیے کی گئی تا کہ وہم کرنے والا وہم نہ کرے کہ تعجیل کرنے میں گناہ ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ تعجیل میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہے تو یہ مزاوجۃ کے عنوان سے ہے (یعنی کلام کے ایک حصے سے دوسرے حصہ سے مسجع یا وزن میں مشابہت کے اعتبار سے) جس طرح کہا جاتا ہے: اَنۡ اَعۡلَنۡتَ الصَّدَقَةَ فَحَسَنٌ وَّاِنۡ اَسۡرَرۡتَ فَحَسَنٌ وَّاِنۡ کَانَ الۡاِسۡرَارُ اَحۡسَنَ وَ اَفۡضَلَ، اگر تم نے صدقہ کو علنی طور پر دیا تو یہ بہتر و حسن ہے اور اگر پوشیدہ رکھا تو یہ بھی حسن اور اچھا ہے، اگرچہ پوشیدہ رکھنا زیادہ اچھا اور زیادہ بہتر ہے۔

لِمَنِ اتَّقٰی (بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں) اس بارے میں دو قول ہیں:

اول: حج مبرور گناہوں کا کفارہ واقع ہو گا اگر وہ اللہ کے نہی کردہ امور سے پرہیز کرے۔

دوم: اس کی روایت ہمارے علماء نے کی ہے کہ ارشاد الٰہی: لِمَنِ اتَّقٰی دو دن کی تعجیل سے متعلق ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے: فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ لِمَنِ اتَّقَی الصَّیۡدَ اِلٰی انۡقِضَاءِ النَّفۡرِ الۡاَخِیۡرِ وَ مَا بَقِیَ مِنۡ اِحۡرَامِهٖ وَ مَنۡ لَّمۡ یَتَّقِهَا فَلَا یَجُوۡزُ النَّفۡرُ فِی الۡاَوَّلِ، جو (شخص) دو دن میں تعجیل کرے اس پر گناہ نہیں ہے جو کہ آخری کوچ کے خاتمہ تک شکار کرنے سے پرہیز کرے

اور جو اپنے احرام میں باقی رہے جو شخص اس سے پرہیز نہ کرے تو اس کے لیے اول میں کوچ جائز نہیں ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے اسے فراء نے اختیار کیا ہے۔

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام سے فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ کے متعلق روایت کی گئی ہے کہ جو ان دنوں کے درمیان فوت کر جائے اس کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اور جس کو موت نہ آئے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ وہ گناہان کبیرہ سے پرہیز کرتا ہو۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ کی نافرمانی سے بچو) گناہوں اور خدا کی نافرمانیوں سے اجتناب کرو۔

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ (اور یہ جان لو کہ تم اس کے حضور اکٹھے کیے جاؤ گے) یعنی تم یقین رکھو کہ موت کے بعد تمھیں ایسے مقام پر اکٹھا کیا جائے گا جہاں اللہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور تمھیں تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔

❀❀❀❀❀

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُہٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیُشۡہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِہٖ ۙ وَہُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡہَا وَیُہۡلِکَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾
انسانوں میں کوئی ایسا ہے، جس کی باتیں دنیاوی زندگی میں تمھیں بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے مگر حقیقت میں وہ سخت جھگڑالو ہے (۲۰۴) اور جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی تمام تر کوشش زمین میں فساد پھیلانے، کھیتوں کو غارت کرنے اور نسل انسانی کو تباہ کرنے میں صرف ہوتی ہے حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ (۲۰۵)

الفاظ و معانی:

اَلۡاِعۡجَاب: مُعۡجِب کا اس چیز سے مسرور اور خوش حال ہونا ہے جو اسے اچھی لگے۔ اسی سے اَلۡعُجۡبُ بِالنَّفۡسِ ہے یعنی مُعۡجِب کا کسی چیز سے خوش حال ہونا ہے اپنے آپ کو اچھا سمجھتے ہوئے۔ ازہری نے کہا ہے: اَلۡعَجَبُ: ہر نامانوس چیز۔

الاَلَدّ: شدید دشمنی۔ کہا گیا ہے کہ الخِصَام خَصم کی جمع ہے، یہ زجاج کا قول ہے۔ اگر صفت فَعْلٌ کے وزن پر ہو تو اس کی جمع فِعَال کے وزن پر آتی ہے جیسے صَعْب سے صِعَاب اور اگر اسم ہو تو اس کی جمع قلت اَفْعُل کے وزن پر اور جمع کثرت فِعَال کے وزن پر آتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ خِصَام مُخَاصَمَة کے مانند مصدر ہے، یہ خلیل کا قول ہے۔

اَلتَّوَلِّی کے معنی کسی چیز سے اس کی مخالف سمت میں انحراف کرنا ہے۔

ارشاد الٰہی: سَعٰی، کبھی عمل کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی اَسْرَعَ (جلدی کرنے کے) معنی میں ہوتا ہے۔

اِفْسَاد: بے جرم وخطا نقصان پہونچانا ہے جس میں کسی طرح کی مصلحت نہ ہو۔

اِهْلَاك: وہ کام جو فائدہ حاصل کرنے کو ختم کردے۔

اَلْحَرْث: زراعت۔

اَلنَّسل: بعد کی پشتوں میں آنے والی اولاد ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اَلْحَرْث یعنی ہر طرح کی نباتات، اَلنَّسل: ہر ذی روح۔

ترکیب:

لِیُفْسِدَ، اَنْ مقدرہ کی بنا پر منصوب ہے۔ اَنْ کو ظاہر کر کے اس طرح کہنا بھی جائز ہے: لِاَنْ یُّفْسِدَ فِیْهَا۔ لیکن مَا كَانَ اللهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ کے لِیَذَرَ میں اَنْ کو ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ لِیُفْسِدَ میں لام جملہ میں اضافت کے قانون کی بنا پر ہے اور لِیَذَرَ میں لام، نفی کی تاکید کی خاطر ہے جس طرح لَیْسَ زَیْدٌ بِقَائِمٍ میں قَائِمٍ پر باء کا داخل ہونا نفی کی تاکید کے لئے ہے۔

شان نزول:

ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ یہ تین آیتیں ریاکار کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اس لیے کہ وہ جس چیز کو چھپاتا ہے اس کے برعکس کا اظہار کرتا ہے۔ یہی بات امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے البتہ انھوں نے مقصود کو معین کردیا ہے۔ حسن نے کہا ہے: منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سدی نے کہا ہے: یہ آیتیں اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے برتاؤ اور آپ

سے محبت اور آپ کے دین کی جانب رغبت کا اظہار کرتا تھا باطن میں ان کا برعکس چھپاتا تھا۔

تفسیر:

منافق کے قول و فعل میں تضاد

خداوند عالم نے مومنین اور کافروں کے حالات بیان کرنے کے بعد منافقین کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ (انسانوں میں کوئی ایسا ہے، جس کی باتیں تمھیں بھلی لگتی ہیں) اے محمدؐ! آپ کو اس کا کلام بھلا معلوم ہوتا ہے اور آپ کے دل میں اترتا ہے۔ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (دنیاوی زندگی میں) یعنی وہ آپ سے کہتا ہے کہ میں آپ پر ایمان لایا ہوں اور میں آپ کا ساتھی اور دوستدار ہوں وغیرہ وغیرہ۔ وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ (اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے) یعنی وہ جو بات چھپائے ہوئے ہے اس پر اللہ کا نام لے کر قسم کھاتا ہے، اسے گواہ بناتا ہے اور کہتا ہے: اَللّٰهُمَّ اشۡهَدۡ عَلٰى بِهٖ پروردگار! اس بارے میں مجھ پر گواہ رہنا حالانکہ اس کا ضمیر اس کے خلاف ہوتا ہے۔ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ (مگر حقیقت میں وہ سخت اور شدید جھگڑالو ہے) جس نے کہا ہے کہ لفظ خِصَام مصدر ہے تو اس کے نزدیک یہ معنی ہوں گے کہ وہ نزاع اور جھگڑے کے موقع پر سخت جھگڑالو اور لغو کام کرنے والا ہے۔ وَاِذَا تَوَلّٰى یعنی اور جب اچھائی سے اعراض اور روگردانی کرتا ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ امر کا مالک اور والی و حاکم بن جاتا ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے یعنی حاکم بن جاتا ہے تو ظلم کرتا ہے۔

سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ تو آپ کے پاس سے جانے میں جلدی کرتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ زمین میں کام کرتا ہے؛ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا (تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلائے) کہا گیا ہے: تاکہ قطع رحم کرے اور خون بہائے۔ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ کہا گیا ہے: تاکہ فساد برپا کرے اور گناہ انجام دے۔ وَيُهۡلِكَ الۡحَـرۡثَ وَالنَّسۡلَ (کھیتوں کو غارت کرنے اور نسل انسانی کو تباہ کرنے میں صرف ہوتی ہے) یعنی نباتات اور اولاد کو ہلاک کرتا ہے۔ زہری نے کہا ہے: حرث سے عورت اور نسل سے اولاد مراد ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّـكُمۡ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۳؛ عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس آیت میں حرث سے مراد دین اور نسل سے مراد انسان ہے۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (حالاں کہ اللہ فساد یعنی باعث فساد کام کو پسند نہیں کرتا) کہا گیا ہے کہ خدا فساد برپا کرنے والے کو پسند نہیں کرتا ہے۔

اس آیت میں مجبرہ کے قول کا بطلان ہے کہ اللہ برائی چاہتا ہے (ان کا کہنا ہے کہ خدا نے بندے کو برائی پر مجبور کیا ہے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا برائی نہیں چاہتا چونکہ خداوند عالم نے اپنی ذات سے فساد کی محبت کی نفی اور انکار کیا ہے اور محبت ارادہ ہے اس لیے کہ خداوند عالم جس چیز کا ہونا محبوب یا پسند کرے گا اس کے ہونے کا ارادہ کرے گا اور جس چیز کا ہونا پسند نہیں کرے گا اس کے ہونے کا ارادہ نہیں کرے گا۔

❁❁❁❁❁

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُہٗ جَہَنَّمُ وَلَبِئۡسَ الۡمِہَادُ﴿۲۰۶﴾
اور جب اس سے کہا جاتا ہے کچھ تو خدا کا خوف کر، تو عزت و وقار کا خیال اسے گناہ سے ہٹنے نہیں دیتا ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔(۲۰۶)

الفاظ و معانی:

اِتِّقَاء: کسی ایسی چیز سے سلامتی چاہنا جو اسے خوف سے روک دے۔ اِتِّقَاءُ اللّٰہِ یعنی عذاب الٰہی سے بچنا اور پرہیز کرنا۔

اَلْاَخذ: عطا کی ضد ہے۔

اَلْعِزَّۃ: ایسی قوت وطاقت جو ذلیل ہونے سے مانع ہوتی ہے۔

اَلْمِھَاد: فرش۔ چونکہ زمین کو اس پر سونے اور قیام کرنے کے لئے ہموار کیا جاتا ہے اسی لئے اسے مِھَاد کہتے ہیں۔

تفسیر:

گناہ سے باز آنے نہیں دیتی!

اس آیت میں خداوند عالم نے گزشتہ منافقین کے صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذَا قِیۡلَ

لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ (اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ کچھ تو خدا کا خوف کر) یعنی جب اس منافق سے کہا جاتا ہے کہ تو خدا سے ان چیزوں کے بارے میں ڈر جن سے اس نے تجھے روکا ہے جیسے زمین میں فساد برپا کرنا، کھیتی اور نسل کو تباہ و برباد کرنا تو اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (تو عزت و وقار کا خیال اسے گناہ سے ہٹنے نہیں دیتا) اس کے معنی میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: گناہ کے انجام دینے سے اس پر زمانہ جاہلیت کی عزت و حمیت سوار ہو جاتی ہے جو اسے گناہ کی طرف دعوت دیتی ہے جس طرح کہا جاتا ہے: اَخَذْتُهُ بِكَذَا یعنی میں نے اسے اس کام پر مجبور کر دیا۔ اَخَذَتْهُ الْحُمّٰى: اسے بخار نے جکڑ لیا۔

دوم: اس کے دل میں موجود کفر کے گناہ کے سبب عزت و وقار اس پر حاوی آ گیا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے) یعنی اس کی گمراہی کے عذاب کے لیے کافی ہے کہ وہ آتش جہنم میں وارد ہو جائے۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ، اور وہ بہت برا ٹھکانا اور قیام گاہ ہے، یہ حسن سے روایت ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر جہنم کو وَبِئْسَ الْقَرَارُ کہا ہے (سورۂ ابراہیم، آیت ۲۹) اس لیے کہ قَرار ان کے لیے ثبوت میں وِطَاء بستر کے مانند ہے۔ کہا گیا ہے کہ جہنم کو مِهَاد (گہوارہ) اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مہاد کی جگہ پر ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورۂ لقمان، آیت ۷؛ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے) اس لئے کہ عذاب الیم کی بشارت دینا نعمتوں کی بشارت دینے کے بجائے ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو حق قبول کرنے سے تکبر کرے جب اسے حق کی طرف دعوت دی جائے تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اسی لیے ابن مسعود نے کہا ہے کہ جو گناہ قابل بخشش نہیں وہ یہ ہے کہ کسی انسان سے کہا جائے کہ خوف خدا کرو اور وہ پلٹ کر کہے: تم اپنے آپ کو دیکھو۔

❁❁❁❁❁

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اپنے نفس کو بیچ کر رضائے الٰہی مول لیتا ہے اور اللہ تو اپنے بندوں پر مہربان ہے۔(۲۰۷)

الفاظ و معانی:

اَلشِّرَاء اضداد سے ہے جب فروخت کیا جاتا ہے شَرىٰ کہا جاتا ہے اور جب خریدا جاتا ہے تب بھی شرىٰ کہا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (سورۂ یوسف، آیت ۲۰؛ اور انھوں نے یوسف کو گنتی کے چند کھوٹے درہم کے عوض بیچ ڈالا)

اَلْمَرْضَات: یعنی اَلرِّضَا (خوشنودی)، یہ اَلسَّخَط (ناراضگی) کی ضد ہے۔

ترکیب:

اِبْتِغَاء منصوب ہے اس لئے کہ مفعول لہ ہے جیسا کہ شاعر کا شعر بھی ہے:

وَاغْفِرْ عَوْرَآءَ الْكَرِيْمِ ادِّخَارَهُ وَاَعْرِضْ عَنْ شَتْمِ اللَّئِيْمِ تَكَرُّمًا

عزت دار کی غلطی کو معاف کرو اس کو محفوظ رکھنے کی خاطر اور پست آدمی سرزنش کرنے سے اعراض کرو اپنی عزت کی خاطر۔

شان نزول:

سدی کے واسطہ سے ابن عباس سے روایت ہے کہ ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین کے خوف سے غار کی طرف چلے گئے اور علی علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوئے۔ یہ آیت مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئی۔

روایت کی گئی ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام بستر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر محو خواب تھے اس وقت جبرئیل علیہ السلام حضرت علی علیہ السلام کے سرہانے اور میکائیل علیہ السلام آپؑ کے پائینتی کھڑے تھے۔

جبرئیلؑ ندا دے رہے تھے: مبارک ہو! مبارک ہو! اے فرزند ابو طالب، خداوند عالم آپؑ کے ذریعہ آسمان کے فرشتوں پر فخر ومباہات کر رہا ہے۔

عکرمہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوذر غفاری، جندب بن السکن اور صہیب بن سنان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

جناب ابوذرؓ کے خاندان والوں نے انھیں قید کر دیا تھا۔ وہ قید سے آزاد ہو کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب انھوں نے ہجرت کی تو ان کے خاندان والوں نے ان سے دوری اختیار کر لی اور وہ ان سے آزاد ہو گئے یہاں تک کہ وہ خدمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وارد ہوئے۔

صہیب کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، ان کا فدیہ دے کر انھیں آزاد کرایا گیا پھر انھوں نے ہجرت کی۔

علی و ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ اس آیت سے وہ شخص مراد ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر جہاد کرتا ہے۔

قتادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مہاجرین اور انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حسن نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو شامل ہے۔

تفسیر:

آیت شب ہجرت

پھر خداوند عالم نے آیۂ کریمہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ میں نیکی کا حکم دینے والے مومن کی وضاحت کرتا ہے اس لئے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ میں قائل نیکیوں کا حکم دینے والا ہے۔ فرماتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ (یعنی اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اپنے نفس کو بیچ کر) ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (رضائے الٰہی مول لیتا ہے) یعنی رضائے الٰہی چاہتے ہوئے۔ اس لفظ يَشْرِيْ پر بیع (بیچنے) کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے کہ اس نے جو کچھ بھی انجام دیا ہے وہ رضائے خدا کی طلب کے لیے ہے جس طرح بائع فروخت کے ذریعہ قیمت چاہتا ہے۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (اور اللہ تو اپنے بندوں پر مہربان ہے) اپنے بندوں پر وسیع رحمت فرماتا ہے، انھیں وہ اپنی رضا اور ثواب تک پہنچاتا ہے جس کے وہ خواہاں ہوتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۲۰۸﴾

اے ایمان والو! تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ (اور خبردار) شیطان کی ہرگز پیروی نہ کرنا اس لیے کہ وہ تمھارا اعلانیہ دشمن ہے۔ (۲۰۸)

قرأت:

اہل حجاز اور کسائی نے فِي السَّلْمِ كَافَّةً ، سین کو فتحہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے کسرہ کے ساتھ (السِّلْم) پڑھا ہے۔

حجت:

اخفش نے کہا: اَلسِّلْم (بکسر العین) یعنی صلح۔ اَلسَّلم کو تین طرح سے پڑھا گیا ہے: السِّلْم، السَّلْم، السَّلَم شاعر کا شعر ہے:

اَ نَائِلُ اَنَّنِيْ سَلَمٌ لِاَهْلِكِ فَاقْبَلِيْ سَلَمِي

ابوعبیدہ نے کہا: اَلسِّلْم (بکسر العین) اور اِسْلَام ایک ہیں وہی دوسرے مقام پر مسالمۃ اور صلح ہے۔ اور السَّلَم یعنی اِسْتِسْلَام (سرسپردگی) اسی سے یہ ارشاد الٰہی ہے: وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ (سورہ زمر، آیت ۲۹؛ اور وہ شخص جو ایک ہی شخص کے سپرد ہو جائے) یعنی مُسْتَسْلِمًا لَّهُ مُنْقَادًا لِّمَا يُرِيْدُهُ مِنْهُ؛ اس کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ پس یہ مصدر ہے جس کے ذریعہ صفت لائی گئی ہے۔ یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ فَعَل فَاعِل کے معنیٰ میں ہو جیسے بَطَل اور حَسَن اس کی نظیر یَابِس و یَبَس اور وَاسِط اور وَسَط ہے۔

ترکیب:

كَافَّةً، اُدْخُلُوْا میں واو ضمیر کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَافَّةً، السِّلْم کے لئے حال ہے۔ لَكُمْ متعلق بہ محذوف اور محلاً منصوب ہے اس لئے کہ عَدُوٌّ کے لئے حال ہے۔

تفسیر:

عالمی صلح وآشتی

خداوند عالم نے بندوں کے تین گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد سب کو اپنی اطاعت وفرماں برداری کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو!) یعنی وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ (تم سب کے سب اسلام میں داخل ہوجاؤ) یعنی جس (اسلام) میں داخل ہوجاؤ اس پر باقی رہو جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (اے ایمان لانے والو! تم اللہ اور اس کے رسول کو تسلیم کرو) یہ ابن عباس، سدی وضحاک اور مجاہد سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت میں داخل ہوجاؤ، یہ ربیع سے مروی ہے۔ اسی کو بلخی نے اختیار کیا ہے۔ کلام میں دونوں معانی کا امکان پایا جاتا ہے۔ سِلْم کو اطاعت کے معنی میں ماننا زیادہ عمومیت کا حامل ہے۔ اس میں وہ چیز بھی داخل ہے جس کی روایت ہمارے علماء نے کی ہے کہ سِلْم میں داخل ہونے سے مراد ولایت میں داخل ہونا ہے۔ کَآفَّةً یعنی سب کے سب اسلام اور اطاعت اور خودسپردگی میں داخل ہوجاؤ، کہا گیا ہے کہ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً کے معنی یہ ہیں کہ پورے قوانین اسلام میں داخل ہوجاؤ اور بعض قوانین کو نافرمانی کرتے ہوئے چھوڑو نہیں۔ اس قول کی تائید یہ روایت کررہی ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے اسلام قبول کرلیا اور انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ ان پر روز ہفتہ کی حرمت اور اونٹ کے گوشت کی حرمت کو باقی رکھیں تو آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ تمام اسلامی احکام کی پابندی کریں۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ (شیطان کی ہرگز پیروی نہ کرنا) یعنی اس کے نقش قدم کی پیروی نہ کرنا چونکہ تمھارا اسلامی احکام میں سے کچھ ترک کرنا شیطان کی پیروی کرنا ہے۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (اس لیے کہ وہ تمھارا علانیہ دشمن ہے) یعنی اس نے سجدۂ آدمؑ سے انکار کرکے اپنی دشمنی وعداوت کا اظہار کردیا اور کہنے لگا لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗ اِلَّا قَلِیْلًا (سورۂ اسراء، آیت ۶۲؛ تو میں اس کی پوری نسل کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا سوائے چند افراد کے)

فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۰۹﴾

جو واضح ہدایات تمھارے پاس آ چکی ہیں اس کے بعد بھی اگر تم نے لغزش دکھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور صاحبِ حکمت ہے۔(۲۰۹)

الفاظ و معانی:

جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو زَلَّ الرَّجُلُ' کہا جاتا ہے۔ راستہ میں پھسلنے والے کو زَلَّ فِي الطَّرِيۡقِ زَلِيۡلًا کہا جاتا ہے۔ اس کی اصل زوال سے ہے۔ زَلَّۃ کے معنی سیدھے راستے سے بہکنے اور بھٹکنے کے ہیں۔

العزیز: ایسا صاحب قدرت جسے کوئی چیز عاجز نہیں بنا سکتی۔ العِزَّۃ کی اصلی معنی مانع ہونے کے ہیں۔ اسی سے ارضٌ عِزَازٌ یعنی نہایت سخت زمین ہے۔

ترکیب:

مَا حرف موصول ہے اور جَآءَتۡكُمُ اس کا صلہ ہے۔ فَاعۡلَمُوۡۤا جملہ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ جواب شرط میں فاء کے بعد واقع ہوا ہے فاء جملہ کے ساتھ محلاً مجزوم یا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ شرط مبنی کا جواب ہے۔

تفسیر:

معجزات کے بعد گمراہی کا نتیجہ

خداوند عالم نے اپنے بندوں کو اطاعت کا حکم دینے کے بعد انھیں اطاعت کے ترک کرنے پر وعید و وعدۂ عذاب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ (اگر تم نے لغزش دکھائی) یعنی تم میانہ روی سے ہٹ گئے اور جس سیدھے اور مستحکم راستہ کو اختیار کرنے کا خدا نے تمھیں حکم دیا ہے اس سے انحراف کیا۔ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ (جو واضح ہدایات تمھارے پاس آ چکی ہیں اس کے بعد بھی) یعنی دلائل و معجزات کو دیکھ لینے کے بعد بھی تو فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ (خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور صاحبِ حکمت ہے) یعنی اللہ (زبردست) قدرت والا ہے کوئی بھی شے اس کے عذاب سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ حَكِيۡمٌ (صاحب حکمت) ہے

تمھارے لیے اس نے اپنے دین کے احکام مقرر کردیئے ہیں اور ان چیزوں میں تم پر قیام حجت کے بعد تمھارے گناہوں اور نافرمانیوں پر عذاب کرتا ہے۔

❁❁❁❁❁

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾
کیا وہ لوگ اس بات کے مُنتظِر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے ہوئے فرشتوں کو ساتھ لیے ہوئے خود سامنے آموجود ہو اور فیصلہ ہوجائے آخر کار تمام امور تو اللہ ہی کے حضور پیش کیے جائیں گے۔(۲۱۰)

قرأت:

ابوجعفر نے وَالْمَلٰٓئِكَةِ جر کے ساتھ اور بقیہ قراء نے وَالْمَلٰٓئِكَةُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔
ابن عامر، کسائی اور حمزہ نے تَرْجِعُ الْاُمُوْرُ، تاء کو فتحہ کے ساتھ اور بقیہ نے تُرْجَعُ ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جس نے وَالْمَلٰٓئِكَةِ جر کے ساتھ پڑھا ہے تو اس نے اس کو اَلْغَمَامِ پر عطف کیا ہے یعنی فِيْ ظِلٍّ مِّنَ الْغَمَامِ وَفِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ یعنی ملائکہ کی ایک جماعت میں۔قرأت سبعہ رفع کے ساتھ لفظ جلالہ اللہُ پر عطف کرتے ہوئے ہے یعنی اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَاِلَّا اَنْ يَّاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔
جن قراء نے تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ فعل مجہول پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ۔ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ۔ لَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْ۔
اور جن حضرات نے تَرْجِعُ (فعل معلوم) پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ۔

الفاظ و معانی:

یہاں اَلنَّظَر کے معنی انتظار کے ہیں۔ نظر کے لغوی معنی کسی چیز کے ادراک کی طلب و خواہش ہے۔ یہ لفظ جب انتظار کے معنی میں استعمال ہوگا تو اس کے معنی ہوں گے فلاں منتظر ہے، متوقع چیز کا ادراک چاہتا ہے۔ جب یہ لفظ قلب کے ذریعہ فکر کے معنی میں ہوگا تو معنی یہ ہوں گے کہ متفکر اس کی معرفت چاہتا ہے۔ جب آنکھ کے معنی میں ہوگا تو اس طرح ہوگا: فلاں شخص دیکھنے والا دیکھنا چاہتا ہے۔

الظُّلَل ظلۃ کی جمع ہے۔ الظِّلّ کے معنی سایہ کے ہیں، جس چیز کے ذریعہ آفتاب سے سایہ کیا جاتا ہے۔ سحاب (ابر) کو ظلۃ (سایہ) کہا جاتا ہے چونکہ اس کے ذریعہ سایہ حاصل ہوتا ہے۔

الغمام: باریک سفید ابر۔

ترکیب:

هَلْ حرف استفہام نفی کے معنیٰ میں ہے اِلَّا یہاں پر نفی کو توڑ کر مثبت بنانے کے لئے آیا ہے۔ آن يَّاْتِيَهُمُ اللهُ، يَنْظُرُوْنَ کی وجہ سے محلاً منصوب ہے (یعنی مفعول بہ ہے) مِنَ الْغَمَامِ محذوف کے متعلق ہے، جملہ ظرفیہ ہے محلاً مجرور، ظُلَلٍ کی صفت ہے۔

تفسیر:

انھیں کس چیز کا انتظار ہے؟!

خداوند عالم نے گذشتہ وعید کے بعد ایک اور وعید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا آنْ يَّاْتِيَهُمُ اللهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (کیا وہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے ہوئے فرشتوں کو ساتھ لیے ہوئے خود سامنے آموجود ہو) یعنی کیا یہ آیات الٰہی کو جھٹلانے والے انتظار کررہے ہیں کہ ان پر امر خدا یا عذاب الٰہی اور نافرمانی پر انھیں جس عذاب سے ڈرایا جارہا ہے ابر کے سایہ میں آجائے۔ کہا گیا ہے کہ ابر کا ٹکڑا یہ اس طرح ہے جیسے کہا جائے امیر اور حاکم نے فلاں کو قتل کردیا، یا اسے مارا، یا اسے عطا کیا اگرچہ حاکم یا امیر نے ان امور کو خود انجام نہ دیا ہو بلکہ اس کے حکم کے سبب ان امور کی نسبت اس کی جانب دی

گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ انتظار نہیں کر رہے ہیں مگر یہ کہ ان کے پاس اللہ کی بڑی بڑی جلیل القدر نشانیاں آجائیں۔ البتہ اللہ نے اپنا ذکر آیات کی عظمت کے پیش نظر کیا ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ حاکم شہر میں داخل ہوا، اس سے حاکم کا لشکر مراد ہوتا ہے۔ ابر کا ذکر اس کے بہت زیادہ خوفناک ہونے کی وجہ سے کیا ہے تا کہ ڈراونی چیز کی تشبیہ ابر کے سایہ سے کی گئی ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (سورۂ لقمان، آیت ۳۲؛ اور جب کوئی موج سائبانوں کی طرح انھیں ڈھانپ لیتی ہے تو (اس وقت) یہ خالص اعتقاد کے ساتھ اللہ ہی کو پکارتے ہیں) زجاج نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان کے لیے جو عذاب اور حساب کا وعدہ کیا ہے وہ ان کے لیے انجام دے کر رہے گا۔ اس کا ارشاد ہے: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا یعنی اللہ انھیں ان کی ذلت و رسوائی اور ذلت تک لے آیا۔ یہ تمام اقوال باعتبار معنی ایک دوسرے سے نزدیک ہیں بلکہ تمام اقوال معنی میں ایک ہی ہیں؛ یعنی کیا یہ لوگ قیامت کے سوا کسی اور چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ یہ استفہام ہے جس سے نفی اور انکار مراد ہے، یعنی انتظار نہیں کر رہے ہیں۔ جیسا کہ بطور مثال کہا جاتا ہے کیا اس کے مانند و مثل مطالبہ کیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ وہ سرزنش کرنے والا ہے یعنی مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ (سورۂ نحل، آیت ۳۳) کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں سوائے اس کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمھارے پروردگار کا امر آئے؟ 'آنا' اور 'آیا' اس چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کا آنا اور جانا ممکن ہوتا ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: میرے پاس فلاں شخص کی وعید (دھمکی) آئی یا میرے پاس فلاں کا کلام یا اس کی بات آئی۔ یہاں پر حقیقی آنا مراد نہیں ہے۔

البتہ ارشاد: وَالْمَلٰٓئِكَةُ ہم اس کے رفع و جر (پیش اور زیر) کی وجہ سابق میں بیان کر چکے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اس کے کہ اللہ ابر کے سایہ کے ساتھ ان کے پاس اپنی عظیم نشانیوں اور ملائکہ کے ساتھ آئے۔

ارشاد الٰہی: وَقُضِيَ الْاَمْرُ (اور فیصلہ ہو جائے) مراد امر سے فارغ ہونا اور حساب کرنا ہے۔ اہل جنت کو داخل جنت اور اہل جہنم کو جہنم پہنچانا ہے جو آخرت میں ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ مراد عذاب کا واجب و لازم ہونا ہے یعنی ہلاک و فنا کرنے والا عذاب جو کہ دنیا میں ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ یعنی سوال اور ان پر جزا ملنا ان امور کی اسی خدا کی جانب بازگشت ہے، آغاز میں تمام امور اسی کے لیے تھے اگرچہ بعض امور کو

دوسروں نے دنیا میں اختیار کرلیا تھا۔ محشر میں تمام امور پھر سے اسی کے لیے ہوجائیں گے جہاں پر کوئی بھی کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ دنیا و آخرت کے امور کی بازگشت (خدا) ہی کی جانب ہے۔

❀❀❀❀❀

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

بنی اسرائیل سے پوچھو تو سہی! کیسی کیسی واضح نشانیاں ہم نے انھیں دیں اور جو قوم اللہ کی نعمت کو پالینے کے بعد اسے تبدیل کردے تو اللہ اسے سخت سزا دیتا ہے۔ (۲۱۱)

ترکیب:

كَمْ محلاً منصوب ہے اس لئے آتَیْنَا کا مفعول ثانی ہے۔ كَمْ کے لئے صدر کلام میں ہونا لازم ہے اس لئے کہ اس میں استفہام کے معنی پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ جملہ: كَمْ اٰتَیْنٰا هُمْ مِّنْ اٰیَةٍ، سَلْ کا مفعول ثانی واقع ہوا ہے۔ مِنْ اٰیَةٍ، اٰتَیْنٰا کے متعلق ہے۔ مَا حرف موصول ہے اور جَآءَتْ اس کا صلہ ہے موصول اور صلہ بَعْدُ کے مضاف ہونے کی بنا پر محلاً مجرور ہے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل سے پوچھو!

سَلْ اے محمد! سوال کیجئے بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (بنی اسرائیل سے) یعنی اولاد یعقوب سے اور وہ یہودی تھے جو اطراف مدینہ میں مقیم تھے، اس سے ان کے علماء مراد ہیں۔ یہ سوال تقریری ہے، ان پر مزید حجت قائم کرنے کے لئے۔

كَمْ اٰتَیْنٰاهُمْ ہم نے انھیں عطا کیں۔ مِنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ (کیسی کیسی واضح نشانیاں) آشکار حجتیں اور دلیلیں جیسے ید بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، سمندر میں شگاف پیدا ہونا، ان پر ابر کا سایہ فگن ہونا اور ان کے لیے من وسلویٰ کا نازل کرنا۔ یہ حسن اور مجاہد سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کس قدر واضح حجتیں اور دلیلیں ہیں جو آپ کی صداقت کا ثبوت ہیں۔ یہ جبائی کا قول ہے۔ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ

بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ (اور جو قوم اللہ کی نعمت کو پالینے کے بعد اسے تبدیل کردے) کلام میں حذف ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے: فَبَدَّلُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ وَ کَفَرُوۡا بِاٰیَاتِهٖ وَ خَالَفُوۡهُ فَضَلُّوۡا وَ اَضَلُّوۡا وَ مَنۡ یُّبَدِّلِ الشُّکۡرَ عَلَیۡهَا بِالۡکُفۡرَانِ (انھوں نے نعمت الٰہی کو بدل دیا۔ یہ اس کی آیات کا انکار کیا اور ان کی مخالفت کی وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، کون ہے جو (ان نعمتوں پر) شکر کو کفر سے تبدیل کرتا ہے)

بیان کیا گیا ہے کہ کون ہے جو اللہ کی دلیلوں کو ان کے (حقیقی) چہروں (رخ) سے فاسد اور دلیل و برہان سے خالی تاویلات کے ذریعہ پلٹ دیتا اور تبدیل کردیتا ہے؟ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (اللہ اسے سخت سزا دیتا ہے) اس کے لیے سخت ترین عذاب ہے، کہا گیا ہے کہ اس کی نافرمانی کرنے والے کے لیے عذاب شدید ہے اس میں یہ مذکور داخل ہوگا۔

اس آیت میں مجبرہ کے اس قول کے باطل ہونے پر دلالت ہے یہ کافروں پر اللہ کی نعمت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں ان پر اللہ کی نعمتوں کو بدل دینے کی بات کہی ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

یَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنۡکِرُوۡنَهَا (سورہ نحل، آیت ۸۳؛ یہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں اور پھر انکار کرتے ہیں) اسی کے مانند دیگر وجوہات بھی ہیں یہ کہ اللہ نے تبدیل کی نسبت ان کی جانب دی ہے اور اس کام پر انھیں عذاب سے ڈرایا ہے اگر تبدیل ان کا فعل نہ ہوتا تو وہ عذاب کے مستحق نہ ہوتے (تبدیل کرنا و تحریف کرنا یا چھپانا یا (حقیقی سمت اور جہت) کے خلاف تاویل کرنا ہے جیسا کہ انھوں نے توراۃ اور انجیل میں کیا اور اس امت کے بدعت شعاروں نے قرآن میں کیا۔

نظم:

جب خداوند عالم نے شریعت کے احکام کی وضاحت فرمائی اور یہ کہ لوگوں کے تین گروہ: مومن، کافر اور منافق ہیں پھر ان پر وعدو وعید فرمائی، اس کے بعد وضاحت فرمائی کہ ان لوگوں کا ایمان ترک کردینا دلیلوں اور حجتوں کی کوتاہی اور نقص کے سبب نہیں ہے بلکہ ان کی طبیعت اور افعال کی خباثت کے سبب ہے۔ اے محمد! یہ لوگ اس طرح کے کام آپ سے قبل بھی انجام دے چکے ہیں۔ پھر خدا نے ارشاد فرمایا: سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ... (بنی اسرائیل سے پوچھئے)

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، ان کے لیے دنیا کی زندگی بڑی دل فریب اور پسندیدہ بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں، مگر قیامت کے دن پرہیزگار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مرتبت ہوں گے، (رہا دنیا کا رزق) تو اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے۔ (۲۱۲)

الفاظ ومعانی:

اَلتَّزْیِیْن اور اَلتَّحْسِیْن کے معنی ایک ہی ہیں۔ اَلزَّیْن: اَلشَّیْن کے برعکس ہے۔ اَلزِّیْنَة ایک ایسا اسم ہے جو ہر اس چیز کو شامل ہے جس سے زینت کی جاتی ہے۔

ترکیب:

اَلدُّنْیَا، اَلْحَیَاۃُ کی صفت ہے۔ بِغَیْرِ حِسَابٍ جار و مجرور بر بنائے حال محلاً منصوب ہے اور اس میں عامل یَرْزُقُ ہے اور ذو الحال یَرْزُقُ میں ھُوَ کی ضمیر ہے یا مَنْ یَّشَآءُ کا موصول اس کا ذو الحال ہے گویا اس طرح ہے: غَیْرَ مُحَاسِب یا غَیْرَ مُحَاسَب ہے (اگر من کو ذو الحال قرار دیا جائے)

شان نزول:

یہ آیت قریش کے رؤساء ابوجہل وغیرہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جن کے لیے دنیا کشادہ کر دی گئی تھی۔ یہ لوگ مومنین کے گروہ مثلاً عبداللہ بن مسعود، عمار، بلال اور خباب کا مسخرہ کرتے اور کہتے تھے: اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی ہوتے تو ہمارے اشراف (بزرگان قوم) ان کی ضرور پیروی کرتے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی جو کمزور مومنین کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ مقاتل سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ بنی قریظہ ونضیر اور قینقاع (قبیلوں) کے رؤساء یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مہاجرین فقراء کا مذاق اڑاتے تھے، یہ عطا سے مروی ہے۔ یہ ان سب آیت کے بارے میں نازل ہوئی ہو اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔

تفسیر:

دنیاوی زندگی کو مزین کردیا گیا ہے

خداوند عالم نے فرمایا کہ ان لوگوں کا ایمان سے روگردانی کرنا ان کے دنیاوی زندگی کو ترجیح دینے کے سبب ہے۔ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا (جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، ان کے لیے دنیا کی زندگی بڑی دل فریب اور پسندیدہ بنادی گئی ہے۔) اس بارے میں دو قول ہیں:

اول: شیطان ان کے لیے دنیا کو سجاتا ہے اس طرح کہ ان کے اغراض کو قوی بنا دیتا ہے، برے کام کو اچھا بنا کر پیش کرتا ہے اور واجب کام میں خلل ڈالتا ہے البتہ اللہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے لیے دنیا کو آراستہ کردے اس لیے کہ اس نے دنیا سے بے رغبتی کا شوق دلایا ہے اور فرمایا ہے: تم جان لو کہ دنیا کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ حسن اور جبائی سے منقول ہے۔

دوم: اللہ دنیا کو ان کے لیے اس طرح سے زینت دیتا ہے کہ دنیا میں ان کے لیے پسندیدہ اور تعجب خیز چیزوں کو پیدا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں ان کے لیے خواہشات بھی پیدا کرتا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴؛ دنیا میں لوگوں کے لیے دل کو لبھانے والی چیزیں عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ہیں جن کی محبت کو زینت بنا دیا گیا ہے مگر یہ سب دنیوی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے)

یہ صرف اس لیے ہے کہ تکلیف صرف خواہشات کے ساتھ سرانجام پاتی ہے، بیشک انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، اسے ایسی چیزوں کی طرف بلایا جاتا ہے جن سے اس کا نفس دور بھاگتا ہے یا ایسی شئے سے روکا جاتا ہے جس سے اس کا نفس بچتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کے یہی معنی ہیں: جنت کو ناپسندیدگی سے

گھیر دیا گیا ہے اور جہنم کو خواہشات سے گھیر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں فعل کو مذکر لایا گیا ہے اس کی نسبت حیات کی طرف ہے کیونکہ حیات مؤنث حقیقی نہیں ہے۔ حیات کے معنی عیش اور بقا کے ہیں، اسی لیے فعل اور فاعل کے درمیان لِلَّذِینَ کَفَرُوا سے فاصلہ پیدا کر دیا گیا ہے کیونکہ مؤنث حقیقی میں اگر یہ کہا جائے: حَضَرَ الْقَاضِیَ الْیَوْمَ اِمْرَاَةٌ (قاضی کے پاس آج ایک عورت حاضر ہوئی) تو جب یہاں یہ صورت جائز و ممکن ہے کہ مؤنث حقیقی کے لیے فعل مذکر لایا جا سکتا ہے تو مؤنث غیر حقیقی کے لیے فعل کا مذکر لانا بدرجہ اولی ممکن ہے۔

وَیَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِینَ آمَنُوا (ایسے لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں) یعنی یہ لوگ مومنین کا ان کے فقر کے سبب مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک اور قول ہے کہ یہ لوگ ان کے ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک اور قول ہے کہ دنیا سے ان کی پارسائی اور زہد کے سبب ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ تینوں اقوال مراد لیے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ الَّذِینَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (مگر قیامت کے دن پرہیز گار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مَرتَبَت ہوں گے) یعنی (وہ لوگ جنھوں نے کفر سے پرہیز کیا ان کے درجات بلند ہیں) اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ وہ دنیا کی نعمتوں کی بنسبت آخرت کی نعمتوں سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کا مرتبہ تمام کافروں سے بلند ہوگا کیونکہ متقین مقام علیین میں ہوں گے اور کفار سجین میں ہوں گے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے اصحاب جنت کے لیے کہا گیا ہے کہ جنت ان کی بہترین قیام گاہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ آخرت میں مذاق اڑانے کی مومنین کی حالت دنیا میں کفار کے مومنین کا مذاق اڑانے کی حالت سے اوپر ہوگی۔ اس پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے:

اِنَّ الَّذِینَ اَجْرَمُوا کَانُوا مِنَ الَّذِینَ آمَنُوا یَضْحَکُونَ (سورہ مطففین، آیت ۲۹: بلاشبہ مجرمین (دنیا میں) مومنین پر ہنسا کرتے تھے)

وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (رہا دنیا کا رزق) تو اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے) اس میں چند اقوال ہیں:

اول: اس کی عنایتیں اور نوازشیں اتنی زیادہ ہوں گی کہ جن کا ان کی کثرت کی وجہ سے کوئی حساب نہیں ہوگا۔

دوم: اللہ لوگوں کو دنیا میں ان کے اعمال و ایمان اور ان کے کفر کے مقابلہ میں رزق نہیں دیتا لہٰذا

کفار کے رزق کی وسعت اس کے درجات کی بلندی پر دلالت نہیں کرتی، اگر ہم یہ کہیں کہ اس سے آخرت کا مقصود ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ مومنین کو آخرت میں ان کے گذشتہ اعمال کے حساب سے رزق دیتا ہے بلکہ ثواب کے ساتھ ساتھ فضل وکرم کا بھی اضافہ کرتا ہے۔

سوم: ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ عطا کرنے کے بعد مواخذہ نہیں کرے گا اور نہ اس سلسلہ میں کوئی باز پرس کرے گا، نہ ہی کسی جزا اور بدلہ کا مطالبہ کرے گا۔

چھارم: ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ وہ اہل جنت کو اتنا عطا کرے گا کہ جس کی کوئی حد نہیں ہوگی اور نہ اس پر کوئی حساب ہوگا، نہ ہی اس کا شمار کیا جا سکتا ہے چونکہ جو اللہ غیر متناہی اور غیر محصور ومحدود پر قادر ہے وہ بے حد و بے حساب چیز کے عطا کرنے پر بھی قادر ہے جس طرح کوئی شخص دو ہزار سے ایک ہزار اور سو سے دس عطا کرتا ہے۔ یہ روایت قطرب سے مروی ہے۔

پنجم: اللہ اہل جنت کو تمام نہ ہونے والا (رزق) عطا کرے گا جس پر کوئی حساب نہیں ہوگا۔

یہ تمام وجہیں اور صورتیں ممکن اور بہتر ہیں۔

❀❀❀❀❀

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۚ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

ابتدا میں سب لوگ ایک طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے انبیاء بھیجے جو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے ہیں ان کا فیصلہ کر دے۔ اختلافات ان لوگوں نے کیے جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا، انھوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض آپس میں زیادتی

کی خاطر مختلف روشیں اپنالیں۔لہٰذا جولوگ انبیاء پر ایمان لائے، انھیں اللہ نے اپنے اذن سے حق کا وہ راستا دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔(۲۱۳)

قرأت:

صرف ابوجعفر القاری نے لِیُحْکَمَ (یاء کو ضمہ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ لِیَحْکُمَ قرأت کی ہے۔

حجت:

غالب و مشہور قرأت کی دلیل یہ ہے کہ اَلْکِتَاب حکم دیتی ہے اور یہ مجازاً ہے جیسے ارشاد الٰہی: هٰذَا كِتَابٌ يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یَحْکُمَ کا فاعل اللہ ہو یعنی لِیَحْکُمَ اللّٰهُ فِیْ عِبَادِهٖ۔ ابوجعفر القاری کی قرأت کی دلیل بھی واضح ہے۔

الفاظ و معانی:

اُمَّة کی متعدد معانی ہیں جنھیں ہم آیت تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ کے موقعہ پر بیان کر چکے ہیں۔ یہاں پر اُمَّة ملت اور دین کے معنی میں ہے۔

ترکیب:

مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ بر بنائے حال منصوب ہیں۔ بِالْحَقِّ مقام حال میں ہے اور اس میں عامل وَ اَنْزَلَ ہے اور ذوالحال اَلْکِتَابَ ہے۔ لِیَحْکُمَ جار و مجرور ہے اور لام متعلق بہ اَنْزَلَ ہے۔ بَغْیاً بَیْنَهُمْ مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی لَمْ یُوْقِعُوا الاخْتِلَافَ اِلَّا الْبَغْیَ (انہوں نے اختلاف نہیں ڈالا مراد بغاوت و سرکشی کی خاطر) یہ بھی ممکن ہے کہ بَغْیًا مصدر ہو جو حال کی جگہ پر واقع ہوا ہو۔ مَا اسم موصول ہے اور اِخْتَلَفُوْا اس کا صلہ ہے۔ لِمَا کا لام متعلق بہ هَدٰی ہے۔ مِنَ الْحَقِّ اسم موصول کے لئے

حال کے مقام میں ہے۔اس میں عامل ھدیٰ ہے۔بِاِذْنِہٖ میں باء بھی ھدیٰ سے متعلق ہے۔

تفسیر:

لوگ امت واحدہ

اللہ نے کافروں کے حالات کو بیان کرتے ہوئے پیغمبرؐ کو دلاسا دیتے ہوئے فرمایا کہ یعنی ذَوِی اُمَّۃٍ وَّاحِدَۃٍ، اَھْلِ مِلَّۃٍ وَّاحِدَۃٍ وَ عَلٰی مِلَّۃٍ وَّاحِدَۃٍ، اس آیت میں مضاف کو محذوف کر دیا گیا ہے البتہ وہ کس دین پر تھے اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ کفر پر تھے، جس کی روایت ابن عباس نے روایتوں میں کی ہے اور حسن نے بھی یہی روایت کی ہے اور جبائی نے حسن کی روایت کی تائید کی ہے پھر ان کے درمیان اختلاف اس سلسلہ میں ہے کہ وہ کس وقت کافر تھے۔حسن نے کہا: یہ لوگ حضرت آدمؑ و حضرت نوحؑ کے درمیانی عرصہ میں کافر تھے۔بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ جناب نوحؑ کے بعد جناب ابراہیمؑ کی بعثت تک کافر تھے۔بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ یہ لوگ ہر نبی کی بعثت کے وقت کافر تھے۔صاحب تفسیر (شیخ طبرسیؒ) کی نظر میں یہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ نے مومنین کی طرف بکثرت انبیاء بھیجے، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہر پیغمبر کی بعثت کے وقت کافر تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمام کے تمام لوگ کافر ہوں، جبکہ اللہ نے زمین کو کسی بھی وقت اپنی حجت سے خالی نہیں چھوڑا ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ حق یہاں ایک امت میں رہا ہوگا یا مختصر جماعت میں رہا ہوگا جن کے لیے خوف اور تقیہ کے سبب دین کا اظہار ممکن نہ تھا کیونکہ اکثریت کافروں کی تھی۔دوسرے لوگوں کا نظریہ ہے کہ یہ لوگ دین حق پر تھے جس کی روایت قتادہ، مجاھد، عکرمہ اور ضحاک نے کی ہے اور ابن عباس نے بھی۔پھر اختلاف کیا گیا ہے کہ ابن عباس اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیانی عرصہ میں تھے۔یہ دس گروہ تھے جو شریعت حقہ پر قائم تھے۔اس کے بعد اختلاف کیا گیا ہے کہ واقدی اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ سب کے سب نوحؑ کے سفینہ والے تھے۔جب اللہ نے مخلوق کو غرق کر دیا تھا۔اس کے بعد پھر اختلاف کیا گیا ہے لہٰذا تمام اقوال کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کے سب امت واحدہ پر تھے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (تب اللہ نے انبیاء بھیجے) مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت آدمؑ تھے جو حق پر تھے اور اپنی ذریت کے امام تھے۔اللہ نے ان کی اولاد میں انبیاء بھیجے۔ہمارے علماء نے امام محمد

باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ یہ لوگ جناب نوحؑ سے پہلے امت واحدہ تھے، نہ ان میں کوئی ہدایت یافتہ تھا، نہ ہی کوئی گمراہ تھا بلکہ یہ فطرت الٰہی پر تھے، پھر اللہ نے انبیاء کو بھیجا۔

اس بنیاد پر اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یہ سب کے سب اپنی عقل کے سبب عبادت گزار تھے، نہ نبوت کے ذریعہ ہدایت یافتہ تھے، نہ ان کے پاس کوئی شریعت تھی پھر اللہ نے شریعتوں کے ساتھ انبیاء کو بھیجا۔

مُبَشِّرِينَ (جو خوش خبری دینے والے) یعنی ان لوگوں کے لیے جنت کی بشارت ہے جو ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

وَمُنْذِرِينَ (اور ڈرانے والے تھے) اور ان لوگوں کو جہنم سے ڈرایا گیا ہے جو ان کی نافرمانی کرتے ہیں۔

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ (اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی) یعنی اس نے ہر نبی کے ساتھ کتاب نازل کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب بھی ان کو بھیجا ہے تب تب ان کو کتاب دی ہے کیونکہ انبیاء کو اس وقت تک بھیجا نہیں گیا جب تک ان کے ساتھ کتاب نہیں اتاری گئی، بعض لوگوں کا خیال ہے ہر نبی کے ساتھ کتاب نہیں اتاری گئی۔ بعض کا خیال ہے آیت میں کتاب سے کُتُب مراد ہیں کیونکہ کتاب اسم جنس ہے اور اس میں جمع کے معنی پائے جاتے ہیں۔

بِالْحَقِّ یعنی صداقت اور عدالت کے ساتھ کتاب بھیجی؛ بعض کا خیال ہے کہ کتاب کو حق کی صورت میں نازل کیا، بعض کا خیال ہے کہ اس نے کتاب کو نازل کیا کیونکہ اس میں حق کا بیان ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ (تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے ہیں ان کا فیصلہ کر دے) يَحْكُمَ کی ضمیر لفظ جلالہ اللہ کی طرف پلٹ رہی ہے یعنی اللہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ضمیر کتاب کی طرف پلٹ رہی ہے، یعنی حکم کی نسبت کتاب کی طرف دی گئی ہے جب کہ بہتر یہی ہے، ہر چند اللہ وہی ہے جو اپنی عظمت کی بنیاد پر کتاب کے معاملات کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ان چیزوں میں جس میں کتاب کے نازل ہونے سے قبل اختلاف کیا گیا ہے۔

جب اس کے بارے میں سوال کیا جائے تو کہا جائے گا کہ جب یہ سب کے سب حق کے سلسلہ میں اختلاف کر رہے تھے تو کیسے انھیں کفر شامل ہوگا ان لوگوں کے قول کی بنیاد پر جو یہ کہتے ہیں کہ سب کے سب کافر تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا محال نہیں ہے کہ وہ کافر ہوں، بعض انھیں غلو کے اعتبار سے کافر کہتے ہوں، بعض تقصیر کے اعتبار سے جس طرح یہود و نصاریٰ حضرت مسیح کے بارے میں کفر کر رہے تھے۔ نصاریٰ انھیں رب

کہتے تھے جبکہ یہودی نصاریٰ کی تکذیب کرتے تھے۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ (اختلافات ان لوگوں نے کیے جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا) یعنی حق کے سلسلہ میں اختلاف نہیں کیا مگر ان لوگوں نے جنہیں علم دیا گیا تھا جیسے یہودی کیونکہ یہ پیغمبرؐ کی صفت کو چھپاتے تھے جبکہ انھیں اس کا علم دیا گیا تھا۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ (روشن ہدایات پا لینے کے بعد) آیت میں بینات سے واضح اور روشن دلیلیں مراد ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ بینات سے تورات و انجیل مراد ہیں اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات مراد ہیں۔

بَغْيًا بَيْنَهُمْ (محض آپس میں زیادتی کی خاطر مختلف روشیں اپنا لیں) آیت میں بغی سے ظلم، حسد اور ریاست طلبی مراد ہے۔ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ (انھیں اللہ نے اپنے اذن سے حق کا وہ راستا دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا) یعنی اللہ نے صاحبان ایمان کی حق کی جانب ہدایت کی کیونکہ وہ اس میں اختلاف کرر ہے تھے۔آیت میں (اذن) سے علم مراد ہے جو لغت میں مشہور ہے اور مومنین سے اس لیے مخصوص کیا ہے کہ وہی ہدایت پانے والے سے مخصوص ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بِإِذْنِهِ سے مراد بِلُطْفِهِ ہے، لہٰذا آیت میں ایک لفظ محذوف ہے: فَاهْتَدَوْا بِإِذْنِهِ (یعنی وہ خدا کے لطف و کرم سے ہدایت یافتہ ہوئے)

وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے) اس میں چند اقوال ہیں:

اول: آیت میں ہدایت سے مراد بیان اور راہنمائی ہے اور صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے۔اس ہدایت کو مکلفین سے اس لیے مخصوص کیا ہے کیونکہ غیر مکلف پر کوئی فریضہ نہیں ہے۔ یہ جبائی سے منقول ہے۔

دوم: اس سے مراد یہ ہے کہ انھیں لطف کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے۔بلخی اور ابن الاخشید کا نظریہ ہے۔

سوم: آیت میں ہدایت سے راہ جنت کی ہدایت مراد ہے لہٰذا یہ ہدایت مومنین سے مخصوص ہوگی۔

❁❁❁❁❁

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکا ہے؟ انھوں نے سختیاں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں اور انھیں خوب جھنجھوڑا گیا (زلزلے کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا) یہاں تک کہ زمانے کا رسول اور مومنین پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (تو بتایا گیا کہ) بے شک اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔ (۲۱۴)

قرأت:

صرف نافع نے حَتّٰى يَقُولُ (رفع کے ساتھ) پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے نصب کے ساتھ يَقُولَ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے منصوب پڑھا ہے تو ان کے نزدیک مراد یہ ہے کہ وَزُلْزِلُوا إِلَىٰ أَنْ قَالَ الرَّسُولُ۔
حَتّٰى کے بعد منصوب ہونے والے افعال میں حَتّٰى دو معنیٰ میں آتا ہے:
(۱) حَتّٰى إِلَىٰ کے معنیٰ میں جیسا کہ آیۂ کریمہ میں ہے۔
(۲) حَتّٰى کَیْ کے معنیٰ میں جیسے آپ یہ کہیں: أَسْلَمْتُ حَتّٰى أَدْخُلَ الْجَنَّةَ، گویا اس طرح ہے: أَسْلَمْتُ كَيْ أَدْخُلَ الْجَنَّةَ: میں اسلام لایا جاتا ہے تا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ یعنی اسلام تو تھا لیکن اسلام میں داخلہ نہیں تھا۔
پہلی صورت میں دونوں فعل سبب و مسبب ہیں جو گذر چکے ہیں۔ جس نے مرفوع پڑھا ہے يَقُولُ تو ایسی صورت میں حَتّٰى کے بعد واقع ہونے والا فعل صرف فعل حال ہو سکتا ہے اور یہ فعل دو طرح سے آتا ہے:
(۱) فعل اول جو کہ سبب ہے وہ گذر چکا ہے اور فعل دوم جو کہ مسبب ہے وہ نہیں گذرا ہے جس طرح

آپ یہ کہتے ہیں: مَرِضَ حَتّٰى لَا يَرْجُوْنَهٗ، وہ مریض ہوا یہاں تک کہ اب لوگ اس کے ٹھیک ہونے کی امید نہیں رکھتے ہیں۔ آیت کی اس طرح توجیہ کی جاسکتی ہے اس لئے کہ معنی یہ ہوں گے: زُلْزِلُوْا فِيْمَا مَضٰى حَتّٰى اَنَّ الرَّسُوْلَ يَقُوْلُ الْاٰنَ (ماضی میں وہ جھنجھوڑ دئے گئے یہاں تک کہ رسول اب کہہ رہے ہیں: مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ؛ اللہ کی مدد اب آئے گی؟ اور اس حالت کی حکایت کی ہے جس پر وہ لوگ تھے جس طرح آیت میں حال کی حکایت کی گئی ہے: هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ۔

(۲) دونوں فعل گزر چکے ہیں جیسے سِرْتُ حَتّٰى اَدْخُلَهَا۔ میں چلتا گیا یہاں تک کہ وہاں داخل ہو گیا۔ یہاں پر داخلہ سیر (چلنے) سے متصل ہے دونوں میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔

حال کی حکایت کی گئی ہے جس طرح پہلی صورت میں حکایت کی گئی تھی جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ جو گذر چکا ہے وہ حال نہیں ہے اور جب حَتّٰى کے بعد فعل کو رفع دیا جاتا ہے تو وہ حرف ہوتا ہے کہ اس کے بعد جملہ کا آغاز کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں نہ عاطفہ ہوتا ہے اور نہ ہی جارہ اور جب حَتّٰى کے بعد فعل کو نصب دیا جاتا ہے تو وہ جارہ ہوتا ہے اور فعل حَتّٰى کے بعد اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر منصوب ہوتا ہے جس طرح لام کے بعد منصوب ہوتا ہے۔ اَنْ مقدرہ، حَتّٰى کی وجہ سے محلاً مجرور ہوتے ہیں۔

الفاظ ومعانی:

اَلزَّلْزَلَة: شدید حرکت، تیز کا جھٹکا۔ اَلزِّلْزَال: ایسی مصیبت جو شدید حرکت کی بنا پر بے قراری اور بے چینی پیدا کردے۔ اس کی جمع زَلَازِل ہے۔ اس کی اصل: زَلَّ الشَّيْءُ عَنْ مَكَانِهٖ ہے کسی چیز کا اپنے مقام سے پھسل جانا۔

ترکیب:

یہ اَمْ منقطعہ ہے اور اس کے معنی بَلْ اَحَسِبْتُمْ کے ہیں یعنی بلکہ کیا تم نے گمان کیا: اَحَسِبْتُمْ اَوْ اَمْ حَسِبْتُمْ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اَمْ کلمہ متصل ہوتا ہے اور اَ (ہمزہ) مستانفہ ہوتا ہے۔ اَنْ تَدْخُلُوْا صلہ ہے اور موصول محلاً منصوب ہے اَحَسِبْتُمْ کا مفعول بہ ہے اور اس کے دو مفعول کا قائم مقام ہے اور کہا گیا ہے کہ حَسِبْتُمْ کا مفعول ثانی محذوف ہے۔ گویا اس طرح سے ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ

دُخُولَكُمُ الْجَنَّةَ ثَابِتًا (کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تمہارا جنت میں داخل ہونا ثابت ہے) اَلْجَنَّةَ منصوب ہے اس لئے کہ لَقَدْ خَلَوْا کا ظرف مکان (مفعول فیہ) ہے۔ لَمَّا کی اصل لَمْ ہے مَا کا اضافہ کر دیا گیا ہے تو اس کے معنیٰ بدل گئے جس طرح لَوْ کے معنیٰ بھی بدل جاتے ہیں۔ جب آپ لَوْ مَا کہتے ہیں تو وہ هَلَّا کے معنیٰ میں ہو جاتا ہے۔

لَمْ اور لَمَّا کے درمیان کا فرق ہے کہ لَمَّا پر وقف کرنا صحیح ہے جیسے اگر آپ سے کوئی سوال کرتا ہے کہ آقَدِمَ الامیرُ تو آپ جواب میں صرف لَمَّا کہہ سکتے ہیں لیکن صرف لَمْ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لَمَّا میں توقع ہوتی ہے اس لئے کہ وہ قَدْ کے بعد آتا ہے جب لوگوں کو حاکم کے سوار ہونے کا انتظار ہو تو آپ کہیں گے: قَدْ رَكِبَ اور اگر اس کی نفی کریں گے تو لَمَّا یَرْكَبْ کہیں گے (یعنی ابھی تک سوار نہیں ہوا ہے) حالانکہ لَمْ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ لَمْ ماضی منفی کے معنیٰ کے لئے آتا ہے۔

مَثَلُ مرفوع، محذوف کی صفت ہے جو یَأْتِ کے ذریعہ مرفوع ہوا ہے گویا اس طرح ہے: وَ لَمَّا يَأْتِكُمْ نَصَبٌ مَثَلُ الَّذِيْ اَصَابَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی اور ابھی تک تم تک وہ زحمت و مشقت نہیں ہے جیسی ان لوگوں پر آئی تھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ مَثَلُ کی اضافت غیر حقیقی یعنی لفظی ہے اس لئے کہ وہ انفصال کے فرض کرنے کی صورت میں ہے پس مجرور تقدیراً منصوب ہے اس لئے کہ مفعول ہے اور لَمَّا جملہ کے ساتھ بر بنائے حال منصوب ہے۔ واؤ حالیہ ہے اور گویا اس طرح ہے: اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ غَيْرَ مُصَابِيْنَ (بغیر زحمت و مشقت برداشت کئے جنت میں داخل ہو جاؤ) مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ بھی قَدْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر حال کے مقام میں ہے اس میں عامل خَلَوْا ہے اور زُلْزِلُوْا، مَسَّتْهُمْ پر عطف ہے۔ نَصْرُ اللّٰهِ مبتدا ہے اور اس کی اضافت بھی غیر حقیقی (لفظی) ہے مَتٰى مبتدا کی خبر کے مقام میں ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیت جنگ خندق کے دن نازل ہوئی جب خوف بہت زیادہ تھا اور مسلمانوں کا مدینہ میں محاصرہ کر لیا گیا تھا، اللہ نے انھیں صبر کی دعوت دی اور ان سے نصرت کا وعدہ کیا۔ یہ قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔ ایک اور قول ہے یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی جب عبداللہ بن اُبیّ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سے کہا: تم کب تک اپنے آپ کو قتل کرتے رہو گے؟ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبی ہوں گے تو اللہ نہ انھیں اسیر

ہونے دے گا نہ ہی قتل ہونے دے گا۔ ایک اور روایت ہے کہ یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مدینہ کی طرف ہجرت کر کے آئے تھے، انھوں نے اپنے دیار اور اموال کو چھوڑ دیا تھا اور انھیں تکلیف و پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ یہ عطا کا قول ہے۔

تفسیر:

جنت میں جانے کی شرطیں

خداوند عالم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی تسلی و دلداری کے لیے گذشتہ امتوں کے حالات بیان فرمائے ہیں جو آپ کے لیے مشرکین وغیرہ کی جانب سے پیش آئے اس لیے کہ نیک اور صالح افراد کے حالات سننے سے ان جیسوں کے حالات میں رغبت پیدا ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا: اَمْ حَسِبْتُمْ (کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے) یعنی اے مومنین! کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکا ہے) یعنی ابھی تمہارا امتحان اور آزمائش نہیں کی گئی ہے جس طرح تم سے پہلے والوں کی آزمائش کی گئی تھی، لہٰذا تم بھی انھیں کے مانند صبر کرنا۔ یہ صبر کی دعوت دینا ہے۔ اس کے بعد نصرت کا وعدہ ہے۔ مِثْل شِبْه کے مانند ہے یعنی تم تک (وہ چیزیں نہیں پہنچیں) جن میں تم سے قبل والے انبیاء اور مومنین مبتلا ہوئے تھے۔ کلام میں حذف ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے: مَثَلُ مِحْنَةِ الَّذِيْنَ يا مُصِيْبَةِ الَّذِيْنَ مَضَوْا؛ یعنی ان لوگوں کی مشقت اور مصیبت کے مانند جو گذر چکے ہیں۔

پھر خداوند عالم نے گذشتہ افراد پر وارد ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَّسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ (انھوں نے سختیاں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں) مَس اور لَمس ایک ہی معنیٰ میں ہیں۔ اَلْبَاْسَآءُ، اَلنَّعْمَآء کی نقیض اور ضد ہے۔ اَلْبَاْسَآءُ الضَّرَّآءُ کی ضد اور نقیض ہے۔ کہا گیا ہے کہ اَلْبَاْسَآءُ قتل ہے اور اَلضَّرَّآءُ فقر ہے۔ کہا گیا ہے کہ جو دین میں ضرر و نقصان سے متعلق ہو جیسے جنگ اور اہل و مال کو چھوڑ کر نکلنا اور نکالا جانا۔ اس طرح ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جب وہ صبر کے ساتھ گشائش کی توقع رکھیں۔

وَزُلْزِلُوْا (اور انھیں خوب جھنجھوڑا گیا (زلزلے کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا)) یعنی مختلف زحمتوں و مشقتوں اور مصیبتوں سے انھیں جھنجوڑا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ دشمن کے خوف سے انھیں اذیت،

زحمت اور تکلیف میں مبتلا کیا گیا جس سے ان کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهُ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (یہاں تک کہ زمانے کا رسول اور مومنین پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی) کہا گیا ہے کہ اس طرح کہنا موعود (جس چیز کے متعلق وعدہ کیا گیا ہو) کے متعلق جلد بازی کرنا ہے جس طرح امتحان دینے والا جلد بازی کرتا ہے۔ اس بات کو رسول نے نصرت میں دیر ہونے کی وجہ سے کہی ہے جس کی انھیں تمنا تھی۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ سے نصرت کی دعا کرنا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ بات اللہ کی جانب سے نصرت میں دیر کی بنا پر ہو چونکہ رسول کو علم ہوتا ہے کہ خداوند عالم اس وقت سے تاخیر نہیں کرسکتا جس کا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔

پھر خداوند عالم نے خبردار فرمایا کہ وہ اپنے اولیاء کی ضرور نصرت فرمائے گا۔ ارشاد ہوا: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ (بے شک اللہ کی مدد قریب ہی ہے) بیان کیا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کے کلام میں ہے جنھوں نے مایوسی کے عالم میں کہا تھا مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ پھر انھوں نے غور وفکر کر کے جان لیا کہ بلاشبہ خداوند عالم اپنے وعدہ کا ضرور پورا کرنے والا ہے لہٰذا انھوں نے کہا: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ بیان کیا گیا ہے کہ یہ اجمالی اور تفصیلی شکل میں رسول اور مومنین کے کلام کا ذکر ہے، مومنین نے کہا: خدا کی نصرت و مدد کب آئے گی اور رسول نے کہا: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (سورۂ قصص، آیت ۷۳؛ اور یہ اس کی رحمت کا فیض ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن قرار دیئے ہیں تاکہ رات میں سکون حاصل کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ) یعنی تاکہ شب میں سکون و آرام حاصل کرو اور دن میں فضل الٰہی کی تلاش کرو۔

❀❀❀❀❀

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۬ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

(اے نبی) لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ تو آپ جواب دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ اپنے والدین، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور تم جو بھلائی بھی کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔ (۲۱۵)

الفاظ و معانی:

نَفَقَہ: کسی چیز کو فروخت یا ہبہ یا انعام وغیرہ کے ذریعہ ملکیت سے خارج کرنا۔ عرف عام میں عین مال اور چاندی کے سکے کے نکالنے کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

اَلسُّؤَال: کلام میں مخصوص صیغہ کے ذریعہ جواب طلب کرنا ہے۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی مَاذَا یُنْفِقُوْنَ میں مَا کے مرفوع ہونے کا بھی احتمال پایا جاتا ہے اور منصوب ہونے کا بھی۔

مرفوع اس فرض کی بنا پر ہے کہ مَا الَّذِیْ یُنْفِقُوْنَ (یعنی وہ کون سی شی ہے جسے وہ انفاق کریں) ایسی صورت میں صلہ سے عائد کو حذف کر دیا ہے اور ذَا، اَلَّذِیْ کی جگہ موصول ہے اور یُنْفِقُوْنَ اس کا صلہ ہے۔

منصوب اس احتمال کی بنا پر ہے کہ اَیَّ شَیْءٍ یُنْفِقُوْنَ ہے ایسی صورت میں مَا اور ذَا ایک ہی چیز ہے اور ذَا لغو ہے اس لئے کہ مَا مفید معنیٰ ہے۔

ارشاد الٰہی: مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَّفَقَةٍ میں مَا اسم برائے شرط ہے۔ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور اَنْفَقْتُمْ، مَا کی وجہ سے محلاً مجزوم ہے۔ مِنْ خَيْرٍ: جار و مجرور حال کی جگہ پر ہے۔ مِنْ بیان کے لئے ہے گویا اس طرح ہے: مَآ اَنْفَقْتُمْ كَائِناً مِّنْ خَيْرٍ۔

ذوالحال، صلہ سے محذوف ضمیر ہے۔ فَلِلَّذِيْنَ جار و مجرور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ مبتدا اور خبر محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ فاء کے بعد واقع ہوئے ہیں اور فاء اپنے مابعد کے ساتھ جواب شرط ہے اور حرف شرط کے

معنیٰ جو کہ مَا میں پائے جاتے ہیں وہ شرط و جزاء کے ساتھ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا اول کی خبر ہے۔

وَمَا تَفْعَلُوْا میں مَا اسم شرط تَفْعَلُوْا کی بنا پر محلاً منصوب ہے اور مَا اَنْفَقْتُمْ میں بھی مَا، اَنْفَقْتُمْ کی بنا پر محلاً منصوب ہے ایسی صورت میں وہ اَنْفَقْتُمْ کا مفعول ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیت عمرو بن الجموع کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ ایک بڑا آدمی اور صاحب دولت و ثروت تھے، انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسول! کس چیز کا صدقہ کریں؟ کس کو صدقہ دیں؟ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

کس پر انفاق کریں؟

یَسْـَٔلُوْنَكَ اے محمدؐ! (آپ سے سوال کرتے ہیں) مَاذَا کس چیز کا انفاق کریں؟ انفاق سے متعلق سوال منفق علیہ (جس پر انفاق و خرچ کیا جائے) کو بھی شامل ہے اس لئے کہ انھیں معلوم تھا کہ مال کے انفاق کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا جواب میں انفاق کی کیفیت اور کس پر انفاق کیا جائے کا بیان آیا ہے۔ ارشاد ہوا: اے محمدؐ! کہہ دیجئے مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ (جو مال بھی تم خرچ کرو) یہ فقرہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ مال اس کی قدرت و اختیار میں ہو اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے کہ جس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا اسے خیر نہیں کہا جا سکتا۔ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (اپنے والدین، رشتے داروں) والدین سے باپ، ماں، دادا، دادی مراد ہیں اگر چہ کتنے ہی اوپر طبقہ میں ہوں اسم والدین میں داخل ہیں۔ اقربین سے عطا کرنے والے کے قرابتدار مراد ہیں۔ وَالْيَتٰمٰى ہر وہ بچہ جس کا باپ موجود نہ ہو۔ وَالْمَسٰكِيْنِ فقراء وَابْنِ السَّبِيْلِ جو سفر میں درماندہ ہو جائے۔

اس انفاق کے بارے میں اختلاف ہے؛ حسن نے کہا ہے: اس سے ان لوگوں پر مستحبی انفاق مراد ہے جن کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اور زکوٰۃ مراد ہے اس شخص کے لیے جس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ یہ آیت حکم فرض اور مستحبی دونوں زکوٰۃ کو شامل ہے۔ سدی نے بیان کیا ہے: آیت زکوٰۃ کے متعلق وارد ہوئی تھی پھر مصارف زکاۃ

کے بیان کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے اس لیے کہ اس کے نسخ پر دلیل نہیں ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ باپ، ماں، دادا، دادی اور اولاد کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے۔ البتہ انفاق کے بارے میں اختلاف نہیں ہے کہ والدین پر واجب ہے اگر دونوں فقیر و نادار ہوں۔ البتہ انفاق صاحب رحم پر واجب نہیں ہے مالک اور شافعی کے نزدیک اور ابوحنیفہ کے نزدیک واجب ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ (اور تم جو بھلائی بھی کروگے) یعنی عمل صالح تمھیں اللہ سے نزدیک کرتا ہے تو فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (اللہ اس سے باخبر ہوگا) تمھیں اس کی جزا اور بدلہ دیا جائے گا اس سے کوئی چیز ضائع کے بغیر اس لیے کہ اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

نظم:

اس آیت کے ماقبل والی آیت سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی والی آیت میں راہ خدا میں جہاد پر صبر کی دعوت دی ہے اور اس آیت میں راہ خدا میں انفاق کرنے کی صورت بیان کی ہے۔ یہ سب نیکی اور اطاعت کی جانب دعوت دیتا ہے۔

❁❁❁❁❁

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾
تم پر جہاد کو فرض کیا گیا ہے جو تمھیں ناگوار ہے، ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو تم ناگوار سمجھ رہے ہو اسی میں تمھارے لیے بھلائی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ جو چیز تمھیں پسند ہو وہ تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۲۱۶)

الفاظ و معانی:

اَلْكَرْہ: وہ مشقت جو نفس پر لادی جاتی ہے۔

الکُرہ ضمہ (پیش) کے ساتھ وہ مشقت چاہے نفس پر لادی جائے یا نہ لادی جائے، یہ بھی کہا گیا ہے

اَلْکُرْہُ، اَلْکَرَاھَۃ (ناپسندیدگی) اور اَلْکُرْہ مشقت ہے، کبھی بھی انسان ایسی چیز سے بھی کراہت کرتا ہے جو اس پر شاق نہیں ہوتی اور کبھی وہ چیز اس پر شاق ہوتی ہے جس سے وہ کراہت نہیں کرتا۔

اَلْخَیْرُ اَلشَّرُّ کی ضد ہے۔ اَلْخَیْر: نفع حسن (اچھا فائدہ) اور اَلشَّرُّ: برا اور نقصان۔

ترکیب:

وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ، اس جملہ میں ایک چیز محذوف ہے اور وہ اس طرح سے ہے: وَھُوَ ذُوْ کُرْہٍ لَّکُمْ (اور وہ تمہارے لئے ناپسندیدگی والا ہے) اور اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں: وَھُوَ مَکْرُوْہٌ لَّکُمْ (اور وہ تمہیں ناپسند ہے) ایسی صورت میں مصدر اسم مفعول کی جگہ آیا ہے جیسے رَجُلٌ رِّضًا یعنی رَجُلٌ ذُوْ رِضًا اور ممکن ہے کہ رِضًا مَرْضِیٌّ کے معنیٰ میں ہو۔ وَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا میں اَنْ تَکْرَھُوْا محلا مرفوع ہے اس لئے کہ عَسٰی کا فاعل ہے اور یہ عَسٰی تامہ ہے، اس کو خبر کی ضرورت نہیں ہے۔

تفسیر:

حکم جہاد

اس آیت میں اس شخص کے لئے جہاد کی مصلحت کو بیان کیا گیا ہے جسے جہاد کا حکم دیا گیا ہے ارشاد فرماتا ہے: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (تم پر جہاد کو فرض کیا گیا ہے) یعنی تم پر راہ خدا میں جہاد کو فرض کیا گیا ہے۔ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (جو تمہیں ناگوار ہے) جو تم پر شاق ہے اسے تم اپنی طبیعت کے اعتبار سے ناگوار سمجھتے ہو ناراضگی کے لحاظ سے نہیں کبھی کوئی چیز انسان کے لئے اس کی طبیعت میں ناپسند اور ناگوار ہوتی ہے اس اعتبار سے کہ اس کا نفس اس سے نفرت کرتا ہے اگرچہ وہ اسے چاہتا بھی ہے اس لئے کہ خدا نے اسے اس بات کا حکم دیا ہے جیسے گرمی میں روزہ رکھنا، ایک قول یہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاد تم پر فرض کئے جانے سے قبل ناگوار تھا اس لیے کہ مومنین اس چیز سے کراہت و ناگواری نہیں کرتے جسے خدا نے ان پر فرض کیا ہے۔

وَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا (ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو تم ناگوار سمجھ رہے ہو) یعنی تم اس وقت اس چیز کو برا سمجھ رہے ہو جب کہ وہ تمہارے انجام میں بہتر ہے جیسا کہ تم قتال و جہاد سے کراہت کرتے ہو اس لیے کہ اس میں جان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ وَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (اسی میں تمہارے لیے بھلائی ہو) اس لیے کہ جہاد میں

تمھارے لیے دوخوبیوں میں سے ایک خوبی ضرور ہے یا تو کامیابی اور مال غنیمت یا شہادت اور جنت۔

وَعَسٰٓى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ (اور ہوسکتا ہے کہ جو چیز تمھیں پسند ہو وہ تمھارے لیے بُری ہو) اور تم اس چیز کو پسند کرتے ہو جو تمھارے لیے شر ہو اور وہ زندگی کی محبت میں جہاد سے پہلو تہی کرنا ہے وہ تمھارے لیے شر ہے اس لیے کہ اس میں تمھاری ذلت و رسوائی، دنیاوی فقر، مال غنیمت سے محرومی اور آخرت میں ثواب سے محرومی ہے۔ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ (اللہ ہر چیز کو جانتا ہے) تمھاری مصلحتوں، منافع اور جو چیزیں تمھاری عاقبت کے لیے مفید ہیں اللہ ان سب سے واقف ہے۔ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (اور تم نہیں جانتے) لہٰذا تم اس کے حکم کی طرف جلدی کرو اگرچہ تمھارے اوپر شاق اور گراں ہی کیوں نہ ہو۔

عطا کے علاوہ تمام مفسرین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت جہاد کے وجوب اور اس کی فرضیت پر دلالت کر رہی ہے البتہ یہ واجب واجب کفائی ہے کہ اگر کوئی بھی انجام نہ دے اور سب بیٹھے رہیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے اور اگر اتنے لوگ انجام دیں کہ وہ کفایت کرے تو باقی سے جہاد ساقط ہو جائے گا۔ عطا نے کہا ہے کہ جہاد صحابہ پر واجب تھا ان کے علاوہ کسی اور پر واجب نہیں ہے۔ عطا کا قول اجماع سے ہٹ کر ہے۔

❀❀❀❀❀

يَسۡـــَٔلُوۡنَكَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَـرَامِ قِتَالٍ فِيۡهِ‌ؕ قُلۡ قِتَالٌ فِيۡهِ كَبِيۡرٌ ‌ؕ وَصَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌ ۢ بِهٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ وَاِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ۚ وَالۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ‌ؕ وَلَا يَزَالُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ حَتّٰى يَرُدُّوۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِكُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ‌ؕ وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾

لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ماہِ حرام میں قتال کرنا کیسا ہے؟ تو آپ فرما دیجیے کہ اس مہینے میں قتال کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔

اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اگر ان کا بس چلے تو جب تک وہ تمھیں دین سے برگشتہ نہ کر دیں لڑائی کے سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ (اور خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں مرے گا اس کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔ (۲۱۷)

الفاظ و معانی:

اَلصَّدُّ، اَلْمَنْعُ، اَلصَّرْفُ ایک جیسے ہیں۔ صَدَّ عَنِ الشَّیْءِ یعنی اس چیز سے اعراض کیا اور اس سے روگردانی کی۔

اَلْحَبَطُ: ایک بیماری اور خرابی ہے جو جانور کے شکم میں حباط نامی گھانس کھانے سے پیدا ہوتی ہے پھر ہلاکت کو حَبَط کہا جانے لگا۔

ترکیب:

قِتَالٍ فِيْهِ، اَلشَّهْرِ کا بدل ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور یہ بدل اشتمال ہے اس لئے کہ زمانہ اس میں واقع ہونے والے حالات پر مشتمل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں پر اس کے مثل یہ ارشاد الٰہی ہے: قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ (سورۂ بروج، آیت ۴) یعنی اَصْحَابُ النَّارِ (آگ والے) اعشیٰ نے کہا:

لَقَدْ كَانَ فِيْ حَوْلٍ ثَوَاءٍ ثَوَيْتُهُ   تَقَضّٰى لُبَانَاتٍ وَ يَسْاَمُ سَائِمٌ

اہل کوفہ نے کہا: اَلشَّهْرِ، عَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ بعض علماء نے کہا: ایسا تکرار کی بنا پر ہے اور یہ الفاظ و معنیٰ میں قریب قریب ہیں اگرچہ تعبیر میں مختلف ہیں۔ قِتَالٌ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور كَبِيْرٌ اس کی خبر ہے۔ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مبتدا و كُفْرٌ بِهٖ اس پر عطف ہے اور اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ بھی اسی پر عطف ہے اور اس کی خبر اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ہے یعنی یہ چیزیں خداوند عالم کے نزدیک بہت بڑی ہیں یعنی ان کا گناہ بہت بڑا ہے۔

فراء نے اَكْبَرُ کو مرفوع پڑھنے کی دو صورتیں جائز قرار دی ہیں:

(۱) اَکْبَرُ، کَبِیْرٌ کی طرف پلٹ رہا ہے یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے، راہ خدا سے روکنا اور اس کا انکار کرنا ہے یعنی قِتَال ان تمام باتوں کو جمع کئے ہوئے ہے، بڑا گناہ بھی ہے۔ راہ خدا سے روکنا بھی ہے اور خدا کا انکار اور کفر ہے۔

(۲) اسے اَلصَّدُّ الْکَبِیْرُ قرار دیا جائے یعنی اَلْقِتَالُ فِیْهِ کَبِیْرٌ وَّ الصَّدُّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَبِیْرٌ اس صورت میں وہ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی۔

علمائے نحو نے اس صورت کو غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے: اس لئے کہ پہلے فرض کی صورت میں یہ معنیٰ ہوں گے: قُلِ الْقِتَالُ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ کُفْرٌ بِاللّٰهِ اور یہ بالاجماع غلط ہے اور دوسرے فرض کی بنا پر معنیٰ یہ ہوں گے: وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْکُفْرِ۔ یہ بھی بالاجماع غلط ہے۔ فراء کو چاہئے کہ وہ اس بارے میں یہ کہیں کہ مراد یہ ہے کہ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ الْاَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ فِیْهِ: مسجد الحرام والوں کو وہاں سے نکالنا نہیں اس میں قتل کرنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے نہ کہ کفر سے زیادہ بڑا گناہ ہے اس لئے کہ مسجد الحرام والوں کو وہاں سے نکالنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد صاحبان ایمان کو وہاں سے نکالنا ہے۔ لیکن پہلی صورت میں فراء کے لئے اس اشکال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مجرور سَبِیْلِ اللّٰهِ پر عطف ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہ مبرد کا نظریہ ہے اور کہا گیا ہے کہ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، اَلشَّهْرِ الْحَرَامِ پر عطف ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْقِتَالِ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (لوگ آپ سے ماہ حرام اور مسجد الحرام میں جنگ کے بارے میں سوال کر رہے ہیں۔ یہ فراء کا نظریہ ہے

اسے کَفَرُوْا بِهٖ کے باء پر حمل کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ضمیر مجرور پر عطف کرنا صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ حرف جر کی تکرار کی جائے یا پھر ضرورت شعری ہو۔

مَنْ یَّرْتَدِدْ حرف مضاعف کو ظاہر کر کے اس لئے کہ دوسرا حرف ساکن ہے اور یَرْتَدَّ (دال کو ادغام اور فتحہ کے ساتھ) بھی پڑھا جاتا ہے اس لئے کہ التقاء ساکنین کی صورت میں اس کو سب سے ہلکی حرکت دیتے ہیں اور ادغام کی صورت میں دال کو کسرہ دینا بھی جائز ہے اس لئے کہ التقائے ساکنین کو حرکت دینے میں قاعدہ یہی ہے حالانکہ فتحہ زیادہ بہتر ہے۔

شانِ نزول:

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سریہ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحش اسدی کو سپہ سالار بنا کر بھیجا جنگ بدر سے دو ماہ قبل یہاں تک کہ وہ نخلہ مقام پر وارد ہوئے جہاں انھوں نے قریش کے تجارتی قافلہ میں عمرو بن الحضرمی کو پایا۔ وہ جمادی الآخر کا آخری دن تھا، ان کا خیال تھا کہ ماہ رجب ہے، پس مسلمان آپس میں اختلاف کر بیٹھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: یہ تمہارا پہلا دشمن ہے ان سے مال غنیمت حاصل کرنا چاہیے۔ ہم نہیں جانتے آج کا دن محترم مہینہ کا دن ہے یا نہیں، ایک دوسرے شخص نے کہا: ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ آج کا دن حرام مہینہ کا دن ہے اور ہم مناسب نہیں سمجھتے ہیں کہ تم لالچ کی بنا پر اسے حلال قرار دے دو۔ چنانچہ ان پر دنیاوی امر غالب آ گیا اور انھوں نے ابن حضرمی پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا قافلہ لوٹ لیا۔ یہ خبر کفار قریش کو پہنچی۔ ابن الحضرمی مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان پہلا مقتول تھا اور یہ پہلی غنیمت تھی جو مسلمانوں کے حصے میں آئی تھی۔ کفار قریش کے وفد نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: محترم مہینہ میں کیا جنگ کرنا جائز ہے؟ اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

حرام مہینوں میں جہاد کا حکم

یَسْئَلُوْنَكَ اے محمد! (لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں) سائل مشرکین ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر ان کے محترم مہینہ میں قتال کو حلال سمجھنے پر اعتراض کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ یہ قول حسن اور بیشتر مفسرین کا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ سوال کرنے والے مسلمان تھے، جنھوں نے حکم کی کیفیت جاننا چاہی تھی۔ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ (ماہِ حَرام میں قتال کرنا کیسا ہے؟) یعنی محترم مہینہ رجب میں قتال کے بارے۔ میں شہر الحرام (محترم مہینہ) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس ماہ میں جنگ و قتال حرام ہے اور اس کی عظیم حرمت ہے۔ اسی سبب سے زمانۂ جاہلیت میں اس مہینہ کو مَنْزَعُ الْاَسِنَّة وَ مَنْصَلُ الْاِلّ کہتے تھے اس لئے کہ وہ لوگ ماہ رجب کے داخل ہوتے ہی اپنے نیزے اور بھالے خود سے جدا کر دیتے اور جنگ و قتال ترک کر دیتے تھے۔ ماہ رجب کو اصم بھی کہا جاتا تھا، اس ماہ میں اسلحہ کی جھنکاریں سنائی نہیں دیتی تھیں اس لئے کہ بہرے پن کو

اس کی طرف نسبت دی گئی جیسے کہا جاتا ہے لَیۡلٌ نَائِمٌ وَ سِرٌّ کَاتِمٌ سوئی ہوئی رات اور چھپا ہوا راز اور لوگ بھی ایک دوسرے سے خوف نہیں کھاتے اور راستے پرامن ہوتے تھے یہاں تک کہ ماہ رجب گذر جاتا۔

قُلۡ اے محمدؐ! کہہ دیجئے: قِتَالٌ فِیۡهِ (اس میں یعنی حرام مہینے میں قتال کرنا کَبِیۡرٌ گناہ عظیم ہے۔ پھر اس طرح آغاز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَصَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ کُفۡرٌۢ بِهٖ (مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا) یعنی راہ خدا سے روکنا اور اللہ کا انکار کرنا ہے۔ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا) یعنی، مسجد الحرام سے روکنا ہے۔ ایک دوسرے قول کے مطابق مراد یہ ہے کہ آپ سے اس محترم مہینہ اور مسجد الحرام کے نزدیک قتال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہا گیا ہے کہ مسجد الحرام کا انکار کرنا ہے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔ وَاِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ (اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا) یعنی اہل مسجد جو کہ مسلمان ہیں ان کا نکالنا۔ مِنۡهُ یعنی مسجد سے۔ اَکۡبَرُ (اس سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے) گناہ عظیم ہے۔ عِنۡدَ اللّٰهِ (اللہ کے نزدیک) یعنی ان کا مسلمانوں کا مکہ سے باہر نکالنا جب انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی بہ ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ محترم مہینہ میں جنگ حرام تھی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: قُلۡ قِتَالٌ فِیۡهِ کَبِیۡرٌ اور اس طرح نہیں کہا جاتا ہے مگر اس چیز کے بارے میں جو حرام وممنوع ہے۔ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن حضرمی کی دیت ادا فرمائی تھی۔

ارشاد الٰہی: وَالۡفِتۡنَةُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ (اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا گناہ ہے) یعنی دین میں فتنہ جو کہ کفر ہے محترم مہینہ میں قتل سے بڑا ہے یعنی ابن حضرمی کا قتل۔ قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ محترم مہینہ میں اور مسجد الحرام کے نزدیک جنگ کی حرمت ان آیات کے ذریعہ منسوخ ہو چکی ہے کہ وَ قَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَةٌ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۳؛ اور ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک سارا فتنہ ختم نہ ہو جائے) اور فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ (سورۂ توبہ، آیت ۵؛ مشرکین کو مار ڈالو جہاں کہیں بھی انھیں پاؤ)

عطا نے کہا ہے: یہ اپنی حرمت پر باقی ہے۔ ہمارے نزدیک بھی حرمت پر باقی ہے اس سلسلہ میں جوان مہینوں میں حرمت کا قائل ہیں اور اس میں جنگ کا آغاز نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح حرم میں۔ اس چیز کو خداوند عالم نے پیغمبرؐ کے لیے فتح کے برس میں اہل مکہ سے قتال (جنگ) کو مباح قرار دیا تھا جس کے متعلق خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا خداوند عالم نے اس گھڑی میرے لیے اسے حلال کر دیا

ہے میرے بعد قیامت تک کے لیے کسی ایک کے لیے حلال و جائز نہیں ہوگا۔

مشرکین میں سے جو لوگ حرم کی حرمت اور ان مہینوں کی حرمت کے قائل نہیں ہیں ان سے کسی بھی وقت جنگ جائز ہے۔اس کے حق میں حرام ہونا منسوخ ہے۔

ارشاد الٰہی ہوتا ہے: وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ (لڑائی کے سلسلے کو جاری رکھیں گے) اے گروہ مسلمین! اہل مکہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ (جب تک وہ تمھیں دین سے برگشتہ نہ کردیں) یہاں تک کہ تمھیں دین اسلام سے پلٹا دیں اور ارتداد کی طرف مائل کردیں۔ إِنِ اسْتَطَاعُوا (اگر ان کا بس چلے) اگر اس پر قدرت پاسکیں۔ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ (اور خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا) یہ مرتد ہونے سے ڈرانا ہے عذاب کے استحقاق کو بیان کرکے۔ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ (اور کفر کی حالت میں مرے گا) یعنی اپنے کفر پر مرے گا تو فَأُولٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (اس کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے) گویا وہ اس طرح ہو جائے گا کہ جیسے اس نے وہ عمل انجام ہی نہ دیا ہو اس لئے کہ عمل کا ضائع اور برباد ہونا اس کے اس صورت اور وجہ کے برعکس انجام پایا ہے کہ جس پر وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنے اعمال پر ثواب کے مستحق ہوئے تھے اور پھر ان کے اعمال ضائع و برباد ہو گئے اس لیے کہ دلیل اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ عمل کا اس طرح سے حبط و برباد ہونا ممکن نہیں ہے۔

وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔

نظم:

اس آیت کریمہ کا نظم اور تقدیر اس طرح ہے: محترم مہینہ میں اور مسجد الحرام کے نزدیک جنگ کے متعلق آپؐ سے سوال کرتے ہیں تو فرما دیجیے: یہ بہت بڑا (گناہ) ہے لیکن اللہ کا انکار کرنا، بیت اللہ اور دین الٰہی سے مسلمانوں کو روکنا اور انھیں ان کے وطن سے نکال باہر کرنا اللہ کے نزدیک بڑی بات اور گناہ کبیرہ ہے۔ یہ کفار ان تمام باتوں کے باوجود تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمھیں دین (اسلام) سے پلٹا دیں لہٰذا یہ تمام باتیں اس چیز سے کہیں عظیم اور بڑی ہیں کہ جس کے متعلق یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۱۸﴾

جولوگ ایمان لائے اور جنھوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا وہ رحمت خداوندی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور انھیں اپنی رحمت سے نوازنے والا ہے۔(۲۱۸)

الفاظ ومعانی:

اَلْهِجْر: اَلْوَصْل کی ضد ہے۔اپنی قوم اور سرزمین سے ہجرت کرنے والوں کو مُهَاجِرِيْنَ کہا جاتا ہے۔انھیں مہاجر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنی زمین کو چھوڑ دیتے ہیں۔

جَاهَدْتُ الْعَدُوَّ مُجَاهَدَةً وَّ جِهَادًا، اس وقت بولتے ہیں جب آپ جنگ میں اپنے آپ کو مشقت اٹھانے پر تیار کریں۔

اَلرَّجَاء: امید۔آیہ کریمہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا میں لَا تَرْجُوْنَ، لَا تَخَافُوْنَ کے معنی میں ہے یعنی تم لوگ نہیں ڈرتے ہو۔یہاں پر رجاء خوف کے معنیٰ میں اس طرح ہے کہ کسی چیز کی امید کے ساتھ اس کے نہ ہونے کا خوف بھی لگا رہتا ہے۔

شان نزول:

یہ آیت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کے واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انھوں نے ماہ رجب میں جنگ کی اور واقدالسہی نے ابن حضرمی کا قتل کر دیا تھا اس وقت کچھ لوگوں نے یہ گمان کیا کہ اگر وہ گناہ سے محفوظ بھی رہ گئے تب بھی ان کے لئے کوئی اجر (وثواب) نہیں ہوگا۔لہٰذا اللہ نے ان کے متعلق آیت نازل فرمائی جس میں ان سے (اجر) کا وعدہ کیا ہے۔

تفسیر:

رحمت الٰہی کے امید

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا (جولوگ ایمان لائے) یعنی جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کی۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا (اور جنھوں نے ہجرت کی) یعنی جنھوں نے اپنے خاندان اور قرابتداروں سے قطع تعلق کیا، گھر بار اور اموال چھوڑ دیئے۔ وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور جہاد کیا خدا کی راہ میں) یعنی کفار سے خدا کی اطاعت میں جنگ کی جو اس کا مقرر کردہ راستہ ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے قرار دیا ہے ان چیزوں (ایمان، ہجرت اور جہاد) کو ان کے فضل وشرف کے بیان اور ان میں رغبت کے لیے جمع کیا ہے نہ کہ اس لیے کہ وہ ان میں سے کسی ایک پر انفرادی طور پر ثواب کا مستحق بن جائے گا۔ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ (وہ رحمت خداوندی کے جائز امیدوار ہیں۔) یعنی دنیا و آخرت میں نعمت الٰہی کی امید کرتے ہیں۔ دنیا میں نصرت و مدد اور آخرت میں ثواب ہے۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ (اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا) ان کے گناہوں کو بخش دے گا۔ رَّحِيْمٌ (اور انھیں اپنی رحمت سے نوازنے والا ہے) ان پر رحم فرمائے گا۔

مومنین کے لئے لفظ رَجَاء (امید) ذکر فرمایا ہے اگرچہ وہ قطعی اور یقینی طور پر ثواب کے حق دار ہوں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں نہیں جانتے ہیں کہ اطاعت خدا پر باقی رہیں گے یا معصیت الٰہی کی طرف پلٹ جائیں گے اور دوسری وجہ جو کہ صحیح ہے یہ ہے کہ وہ اپنے ان گناہوں کی بخشش کے لیے رحمت الٰہی کے امیدوار رہیں جن پر انھیں توبہ کی توفیق نہ ہوئی ہو۔ لہٰذا وہ خداوند عالم سے امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل وکرم سے عذاب کو ان سے دور فرمائے۔ پہلی تفسیر اس کے مذہب (نظریہ) کے اعتبار سے درست ہے جو یہ کہتا ہے کہ مومن اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کرے یا مستقبل میں گناہ کبیرہ انجام دے تو اس کے ایمان کا ثواب برباد اور اکارت ہو جائے گا۔ یہ بات ہمارے مذہب کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔

حسن نے کہا ہے: اس سے مومنین کے لیے امید اور طمع کا واجب ہونا مراد ہے اس لیے کہ رحمت الٰہی کی امید ارکان دین میں سے ہے اور اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (سورۂ یوسف، آیت ۸۷؛ اور خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا)

اللہ کے عذاب سے مطمئن رہنا خسارہ کا باعث ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (سورۂ اعراف، آیت ۹۹؛ اللہ کی تدبیروں سے سوائے خسارہ پانے والوں کے کوئی نڈر نہیں ہوسکتا) اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کے لئے واجب ولازم ہے کہ وہ رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو، نہ ہی اس کے عذاب سے مطمئن ہو جائے جس کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (سورۂ زمر، آیت ۹؛ آخرت کا خوف رکھتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے) اور یہ ارشاد:

یدعون ربھم خوفا وطمعا (سورہ سجدہ، آیت ۱۶؛ اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور طمع کی بنیاد پر پکارتے رہتے ہیں) آیت میں اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ جو شخص (گناہ) کبیرہ پر اصرار کرتے ہوئے مرجائے وہ رحمت الٰہی کا امیدوار نہ ہو اس کے دو سبب ہیں:

اول: دلیل مفہوم بیشتر اہل علم کے نزدیک درست نہیں ہے۔

دوم: ہمارے نزدیک ایمان، ہجرت اور جہاد گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ آیت اس صورت کی شمولیت سے خارج نہیں ہے۔

نظم: اس آیت کے اپنے ماقبل والی آیت سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں عذاب کا ذکر کیا گیا ہے اور بعد کی آیت میں ثواب کا ذکر ہے تاکہ بندہ خوف و رجاء کے درمیان رہے جبکہ یہ چیز حکماء (صاحبان عقل) کی تدبیر کی زیادہ حق دار و مناسب اور استدعا (بلانے) کے لیے زیادہ پرزور ہے۔

❀❀❀❀❀

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

(اے نبی!) یہ پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ آپ فرما دیجیے: ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے، اگرچہ اس میں لوگوں کے لیے منافع بھی ہیں۔ مگر ان دونوں چیزوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے اور پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں تو آپ فرما دیجیے: جو تمھاری ضروریات سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اپنے احکام کو صاف صاف بیان کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔ (۲۱۹) دنیا و آخرت کے بارے میں، یہ لوگ

آپ سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ ان سے کیا معاملہ کیا جائے تو آپ فرما دیجیے: جس طرز عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی اختیار کرنا بہتر ہے اگر تمھارا اور ان کا خرچ مشترک ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں آخر وہ تمھارے بھائی بند ہیں برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے، اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔(۲۲۰)

اہل کوفہ کے نزدیک دو آیتیں ہیں اور دوسروں کے نزدیک آیت ایک شمار کی گئی ہے۔کوفی نے تَتَفَكَّرُوْنَ تک کو ایک آیت شمار کیا ہے اور دوسروں نے وہاں تک کو ایک آیت نہیں مانی ہے۔

قرأت:

عاصم کے علاوہ دیگر اہل کوفہ نے اِثْمٌ كَثِيْرٌ (كَثِيْر کو) ثاء کے ساتھ اور بقیہ قراء نے باء کے ساتھ كَبِيْرٌ پڑھا ہے۔

صرف ابوعمرو نے قُلِ الْعَفْوُ (واوَ) ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ حضرات نے قُلِ الْعَفْوَ فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن حضرات نے باء کے ساتھ كَبِيْرٌ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ باء زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ كَبِيْرٌ، عَظِيْمٌ کے مانند صَغُرَ کے مقابلہ میں ہے۔ كَبِيْر یعنی عظیم، پروردگار عالم نے فرمایا: وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَر ۔علماء نے گناہ کو كَبِيْرَة کہا ہے جب وہ ہلاک کرنے والا ہو جیسے یہ ارشاد الٰہی: كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ اور كَبَائِرَ الْاِثْمِ (سورۂ شوریٰ، آیت ۳۷) لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اسے قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ باء کے ساتھ پڑھا جائے اس لئے کہ شراب خوری اور قمار بازی گناہان کبیرہ میں سے ہیں۔وہ گناہ جو ہلاکت کا باعث نہیں ہے انہیں صَغِيْر اور صَغِيْرَة کہتے ہیں اسے قَلِيْل نہیں کہتے ہیں۔ كَثِيْر کی ضد قَلِيْل ہے جس طرح كَبِيْر کی ضد صَغِيْر ہے اس بات پر یہ ارشاد الٰہی بھی دلالت کرتا ہے: وَ

اِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا یہاں پر اَكۡبَرُ پرسب کا اتفاق ہے اور کسی نے بھی اَكۡثَرُ نہیں پڑھا ہے۔

جن قراء نے ثاء کے ساتھ كَثِيۡرٌ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ شراب اور جوئے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: اِنَّمَا يُرِيۡدُ الشَّيۡطَانُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِى الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۹۱: شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے بارے میں تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کردے اور تمہیں یاد خدا اور نماز سے روک دے)

اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے متعلق دس لوگوں پر لعنت کی ہے: خریدار، جس کے لئے خریدی جائے، شراب کے لئے انگور نچوڑنے والا، جس کے لئے انگور نچوڑا جائے، شراب پلانے والا، شراب ڈھوئی والا، جس کی جانب شراب ڈھوئی جائے، اس کی کمائی کھانے والا اور شراب کا پیسہ دینے والا۔

یہ حدیث كَثِيۡر پڑھنے والے کی قرأت کو قوی بناتی ہے۔

جن قراء نے اَلۡعَفۡوَ کو منصوب پڑھا ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ مَاذَا دو طرح سے استعمال ہوتا ہے:

(۱) مَا، ذَا کے ساتھ ایک اسم ہے

(۲) ذَا، اَلَّذِىۡ کے معنیٰ میں ہے

پہلا، عرب کا یہ کہنا ہے کہ عَمَّا ذَا تَسۡاَلُ تو انہوں نے مَا میں الف کو باقی رکھا ہے اس لئے کہ مَاذَا سے مل کر ایک اسم بن گیا ہے الف وہاں حذف ہوتا ہے جہاں پر الف آخر میں واقع ہو۔ اسی سے شاعر کا یہ شعر ہے:

یَا خُزۡرَ تَغۡلِبَ مَاذَا بَالُ نِسۡوَتِكُمۡ   لَا يَسۡتَفِقۡنَ اِلَى الدَّيۡرَيۡنِ تَحۡنَانَا

یعنی مَا بَالُ نِسۡوَتُكُمۡ تھا۔

جب مَا، ذَا کے ساتھ ایک اسم ہوگا تو وہ اس ارشاد: مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ مقام نصب میں مَا يُنۡفِقُوۡنَ کے مانند ہوگا یعنی اَيًّا مَا يُنۡفِقُوۡنَ تو اس کا جواب اَلۡعَفۡوَ نصب کے ساتھ ہوگا۔

اور جس نے اَلۡعَفۡوُ کو مرفوع پڑھا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے مَاذَا کو دوسری قسم والا قرار دیا ہے گویا اس طرح ہے: مَا الَّذِىۡ يُنۡفِقُوۡنَ تو جواب اَلۡعَفۡوُ آئے گا اس لئے کہ وہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگا یعنی اَلَّذِىۡ يُنۡفِقُوۡنَ الۡعَفۡوُ۔ قرآن کریم میں اس کا نمونہ یہ آیت ہے: وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ مَاذَا اَنۡزَلَ

رَبُّكُمْ قَالُوٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔

جان لیجئے کہ سیبویہ صرف اس آیت میں ذَا کو اَلَّذِی کے معنی میں ماننے کو جائز قرار دیتے ہیں۔اس پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔اہل کوفہ اس آیت کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اسے جائز قرار دیتے ہیں اور اپنے اس عمل کے لئے اس شعر سے دلیل پیش کرتے ہیں:

عَدَسْ مَا لِعَبَّادٍ عَلَيْكِ اَمَارَةٌ	نَجَوْتِ وَ هٰذَا تَحْمِلِيْنَ طَلِيْقُ

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (سورۂ طٰہ، آیت ۱۷) اس آیت میں ان کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے کہ بِيَمِيْنِكَ ممکن ہے کہ جار و مجرور مقام حال میں ہو ایسی صورت میں وہ صلہ نہیں ہوگا۔اسی طرح شعر میں تَحْمِلِيْنَ بھی ہے۔دونوں مقام پر حال میں عامل معنیٔ فعل میں سے ایک شئے مبہم ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْخَمْر کے لغوی معنیٰ اَلسَّتْر کے ہیں۔اسی سے اَلْخِمَار ہے جس کے معنی مَقْنَعَه کے ہیں۔حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْجُدُ عَلَى الْخُمْرَةِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خمرہ جو حصیر کا چھوٹا سجادہ ہے اس پر سجدہ کرتے تھے۔اس نام کی وجہ یہ ہے کہ سجادہ زمین سے چہرہ کو چھپا لیتا ہے۔اصل معنیٰ اَلسَّتْر یعنی پوشیدہ کرنے اور چھپانے کے ہیں۔

اَلْمَيْسِر: جوا۔

ترکیب:

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ میں جار و مجرور کا عامل يُبَيِّنُ ہے یعنی يُبَيِّنُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ فِيْ اَمْرِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ تَتَفَكَّرُوْنَ بھی اس کا عامل ہو سکتا ہے یعنی تَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ اَمْرِ الدُّنْيَا وَ اَمْرِ الْاٰخِرَةِ۔

فَاِخْوَانُكُمْ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔گویا اس طرح ہے: فَهُمْ اِخْوَانُكُمْ۔

عربی زبان میں فَاِخْوَانَكُمْ منصوب بھی ہو سکتا ہے گویا اس طرح مان کر کہ فَاِخْوَانَكُمْ تُخَالِطُوْنَ۔ بہر حال صحیح وہی رفع دینا ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: ہمیں شراب اور جوئے کے متعلق حکم بتلایئے اس لیے کہ یہ عقل کو زائل اور مال کو فنا کردیتے ہیں؟ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

شراب کے نقصانات

خداوند عالم نے دوبارہ احکام شریعت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یَسْـَٔلُوْنَكَ (اے محمد! یہ لوگ) (آپ سے سوال کرتے ہیں) عَنِ الْخَمْرِ (شراب (کے بارے میں)) یہ پی جانے والی ہر نشہ آور چیز ہے جو عقل کو برباد کردیتی ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ جس چیز کا کثیر نشہ آور ہو اس کا قلیل بھی خمر ہے۔ ہمارے علماء کے روایات سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ شافعی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ خمر انگور کا نچوڑ ہے، جب اسے جوش دیا جائے اور وہ اُبل جائے۔ یہ ابوحنیفہ کا نظریہ ہے۔

وَالْمَيْسِرِ (اور جوئے کا کیا حکم ہے؟) یہ ہر قسم کا (قمار) جوا ہے۔ یہ ابن عباس، ابن مسعود، مجاہد و قتادہ اور حسن کا قول ہے۔ یہی بات ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے یہاں تک کہ آپ حضرات نے فرمایا: بچوں کا اخروٹ کے ذریعہ کھیلنا بھی جوا ہے۔ قُلْ فِيْهِمَآ (آپ فرما دیجیے: ان دونوں چیزوں میں) یعنی شراب اور جوے میں۔ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (بڑا گناہ ہے) گناہ عظیم ہے اور کبیر کثرت سے ہے۔

وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (اگرچہ اس میں لوگوں کے لیے منافع بھی ہیں) شراب کا فائدہ اس طرح ہے کہ جسے پی کر وہ لذت، طرب، قوت اور مستی و سرور کی کیفیت حاصل کرتے ہیں۔ جوئے کا فائدہ اس طرح ہے کہ جواری اپنے ساتھی کے مال پر کسی محنت و مشقت کے بغیر حاصل کر لیتا ہے اور کمزوروں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (مگر ان دونوں چیزوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے) یعنی دونوں میں موجود گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے اور دونوں میں موجود گناہ آخرت میں اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ اس سے نہایت مختصر فائدہ حاصل ہوتا ہے جسے بقا و دوام نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے: اس آیت میں حرمت

شراب کی دو دلیلیں ہیں:

اول: ارشاد الٰہی: وَاِثۡمُهُمَاۤ اَکۡبَرُ (دونوں کا گناہ بہت بڑا ہے) جب کسی چیز کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہو جاتا ہے تو عقل اس سے بچنے کا تقاضا کرتی ہے۔

دوم: خداوند عالم نے بیان فرمایا ہے کہ دونوں (شراب اور جوے) میں گناہ ہے۔ دوسری آیت میں گناہ کو حرام قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ ... (سورۂ اعراف، آیت ۳۳؛ (اے نبی) آپ فرما دیجیے! میرے رَبّ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہ یہ ہیں! بے شرمی کے کام خواہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ طور سے اور ہر گناہ کی بات---

کہا گیا ہے کہ لغت میں خمر (شراب) کو اِثۡم کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے:

شَرِبۡتُ الۡاِثۡمَ حَتّٰی ضَلَّ عَقۡلِیۡ   کَذَاكَ الۡاِثۡمُ یَصۡنَعُ بِالۡعُقُوۡلِ

(میں نے اثم یعنی خمر پی لی یہاں تک کہ میری عقل گم ہو گئی، اثم یعنی خمر عقلوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہے)

خدا اِثۡم کی صفت کبیر لایا ہے اور کبیرہ حرام ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ دونوں کا گناہ دونوں کی حرمت کے بعد ان کے نفع سے بڑا ہے دونوں کے حرام کیے جانے سے قبل۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ دونوں حرمت سے قبل ہیں یعنی وہ گناہ جو دونوں کے اسباب سے پیدا ہوتا ہے دونوں کے نفع سے بڑا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت شراب اور جوے کی حرمت پر دلالت نہیں کر رہی ہے بلکہ سورۂ مائدہ کی آیت دلالت کر رہی ہے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَیۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (سورۂ مائدہ، آیت ۹۰؛ اے ایمان والو! بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے یہ سب گندے ناپاک اور شیطانی عمل ہیں، ان سے پرہیز کرو تا کہ تمھیں فلاح نصیب ہو)

اس کا ارشاد: وَیَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ (اور پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں) یعنی کون سی چیز خرچ کریں سائل عمرو بن الجموح تھے جنھوں نے جہاد میں خرچ کے بارے میں سوال کیا تھا۔ کہا گیا ہے کہ صدقات میں خرچ کے بارے میں سوال کیا تھا۔

قُلِ الۡعَفۡوَ (تو آپ فرما دیجیے جو تمھاری ضروریات سے زیادہ ہو) اس سے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: جو اہل وعیال کے اخراجات سے بچ رہے یا دولت وثروت سے اضافی ہو۔ یہ ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے۔

دوم: عفو فضول خرچی اور نان ونفقہ میں تنگی کی درمیانی حالت کو کہتے ہیں۔ یہ حسن اور عطا سے مروی ہے۔ یہی بات امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

سوم: عفو وہ چیز جو سال بھر کی خوراک سے بچ رہے۔ یہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حکم آیت زکوٰۃ کے ذریعہ منسوخ ہو گیا ہے۔ اسے سدی نے بیان کیا ہے۔

چہارم: عفو پاکیزہ اور افضل مال ہے۔

اللہ کا ارشاد: كَذٰلِكَ (اس طرح) کاف کو واحد اس لیے لایا ہے کہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، اور اس میں امت داخل ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہے: كَذٰلِكَ اَيُّهَا الْقَبِيْلُ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ (اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اپنے احکام کو صاف صاف بیان کر دیتا ہے) یعنی نفقہ، شراب اور جوئے کے متعلق حجتیں اور دلائل۔ کہا گیا ہے کہ تمام اسلامی احکام کے بارے میں ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم غور وفکر سے کام لو فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (دنیا وآخرت کے بارے میں) امر دنیا اور امر آخرت کے بارے میں۔ تو تم جان لوگے کہ دنیا آزمائش وتکالیف اور فنا کا گھر ہے اور آخرت دار جزا و بقا ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں زہد اختیار کرو اور آخرت کی طرف رغبت پیدا کرو۔ کہا گیا ہے کہ یبین سے مربوط ہے یعنی جس طرح وہ تمہارے لیے شراب اور جوے کے بارے میں آیات بیان کرتا ہے۔ (اسی طرح) دنیاوی اور اخروی امور کے بارے میں اپنی آیات بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان نشانیوں میں غور وفکر کرو جو اس بات پر دلالت ہے کہ خداوند عالم ان سے چاہتا ہے کہ غور وفکر کریں چاہے وہ غور وفکر کریں یا غور وفکر نہ کریں۔

ارشاد الٰہی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى (یہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ ان سے کیا معاملہ کیا جائے) ابن عباس نے کہا ہے: جب خدا نے آیت: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (سورۂ انعام، آیت ۱۵۲؛ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جانا مگر احسن طریقے سے یہاں تک کہ وہ سن رُشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں انصاف سے کام لینا ہم ہر شخص کو اُتنی ہی ذمہ داری دیتے ہیں جتنی وہ

وسعت رکھتا ہے اور جب بات کہو تو عدل سے کام لو خواہ قرابت داری کا ہی معاملہ کیوں نہ ہو۔ اور اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرو۔ تمھیں ان باتوں کی نصیحت کی جاتی ہے شاید کہ تم نصیحت کو قبول کرلو) اور آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (سورۂ نساء، آیت ۱۰؛ وہ لوگ جو یتیم کا مال ظالمانہ طریقے سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھر رہے ہیں اور وہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیے جائیں گے) نازل فرمائیں تو جس کے پاس بھی کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اور پانی اپنے کھانے اور پانی سے علیحدہ کردیا۔ یہ بات ان پر شاق اور دشوار ہوئی، چنانچہ انھوں نے اس بارے میں دریافت کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یہاں پر کلام میں کچھ پوشیدہ ہونا لازمی و ضروری ہے اس لیے کہ سوال خود یتیموں سے متعلق نہیں ہوا ہے، نہ ہی اس کا جواب وارد ہوا ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ آپ سے (لوگ) یتیموں اور ان کے اموال میں تصرف کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو قُلْ اے محمدؐ! آپ کہہ دیجیے: اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ (جس طرز عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی اختیار کرنا بہتر ہے) یعنی اجرت اور عوض لیے بغیر ان کے اموال میں اصلاح بہتر اور اچھی بات ہے اور اس میں اجر عظیم ہے۔ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ (اگر تمھارا اور ان کا خرچ مشترک ہو) اگر تم ان کے اموال میں شریک ہو اور ان کے اموال کو اپنے اموال میں مخلوط کرو، اسی طرح تم ان کے اموال میں عوض حاصل کرو گے ان کے امور انجام دینے کے سبب۔ فَاِخْوَانُكُمْ (تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں آخر وہ تمھارے بھائی بند ہیں) یعنی وہ تمہارے برادر ہیں اور بھائی بھائی ایک دوسرے کی اعانت اور مدد کرتے ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے اموال پاتے ہیں، اس طرح انھیں اس بات کی اجازت دی گئی ہے جس میں انھیں یتیموں کے اموال کھانے پینے اور مسکن (وغیرہ) میں مخلوط کرنے سے حرج اور زحمت پیدا ہوتی تھی۔ اسی طرح اس بارے میں انھیں اجازت دی گئی ہے کہ جب وہ یتیموں پر فراوانی کے ساتھ ان کی بھلائی کے طلب گار ہوں۔ یہ حسن وغیرہ کا قول ہے۔ یہی بات ہماری روایات میں مروی ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے) یعنی ہیں خداوند عالم اس کے بارے میں بخوبی جانتا ہے جس کا مقصد یتیموں کے (اموال) میں اپنے اموال مخلوط کرنے میں ان کے مال کو برباد ہے یا ان کے اموال کی اصلاح کرنا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ (اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا) یعنی تمھارے لیے یتیموں کے معاملہ اور ان سے مخلوط ہونے کو تنگ کردیتا اور ان سے مشارکت جس سے تم بچنا چاہتے ہو، تمھارے لیے لازمی

قرار دے دیتا۔ زجاج نے بیان کیا ہے: تمھیں اس چیز کی زحمت و تکلیف دیتا جو تم پر شاق اور دشوار ہوتی اور تم سرزنش کرتے حال آں کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس آیت میں مجبرہ کے قول کے بطلان پر دلالت ہے چونکہ جب خداوند عالم نے ان پر تنگی اور دشواری نہیں چاہی اور وہ انھیں دشواری اور تنگی میں مبتلا کرتا تو جائز اور اچھا ہوتا بلکہ ان پر وسعت پیدا اس لئے کہ کشائش دینے میں نعمت ہے۔ لہٰذا ان کے لیے خدا کا تکلیفِ مَالا یُطَاق چاہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ اور کس طرح انھیں تکلیف دی جاسکتی ہے اس چیز کی جس کے لئے مکلف کے پاس کوئی چارہ نہ ہو اور انھیں اس چیز کا حکم کس طرح دے سکتا ہے جس کا انجام دینا اس کی طرف سے قابل تصور نہ ہو؟ کون سی تنگی اور زحمت ہے جو اس سے بڑھ کر ہوگی؟

بلخی نے کہا ہے: اس آیت میں اس کے نظریہ کے بطلان پر دلیل ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ خداوند عالم ظلم پر قادر نہیں ہے، اس لیے کہ ایسی تکلیف کے ذریعہ تنگی میں مبتلا کرنا جو (اللہ) کی حکمت میں جائز نہیں ہے وہ اس پر قادر ہے اگر چاہے تو انجام دے سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ (مگر وہ صاحب اختیار) اپنی قدرت کے سبب اسے انجام دے سکتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا دفع نہیں کرسکتا۔ حَكِيْمٌ (صاحب حکمت (بھی) ہے) اپنی تدبیر و افعال میں (صاحب حکمت ہے) اس کی حکمت جس چیز کا تقاضا کرتی ہے اس سے کوئی مانع نہیں ہوسکتا۔

❀❀❀❀❀

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

اور تم لوگ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، یقیناً ایک مومن کنیز مشرک عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تمھیں کتنی ہی بھلی معلوم ہو،

اور اپنی لڑکیوں کا نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں کہ ایک مومن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمھیں بہت پسند ہو، یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور خدا اپنے حکم سے جنّت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔(۲۲۱)

الفاظ و معانی:

نِکاح کا استعمال عقد اور وطی (جماع) کے لیے ہوتا ہے نیز کہا گیا ہے کہ اس کے حقیقی معنیٰ اَلْوَطْئِ (جماع) کے ہیں پھر اس کا کثرت استعمال ہوا یہاں تک کہ عقد کو بھی نکاح کہا جانا لگا۔ نَکَحَ یَنْکِحُ نِکَاحاً: اس نے شادی کی، اَنْکَحَهٗ غَیْرُہٗ: دوسرے نے شادی کرائی۔ جس طرح حَدَث (نجاست و فضلہ) کو عَذِرَۃ کہنے لگے حالانکہ وہ فِنَاء (صحن) کے معنیٰ میں تھا۔ اسی طرح حَدَث کو غَائِط کہنے لگے حالانکہ اس کے معنیٰ پرسکون جگہ کے ہیں۔　اَلْاَمَۃ: کنیز۔

ترکیب:

یُؤْمِنَّ، پوشیدہ اَنْ کی وجہ سے محلاً منصوب ہے اور اَن یُؤْمِنَّ، حَتّٰی کی وجہ سے محلاً مجرور ہے اور حَتّٰی، تَنْکِحَ کے متعلق ہے۔ مِنْ مُشْرِکَۃٍ، خَیْرٌ سے متعلق ہے اور جار و مجرور محلاً منصوب ہے اس لئے کہ مفعول بہ ہے۔

وَلَوْ اَعْجَبَتْکُمْ، لَوْ کا جواب محذوف ہے گویا اس طرح ہے: وَلَوْ اَعْجَبَتْکُمْ اَمَۃٌ مُشْرِکَۃٌ لَاَمَۃٌ مُؤْمِنَۃٌ خَیْرٌ مِنْهَا (چاہے مشرک لڑکی تمہیں کتنی ہی بھلی معلوم ہو تب بھی مومنہ کنیز اس مشرکہ سے بہتر ہے)

وَ لَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکِیْنَ۔ اس جملہ میں مفعول دوم محذوف ہے اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکِیْنَ الْاَزْوَاجَ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا (اور مشرکین کی عورتوں سے شادی مت کراؤ جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں) حَتّٰی یُؤْمِنُوْا اور وَلَوْ اَعْجَبَکُمْ کی ترکیب وہی ہے جو حَتّٰی یُؤْمِنَّ اور لَوْ اَعْجَبَتْکُمْ کی ترکیب ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیت مرثد بن ابو مرثد الغنوی کے بارے میں نازل ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں مکہ روانہ کیا تھا تاکہ وہاں سے مسلمانوں کو نکال لائیں۔ یہ قوی اور بہادر شخص تھے، ایک عورت جس کا نام عناق تھا اس نے انھیں اپنی طرف دعوت دی (اپنی جانب لبھایا) انھوں نے انکار کردیا۔ زمانہ جاہلیت میں اس عورت سے مرثد کی محبت تھی۔ اس نے کہا: کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے لوں، جب وہ حضورؐ سے اجازت لینے کے لیے پلٹے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

شادی کس سے؟!

ایک دوسرے سے مخلوط اور پیوستہ ہونے کا ذکر گذر چکا تو خداوند عالم نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ کس کے ساتھ نکاح کے ذریعہ مخلوط (باہم پیوستہ ہونا) و آمیزش جائز ہے۔ ارشاد فرمایا: وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ (اور تم لوگ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرنا) یعنی کافر عورتوں سے ازدواج نہ کرو۔ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ (جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں) اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق نہ کردیں۔ آیت ہمارے نزدیک اہل کتاب وغیرہ تمام کفار سے شادی کرنے کی حرمت میں عام ہے جو نہ تو منسوخ ہوئی ہے نہ اور ہی مخصوص کی گئی ہے، اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کو مشرک نہیں کہا جائے گا۔ خداوند عالم نے دونوں کے درمیان حد فاصل رکھ دی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (سورۂ بینہ، آیت ۱؛ اہل کتاب میں سے جو کافر ہو گئے اور مشرکین اس وقت تک کفر سے جدا ہونے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس روشن دلیل نہ آجاتی) اور مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ؛ اے رسول! اہل کتاب میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا وہ اور مشرکین یہ نہیں چاہتے) ایک کو دوسرے پر عطف کیا گیا ہے۔ آیت میں نسخ نہیں ہے، نہ ہی تخصیص ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے: آیت تمام کفار کو شامل ہے اور شرک کا اطلاق ان تمام پر ہوتا ہے اور جو شخص

ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرے تو اس نے آپ کے معجزہ کا انکار کیا ہے اور اسے غیر اللہ کی جانب منسوب کیا ہے اور یہ بعینہ شرک ہے اس لئے کہ معجزہ اللہ کی جانب سے آپ کی نبوت کی گواہی ہے۔

پھر مفسرین نے اختلاف کیا ہے، ان میں بعض نے کہا ہے: یہ آیت ان اہل کتاب خواتین کے سلسلہ میں اس آیت کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے جو سورۂ مائدہ میں ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (سورۂ مائدہ، آیت ۵؛ اور ان قوموں کی آزاد عورتیں بھی حلال قرار دی گئی ہیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے) یہ ابن عباس، حسن اور مجاہد سے مروی ہے۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: آیت اہل کتاب عورتوں کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے مخصوص ہے۔ یہ قتادہ اور سعید بن جبیر سے مروی ہے ان میں سے بعض نے کہا ہے: یہ آیت ہر کافرہ عورت چاہے اہل کتاب سے نکاح کی حرمت کو ظاہر کرتی ہے چاہے وہ اہل کتاب ہو یا مشرکہ ہو۔ یہ ابن عمر اور بعض زیدیوں سے یہی مروی ہے، یہی ہمارا نظریہ ہے۔ عنقریب سورۂ مائدہ کی آیت کا بیان اپنے مقام پر آئے گا انشاء اللہ!

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ (یقیناً ایک مومن کنیز مشرک عورت سے بہتر ہے) یعنی مسلم سچی کنیز آزاد مشرکہ عورت سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ (چاہے وہ تمھیں کتنی ہی بھلی معلوم ہو) اگرچہ تمھیں اس کا مال، حسب اور جمال بھلا ہی کیوں نہ لگے۔ آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کر رہا ہے مومنہ کنیز کا نکاح مَقْدِرَتْ کی موجودگی (سہولت کی صورت) میں جائز ہے اور اللہ کا ارشاد: وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا ... (سورۂ نساء، آیت ۲۵؛ اور تم میں سے جو شخص اتنی مَقْدِرَتْ نہ رکھتا ہو۔۔۔) آیت تنزیہ کے لیے ہے نہ کہ حرمت کے لیے۔

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا (اور اپنی لڑکیوں کا نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا) یعنی مسلمان عورتوں کسی بھی کافر سے شادی نہ کرنا چاہے وہ اہل کتاب ہو یا اہل کتاب نہ ہو جب تک کہ وہ ایمان قبول کر لیں۔ یہ ارشاد اس شخص کے قول کی تائید کر رہا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ارشاد الٰہی: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ تمام کافر عورتوں کو شامل ہے۔

ارشاد الٰہی وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ (کہ ایک مومن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے) یعنی تصدیق کرنے والا مسلمان بندہ مشرک آزاد سے کہیں بہتر و افضل ہے اگرچہ تمھیں اس کا مال حلال اور حسن و جمال بھلا ہی کیوں نہ لگے۔ وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ (اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو) اور وَاِنْ اَعْجَبَكُمْ کے درمیان

فرق یہ ہے کہ لَوْ ماضی کے لیے ہے اور اِنْ مستقبل کے لیے ہے۔ دونوں ہی آیت کے معنی میں صحیح ہیں۔ وہ اس عجب کے معنی میں ہے جو اِسْتِعْظَام (یعنی عظیم اور عظمت) کے معنی میں ہے تعجب کے معنی میں نہیں ہے۔ اُولٰٓئِكَ (یہ لوگ) یعنی مشرکین۔ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں) یعنی کفر اور معصیت (کی طرف دعوت دیتے اور بلاتے ہیں) جو آتش جہنم میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ یہ تعلیل کے مانند ہے چونکہ زیادہ تر شوہر اپنی زوجہ کو دین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ (اور خدا جنّت کی دعوت دیتا ہے) یعنی اللہ ایسے اعمال کی طرف دعوت دیتا ہے جو جنت میں جانے کا سبب ہیں۔ وَالْمَغْفِرَةِ (اور مغفرت کی (دعوت دیتا ہے)) جس کا تعلق ایمان اور اطاعت سے ہے۔ بِاِذْنِهٖ اپنے امر اور حکم سے۔ یعنی جن شرائع اور احکام کا حکم دیتا اور اس کی اجازت دیتا ہے۔ یہ حسن اور جبائی کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے اعلان سے۔

ارشاد الٰہی: وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ (اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے) اپنی حجتیں اور دلائل بیان کرتا ہے، ایک قول ہے کہ اپنے اوامر اور نواہی اور جن چیزوں سے منع کرتا ہے اور جن چیزوں کو مباح قرار دیتا ہے ان سب کو بیان کرتا ہے، لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ تاکہ وہ وعظ و نصیحت حاصل کریں۔

❀❀❀❀❀

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

یہ لوگ آپ سے ایام حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں: فرما دیجیے کہ وہ ایک تکلیف دِہ امر ہے۔ تم دوران حیض عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس اس طرح جاؤ جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو توبہ کرنے والے اور پاکیزگی اختیار کرنے والے ہیں۔ (۲۲۲)

قرأت:

حفص کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے حَتّٰی یَطَّهَّرْنَ طاء اور ہاء کو تشدید کے ساتھ قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے حَتّٰی یَطْهُرْنَ طاء اور ہاء کو بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔

حجت:

جن حضرات نے یَطْهُرْنَ (بغیر تشدید کے) پڑھا ہے تو انہوں نے اسے طَهُرَتِ الْمَرْأَةُ وَ طَهَرَتْ طُهْرًا وَّ طَهَارَةً سے مشتق بنایا ہے اور طَهَرَتْ فتحہ کے ساتھ زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ طَهَرَتْ طَمَثَتْ کی ضد ہے لہٰذا اسے بھی طَمَثَ کے وزن و بنا پر ہونا چاہئے اور ان کا طَاهِر کہنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ قَعَدَ فَهُوَ قَاعِد کے مانند ہے۔

جن قراء نے یَطَّهَّرْنَ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک اس کی اصل یَتَطَهَّرْنَ (باب تفعل) سے ہے اور انھوں نے تاء کو طاء میں ادغام کر دیا ہے۔

الفاظ و معانی:

اِعْتِزَال: کسی چیز سے دوری اختیار کرنا۔

اَلطُّهر، اَلدَّنَس (نجاست) کی ضد ہے۔ اَلطَّهُوْر اسم بھی ہو سکتا اور صفت بھی، اگر اسم ہو گا تو اس کی دو قسمیں ہیں:

اول: مصدر ہو گا جس کی حکایت سیبویہ نے کی ہے۔ تَطَهَّرْتُ طَهُوْرًا حَسَنًا وَ تَوَضَّأْتُ وَضُوْءًا

دوم: اسم ہو گا لیکن مصدر نہیں ہو گا جیسا کہ آیا ہے: طُهُوْرُ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ (تمہارے برتن کی اس طرح طہارت ہونا چاہئے) وارد ہوا ہے۔ پس طہور اسم ہے اس چیز کے لئے جو پاک ہو جیسے فُطُوْر، وُجُوْد، سُقُوْط اور سُحُوْر اگر صفت ہو گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (اور ہم نے آسمان سے پاک و پاکیزہ پانی نازل کیا) (۴۸:الفرقان:۲۵) رَسُوْل اور عَجُوْز وغیرہ کے وزن پر ہے۔

ترکیب:

مِنْ حَیْثُ جار و مجرور ہیں۔ البتہ حَیْثُ مبنی ہے، اس کی حرکت نہیں بدلتی ہے اور وہ حرف سے مشابہت کی بنا پر مبنی ہے اس لئے کہ وہ اسی وقت معنیٰ دیتا ہے جب دوسرے کلمہ کے ساتھ ہو کہ حرف کی صورت حال بھی یہی ہے۔ مِنْ حَیْثُ جار و مجرور کا متعلق فَأْتُوْهُنَّ ہے۔ جملہ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ مجرور ہے، حَیْثُ کے مضاف ہونے کی بنا پر۔

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں حائضہ عورت کے ساتھ کھانے پینے اور نشست و برخاست کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس بارے میں لوگوں نے سوال کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حسن، قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ مقام دُبُر میں وطی کو جائز سمجھتے تھے۔ جب اس بارے میں (آنحضرتؐ) سے دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کی حرمت بیان کی۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا قول زیادہ قوی ہے۔

تفسیر:

حیض کے احکام

پھر خداوند عالم نے دوسرا حکم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَيَسْئَلُوْنَكَ (اے محمد! آپ سے سوال کرتے ہیں) جیسا کہ کہا گیا ہے سائل ابوالدحداح تھا، عَنِ الْمَحِيْضِ (ایام حیض کے بارے میں) یعنی حیض اور اس حالات کے متعلق تو قُلْ اے محمد! (کہہ دیجئے) هُوَ اَذًى (یہ ایک تکلیف دِہ امر ہے) اَذًى یعنی پلیدگی اور نجاست، یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ کہا گیا ہے: خون، یہ مجاہد کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ (حائضہ) عورتوں کے لیے اذیت و تکلیف ہے جس میں ان پر زحمت و مشقت ہوتی ہے، اسے قاضی نے بیان کیا ہے۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ (تم دوران حیض عورتوں سے الگ رہو) یعنی ان کی فرج میں مجامعت سے پرہیز کرو۔ یہ ابن عباس، عائشہ، حسن و قتادہ اور مجاہد سے مروی ہے۔ یہ محمد بن حسن کا بھی قول ہے۔

ہمارے مذہب و نظریہ کے موافق ہے یہ کہ (جماع) خون کے مقام کے علاوہ حرام نہیں ہے۔ کہا گیا ہے

شلوار کے بغیر حرام ہے اور اس کے اوپر سے حلال ہے۔ یہ شریح وسعید بن المسیب سے مروی ہے۔ یہ ابوحنیفہ اور شافعی کا بھی قول ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ (اور ان کے قریب نہ جاؤ) جماع کے ذریعہ یا تہمند کے نیچے سے، اس میں اختلاف ہے۔ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (جب تک وہ پاک صاف نہ ہو جائیں) بغیر تشدید کے معنی یہ ہیں کہ یہاں تک کہ ان کا خون آنا بند ہو جائے اور يَطَّهَّرْنَ تشدید کے ساتھ معنی یہ ہیں کہ وہ غسل کرلیں۔ یہ حسن سے منقول ہے۔ اور وضو کرلیں۔ یہ مجاہد و طاؤس سے مروی ہے۔ یہی ہمارا مذہب و نظریہ ہے۔ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ (پھر جب وہ پاک ہو جائیں) یعنی غسل کرلیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وضو کرلیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ شرمگاہ کو دھولیں۔ فَاْتُوهُنَّ (تو اُن کے پاس اس طرح جاؤ) اور ان سے جماع کریں۔ یہ حکم مباح ہے اگرچہ صیغہ، صیغۂ امر ہے جس طرح یہ ارشاد ہے: اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (جب تم احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کرو) مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے) یعنی وہاں جماع کرو جہاں اللہ نے تمھیں حالت حیض میں جماع کرنے سے پرہیز کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ فرج ہے۔ یہ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔ ایک قول ہے کہ حیض کے علاوہ پاکیزگی سے قبل۔ یہ سدی اور ضحاک سے مروی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ نکاح سے قبل۔ فجور کے علاوہ یہ ابن الحنفیہ سے مروی ہے۔ قول اول ظاہر کے زیادہ نزدیک ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ جہات جن میں عورت سے نزدیکی اختیار کرنا حلال ہے۔ ان سے نزدیکی اختیار نہ کرو، اس طرح جو پسندیدہ نہ ہو یعنی ان سے نزدیکی اختیار نہ کرو جب کہ وہ روزے سے ہوں یا حالت احرام میں اور حالت اعتکاف میں ہوں۔ فراء نے کہا: ہے۔ اگر فرج مقصود ہوتی تو فی حَيْثُ فرماتا چونکہ مِنْ حيثُ کہا ہے تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس سے وہ جہت مراد ہے جس کا تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ ایک دوسرے مفسر نے کہا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں) وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (اور انھیں پسند کرتا ہے جو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہیں) کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ پانی سے طہارت کرنے والے۔ یہ عطا سے مروی ہے۔ اسی بات کو آیت کے سبب نزول میں ہمارے علماء نے بھی روایت کی ہے کہ کہا گیا ہے گناہوں سے طہارت حاصل کرنے والے۔ یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ المطہرات کا ذکر نہیں کیا ہے اس لیے کہ مونث مذکر میں داخل ہے۔ کہا گیا ہے کہ گناہان کبیرہ سے توبہ کرنے والے اور گناہان صغیرہ سے طہارت حاصل کرنے والے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ حیض کی حالت میں عورت سے علیحدہ رہنا واجب ہے اس میں حرمت کی غایت وسبب کا بھی ذکر ہے، یہ (بیان) چند فصلوں پر مشتمل ہے:

اول: حیض کا ذکر اور اس کا کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ ہونا ہمارے نزدیک حیض کی کم از کم مدت تین روز ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ یہ اہل عراق کا بھی قول ہے۔ شافعی اور بیشتر اہل مدینہ کے نزدیک کم از کم ایک دن ایک رات اور زیادہ سے زیادہ پندرہ روز ہے۔

دوم: حالت حیض میں وطی کا حکم: ہمارے نزدیک اس طرح ہے کہ اگر (عورت) حیض کے پہلے مرحلہ میں ہے تو اس پر وطی کرنے کی صورت میں ایک دینار (کفارہ) واجب ہے۔ اگر درمیانی حالت میں ہے تو نصف دینار واجب ہے، اگر آخری مرحلہ میں ہے تو ایک چوتھائی دینار (بطور کفارہ) ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے: ایک دینار (کفارہ) ہے انھوں نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اس پر بُدنہ بچہ شتر یا غلام آزاد کرنا یا بیس صاع (ساٹھ کلو غلہ) واجب ہے۔

سوم: جماع کے حرام ہونے کی حد تو اس بارے میں اختلاف ہے، بعض علماء نے انتہائے حرمت خون حیض کا منقطع ہونا قرار دیا ہے، ان میں سے بعض نے کہا ہے: جب عورت وضو کرلے یا شرمگاہ کو دھولے تو اس سے ہمبستری جائز ہے۔ یہ عطا و طاؤس کا قول ہے۔ یہی ہمارا نظریہ ہے، اگرچہ مستحب ہے کہ اس سے مقاربت ونزدیکی اختیار نہ کرے جب تک کہ وہ غسل نہ کرلے۔ بعض نے کہا ہے جب خون بند ہوجائے اور عورت غسل کرلے تو اس سے ہمبستری جائز ہے۔ یہ شافعی کا قول ہے۔ بعض نے کہا ہے: اگر عورت کو حیض دس روز آتا ہو تو خون کا بند ہونا ہی جماع کو حلال قرار دے گا، اگر خون دس روز سے پہلے ہی بند ہو تو ہمبستری جائز نہیں ہے مگر غسل یا تیمم کے بعد یا اس پر وقت نماز گذر جائے۔ یہ ابو حنیفہ کا قول ہے۔

❁❁❁❁❁

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۲۳﴾

عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ، اور اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ ایک دن تمھیں اُس سے ملاقات کرنی ہے اور (اے نبی) آپ مومنین کو خوش خبری سنا دیں۔ (۲۲۳)

ترکیب:

اَنّٰی محلاً منصوب ہے اس لئے کہ ظرف مکان مبنی، حَیْثُ یا اَیْنَ کے معنیٰ میں ہے یا ظرف زمان ہے جب مَتٰی کے معنیٰ میں ہو اور اس میں عامل فَاْتُوْا ہے۔ شِئْتُمْ جملہ فعلیہ ہے محلاً منصوب ہے اس لئے کہ ظرف اس کی جانب مضاف ہوا ہے۔ جب اَنّٰی کَیْفَ کے معنیٰ میں ہوگا تو محلاً منصوب ہوگا مصدر (مفعول مطلق) کی بنا پر اور شِئْتُمْ کا کوئی محل اعراب نہ ہوگا گویا اس طرح ہوگا: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَيَّ نَوْعٍ شِئْتُمْ (تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی کے پاس آؤ)

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ آیت یہودیوں کی رد میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مرد عورت کے ساتھ اس کی دُبُر سے وطی کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ پس خداوند عالم نے ان کی تکذیب کی۔ یہ ابن عباس اور جابر سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہودی عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر جماع کرنے کو منع کرتے تھے۔ خداوند عالم نے اس کے متعلق اباحت کا حکم نازل فرمایا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

تفسیر:

نوع بشر کی حفاظت کا ذریعہ

خداوند عالم نے عورتوں کی پاکیزگی اور حیض کی حالت کو بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں) اس ارشاد میں دو وجہیں ہیں:

اول: یعنی عورتیں تمہاری زراعت اور کھیتیاں ہیں۔ ابن عباس و سُدی سے روایت ہے۔

دوم: یعنی عورتیں تمہارے لیے زراعت والیاں ہیں جن میں تم اولاد اور لذت کی زراعت اور کھیتی کرتے ہو۔ اس جملہ میں مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ یہ معنی میں پہلے قول کے مانند ہی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: 'حَرْثَ' (کھیتی) کے ذریعہ جماع سے کنایہ کیا گیا ہے۔

سوم: یعنی تمہارے لیے کھیتی کے مانند ہیں۔ کاف تشبیہ حذف کر دیا گیا ہے۔ عرب نے عورت کو

حرث کہا ہے۔ مفضل بن سلمہ نے کہا کہ شاعر نے شعر کہا ہے:

اِذَا اَكَلَ الْجَرَادُ حُرُوْثَ قَوْمٍ فَحَرْثِيْ هَمُّهٗ اَكْلُ الْجَرَادِ

حَرْثِیْ یعنی اِمْرَاتِیْ کی جگہ (میری بیوی)

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ (اپنی کھیتی میں جاؤ) یعنی کھیتی کرنے کی جگہ

اَنّٰى شِئْتُمْ (تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو) یعنی جہاں سے چاہو۔ یہ قتادہ وربیع سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس طرح تم چاہو۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب چاہو۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ اہل لغت کے نزدیک یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ 'اَنّٰى' فقط کہاں سے کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ کہا ہے: اَنّٰى لَكِ هٰذَا (یہ تمھارے پاس کہاں سے آیا؟) کہا گیا ہے کہ انیٰ کے معنی کسی بھی صورت کے ہیں۔ ممکن ہے کہ کیف کے معنی میں ہو (یعنی کس طرح اور کیفیت کے معنی میں ہو) مالک نے ارشاد الٰہی اَنّٰى شِئْتُمْ کے ذریعہ عورت کی دبر میں جماع کرنے پر دلیل پیش کی ہے۔ اس کی روایت نافع نے ابن عمر سے کی ہے اور اس کی حکایت زید بن اسلم نے محمد بن منکدر سے کی ہے۔ اسی چیز کو ہمارے بیشتر علما نے کہا ہے اور تمام فقہا نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حرث (کھیتی) نہیں ہوتی ہے مگر نسل کے اعتبار سے۔ لہٰذا جماع کو نسل کے لیے ہی ہونا چاہیے۔ ان کی اس بات کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ عورتیں اگرچہ ہمارے لیے کھیتیاں ہیں اس لیے ہمارے لیے ان سے کھیتی کے مقام کے علاوہ جماع مباح ہے، کسی اختلاف کے بغیر، جس طرح فرج کے علاوہ میں جماع کرنا اور اس کے مانند۔

ارشاد الٰہی: وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ (اور اپنے مستقبل کی فکر کرو) یعنی اپنے اعمال صالحہ اللہ کے حضور بھیجو جن کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اور جن میں تمھیں رغبت دلائی گئی ہے تاکہ (اللہ کے یہاں) تمھارے لیے ذخیرہ ہو سکیں، اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب متعدد اشیاء کا حکم گذر چکا تو اس کے بعد ارشاد فرمایا: جس چیز کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اس کی اطاعت کر کے اپنے لئے بھیج دو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور اللہ سے ڈرتے رہو) یعنی جو حدود تمھارے لیے بیان کیے ہیں انھیں تجاوز کرنے سے خدا کے عذاب سے ڈرو۔ اس جملہ میں واجب پر عمل کرنے کی ترغیب کی گئی ہے، جسے جانتے ہیں اور اس چیز کی مخالفت سے ڈرایا گیا ہے جس کا تمھیں پابند بنایا گیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس مقام پر تقدیم کے معنی فرزند کی طلب و خواہش ہے اس لیے کہ فرزند صالح کی تمنا کرنا عظیم تقدیم (پیشکش) ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: جب کوئی فرزند آدم

انتقال کر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین قسم (کے افراد) کے: فرزند صالح چھوڑا ہو جو اس کے حق میں دعا کرے، صدقہ جاریہ اور ایسا علم جس سے اس کی موت کے بعد استفادہ کیا جائے۔

کہا گیا ہے کہ خوشیوں کا بھیجنا ہے جیسا کہ ارشاد ہے کہ اس بارے میں جو تین ایسے فرزند پیش کرے (یعنی تین ایسے فرزند ہوں) جو باطل کی طرف میلان و جھکاؤ نہ رکھتے ہوں۔ انھیں آتش جہنم مس نہیں کرے گی مگر قسم اسے جائز کر دے گی۔ لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! دوسرا؟ فرمایا: وقت جماع بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ' کہنا ہے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ جماع کے وقت دعا، یہ مجاہد سے مروی ہے۔

اس کی تائید ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی سے نزدیکی کرنا چاہے تو اس طرح کہے: بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنِي الشَّيْطَانَ وَ جَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا اللہ کے نام سے، خدایا! مجھے شیطان سے دور رکھ اور جو فرزند عطا فرما شیطان کو اس سے دور رکھ۔

اگر ان کی قسمت میں فرزند ہے تو شیطان اسے نقصان نہیں پہونچائے گا۔

کہا گیا ہے کہ مراد پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا ہے تاکہ فرزند پاک صاف اور صالح و نیک ہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (اور خوب جان لو کہ ایک دن تمھیں اُس سے ملاقات کرنی ہے) یعنی اس کی جزا سے ملاقات کرو گے اس کے ثواب سے ملاقات کرو گے اگر تم نے اس کی اطاعت کی۔ اس کے عذاب سے ملاقات کرو گے اگر تم نے اس کی نافرمانی کی (اللہ) کی جانب نسبت مجاز کے عنوان سے نسبت دی ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (اور (اے نبی) آپ مومنین کو خوش خبری سنا دیں۔) مومنین کو ثواب اور جنت کی بشارت دے دو اللہ سے ملاقات کو اس کی رؤیت پر حمل نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ لِقاء (یعنی ملاقات) کی لفظ مختلف معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: لَقِيَ جُهْدَهٗ اس نے اپنی محنت کا پھل پالیا وَ لَقِيَ حِمَامَهٗ (اور اس نے اپنی موت سے ملاقات کی) اور اس لئے کہ آیت میں ملاقات تمام بندوں کے لیے ثابت ہے۔ یہ بات اہل تشبیہ (فرقۂ مشبّہ) کے نظریہ کے خلاف ہے (اس لئے کہ ان کا کہنا ہے کہ ہر کوئی اللہ کو نہیں دیکھے گا)

❀❀❀❀❀

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو، جن کا مقصود نیکی تقویٰ اور بندگانِ خدا کو بھلائی کے کاموں سے باز رکھنا ہو۔ اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ (۲۲۴)

الفاظ و معانی:

عُرْضَة یعنی کسی کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھنا۔ ابوالعباس نے بیان کیا ہے: العُرْضَة خیر اور شر کے درمیان پیش کرنا ہے۔

یَمِیْن و قَسَم اور حَلْف ایک ہی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی قوت سے لئے گئے ہیں کہ اس کے ذریعہ جس چیز پر قسم کھاتا ہے اس بات پر قوی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلْجَارِحَة (ہاتھ) کے معنیٰ میں سے لیا گیا ہے چونکہ قسم کھاتے وقت لوگ اپنے ہاتھوں کو (ان کے) ہاتھوں پر مارتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ یمن کے معنی سے لیا گیا ہے جو کہ برکت ہے چونکہ قسم کھا کر اس کی برکت زیادہ ہو جاتی ہے۔

ترکیب:

اَنْ تَبَرُّوْا کے مقام کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

(ا) محلاً مجرور ہے لام کے محذوف ہونے کی بنا پر۔ یہ خلیل کا قول ہے۔ ابوعلی نے کہا: ممکن ہے کہ اَنْ فعل کے ساتھ تاویل مصدر میں جانے کے بعد مصدر مقام جر میں ہو اگر چہ یہ بات اَنْ کے علاوہ دیگر مقام پر جائز نہیں ہے دو باتوں کے سبب:

(الف) جملہ صلہ کی وجہ سے طولانی ہو جاتا ہے لہٰذا اس کو حذف کرنا بہتر ہے۔

(ب) اَنْ حرف ہے اور جب لام کو حذف کر دیا گیا ہے تو گویا حرف کو حرف کا قائم مقام بنا دیا گیا لہٰذا اَنْ کے ساتھ لام کو حذف کرنا بہتر ہے لیکن مصدر کے ساتھ لام کو حذف کرنا صحیح نہیں ہے جب وہ ظاہر میں فعل سے مربوط نہ ہو۔

اور میں کہتا ہوں: مراد یہ ہے کہ جب آپ یہ کہیں گے کہ: جِئْتُ لِضَرْبِ زَیْدٍ تو ایسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ آپ لام کو حذف کر کے یہ کہتے ہیں: جِئْتُكَ ضَرْبَ زَیْدٍ لیکن جب آپ جِئْتُكَ لِاَنْ تَضْرِبَ زَیْداً تو آپ لام کو حذف کر کے: جِئْتُكَ اَنْ تَضْرِبَ زَیْداً کہہ سکتے ہیں۔

(۲) اَنْ تَبَرُّوْا مقام نصب میں ہے اس لئے کہ جب حرف جر لام محذوف ہو گیا تو فعل اس سے متصل ہو گیا۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور یہ قیاسی ہے اور میں دونوں اقوال کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ اس کی تقدیر یہ ہے: لِاَنْ لَا تَبَرُّوْا نفی کی بنا پر ہے، لِاَنْ تَبَرُّوْا اثبات کی بنا پر ہے۔ پہلے قول کی بنا پر ہے اور وہ نفی کا قول ہے تو وہ محلاً منصوب ہوگا اس لئے کہ مفعول لہ ہے اور دوسرا قول جو کہ مثبت ہے اس کی بنا پر مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے اور بر بنائے حال محلاً منصوب بھی ہو سکتا ہے اور اس میں عامل وہی چیز ہے جو لِاَیْمَانِکُمْ میں ہے اور وہ معنیٰ فعل ہے گویا اس طرح ہے کہ اَلَّا تَجْعَلُوا اللهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِکُمْ کَائِنَةً لِاَنْ تَبَرُّوْا یعنی لِبِرِّکُمْ اور ذوالحال اَلْاَیْمَانَ ہے۔

(۳) ایک جماعت نے کہا: اَنْ تَبَرُّوْا محلاً مرفوع ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اَنْ تَبَرُّوْ او تَتَّقُوْا اَوْلٰی پس اَوْلٰی جو کہ خبر ہے اسے حذف کر دیا گیا ہے کہ وہ معلوم ہے۔

شان نزول:

یہ آیت عبداللہ بن رواحہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس وقت جب انھوں نے قسم کھائی کہ وہ (اپنی زوجہ سے) جماع نہیں کریں گے نہ ہی کلام کریں گے، نہ اپنے اور اپنی زوجہ کے درمیان اصلاح کریں گے گویا انھوں نے اس طرح کہا: میں اس امر پر حلف اٹھاتا ہوں (قسم کھاتا ہوں) کہ یہ بات میرے لیے جائز نہیں ہے کہ میں اسے انجام دوں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

اللہ کے نام کا احترام

خداوند عالم نے عورتوں کے حالات اور ان کے لیے حلال چیزوں کو بیان کرنے کے فوراً ہی بعد ایلا کا ذکر کیا۔ یہ وہ قَسَم ہے جس کے ذریعہ زوجہ شوہر پر حرام ہو جاتی ہے۔ خدا نے آیت کا آغاز اَیمان (قسم) کے

ذکر سے کیا ہے حکم ایلاء کی بنیاد قائم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (اللہ کے نام کو اپنی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو) اس سے مراد کیا ہے اس بارے میں تین اقوال ہیں:

اول: تم اللہ کی قسم کو اپنے لیے نیکی و تقویٰ سے روکنے کی علت قرار نہ دو کہ تم اس پر اعتماد کرو اور شدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح کہو کہ ہم نے تو اللہ کے لیے حلف لیا (قسم کھائی) جب کہ تم اس کے ذریعہ قسم نہیں کھاتے ہو۔ یہ حسن و طاؤس اور قتادہ سے مروی ہے۔ اس تفسیر میں اصل وہ عارض اور مانع ہے جو تمھارے اور نیکی و تقویٰ کے درمیان رکاوٹ ہے اس لیے کہ عارض آنے والی شے دو چیزوں کے درمیان ایک چیز کے دوسری چیز تک پہونچنے سے مانع ہوتی ہے لہٰذا علت اس معترض کی طرح مانع ہے۔

دوم: عُرضہ (نشانہ، ہدف) کے معنی حجت کے ہیں گویا ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کی قسم کو نیکی اور تقویٰ کے منع کرنے میں حجت قرار نہ دو۔ اگر تم پہلے قسم کھا چکے ہو پھر ظاہر ہوا کہ اس کے علاوہ اس سے بہتر تھا تو اسی بہتر کو انجام دو اور گذشتہ قَسم کے ذریعہ حجت پیش نہ کرو۔ یہ ابن عباس، مجاہد اور ربیع سے مروی ہے۔ اس قول اور پہلے قول کی اصل ایک ہی ہے اس لیے کہ علت یا حجت کے سبب اعتراض کی جہت سے منع اور روکا گیا ہے۔

[illegible] اللہ کی قسم کو ہر حق اور باطل کے لیے، گھٹیا اور معمولی قرار نہ دو کہ اس کے ذریعہ نیک بن جاؤ [illegible] اپنے آپ کو گناہوں سے بچالو۔ یہ حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ اللہ کے نام سے حلف نہ اٹھاؤ اگر تم [illegible] یت کو جبائی اور ابو مسلم نے کہا ہے۔ یہی چیز ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے جس کی روایت [illegible] نے ابو ایوب نے خزازی کے واسطہ سے کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں: میں نے امام جعفر [illegible] علیہ السلام کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ کے نام سے حلف نہ اٹھاؤ، نہ سچا نہ جھوٹا اس لیے کہ [illegible] ہے: وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ۔

[illegible] نے بیان کیا ہے: جو کسی چیز کا بکثرت ذکر کرتا ہے وہ اس چیز کو اپنے لیے عرضہ (یعنی نشانہ اور [illegible] ہے۔ چنانچہ آپ اس طرح کہتے ہیں: جَعَلْتَنِيْ عُرْضَةً لِّقَوْمِكَ تم نے مجھے اپنی قوم کا [illegible] شاعر نے اس طرح کہا ہے:

وَلَا تَجْعَلَنِيْ عُرْضَةً لِّلَّوَائِمِ

(تم مجھے ملامتوں کا نشانہ مت بناؤ)

[illegible] دوسری تفسیر کے مطابق اس کی تقدیر اس طرح ہوگی: لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ مَانِعاً مِّنَ الْبِرِّ وَ

التَّقْوٰى بِاعْتِرَاضِكَ بِهٖ حَالِفاً۔ یعنی تم بیچ بیچ میں اللہ کی قسم کھا کر لفظ اللہ کو نیکی اور تقویٰ اختیار کرنے کی راہ میں مانع قرار نہ دو اور تیسری وجہ کے مطابق اس طرح ہوگی تم جو ہمیشہ اللہ کی قسم کھاتے ہو اسے ہر حق و باطل میں قرار مت دو۔

اَنْ تَبَرُّوْا (جن کا مقصود نیکی ہو) بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی میں متعدد اقوال ہیں:

اول: تا کہ تم بر بنائے اثبات نیک قرار پاؤ یعنی تا کہ تم نیک و متقی ہو جاؤ اس لیے کہ جس کی قسمیں کم ہوتی ہیں وہ زیادہ قسم والے کی نسبت نیکی سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے تا کہ تم قسم میں نیک ہو جاؤ۔

دوم: مراد یہ ہے کہ تم نیک بننے کو دور کرنے کے لئے یا نیک بننے کو ترک کرنے کے لئے۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ مبرد کا قول ہے۔

سوم: مراد یہ ہے کہ تم نیک نہ بنو۔ لَا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے۔ انھوں نے کہا ہے: لَا کو حذف کر دیا گیا ہے اس لیے کہ قسم کے معنی میں ہے جیسا کہ امرئ القیس کا یہ مصرع ہے:

فَقُلْتُ يَمِيْنُ اللهِ اَبْرَحُ قَاعِدًا

یعنی: لَا اَبْرَحُ۔

وَتَتَّقُوْا (پرہیز کرو) یعنی قسموں میں گناہوں اور نافرمانیوں سے پرہیز کرو۔ وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (اور بندگانِ خدا کو بھلائی کے کاموں سے باز رکھنا ہو) یعنی لوگوں کے درمیان قسموں میں مصالحت کرو۔ اپنے ماسبق پر عطف ہے جس کے معنی یہ ہیں: اللہ کے حلف (قسم) کو علت یا حجت قرار نہ دو کہ تم نیکی اور تقویٰ اختیار نہیں کرو گے نہ ہی صلح و مصالحت کراؤ گے تا کہ نیک اور متقی بن جاؤ اور لوگوں کے درمیان صلح و مصالحت کرانے والوں میں ہو جاؤ یا اسے دفع کرنے کے لیے ہے کہ نیک اور متقی بنو اور صلح کراؤ۔ تیسری وجہ کے مطابق اللہ کی قسم کو حقیر اور گھٹیا قرار نہ دو تا کہ تم نیک و متقی اور لوگوں کے درمیان صلح و مصالحت کرانے والے ہو جاؤ۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ (اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے) عَلِيْمٌ (اور سب کچھ جانتا ہے) یعنی جو کچھ تمھاری نیتوں میں ہے اس پر پوشیدہ نہیں ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے جو کسی کام پر حلف (قسم) کھائے اور کسی دوسرے کام کو اس سے بہتر دیکھے تو اس پر قسم کا توڑنا واجب ہے اور وہ کام انجام دے جو بہتر ہے۔ تو آیا اس پر کفارہ واجب ہوگا؟ اس میں اختلاف ہے؛ بیشتر فقہاء کے نزدیک کفارہ واجب ہے جبکہ ہمارے نزدیک اس پر کفارہ واجب

نہیں ہے جو کسی دوسرے کے لیے قسم کھائے کہ (فلاں) فعل انجام دوں گا یا (فلاں) فعل سے دوری اختیار کروں گا اور وہ اس کی پرواہ نہ کرے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: اَلْمُقْسَمُ عَلَیْہِ (جس کے لیے قسم کھائی گئی ہو) اس سے گنہگار نہیں ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ اَلْمُقْسَمُ عَلَیْہِ گنہگار ہوگا اس لئے کہ ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے: مَنْ سَاَلَکُمْ بِاللہِ فَاَعْطُوْہُ وَ مَنِ اسْتَعَاذَکُمْ بِاللہِ فَاَعِیْذُوْہُ جو تم سے اللہ کے واسطہ سے سوال کرے اسے عطا کرو اور جو اللہ کا واسطہ دے کر تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دو!

❀❀❀❀❀

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَاللہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾
جو بے معنی قسمیں بلا ارادہ تم کھاتے ہو، اُن پر اللہ تمھاری گرفت نہیں کرتا مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو، اُن کی باز پرس وہ ضرور کرے گا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ (۲۲۵)

الفاظ و معانی:

اَللَّغْو: ایسی بات جس میں کوئی فائدہ نہ ہو (اَلْغَی الْکَلِمَۃ) یعنی بات کو چھوڑ دیا اس لئے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لَاغِیَۃ: بری اور فحش بات، اسی سے لُغَۃ ہے اس لئے کہ جو شخص اہل زبان نہیں ہے اس کے سامنے بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لَغْوُ الطَّائِر: پرندہ کی آواز، بولی۔ اَلِلّغَاء: بری بات سے یاد کرنا۔

حِلْم کے حقیقی معنیٰ اَنَاۃ یعنی انتظار و مہلت کے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔

اِمْھَال: گناہ پر عذاب کو ٹال کر مہلت دینا۔

ترکیب:

فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ مقام حال میں ہے اس میں عامل یُؤَاخِذُ ہے۔ ذوالحال اللَّغْو ہے اور بِمَا کَسَبَتْ میں مَا اسم موصول بھی ہوسکتا ہے اور حرف موصول بھی ہوسکتا ہے۔

تفسیر:

قابل اعتبار قسمیں

خدا وند عالم نے قسم کے اقسام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (جو بے معنی قسمیں بلا ارادہ تم کھاتے ہو، اُن پر اللہ تمھاری گرفت نہیں کرتا) لغو قسم کے متعلق اختلاف ہے: ایک قول یہ ہے کہ لوگ جس کے عادی ہو جاتے ہیں جیسے بغیر قصد و ارداہ کے لَا وَ اللّٰهِ بَلٰى وَ اللّٰهِ کہنے کو عادت بنالینا بغیر اس کے کہ کسی کا مال ہڑپ کرے یا کسی پر ظلم کرے۔ یہ ابن عباس، عائشہ اور شعبی سے مروی ہے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ یہی قول شافعی کا ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سچا سمجھ کر قسم کھائے بعد میں یہ پتہ چلے کہ وہ کاذب (جھوٹا) ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، نہ ہی کفارہ ہے۔ یہ حسن، مجاہد، قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔ ابو حنیفہ اور ان کے احباب کا بھی یہی قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ غیظ و غضب کی حالت کی قسم مراد ہے اللہ تم سے ایسی قسم توڑنے کا مواخذہ نہیں کرے گا۔ یہ ابن عباس و طاؤس سے مروی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے: اس میں کفارہ واجب ہے۔ یہ مسروق نے کہا ہے۔ ہر وہ قسم جسے پورا نہ کیا جا سکے لغو ہے اس پر کفارہ واجب نہیں ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو اُن کی باز پرس وہ ضرور کرے گا) یعنی جس (قسم) کا تم عزم و ارادہ کرتے ہو۔ قلب کا کسب کرنا عقد و نیت ہے۔ اس میں حذف ہے یعنی مِنْ اَيْمَانِكُمْ ایک قول یہ بھی ہے کہ تم جھوٹی قسم کھانے لگو اور کسی غلط کام کے لیے قسم کھاؤ۔ یہ ابراہیم سے مروی ہے۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ (اللہ بہت درگزر کرنے والا (ہے)) گناہوں کو بخش دے گا۔ حَلِيْمٌ (اور بردبار ہے) گناہ پر عذاب میں مہلت دیتا ہے، جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

❀❀❀❀❀

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَإِنْ عَزَمُوا۟ ٱلطَّلَٰقَ فَإِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾

جولوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھے ہیں اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اگر انھوں نے رجوع کرلیا تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔(۲۲۶) اور اگر انھوں نے طلاق دینے کی ٹھان لی ہے تو وہ یہ جان لیں کہ اللہ سننے والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے۔(۲۲۷)

الفاظ ومعانی:

اَلْفَیْء: رجوع اور واپسی۔ فَیْء اور ظِلّ کے درمیان فرق یہ ہے: جسے مبرد نے بیان کیا ہے کہ الفیٔ وہ ہے جسے آفتاب ختم کر دیتا ہے چونکہ وہ پلٹتا ہے۔ ظِلّ وہ ہے جس میں آفتاب کا دخل نہیں ہوتا لہٰذا ہر فَیْء ظِلّ (سایہ) ہے لیکن ہر ظِلّ فَیْء نہیں ہے، اس لیے کہ جنتی افراد ظل (سایہ) میں ہوں گے فیٔ میں نہیں ہوں گے۔ چونکہ جنت میں آفتاب نہیں ہوگا یا آفتاب کی شعاعیں نہیں ہوں گی۔

عَزم: مستقبل میں کسی چیز کے انجام دینے کا عقد (عہد) کرنا۔

اَلطَّلَاق: کسی سبب سے مرد یا عورت کی طرف سے لفظ طَالِق کے ذریعہ عقد نکاح کا ختم کرنا۔

اَلسَّمِیْع: وہ ذات کہ جس کی یہ صفت ہو کہ اس لیے سنی جانے والی باتوں کا سننا واجب و لازم ہو، اگر وہ آواز پائی جاتی ہو اس کی بازگشت ایسے امر کی جانب ہوتی ہے، وہ ذات حی اور زندہ ہے، اس چیز کے سننے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور اَلسَّامِع، اَلْمُدْرِك، اور قَدِیْم اللہ سبحانہ کی ازل سے یہ صفت بیان کی جاتی ہے کہ وہ سَمِیْع ہے ازل میں اس کی صفت سَامِع نہیں ہے اس لئے کہ سَامِع اسی وقت کہیں گے جب مسموعات پائی جاتی ہوں۔

ترکیب:

اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ میں تین وجہیں اور صورتیں ممکن ہیں:

(۱) جر اضافت کی بنا پر اور یہی قرأت بھی ہے اور یہ اضافت غیر حقیقی ہے اس لئے کہ اَرْبَعَةِ محلاً منصوب ہے اگرچہ لفظاً مجرور ہے۔ عربی زبان میں اسے رفع دینا اور نصب دینا دونوں جائز ہے (رفع) تَرَبُّصُ اَرْبَعَةُ اَشْهُرٍ۔ جیسے یہ ارشاد الٰہی: فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ۔ نیز فَجَزَآءٌ مِثْلُ مَا

قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (نصب) وَ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ جیسے یہ آیت: اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتاً اَحْيَاءً وَّ اَمْوَاتاً (سورۂ مرسلات، آیت ۲۵، ۲۶) یعنی تَكْفُتُكُمْ اَحْيَاءً وَّ اَمْوَاتاً (زمین تمھیں سمیٹتی ہے زندہ ہو یا مردہ)

تفسیر:

غلط طرزِ عمل کا خاتمہ

پھر خداوند عالم نے حکم ایلاء بیان فرمایا ہے قسموں میں سے اور اسلامی احکام میں سے ہے ایک حکم ارشاد فرمایا: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ (جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھے ہیں) یعنی حلف اٹھاتے ہیں۔ اس جملہ میں حذف ہے یعنی نقصان و ضرر پہنچانے کے مقصد سے اپنی بیویوں سے جماع سے دوری اختیار کرنے کی قسم کھاتے ہیں۔ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ (اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے) انھیں توقف و مہلت ہے چار ماہ کی۔ وہ قسم جسے انسان کھاتا ہے، یہ اللہ (کے نام) کے ساتھ ہوگی یا اس کے ایسی صفات کے ذریعہ ہوگی جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو اس طرح (قسم) ہو جو لغو و بیہودہ محل و مقام میں واقع نہ ہو جس میں کوئی فائدہ نہ ہو اور حلف جماع سے (خود کو) روکنے کے لیے غضب اور نقصان پہونچانے کے لیے ہو۔ یہ علی و ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ غضب اور خوشی میں ہو، یہ ابراہیم و شعبی اور فقہاء کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جماع اور اس کے علاوہ بھی نقصان پہونچانے کے لیے ہو مثلاً قسم کھائے کہ وہ بیوی سے بات نہیں کرے گا۔ یہ سعید بن المسیب سے مروی ہے۔

فَاِنْ فَآءُوْ (اگر انھوں نے رجوع کر لیا) یعنی امر خدا کی طرف پلٹ آئے یعنی قدرت رکھتے ہوئے مجامعت کرے یا جماع سے عاجز ہونے کی صورت میں اپنی بات واپس لے لے۔ یہ ابن عباس، مسروق سعید بن مسیب نے کہا ہے یہی ہمارا مذہب و نظریہ ہے۔

ابوحنفیہ اور ان کے احباب بھی اسی چیز کے قائل ہیں۔ ایک ضعیف قول یہ آیا ہے کہ اگر وہ عذر کی صورت میں پلٹ رہا ہے تو کوئی بات نہیں لیکن ضروری ہے کہ وہ اپنی بازگشت پر کوئی گواہ معین کرے۔ یہ حسن، ابراہیم اور علقمہ کا نظریہ ہے، صاحب تفسیر (شیخ طبرسیؒ) کہتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ صورت جماع سے عاجز (شخص) کے لیے ہوگی، پلٹنے والے پر کفارہ واجب ہوگا، سزا نہیں ہوگی۔ ابن عباس، سعید بن مسیب اور قتادہ اسی کے

قائل ہیں۔ حسن اور ابراہیم نے کہا ہے کہ اللہ کے ارشاد: فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے) کی بنا پر اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔

فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ آیت میں غفور کے معنی سزا نہ دینے کے ہیں جو قسم کھائے کہ وہ چار ماہ سے کم میں جماع نہیں کرے گا تو اسے مُوْلِی (ایلا کرنے والا) نہیں کہا جائے گا اور جو قسم کھائے کہ وہ بیوی سے نزدیکی اختیار نہیں کرے گا جب کہ وہ مُرْضِعَة (دودھ پلا رہی ہو) ہو اور اس کو اس بات کا خوف ہو کہ اس سے بچہ کو نقصان پہونچے گا تو یہ ایلا کے حکم میں نہیں ہے اور جب چار ماہ گذر جائیں اور وہ مجامعت نہ کرے تو حاکم اس کے اوپر حکم لگائے گا کہ رجوع کرے اور کفارہ ادا کرے یا طلاق دے اگر ایسا نہیں کرے گا تو اسے قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ حکم بجالائے۔

ارشاد الٰہی: وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (اور اگر انھوں نے طلاق دینے کی ٹھان لی ہے) ہمارے نزدیک یہ ہے کہ طلاق کا ارادہ کرلے پھر طلاق کا فقرہ ادا کرے۔ جب تک طلاق کا صیغہ جاری نہیں کرے گا شرعی طور پر عورت اس سے جدا نہیں ہوگی مگر عورت آمادہ ہو (یا عدت پوری کرلے) اگر وہ عدت اختیار کرے گی تو حاکم مرد کو چار ماہ کی مہلت دے گا اور اسے چار ماہ تک کے لیے روکا جائے گا اس سے کہا جائے گا یا تو امر خدا کی طرف پلٹ آئے یا طلاق دے دے! اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اسے قید کر دیا جائے گا۔ شافعی نے کہا ہے: جب وہ طلاق دینے اور رجوع کرنے سے انکار کرے تو حاکم اسے طلاق رجعی دے گا۔

ابوحنفیہ اور ان کے احباب نے کہا ہے کہ جب چار ماہ گذر جائیں اور وہ رجوع نہ کرے تو اسے طلاق بائن ہوگی پھر مرد کو عورت کی جانب رجوع کا اختیار نہیں ہوگا اس پر عدت ضروری ہوگی مرد عدت میں خطبہ (یعنی منگنی) کرسکتا ہے اور اس مرد کے علاوہ (اس عورت سے) کوئی دوسرا منگنی نہیں کرسکتا۔

فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (تو وہ یہ جان لیں کہ اللہ سننے والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے) یعنی اللہ اس کی باتوں کو سنتا اور دل کی کیفیت کو جانتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ اس کے ایلاء کے الفاظ کو سنتا ہے اور اس کی نیت کو جانتا ہے۔ بیشک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اگر وہ رجوع کرے تو اس پر کوئی عذاب نہیں ہوگا اور نہ اسے مرتکب گناہ کہا جائے گا۔ یہ مسئلہ قرآن کریم کی عظیم فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہے۔

❀❀❀❀❀

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین مرتبہ ایام آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہے وہ اُسے پوشیدہ رکھیں، اگر اُن کا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے۔ اُن کے شوہر اگر مصالحت پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران انھیں پھر اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں، البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ (فوقیت) حاصل ہے۔ اور (اُن سب پر) اللہ کی ذات ہے (جو) غالب اور صاحب حکمت ہے۔ (۲۲۸)

الفاظ و معانی:

قُرُوْءٍ قُرْء کی جمع ہے اس کی جمع قلت اَقْرُء اور جمع کثرت اَقْرَاء اور قُرُوْء ہے یہ لفظ حیض اور طہر دونوں کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے

بُعُوْلَة جمع ہے بَعْل کی، شوہر کو بَعْل کہتے ہیں چونکہ شوہر عورت کو زوجیت کے مالک ہونے کے باعث زوجہ پر عالی اور بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

رِجَال رَجُل کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ بَيِّنَةُ الرَّجُلَة یعنی آدمی جس کی مردانی وقوت نمایاں ہو۔

اَلرَّاجِل اپنے پیروں سے چلنے والے کو کہتے ہیں۔ اِرْتَجَلَ الْكَلَامَ اِرْتِجَالًا کے معنی ہیں کہ فلاں شخص غور و فکر کیے بغیر کلام کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

ترکیب:

اِنۡ کُنَّ یُؤۡمِنَّ بِاللّٰہِ: جواب شرط، محذوف ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اِنۡ کُنَّ یُؤۡمِنَّ بِاللّٰہِ لَا یَکۡتُمۡنَ (اگر وہ اللہ پر ایمان رکھیں گی تو چھپائیں گی نہیں)

اسی طرح ارشاد الٰہی: اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا سے بھی جواب شرط محذوف ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا فَبُعُوۡلَتُہُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّہِنَّ. مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡہِنَّ میں مِثۡلُ کی اضافت غیر حقیقی ہے اس لئے کہ اَلَّذِیۡ عَلَیۡہِنَّ اس کا مفعول ہے۔

تفسیر:

عدۂ طلاق کے احکام

اللہ نے اس آیت میں طلاق اور مطلقہ عورتوں کا حکم بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَالۡمُطَلَّقٰتُ (جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو) وہ طلاق شدہ عورتیں جو حبالۂ ازدواج سے آزاد شدہ ہوں یعنی وہ مطلقہ عورتیں جن کے ساتھ دخول بھی ہو چکا ہو لیکن وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ آیت میں عدت کا بیان ہے یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ ثَلٰثَۃَ قُرُوۡٓءٍ (وہ تین مرتبہ ایام آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں) یعنی وہ تین طہر (پاکیزگی) انتظار کریں گی اور عقد نہیں کریں گی۔ ہمارے نزدیک لفظ خبر کا ہے معنی امر کے ہیں۔ آیت میں قروء سے مراد پاکی ہے۔ زید بن ثابت، حضرت عائشہ، ابن عمر، مالک، شافعی اور اہل مدینہ کا یہی نظریہ ہے۔ ابن شہاب نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے شہر کے کسی شخص کو نہیں دیکھا مگر اس کا کہنا ہے کہ قُرُوۡءٍ سے پاکیزگی مراد ہے سوائے سعید بن مسیب کے۔ ابن عباس، ابن مسعود، حسن و مجاہد نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ قروء سے حیض مراد ہے اور تین قروء سے تین حیض مراد ہیں۔ ابو حنفیہ اور ان کے احباب کا یہی مذہب و نظریہ ہے اور ان حضرات نے حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد کو گواہ بنایا ہے جس میں حضرت نے مستحاضہ عورت سے فرمایا کہ دَعِیۡ صَلَاتَکِ اَیَّامَ اَقۡرَائِکِ یعنی اقراء کے دنوں میں نماز ترک کر دو اور نماز ایام حیض میں چھوڑی جاتی ہے جس کی رائے اور نظریہ یہ ہے کہ قرء طہارت ہے اس نے اس ارشاد الٰہی کو گواہ بنایا ہے۔ فَطَلِّقُوۡہُنَّ لِعِدَّتِہِنَّ یعنی اسے ایسے طہر (پاکیزگی) میں طلاق دو جس میں جماع نہ کیا ہو۔

جب ابن عمر نے اپنی زوجہ کو جبکہ وہ حالت حیض میں تھی ایک مرتبہ طلاق دی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر اس سے رجوع کرو جب وہ پاک ہو جائے تو اسے طلاق دے دینا یا اسے روک کے رکھنا! اس وقت آپؐ نے اس فقرہ کی تلاوت فرمائی: اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ عدت سے پہلے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا کہ یہاں عدت سے پاکیزگی مراد ہے حیض نہیں کیونکہ وہ ایسی صورت میں عدت قبول کر رہی ہے اور اگر حیض کی حالت میں طلاق دے تو وہ عدت کو قبول نہیں کرتی مگر حیض کے بعد۔

زرارہ نے روایت بیان کی ہے کہ میں نے ربیعہ سے سنا، وہ فرماتے تھے: میری نظر میں قروء جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے اس سے دو حیض کے دوران پاکیزگی مراد ہے خود حیض نہیں ہے، (زرارہ) نے کہا: میں امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ربیعہ کے بیان کا امام علیہ السلام سے تذکرہ کیا کہ آپؑ نے فرمایا: وہ جھوٹا ہے یہ اس کی رائے نہیں ہے بلکہ علیؑ کی رائے ہے۔ میں نے کہا: اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ کیا علی علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں قروء سے طہر مراد ہے جس میں خون بہتا ہے اور جمع ہو جاتا ہے، جب حیض آتا ہے تو عورت کو ناپاک کر دیتا ہے۔ میں نے عرض کی: اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ ایک مرد نے اپنی بیوی کو دو عادل گواہوں کی موجودگی میں طلاق دی جبکہ وہ پاک تھی اور اس نے جماع بھی نہیں کیا تھا کو اس کا حکم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب وہ تیسرے حیض میں داخل ہو جائے گی تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے شوہر کے لیے حلال ہو جائے گی اور اس سے عقد جائز ہو جائے گا۔ میں نے عرض کی: اہل عراق حضرت علی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ جب تک وہ تیسرے حیض سے پاک نہ ہو جائے وہ رجوع کرنے کا زیادہ حق ہے؟ آپؑ نے فرمایا: وہ لوگ جھوٹے ہیں۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ (اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے) وہ مطلقہ عورتیں جن پر عدت واجب ہے ان کے لیے جائز نہیں کہ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ (اللہ نے اُن کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہے وہ اُسے پوشیدہ رکھیں) یعنی جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں میں خلق فرمایا ہے اس کا چھپانا جائز نہیں ہے۔ اس سے حیض مراد ہے۔ یہ ابراہیم وعکرمہ کا نظریہ ہے۔ ابن عباس وقتادہ کا نظریہ ہے کہ اس سے حمل مراد ہے نیز ابن عمر اور حسن کی نظر میں اس سے حیض اور حمل دونوں مراد ہیں۔ یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے عورتوں کو تین چیزیں تفویض کی ہیں: حیض، طہر، حمل، اور یہ قول بہت عام ہے۔ لہٰذا اسی کو اختیار کرنا بہتر ہے۔ ان کے لیے چھپانا جائز نہیں تا کہ رجوع سے منع کرنے سے زوج

(شوہر) کے ظلم کا شکار نہ ہو۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بچہ کی غیر سے نسبت کے متعلق ظلم کا شکار نہ ہو جس طرح زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا۔

اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اگر اُن کا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے) یعنی جو اللہ پر ایمان لائے اور قیامت پر ایمان لائے تو یہی اس کی صفت اور اس کی خصلت ہے یہ شرط نہیں ہے کہ اگر وہ مومنہ نہیں ہے تو اس کے لیے (حمل) کا چھپانا جائز ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایمان اس طرح کے گناہ سے روکتا ہے جیسا کہ انسان اپنے دوست سے کہتا ہے: اگر تم مومن ہو تو تم ظلم نہیں کرو گے۔ آیت کا یہ فقرہ بعنوان وعید (ڈرانے اور خبردار کرنے کے لئے) ہے۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (اُن کے شوہر (اگر مصالحت پر آمادہ ہوں تو) وہ اس عدت کے دوران انھیں پھر اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں) یعنی ان کے شوہر ان عورتوں (اپنی بیویوں) کی جانب رجوع کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ یہ ان کا پہلی حالت کی طرف پلٹنا ہے اس مدّت میں جو ان کی عدت کے لیے مقرر کی گئی تھی اس لیے کہ جب تک وہ مدت باقی ہے شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے اور وہ حق اس مدت کے پورا ہوتے ہی ختم ہو جائے گا اور اس فقرہ میں ایک ایسی بات ہے جو دلالت کرتی ہے کہ شوہر مراجعہ میں منفرد ہے اس میں زوجہ کے راضی ہونے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی عقد جدید اور گواہوں کی ضرورت ہے۔ یہ حکم رجعی عورتوں سے مخصوص ہے اگرچہ آیت کا ابتدائی حصہ رجعیہ اور بائنہ طلاق شدہ عورتوں سب کو شامل ہے۔

اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (اگر مصالحت پر آمادہ ہوں) نقصان پہنچانے کی غرض سے نہ ہو اور وہ اس طرح ہے کہ مرد اپنی زوجہ کو نقصان پہونچانا چاہے یعنی اسے ایک طلاق دے دے اور چھوڑے رکھے اور جب عدت ختم ہونے کا وقت آئے تو اس سے رجوع کرے اور ایک مدت تک اسے چھوڑے رکھے پھر (دوسری مرتبہ) طلاق دے دے اور اسی طرح چھوڑے رکھے جس طرح پہلی طلاق میں چھوڑ رکھا تھا پھر رجوع کرلے پھر ایک مدت تک چھوڑے رکھے پھر طلاق دیدے۔ خداوند عالم نے شوہر کو اصلاح کی غرض سے رجوع کا زیادہ حق دار قرار دیا ہے، نقصان پہونچانے کا نہیں۔ اصلاح کی شرط رجوع کے مباح اور جائز ہونے کے لیے قرار دی گئی ہے نہ کہ اس کے احکام ثابت کرنے کے لیے، اس لئے کہ اس بات پر اجماع امت ہے کہ نقصان پہونچانے کے ارادے کے ساتھ بھی رجوع کے احکام ثابت ہوں گے۔

ارشادالٰہی: وَلَهُنَّ (عورتوں کے لیے بھی) عورتوں کے لئے اپنے شوہروں پر مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (معروف طریقے پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں) بِالْمَعْرُوفِ (معروف طریقے پر) یہ کلمات عجیب وغریب کلمات میں سے ہے جو جملہ فوائد سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان سے مراد وہ امور ہیں جن کی باز گشت حسن معاشرت، نقصانات کو ترک کرنا، نفقہ اور لباس میں مساوات جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں مثلاً اطاعت جو خداوند عالم نے مردوں کے لیے عورتوں پر فرض کی کہ وہ اپنے بستر پر اپنے شوہر کے سوا کسی دوسرے کو جگہ نہ دے۔ اس کے مادہ منویہ کی حفاظت کرے، اس کے اسقاط (حمل) میں حیلہ نہ کرے۔

روایت کی گئی ہے کہ معاذ کی زوجہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! زوجہ کا اپنے شوہر پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس کے چہرے پر نہ مارے، اس کی برائی نہ کرے، جیسا خود کھاتے ہیں ویسا اسے کھلائے، جیسا خود پہنے اسے بھی ویسا ہی پہنائے، اسے خود سے دور نہ کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: عورتوں کے بارے میں خدا کا خوف کرو اس لیے کہ تم نے انھیں اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو کلمۂ الٰہی کے ذریعہ حلال کیا ہے، تمھارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے ہمبستری نہ کریں اگر وہ ایسا کریں تو انھیں اس طرح ضرب لگاؤ کہ تکلیف دہ نہ ہو، تم پر ان کا رزق اور لباس، نیکی اور اچھائی کے ساتھ فرض ہے۔

ارشادالٰہی: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ (فوقیت) حاصل ہے) کہا گیا ہے کہ اس کے معنی مرد کے عورت پر فضیلت اور شرف کے ہیں، اسی فضیلت میں اطاعت ہے اور یہ کہ مرد تخلیہ اور تنہائی کا مالک ومختار ہے (عورتوں کے ساتھ) اور انھیں میں سے مرد کا حصہ عورت سے میراث میں زیادہ ہے اور مردوں پر جہاد فرض ہے۔ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مرد کو عورت پر باعتبار منزلت فضیلت حاصل ہے یہاں تک کہ مرد کہے کہ میں پسند نہیں کرتا کہ اس سے اپنا پورا حق حاصل کروں کہ اس پر مجھے فضیلت حاصل ہو۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ عورت مرد سے اسی طرح لذت حاصل کرتی ہے جس طرح مرد اس سے لذت حاصل کرتا ہے اور مرد کو فضیلت حاصل ہے عورت کو نفقہ دینے اور ان کی سرپرستی کی بنا پر زجاج سے روایت ہے کہ علی ابن ابراہیم بن ہاشم کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے کہ انھوں نے کہا: مردوں کا عورتوں پر حق، عورتوں کے مردوں پر حق کی نسبت افضل ہے۔

کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں امام باقر علیہ السلام سے اس طرح روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ایک عورت خدمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! شوہر کا زوجہ پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا: عورت پر حق یہ ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے، اس کی نافرمانی نہ کرے، شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر (مال) سے صدقہ نہ دے، اس کی اجازت کے بغیر مستحبی روزہ نہ رکھے، اپنے آپ سے منع نہ کرے (یعنی جماع سے منع نہ کرے) اگرچہ وہ اونٹ کی کوہان ہی پر کیوں نہ بیٹھی ہو، شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے، اگر اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلے گی تو اس پر آسمان وزمین اور غضب ورحمت کے فرشتے لعنت کرتے ہیں جب تک کہ وہ گھر واپس نہ آجائے، روی نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! عورت پر سب سے بڑا حق کس کا ہے؟ فرمایا: اس کے شوہر کا، اس نے عرض کیا: میرا بھی اس پر ایسا ہی حق ہے جیسا کہ اس کا حق مجھ پر ہے؟ فرمایا نہیں، ہر سو میں سے ایک حق۔ اس نے عرض کی: اس (اللہ) کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا کوئی شخص مجھ پر حاکم نہیں ہوسکتا (یعنی میرا شوہر نہیں بن سکتا) پیغمبر نے ارشاد فرمایا: اگر میں کسی کو (غیر خدا) کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو زوجہ کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (اور (اُن سب پر) اللہ کی ذات ہے (جو) غالب اور صاحب حکمت ہے) وہ جو چاہتا ہے اس پر قادر ہے، وہ منع کرتا ہے اسے منع نہیں کیا جاسکتا (وہ روکتا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا) وہ غلبہ حاصل کرنے والا ہے اس پر غلبہ نہیں پایا جاسکتا، وہ حکمت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ آیت میں دخول سے قبل کی مطلقہ اور حاملہ مطلقہ اس آیت سے منسوخ ہوچکی ہیں اس ارشاد الٰہی کی بنیاد پر: فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا... وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (سورۂ طلاق، آیت ۴؛ اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہوجائے)

بیان کیا گیا ہے یہ دونوں آیتیں اس آیت کے ذریعہ مخصوص ہوگئی ہیں جیسا کہ ہم نے آیت کے شروع میں بیان کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

طلاق صرف دو بار ہے یا تو پھر سیدھے طریقے سے عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو الّا یہ کہ زوجین کو حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہنے کا اندیشہ ہو ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہے کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو پھر ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ طے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علاحدگی حاصل کر لے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا اور جو لوگ حدودِ خداوندی سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ (۲۲۹)

قرأت:

ابو جعفر حمزہ نے: اِلَّآ اَنۡ يُّخَافَا میں یاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے اِلَّآ اَنۡ يَّخَافَا یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

خَافَ ایک مفعولی فعل متعدی ہے اس کا مفعول اَنۡ اور اس کا صلہ بھی ہو سکتا ہے جیسے: تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ اور اَنۡ اور اس کا صلہ کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے: جیسے تَخَافُوۡنَهُمۡ (سورۂ روم، آیت ۲۸) حمزہ کی قرأت اِلَّا اَنۡ يُّخَافَا کی دلیل یہ ہے کہ جب فعل کو مجہول بنا کر اس کی نسبت مفعول بہ کی جانب دے دی گئی تو اب کوئی ایسی چیز نہیں باقی رہ گئی ہے کہ فعل اس کی جانب متعدی ہو۔ البتہ ارشادِ الٰہی: اِلَّا اَنۡ

یُّقِیۡمَا تو یہاں پر فعل حرف جر کے ذریعہ متعدی ہوا ہے جس طرح وَلَوۡ خَافَكَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ حَرَمَهٗ میں حرف جر کے ذریعہ متعدی ہوا ہے اور خلیل وکسائی کے قول کے مطابق آیت میں اَنۡ یَّخَافَا حرف جر مقدر کے ذریعہ مجرور ہے اور سیبویہ اور اس کے اصحاب کی نظر میں منصوب ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ جب حرف جر کو حذف کر دیا گیا تو فعل مفعول ثانی سے متصل ہو گیا جیسے: اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ ذَنۡباً (کہ اصل میں مِنۡ ذَنۡبٍ تھا) اَمَرۡتُكَ الۡخَیۡرَ (اصل میں بِالۡخَیۡرِ تھا) پس سیبویہ کی قرأت صحیح ہے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر یُخَافَا ہوتا جیسا کہ قرأت کی گئی ہے تو بہتر تھا کہ فَاِنۡ خِیۡفَا ہوتا! تو جواب یہ دیا گیا کہ یہ سوال اور اعتراض اس کے دامن گیر نہیں ہوتا ہے جس نے اس قرأت کی مخالفت کی ہے اس لئے کہ انہوں نے تو اِلَّا اَن یَّخَافَا پڑھا ہے فَاِنۡ خَافَا نہیں کہا ہے۔ یہ اعتراض ہر ایک پر نہیں جاتا ہے دو وجہوں سے:

(۱) خدا نے غیبت سے خطاب کی جانب عدول کیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ پھر فرمایا: اِیَّاكَ نَعۡبُدُ، وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَكٰوةٍ، اَلۡمُضۡعِفُوۡنَ قرآن مجید میں اس کے بہت سے نمونے ہیں۔

(۲) ارشاد الٰہی ہے: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ میں خطاب ان امراء وفقہاء کی جانب پلٹ رہا ہے جو سارے امور کو انجام دیتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کثرت کی بنا پر خطاب ان لوگوں سے ہو کہ جنہیں غیبت سے خطاب کی جانب پلٹایا گیا ہے اس لئے کہ یُخَافَا میں تثنیہ کی ضمیر اس سے صرف دو مخصوص افراد نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس کی بھی حالت یہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

لیکن جن قراء نے یَخَافَا یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے تو مراد یہ ہے کہ جب زوجہ وشوہر میں سے دونوں اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ حدود الٰہی کو قائم نہیں کر سکتے تو پھر فدیہ حلال ہے۔

الفاظ ومعانی:

اَلتَّسۡرِیۡحُ اَلسَّرۡحُ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی آزاد کرنے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ سَرَّحَ الۡمَاشِیَةَ فِی الۡمَرۡعٰی یعنی اس نے جانور کو چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

ترکیب:

اَلطَّلَاقُ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع اور مَرَّتَانِ اس کی خبر ہے۔ فَاِمۡسَاكٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے

اور اس کی تقدیر یہ ہے: فَالْوَاجِبُ عَلَيْكُمْ اِمْسَاكٌ۔ اگر جملہ میں اِمْسَاکاً منصوب ہوتا تب بھی فَاَمْسِكُوْهُنَّ اِمْسَاكاً بِمَعْرُوْفٍ کی بنا پر صحیح ہوتا جیسا کہ ارشاد میں ہے: فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ۔ آن يَّخَافَا موصول اور صلہ محلاً منصوب، مفعول لہ ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: لِمَخَافَتِهِمَا اور اِلَّا يُقِيْمَا محلاً منصوب ہے يَخَافَا کا مفعول ہے تقدیر یہ ہے: يَخَافَا تَرْكَ اِقَامَةِ حُدُوْدِ اللهِ۔

شانِ نزول:

ہشام بن عروہ نے اپنے والد کے واسطے سے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ ایک خاتون ان کے پاس آئی اور اس نے شکایت کی کہ اس کا شوہر اسے طلاق دیتا ہے پھر رجوع کر لیتا ہے، وہ اس طرح اسے ضرر و نقصان پہونچاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا پھر عدت کی مدت ختم ہونے سے قبل اس سے رجوع کر لیتا تو اسے اختیار ہوتا تھا وہ چاہے اسے اس طرح ہزار مرتبہ طلاق دے۔ ان کے یہاں طلاق کی کوئی حد معین نہیں تھی۔ اس کا تذکرہ (حضرت عائشہ نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے کیا۔ چنانچہ آیت: 'اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ' نازل ہوئی اور طلاق کی حد تین طلاق کو قرار دیا، تیسری طلاق کے بارے میں ارشاد ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۰: پھر اگر دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے (تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اُس کے لیے حلال نہ ہوگی مگر یہ کہ اس کا نکاح کسی اور سے ہو)

نیز روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ طلاق دو مرتبہ ہے تیسری طلاق کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ (سیدھے طریقے سے عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے)

ارشاد الٰہی اِلَّا اَنْ يَّخَافَا ثابت بن قیس بن شماس اور ان کی زوجہ جمیلہ بنت عبداللہ بن ابئ کے متعلق نازل ہوئی۔ ثابت بن قیس جمیلہ سے محبت کرتے تھے اور جمیلہ انھیں ناپسند کرتی تھی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمیلہ سے فرمایا: کیا تم اس کا باغ واپس کرو گی؟ اس نے کہا: ہاں اور اس سے زائد، ثابت بن قیس نے کہا: نہیں فقط باغ۔ جمیلہ نے ثابت کا باغ پلٹا دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ثابت! تم نے جو کچھ جمیلہ کو دیا ہے اس سے لے لو اور اسے آزاد کر دو! ثابت نے ایسا ہی کیا۔ اسلام کا یہ پہلا خلع ہے۔

تفسیر:

طلاق کے احکام

پھر خداوند عالم نے عدد طلاق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ طلاق دو مرتبہ میں ہوگی۔ یعنی ایسی طلاق جس میں اسے دو مرتبہ ہی حق رجوع حاصل ہوگا، اس کے مراد میں دو اقوال ہیں:

اول: طلاق سنت کا تفصیلی بیان ہے یہ کہ جب (زوجہ) کو طلاق دینا چاہے تو اسے طہر (زمانہ پاکی) میں طلاق دے، جس میں اس نے جماع نہ کیا ہو۔ یہ پہلی طلاق ہوگی پھر یونہی چھوڑے رکھے یہاں تک کہ عدت کی مدت گذر جائے یا حائضہ ہو کر پاک ہو جائے، پھر دوسری مرتبہ طلاق دے دے۔ یہ ابن عباس و مجاہد سے مروی ہے۔

دوم: طلاق بائن اور طلاق غیر بائن کی عدد کا بیان ہے۔ آیت میں اس بات کا بیان اور وضاحت ہے کہ دو طلاقوں کے بعد ہی دائمی جدائی اور علیحدگی ہے۔ (آیت میں) لفظ خبر کا ہے معنی امر کے ہیں یعنی دو مرتبہ طلاق دو۔

ارشاد الٰہی: فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ (یا تو پھر سیدھے طریقے سے عورت کو روک لیا جائے) جس کی تقدیر اس طرح ہے: فَالْوَاجِبُ اِذَا رَاجَعَهَا بَعْدَ التَّطْلِيْقَتَيْنِ اِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ، اگر شوہر دو طلاقوں کے بعد رجوع کرے تو واجب ہے کہ یا تو خوبصورتی (حسن سلوک) کے ساتھ روکے رکھے جو شریعت میں جائز ہے، انھیں نقصان پہونچانے کی غرض سے نہ روکے رکھے۔

اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: یہ تیسری طلاق ہے۔

دوم: صاحب عدت کو اسی طرح چھوڑے رکھے یہاں تک کہ عدت کی مدت ختم ہو جائے۔ سدی اور ضحاک کا قول ہے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ (اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے) شوہروں سے خطاب ہے۔ اَنْ تَاْخُذُوْا (کچھ واپس لے لو) (تمھارے لئے جائز نہیں ہے) طلاق کی حالت میں اور تبدیل کرنے کی صورت میں۔ مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (اس میں سے جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو) یعنی تم نے جو انھیں مہر دیا ہے (اس کا واپس لینا جائز نہیں ہے)

پھر خلع کو استثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (الا یہ کہ زوجین کو حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہنے کا اندیشہ ہو) یعنی دونوں کو گمان غالب ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہ رکھ سکیں گے ان اسباب کے سبب جوان دونوں کے درمیان دوری اور دشمنی کی وجہ سے پائے جاتے ہیں۔ابن عباس نے بیان کیا ہے: یہ کہ عورت کی طرف سے شوہر سے دشمنی کے سبب نافرمانی، اور بداخلاقی کا ظاہر ہونا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اگر عورت شوہر سے کہے: میں تیرے لیے جنابت کا غسل نہیں کروں گی، نہ ہی تیرے لیے قسم کو نیک قرار دوں گی، یعنی تیرے ساتھ کوئی نیکی نہیں کروں گی، نہ ہی تیرا بستر بچھاؤں گی، نہ ہی تیرے پاس تیری اجازت کے بغیر داخل ہونگی۔ جب عورت اس طرح کہے تو مرد کے لیے عورت کو طلاق خلع دینا جائز ہے اور عورت سے جو کچھ اس نے اسے لیا ہے وہ بھی اس کے لیے جائز و حلال ہے۔

المختصر اگر مرد کو خوف ہو کہ عورت حرام کو انجام دے کر اس کے سلسلہ میں خدا کی نافرمانی کرے گی یا جو چیزیں اس پر واجب ہیں اس میں خلل واقع کر کے اس کی اطاعت نہ کرے گی تو ان حالات میں مرد کے لیے (عورت کو طلاق خلع دینا حلال و جائز ہے۔اسی کے مانند حسن سے بھی روایت کی گئی ہے۔اور شعبی نے کہا ہے: یہ عورت اور مرد کی نافرمانی ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہے کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے) یعنی اگر تمھیں گمان ہو کہ ان دونوں کے درمیان صلح و صفائی نہیں ہوسکتی تو۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے اور دونوں پر کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔ یہ جملہ مباح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ارشاد الٰہی: عَلَيْهِمَا میں اگر چہ اباحت شوہر کے لیے ہے پھر بھی عَلَيْهِمَا تثنیہ ہے تو اس میں دو وجہیں ہیں:

اول: اگر صرف شوہر کا ذکر ہوتا تو اس بات کا وہم و گمان ہوتا کہ عورت گنہگار ہے اگر چہ مرد کے لیے فدیہ جائز ہے، پس خداوند عالم نے دونوں کے لیے اذن (اجازت) کو اس لیے بیان کیا ہے کہ یہ وہم دور ہو جائے۔ یہ علی بن عیسیٰ سے مروی ہے۔

دوم: عَلَيْهِمَا اس سے شوہر مراد ہے اس کے ساتھ عورت کا ذکر دونوں کے باہم متصل اور وابستہ ہونے کے باعث کیا ہے، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: نَسِيَا حُوْتَهُمَا اور يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ جس طرح اس آیت میں بحرین میں تثنیہ کے باوجود اس سے مراد آب شیریں نہیں بلکہ آب شور ہے اس لئے لولو و مرجان، آب شور سے نکلتے ہیں، تو یہ مجازاً صحیح ہے۔ شیخ ابو جعفر محمد بن الحسنؒ نے فرمایا ہے: یہی ہمارے مذہب

کے لیے بہت بہتر اور شایان شان ہے کیونکہ ہمارے نزدیک طلاق خلع کو جو چیز مباح قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر خلع نہیں ہوتا تو عورت گناہ گار ہوتی۔

صاحب کتاب (شیخ طبرسیؒ) کہتے ہیں: ہمارے نزدیک عورت سے نافرمانی کے واقع ہونے کا امکان طلاق خلع کے مباح ہونے کا سبب ہے اور گناہ کو برطرف کرنا خلع سے متعلق ہے، اسباب خلع سے نہیں اور پہلی تفسیر اختیار کرنے کے لئے اولیٰ ہے اور آیت کے ظاہر سے بہت زیادہ مناسب ہے۔ دوسری تفسیر نا قابل اعتنا ہے اس لیے کہ راہ مستقیم سے منحرف ہے کیوں کہ دو چیزیں حقیقت میں ایک نہیں ہوسکتیں۔

فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ یعنی عورت اپنے شوہر کو مال میں سے کچھ معاوضہ دے کر علاحدگی حاصل کرلے۔ اس بارے میں اختلاف ہے، ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر نفرت فقط عورت کی طرف سے ہو اور اس سے نافرمانی کا خوف ہو تو مرد عورت سے مہر اور کچھ اضافی چیز لے۔ اگر نفرت دونوں طرف سے ہو تو مہر سے کم لے۔ ایک اور قول میں مہر سے اضافی (رقم) لینا جائز ہے اور اس سے کم بھی جائز ہے۔ اس میں اس بات کی تفصیل نہیں ہے کہ نفرت صرف زوجہ کی طرف سے ہو یا دونوں کی جانب سے۔ یہ ابن عباس، ابن عمر، رجا بن حیات، ابراہیم ومجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فقط مہر لے گا اس کے قائل عطا، زہری اور شعبی ہیں۔ انھوں نے اس کی روایت علی سے کی ہے۔

فدیہ کے ساتھ خلع لینے کی تین صورتیں ہیں:

اول: عورت ناتواں ہو یا بدصورت ہو جس کی بنا پر شوہر عورت کو ضرر ونقصان پہونچاتا ہے تاکہ وہ مرد کو فدیہ دے کر اپنی جان چھڑائے ایسی صورت میں عورت کے لئے فدیہ جائز نہیں ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (سورۂ نساء، آیت ۲۰؛ اور اگر تم ایک زوجہ کی جگہ پر دوسری زوجہ کو لانا چاہو)

دوم: مرد کی نظر میں عورت فاحشہ ہو (یا عورت کو بدکار سمجھے) اور اس سبب سے مرد عورت کو اذیت و نقصان پہونچائے تاکہ وہ فدیہ دے تو فدیہ جائز ہے اور اس ارشاد الٰہی کہ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (سورۂ نساء، آیت ۱۹؛ اور نہ ہی یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کرکے اس مہر کا کچھ حصّہ ہڑپ کر جاؤ جو تم ان کو دے چکے ہو ہاں اگر وہ علانیہ بدکاری کی مرتکب ہوں) کا مطلب بھی یہی ہے۔

سوم: دونوں کو خوف ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہ رکھ پائیں گے بد خلقی کی بنا پر یا نفقہ کی قلت کے سبب کسی ظلم و زیادتی وغیرہ کے بغیر یا تو ایسی صورت میں دونوں کے لیے فدیہ جائز ہے۔ جس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں) حدود الٰہی سے مراد اللہ کے اوامر و نواہی اور وہ احکام ہیں جو خلع، طلاق رجعی اور عدت کی آیتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (ان سے تجاوز نہ کرنا) یعنی حدود الٰہی کی مخالفت کر کے حد سے تجاوز نہ کرو۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ جو حدود الٰہی سے تجاوز کرے وہ سب کے سب ظالم ہیں۔ یعنی جو حد اس کے لیے معین کی گئی ہے اس کی مخالفت کر کے اس سے تجاوز کرے۔

ہمارے علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق نہیں ہو سکتیں کیوں کہ اللہ نے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کہا ہے اور تیسری طلاق کا ذکر اختلاف کی صورت میں اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور فَاِنْ طَلَّقَهَا سے کیا ہے۔ لہٰذا جو شخص تین دفع ایک لفظ سے طلاق دے تو طلاق نہ تو دو مرتبہ انجام پائے گی، نہ ہی تین مرتبہ انجام پائے گی۔ جس طرح لعان میں چار گواہیاں واجب ہیں، اگر ایک ہی لفظ سے چار گواہیاں دے گا تو اس کا آغاز ہی نہیں ہوگا (یعنی ابتدا نہیں ہوگی) نہ ہی اس سے حکم لعان ثابت ہوگا جس طرح سے شیطان کو اگر سات کنکریاں ایک دفعہ میں ہی مارے تو کافی و جائز نہیں ہے۔ اس میں اختلاف نہیں ہے، اسی طرح ایک لفظ سے تین طلاق کافی نہیں ہے۔

❁❁❁❁❁

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

پھر اگر دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے (تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اُس کے لیے حلال نہ ہوگی مگر یہ کہ اس کا نکاح کسی اور سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔ تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ یہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان پر رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اللہ کی

مقرر کردہ حدیں ہیں اللہ انھیں اس قوم کے لیے واضح کر رہا ہے جو (حدود الٰہی کو توڑنے کے) انجام سے باخبر ہیں۔(۲۳۰)

ترکیب:

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَّتَرَاجَعَا میں أَنْ يَّتَرَاجَعَا حرف جر مقدر کی بنا پر مجرور ہے گویا اس طرح ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْ أَنْ يَّتَرَاجَعَا میں أَنْ يَّتَرَاجَعَا یہ خلیل، کسائی اور زجاج کا نظریہ ہے۔ کہا گیا ہے: أَنْ يَّتَرَاجَعَا محلاً منصوب ہے یہ زجاج اور بقیہ علمائے نحو کا نظریہ ہے۔ أَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ میں أَنْ يُّقِيْمَا، ظَنَّا کی وجہ سے منصوب ہے بلا کسی اختلاف کے۔ أَنْ يَّتَرَاجَعَا سے فِيْ کو حذف کرنا جائز ہے لیکن اس کے مصدر تَرَاجُع سے فِيْ کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ أَنْ صلہ کی وجہ سے طولانی ہو جاتا ہے جس طرح یہ جائز ہے کہ اَلَّذِيْ ضَرَبْتُهٗ زَيْدٌ اس لئے کہ اَلَّذِيْ صلہ کی وجہ سے طولانی ہو گیا ہے لیکن مصدر میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے جس طرح اسم فاعل میں جائز نہیں ہے جیسے زَيْدٌ ضَارِبُ عَمْرٍو يُرِيْدُ ضَارِبَهٗ۔

شان نزول:

زہری نے عروہ کے واسطے سے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: رفاعہ بن وہب القرظی کی زوجہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے لگیں: میں رفاعہ کے یہاں تھی اس نے مجھے طلاق دے دی میری طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے عبدالرحمن بن زبیر سے شادی کر لی، جس کے پاس لباس عروسی (یا سہرا) نہیں تھا، اس نے مجھے مس کیے بغیر طلاق دے دی۔ کیا میں اپنے چچا کے فرزند کی طرف رجوع کر لوں؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: کیا تم رفاعہ کی طرف پلٹنا چاہتی ہو؟ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک (ایک دوسرا شخص تم سے ازدواج کر کے) تم اس سے لطف اندوز نہ ہو۔ یہ آیت فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ.... رفاعہ اور ان کی زوجہ کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

تفسیر:

دو طلاق

خداوند عالم نے تیسری طلاق کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا: فَإِنْ طَلَّقَهَا (پھر اگر دو بار طلاق دینے

کے بعد شوہر نے طلاق دے دی تو) یعنی تیسری بار طلاق اس کی روایت امام باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے اسی کو سدی اور ضحاک نے بھی بیان کیا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ اس قول (اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ) کی تفسیر و تشریح ہے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ یہ اس کے نظریہ کے مطابق ہے جس نے تسریحکو طلاق قرار دیا ہے۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ یعنی وہ عورت پھر اُس کے لیے حلال نہ ہوگی مگر یہ کہ اس کا نکاح کسی اور سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔ یعنی طلاق دینے والے شوہر سے اس عورت نکاح حلال و جائز نہیں ہوگا جب تک کہ وہ کسی غیر مرد سے شادی نہ کرے اور وہ اس سے جماع کرے۔ جماع کے بارے میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ عقد کے متعلق کتاب (قرآن) سے معلوم ہوا اور وطی (جماع) کے بارے میں سنت سے پتہ چلا ہے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ بلکہ دونوں کا علم کتاب سے حاصل ہوا ہے، اس لیے کہ لفظ نکاح عقد اور جماع دونوں کے لئے بولا جاتا ہے، گویا کہا جا رہا ہے کہ جب تک کہ وہ شادی نہ کرلے اور اس کا شوہر اس سے جماع نہ کرلے اس لیے کہ زَوْجًا غَيْرَهٗ سے عقد کا استفادہ ہو رہا ہے اور حَتّٰى تَنْكِحَ سے جماع کا استفادہ ہو رہا ہے۔ اللہ نے اسے اس لیے واجب قرار دیا ہے تا کہ اسے معلوم ہے کہ عورت کا کسی دوسرے مرد سے شادی کرنا طلاق دینے والے پر سخت گزرتا ہے لہٰذا لوگ طلاق دینے میں جلد بازی سے کام نہ لیں اور وہ خود میں ثبات اور ٹھہراؤ (استقلال و مستقل مزاجی) پیدا کریں۔ یہ ابو مسلم نے کہا ہے کہ یہ فصیح کنایات میں سے اور عجیب و غریب ایجاز و اختصار ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا اگر دوسرا شوہر اسے طلاق دے دے تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ (تو ان پر رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں) یعنی مرد و عورت کا باہم عقد نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ حالت سابقہ کی طرف پلٹ آئیں۔ نکاح کو لفظ تراجع (باہم رجوع کرنا) سے بیان کیا ہے۔ اِنْ ظَنَّآ لوگ دونوں امید کریں۔ کہا گیا ہے کہ دونوں کو علم ہو جائے۔ کہا گیا ہے کہ دونوں کو اعتقاد و یقین ہو جائے۔ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یعنی تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ یہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے اور دونوں کے درمیان صلح و صفا قائم رہے گی۔ وَ تِلْكَ، یہ ان امور کی طرف اشارہ ہے جنھیں نکاح اور طلاق اور رجعی طلاق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں یعنی اس کے اوامر و نواہی ہیں۔ يُبَيِّنُهَا (اللہ انھیں واضح کر رہا ہے) اللہ ان کی وضاحت و تفصیل بیان کرتا ہے لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (اس قوم کے لیے جو (حدود الٰہی کو توڑنے کے) انجام سے باخبر ہیں) خدا نے خاص طور سے عالمین کے لئے بیان کیا

ہے اس لیے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو آیات کے بیان سے استفادہ کرتے ہیں۔ پس دیگران اس مقام میں کہ ان کا شمار بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے خاص طور سے عالمین کا ذکر ان کو شرف دینے کی خاطر ہو جس طرح فرشتوں کے درمیان خاص کر جبرئیل و میکائیل کا ذکر کرنا ہے۔

آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جب مرد تیسری طلاق دے دے تو اس کے لیے عورت حلال و جائز نہیں رہے گی مگر یہ کہ وہ دوسرے مرد سے شادی کے شرائط کے بعد اور اس کا قُبل میں جماع کرنا پھر اس سے علیحدگی اختیار کرنا اور عدت کا تمام ہونا۔ اس شوہر کی صفت جو عورت کے پہلے شوہر کے لیے حلالہ کرے گا یہ ہے کہ وہ بالغ ہو اور عورت سے صحیح دائمی عقد کرے۔

تحلیل (حلالہ کرنے) میں اختلاف ہے۔ اس میں تین اقوال پائے جاتے ہیں: بعض نے کہا ہے کہ اگر وہ حلالہ کی نیت کرے گا تو نکاح فاسد ہو جائے گا اور عورت پہلے شوہر کے لیے حلال و جائز نہیں ہوگی۔ یہ مالک، اوزاعی اور ثوری کا قول ہے۔ اسی کے مانند ابو یوسف سے بھی روایت کی گئی ہے اور ان حضرات نے اس قول کے ذریعہ دلیل پیش کی ہے کہ لَعَنَ اللهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهٗ (خدا کی لعنت ہو حلالہ کرنے والے پر اور اس پر بھی لعنت ہو جس کے لیے حلالہ کیا جائے) ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ اگر عقد میں (حلالہ کی) شرط نہیں ہے تو حلالہ جائز ہے اور شرط لگائے تو فاسد ہے اور حلال نہیں ہے۔ یہ شافعی کا قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عقد تو درست ہے لیکن شرط باطل ہے اور پہلے والے شوہر کے لیے (زوجہ) حلال ہو جائے گی لیکن یہ مکروہ ہے۔ مذہب ابو حنیفہ اور اہل عراق کا نظریہ بہ ظاہر یہی ہے۔ محمد نے کہا ہے: نکاح صحیح تو ہے لیکن (عورت) پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔

ارشاد الٰہی: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ میں اس بات پر دلالت ہے کہ ولی کی (اجازت) کے بغیر نکاح جائز ہے۔ عورت خود نکاح کر سکتی ہے، اس لیے کہ عقد کی نسبت عورت کی جانب دی ہے، نہ کہ اس کے ولی کی طرف۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ‌ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا‌ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ‌ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا‌ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ‌ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۳۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور اُن کی عدت پوری ہو جائے پھر یا تو بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا احسن طریقے سے انھیں رخصت کردو۔ محض ستانے کی خاطر زیادتی کرنے کے لیے انھیں نہ روکے رکھنا اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا مذاق نہ بناؤ اور اللہ نے تمھیں جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے انھیں پیش نظر رکھو اور وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب وحکمت اس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔ (۲۳۱)

الفاظ ومعانی:

اَلۡاَجَل کے معنی آخری مدت اور امور کا انجام ہے۔

اس مقام پر 'مَعۡرُوۡف' سے مراد اس حق کے ہیں جس کے صحیح ہونے کی وجہ سے عقل اور شریعت اس کی طرف دعوت دیتی ہے۔ معروف منکر کے برعکس ہے جس سے عقل یا شریعت روکتی اور منع کرتی ہے چونکہ اس کے صحیح ہونے کو معلوم کرنا ناممکن ہے لہٰذا جس چیز کی صحت جائز وممکن ہے، وہ معروف ہے اور جس چیز کے صحیح ہونے کو جاننا ممکن نہ ہو وہ منکر ہے۔

ترکیب:

فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ یہ جملہ محلاً مجرور ہے اس لئے کہ پہلے والے جملہ پر عطف ہے اور وہ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ ہے جو اِذَا کے مضاف ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ ضِرَارًا، تُمۡسِكُوۡهُنَّ میں واؤ کے لئے حال

ہونے کی بنا پر منصوب ہے اس کی تقدیر ہے : وَ لَا تُمۡسِکُوۡھُنَّ مُضَارِّیۡنَ - لِتَعۡتَدُوۡا میں لام تُمۡسِکُوۡا سے متعلق ہے اور ضِرَارًا اَوۡ ھُزُوًا، لَا تَتَّخِذُوۡا کا مفعول ثانی رہیں۔ وَمَا اَنۡزَلَ صلہ اور موصول محلاً منصوب، نِعۡمَتَ پر عطف ہے۔ مِنَ الۡکِتٰبِ بر بنائے حال محلاً منصوب ہے اس میں عامل اُذۡکُرُوۡا اور ذوالحال وَ مَا اَنۡزَلَ ہے۔ مِنۡ تَبۡیِیۡن کے معنی میں ہے یعنی مِنۡ بیانیہ ہے۔ جملہ یَعِظُکُمۡ مقام حال میں ہے اور اس میں عامل اَنۡزَلَ ہے۔

تفسیر:

تین طلاق کا حکم

خداوند عالم نے طلاق کے انجام دیئے جانے والے امور کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ (اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو) یہ شوہروں سے خطاب ہے۔ فَبَلَغۡنَ اَجَلَھُنَّ (اور ان کی عدت پوری ہو جائے) یہاں پر بلوغ سے عورت کی عدت پوری ہونے کی مدت سے قریب ہونا مراد ہے جو لوگوں کے درمیان متعارف اور رائج ہو جسے نفوس قبول کریں اور عقلیں اس کا انکار نہ کریں۔

فَاَمۡسِکُوۡھُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ (پھر یا تو بھلے طریقے سے انھیں روک لو) یہاں پر معروف سے مراد ہے یہ ہے کہ انھیں اس طرح روکے جس طرح اللہ نے مرد کے لیے مباح قرار دیا ہے یعنی عورتوں کے لیے نفقہ اور حسن معاشرت وغیرہ واجب ہے۔ اَوۡ سَرِّحُوۡھُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ (یا احسن طریقے سے انھیں رخصت کردو انھیں آزاد چھوڑ دو یہاں تک کہ ان کی مدت عدت تمام ہو جائے۔ اس طرح وہ اپنی مرضی کی مالک ہوں گی۔ وَلَا تُمۡسِکُوۡھُنَّ ضِرَارًا (محض ستانے کی خاطر زیادتی کرنے کے لیے انھیں نہ روکے رکھنا) یعنی ان کی جانب رغبت کے بغیر صرف انھیں ضرر و نقصان پہونچانے کے لیے یا تو مدت کو طولانی کرنے کے لیے یا عدت میں نفقہ تنگ کرنے کی غرض سے۔ ان کی جانب رجوع نہ کرنا لِتَعۡتَدُوۡا تا کہ ان پر ظلم کرو۔ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ (اور جو ایسا کرے گا) یعنی جو انھیں نقصان پہونچانے کے مقصد سے روکے گا۔ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ (تو درحقیقت اپنے آپ پر ظلم کرے گا) یعنی وہ خود کو نقصان پہونچائے گا اور خود کو عذاب الٰہی کے حوالے کرے گا۔ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا (اللہ کی آیات کا مذاق نہ بناؤ) یعنی اس کے اوامر، فرائض اور نواہی کو سبک اور ہلکا نہ سمجھو۔ کہا گیا ہے کہ آیات الٰہی مراد ہے: فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ہے یعنی

یا تو انھیں بھلے طریقہ سے روک لو اور یا ان پر احسان کرتے ہوئے انھیں آزاد کر دو

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ (اور اللہ نے تمھیں جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے انھیں پیش نظر رکھو) یعنی ان چیزوں کے بارے میں جو تمھارے لیے ازواج اور اموال میں سے مباح قرار دی ہیں اور حلال و حرام سے متعلق چیز جنھیں تمھارے لیے بیان کیا گیا ہے (ان اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو)

وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ (جو کتاب وحکمت اس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو) یعنی وہ علوم جس پر کتاب دلالت کر رہی ہے اور وہ احکام جنھیں اس میں بیان کیا گیا ہے۔ (تشریح کی گئی ہے) يَعِظُكُمۡ بِهٖ'' (اور وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ) تاکہ تم نصیحت حاصل کرو کہ جن چیزوں کا تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے انھیں بجالا کر اور جن چیزوں سے تمھیں روکا ہے انھیں ترک کر کے ثواب حاصل کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) یعنی اللہ کی نافرمانی اور گناہ سے بچو جو اس کے عذاب تک پہونچا دیتے ہیں۔ کہا گیا ہے اللہ کی معصیت و نافرمانی سے پرہیز کر کے اللہ کے عذاب سے ڈرو۔ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ (اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے) اللہ تمھارے افعال وغیرہ (بخوبی واقف ہے)

❁❁❁❁❁❁

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَـكُمۡ وَاَطۡهَرُ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡـتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴿۲۳۲﴾

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدّت پوری کر لیں تو پھر اس میں رکاوٹ نہ بنو کہ وہ اپنے (زیر تجویز) شوہروں سے نکاح کر لیں جب کہ وہ معروف طریقے سے باہمی مناکحت پر آمادہ ہوں۔ تمھیں نصیحت کی جاتی ہے (کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا) اگر تمھارا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے۔ تمھارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے (کہ تم اس سے باز رہو) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۲۳۲)

الفاظ و معانی:

اَلْعَضْل: روکنا۔ کہا گیا ہے کہ اس کے حقیقی معنیٰ منع کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضِیق وَ شِدَّۃ (تنگی اور شدت) ہیں۔ اَمْرٌ مُعْضَل: سخت و دشوار کام۔
جب عورت پر ظلم کرتے ہوئے اسے شادی سے روک دیتے ہیں تو عرب اس طرح کہتے ہیں: عَضَلَ المرأۃ یَعْضِلُهَا عَضْلًا۔

ترکیب:

اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ میں اَنْ یَّنْكِحْنَ محلاً مجرور ہے خلیل اور کسائی کے نزدیک اور اس کی تقدیر یہ ہے: مِنْ اَنْ اور ان دونوں کے علاوہ بقیہ افراد کے نزدیک ایک فعل سے متصل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مبتدا اور خبر ہیں۔ ارشاد الٰہی مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ، یُوْعَظُ کی بنا پر مقام رفع میں ہے اور مِنْكُمْ، یُؤْمِنُ میں مستتر ضمیر کے لئے حال ہے۔

تفسیر:

احکام طلاق

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ (جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں) یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (تو پھر اس میں رکاوٹ نہ بنو) یعنی انھیں شادی کرنے سے روک کر ان پر ظلم نہ کرو۔ کہا گیا ہے کہ اس سے تخلیہ مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ اولیاء سے خطاب ہے اور انھیں (ان عورتوں کو شادی کرنے سے روکنے) سے منع کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے خطاب (شوہروں) سے ہے یعنی تم عورتوں کو خاموشی سے طلاق دے دو اور اسے ظاہر نہ کرو تا کہ کوئی دوسرا ان سے شادی نہ کرے پس وہ (اسی طرح) باقی رہیں، نہ تو انھیں ان کے شوہر اپنے پاس روکیں اور نہ ہی طلاق کے ذریعہ انھیں آزادی حاصل ہو سکے یا ان پر عدت کو طولانی کر دو۔ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (کہ وہ اپنے (زیر تجویز) شوہروں سے نکاح کر لیں) یعنی جس سے وہ شادی کرنے پر راضی ہوں۔ کہا گیا ہے کہ جو ان عورتوں کے پہلے شوہر تھے۔ اِذَا

تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ (جب کہ وہ معروف طریقے سے باہمی مناکحت پر آمادہ ہوں) یعنی جو باعتبار عادت قابل نفرت وانکار نہ ہو، نہ ہی اخلاق کے اعتبار سے اور نہ ہی عقل کے اعتبار سے۔ کہا گیا ہے کہ جب شوہر و زوجہ صحیح نکاح پر راضی ہوں۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب دونوں مہر پر راضی ہوں کم ہو یا زیادہ۔

ذٰلِكَ گذشتہ امرونہی کی طرف اشارہ ہے۔ يُوعَظُ بِهٖ (تمھیں نصیحت کی جاتی ہے (کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا)) جس نصیحت کے ذریعہ روکا اور ڈرایا جاتا ہے۔ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اسے جو تم میں اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے خاص طور سے صاحبان ایمان کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ یہی وہ افراد ہیں جنھوں نے اس نصیحت سے استفادہ کیا ہے یا یہی لوگ وعظ ونصیحت حاصل کرنے کے اعتبار سے اولیٰ اور بہتر ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس لئے کہ کافر کے لیے اللہ کے اعتراف اور ایمان قبول کرنے کے بعد وعظ ونصیحت فائدہ مند ضروری ہے۔

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ (تمھارے لیے شائستہ طریقہ یہی ہے (کہ تم اس سے باز رہو)) یعنی تمھارے لیے خیر اور برکت کے اعتبار سے افضل واعظم اور لائق ومناسب ہے کہ تمھیں پاک قرار دیا جائے۔

وَاَطْهَرُ (اور پاکیزہ) تمھارے قلوب کے لیے شک وریب سے پاک صاف ہے، اس لیے کہ عورت کے دل میں شاید محبت ہو۔ پس جب اسے شادی کرنے سے روکا جائے گا تو اس بات کا اطمینان اور بھروسہ نہیں رہے گا کہ دونوں اس چیز سے تجاوز نہیں کریں گے جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ تمھارے لیے گناہوں سے بہت زیادہ پاک کرنے والا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ (اللہ جانتا ہے) اس میں تمھارے لیے دنیا و آخرت کیا فائدہ ہے وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اور تم نہیں جانتے) اور تم ناواقف ہو، صرف اتنا ہی جانتے ہو جتنا خدا نے تمھیں بتایا ہے۔

کسی کو آیت سے یہ استدلال کرنے کا حق نہیں ہے کہ عقد ولی کے بغیر درست نہیں ہے، اس لیے کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ (عضل) سے مراد روکنا اور منع کرنا ہے۔ جب ہم یہ کہیں گے کہ آیت میں ازواج سے خطاب ہے تو ولی کی اجازت کو شرط ماننے والوں کا قول بے معنیٰ ہو جائے گا اور یہی اولیٰ ہے اس لیے کہ اولیا کا ذکر اس طرح نہیں کیا گیا ہے جس طرح مطلقین (طلاق دینے والوں) کا ذکر کیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں جو یہ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد مدتِ رَضاعت پوری کرے۔ اس صورت میں بچّے کے باپ کو معروف طریقے سے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرنا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی گنجائش سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچّہ اس کا ہے اور نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ اولاد اس کی ہے۔ دودھ پلانے والی کا حق (جیسا کہ بچّے کے باپ پر ہے) ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر تمھارا خیال اپنی اولاد کو کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو بھی معاوضہ طے کر دا سے معروف طریقے پر ادا کرو، اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ (۲۳۳)

قرأت:

اہل بصرہ، ابن کثیر نے اور قتیبہ نے کسائی سے لَا تُضَارُّ کے راء کو مرفوع اور مشدد پڑھا ہے صرف ابو جعفر نے لَا تُضَارْ راء کو ساکن و بغیر تشدید کے قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے راء کو تشدید اور فتحہ کے ساتھ لَا تُضَارَّ قرأت کی ہے۔

صرف ابن کثیر نے مَا آتَیْتُمْ میں ہمزہ کو مقصورہ اور بقیہ قراء نے مَا آتَیْتُمْ مد کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اسی طرح سورہ روم میں بھی قرأت کی ہے۔

حجت:

جن قراء نے مرفوع پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لَا تُضَارُّ سے پہلے لَا تُكَلَّفُ ہے لَا تُضَارُّ کو اس کا تابع قرار دیا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ بہتر ہو اس لئے کہ دونوں کے لفظ مشابہ ہیں۔

اگر آپ کہیں کہ لَا تُكَلَّفُ خبر ہے اور لَا تُضَارُّ امر ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں کبھی کبھی امر خبر کی شکل میں آیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ہے اور اس بات کی تائید یہ بھی کرتا ہے کہ اس کے بعد جو آیا ہے وہ خبر ہے اور وہ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایسا کرنا سزاوار اور مناسب ہے جب خبر امر کے معنی میں واقع ہوگی تو لفظ میں بھی اس جیسی ہو جائے گی۔

جن قراء نے تُضَارَّ کو فتحہ دیا ہے تو انہوں نے اسے فعل نہی قرار دیا ہے اور راء کو فتحہ دیا ہے تا کہ اس کی حرکت ماقبل کے مطابق ہو اور وہ الف ہے۔

ابو جعفر کی قرأت تُضَارْ تو مناسب ہے کہ انہوں نے تُضَارّ کا ارادہ کیا ہو۔ جیسا کہ قرأت شواذ میں ابان نے عاصم سے نقل کیا ہے۔ مگر یہ کہ دو یاء میں سے ایک کو آسان بنانے کی خاطر حذف کر دیا ہے جیسا کہ أَحْسَسْتُ کو أَحَسْتُ، ظَلَلْتُ کو ظَلْتُ اور مَسَسْتُ کو مَسْتُ پڑھا ہے۔

جن قراء نے آتَیْتُمْ پڑھا ہے تو مراد إِيتَاءُ الْمَهْرِ (مہر دینا) ہے جیسے یہ ارشاد الٰہی: آتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا، نیز إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُمْ۔

ابن کثیر کا أَتَیْتُمْ پڑھنا تو اس کی تقدیر یہ ہے کہ إِذَا أَسْلَمْتُمْ مَا أَتَيْتُمْ نَقْدَهُ یا أَتَيْتُمْ سَوْقَهُ پس مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے پھر صلہ سے ہاء کو بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا: أَتَيْتَ نَقْدَ أَلْفٍ یعنی بَذَلْتَهُ (خرچ کیا) جس طرح آپ یہ کہتے ہیں: أَتَيْتَ جَمِيلًا یعنی فَعَلْتَهُ (تم نے بہت اچھا کیا) اس کی تاکید زہیر کا یہ شعر کر رہا ہے:

فَمَا يَكُ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّمَا تَوَارَثَهُ آبَاؤُهُمْ قَبْلُ

۔ جو بھی خیر ہے اسے ان لوگوں نے انجام دیا ہے کہ اسے ان کے اباء واجداد نے ایک دوسرے سے

میراث میں حاصل کیا ہے۔

جس طرح آپ آتَیْتَ خَیْراً کہتے ہیں اسی طرح آتَیْتَ نَقْدَ اَلْفٍ بھی کہتے ہیں۔ یہاں پر آتَیْتَ آتَیْتَ کی جگہ پر آیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کریمہ میں مَا مصدریہ ہو۔ پس تقدیر اس طرح ہوگی :اِذَا اَسْلَمَ الْاِتْیَانَ اور الْاِتْیَان یعنی جسے انجام دیا جائے، نقد خرچ کر کے جیسے ضَرْبُ الْاَمِیْرِ یعنی مَضْرُوْبُ الْاَمِیْرِ حاکم سے مار کھایا ہوا۔

الفاظ و معانی:

اَلرَّضع : دودھ پینے کے لیے پستان کا چوسنا (یا پستان چوس کر دودھ پینا ہے)

اَلْحَوْل : برس، سال۔ اَلْکِسْوَۃ : لباس۔

اَلتَّکْلِیف : کسی زحمت و مشقت کا لازمی قرار دینا اور پابند بنانا۔

اَلْفِصَال : بچہ کا ماں کا دودھ چھڑا کر اسے دوسری غذا دینا۔

ترکیب:

مِنْ تَرَاضٍ مقام حال میں ہے گویا اس طرح ہے :فَاِنْ اَرَادَا مُتَرَاضِیَیْنِ، مِنْہُمَا محلاً مجرور ہے اس لئے کہ تَرَاضٍ کی صفت ہے۔ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْ اَوْلَادَکُمْ یعنی لِاَوْلَادِکُمْ۔ یعنی اپنے اولاد کے لئے ان سے طلب رضاعت کرو۔ دودھ پلانے کا مطالبہ کرو) لام کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ خود استرضاع اس پر دلالت کر رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ طلب رضاعت حرف اولاد کے لئے ہو سکتا ہے۔ آپ دَعَوْتُ زَیْداً کہہ کر دَعَوْتُ لِزَیْدٍ مراد نہیں لے سکتے ہیں اس لئے کہ زیدٌ مدعولہ نہیں ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دَعَوْتُ زَیْداً لِعَمْرٍو کے معنیٰ صرف دَعَوْتُ زَیْداً مدعولہ نہیں ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دَعَوْتُ زَیْداً لِعَمْرٍو کے معنیٰ میں صرف دَعَوْتُ زَیْداً سے الگ ہے پس اشتباہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

بِالْمَعْرُوْفِ، سَلَّمْتُمْ سے بھی متعلق ہو سکتا ہے گویا اس طرح فرمایا ہے :اِذَا سَلَّمْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ مَا آتَیْتُمْ اور بِالْمَعْرُوْف، آتَیْتُمْ سے بھی متعلق ہو سکتا ہے آپ کے اس جملہ کے مطابق کہ آتَیْتُہٗ بِزَیْدٍ۔

تفسیر:

دودھ پلانے کے احکام

خداوند عالم نے حکم طلاق بیان کرنے کے فوراً بعد ہی چھوٹے بچوں کی رضاعت، ان کی تربیت اور اس سے متعلق واجبی امور جیسے لباس و نفقہ کے احکام کے متعلق ارشاد فرمایا: وَالْوٰلِدٰتُ (مائیں) يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (اپنے بچوں کو دودھ پلائیں) صیغہ صیغۂ خبر ہے، لیکن اس سے امر مراد ہے یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ (انتظار کریں) کلام میں اس طرح کا تصرف جائز ہے اشکال برطرف کرنے کے لیے۔ اس لئے کہ اگر یہ خبر ہوتی تو جھوٹ ہوتی اس لئے کہ ممکن تھا کہ مائیں دو سال سے زیادہ یا اس سے کم دودھ پلائیں جیسا کہ آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ حَسْبُكَ دِرْهَمٌ یعنی درہم پر کفایت کرو۔ یہ بھی کہا گیا ہے یہ خبر ہے امر کے معنی ہیں جس کی تقدیر اس طرح ہے: وَ الْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ فِيْ حُكْمِ الَّذِيْ اَوْجَبَهٗ عَلٰى عِبَادِهٖ یعنی مائیں اپنی اولاد کو مکمل دو برس تک دودھ پلائیں اس حکم الٰہی کے مطابق جسے اس نے اپنے بندوں پر واجب کیا ہے) دلالت کے سبب اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ استحبابی امر ہے، وجوبی نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ مائیں دوسری عورتوں کی نسبت اپنے بچوں کو دودھ پلانے کا زیادہ حق رکھتی ہیں اللہ کے اس ارشاد کی بنا پر کہ وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى۔

پھر دودھ پلانے کی مدت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ یعنی مکمل دو برس، چوبیس ماہ۔ كَامِلَيْنِ فرمایا ہے اگرچہ تثنیہ کو مدت پوری کرنے کے لیے لایا گیا ہے، یہ (عمل) اس ابہام و شک کو دور کرنے کے لیے ہے جو کلام میں پیش آتا ہے، جس طرح کوئی شخص کہے: سِرْتُ شَهْرًا وَّ قُمْتُ عِنْدَ فُلَانٍ سَنَةً یعنی میں نے مہینہ بھر سفر کیا اور میں نے فلاں کے پاس ایک برس قیام کیا، اگرچہ اس نے ایک ماہ کے قریب سفر کی ہو یا تقریباً ایک برس قیام کیا ہو۔ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ میں دو باتوں کا بیان ہے:

اول: مندوب یعنی مستحب۔

دوم: فرض۔

مندوب و مستحب یہ ہے کہ رضاعت کے دو برس مکمل کیے جائیں۔ فرض یہ ہے کہ دودھ پلانے والی دو

برس کی مدت کی اجرت کی مستحق ہوگی، اس سے زائد (مدت) کی حقدار نہیں ہوگی۔

اس حد میں اختلاف ہے کہ کیا ہر بچہ کے لیے یہی حد ہے یا بعض کے لیے؟ ابن عباس نے کہا ہے کہ ہر بچہ کے لیے نہیں ہے لیکن جس کے یہاں چھ ماہ کی مدت میں بچہ پیدا ہو یا سات ماہ میں بچہ پیدا ہو تو اس کی حد تیس ماہ ہے۔ اگر نو ماہ میں پیدا ہو تو اس کی حد اکیس ماہ ہے۔ اس طرح حمل اور فصال (بچہ کی دودھ بڑھائی) کی تیس ماہ کی مدت پوری کرنا مطلوب ہے۔ اس قول پر ہمارے علماء کی روایت دلالت کر رہی ہے جسے انھوں نے اس باب میں نقل فرمایا ہے۔ انھوں نے روایت کی ہے کہ اگر مدت اکیس ماہ سے کم ہوئی تو بچہ پر ظلم ہوگا۔

ثوری اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ ہر بچہ کے لیے ضروری ہے جب اس کے والدین اختلاف کریں (بچہ کی ولادت کی مدت کے متعلق) تو کسی زیادتی اور کمی کے بغیر دو برس کی طرف رجوع کریں گے، ان دونوں کے لیے اس کے سوا کوئی دوسری بات جائز نہیں ہے۔ دو برس کے بعد ہمارے نزدیک دودھ پلانے کے لئے حرمت کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اسی بات کو ابن عباس اور ابن مسعود نے بھی بیان کیا ہے۔ بیشتر علماء نے کہا ہے: آیت سے رضاعت کے ذریعہ واقع ہونے والی حرمت کا بیان مراد ہے۔ دو سال کے اندر رضاعت ہوئی ہے تو محرمیت پیدا ہوگی اور اگر دو سال کے بعد دودھ پلایا ہے تو محرمیت ایجاد نہیں ہوگی۔

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (جو یہ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد مدتِ رضاعت پوری کرے) یعنی اس کے لیے جو خود پر واجبی رضاعت کو پورا کرنا چاہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ماں پر رضاعت واجب نہیں ہے، اس لیے کہ اسے ارادہ پر موقوف کیا ہے جس پر اس کا یہ ارشاد دلیل ہے: وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى قتادہ اور ربیع نے کہا ہے کہ خداوند عالم نے ماؤں پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو دو برس دودھ پلائیں پھر اس کے بعد رخصت (اجازت) نازل ہوئی ارشاد فرمایا: لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ یعنی یہ انتہائی (مدت) رضاعت ہے اس کے سوا کوئی حد محدود (معین) نہیں ہے۔ یہ بچہ کے لیے بہتر و مناسب مقدار ہے جس کے ذریعہ وہ زندگی بسر کرتا ہے۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ اس صورت میں بچّے کے باپ پر واجب ہے رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ ان کا رزق یعنی کھانا، غذا اور ان کا لباس۔ اس سے ماؤں کا کھانا اور لباس مراد ہے، جب تک وہ واجبی مدت رضاعت میں ہیں اور یہی حکم مطلقہ (طلاق شدہ) کا بھی ہے۔ یہ ثوری، ضحاک اور بیشتر مفسرین کا نظریہ ہے۔ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی آسانی اور سہولت (حیثیت) کے مطابق اس لیے کہ اللہ دولت مندی و ناداری میں لوگوں کے

حالات سے بخوبی واقف ہے) اس نے بچہ کی نگہداشت کا حق ماں کے لیے قرار دیا ہے اور نفقہ باپ پر اس کی حیثیت کے مطابق فرض ہے۔ اس سے ازواج کا نفقہ مراد نہیں ہے اس لیے کہ یہ رضاعت کے مقابل ہے اور زوجہ کا نفقہ رضاعت کے سبب واجب نہیں ہوتا بلکہ زوجیت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ازواج کا نفقہ مراد ہے۔

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا (مگر کسی پر اس کی گنجائش سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے) یعنی اس کی طاقت بھر اس پر فرض کیا جاتا ہے۔ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا (نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچّہ اس کا ہے) یعنی ماں بچہ کے باپ پر غیظ وغضب کے باعث بچہ کا دودھ پلانا نہ چھوڑے کہ ایسی صورت میں وہ شوہر کی وجہ سے بچہ کو نقصان پہونچائے گی، اس لیے کہ ماں اجنبی عورت سے زیادہ اس پر شفیق و مہربان ہے۔

وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (اور نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ اولاد اس کی ہے۔) یعنی باپ ماں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے بچہ کو اس سے نہ لے لے جس سے اس کے بچہ کو نقصان پہنچے۔ یہاں پر اَلْمُضَارَّۃ باب مُفَاعَلَة سے، ایک دوسرے کو نقصان پہونچانا۔ اِضْرَار باب اِفْعَال سے نقصان پہونچانے کے معنی میں ہے، یعنی ماں اور باپ کو بچہ کی وجہ سے نقصان نہ پہونچا جائے۔ آیت میں 'تُضَآرَّ' باب مفاعلہ سے کہا گیا ہے جبکہ فعل ایک کی جانب سے ہے کیونکہ جب اس کے معنی مبالغہ کے ہوں تو فعل واحد دو کا قائم مقام ہوتا ہے۔ ایک اور قول ہے کہ ضرر بچہ کو ہوگا گویا کہا جارہا ہے ماں باپ میں سے کوئی ایک بھی بچہ کو ضرر نہ پہونچائے۔ یعنی ماں بچہ کو دودھ نہ پلاکر اور باپ اسے نفقہ نہ دے کر (یا بچہ کو ماں سے جدا کر کے ضرر نہ پہونچائے) آیت میں (ب) زائدہ ہے مراد یہ ہے کہ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ وَلَدَهَا وَ لَا وَالِدٌ وَلَدَهٗ یعنی نہ تو ماں اپنے بچہ کو نقصان پہونچائے نہ ہی باپ بچہ کو نقصان پہونچائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے ماں اپنے فرزند کے ذریعہ شوہر کو ضرر نہ پہونچائے۔ اگر فِیْ وَلَدِهَا (یعنی بچہ کی بابت) کہا جاتا تو معنی میں ممکن تھا۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ یعنی ماں کو نقصان نہ پہونچائے کہ حمل کے خوف سے جماع ترک کردے اس کی آغوش میں شیر خوار بچہ ہونے کے سبب۔ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ یعنی بچہ کی ماں باپ سے خود کو حمل کے خوف سے جماع سے نہ روک دے کہ اس سے باپ کو نقصان پہونچے گا۔ ایک اور قول ہے کہ ماں کو نقصان نہ پہونچائے اس کے بچہ کی وجہ سے یعنی ماں سے بچہ کو لیکر دودھ پلانے کے لیے کسی دایا کے

حوالے کردے۔ایسی صورت میں (دایا کے رضاعت کے لیے قبول کرنے پر) دایا کو اجرت المثل دینا پڑے گی۔ایسی صورت میں ماں کو ضرر پہونچ رہا ہے بچہ کی وجہ سے۔ وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ باوجودیکہ وہ رضاعت سے منع نہیں کرتی اگر اسے (رضاعت کے عوض) اجرت المثل دی جاتی لیکن اگر ماں دودھ پلانے سے منع کرے تو باپ کو لازمی طور پر ایک دودھ پلانے والی رکھنی پڑے گی۔لیکن بچہ کے دیدار سے ممانعت کا حق نہیں ہوگا،ایسی صورت میں ضرر باپ کو ہوگا۔ان اقوال میں کوئی منافات نہیں ہے۔لہٰذا آیت کا تمام اقوال پر حمل کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ کہا گیا ہے کہ مراد بچہ کے وارث کے ہیں۔حسن،قتادہ اور سدی نے یہ روایت کی ہے یعنی باپ جب مرجائے تو لڑکا اس کا وارث ہوگا۔کہا گیا ہے کہ وارث والد ہے۔یہ قبیصہ بن ذؤیب سے مروی ہے۔قول اول اقویٰ ہے۔ مِثْلُ ذٰلِكَ یعنی اسی کے مانند جو والد پر تھا جیسے نفقہ اور رضاعت (واجب ہے) حسن وقتادہ نے یہ روایت کی ہے۔ایک اور قول ہے کہ اس چیز کے مانند اور مثل ہے جو والد کے اوپر تھا جیسے ضرر پہونچانے کو ترک کرنا۔بیشتر علماء کے نزدیک دونوں باتیں ایک ساتھ قابل فہم ہیں اور یہی عمومیت کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔

البتہ نفقہ کے تمام ورثا یا بعض وارث کے متعلق ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ایک قول یہ ہے کہ رشتہ داروں پر ہوگا۔اصحاب فرائض یعنی ماں اور ماں کے بھائیوں پر نہیں ہوگا۔عمر بن خطاب اور حسن نے یہ روایت کی ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ نفقہ بچے کے وارث کی میراث میں حصہ کے بقدر ہوگا چاہے مرد ہو یا عورت۔یہ قتادہ سے مروی ہے۔تیسرا قول یہ ہے کہ نفقہ ان ورثا پر ہوگا جو قرابت دار محارم میں سے ہیں نہ کہ وہ قرابت دار جو محرم نہیں ہیں مثلاً چچا کا فرزند اور بہن کا فرزند یہ محرم ہیں لیکن بھانجے پر نفقہ واجب ہوگا،چچا زاد بھائی پر نہیں،اگرچہ وہ اس حالت میں اس کا وارث ہو۔یہ ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا قول ہے۔چوتھا قول یہ ہے کہ نفقہ ان ورثا پر واجب ہوگا جو ماں باپ میں سے زندہ ہوں،یہ سفیان کا قول ہے۔ہمارے نزدیک یہی قول صحیح ہے اور شافعی کا بھی یہی نظریہ ہے چونکہ ان کے نزدیک رضاعت کے نفقہ پر جبر نہیں کیا جائے گا سوائے بیٹوں کے۔ہماری احادیث میں روایت کی گئی ہے کہ نفقہ موجود وارث پر واجب ہوگا۔یہی معنیٰ ظاہر آیت کے موافق ہے۔قتادہ،احمد اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا فصال یعنی دو برس پہلے دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں۔یہ روایت مجاہد وقتادہ نے کی ہے اور یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام کی بھی ہے۔ایک ضعیف قول میں ابن عباس نے دو سال قبل یا

دو سال بعد کی بھی روایت کی ہے۔
عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا (لیکن اگر فریقین یعنی ماں باپ کی باہمی رضامندی) وَتَشَاوُرٍ (اور مشورے سے) یعنی ماں باپ کے اتفاق اور ان کے مشورہ سے۔ والدین کی رضایت اور ان سے مشورہ کی شرط میں بچہ کی بھلائی ہے، چونکہ ماں بچہ کی تربیت سے متعلق ان امور کو جانتی ہے جس کا علم باپ کو نہیں ہوتا، لہٰذا اگر اس سلسلہ میں (والدین) باہم غور و فکر اور مشورہ نہیں کریں گے تو بچہ کو نقصان ہوگا۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے) یعنی ماں باپ پر کوئی حرج نہیں ہے جب بچہ ان سے وابستہ ہو (یا ماں باپ دونوں بچہ سے وابستہ ہوں) لیکن اگر ماں باپ کے درمیان اختلاف ہو تو دو برس مکمل ہونے کی طرف رجوع کریں گے۔ وَاِنۡ اَرَدتُّمۡ (اور اگر تمہارا خیال) آیت میں خطاب آباء و اجداد سے ہے۔ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ (اپنی اولاد کو کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانے کا ہو) یعنی اگر بچہ کی اصل ماں مرض یا شیر منقطع ہونے کے سبب بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کر دے تو ایک دوسری دودھ پلانے والی کا انتظام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ (تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں) ہے اور نہ ہی کوئی تنگی و دشواری ہے۔ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (بشرطیکہ اس کا جو بھی معاوضہ طے کروا سے معروف طریقے پر ادا کرو) یعنی جب تم ماؤں کو رضاعت کی مقدار بھر اجرت ادا کرو تو (تم اس کے ضامن ہو گے) مجاہد اور سُدی نے یہ روایت کی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اس وقت ممکن ہوگا جب رضاعت باہمی اتفاق سے طے کرو۔ اس میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہ ابوشہاب سے مروی ہے۔ یہ ابن عباس کے قول کے یہی معنی ہیں۔ عطا کی روایت میں آیا ہے کہ جب بچہ کو اس کی ماں کسی دوسری دودھ پلانے والی کے سپرد کر دے اور بچہ کا باپ اس پر راضی ہو گویا وہ بچہ کے لیے دودھ پلانے والی خریدنے سے بے نیاز ہو جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تم دودھ پلانے والی کی اجرت ادا کر دو۔ یہ ثوری سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب ماں کی اجرت ادا کر دو۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ اٰتَيۡتُمۡ کے معنی ہیں تم اس کے ضامن اور پابند ہو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) یعنی اللہ کی نافرمانی اور اس کے عذاب سے بچو ان حدود سے تجاوز کرنے میں جو اس نے تمہارے لیے مقرر کیے ہیں۔ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (اور یہ جان لو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے) یعنی اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ وہ بصیر ہے، اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

ارشادِ الٰہی: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا مالا یُطاق مجبرہ کے اس قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ تکلیف مالا یطاق حسن ہے اس لئے کہ جب وہ اجازت نہیں دیتا ہے کسی کو ناتوانائی اور عاجزی کی صورت میں کسی پر کوئی فریضہ رکھا جائے تو وہ اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ عدم قدرت کی صورت میں فریضہ عائد نہ کرے اس لئے کہ دونوں صورتوں میں انسان پر جو فریضہ عائد کیا جارہا ہے وہ اس کی انجام دہی کی طاقت وقوت نہیں رکھتا ہے۔

❁❁❁❁❁

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

تم میں سے جو لوگ مرجائیں اور اُن کے بعد اُن کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں۔ پھر جب اُن کی عدّت پوری ہوجائے تو انھیں اختیار ہے، اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں۔ تم پر اُن کی کوئی ذمّے داری نہیں ہے، اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ (۲۳۴)

قراءت:

قرأت شواذ میں امام علی علیہ السلام سے يَتَوَفَّوْنَ یاء کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔

حجت:

ابن جنی نے کہا: یہ قرأت مفعول کے محذوف ہونے کی بنا پر ہے یعنی اَلَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ اَيَّامَهُمْ اَوْ اٰجَالَهُمْ وَ اَعْمَارَهُمْ (جو لوگ اپنے دن یا اپنی مدتیں یا اپنی عمریں گذارتے ہیں) قرآن مجید میں بہت سے مقام پر مفعول بہ کو حذف کیا گیا ہے اور فصیح کلام میں بھی دلیل اور قرینہ کی موجودگی میں ایسا کیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اُوْتِيَتْ شَيْئًا مِّنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ حطیہ شاعر نے کہا:

مُنَعَّمَةٌ تَصُوْنُ اِلَيْكَ مِنْهَا كَصَوْنِكَ مِنْ رِدَاءٍ شَرِّ عَبِيّ

یعنی تصون الکلام منہا۔
تَوَفَّیْتُ الشَّیْءَ وَاسْتَوْفَیْتُہ یعنی میں نے اسے مکمل طریقہ سے پکڑ لیا، حاصل کر لیا۔

الفاظ و معانی:

یَذَرُ وَیَدَعُ: ترک کرتا ہے۔
اَلْاَجَل: انتہائے وقت، اَلْعَاجِل کی ضد ہے۔ اَلْاٰجِلَۃ: آخرت۔ اَلْعَاجِلَۃ: دنیا۔
اَلْخَبِیْر: عالم۔ اس کے لغوی معنی سُھُوْلَۃ کے ہیں۔ اَلْخَبَار: نرم زمین۔

ترکیب:

وَالَّذِیْنَ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ یُتَوَفَّوْنَ اس کا صلہ ہے۔ مِنْکُمْ، یُتَوَفَّوْنَ میں واؤ کے لئے حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے۔ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً صلہ پر عطف ہے وہ بھی صلہ ہے۔ یَتَرَبَّصْنَ اور مابعد مبتدا کی خبر ہے۔ جب مبتدا کی خبر اس بات سے خالی نہ ہو کہ وہ وہی ہو یا اسی کا اس میں ذکر ہو تو ایسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ ظاہر اس چیز پر وہ ہے اس لئے کہ وہ مبتدا کی خبر دو قسموں سے خالی ہے اور اس کے بارے میں چند اقوال ہیں:

پہلا قول: مبتدا (اَلَّذِیْنَ) کی خبر یَتَرَبَّصْنَ بَعْدَھُمْ کو فرض کیا جائے گا، اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ ان کی بیویاں ان کے انتقال کے بعد چار مہینے دس دن انتظار کریں گی (عدت وفات) اور اس بَعْدَھُمْ کو حذف کرنا جائز ہے جو کہ یَتَرَبَّصْنَ سے متعلق ہے اور اس میں ھُمْ کی ضمیر مبتدا کی جانب پلٹ رہی ہے جیسا کہ عربوں کے اس جملہ میں بھی ایسا کرنا جائز ہے: اَلسَّمَنُ مَنَوَانِ بِدِرْھَمٍ یعنی مَنَوَانِ مِنْہُ بِدِرْھَمٍ یہ اخفش کا نظریہ ہے۔

دوسرا قول: اس کی تقدیر یہ ہے: اَزْوَاجُھُمْ یَتَرَبَّصْنَ (یہ ابو العباس مبرد کا قول ہے) اس قول کی بنا پر جو محذوف ہے وہ مبتدا ہے اور وہ اَزْوَاجُھُمْ ہے۔ اس طرح کا حذف رائج و جائز ہے اس لئے کہ اس پہ دلیل موجود ہے۔ اسی طرح مفرد کو حذف کرنا بھی جائز ہے جب اس پر قرینہ موجود ہو اور مضاف پر دلالت اور قرینہ کی موجودگی اس طرح ہے کہ ازواج وہی ہیں کہ جن کا ذکر گزر چکا ہے پس ازواج کو حذف کرنا جائز اور

حسن ہے البتہ مضاف الیہ کو حذف کرنا تو اس مبتدا کی بنا پر ہے جس کی جانب (مضاف الیہ) پلٹ رہا ہے۔
مبتدا مضاف محذوف بھی آیا ہے جس طرح مفرد آیا ہے اور وہ یہ ارشاد الٰہی ہے: لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ (آل عمران ۱۹۶، ۱۹۷) یعنی تَقَلُّبُهُمْ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ۔

تیسرا قول: اس کی تقدیر یہ ہے کہ یَتَرَبَّصْنَ اَزْوَاجُهُنَّ پھر ازواج سے کنایہ کیا ہے۔ یہ کسائی کا قول ہے خدا نے عَشْرًا مؤنث فرمایا ہے لَیَالِی کو اَیَّام پر غلبہ دلاتے ہوئے جب تاریخ میں جمع ہو جائیں اس لئے کہ ہر دن کی رات اس دن سے پہلے ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: لِخَمْسٍ بَقِیْنَ مخاطب کو معلوم ہے کہ اَیَّام بھی لَیَالِی کے ساتھ داخل ہیں۔ سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

وَ طَافَتْ ثَلَاثاً بَیْنَ یومٍ ولیلةٍ	یَکُوْنُ النَّکِیْرُ اَنْ تُضِیْفَ وَتَجْاَرَا

فِیْمَا فَعَلْنَ میں مَا اپنے صلہ کے ساتھ محلاً مجرور ہے۔ بِالْمَعْرُوْفِ جار و مجرور بر بنائے حال محلاً منصوب ہے۔

تفسیر:

عدہ وفات کے احکام

مطلقات کا عدہ بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے عدت وفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:
وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ یعنی تم میں سے جن کی روح قبض ہو جائے اور وہ مر جائیں۔ وَیَذَرُوْنَ چھوڑ جائیں اَزْوٰجًا عورتیں۔ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ عدت پوری ہونے تک انتظار کریں اور عدت کی حالت میں خود کو شادی سے روکے رکھیں اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا چار ماہ اور دس راتیں اور دس دن۔ یہ اس عورت کی عدت ہے جس کا شوہر مر گیا ہو، چاہے اس عورت سے ہمبستری کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، آزاد ہو یا کنیز۔ اگر وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت کی مدت وضع حمل ہے یا چار ماہ اور دس دن ہے۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو زیادہ طولانی ہو وہی اس کی عدت ہے۔ کنیز کی عدت بھی چار ماہ اور دس دن ہیں اس سلسلہ میں اصم نے ہماری موافقت کی ہے اور باقی فقہاء نے ہماری مخالفت کی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ کنیز کی عدت آزاد عورت کے نصف یعنی دو ماہ پانچ روز ہے۔ ہمارے علما کے ایک گروہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انھوں نے حاملہ کی عدت کے بارے میں کہا ہے کہ وضع حمل ہے اگر چہ (اس مدت کا شمار بچہ پیدا ہونے کے بعد عورت کے نفاس کے غسل کے بعد سے ہے۔ اس کی

روایت عمر بن خطاب، ابو مسعود البدری، اور ابو ہریرہ سے کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک (حاملہ کی عدت) وضع حمل ہے جو مطلقہ کی عدت سے مخصوص ہے۔ عدت وفات والی عورت پر واجب ہے کہ وہ زینت کرنے، سرمہ لگانے اور گھر سے باہر نکلنے سے پرہیز کرے۔ یہ ابن عباس اور زہری سے مروی ہے۔ شادی کرنے سے ممانعت ہے اس کے علاوہ سے نہیں۔ یہ حسن سے مروی ہے اور دو روایتوں میں سے ایک روایت سے ابن عباس سے مروی ہے اور ہمارے نزدیک یہ تمام امور واجب ہیں۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ یعنی عدت کا وقت ختم ہو جائے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (تو انھیں اختیار ہے) بیان کیا گیا ہے یہ اولیا (سرپرستوں) سے خطاب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اس لیے کہ انھیں صاحب عدت عورت کو عدت میں شادی سے روکنے کا پابند بنایا گیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ عورتوں اور تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔

فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ (اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں) جیسے نکاح کرنا اور زینت کے سامان کا استعمال کرنا جو اس جیسی خاتون کے لئے برا نہیں مانا جاتا ہے۔ بِالْمَعْرُوفِ کے یہی معنیٰ ہیں۔ معروف کے معنی میں کہا گیا ہے کہ جو چیز جائز ہو۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی حلال نکاح کے ہیں۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے) یعنی اللہ جاننے والا ہے۔ مذکورہ بالا آیت اس آیت کے لئے ناسخ ہے: وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۰؛ تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ کر جائیں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک اُن کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو)

❀❀❀❀❀

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

عدّت کے دوران تم ان بیوہ عورتوں سے منگنی کا ارادہ اشارے، کنائے میں ظاہر کردو، خواہ دل میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا، اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو اور عقد نکاح کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدّت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کے حالات سے بخوبی باخبر ہے۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ (۲۳۵)

الفاظ و معانی:

اَلتَّعْرِيْض، اَلتَّصْرِيْح کی ضد ہے۔ 'اَلتَّصْرِيْح' کلام کا اس دلالت پر مشتمل ہونا ہے جسے آپ چاہتے ہیں۔ تعریض اور کِنَايَة کے درمیان یہ فرق ہے کہ تعریض یہ ہے کہ کلام کسی ایسی چیز کی دلالت پر مشتمل ہو جس کا اس میں ذکر نہ کیا گیا ہو۔ کِنَايَة یہ ہے کسی خاص چیز کے ذکر سے گریز کر کے ایسی چیز کا ذکر کیا جائے جو اس لئے خاص پر دلالت کرے۔

خِطْبَة: عقد کی پیشکش کرنا، منگنی۔

اَكْنَنْتُمْ: تم نے پوشیدہ کیا۔ چھپایا، اِكْنَان: پوشیدہ کرنا۔ چھپانا۔

ترکیب:

فِيمَا عَرَّضْتُمْ جار و مجرور مقام حال میں ہے۔ اسی طرح مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآء بھی مقام حال میں

ہے۔ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا محلاً منصوب ہے سِرًّا کا بدل ہے۔ گویا اس طرح ہے: وَلَا تُوَاعِدُوۡهُنَّ اِلَّا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا۔ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّکَاحِ۔ یعنی عَلٰی عُقۡدَةِ النِّکَاحِ آسانی کی خاطر عَلٰی کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح عربوں کا یہ کہنا ہے: ضَرَبَ زَیۡدٌ الظَّهۡرَ وَ الۡبَطۡنَ یعنی عَلَی الظَّهۡرِ وَ الۡبَطۡنِ (زید کی پیٹھ اور پیٹ پر مارا گیا۔ سیبویہ نے کہا: ان جملوں میں حذف پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

تفسیر:

دوران عدت خواستگاری کے احکام

خداوند عالم نے عورت کی عدت اور مردوں کے لیے عدت میں رجوع کرنے کا ذکر کرنے کے فوراً بعد شوہروں کے علاوہ دیگر افراد کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اے گروہ مردم تمھارے لیے کوئی حرج نہیں ہے، نہ ہی کسی قسم کی تنگی ہے۔ فِیۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِهٖ مِنۡ خِطۡبَةِ النِّسَآءِ (تمھارے لیے نکاح کے پیغام کی پیش کش یا دل ہی دل پوشیدہ ارادہ میں) صاحب عدت عورتوں کے بارے میں جن کے متعلق تم صراحت اور وضاحت نہ کرو۔ یعنی ان کے بارے میں ایسا ذکر کرنا جو ان کے متعلق تمھاری رغبت و چاہت پر دلالت کرے، اس کے مراد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ تعریض (پیشکش) یہ ہے کہ مرد صاحب عدت عورت سے اس طرح کہے کہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان صفات کی حامل عورت کو پسند کرتا ہوں اور پھر بعض ان صفات کا ذکر کرے جو اس عورت میں موجود ہوں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مرد اس طرح کہے: تم نفع بخش ہو، تم میرے لیے مناسب ہو، تم عجیب و غریب اور حسین و جمیل ہو۔ اگر اللہ کا فیصلہ ہوا تو کچھ ہو جائے گا۔ یہ قاسم بن محمد اور شعبی سے روایت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ عقد کے علاوہ ہر کلام و گفتگو مراد ہے۔ ابن زید سے مروی ہے۔

ارشاد الٰہی: اَوۡ اَکۡنَنۡتُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ یعنی تم اپنے دل ہی دل میں پوشیدہ رکھو کہ ان کی عدت کی مدت گذر جانے کے بعد ان سے نکاح کرو گے۔ کہا گیا ہے کہ ارادہ کو پوشیدہ رکھو اس کا اظہار نہ کرو۔ تعریض (پیش کش): ارادہ کا اظہار کرنا ہے۔ یہ مجاہد و ابن زید سے مروی ہے۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمۡ سَتَذۡکُرُوۡنَهُنَّ (اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی) اللہ ان کے متعلق تمھاری رغبت و چاہت اور تمھارے اس خوف سے بخوبی واقف ہے کہ ان پر کوئی دوسرا سبقت

نہ لے جائے گا۔لہٰذا تمھارے لیے یہ مباح قرار دیا ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا (مگر دیکھو خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا) اس میں متعدد اقوال ہیں:

اول: تم ان سے رازدارانہ طور پر وعدہ (عہد و پیمان) نہ کر لینا، اس لیے کہ یہ اجنبی ہیں اور رازدارانہ طور پر وعدہ کرنا ناجائز چیز کی دعوت دیتا ہے۔

دوم: زنا مراد ہے۔ یہ حسن، ابراہیم اور قتادہ سے مروی ہے۔ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ آدمی نکاح کی پیشکش لے کر عورتوں کے پاس زنا کے ارادہ سے پہونچتا تھا لہٰذا انھیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

سوم: اس بات کا عہد لینا ہے کہ وہ تمھارے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی) یہ ابن عباس و سعید بن جبیر سے مروی ہے۔

چہارم: عورت سے اس طرح کہنا کہ میں تجھ سے نکاح کروں گا مجھے فراموش نہ کرنا۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔

پنجم: السِّرِ یعنی جماع ہے مراد یہ ہے کہ اپنی تعریف کثرت جماع سے نہ کرو نہ ہی اس کا تذکرہ کرو۔ یہ ایک جماعت سے مروی ہے۔

ششم: عقد نکاح کا خاموشی سے انجام دینا اور اسے پوشیدہ رکھنا۔ یہ عبدالرحمٰن بن زید سے مروی ہے۔ یہ تمام اقوال امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس ارشاد میں جمع ہو جاتے ہیں جس میں آپؑ نے فرمایا: عورتوں سے نکاح اور شادی کی صراحت و وضاحت نہ کرو۔ پھر آپؑ نے فرمایا: سِر یعنی پوشیدہ راز یہ ہے ان سے کہا جائے تمھاری وعدہ گاہ فلاں کا مکان ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو) یعنی جس پیش کش کو اللہ نے ان کے لیے مباح قرار دیا ہے۔ اِلَّا لٰکِنْ کے معنی میں ہے اس لیے کہ اس کے ماقبل سے نہی کی گئی ہے اور اس کے مابعد میں اجازت دی گئی ہے، جس کی تقدیر اس طرح ہے: وَ لٰكِنْ قُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا لیکن اچھی اور بہتر بات کہو۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (اور عقد نکاح کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو) یعنی نکاح کے لیے سختی اور شدت نہ کرو، نہ ہی عدت میں عقد نکاح کرو۔ عدت کے بعد نکاح کا ارادہ کرنے کی نہی وارد نہیں ہوئی ہے چونکہ اس کے اس ارشاد اَوْ اَكْنَنْتُمْ سے مباح قرار دیا گیا ہے۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ (جب تک کہ عدّت پوری نہ ہو جائے) یعنی یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اَلْكِتَاب سے مراد قرآن ہے۔ یہاں تک کہ فرض اپنی

مدت تک پہونچ جائے۔یعنی جو قرآن میں عدت کی مدت فرض اور مقرر کی گئی ہے (وہ مکمل ہو جائے) کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہاں تک کہ فرض کی مدت پہونچ جائے۔فرض کو کتاب کہا گیا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: کُتِبَ یعنی فُرِضَ (فرض کیا گیا) اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لکھ دیا جاتا ہے وہ ثابت کر دیا جاتا ہے اور کِتَاب اور فَرْض دونوں ثبوت کے معنی میں جمع ہیں۔کہا گیا ہے کہ عدت کی اس قرض سے تشبیہ ہے جس کی مدت کتاب میں تحریر ہے۔جس طرح اس قرض کا مطالبہ متاخر ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی تحریری مدت پہونچ جاتی ہے۔اسی طرح خطبۂ نکاح (منگنی) عدت کے خاتمہ تک متاخر ہوتا ہے (ٹال دیا جاتا ہے)

وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيٓ اَنْفُسِكُمْ (خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کے حالات سے بخوبی باخبر ہے) اللہ تعالیٰ تمھارے اسرار اور پوشیدہ رازوں کو بخوبی جانتا ہے۔فَاحْذَرُوْهُ (لہٰذا اللہ سے ڈرو) اس کے عذاب سے ڈرو اور اس کے امر کی مخالفت نہ کرو۔

وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ (اور یہ بھی جان لو کہ اللہ درگزر کرنے والا ہے) یقیناً اللہ اپنے بندوں کو بخشنے والا۔حَلِيْمٌ (بردبار ہے) مستحق عذاب کو مہلت دیتا ہے۔عذاب میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

❀❀❀❀❀

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تم اپنی عورتوں کو ہاتھ لگانے یا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دو، اس صورت میں انھیں کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیے، خوش حال اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب اپنی بساط بھر، معروف طریقے سے ادا کرے۔ نیک آدمیوں پر یہ حق مقرر کیا گیا ہے۔(۲۳۶)

قرائت:

حمزہ اور کسائی نے اس آیت میں دو مقامات اور سورۂ احزاب میں تُمَاسُّوْهُنَّ تاء کے ضمہ اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے تَمَسُّوْهُنَّ پڑھا ہے۔ابوجعفر نے اور اہل کوفہ سوائے ابوبکر اور ابن ذکوان کے

دونوں جگہوں پر قَدَرہ دال کو فتحہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے دال کو سکون کے ساتھ قَدْرہ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے تَمَسُّوْهُنَّ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ۔ وَلَمْ يَطْمِثْهُنَّ اور فَانْكِحُوْهُنَّ ہے۔ نکاح سے مراد ہمبستری ہے۔ جریر نے کہا:

اَلتَّارِكُوْنَ عَلٰى طُهْرٍ نِسَآءَهُمْ وَالنَّاكِحُوْنَ بِشَطِّي دَجْلَةَ الْبَقَرَا

جن قراء نے وَلَا تُمَاسُّوْهُنَّ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ فَاعَلَ (باب مفاعلہ) اور فَعَلَ (مجرد) ہر ایک سے وہی ارادہ کیا گیا ہے جو دوسرے سے کیا گیا ہے جیسے طَارَقْتُ النَّعْلَ وَعَاقَبْتُ اللِّصَّ۔ ابوالحسن نے کہا: کہا جاتا ہے کہ هُوَ الْقَدَرُ وَالْقَدْرُ، اور لوگ قَدَر اور قَدْر میں اختلاف کرتے اور جھگڑتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

اَلَا يَالِقَوْمٍ لِلْغَوَائِبِ وَالْقَدْرِ

وَخُذْ مِنْهُ بِقَدْرِ كَذَا۔ قَدْر اور قَدَر دو تلفظ ہیں۔ کتاب خدا میں فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا [illegible] بھی تلفظ کیا گیا ہے۔ اسی طرح عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَقَدْرُهٗ بھی ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔ اگر دال کو حرکت دیتے تب بھی جائز ہوتا اسی طرح اِنَّ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۔ اگر دال کو ساکن کر دیتے تب بھی جائز تھا۔

لیکن سرفہرست تمام آیتوں میں دال کو فتحہ دینا لازم ہے اس لئے کہ اس سے پہلے فتحہ ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْمُوْسِعِ: وہ شخص جو اپنے مال و ثروت کی وجہ سے وسعت و کشائش میں ہو۔

اَلْمُقْتِرِ: وہ شخص جو اپنے فقر و ناداری کے سبب تنگی میں ہو۔

ترکیب:

مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ: موصول و صلہ محلا منصوب ہیں گویا اس طرح ہے: مُدَّةَ تَرْكِ الْمَسِّ۔ مضاف کو

حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیا ہے۔ ظرف میں عامل طَلَّقَ ہے اور جواب شرط محذوف ہے۔ گویا اس طرح ہے: اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ مَتَاعاً دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے منصوب ہے: یا تو قَدَرُہٗ کا حال ہے اور اس میں عامل ظرف ہے یعنی مُمَتِّعاً مَتَاعاً یا مصدر (مفعول مطلق) کی بنا پر منصوب ہے یعنی مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعاً اور حَقًّا بھی دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے منصوب ہے: یا تو بِالْمَعْرُوْفِ کے لئے حال ہے اور اس میں عامل عرف حَقًّا کے معنیٰ ہیں یا تو جملہ خبر کے ذریعہ تاکید کی بنا پر منصوب ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: اُخْبِرُكُمْ بِهٖ حَقًّا اَوْ اُحِقُّهٗ حَقًّا یا حَقَّ عَلَيْهِمْ حَقًّا گویا اس طرح فرمایا ہے: اِيْجَاباً عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ۔

تفسیر:

جماع سے پہلے طلاق کے احکام

پھر خداوند عالم نے فرض اور (جماع) کرنے سے قبل طلاق کا حکم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ (تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، اگر تم اپنی عورتوں کو ہاتھ لگانے (یا مہر مقرر کرنے سے) پہلے طلاق دے دو) یہ عورت کو مس (جماع) کرنے اور مہر کے فرض سے قبل طلاق کے مباح ہونے کا حکم ہے۔ دخول سے قبل طلاق دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے یہ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ ایسی حالت میں طلاق دینا حرام ہے۔ مس کنایہ ہے جماع سے اور مفروض (عورت کا) مہر ہے جو آیت کی دلالت میں داخل ہے، اگرچہ اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے: مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ مِمَّنْ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ جب تک تم انھیں مس (جماع) نہ کرو جو تم ان کے لیے (فرض) مہر قرار دے چکے ہو۔ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً (یا مہر مقرر کرنے سے پہلے) اس لیے کہ اَوْ اس چیز کو ظاہر کر رہا ہے۔ اگر جمع کے لیے ہوتا یعنی دونوں ملا کر شرط ہوتے تو (واو) کے ساتھ ہوتا، فریضہ سے مراد مہر ہے اس میں اختلاف نہیں ہے اس لئے کہ ہر عورت سے عقد کے ساتھ ہی واجب ہو جاتا ہے، پس مراد یہ ہے کہ یا تم نے ان کے لیے مہر مقرر و معین نہ کیا ہو، خاص طور سے ان عورتوں سے رفع حرج کا ذکر کیا گیا ہے جن سے دخول نہ کیا گیا ہو، نہ کہ وہ عورتیں کہ جن کے ساتھ دخول ہوا ہو، اگرچہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے تو خاص طور سے ذکر دو وجہوں سے ہے:

اول: تا کہ شک برطرف کیا جائے جس کا ہم نے سابقاً ذکر کیا ہے۔

دوم: اس لیے کہ جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا ہے اسے کسی بھی وقت طلاق دے سکتا ہے، برخلاف مَدۡخُوۡل بِهَا (جس سے جماع ہوا ہو) اسے ایسی پاکی کے زمانہ ہی میں طلاق دی جاسکتی ہے جس میں جماع نہ کیا ہو۔

وَمَتِّعُوۡهُنَّ (اس صورت میں انھیں کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیے) انھیں اپنے مال سے وہ چیز عطا کرو جس سے وہ استفادہ کرسکیں۔ اَلۡمُتۡعَةُ اور اَلۡمَتَاعُ (وہ چیز ہے جس سے استفادہ کیا جاتا ہے) عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ (خوش حال اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرے) جس کے یہاں (مال) میں وسعت ہو وہ اپنے حسب حال عطا کرے گا۔ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ (اور غریب اپنی بساط بھر،) اور فقیر جو تنگی کی حالت میں ہے وہ اپنے امکان اور طاقت کے مطابق عطا کرے۔ متعہ میں خادم، لباس یا رزق (غذا) داخل ہے۔ یہ ابن عباس، شعبی اور ربیع سے مروی ہے۔ یہی حکم امام محمد باقر علیہ السلام وامام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ شافعی کا نظریہ بھی یہی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ منکوحہ عورت کے مثل مہر کا نصف ہے۔ یہ ابوحنیفہ اور ان کے احباب سے مروی ہے۔

پھر اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے: پہلا قول: متعہ ان عورتوں کے لیے واجب ہے جن کا خاص طور پر مہر معین نہ کیا گیا ہو۔ یہ سعید بن مسیب سے روایت ہے۔ یہی حکم امام باقر اور امام جعفر صادق (علیہما السلام) سے مروی ہے۔ یہ ابوحنیفہ اور ان کے احباب کا بھی یہی نظریہ ہے۔ دوسرا قول: یہ (متعہ) خلع والی عورت، مبارات والی عورت اور ملاعنہ والی عورت کے علاوہ ہر مطلقہ کے لیے ہے۔ یہ زہری وسعید ابن جبیر اور ابوالعالیہ سے مروی ہے۔ تیسرا قول: ہر مطلقہ کے لیے ہے سوائے اس مطلقہ کے جس کا (مہر) معین کیا گیا ہو، جب اسے دخول سے قبل طلاق دے دی جائے اس کے لیے نصف مہر ہے، اس کے لیے متعہ کا (حق) نہیں ہے۔ یہ ابن عمر ونافع اور عطا سے مروی ہے۔ شافعی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ ہمارے علمانے بھی اسی طرح روایت کی ہے، اسے استحباب پر حمل کیا جائے گا۔

مَتَاعًا انھیں پونجی سے فائدہ پہونچاؤ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (معروف طریقے سے) میانہ روی کے ساتھ؛ نہ تو اس میں اسراف وفضول خرچی ہو، نہ ہی بخل وکنجوسی سے کام لیا جائے۔ ایک قول یہ بھی وارد ہوا ہے پونجی ایسی ہونی چاہیے جو مرد کی وسعت اور تنگی کی حالت کے مطابق ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں کی حالت کے مطابق ہو۔ اس لیے کہ شریف آزاد عورت اور آزاد شدہ کنیز کے درمیان مساوات نہیں ہے تا کہ یہ تعارف سے خارج

ہو۔ یہ قاضی سے مروی ہے۔ اہل مدینہ کا کہنا ہے کہ شوہر کو اس کا حکم دیا جائے گا مگر اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک اس پر جبر کیا جائے گا، یہی بات اہل عراق نے کہی ہے۔

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (نیک آدمیوں پر یہ حق مقرّر کیا گیا ہے) یعنی ان لوگوں پر واجب ہے جو بہتر طریقہ پر اطاعت کرتے اور معصیت سے پرہیز کرتے ہیں۔ مُحْسِنِينَ (حسن عمل کرنے والوں) کا ان کے شرف اور احترام کے سبب خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، نہ یہ کہ دوسروں پر واجب نہیں ہے۔ یہ فقرہ ہر ایک کے نیکی کرنے اور محسن و نیکوکار بننے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ ہر انسان کا محسن ہونا ضروری ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو حسن عمل کرنا چاہے تو اس کا یہ حق اور حکم اور طریقۂ کار ہے۔ یہ ابو مسلم سے مروی ہے۔ یہ تمام احکام مطلقہ سے متعلق ہیں لیکن جس کا شوہر مر گیا ہو جب اس کا مہر معین نہ کیا گیا ہو تو اس کے لیے میراث ہے اور اس پر عدت فرض ہے۔ اجماعی طور پر بیشتر فقہاء نے کہا ہے کہ اس کے لیے مہر مثل ہے۔ ابو علی الجبائی نے بعض فقہاء سے نقل کیا گیا ہے کہ اس کے لیے مہر نہیں ہے۔ یہی ہمارے مذہب (نظریہ) کے مناسب ہے، اس لیے کہ ہمارے علما کے لیے اس بارے میں کوئی نص (واضح حکم یا صریح حدیث و روایت) نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو اور مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ ولی جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے، نرمی سے کام لے اور مہر کی رقم کو معاف کردے اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ کے نزدیک لے جاتا ہے اور آپس کے معاملات میں فیاضی کو فراموش نہ کرو، اللہ تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (۲۳۷)

قرائت:

قرأت شواذ میں حسن سے مروی ہے: اَوْ یَعْفُوْ الَّذِیْ بِیَدِہٖ کو واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور امام علی علیہ السلام سے وَلَا تَنَاسَوُا الْفَضْلَ مروی ہے۔

حجت:

حالت نصب میں فعل مضارع کے واؤ کا ساکن ہونا بہت کم ہے اور یاء کا ساکن ہونا بہت زیادہ ہے یہاں پر درحقیقت سکون الف کے لئے ہے جیسے اَنْ یَّسْعیٰ پھر یاء کو بھی الف سے قریب ہونے بنا پر الف کے مشابہ قرار دے دیا گیا ہے جیسے شاعر کا یہ شعر ہے:

کَاَنَّ اَیْدِیْھِنَّ بِالْمُوْمَاۃ اَیْدِیْ جَوَارٍ بِتْنَ نَاعِمَات

نیز کہا: کَاَنَّ اَیْدِیْھِنَّ بِالْقَاعِ الْقَرِق

پھر واؤ کو یاء کے مشابہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اخطل نے کہا:

اِنْ شِئْتَ اَنْ تَلْھُوْ بِبَعْضِ حَدِیْثِھَا رَفَعْنَ وَ اَنْزَلْنَ الْقِطِیْنَ الْمُوَلَّدا

نیز مصرع: اَبَی اللّٰہُ اَنْ اَسْمُوْ بِاُمٍّ وَّلَا اَبٍ

ارشاد الٰہی وَ لَا تَنْسَوُا یہ جملہ ان لوگوں کے اس کام سے نہی ہے جسے انھوں نے اختیار کر رکھا تھا اور اس کا تظاہر کرتے تھے جیسے یہ کہا جاتا ہے: تَغَافَلَ وَ تَصَامَّ (انھوں نے آپس میں غفلت برتی اور ایک دوسرے کی ان سنی کی) اور یہ قرأت حسن ہے اس لئے کہ آپ انسان کو اس کے عمل سے منع کر رہے ہیں۔ نسیان کا ظاہر یہ ہے کہ دوسرے کا عمل ہو گویا اسے بھلایا گیا ہو اور وہ بھول گیا ہو۔ قرآن مجید میں آیا ہے: وَمَا اَنْسٰنِیْہُ اِلَّا الشَّیْطَانُ۔

ترکیب:

فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ: یہ مرفوع ہے اس کی تقدیر یہ ہے: عَلَیْکُمْ نِصْفُ مَافَرَضْتُمْ۔ یَعْفُوْنَ محلًا منصوب ہے ان کی وجہ سے۔ فعل مضارع سے جب نون جمع مونث ملحق ہوتا ہے تو وہ مبنی ہو جاتا ہے پھر

تینوں حالتوں میں رفع، نصب اور جزم میں ایک جیسا ہوتا ہے۔

اَنْ یَّعْفُوْنَ موصول اور صلہ استثناء کی بنا پر محلاً منصوب ہیں اَوْ یَعْفُوَا اس کی تقدیر اَوْ اَن یَّعْفُوَ ہے۔ یہ بھی گذشتہ موصول وصلہ پر عطف ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے۔ وَاَنْ تَعْفُوْا مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے۔ اَقْرَبُ اَنْ تَعْفُوْ کی خبر ہے گویا اس طرح ہے: وَ الْعَفْوُ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ لِلتَّقْوٰی میں لام (جار مجرور) اقرب کے متعلق ہے اور یہ لام مِنْ یا اِلٰی کے معنیٰ میں ہے۔ اَلنِّکَاح میں الف لام کا اضافت کا بدل ہے اس لئے کہ مراد یہ ہے: اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ نِکَاحِہٖ اسی کے مثل یہ ارشاد الٰہی ہے: فَاِنَّ الْجَنَّۃَ هِیَ الْمَاْوٰی یعنی هِیَ مَاْوَاہُ۔

تفسیر:

مہر کے احکام

خداوند عالم نے عورت کو ہاتھ لگانے (جماع کرنے) سے قبل اور مہر معین ہونے کے بعد طلاق دینے کا حکم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ اے لوگو! اگر تم عورتوں کو طلاق دو۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ (انھیں ہاتھ لگانے یعنی جماع کرنے سے پہلے وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَۃً (اور مہر مقرر کیا جا چکا ہو) یعنی تم نے ان کے لیے مہر معین اور طے کرلیا ہو فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا) یعنی تم نے جو مہر معین کیا ہے اس کا نصف تم پر واجب ہے اور وہ مہر مسمّیٰ ہے۔ اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ (یہ اور بات ہے کہ وہ عورتیں نرمی برتیں اور مہر نہ لیں جو بالغ رشیدہ اور آزاد ہوں کہ ان پر بے عقلی کی بنا پر ولی معین نہ کیا گیا ہو۔ وہ ان کے لئے جو نصف مہر واجب تھا اسے چھوڑ دیں اور اپنے شوہروں سے اس کا مطالبہ نہ کریں۔ یہ ابن عباس ومجاہد اور جملہ اہل علم سے مروی ہے۔ اَوْ یَعْفُوَا (یا وہ ولی جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے، نرمی سے کام لے اور مہر کی رقم کو معاف کردے اور بخش دے۔ کہا گیا ہے کہ وہ ولی ہے۔ یہ مجاہد وعلقمہ اور حسن سے مروی ہے۔ یہی چیز امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے۔ یہی شافعی کا مذہب (نظریہ) ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک باکرہ غیر بالغہ پر ولی باپ ہے یا دادا ہے باپ کی موجودگی میں، البتہ ان دونوں کے علاوہ کسی اور کو ولایت حاصل نہیں ہے، سوائے یہ کہ وہ کسی اور کو اپنا ولی بنائے کہا گیا ہے کہ وہ شوہر ہے، اس کی روایت علی وسعید بن المسیب وشریح، ابراہیم، قتادہ وضحاک سے کی ہے اور ابوحنیفہ کا مذہب (رائے اور نظریہ)

بھی یہی ہے۔ اسی طرح اس کی روایت ہمارے علما نے بھی کی ہے۔ اللہ پہلا قول اظہر اور زیادہ واضح ہے اور یہی مذہب ونظریہ (درست) ہے۔

جس عالم نے زوجہ کے لیے قرار دیا ہے اس نے کہا ہے کہ (زوجہ کو) پورا نصف معاف کرنے کا اختیار ہے اور ہمارے علماء میں سے جس نے مہر کی معافی کو ولی کے لیے قرار دیا ہے اس نے کہا ہے کہ ولی کو مہر کا کچھ حصہ معاف کرنے کا اختیار ہے، پورا مہر معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اگر عورت مہر لینے سے منع کر دے تو جب مصلحت تقاضا کرے تو اسے دوبارہ مانگنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

وَاَنۡ تَعۡفُوۡٓا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰىؕ (اور تم نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ کے نزدیک لے جاتا ہے) یہ شوہر و زوجہ دونوں سے خطاب ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ فقط شوہر سے متعلق ہے۔ یہ شعبی کا قول ہے۔ انھوں نے کہا ہے: جمع (کا صیغہ) استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر شوہر سے خطاب ہے۔ ابن عباس کا قول عام ہونے کی وجہ سے زیادہ قوی ہے۔ عفو (مہر کا معاف کر دینا) تقویٰ سے بہت زیادہ نزدیک ہے اس کی دو وجہیں ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ بہت زیادہ نزدیک ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی پر ظلم کرنے سے پرہیز کرے (ڈرے) اس لیے کہ جو دوسروں کے لیے اپنا حق چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس سے بہت نزدیک ہوتا ہے کہ دوسروں لوگ ناحق کا مطالبہ کر کے اس پر ظلم نہ کریں۔

دوم: مراد یہ ہے کہ اس سے بہت نزدیک ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی سے گریز کرے، اس لیے کہ جو اپنا حق چھوڑ دیتا ہے وہ اس بات سے بہت نزدیک ہوتا ہے کہ وہ اس ناحق چیز کا مطالبہ کر کے اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔

وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ (اور آپس کے معاملات میں فیاضی کو فراموش نہ کرو) اپنے درمیان فضل و احسان کا حصول ترک نہ کرو۔ اس کا حکم دے کر اور مکمل طور پر حقوق کی ادائے گی کرنے کے ساتھ (حصول فضل و احسان کرو) خداوند عالم نے اس آیت کریمہ میں وہ حکم بیان فرمایا ہے کہ جس کے ترک پر کوئی بھی معذور قرار نہیں دیا جا سکتا (معاف نہیں کیا جا سکتا) ہے یہ اور وہ کہ شوہر کو عورت کے نصف مہر سے کم ادا کرنے کا حق نہیں ہے اور عورت کو اس سے زائد کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ پھر خداوند عالم نے دونوں طرف کے فضل کے راستے کی وضاحت کی ہے اور اس کی طرف دعوت دی ہے اور ترغیب کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ (بلاشبہ اللہ تمھارے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔) بَصِيۡرٌ (جانتا ہے۔) سعید بن المسیب سے

روایت کی گئی ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کے حکم متعہ کے لیے ناسخ ہے۔ ابوالقاسم بلخی کا کہنا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ گذشتہ آیت میں اس عورت کا حکم بیان ہوا ہے جس کے ساتھ دخول نہ ہوا ہو، جب کہ اس کے مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو جب کہ اسے طلاق دی جائے اور یہ آیت اس عورت کے حکم کو شامل ہے جس کا مہر معین ہو چکا ہو اور اس کے ساتھ دخول نہ ہوا ہو جب اسے طلاق دی جائے۔ دو الگ الگ حکم ہیں۔ ہم کہتے ہیں (شیخ طبرسیؒ): جب ہم نے پہلی آیت میں وضاحت کر دی ہے کہ یہ آیت ان مطلقات عورتوں کو شامل ہے جن کے ساتھ دخول نہ ہوا ہو چاہے اس کا مہر معین ہوا ہو یا معین نہ ہوا ہو، ہم نے بیان کیا ہے ان کا متعہ (مال کے ذریعہ نھیں فائدہ پہونچانا) عموم پر حمل نہیں ہوگا اس لیے کہ جس کا مہر معین ہو اس کے لیے متعہ (وہ مال جس سے استفادہ کیا جائے) نہیں ہوتا، اگر اس کے ساتھ دخول نہ ہوا ہو۔ لہٰذا اس میں تخصیص و تقدیر اور حذف لازمی ہے یعنی جنہیں تم نے طلاق دی انھیں (مال کے ذریعہ) فائدہ پہونچاؤ! اگر تم نے ان کے لیے مہر معین نہ کیا ہو۔ یہ حذف جائز ہے، جس کی دلالت یہ ہے کہ جس کا مہر معین کیا گیا ہے اس کا ذکر اور حکم دوسری آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ چیز ہمارے لیے اس مقام پر پیش آئی ہے (یعنی مفسرین میں سے فقط ہم نے ہی اسے ذکر کیا ہے) ہم نے مفسرین میں سے کسی کو نہیں دیکھا جس نے یہ ذکر کیا ہو، توفیق اللہ کی جانب سے ہے۔

❁❁❁❁❁

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾
اپنی نمازوں کا خیال رکھو، خصوصاً درمیانی نماز اور اللہ کے آگے نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ کھڑے رہو۔ (۲۳۸)

الفاظ ومعانی:

اَلْحِفْظ کے معنی کسی چیز کا نفس میں محفوظ کرنا ہے۔ حِفْظ، نِسْيَان (فراموشی) کے برعکس ہے۔
وُسْطٰى اَوْسَط کی مؤنث ہے۔ دو چیزوں کے درمیان برابر سے رہنے والی چیز کو اَوْسَط کہتے ہیں۔
اَلْقُنُوْت کے لغوی معنی کسی ایک امر پر دوام اور استمرار کے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے حقیقی معنی اطاعت کے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے حقیقی کے معنی حالت قیام میں دعا کرنے کے ہیں۔ علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے کہ باب میں تصرف اور استعمال کے سبب پہلی وجہ سب سے بہتر ہے اس لیے کہ اطاعت کی پابندی

کرنے والا قانت ہے۔اسی طرح نماز کی پابندی کرنے والا (باقی رہنے والا) سکوت کی پابندی کرتا ہے، بجز ذکر مشروع کے۔اسی طرح دعا کی پابندی کرنے والا بھی ہے اس طرح کہا جاتا ہے: فُلَانٌ یَقْنُتُ عَلَیْہِ یعنی فلاں شخص کے لئے مسلسل بددعا کرتا ہے۔

رِجَالًا بربنائے حال منصوب ہے اس کی تقدیر یہ ہے: فَصَلُّوا رِجَالاً ۔ کَمَا عَلَّمَکُمْ میں کاف اُذْکُرُوْا کے متعلق ہے اور مَا عَلَّمَکُمْ میں مَا مصدریہ ہے۔مَا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ موصول و صلہ عَلَّمَ کا مفعول ثانی کے مقام میں ہے۔

شان نزول:

زید بن ثابت سے روایت ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوپہر کے وقت شدید گرمی میں نماز پڑھ رہے تھے اور آپؐ کے اصحاب پر دشوار ترین نماز تھی، آپؐ کے پیچھے ایک یا دو صفیں تھیں۔اس وقت آپؐ نے ارشاد فرمایا: میں چاہتا ہوں جو لوگ نماز (جماعت) میں شرکت نہیں کرتے ان کے مکانات کو نذر آتش کردوں۔تب یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

نماز کی پابندی

جب خداوند عالم نے اطاعت پر برانگیختہ اور آمادہ کیا تو نماز کی حفاظت کو خاص طور پر بیان فرمایا چونکہ نماز عظیم ترین اطاعت ہے، ارشاد فرمایا: حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ (اپنی نمازوں کا خیال رکھو) یعنی واجبی نمازوں کی پابندی کرو، ان کے اوقات میں جملہ ارکان کے ساتھ۔پھر وسطیٰ (درمیانی نماز) کو اس کی عظمت و شان کے سبب مخصوص طور پر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی (اور درمیانی نماز کی حفاظت کرو) جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ یعنی صلٰوۃ وسطیٰ کی خصوصیت سے پابندی کرو۔ اَلصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی (درمیانی نماز) کے متعلق اختلاف ہے جس میں متعدد اقوال ہیں:

اول: نماز ظہر ہے۔ یہ زید بن ثابت، ابن عمر، ابوسعید خدری، اسامہ و حضرت عائشہ سے مروی

ہے۔ یہ روایت امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی مروی ہے۔ ابو حنیفہ اور ان کے احباب کا بھی یہی قول ہے۔ فرقۂ زیدیہ کے بعض ائمہ نے کہا ہے کہ جمعہ کے روز نماز جمعہ مراد ہے اور تمام دنوں میں ظہر کی نماز ہے۔ انھوں نے اس کی روایت علی سے کی ہے۔ جس پر اس آیت کا سبب نزول دلالت کر رہا ہے یہ ہے کہ دن کے درمیانی حصہ کی نماز ہے اور سب سے پہلے اسی نماز کو فرض کیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے، آپؑ نے فرمایا: پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: خداوند عالم کا آسمان دنیا میں ایک حلقہ ہے جس میں زوال آفتاب ہوتا ہے۔ جس وقت زوال آفتاب ہوتا ہے۔ اس وقت ہر چیز ہمارے پروردگار کی تسبیح کرتی ہے، اسی وقت خداوند عالم نے نماز کا حکم دیا ہے۔ اس وقت آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں جو بند نہیں ہوتے یہاں تک کہ ظہر کی نماز پڑھی جائے۔ اس میں دعا مستجاب ہوتی ہے۔

دوم: یہ نماز عصر ہے۔ ابن عباس و حسن سے روایت ہے۔ اس کی روایت علی و ابن مسعود، قتادہ و ضحاک سے کی گئی ہے۔ یہی روایت ابو حنیفہ سے کی گئی ہے۔ علماء نے سند مرفوع کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے: چونکہ نماز ظہر دن کی دو نمازوں اور شب کی دو نمازوں کے درمیان واقع ہے، اس کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ ایسے وقت میں واقع ہوتی ہے جس میں عام طور پر لوگ مشغول ہوتے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس سے نماز عصر چھوٹ جائے گی گویا اس کے اہل اور مال مشقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بریدہ نے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابر کے دنوں میں نماز میں جلدی کرو اس لیے کہ جس سے نماز عصر چھوٹ جاتی ہے اس کا عمل باطل ہو جاتا ہے۔

سوم: نماز مغرب مراد ہے۔ یہ قبیصہ بن ذؤیب سے مروی ہے۔ یہ نمازوں میں طویل اور مختصر (نمازوں) کے درمیان ہے۔ شعبی نے اپنی سند سے حضرت عائشہ سے روایت کی، وہ کہتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے نزدیک افضل ترین نماز مغرب کی نماز ہے جسے اللہ نے مسافر اور حاضر شخص سے کم (یعنی قصر) نہیں کیا، اسی کے ذریعہ خداوند عالم نے نماز شب کا آغاز کیا اور اسی سے دن کی نماز کا اختتام فرمایا، جو شخص نماز مغرب پڑھے اور اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھے خداوند عالم اس کے لیے جنت میں محل تعمیر فرماتا ہے اور جو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے خداوند عالم اس کے بیس برس یا چالیس برس کے گناہ

بخش دیتا ہے۔

چہارم: اس سے نماز عشاء مراد ہے۔ یہ ان بعض افراد سے مروی ہے جنھوں نے کہا ہے کہ چونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جو قصر نہیں ہوتیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے؛ آپؐ نے فرمایا: جس نے عشاء کی نماز باجماعت پڑھی گویا اس نے نصف شب قیام کی حالت میں بسر کی اور جس نے نماز فجر باجماعت ادا کی گویا اس نے تمام شب قیام میں گذاری۔

پنجم: نماز فجر مراد ہے۔ یہ معاذ و ابن عباس و جابر بن عبداللہ، عطا و عکرمہ اور مجاہد سے مروی ہے۔ یہی شافعی کا قول ہے۔ انھوں نے کہا ہے چونکہ نماز فجر شب کی نمازوں اور دن کی نمازوں، تاریکی اور روشنی کے درمیان ہے اور ایسی نماز ہے جو کسی غیر (نماز) کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، یہ جمع ہونے والی (نمازوں) کے درمیان منفرد ہے جس پر قرآن مجید میں دلالت موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے: وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا یعنی (نماز صبح) کی ملائکۂ شب اور ملائکہ روز گواہی دیتے ہیں جو دن کے نامۂ اعمال اور شب کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اس بات پر آیت کا یہ آخری جزء دلالت کر رہا ہے جو اس طرح ہے: قُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ یعنی نماز میں قیام کرو اللہ کے لیے قیام کرنے والوں کی طرح۔ ابورجاء عطاردی نے بیان کیا ہے: ابن عباس نے مسجد بصرہ میں ہمارے ساتھ نماز صبح ادا کی جس میں انھوں نے قنوت پڑھا، رکوع سے قبل اور رفع یدین کیا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا: یہی ہے 'صلوٰۃ وسطیٰ' جس میں ہمیں قنوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس چیز کو شعبی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اور اپنی سند سے مرفوعاً انس بن مالک سے روایت کی ہے۔ انس کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ نماز صبح میں قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ دنیا سے آپؐ کا وصال ہوا۔

ششم: پانچ نمازوں کے درمیان کوئی ایک نماز ہے جسے اللہ نے معین نہیں فرمایا ہے، اسے تمام واجبی نمازوں میں پوشیدہ رکھا ہے تاکہ تمام نمازوں کی حفاظت کی جائے جس طرح شب قدر کو رمضان المبارک کی تمام راتوں میں پوشیدہ اور مخفی رکھا گیا ہے اور اس نے اپنے اسم اعظم کو تمام اسماء کے درمیان اور جمعہ کی ساعتوں میں قبولیت کی ساعتوں (گھڑیوں) اور اوقات کو پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ ربیع بن خیثم اور ابوبکر الوراق سے مروی ہے۔

وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (اور اللہ کے آگے نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ کھڑے رہو) ابن عباس نے

کہا: قَانِتِیْنَ یعنی دَاعِیْنَ، دعا کرتے ہوئے۔ قنوت وہ دعا ہے جو نماز میں حالت قیام میں پڑھی جاتی ہے۔ امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام سے یہی مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی اطاعت کرنے والوں کے ہیں۔ یہ حسن وسعید بن مسیب، قتادہ، ضحاک، طاؤس سے مروی ہے اور دو روایتوں میں سے ایک اور روایت میں ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: اس کے معنی خاشعین کے ہیں۔ یہ مجاہد سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: نماز میں (فعل) عبث اور (اِدھر اُدھر) توجہ کرنے سے نہی کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ساکنین (یعنی سکون واطمینان والے) مراد ہے۔ یہ ابن مسعود اور زید بن ارقم سے مروی ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ عبادات میں قیام کی حالت میں دعا وغیرہ کرنا ہے اس کا استعمال تمام عبادتوں کے لئے صحیح ہے اگرچہ (تمام عبادتوں میں) حقیقی قیام نہیں ہوتا لیکن عبادت کا قیام ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو خواہ سوار جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو، اور جب امن کی حالت بحال ہو جائے، تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔ (۲۳۹)

الفاظ و معانی:

الرجال، راجل کی جمع ہے جیسے تجار تاجر کی، صحاب صاحب کی اور قیام قائم کی جمع ہے۔ اَلرَّاجِل: پیروں والا چاہے وہ کھڑا ہو یا چل رہا ہو۔

اَلرُّکْبَان، رَاکِب کی جمع ہے۔ جس طرح فُرْسَان جمع ہے فَارِس (سوار) کی۔

تفسیر:

نماز ہر حالت میں

خداوند عالم نے نماز کی حفاظت کے واجب ہونے کے ذکر کے فوراً بعد خوف کے وقت رخصت و

اجازت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ (بدامنی کی حالت ہو تو) یعنی اگر تم خوف پیش آنے کے سبب کھڑے ہو کر نماز ادا نہ کر سکو۔ یعنی نماز کا پورا پورا (مکمل) حق ادا نہ کر سکو۔ فَرِجَالًا (خواہ پیدل ہو) تو پیدل ہو کر نماز ادا کرو۔ کہا گیا ہے چلنے کی حالت میں نماز پڑھو۔ اَوْ رُكْبَانًا (خواہ سوار) یعنی اپنے چوپاؤں (سواری) کی پشت پر (نماز پڑھو) اس سے نماز خوف مراد لی گئی ہے۔ دشمن کے خوف سے نماز خوف سفر اور حضر میں دو رکعت پڑھی جاتی ہے سوائے نماز مغرب کے جو تین رکعت ہے۔ روایت میں وارد ہوا ہے کہ لیلۃ الھریر (جنگ صفین) میں حضرت علی ابن ابی طالب (علیہما السلام) نے پانچ نمازیں اشاروں میں پڑھیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فقط تکبیر کے ذریعہ ادا کیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خندق میں اشاروں سے نماز ادا کی۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ (اور جب امن کی حالت بحال ہو جائے) جب خوف سے امان ہو جائے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ (تو اللہ کو اس طرح یاد کرو) یعنی امن (وسکون) اور اطمینان کے ساتھ نماز پڑھو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمد وثنا کے ذریعہ خدا کو یاد کرو كَمَا عَلَّمَكُمْ (جس طرح اس نے تمھیں سکھا دیا ہے) تمھارے دینی امور اور اس کے علاوہ دنیاوی امور کی تمھیں تعلیم دی۔ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (جس سے تم پہلے ناواقف تھے) جنھیں تم نہیں جانتے تھے۔

❀❀❀❀❀

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ کر جائیں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک اُن کو نان ونفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی ذمّے داری تم پر عائد نہیں ہوتی، اللہ ہر چیز پر غالب اور دانا ہے۔ (۲۴۰)

قرأت:

اہل مدینہ، ابن کثیر، کسائی اور ابو بکر نے عاصم سے وَصِيَّةٌ رفع کے ساتھ اور بقیہ قراء نے نصب کے ساتھ وَصِيَّةً پڑھا ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: جن قراء نے وَصِيَّةٌ بالرفع پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس لفظ کو دو وجہوں سے رفع دے سکتے ہیں:

۱۔ وَصِيَّةٌ مبتدا اور لِأَزْوَاجِهِمْ اس کی خبر ہے یہاں پر نکرہ کو مبتدا قرار دینا حسن ہے اس لئے کہ یہ تخصیص کا مقام ہے جس طرح سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اور خَيْرٌ بَيْنَ يَدَيْكَ میں اور اس مصرعہ میں رفع دینا حسن ہے:

لِمُلْتَمِسِ الْمَعروفِ اَهْلٌ وَّ مرحبٌ

اس لئے کہ یہ سب مقام دعا میں ہیں پس ان میں نکرہ کو مبتدا قرار دینا جائز ہے اس لئے کہ اس کے معنی منصوب کے معنی کے مانند ہیں۔

۲۔ آپ وَصِيَّةٌ کے لئے خبر پوشیدہ مانئے اور لِأَزْوَاجِهِمْ کو اس کی صفت قرار دیجئے۔ پوشیدہ خبر کی تقدیر یہ ہوگی: فَعَلَيْهِمْ وَصِيَّةٌ لِأَزْوَاجِهِمْ

جن قراء نے وَصِيَّةً منصوب پڑھا ہے انہوں نے اسے فعل پر حمل کیا ہے یعنی لِيُوْصُوْا وَصِيَّةً اور لِأَزْوَاجِهِمْ کو صفت مانا ہے جیسا کہ خبر کو پوشیدہ ماننے والے قول میں بیان کیا گیا ہے۔

ان حضرات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ظرف جب نکرہ کے بعد آئے تو اس کو بطور صفت استعمال ہونا زیادہ رائج ہے اور جب ظرف خبر ہوگا تو وہ نکرہ پر مقدم ہوگا جب وہ منصوب (مفعول) کے معنی میں نہ ہو۔ جیسے یہ ارشاد الٰہی: وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ ۔ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۔ جب نکرہ بعد میں ہو تو وہ زیادہ تر صفت ہوتا ہے۔

بعض علماء نے کہا: یہاں پر وَصِيَّةٌ کو رفع کے علاوہ کوئی دوسرا اعراب دینا جائز نہیں ہے اس لئے کہ وصیت وفات کے بعد ممکن ہی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ازواج کے لئے نفقہ فرض ہے چاہے شوہر وصیت

کرے یا نہ کرے۔

علی بن عیسیٰ نے کہا: یہ غلط ہے اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ تم میں سے وہ لوگ جن کی وفات کا وقت آجاتا ہے۔ اسی لئے یُتَوَفَّوْنَ فرمایا ہے جو فعل حال ہے جو اس جملہ کے مانند ہے: اَلَّذِیْنَ یُصَلُّوْنَ فَلْیُعْرِضُوْا عَنِ الْفِکْرِ فِیْمَا یَشْغَلُهُمْ (جولوگ نماز پڑھتے ہیں انہیں ان افکار سے روگردانی کرنی چاہئے جو انھیں نماز سے غافل کردیں۔

علماء کا یہ کہنا کہ ازواج کو نفقہ دینا فرض ہے اگر چہ اس نے وصیت نہ کی ہو تب بھی۔ تو یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جب شوہر وصیت میں انہیں چھوڑ دے تو یہ ناپسندیدہ نہیں ہے کہ خداوند عالم ورثہ پر اس اسے واجب قرار دے۔ قتادہ اور سدی نے کہا: شوہر کا زوجہ کے لئے وصیت کرنا واجب ہے جس طرح ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے وصیت کرنا واجب ہے۔

مَتَاعاً: دو وجہوں سے منصوب ہے:

۱۔ مَتِّعُوْهُنَّ کی تقدیر کی بنا پر منصوب ہے (یعنی مفعول مطلق ہے)

۲۔ اس تقدیر کی بنا پر ہے کہ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ ذٰلِكَ مَتَاعاً (خدا نے اسے ان ازواج کے لئے متاع قرار دیا ہے) اس لئے کہ ماقبل اس بات پر دلالت کرتا ہے۔

غَیْرَ اِخْرَاجٍ میں غَیْرَ دو سبب سے منصوب ہے:

۱۔ مَتَاعاً کی صفت ہے۔

۲۔ مصدر ہے جو حال کا قائم مقام ہے۔ فراء نے کہا: یہ آپ کے اس جملہ کے مانند ہے: جِئْتُكَ غَیْرَ رَغْبَةٍ اِلَیْكَ۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا فِیْ مَسَاكِنِهِنَّ

میں کہتا ہوں۔ اس کی تقدیر یہ ہے: غَیْرَ مُخْرَجَاتٍ اِخْرَاجًا۔ ایسی صورت میں ذوالحال مَتِّعُوْهُنَّ میں هُنَّ ہے اور اس کی تقدیر یہ بھی ہوسکتی ہے: غَیْرَ مُخْرِجِیْنَ ایسی صورت میں ذوالحال مَتِّعُوْهُنَّ میں واؤ ہے۔

تفسیر:

بیوہ کے حقوق

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں) تم میں سے جن لوگوں کی موت

نزدیک ہو کیونکہ متوفی پر نہ تو کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے، نہ ہی اسے کسی چیز سے منع کیا جا سکتا ہے۔ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِم (اور بیویاں چھوڑ کر جائیں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں) یعنی یہ لوگ وصیت کریں اپنی ازواج کے لیے اور جن قراء نے وصیۃٌ حالت رفع میں پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ معنیٰ ہیں کہ اللہ کی جانب سے ان کی ازواج کے لئے وصیت فرض ہے یا ازواج کے لئے ان پر وصیت فرض ہے۔ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ (کہ ایک سال تک اُن کو نان ونفقہ دیا جائے) یعنی وہ عورتیں ایک برس تک غذا، لباس اور جائے رہائش سے فائدہ اٹھائیں (استفادہ کریں) کہا گیا ہے کہ یہ مطلقات میں متعہ (فائدہ کے مانند ہے) کے مانند ہے جسے وہ طلاق شدہ عورتیں حاصل کرتی ہیں جن کا مہر معین نہیں کیا گیا تھا اور متوفی پر واجب ہے کہ وہ اپنی زوجہ کے لیے وصیت کرے اور اس وصیت کو شوہر کے مال سے پورا کیا جائے گا۔ غَيْرَ إِخْرَاجٍ (اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں) یعنی عورتوں کو ان کے شوہروں کے گھروں سے نہ نکالا جائے۔ فَإِنْ خَرَجْنَ (پھر اگر وہ خود نکل جائیں) اگر یہ عورتیں ورثا کے نکالے بغیر خود سے نکل جائیں تو اس سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے جب وہ ایک برس گذرنے کے بعد نکلیں اور عدت پوری ہو چکی ہو تو اِن إِذَا (جب) کے معنی میں ہے۔ یہ قاضی وغیرہ سے مروی ہے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ یعنی اے اولیائے میت! تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوتی۔

فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ (اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں) علماء نے حرج کی برطرفی کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ عورتوں سے نفقہ اور رہائش کے قطع کرنے کے سلسلہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ حسن اور سدی سے مروی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نکلنے سے نفقہ خود بخود ختم ہو جائے گا اگرچہ ان کے لیے ایک برس تک قیام کے ساتھ (نفقہ) واجب تھا۔ اگر وہ ایک برس کے پہلے نکل جاتی ہیں تو وہ حق باطل ہو جائے گا جو گھر میں ٹھہرنے کے سبب واجب ہوا تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انھیں گھر سے نکلنے سے منع کرنے کے ترک کرنے میں بھی تم پر کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ عورت کا مقام گھر میں ایک برس واجب نہیں ہے اس سلسلہ میں اللہ نے عورت کو اختیار دیا ہے، یہ جبائی سے مروی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر وہ عدت گذرنے کے بعد شادی کرلیں تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی وجہ زیادہ بہتر ہے یعنی اگر وہ سال پورا کرنے کے بعد عدت سے نکل جائے تو ان کے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آیت میں مَعْرُوف سے مراد طلب نکاح اور زینت ہی ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ (اللہ ہر چیز پر غالب ہے) یعنی وہ قادر ہے، کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ حَكِيْمٌ (اور دانا ہے) اس سے وہی فعل صادر ہوگا جو حکمت کا تقاضا ہوگا۔

علماء کا اس آیت کے منسوخ ہونے پر اتفاق ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک شخص مر گیا تو اس کی بیوی کو اس کے شوہر کے مال سے ایک برس تک نفقہ دیا گیا اس کے بعد اسے میراث دیئے بغیر گھر سے نکال دیا گیا پھر اس حکم کو آیت ربع اور آیت ثمن سے منسوخ کر دیا گیا (یعنی جس آیت میں عورت کی میراث کے لیے چوتھے اور آٹھویں حصہ کا ذکر کیا گیا ہے) عورت پر اس کے حصہ (میراث) کو خرچ کیا جائے گا۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اس حکم کو بھی آیت 'يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا' کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ آیت مواریث کے ذریعہ اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾
اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر (۲۴۱) اس طرح اللہ اپنے احکام تمھیں صاف صاف بتلا رہا ہے تاکہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ (۲۴۲)

ترکیب:

حَقًّا کے منصوب ہونے کی وجہ اس سے پہلے حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ میں بیان کر چکے ہیں۔
كَذٰلِكَ میں کاف يُبَيِّنُ سے متعلق ہے یعنی مِثْلَ هٰذَا الْبَيَانِ يُبَيِّنُ لَكُمْ۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ جب آیت 'وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۶) (انھیں کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیے خوش حال اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب اپنی بساط بھر، معروف طریقے سے ادا کرے۔ نیک آدمیوں پر یہ حق مقرر کیا

گیا ہے۔) نازل ہوئی تو بعض افراد نے کہا کہ جب ہم چاہتے ہیں اسے انجام دیتے ہیں جب نہیں چاہتے انجام نہیں دیتے۔اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے مروی ہے۔

تفسیر:

مطلقہ کا حق

اللہ نے عدت والی عورتوں کے حالات بیان کرنے کے فوراً بعد ان کے لیے جو کچھ متعہ (فائدہ پہونچانا) سے متعلق واجب ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا:: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ (اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔) اس متاع کے سلسلہ میں اختلاف ہے؛ سعید بن جبیر، ابوالعالیہ اور زہری نے کہا ہے کہ آیت میں متاع سے مراد مُتْعَة' اور متعہ ہر مطلقہ کے لیے واجب ہے ہے۔ ابوعلی الجبائی نے کہا ہے کہ متاع سے مراد نفقہ ہے اور یہ وہی متاع ہے جس کا ذکر مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ میں ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا ہے: یہ آیت اللہ کی اس آیت فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حکم اسی آیت کے ذریعہ خاص بنا دیا گیا ہے اگرچہ یہ دونوں آیتیں ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں۔ اگر یہ آیت بعد میں نازل ہوئی ہے تو وہ منسوخ ہے کیونکہ ہمارے نزدیک مُتْعَة اسی مطلقہ کے لیے واجب ہے جس کے ساتھ دخول نہ کیا گیا ہو اور اس کے لیے کوئی مہر معین نہ کیا گیا ہو البتہ مطلقہ مدخولہ کے لیے مہر مثل ہے اگر مہر معین نہ کیا گیا ہو (یا مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو) اور اگر اس کے لیے مہر معین کیا گیا ہو تو وہی ہے جو معین کیا گیا ہے۔ لیکن غیر مدخول بہا جس کے لیے مہر معین کی گئی ہو اس کے لیے نصف مہر ہے، البتہ تمام صورتوں میں اس کے لیے متعۃ نہیں ہے۔ حسن کا بھی یہی قول ہے۔ لہٰذا اس آیت کو خاص بنانا ضروری ہے۔ متعہ کے سلسلہ میں ہم نے اپنی بات کا تذکرہ وَ مَتِّعُوْهُنَّ کی تفسیر کے وقت بیان کر چکے ہیں۔

آیت بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔ اس آیت میں خاص طور سے متقین کا ذکر کیا ہے جس طرح وہاں محسنین کا ذکر کیا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ (اس طرح اللہ اپنے احکام تمھیں صاف صاف بتلا رہا ہے) جس طرح اللہ نے تمھارے لیے وہ احکام و آداب بیان کر دیے ہیں جو گذر چکے ہیں جن کا جاننا تمھاری دینداری کے

لیے ضروری تھا۔اسی طرح تمھارے لیے یہ احکام بھی بیان کر رہا ہے۔آنے والے بیان کی گذشتہ بیان سے تشبیہ دی گئی ہے۔بیان وہ دلیلیں ہیں کہ جن کے ذریعہ حق و باطل میں فرق کیا جاتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (تا کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو) یعنی تا کہ تم اللہ کی آیتوں میں عقل سے کام لو، غور و فکر کرو۔ایک قول یہ بھی ہے: تا کہ تمھاری عقلیں کامل ہو جائیں کیونکہ فطری عقل کسبی عقل کے ذریعہ کامل ہوتی ہے اور عقل کسبی سے مراد علم کے ساتھ باوجود عقل کا استعمال کرنا ہے کیونکہ جو عقل کا استعمال نہیں کرتا گویا اس کے پاس عقل ہی نہیں ہے۔یہ مسئلہ ویسے ہی ہے جیسا کہ اس آیت آیا میں ہے کہ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ یعنی توبہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی بنیاد پر گناہ کرتے ہیں۔آیت میں ایسے لوگوں کو جُهَلَاء سے تعبیر کیا گیا ہے چونکہ وہ لوگ حق کو جاننے کے باوجود اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾
کیا تم نے کبھی ان لوگوں کے حال پر بھی غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے اُن سے فرمایا: مرجاؤ۔ پھر اس نے انھیں دوبارہ زندگی عطا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔(۲۴۳)

الفاظ و معانی:

اَلرُّؤْيَة یہاں علم کے معنی میں ہے۔اَلَمْ تَرَ یعنی اَلَمْ تَعْلَمْ (کیا تم نہیں جانتے)

ترکیب:

حَذَرَ الْمَوْتِ، مفعول لہ کی بنا پر منصوب ہے۔وہ مصدر (مفعول مطلق) کی بنا پر بھی منصوب ہو

سکتا ہے اس لئے کہ ان کا خارج ہونا دلالت کرتا ہے کہ وہ حَذَرُوا الْمَوْتَ حَذَراً (وہ لوگ موت سے باقاعدہ ڈر گئے تھے)

تفسیر:

درس عبرت

جب خداوند عالم نے یُبَیِّنُ آیَاتِهٖ لِلنَّاسِ (یعنی خدا لوگوں کے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے) کرنے کے بعد اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ یعنی اے محمدؐ! یا اے سامع! کیا تم نہیں جانتے ہو؟ یا کیا تم تک ان لوگوں خبر نہیں پہونچی؟ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ (جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے) کہا گیا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم تھی جنھوں نے طاعون (جیسی بیماری) سے فرار کیا تھا، جو ان کی سرزمین تک پہونچ چکی تھی۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انھوں نے جہاد سے فرار کیا تھا، جو ان پر فرض کیا گیا تھا۔ یہ ضحاک اور مقاتل سے مروی ہے۔ ان دونوں نے بعد والی آیت سے دلیل پیش کی ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حزقیل کی قوم تھی جو جناب موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے تیسرے خلیفہ اور جانشین تھے۔ وہ اس طرح کہ جناب موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے حاکم یوشع بن نون پھر کالب بن یوقنا پھر حزقیل تھے، انھیں اِبْنُ الْعَجُوْز کہتے تھے چونکہ ان کی والدہ بوڑھی تھیں۔ انھوں نے بڑھاپے اور بانجھ ہوجانے کے بعد خداوند عالم سے فرزند کی دعا کی تھی۔ اللہ نے انھیں فرزند عطا کیا تھا۔ حسن نے کہا وہ ذوالکفل ہیں، حزقیل کو ذوالکفل اس لیے کہا گیا ہے کہ انھوں نے ستر پیغمبروں کی کفالت کی اور انھیں قتل سے بچایا، انھوں نے پیغمبروں سے کہا: آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں میرا قتل ہونا آپ تمام کے قتل ہونے سے بہتر ہے۔ جب یہودی آئے اور انھوں نے حزقیل سے ستر انبیاء کی بابت دریافت کیا، انھوں نے کہا وہ تو چلے گئے، مجھے نہیں معلوم کہاں ہیں؟ اور خداوند عالم نے ان لوگوں سے ذوالکفل کو بچالیا۔

وَھُمْ اُلُوْفٌ (اور ہزاروں کی تعداد میں تھے) تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے اُلُوْفٌ (ہزاروں) سے یہاں تعداد کی کثرت مراد ہے، سوائے ابن زید کے۔ انھوں نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ ایک دل ہوکر نکلے لیکن بغض و دشمنی سے نہیں نکلے۔ آلف کی جمع قاعد وقعود، شاہد وشہود کے مثل قرار دی ہے۔ جس

نے کہا ہے کہ مراد عدد کثیر ہے اس نے اختلاف کیا ہے: کہا گیا ہے کہ تین ہزار تھے۔ یہ عطا خراسانی کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ آٹھ ہزار تھے۔ یہ مقاتل اور کلبی کا قول ہے۔ دس ہزار کا قول بھی وارد ہوا ہے، جو ابن روق سے مروی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ تیس ہزار کچھ تھے۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ چالیس ہزار کا قول بھی ہے جو ابن عباس اور ابن جریج سے مروی ہے۔ ستر ہزار کا قول بھی ہے۔ جو عطا ابن ابی رباح سے روایت ہے۔ عدد کثیر کی بھی روایت ہے جو ضحاک سے مروی ہے۔ ظاہر جس کا تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ دس ہزار سے زائد تھے اس لیے کہ فُعُوْل جمع کثرت کے لئے ہے یہ جو دس سے زائد ہوتی ہے، جو دس ہزار سے کم ہوا سے عَشَرَۃُ آلَافٍ کہا جاتا ہے۔ عَشَرُ اُلُوْف نہیں کہا جاتا۔

حَذَرَ الْمَوْتِ یعنی موت کے خوف سے۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (اللہ نے اُن سے فرمایا: مرجاؤ۔ پھر اس نے انھیں دوبارہ زندگی عطا کی) اس کی تفسیر میں دو اقوال بیان کئے گیے ہیں:

اول: خدا نے انھیں موت دے دی جس طرح کہا جاتا ہے: قَالَتِ السَّمَآءُ فَهَطَلَتْ یعنی آسمان برسنے لگا۔ یا یوں کہا جائے: میں نے اپنے سر کے ذریعہ کہا، میں نے اپنے ہاتھ کے ذریعہ اس طرح کہا۔ یعنی میں نے اپنے سر اور ہاتھ سے اشارہ کیا، جب کہ قول عام طور سے فعل کے شروع ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے یہاں معنی ہیں کہ خدا نے انھیں مارنا شروع کر دیا (ان پر موت کا آغاز کر دیا)

دوم: یعنی اللہ نے انھیں اس قول کے ذریعہ مار دیا جسے ملائکہ نے سنا تھا۔ یہ ایک طرح کی عبرت ہے۔ پھر انھیں خداوند عالم نے ان کے پیغمبر حزقیل کی دعا کے سبب زندہ کر دیا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ شمعون بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے) جب ان پر اس نعمت کا ذکر کیا جو انھیں عظیم نعمت کی صورت میں دکھائی گئی تھی تا کہ وہ ہدایت کا راستہ اختیار کریں، پست اور حقیر راستہ سے بچیں۔ اس کے بعد ان پر انعام واحسان کا ذکر کیا اس کے باوجود وہ اس کے انکار اور ناشکری پر اڑے رہے۔ یہ آیت اس شخص پر حجت ہے جو عذاب قبر اور رجعت دونوں کا انکار کرتا ہے، اس لیے کہ ان لوگوں کا زندہ کیا جانا ان کے مانند ہے جنھیں خداوند عالم نے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کے لیے (پھر سے) زندہ کیا تھا۔

قصہ

بیان کیا گیا ہے کہ جس قریہ سے یہ لوگ اس کی وبائی بیماری کے سبب نکل بھاگے تھے اس کا نام داوردان قبل واسط تھا۔کلبی وضحاک اور مقاتل نے بیان کیا ہے: بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے دشمن سے جنگ کرنے کے لیے نکلیں، چنانچہ وہ لوگ لشکر کی شکل میں نکلے، پھر ان پر دیوانگی اور پاگل پن طاری ہو گیا اور موت سے کراہت کرنے لگے، اس طرح برائی کی طرف چل پڑے اور انھوں نے کہنا شروع کر دیا: جس سرزمین پر ہمیں لایا گیا ہے وہاں وبائی بیماری ہے، ہم وہاں نہیں جائیں گے جب تک کہ وہاں سے وبائی بیماری کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ خداوند عالم نے ان کی طرف موت کو بھیج دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اموات ان کے درمیان بکثرت واقع ہو رہی ہیں تو اپنے شہروں سے موت سے فرار کرتے ہوئے بھاگ نکلے۔ جب بادشاہ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو اس نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی: پروردگارا! یعقوب اور ان کی آل موسیٰ کے رب تو اپنے بندوں کی نافرمانی دیکھ رہا ہے تو انھیں اپنی نشانی دکھا دے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ وہ تجھ سے فرار نہیں کر سکتے ہیں، چنانچہ خداوند عالم نے انھیں مار ڈالا اور ان کے چوپاؤں کو بھی مار دیا، ان پر سات روز گذر گئے، یہاں تک ان کے لاشے پھول گئے اور ان سے بدبو آنے لگی۔ان کے پاس لوگ آئے اور ان کے دفن سے عاجز و پریشان ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے درندوں سے حفاظت کی غرض سے ان پر ایک رکاوٹ اور بندش قائم کر دی (یا ان پر عمارت تعمیر کر دی) اور انھیں اس میں چھوڑ دیا۔لوگوں نے بیان کیا ہے کہ اس طرح ایک مدت گذر گئی یہاں تک کہ ان کے اجسام سڑنے، لگے ہڈیاں ظاہر ہو گئیں، اور جوڑ بند پراگندہ ہو گئے۔ان کے نزدیک سے حزقیل کا گذر ہوا، انھیں تعجب خیز نظروں سے دیکھنے لگے اور ان کے متعلق غور وفکر کرنا شروع کر دیا۔ان پر (اللہ) کی وحی ہوئی: اے حزقیل! تم ہماری آیت دیکھنا چاہتے ہو؟ میں تمھیں دکھاؤں کہ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہوں؟ عرض کی: ہاں! لہٰذا اللہ نے ان سب کو زندہ کر دیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حزقیل کی قوم تھی جنھیں خداوند عالم نے آٹھ روز بعد زندہ کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ جب ان پر یہ واقعہ پیش آیا تو حزقیل ان کی تلاش میں نکلے، جب انھیں مردہ پایا تو انھوں نے گریہ کیا، پھر عرض کیا: پروردگار میں ایسی قوم میں تھا جو تیری حمد کرتی تھی اور تیری تسبیح وتقدیس کرتی تھی، اب میں تنہا رہ گیا ہوں، میری کوئی قوم نہیں ہے۔ خداوند عالم نے ان کی طرف وحی فرمائی: میں نے ان کی زندگی تمھارے

لیے قرار دی۔ حزقیل نے کہا: اذن خدا سے زندہ ہو جاؤ! چنانچہ وہ زندہ ہو گئے۔

حمران بن اعین نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا اس قوم کے بارے میں جن کے متعلق خداوند عالم نے فرمایا تھا: مرجاؤ پھر انھیں زندہ کر دیا، حمران نے کہا: انھیں زندہ کر دیا یہاں تک کہ انھیں لوگوں نے دیکھا پھر انھیں (اللہ نے) موت دے دی، انھیں دنیا کی طرف پلٹا دیا یہاں تک کہ انھوں نے مکانات میں سکونت اختیار کی اور انھوں نے کھانا کھایا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: نہیں بلکہ خداوند عالم نے واپس پلٹا دیا یہاں تک کہ انھوں نے مکانوں میں سکونت کی، کھانا کھایا، عورتوں سے نکاح کیا اور جب تک خدا نے چاہا اسی طرح زندہ رہے، پھر اپنی (طبعی) موت مرے۔

❀❀❀❀❀

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾
(مسلمانو)! اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جان رکھو کہ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (۲۴۴)

تفسیر:

راہ خدا میں قتال

اس ارشاد کے مخاطب کے بارے میں اختلاف ہے: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ((مسلمانو)! اللہ کی راہ میں جہاد کرو) کہا گیا ہے کہ خطاب صحابہ سے ہے، جب انھیں موت سے فرار کرنے والوں کی یاددہانی کرائی گئی اور فرار سے انھیں ذرا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا، انھیں جہاد پر آمادہ کیا گیا تاکہ وہ جہاد سے فرار کر کے ان لوگوں کی راہ پر نہ چلیں جنھوں نے اپنے گھروں سے فرار اختیار کیا تھا۔ یہ قول بھی وارد ہوا ہے کہ ان لوگوں سے خطاب ہے جن کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس کی تقدیر اس طرح ہے ان سے کہا جا رہا ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرو۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (اور جان رکھو کہ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے) یعنی جو کچھ منافق کہتے ہیں اللہ اس کا سننے والا ہے اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اس سے واقف ہے۔ اس کے حال سے ڈرو۔

❀❀❀❀❀

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حَسَنہ دے تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے گھٹانا اور بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔(۲۴۵)

قراءت:

فَیُضَاعِفه میں چار قرأتیں ہیں:

۱۔ابو عمرو، نافع، حمزہ اور کسائی نے فَیُضَاعِفُهٗ کو الف اور رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔عاصم نے الف اور نصب کے ساتھ فَیُضَاعِفَهٗ پڑھا ہے۔

۳۔ابن کثیر اور ابو جعفر نے فَیُضَعِّفُهٗ تشدید اور رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

۴۔ابن عامر اور یعقوب نے تشدید اور نصب کے ساتھ فَیُضَعِّفَهٗ پڑھا ہے۔

ابو عمرو، کسائی اور حمزہ نے یَبْسُطُ اور بَسْطَهٗ یہاں پر اور سورہ اعراف میں بھی سین کے ساتھ پڑھا ہے۔ان حضرات سے صاد کے ساتھ بھی مروی ہے۔یعقوب اور ہشام نے سین کے ساتھ اور بقیہ نے مختلف پڑھا ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: فَیُضَاعِفُهٗ کے مرفوع ہونے کی دو وجہیں ہیں:

۱۔اسے عطف کیا جائے گا اس فعل یُقْرِض پر جو صلہ میں ہے۔

۲۔اسے استیناف (نیا جملہ) مانا جائے۔

فَیُضَاعِفَهٗ میں نصب اس کو رفع دینے سے زیادہ بہتر ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ یہاں پر سوال اِقْرَاض کے فاعل (قرض دینے والے) کے بارے میں ہے خود اِقْرَاض (قرض دینے) کے بارے میں نہیں ہے۔جب ایسا ہے تو پھر یہ آپ کے اس جملہ کے مانند نہیں ہے: اَتُقْرِضُنِیْ فَاَشْكُرَكَ اس

لئے کہ یہاں پر سوال قرض کے بارے میں ہے (کیا تم مجھے قرض دو کہ میں تمہارا شکرادا کروں)

ابن عامر اور عاصم کے فَيُضَاعِفَهُ کو فاء کی وجہ سے نصب دینے کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس جملہ کو معنیٰ پر حمل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب معنیٰ یہ ہیں کہ اَيَكُونُ قَرْضٌ تو فَيُضَاعِفَهُ کو اسی پر حمل کیا جائے گا۔ جیسا کہ اس آیت مِن يُّضْلِلِ اللهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَيَذَرْهُمْ میں يَذَرْهم کو جزم دیا ہے اس لئے کہ فَلَا هَادِيَ لَهُ کے معنیٰ یہ ہیں کہ لَا يَهْدِهِ یعنی وہ اس کی ہدایت نہیں کرے گا۔ اور کلام کو لفظ کے بجائے معنیٰ پر حمل کرنے کی مثالیں بہت ہیں۔

يُضَاعِفُ اور يُضَعِّفُ کے سلسلہ میں تو دونوں ایک دوسرے کے معنیٰ میں ہیں۔ اَضْعَافاً بر بنائے حال منصوب ہے اور اس کی تقدیر فَيُكَثِّرُهُ ہے جب وہ اَضْعَاف ہے تو فعل سے فارغ ہونے کے بعد وہ حال ہے۔

جن لوگوں نے مذکورہ بالا کلمات بَسَطَ يَبْسُطُ میں سین کو صاد سے بدل دیا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ طاء حرف استعلاء ہے اپنے مخرج سے جنک تک پہونچ جاتا ہے اور سین وہاں تک اوپر نہیں جاتا ہے جس قدر صاد جاتا ہے۔ پس ان لوگوں نے استفال کے بجائے استعلاء کو ناپسند قرار دیتے ہوئے سین کو ایک ایسے حروف سے بدل دیا ہے جو اپنے مخرج میں طاء کے مانند استعلاء ہوتا ہے پس دونوں حروف آپس میں سازگار ہو جاتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک استعلاء میں اپنے ساتھی کے مطابق و موافق ہو جاتا ہے لہٰذا استفال کے بجائے استعلاء میں جو ناپسندیدہ بات تھی وہ ابدال میں ختم ہو جاتی ہے اور اگر دونوں کا اجتماع اس کے برخلاف ہو جس کو ہم نے ذکر کیا ہے کہ استعلاء استفال سے پہلے ہو تو یہ ناپسندیدہ نہیں ہے اور پھر ابدال کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں: طَسَمَ الطَّرِيقُ وَ قَسَوْتُ وَ قَسَتْ، ایسی صورت میں انہوں نے استعلاء کے بجائے استفال کو ناپسند نہیں مانا ہے جس طرح بَسَطَ کو ناپسند مانتے ہوئے بَصَطَ پڑھا جاتا ہے اور ابدال کر دیا تھا۔

اور جس نے بَسَطَ میں سین کو صاد سے نہیں بدلا ہے تو اس نے اصل اور قانون کی بنا پر ایسا کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ سین اور صاد میں سا ذرا سا فرق بھی پایا جاتا ہے پس اس قلت کی بنا پر اختلاف کا احتمال پایا جاتا ہے۔

الفاظ ومعانی:

اَلْقَرْض یعنی عطا کے ذریعہ مال کا کچھ حصہ علیحدہ کرنا اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسے اسی طرح واپس

کردے یا اس کے مانند اس کا بدل اور عوض پلٹادے۔

اَلتَّضْعِیْف: اَلْمُضَاعَفَة اور اِضْعَاف کے ایک ہی معنی ہیں۔ یہ اصل شیٔ پر اضافہ اور زیادتی ہے یہاں تک کہ (اصل شیٔ) دوگنا یا اس سے بیشتر ہوجائے۔

ضُعْف، قُوَّة کے برخلاف ہے اور قَبْض (روکنا) بَسْط (پھیلانا اور کشادہ کرنا) کے برعکس ہے۔

تفسیر:

اللہ کا بندوں سے قرض لینا

جب خداوند عالم نے (لوگوں) کو جہاد پر آمادہ کیا جو جان اور مال کے ذریعہ ہوتا ہے، اس کے بعد لطف ومہربانی کے ذریعہ نیک اعمال اور راہ خیر میں انفاق کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ (تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض دے) یعنی کون ہے جو راہ خدا اور اس کی اطاعت میں خرچ کرتا ہے؟ اس سے امر مراد ہے، یہ حاجت وضرورت والا قرض نہیں ہے جیسا کہ یہودیوں کا گمان تھا اور ان کا کہنا تھا ہمارا پروردگار ہم سے اپنی مشکل اور احتیاج میں قرض طلب کررہا ہے، لہٰذا وہ فقیر ومحتاج ہے اور ہم اغنیا ہیں بلکہ خداوند عالم نے انفاق (خرچ کرنے کو) لطف ومہربانی کے ساتھ فرض فرمایا ہے۔ اس کے بجالانے کی دعوت دی ہے اور اس کی جزا پر تاکید فرمائی ہے، اس لیے کہ قرض جزا کا باعث ہوتا ہے (یا قرض جزا کو لازمی قرار دیتا ہے)

قَرْضًا حَسَنًا (قرض حسنہ) قرض حسن یہ ہے کہ مال حلال میں سے خرچ کرے۔ احسان جتلا کر اور اذیت پہونچا کر فاسد نہ کرے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس سے نفس پاک وصاف ہوتا ہے۔ یہ واقدی کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انفاق کے وقت بہترین موقع ومحل ہو (یعنی خوش وخرم حالت میں انفاق کرے یا برضاو رغبت خرچ کرے) خسیس وبخیل نہ ہو۔ اولیٰ وبہتر یہ ہے کہ وہ غرض ان تمام امور کا جامع ہو اس کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کہ اس میں کئی گنا زیادہ اضافہ کردے یعنی اس میں اس قدر اضافہ کردے اور عطا کردے جسے اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا ہو۔ یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے کہ وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا، یہ حسن اور سُدی سے مروی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پروردگار! مزید اضافہ فرما! تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا پھر رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رَبِّ زِدْنِیْ (پروردگار مزید اضافہ فرما!) تو اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

ارشاد الٰہی: فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً (تا کہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے) کثیر اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ جس کا شمار نہ کیا جا سکے۔ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ (گھٹانا اور بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے) (کم کرتا اور کشادگی عطا کرتا ہے) یعنی اللہ کچھ لوگوں کے رزق کو روک لیتا ہے، یعنی انھیں تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے اور کچھ لوگوں پر رزق پھیلاتا ہے اور کشادگی عطا کرتا ہے یعنی انھیں رزق میں وسعت عطا کرتا ہے۔ یہ حسن و ابن زید سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس فقرہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ صدقات کو روک لیتا ہے اور صدقات پر دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ جزا میں وسعت دے گا۔ یہ اصم اور زجاج سے مروی ہے۔ یہ ایک قول یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی موت سے رزق کو روکتا ہے اور وارثوں کے لیے وسعت دیتا ہے ان کے (رزق میں کشائش عطا کرتا ہے)

وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے) یہ جزا کے لیے تاکید ہے۔

کلبی نے اس آیت کے سبب نزول میں اس طرح بیان کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو کوئی صدقہ دے گا وہ اس کے مثل جنت میں پائے گا۔ ابودحداح جن کا نام عمرو بن دحداح تھا، نے اس طرح بیان کیا ہے: میں نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! میرے دو باغ ہیں اگر میں ایک باغ صدقہ کر دوں تو میرے لیے جنت میں اس کے مانند دو باغ ہوں گے؟ فرمایا: ہاں، ابودحداح نے عرض کیا ام الدحداح میرے ہمراہ ہوگی؟ فرمایا: ہاں، عرض کیا: میری دختر میرے ہمراہ ہوگی؟ فرمایا: ہاں چنانچہ اُس نے دونوں باغوں میں سے بہترین باغ کو بطور صدقہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اللہ نے ان کے صدقہ کو ہزار ہزار گنا بڑھا دیا ہے یہی ہے ارشاد الٰہی اَضْعَافًا كَثِیْرَةً (کا مطلب)

امام صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ابودحداح واپس پلٹے تو انھوں نے ام دحداح اور اپنی بیٹی کو اس باغ میں پایا جسے وہ صدقہ کر چکے تھے۔ باغ کے در پر کھڑے ہو گئے، اس کے اندر جانے میں انھوں نے حرج محسوس کیا۔ آواز دی: اے ام دحداح! اس نے کہا: لبیک! اے ابودحداح! انھوں نے کہا: میں ان دونوں باغوں کو صدقہ کر چکا ہوں اور اس جیسے دو باغ جنت میں خرید لیا ہے۔ میری دختر بھی میرے ہمراہ ہوگی۔ اس نے

کہا: اللہ تمھیں مبارک کرے جس چیز کو تم نے خریدا ہے اور جو چیز تم نے فروخت کی ہے۔ سب کے سب باغ سے نکل آئے اور باغ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابودحداح کے کھجور کے کتنے درخت اور باغات جنت میں محفوظ ہیں۔

❁❁❁❁❁

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾

کیا تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تا کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے دریافت کیا: کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور تم لڑائی میں حصّہ نہ لو۔ وہ کہنے لگے: بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں۔ جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ اور ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا گیا ہے۔ مگر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو چند افراد کے سوا باقی سب منہ پھیر کر چلے گئے اور اللہ ان ظالمین سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ (۲۴۶)

قرأت:

صرف نافع نے عَسِيْتُمْ سین کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے فتحہ کے ساتھ عَسَيْتُمْ پڑھا ہے۔

حجت:

عَسَيْتُ میں مشہور سین کا مفتوح ہونا ہے اور نافع کی قرأت کی دلیل یہ ہے کہ علماء نے کہا ہے: وہ عَسِيَ بِذٰلِكَ وَ مَا عَسَاهُ وَاَعْسِ بِهِ ہے۔ اس کی حکایت ابن الاعرابی نے کی ہے اور یہی بات نافع کی

قرأت کو قوی بناتی ہے اس لئے کہ عَسِیَ حَرٍ اور شَجٍ کے مانند ہے اور فَعَلَ اور فَعِلَ دونوں کے وزن پر آیا ہے جیسے نَقَمَ اور نَقِمَ وَرَتْ بِكَ زِنَادِي وَرِيَتْ۔ اسی طرح عَسَتْ اور عَسِيَتْ بھی ہے اگر فعل اسم ظاہر کی جانب مسند ہو تو عَسَيْتُمْ کا قیاس یہ ہے کہ آپ اس طرح کہیں گے عَسِيَ زَيْدٌ جیسے رَضِيَ۔ اگر اس نے اس طرح کہا تو قیاس کیا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ ایک ساتھ دونوں لغت اور تلفظ کو اختیار کرے اور دونوں میں سے ایک کو ایک مقام پر اور دوسرے کو کسی اور مقام پر استعمال کرے جیسا کہ دوسرے افراد نے بھی ایسا کیا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْمَلَأُ: اشراف لوگوں کی جماعت۔ اشراف کو مَلَأٌ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے شرف میں مزید اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے چونکہ اشراف کی ہیبت سے سینے پر ہو جاتے ہیں۔

ترکیب:

مِنۢ بَنِيٓ اِسْرَآئِيْلَ جار و مجرور بر بنائے حال محلاً منصوب ہے اور اس میں عامل تَرَ اور ذوالحال اَلْمَلَأُ ہے۔ مِنۢ بَعْدِ مُوْسٰى بھی مقام حال میں ہے۔ یہ حال بعد از حال ہے اور اس سے پہلے والے جار و مجرور میں موجود ضمیر کے لئے حال ہے۔ نُقَاتِلْ اس سوال کے جواب کی بنا پر مجزوم ہے جو امر کی صورت میں ہے۔ (اِبْعَثْ) یعنی اَنْ تَبْعَثَ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ۔ اگر یاء کے ساتھ یُقَاتِلُ ہوتا تو اسے مَلِكٌ کی صفت ہونے کی بنا پر رفع دینا ہوتا۔ زجاج نے کہا: نُقَاتِلُ کو رفع دینا بعید ہے۔ ہاں اس معنیٰ کی بنا پر رفع دینا جائز ہے کہ فَاِنَّا نُقَاتِلُ فِي سَبِيْلِ اللهِ علمائے نحو کی ایک بڑی تعداد نے کہا ہے کہ نُقَاتِلُ کو رفع دینا جائز و صحیح نہیں ہے۔

اَلَّا تُقَاتِلُوْا مقام نصب میں ہے اس لئے کہ عَسَيْتُمْ کی خبر ہے۔ وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ اور مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا کے بارے میں ابوالحسن اخفش نے کہا ہے کہ ان دونوں میں اَن زائدہ ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: مَالَنَا لَا نُقَاتِلُ وَ مَا لَكُمْ لَا تَاْكُلُوْنَ، جیسے یہ ارشاد ہے: مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ۔ مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا (سورۂ یوسف ۱۱) فعل منفی مقام حال میں واقع ہوا ہے جیسا کہ آپ کے اس جملہ "مَالَكَ تَفْعَلُ" میں فعل مثبت حال واقع ہوا ہے بسا اوقات اس طرح کے جملوں میں کہا جاتا ہے کہ مراد یہ ہے: وَ مَا

لَنَا اَنْ لَّا نُقَاتِلَ وَمَالَكُمْ فِيْ اَنْ لَّا تَاْكُلُوْا گویا آیت کو دونوں صورتوں پر حمل کیا گیا ہے۔

ابوعلی نے کہا: دوسرا قول زیادہ واضح ہے اور فعل حرف کے ساتھ حال کے منصوب ہونے کے مقام میں جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (سورۂ مدثر، آیت ۴۹) وغیرہ۔ پھر جار کو حذف کر دیا گیا ہے اور آنْ اور اس کا صلہ جار کا قائم مقام بن گیا ہے اور حال دراصل حرف مقدر کو لانے والا ہے البتہ اس کو ظاہر نہیں کیا گیا ہے اس لئے کہ منصوب عنہ اس پر دلالت کر رہا ہے اور ظرف کے مقام حال میں واقع ہونے کی ایک مثال شاعر ابوذویب کا یہ شعر بھی ہے:

يَعْثُرْنَ فِيْ حَدِّ الظُّبَاةِ كَاَنَّمَا　كُسِيَتْ بُرُوْدَ بَنِيْ تَزِيْدَ الْاَذْرُعُ

یہ اس جملہ کے مانند ہے کہ خَرَجْتُ فِي الثِّيَابِ یعنی خَرَجْتُ لَابِساً۔

تیسری صورت کو مبرد نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ انہوں نے انکار نہیں کیا اور تقدیر یہ ہے: وَمَالَنَا نَتْرُكُ الْقِتَالَ۔

شروع کی دو صورتوں میں مَا استفہامیہ ہے۔

قَدْ اُخْرِجْنَا جملہ مقام حال میں ہے اور تقدیر یہ ہے کہ وَمَالَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ مُخْرَجِيْنَ مِنْ دِيَارِنَا، ذوالحال اَلَّا نُقَاتِلَ میں ضمیر (نَحْنُ) ہے۔ قَلِيْلًا کلام موجب سے استثناء کی بنا پر منصوب ہے۔

تفسیر:

ایک عبرتناک واقعہ

خداوند عالم نے ذکر جہاد کے بعد بنی اسرائیل کے مشہور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے جو ان کے جہاد سے بیٹھ جانے کی بنا پر پیش آیا اس بات سے خبردار کرنے کی خاطر بیان کیا ہے کہ مسلمان ان کا راستہ اختیار نہ کریں۔

اَلَمْ تَرَ (کیا تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا،) اے محمدؐ! کیا یہ بات آپ کے علم میں نہیں ہے۔(کیا آپ اس سے واقف نہیں ہیں یا کیا یہ بات آپ کے علم میں نہیں ہے) اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى (کہ اشراف کی ایک جماعت جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا) یعنی جناب موسیٰؑ کی وفات کے بعد۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ جب انھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا۔ اس پیغمبر کے متعلق اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ ان کا نام شمعون تھا۔ ان کی ماں نے ان کا یہ نام اس لیے رکھا تھا کہ انھوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ

انھیں فرزند عطا فرمائے۔ چنانچہ خدا نے ان کی دعا قبول فرمالی، یہ شمعون بن صفیہ لاوی بن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب تھے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اشمویل تھے جو عربی زبان میں اسماعیلؑ ہیں۔ بیشتر مفسرین کے نزدیک یہی ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی روایت ہے۔

اِبۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کردیں تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں) اس مطالبہ کے سبب کے بارے میں اختلاف ہے: بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اس مطالبہ کا سبب یہ تھا کہ جب ظالم وسرکش لوگوں کو بنی اسرائیل پر اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے انھیں ذلیل کیا، ان کے شہروں پر قبضہ کرلیا، ان کی بیشتر اولاد کو اسیر بنالیا۔ یہ واقعات ان کے درمیان اس وقت رونما ہوئے جب بنی اسرائیل میں کثرت سے گناہ ہونے لگے، حادثات بڑھنے لگے (یا ان کے درمیان بدعتیں عام ہوگئیں) اور انھوں نے عہد الٰہی کو فراموش کردیا، ان کے درمیان نہ کوئی پیغمبر تھا جو ان کے امور کی تدبیر کرتا چنانچہ خداوند عالم نے ان کی جانب اشمویل پیغمبر کو بھیجا۔ لوگوں نے پیغمبر سے کہا: اگر آپ سچے (پیغمبر) ہیں تو ہمارے لیے کسی بادشاہ کو مقرر کیجیے تاکہ ہم راہ خدا میں جہاد کریں جو آپ کی نبوت کی نشانی اور علامت ہو۔ یہ ربیع اور کلبی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے عمالقہ سے جنگ کرنا چاہی لہٰذا بادشاہ کا مطالبہ کیا جو ان پر امیر و حاکم ہو جس سے ان کا اتحاد منظم اور امر یکجا ہوجائے اور دشمن سے جہاد کرنے میں ان کی حالت مستحکم اور بہتر ہو جائے۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ یہ بھی قول وارد ہوا ہے کہ اللہ نے اشمویل پیغمبر کو بھیجا جو چالیس برس تک بہت اچھی حالت میں رہے پھر جالوت اور عمالقہ کا واقعہ پیش آیا۔ لوگوں نے اشمویل سے کہا: آپ ہمارے لیے بادشاہ کو بھیجیے۔ یہ وہب کا قول ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اس زمانہ میں بادشاہ لشکر لے کر جاتا تھا اور پیغمبر اسے حکم دیتے تھے (اس کی رہنمائی کرتے تھے) اور انھیں پروردگار کی جانب سے خبر سے آگاہ کرتے تھے۔

ان کے پیغمبر نے انھیں جواب دیتے ہوئے کہا: هَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ (نبی نے دریافت کیا، کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے) شاید اگر اس بادشاہ کے ہمراہ تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو اَلَّا تُقَاتِلُوۡا (تم لڑائی میں حصہ نہ لو) جو کچھ تم کہہ رہے ہو اسے پورا نہیں کر پاؤ گے اور اس سے گریز اور پہلوتہی اختیار کرو گے اور جنگ نہیں کرو گے۔ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) ان سے سوال اس لیے کیا تھا کہ

معلوم ہو سکے کہ وہ کس حد تک جنگ پر حریص اور اس کے خواہاں ہیں۔ یہ ان سے عہد لینے کے مانند ہے۔
عَسَيْتُمْ کے معنی تمھارا قریب ہونا ہے، جب آپ کہتے ہیں: عَسَيْتُ اَنْ اَفْعَلَ كَذَا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں فعل انجام دینے کے نزدیک ہو گیا۔ قَالُوْا گروہ نے کہا: وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں) یعنی کون چیز ہے جو ہمارے قتال نہ کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ (یعنی کون سی چیز ہمیں قتال سے روک سکتی ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہمارے لیے جنگ کا ترک کرنا نہیں ہے۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا (جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے) لفظ عام ہے معنی خاص ہیں یعنی ہم میں سے بعض کو نکال دیا گیا ہے۔ مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا (اور ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا گیا ہے) ہمیں ہمارے وطن سے نکال دیا گیا اور ہمارے اہل و عیال کو اسیر کر لیا گیا اور ہمارے علاقوں پر قہر و غلبہ سے قبضہ حاصل کر لیا گیا۔ یعنی ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو جواب دیتے ہوئے کہا: ہم جنگ میں اس وقت رغبت نہیں دکھاتے جب ہم عزت و شرف کے ساتھ ہوتے، ہمارے دشمن نے ہم پر قہر و غلبہ حاصل نہ کیا ہوتا لیکن حالات جب اس مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں تو جہاد لازمی ہے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ (مگر جب ان پر جنگ فرض کی گئی) اس میں حذف ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے: فَسَاَلَ النَّبِيُّ؛ پیغمبر نے اللہ سے درخواست (دعا) کی کہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کردے تاکہ وہ اس کی ہمراہی میں اپنے دشمن سے جہاد کریں۔ خداوند عالم نے پیغمبر کی دعا کو قبول کیا اور ان کے مطالبہ کا جواب عطا فرمایا، ان کے لیے بادشاہ کو مقرر کر دیا اور ان پر قتال فرض کر دیا، جب ان پر قتال فرض کر دیا تو تَوَلَّوْا (سب منہ پھیر کر چلے گئے) یعنی انھوں نے قتال کرنے سے اعراض اور پہلوتہی کی اور امر الٰہی کو ضائع و برباد کر دیا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (سوائے کم لوگوں کے) یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے بعد میں اپنے پیغمبر کے ساتھ نہر سے عبور کیا تھا جسے ہم بعد میں بیان کریں گے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (اور اللہ ان ظالمین سے اچھی طرح آگاہ ہے) یہ جنگ سے منھ موڑنے والوں کو خبردار کرنا ہے اس لیے کہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

❀❀❀❀❀❀

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۷﴾

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمھارے لیے بادشاہ بنایا ہے۔ یہ سن کر وہ کہنے لگے: بھلا وہ ہم پر بادشاہی کیسے کرسکتا ہے؟! اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ حق دار ہیں، وہ تو کوئی بڑا صاحب ثروت نہیں ہے! نبی نے جواب دیا: اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اسے علمی اور جسمانی دونوں طاقتیں زیادہ عطا کی گئی ہیں۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے اقتدار عطا کرتا ہے اور اللہ صاحبِ وسعت اور صاحبِ علم ہے۔ (۲۴۷)

الفاظ و معانی:

اِصْطَفَاهُ، اِخْتَارَهُ، اِسْتَصْفَاهُ سب کے معنی ایک ہی ہیں یعنی منتخب کیا۔

اَلْبَسْطَة: جسم اور مال میں برتری۔ جسم کی حد اس کا طول وعرض اور عُمق (گہرائی) میں ہونا ہے۔

عربوں کا یہ کہنا کہ جَسُمَ: ضخیم ہوا جَسِیْم جَسَامَة یعنی یہ جسم میں ضخیم ہے۔ ''هٰذَا اَجْسَمُ مِنْ هٰذَا یہ اس سے طول وعرض وعُمق میں بیشتر ہے۔ جَسِیْم: ضخیم۔

ترکیب:

طَالُوْت، جَالُوْت اور دَاوٗد غیر منصرف ہیں اس لئے کہ اعجمیہ ہیں اور ان میں غیر منصرف ہونے کے دو اسباب معرفہ اور عجمیہ ہونا ہیں۔ لیکن لفظ جَامُوْس اگر کسی آدمی کا نام پڑ جائے تب بھی وہ منصرف ہی رہے گا اگرچہ عربی ہے اس لئے کہ عربی میں آنے کے بعد وہ متمکن (منصرف) ہو گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اس پر الف لام داخل کرکے اَلْجَامُوْس کہتے ہیں۔

مَلِكًا بر بنائے حال منصوب ہے اور اس میں عامل بَعَثَ ہے اور ذوالحال طَالُوْت ہے۔ اَنّٰى محل

نصب میں ہے اس لئے کہ یَکُوْنُ کی خبر ہے اور اَلْمُلْکُ اس کا اسم ہے۔ لَہٗ مقام حال میں ہے اور اَلْمُلْکُ ذوالحال ہے۔ تقدیر یہ ہے: وَاَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ یَسْتَقِرُّ لَہٗ عَلَیْنَا یہاں پر کَانَ تامہ بھی ہوسکتا ہے اور لام کَانَ سے متعلق ہے اور اَنّٰی یَکُوْنُ حال ہونے کی بنا پر مقام نصب میں ہے۔ عَلَیْنَا مُلْکٌ سے متعلق ہے۔ نَحْنُ اَحَقُّ بھی بر بنائے حال مقام نصب میں ہے۔ تقدیر یہ ہے: اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ اَنْ یَّمْلِکَ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ مِنْہُ بِالْمُلْکِ۔ وَلَمْ یُؤْتَ بھی مقام حال میں ہے وَ نَحْنُ اَحَقُّ پر عطف ہے اس میں عامل اَلْمُلْکُ ہے اور ذوالحال اَن یَّمْلِکَ میں ضمیر (ھُوَ) ہے اور تقدیر یہ ہے: اَن یَّمْلِکَ عَلَیْنَا غَیْرَ مُؤْتیٰ سَعَۃً مَالِیَّۃً۔

تفسیر:

طالوت کی بادشاہی

وَقَالَ لَھُمْ نَبِیُّھُمْ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا (ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمھارے لیے بادشاہ بنایا ہے) طالوت بنیامین بن یعقوبؑ کی اولاد تھے۔ نبوت کے سبط سے نہیں تھے، نہ ہی مملکت (حکومت و اقتدار) کے سبط (اولاد) تھے۔ ان کے طولانی ہونے کے سبب انھیں طالوت کہا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ سقا تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خربندا تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ دباغ (چمڑا رنگنے والے) تھے۔ نبوت لاوی بن یعقوب کے سبط میں تھی اور مملکت (حکومت) یھوذا بن یعقوب کے سبط میں تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے یوسف کے سبط میں تھی۔

اللہ کا ارشاد مَلِکًا یعنی امیر لشکر۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں نبی مبعوث کیا بعد میں بادشاہ بنایا۔ قَالُوْٓا اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا (یہ سن کر وہ کہنے لگے! بھلا وہ ہم پر بادشاہی کیسے کرسکتا ہے) یعنی انھیں حکومت کرنے کا حق کہاں سے اور کس طرح حاصل ہوگیا؟ یہ لوگوں کا پہلا اعتراض تھا کہ جب انھوں نے ان کی حکومت و اقتدار کا انکار کیا۔ وَنَحْنُ اَحَقُّ (اس کے مقابلہ میں ہم زیادہ حق دار ہیں) یعنی ہم اولیٰ ہیں بِالْمُلْکِ مِنْہُ (ہم ان سے حکومت کے زیادہ حق دار ہیں) اس لیے کہ ہم نبوت اور مملکت کے سبط سے ہیں اور ہمیں مال بھی عطا کیا گیا ہے۔ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ (وہ تو کوئی بڑا صاحب ثروت نہیں ہے) انھیں وہ چیز عطا نہیں کی گئی جس کے لوگ مالک ہوتے ہیں جو کہ مال ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ کے

لیے مال کا ہونا لازمی چیز ہے۔ جس سے وہ دیگر (ممالک) حاصل کرتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ انھیں مال میں وسعت نہیں دی گئی ہے جس سے انھیں شرف حاصل ہوتا، اگر کوئی کمی یا کوتاہی ہوتی تو مال سے اسے دور کیا جاتا تا کہ اہل انساب (نسلی شرف والے) کے برابر ہوسکیں۔ خداوند عالم نے انھیں بتلادیا کہ وہ حکمت کی وجہوں کا ان سے زیادہ واقف اور جاننے والا ہے اس لیے کہ مُلک اور ریاست اور اقتدار سے مقصود علم وشجاعت ہیں جس کی خبر ان کے پیغمبر کی زبانی دے دی۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ (نبی نے جواب دیا: اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اسی کو منتخب کیا ہے) اللہ نے انھیں منتخب کیا ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً (اور اسے طاقتیں زیادہ عطا کی گئی ہیں) فضیلت اور وسعت عطا فرمائی ہے۔ فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (علمی (طاقت) اور جسمانی (طاقت) دونوں) طالوت اپنے وقت میں بنی اسرائیل میں اعلم (باعتبار علم سب سے زائد) خوبصورت ترین اور باعتبار جسم ان میں کامل ترین اور اعظم ترین تھے اور باعتبار شجاعت سب سے زیادہ قوی تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص کھڑا ہو کر اپنا ہاتھ بلند کرتا تو ان کے سر تک پہونچتا تھا۔ وہب نے بیان کیا ہے کہ یہ (صفات) ان میں حکومت حاصل ہونے سے قبل موجود تھے اور ان میں حکومت کے بعد اضافہ کیا گیا۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (اور اللہ جسے چاہتا ہے اقتدار عطا کرتا ہے) یعنی (طالوت) کی حکومت سے انکار نہ کرو اگر چہ یہ شاہی گھرانے سے نہیں ہیں اس لیے کہ خداوند عالم ہی حکومت واقتدار کا مالک ہے جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ وٰسِعٌ (اور اللہ صاحبِ وسعت ہے) اس کے معنی میں تین اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: وہ فضل میں وسعت عطا کرنے والا ہے۔ اس میں حذف ہے جس طرح کہا جاتا ہے فُلَانٌ كَبِيْرٌ فلاں شخص بڑا اور بزرگ ہے یعنی كَبِيْرُ الْقَدْرِ قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑا ہے۔

دوم: وَاسِع مُوْسِع (وسعت دینے والے) کے معنی میں ہے یعنی جس کے لیے چاہتا ہے اپنی نعمت میں وسعت عطا کرتا ہے۔

سوم: صاحب وسعت ہے جیسے: عِيْشَةٌ رَّاضِيَةٌ یعنی صاحب رضا، رَجُلٌ تَامِرٌ یعنی صاحب تمر (کھجور والا) لَابِن یعنی ذُوْ لَبَن (دودھ والا)

عَلِيْمٌ (اور صاحبِ علم ہے) یعنی اس کے بارے میں جانتا اور واقف ہے جسے فضل وحکومت عطا کرنا

مناسب وسزاوار ہے، چاہے اصلاح کرنے کے لیے یا امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہو۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ حکومت کی نسبت خدا کی جانب دی گئی ہے چونکہ وہ بادشاہ کو تدبیر کے لیے مقرر کرتا ہے، اسے حکومتی آلات واسباب عطا کرتا ہے اور مخلوق کو اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ خداوند عالم نے ان کے لیے بادشاہ مقرر کیا اگرچہ بادشاہ کا تقرر انبیاء کے تقرر کے مانند نہیں ہوتا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ اس (اللہ کی) حکومت میں چونکہ خدا کی جانب سے ہوتا ہے اس کا تصرف اللہ کے حکم سے صادر ہوتا ہے، اسی طرح اس میں یہ دلالت ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ حکومت وراثت کے ذریعہ ہو بلکہ اللہ کی مصلحت اور علم کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ امام کے شرائط میں اس شرط یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا اور عوام سے اعلم ہو، فضل وشجاعت کے صفات میں اکمل وافضل ہو اس لیے کہ خداوند عالم نے طالوت کو لوگوں پر مقدم کرنے کی علت وسبب ان کا اعلم واقوی ہونا قرار دیا ہے اگر یہ شرطیں نہیں تو اس کے کوئی معنی نہیں۔

❁❁❁❁❁

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

ان کے نبی نے ان لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے طالوت کے بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمھارے پاس ایک تابوت (صندوق) آئے گا جس میں تمھارے ربّ کی طرف سے تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرّکات ہیں، فرشتے جسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اگر تم صاحبان ایمان ہو تو تمھارے لیے اس تابوت (صندوق) میں بہت بڑی نشانی ہے۔ (۲۴۸)

الفاظ ومعانی:

اَلتَّابُوْت جمہور عرب کی لغت ہے۔ اَلتَّابُوْہ انصار کی لغت ہے۔

اَلسَّكِيْنَةَ مصدر ہے جو اسم کے مقام پر واقع ہوا ہے اور اَلسُّكُوْن سے مشتق ہے۔

ترکیب:

اَن يَّاْتِيَكُمْ مقام رفع میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ اِنَّ آيَةَ مُلْكِهٖ اِتْيَانُ التَّابُوْتِ اِيَّاكُمْ۔ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ مبتدا اور خبر تَابُوْت کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ مِمَّا تَرَكَ جار ومجرور بَقِيَّةٍ کے لئے صفت ہیں۔

تفسیر:

تابوت سکینہ

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ ءَايَةَ مُلْكِهٖ (ان کے نبی نے ان لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے طالوت کے بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے) یعنی طالوت کو اللہ کی طرف سے بادشاہ بنانے کی علامت اور ان کی حکومت کے صحیح ہونے کی حجت و دلیل یہ ہے اَن يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ (کہ تمھارے پاس ایک تابوت (صندوق) آئے گا) اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ انھوں نے اپنے رسول سے کہا تھا کہ اگر ان کی حکومت اللہ کے حکم اور اس کی جانب سے ہے تو کوئی علامت ونشانی پیش کریں جو اس بات پر دلالت کرے۔ چنانچہ انھیں یہ جواب دیا گیا۔ علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ یہ تابوت وہ تھا جسے خداوند عالم نے مادر موسیٰ پر نازل فرمایا تھا جس میں انھوں نے اپنے فرزند (موسیٰ) کو رکھ کر دریا کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ تابوت بنی اسرائیل کے لیے لائق تعظیم تھا جس سے وہ برکت حاصل کرتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وقت وفات آیا تو اس میں انھوں نے توراۃ کی الواح، اپنی زرہ اور تبرکات نبوت رکھ کر اپنے جانشین یوشع بن نون کے حوالے کر دیا تھا۔ اسی طرح یہ تابوت ان کے اور بنی اسرائیل کے پاس عزت واحترام کے ساتھ رہا جب تک ان کے درمیان تھا۔ پھر انھوں نے اسے سُبک اور حقیر سمجھنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کے بچوں نے گلی کوچوں میں اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ لہٰذا جب انھوں نے گناہ کرنا شروع کر دیا اور اسے سبک وحقیر سمجھنے لگے تو خداوند عالم نے اسے ان کے پاس سے اٹھالیا۔ جب لوگوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ وہ ان کے لیے بادشاہ مقرر کر دیں تو اللہ نے طالوت کو ان کے لیے مقرر کر دیا اور انھیں تابوت بھی پلٹا

دیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ (تابوت) عمالقہ یعنی بنی اسرائیل کے دشمنوں کے ہاتھوں میں تھا جن پر انھوں نے غلبہ حاصل کرلیا تھا جب بنی اسرائیل میں برائیاں رائج ہوگئیں اور ان میں نئی نئی باتیں رونما ہونے لگیں تو خداوند عالم نے اسے ان کے ہاتھوں سے چھین لیا اور بنی اسرائیل پر واپس پلٹا دیا جسے فرشتے اٹھاتے تھے۔ یہ ابن عباس اور وہب سے مروی ہے۔ نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ وہ تابوت تھا جسے خداوند عالم نے آدمؑ پر نازل کیا تھا اس میں انبیاء کی تصویریں تھیں جسے اولاد آدم نے میراث میں پائی تھیں اور بنی اسرائیل اس کے ذریعہ اپنے دشمن پر فتح حاصل کرتے تھے۔ یہ قتادہ نے بیان کیا ہے۔ تابوت صحرا میں تھا جسے وہاں یوشع بن نون چھوڑ آئے تھے اسے فرشتے اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس لے آئے تھے۔ کہا گیا ہے کہ تابوت کی لمبائی چوڑائی تین ہاتھ سے دو ہاتھ تک تھی جس پر سونا لگا ہوا تھا، جسے جنگوں میں لے جاتے اور اپنے لشکر کے سامنے رکھ دیتے تھے جب تابوت کے اندر سے چلنے کی آواز سنائی دیتی یعنی جب تابوت چلتا تو لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلتے جب آواز بند ہو جاتی تو لوگ اس کے رکنے کے ساتھ ٹھہر جاتے تھے۔

فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ (جس میں تمھارے ربّ کی طرف سے تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے) کہا گیا ہے کہ (بذات) خود تابوت کے اندر سکون تھا اور یہ بھی قول ہے کہ ان چیزوں میں جو تابوت کے اندر تھیں ان میں (سکون تھا) اس کے بارے میں اختلاف ہے؛ بیان کیا گیا ہے سکینہ (سکون) جو اس کے اندر تھا اس میں جنت کی ہوا تھی جس کا انسان کے چہرہ کے مانند چہرہ تھا۔ یہ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے دو پر تھے اور بلی کے مانند سر تھا جو زبرجد اور زمرد کا تھا۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ ہماری اخبار (روایات) میں بھی اس کی روایت کی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں آیت (نشانی) تھی جس سے سکون حاصل ہوتا تھا۔ یہ عطا سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ روح خدا تھی جو ان سے بیان کے ذریعہ کلام کرتی تھی اختلاف پیش آنے پر۔ یہ وہب سے مروی ہے۔

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ (جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرّکات ہیں) بیان کیا گیا ہے کہ اس میں عصائے موسیٰؑ اور (توراۃ کی) الواح تھیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے اس میں توراۃ اور حضرت موسیٰؑ کے لباس تھے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس میں توراۃ کی دو تختیاں تھیں اور ان پر نازل ہونے والے من وسلویٰ کا پیمانہ تھا۔ جناب موسیٰؑ کی نعلین، جناب ہارونؑ کا عمامہ اور عصا تھا۔ یہ

مفسرین کے اقوال ہیں۔سکینہ اور بقیہ کے بارے میں ظاہر یہ ہے سکینہ امن و امان اور اطمینان ہے جسے خداوند عالم نے (تابوت) میں قرار دیا تھا تاکہ اس سے بنی اسرائیل سکون حاصل کریں اور بقیہ ممکن ہے علم کا بقیہ (باقی ماندہ) ہو یا انبیا کی علامتوں میں سے کچھ ہو، ممکن ہے تمام چیزوں پر مشتمل ہو جیسا کہ زجاج نے کہا ہے۔بیان کیا گیا ہے آل موسیٰ اور آل ہارون سے موسیٰ و ہارون مراد ہیں یعنی جس چیز کو موسیٰ و ہارون نے چھوڑا۔عرب کہتے ہیں آل فُلان یعنی فلاں کی اولاد۔جبکہ اس سے مراد خود اسی کی ذات ہوتی ہے۔ابوعبیدہ کا شعر اس طرح ہے:

فَلَا تَبْكِ مَيِّتًا بَعْدَ مَيِّتٍ اَحَبَّهٗ عَلِیٌّ وَّ عَبَّاسٌ وَ آلُ اَبِیْ بَكر

آل ابوبکر سے خود ابوبکر مراد ہے۔

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ (فرشتے جسے اٹھائے ہوئے ہوں گے) بیان کیا گیا ہے کہ فرشتے تابوت کو زمین و آسمان کے درمیان اٹھائے ہوتے تھے یہاں تک کہ بنی اسرائیل اس کا چشم دید مشاہدہ کرلیا کرتے تھے۔یہ ابن عباس وحسن سے مروی ہے۔بیان کیا گیا ہے کہ جب دشمنوں نے تابوت پر غلبہ حاصل کرلیا تو اسے بت خانہ میں رکھ دیا تو ان کے بت اوندھے منہ گرنے لگے،انھوں نے اسے وہاں سے نکال کر شہر کی جانب رکھ دیا پھر ان کی گردنوں میں تکلیف پیدا ہوگئی۔وہ جس مقام پر بھی تابوت رکھتے وہاں پر موت، بلا و مصیبت رونما ہو جاتی۔اس پر انھوں نے مشورہ کیا (یا انھیں اشارہ کیا گیا) کہ وہ تابوت کو نکال کرلے جائیں۔انھوں نے اس بات پر اتفاق کرلیا کہ وہ تابوت کو گاڑی پر رکھ کر دو بیلوں کے ساتھ باندھ دیں چنانچہ انھوں نے اسی طرح کیا اور دونوں بیلوں کو روانہ کردیا پس فرشتے آئے اور انھوں نے بیلوں کو بنی اسرائیل کی طرف ہنکانا شروع کردیا۔اس اعتبار سے تَحْمِلُهُ الْمَلَآئِكَةُ کے معنی ہوں گے فرشتے انھیں لے جاتے ہیں آگے بڑھاتے اور کھینچتے ہیں۔جس طرح آپ کہتے ہیں میں اپنے اغراض مکہ لے گیا یعنی میں اسے مکہ تک لے جانے کا سبب بنا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ (تمھارے لیے اس تابوت (صندوق) میں بہت بڑی نشانی ہے) یعنی تابوت کی تمھاری جانب پلٹنے میں یہ علامت ونشانی ہے کہ خداوند عالم نے طالوت کو تم پر بادشاہ بنایا ہے۔اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (اگر تم صاحبان ایمان ہو تو) اگر تم تصدیق کرنے والے ہو ان کے لیے ایمان پر ثابت قدم رہنا ممکن نہیں تھا اس لیے کہ انھوں نے اس وقت کفر اختیار کیا جب انھوں نے اپنے پیغمبر پر اعتراض کیا۔کہا گیا ہے کہ اگر تم مومنین ہو جیسا کہ تمھارا گمان اور خیال ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن
شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ
اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ
هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَ
جُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾

پھر جب طالوت لشکر لے کر روانہ ہوئے تو انھوں نے کہا کہ اللہ ایک دریا کے ذریعہ تمھارا امتحان لینے والا ہے۔ جو اس کا پانی پئے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو پانی نہ چکھے وہ میرا ساتھی ہوگا اِلّا یہ کہ وہ اپنے ہاتھ میں ایک چلّو پانی بھر لے۔ مگر تھوڑے سے گروہ کے سوا سب لوگ دریا سے سیراب ہوئے۔ پھر جب طالوت اور ان کے مومن ساتھی دریا پار کر کے آگے بڑھے، تو انھوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملاقات کرنی ہے، انھوں نے کہا: بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹا گروہ اللہ کے اذن سے بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(۲۴۹)

قرأت:

ابن کثیر، ابو عمرو اور اہل مدینہ نے غَرْفَة بالفتح اور بقیہ قراء نے غُرْفَة بالضم پڑھا ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: جن قراء نے غَرْفَة فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے فعل کو مصدر کی جانب متعدی کیا ہے اور آیت میں مفعول کو محذوف مانا ہے انہوں نے فعل کو مصدر کی جانب متعدی کیا ہے اور آیت میں مفعول کو محذوف مانا ہے۔ مراد اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ مَآءً غَرْفَةً ہے اور جن حضرات نے عین کو ضمہ دیا ہے تو انہوں نے

فعل کو مفعول بہ کی جانب متعدی کیا ہے اسے مصدر کی جانب متعدی نہیں کیا ہے اس لئے کہ غُرْفَة خود مُغْتَرَفَة ہے اور اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ مَاءً کی جگہ ہے اہل بغداد مصدر سے مشتق ایسے اسماء کو مصدر کی جگہ مانتے ہیں اور ان کے ساتھ وہی عمل انجام دیتے ہیں جو مصدر کے ساتھ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: عَجِبْتُ مِنْ دُهْنِكَ لِحْيَتَكَ عربی اشعار میں بھی ایسی چیز ہے جو مذکورہ بات پر دلالت کرتی ہے اور وہ شاعر کا یہ مصرعہ ہے:

وَبَعْدَ عَطَائِكَ الْمِئَةَ الرِّتَاعَا

اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں اس بنا پر جس طرح غَرْفَة کو نصب دیا گیا ہے اسی طرح غُرْفَة کو بھی نصب دیا جائے گا۔ جِلْسَة اور رِكْبَة کے سلسلہ میں سیبویہ نے کہا ہے کہ ان کی وجہ سے مصادر کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے یا کہا کہ اس طرح کے اسماء مصادر کی جگہ واقع ہوتے ہیں۔ سیبویہ کی یہ بات اہل بغداد کی بات سے قریب معلوم ہوتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہاں پر فَشَرِبُوا مِنْهُ اور مَشْرُوبٌ مِنْهُ کی بنا پر غُرْفَة کو ضمہ دینا زیادہ بہتر ہے تو یہ بھی ایک قول ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْفَصْل: اَلْقَطْع (یعنی علیحدہ اور جدا ہونا) لشکر لے کر جدا ہوئے یعنی اپنے مقام سے چلے اور علیحدہ ہوئے۔ فُصِلَ الصَّبِيُّ فِصَالًا (یعنی بچے کی دودھ بڑھائی کرادی گئی)

اَلْجُنُوْد جمع ہے جُنْد (لشکر) کی۔ حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَة (ارواح آمادہ شدہ لشکر ہیں)

ترکیب:

بِيَدِهٖ جس نے غَرْفَة کے غین کو فتحہ دیا ہے اس کے نزدیک یہ جار و مجرور مصدر سے متعلق ہوگا اور فعل سے بھی متعلق ہوسکتا ہے اور جس نے غَرْفَة کے ساتھ مصدر والا برتاؤ کیا ہے تو بِيَدِهٖ غَرْفَة سے متعلق ہوگا۔ دونوں باتیں ایک ہی ہیں۔ مَنِ اغْتَرَفَ میں مَنْ استثناء کی بنا پر منصوب ہے اور کَمْ خبریہ ہے اور مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے۔

تفسیر:

عظیم امتحان

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ (پھر جب طالوت لشکر لے کر روانہ ہوئے) کلام میں حذف ہے، اس پر باقی رہنے والی چیز کی دلالت ہے، وہ یہ کہ انھیں اس صفت کا حامل تابوت دیا گیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، جس کی انھوں نے تصدیق کی اور طالوت کی اطاعت وفرماں برداری کی۔ جب طالوت اپنی جگہ سے نکلے اور لشکر کے ساتھ راستہ طے کیا۔ لشکر کی تعداد میں اختلاف ہے؛ اسی ہزار جنگجو تھے۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ ستر ہزار سپاہی تھے۔ یہ مقاتل کا قول ہے۔ ہے جب انھوں نے تابوت کو دیکھا تو انھیں نصرت کا یقین ہو گیا اور انھوں نے جہاد کی طرف جلدی کی۔ قَالَ یعنی طالوت نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ یعنی اللہ ایک دریا کے ذریعہ تمھارا امتحان لینے والا ہے۔ اس مقام پر اِبْتِلَاء (آزمائش) کے معنی سچے کا جھوٹے سے امتیاز کرنا ہے اس کے قول میں۔ یہ حسن کی روایت ہے۔ دریا کے ذریعہ ان کی آزمائش کی وجہ پانی کی کمی اور پیاس سے تلف ہونے کے خوف سے ان کی شکایت تھی۔ یہ وہب سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کی اس لیے آزمائش کی گئی کہ وہ اس پر صبر کر سکیں اور ان کے ثواب میں اضافہ ہو اور اپنے دشمن پر نصرت و مدد کے حقدار ہو سکیں، وہ شدائد اور سختیوں میں صبر کے عادی ہوں اور جنگ میں پائداری کا مظاہرہ کریں اور شکست خوردہ نہ ہوں۔

جس دریا کے ذریعہ آزمائش کی گئی اس میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ اردن اور فلسطین کے درمیان نہر ہے۔ یہ قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ دریا فلسطین میں ہے۔ یہ ابن عباس اور سُدی سے مروی ہے۔ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ (جو اس کا پانی پئے گا) 'ھَا' لفظ میں دریا سے کنایہ ہے۔ اور معنی میں پانی کے لیے ہے، کہا جاتا ہے: میں نے نہر سے اس طرح پیا مراد پانی ہوتا ہے۔

فَلَيْسَ مِنِّي (وہ میرا ساتھی نہیں) یعنی میری ولایت کا اہل سے نہیں ہے۔ میرے ساتھیوں میں سے نہیں ہے، نہ ہی میرا اتباع کرنے والوں میں سے ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ (اور جو پانی نہ چکھے) یعنی جو اس پانی سے نہیں چکھے گا۔ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (وہ میرا ساتھی ہوگا) میری ولایت کے اہل اور میرے دوستوں میں سے ہوگا۔ یہ طَعْم سے ہے جو ذَوق (ذائقہ) تک پہونچاتا ہے یعنی پانی کو نہیں چکھے گا طَعَام سے نہیں ہے،

اَلطَّعۡمَ (ذائقہ) پانی میں بھی پایا جاتا ہے اور کھانے میں بھی پایا جاتا ہے۔

اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةًۢ بِیَدِهٖ (الّا یہ کہ وہ اپنے ہاتھ میں ایک چلو پانی بھر لے) یعنی سوائے اس کے جو ایک مرتبہ اپنے ہاتھ میں پانی لے اور جس نے غُرۡفَةً کو ضمہ (پیش) کے ساتھ قرأت کی ہے اس کے لحاظ سے یہ معنی ہوں گے سوائے اس کے جو ہتھیلی بھر پانی پیے۔ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ (مگر تھوڑے سے گروہ کے سوا سب لوگ دریا سے سیراب ہوئے) یعنی سب نے ایک چلو سے زائد پانی پیا، ان میں بہت کم لوگوں کے علاوہ۔ کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ایک چلو پانی پیا تھا ان کی تعداد تین سو دس تھی۔ یہ حسن، قتادہ اور ایک جماعت سے مروی ہے۔ چار ہزار کے لیے بھی قول وارد ہوا ہے۔ چھیتر ہزار (۷۶۰۰۰) کی تعداد بھی بیان کی گئی ہے۔ تین ہزار چھ سو نوے (۳۶۹۰) کا قول بھی ہے۔ یہ سب سدی سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جنھوں نے (چلو بھر) پانی سے زیادہ استعمال کیا وہ پیاس میں مبتلا ہوئے، جنھوں نے فقط چلو بھر پیا وہ سیراب ہو گئے اور ان کی پیاس بجھ گئی۔ اس وقت طالوت کے ہمراہ گنہگار بھی تھے جنھوں نے ان کے ساتھ دریا کو عبور نہیں کیا۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ (پھر جب طالوت اور ان کے مومن ساتھی دریا پار کر کے آگے بڑھے) جب طالوت نے دریا کو عبور کیا تو مومنین ان کے ہمراہ تھے اور وہی ان کے ساتھی تھے۔ براء بن عازب، قتادہ اور حسن سے روایت کی گئی ہے کہ طالوت کے ساتھ فقط مومنین نے دریا سے عبور کیا تھا جن کی تعداد اہل بدر کے مانند (۳۱۳) تھی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مومنین اور کافر گزر رہے تھے مگر کافر علیحدہ ہو گئے تھے اور مومنین اہل بدر کی تعداد کے برابر باقی رہ گئے تھے۔ یہ ابن عباس اور سدی سے مروی ہے۔ یہی قول اقویٰ ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ جب انھوں نے جالوت کے لشکر کی کثرت دیکھی تو قَالُوۡا (ان میں سے کفار نے طالوت سے کہہ دیا: لَا طَاقَةَ لَنَا الۡیَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ (آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے) اس وقت مومنین نے کہا جن کی تعداد اہل بدر کے برابر تھی: كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِیۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹا گروہ اللہ کے اذن سے بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔) ابو القاسم بلخی نے کہا ہے: ممکن ہے سب کے سب مومنین ہوں مگر یہ کہ بعض کا یقین پختہ اور عقیدہ قوی ہو اور انھوں نے ہی کہا ہو كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ

(قَالَ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ) یعنی اللہ اور اس کے جزا کی طرف اور پلٹنے والے نے

کہا) بیان کیا گیا ہے کہ یَظُنُّوْنَ' میں تین اقوال ہیں:

اول: یَظُنُّوْنَ کے معنی یقین کرنے کے ہیں۔ یہ سدی کا قول ہے۔

دوم: یَظُنُّوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دل ہی دل میں باتیں کر رہے ہیں ظَنٌّ حقیقی معنیٰ یہی ہیں اس لیے کہ کسی چیز کے بارے میں دل ہی دل میں باتیں کرنا کبھی شک کے ساتھ ہوتا ہے، کبھی علم کے ہمراہ ہوتا ہے لیکن زیادہ تر پر شک کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

سوم: گمان کر رہے ہوں کہ وہ اس جنگ میں قتل ہو کر اللہ سے ملاقات کریں گے۔

کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً یعنی کتنے کم گروہ ہیں جو بہت سے گروہ پر غالب آجاتے ہیں۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ کی نصرت و مدد سے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے جب انھیں جنگ کی اجازت دی تو ان کی اسی صورت میں مدد کی جس میں انھیں اجازت دی۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یعنی اللہ صابروں کی ان کے دشمنوں پر مدد کرے گا۔

❀❀❀❀❀

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾
اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ پر آگئے تو انھوں نے دعا کی: اے ہمارے رَبّ! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ (۲۵۰)

الفاظ و معانی:

اَلْبُرُوْزُ کے حقیقی معنی اَلظُّهُوْر کے ہیں۔ اسی سے البراز (یعنی انسان کا رفع حاجت کے لیے صحرا کی طرف جانا) ہے۔ رَجُلٌ بَرَزٌ، اِمْرَاَةٌ بَرْزَةٌ یعنی باعفت اور صاحب شرف مرد اور پاکدامن اور باشرف عورت چونکہ ان صفات کا مرد و زن دونوں میں ظہور ہوتا ہے۔

اِلْاِفْرَاغ: کسی جگہ کے خالی ہونے کی وجہ سے اس میں سیال چیز کا انڈیلنا۔ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا (یعنی مادر موسیٰ کا قلب صبر سے خالی ہوگیا) اَلْفَرَاغ کے لغوی معنیٰ خالی ہونے کے ہیں۔

تَثْبِیْت: کسی چیز کو اس کی جگہ اور مقام پر اس کے لازمی ہونے کے سبب تمکن عطا کرنا (ثبات قدم عطا کرنا) رَجُلٌ ثَبْتُ الْمَقَامِ (اس مقام پر کہتے ہیں) جب بہادر انسان اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ رَجُلٌ ثُبتٌ یعنی انسان جس بات کی روایت کرتا ہے اس میں ثقہ (بھروسہ مند اور امین ہے۔

اَلنَّصر: دشمن کے مقابلہ میں مدد کرنا جو کئی طریقوں سے ہوسکتی ہے:

۱۔ قوت کی زیادتی کے ذریعہ۔

۲۔ دشمن کا سامنا ہونے پر دشمن کے اندر رعب و خوف پیدا کر کے، دشمن کے پوشیدہ ٹھکانوں سے مطلع کر کے، ان میں سے یہ کہ دشمن (اہل ایمان) کو بہت زیادہ خیال کرے۔ یہ کہ دشمنوں کے درمیان پھوٹ پڑ جائے اور وہ منتشر ہو جائیں۔ نصرت اور لطف کے درمیان یہ فرق ہے کہ اللہ کی طرف سے ہر نصرت لطف الٰہی ہے جبکہ ہر لطف نصرت نہیں ہے، اس لیے کہ لطف معصیت کے بدلے اطاعت کرنے پر حاصل ہوتا ہے جو کبھی نوافل کی اطاعت پر بھی حاصل ہوتا ہے جبکہ نصرت اللہ کا فعل ہے اور صبر بندے کا فعل ہے جس پر اسے جزا اور بدلہ دیا جاتا ہے اور یہ اس چیز پر ضبط نفس کرنا ہے جس میں فعل سے ٹکراؤ اور جھگڑا ہوتا ہے۔ یہ اس مقام پر جنگ میں فرار اختیار کرنے کے تنازعہ اور اختلاف سے ضبط نفس کرنا ہے۔ (یعنی میدان جنگ میں استقامت و پائیداری کا مظاہرہ کرنا ہے)

تفسیر:

دشمن پر کامیابی کی دعا

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ جب طالوت اور ان کے ہمراہ مومنین جالوت سے جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ یعنی طالوت اور ان کے ہمراہ مومنین جالوت سے جنگ کرنے کے لیے ظاہر و نمایاں ہوئے۔ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا (تو انھوں نے دعا کی: اے ہمارے رَبّ ہم پر صبر کا فیضان کر) یعنی ہم پر صبر انڈیل دے (ہمیں صبر فراواں عطا فرما) یعنی جہاد پر صبر کی توفیق عطا فرما: اللہ نے صبر عطا کرنے کی تشبیہ ظرف کے خالی کرنے سے دی ہے چونکہ یہ انتہا ہے اس چیز کی جس کی اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ جیسا کہ کوئی آخری چیز کسی ظرف میں ہوتی ہے۔ وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (اور ہمیں ثابت قدم رکھ) یعنی اس امر پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما وَانْصُرْنَا جہاد میں ہماری نصرت و مدد فرما۔ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ‘ (کافروں

کے خلاف) یعنی قوم جالوت کے مقابلہ میں۔

❀❀❀❀❀❀

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۱﴾

آخر کار اذن خداوندی سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد کو سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جو چاہا انھیں سکھا دیا۔ اگر اسی طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے (کہ وہ اس طرح رفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے) (۲۵۱)

قراءت:

ابوجعفر، نافع اور یعقوب نے دِفَاعُ اللهِ الف کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ حج میں بھی اسی طرح پڑھا ہے اور باقی قراء نے الف کے بغیر دَفْعُ اللهِ قرأت کی ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: دِفَاع کے سلسلہ میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ ہوسکتا ہے کہ وہ فعل کا مصدر ہو جیسے کِتَاب لِقَاء وغیرہ

۲۔ ہوسکتا ہے کہ فاعل کا مصدر یعنی حاصل مصدر ہو اور اس بات پر اس شخص کی قرأت دلالت کرتی ہے جس نے اِنَّ اللهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا پڑھا ہے اس طرح دَفَعَ اور دَافَعَ کے معنیٰ ایک ہیں جیسا کہ اس شعر میں بھی ہے:

وَ لَقَدْ حَرَصْتُ بِاَنْ اُدَافِعَ عَنْهُمْ　فَاِذَا الْمَنِيَّةُ اَقْبَلَتْ لَا تُدْفَعُ

گویا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں چاہ رہا تھا کہ موت کو ان سے دور کردوں حالانکہ موت کو ٹالا نہیں جاسکتا ہے۔

شاعر نے اُدَافِعُ کو اَدْفَعُ کی جگہ رکھا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو یَدْفَعُ اور یُدَافِعُ قریب المعنیٰ ہیں۔

الفاظ و معانی:

اَلْهَزْمَ: دفع کرنا اور شکست دینا۔ اس طرح کہا جاتا ہے: هَزَمَ الْقَوْمُ فِي الْحَرْبِ یعنی قوم نے جنگ میں شکست دے دی۔

اَلدَّفْعِ: کسی چیز سے موڑ دینا اور اس سے پلٹا دینا۔ اَلدِّفَاع: سیل۔

تفسیر:

جناب داؤدؑ کا عظیم کارنامہ

خداوند عالم نے واقعہ کا آخری حصہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: فَهَزَمُوْهُمْ (آخر کار (اذن خداوندی سے) انھوں نے کافروں کو مار بھگایا) اس مقام پر حذف ہونا لازمی ہے گویا جب ان لوگوں نے کہا: رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا (خدایا ہمیں صبر فراواں عطا فرما) تو اللہ نے فرمایا: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ فَهَزَمُوْهُمْ بِنَصْرِهٖ؛ ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی اور انھوں نے اللہ کی نصرت و مدد سے (جالوت کے لشکر کو) شکست دے دی یعنی انھیں دفع اور دور کر دیا اور انھیں توڑ ڈالا۔ نصرت و کمک کی دعا کے بعد ہزیمت (شکست) کا ذکر اس دعا کی قبولیت پر دلیل ہے۔ انھیں شکست دینے کے معنی ہیں کہ ان کی شکست کا سبب فراہم کیا یعنی انھوں نے وہ کام کیا جس کے سبب وہ شکست کھا گئے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ استعمال حقیقی ہے۔ ابوعلی الجبائی نے کہا ہے، یہ مجاز ہے اس لیے کہ انھوں نے جالوت کو شکست نہیں دی، جس طرح کہا جاتا ہے: اَخْرَجَهٗ مِنْ مَنْزِلِهٖ؛ اس نے اسے اپنے مکان سے نکال دیا، جب اسے نکلنے پر آمادہ کیا حالآں کہ اس نے اس کے نکلنے کو انجام نہیں دیا۔ پہلا قول صحیح ہے۔

ارشادِ الٰہی: بِاِذْنِ اللّٰهِ (اذن خداوندی سے) یعنی حکم خدا سے۔ کہا گیا ہے کہ علم خدا سے۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔

واقعہ

حضرت داؤدؑ کا واقعہ جس کی روایت علی بن ابراہیم بن ہاشم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح کی ہے کہ خداوند عالم نے ان لوگوں کے پیغمبر پر وحی فرمائی کہ جالوت کو وہ شخص قتل کرے گا جس کے (جسم پر) جناب موسیٰؑ کی ذرہ درست اور برابر ہوگی، وہ لاوی بن یعقوب کی اولاد سے ہوگا، اس کا نام داؤد بن ایشا چرواہا ہوگا۔ ایشاء کے دس فرزند تھے، جن میں سب سے چھوٹے داؤد تھے۔ جب خداوند عالم نے طالوت کو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا اور انھیں جالوت سے جنگ کے لیے جمع کیا تو ایشاء کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اپنے فرزندوں کو حاضر کریں۔ جب سب حاضر ہو گئے تو انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے بیٹوں کو بلایا اور موسیٰ کی ذرع پہنائی۔ ان میں سے کسی کے بڑی ہوتی اور کسی کے چھوٹی ہوتی تھی، ایشا سے کہا: تم نے اپنے کسی فرزند کو چھوڑ دیا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! وہ سب سے چھوٹا ہے جسے میں نے بھیڑوں کے پاس چھوڑ دیا ہے جو انھیں چرا رہا ہے۔ چنانچہ اسے بلایا گیا، وہ نزدیک آیا، اس کے پاس گوپھن تھی۔ (امامؑ نے فرمایا:) اسے تین پتھروں نے اس وقت آواز دی جب وہ راستہ میں تھا، اے داؤد! ہمیں لے لو! انھوں نے انھیں اٹھالیا، وہ پتھر فیروزہ تھا۔ داؤد بڑی ہمت وجرأت کے مالک اور شجاع، جسمانی اعتبار سے قوی تھے۔ جب وہ طالوت کے پاس آئے اور انھیں علیہ السلام موسیٰؑ کی ذرع پہنائی گئی جو ان پر بالکل درست آگئی۔ (امام علیہ السلام فرماتے ہیں:) داؤدؑ آئے اور جالوت کے سامنے کھڑے ہو گئے، جالوت ہاتھی پر سوار تھا، اس کے سر پر تاج، پیشانی پر یاقوت تھا جو چمک رہا تھا۔ اس کا لشکر اس کے سامنے تھا۔ داؤدؑ نے ان پتھروں میں سے ایک پتھر اٹھا کر جالوت کے دائیں طرف مارا جو (لشکر) والوں کو لگا، جس سے وہ شکست کھا گئے۔ دوسرا پتھر اٹھا کر جالوت کے بائیں طرف کے لشکر کو مارا وہ بھی شکست کھا گئے اور تیسرا پتھر جالوت کے مارا جو اس کی پیشانی پر یاقوت کے مقام پر لگا جو اس کے بھیجے تک پہونچ گیا اور وہ زمین پر مردہ حالت میں گر پڑا۔

بیان کیا گیا ہے کہ جالوت نے براز کو بلایا اس کی طرف داؤد بڑھے اور گوپھن سے اسے پتھر مارا جو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) لگا اور پیچھے سے نکل گیا جس سے اس کے لشکر کی بڑی تعداد قتل ہو گئی اور آخر تک شکست کھا گئی۔ یہ وہب اور دیگر مفسرین سے مروی ہے۔

وَآتَىٰهُ اللَّهُ الْمُلْكَ (اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد کو سلطنت سے نوازا) اور داؤد

کے جالوت کو قتل کرنے کے بعد سات برس تک کے لیے داؤد کو حکومت دے دی۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔

وَالْحِكْمَةَ (اور حکمت (سے نوازا)) کہا گیا ہے: نبوت عطا کی۔ جالوت کے قتل سے قبل (طالوت) نبی نہیں تھے۔ خدا نے ان کے لیے حکومت اور نبوت یک جا کر دی طالوت کی موت کے وقت ایک حالت میں۔ اس لیے کہ جو نبی نہ ہو اس کے لیے سرداری جائز نہیں ہے، چونکہ یہ چیز حکمت کے تقاضے کے برعکس ہے۔ اس لیے کہ نبی کا ظاہر و باطن بھروسہ مند اور قابل اطمینان ہوتا ہے، جو حق کے سوا کوئی خبر نہیں دیتا، فقط حق کی طرف بلاتا ہے، جو نبی نہیں ہوگا وہ ویسا نہیں ہوگا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ نبی حکم اور اس کے مشورے سے کام کرے۔

وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ (اور جو چاہا انھیں سکھا دیا) یعنی انھیں دینی امور کی تعلیم دی گئی اور جو کچھ دنیاوی امور سے چاہا اسے تعلیم دی منجملہ ذرہ سازی کا علم دیا، لوہا ان کے ہاتھوں میں موم بن جاتا تھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ (جناب داؤدؑ کو) زبور عطا کی، لوگوں کے درمیان حکم (فیصلے کرنے کا علم) عطا کیا، پرندوں اور چونٹیوں سے بات کرنے کا علم عطا کیا (بیان کیا گیا ہے) آپ کو اچھی آواز عطا کی۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ (اگر اسی طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا) بیان کیا گیا ہے کہ اس میں تین اقوال ہیں:

اول: اگر خداوند عالم مسلمانوں کے لشکروں کے ذریعہ کفار کو دفع نہ کرتا تو وہ غلبہ حاصل کر لیتے اور شہروں کو برباد کر دیتے۔ یہ ابن عباس و مجاہد سے مروی ہے۔

دوم: خداوند عالم نیک کے ذریعہ فاجر سے اسے ہلاکت کو دور کرتا ہے۔ یہ علی و قتادہ اور مفسرین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ اسی کے مانند وہ روایت ہے جس کی جمیل نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے: آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم ہمارے نمازی شیعوں کے ذریعہ بے نمازیوں کا دفاع فرماتا ہے، اگر سب کے سب نماز ترک کرنے پر یکجا ہو جاتے تو سب کے بس ہلاک ہو جاتے۔ خداوند عالم زکوٰۃ دینے والے شیعوں کے ذریعہ زکوٰۃ نہ دینے والوں سے دفاع کرتا ہے، اگر سب کے سب ترک زکوٰۃ پر جمع ہو جاتے تو یقیناً سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ خداوند عالم حج کرنے والے ہمارے شیعوں کے ذریعہ ان میں سے حج نہ کرنے والے شیعوں سے دفاع کرتا ہے، اگر سب کے سب ترک حج پر جمع ہو جاتے تو یقیناً سب کے سب ہلاک

ہو جاتے۔

اسی معنی سے نزدیک وہ روایت ہے جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا گیا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے: اگر بندگان خدا رکوع نہ بجالاتے (مراد نماز ہے) بچوں کو شیر نہیں دیا جاتا اور جانوروں کو چارہ نہیں چرایا جاتا تو تم پر عذاب نازل ہونے کی طرح نازل ہوتا۔

اور جابر بن عبداللہ انصاری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم مسلمان مرد کی اچھائی اور نیکی کے سبب اس کے فرزند پھر فرزند کے فرزند اور فرزند کے فرزند کی اصلاح فرماتا ہے اور اہل خانہ کی اچھائی اور نیکی کے سبب اس کے اطراف کے گھروں کی اصلاح فرماتا ہے، اسی طرح وہ خدا کی حفظ وامان میں رہیں گے جب تک کہ وہ اس جگہ پر موجود ہیں۔

سوم: حسن کے قول میں یہ بات ہے کہ خداوند عالم سلطان (بادشاہ) کے ذریعہ جس چیز کو روکتا ہے وہ قرآن کے ذریعہ روکنے کی نسبت زیادہ ہے کہ اس لیے کہ جو (شخص) سلطان کے خوف سے برائیوں سے رکتا ہے وہ قرآن میں موجود وعدوعید کے ذریعہ رکنے کی نسبت بیشتر ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے (کہ وہ اس طرح رفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)) یعنی دین اور دنیا میں ان پر نعمت عطا کرنے والا ہے۔

❀❀❀❀❀

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾
یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم آپ کو حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔ (۲۵۲)

الفاظ ومعانی:

اَلتِّلَاوَۃ: کسی فاصلہ کے بغیر کلمہ کے بعد کلمہ کا ذکر کرنا۔

اَلْحَقّ: کسی چیز کا اپنے موقع ومحل میں اس میں کسی ناجائز تغیر کے بغیر واقع ہونا۔

اَلرِّسَالَۃ: جس کو بتانا مقصود ہے اس تک کوئی ایسی بات لے جانا جس کا کوئی فائدہ ہو۔

ترکیب:

نَتۡلُوۡهَا یہ جملہ مقام حال میں ہے اور اس میں عامل تِلۡكَ کے معنیٰ اشارہ ہے اور ذوالحال آیَاتُ اللّٰہِ ہے یعنی اس حالت میں کہ تم پر آیَاتُ اللّٰہِ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ بِالۡحَقِّ میں باء نَتۡلُوۡ سے متعلق ہے۔

تفسیر:

آیاتِ الٰہیہ

تِلۡكَ (یہ) ہزاروں لوگوں کو ایک دفعہ اسی میں مار دینے کی طرف اشارہ ہے، جس کا بیان سابق میں گذر چکا ہے اور اسی طرح انھیں ایک ہی مرتبہ میں ان کے پیغمبر کی دعا سے زندہ کو اور طالوت کو بادشاہ بنانا جبکہ وہ گمنام اور غیر مشہور انسان تھے کہ لوگ ان جیسوں کی اطاعت نہیں کرتے ہیں۔ جب خداوند عالم نے ان کے لیے علم کو اپنی نشانی قرار دیا، انھیں حکومت عطا کی، طالوت کے ساتھیوں کی ان کی قلت اور کمزوری کے باوجود جالوت اور اس کے ساتھیوں پر ان کی قوت اور شوکت کے باوجود نصرت و مدد فرمائی۔

آيٰتُ اللّٰہِ (اللہ کی آیات ہیں) یعنی اللہ کی قدرت پر دلائل ہیں۔ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ (جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں) اے محمدؐ! ہم آپ کے سامنے انھیں بیان کرتے ہیں بِالۡحَقِّ اور سچائی کے ساتھ۔ بیان کیا گیا ہے (ان آیتوں کو) آپ پر جبرئیلؑ پڑھتے ہیں۔

بِالۡحَقِّ ہمارے امر سے وَاِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ یعنی آپ مرسلین میں سے ہیں، جس پر ان آیتوں کے بارے میں آپ کا خبر دینا دلالت کر رہا ہے باوجودیکہ آپؐ نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا، نہ ہی آپ ان کے ساتھ تھے۔ مشاہدہ نہ کرنے اور اس کے درمیان نہ رہنے کے سبب آپ ان سے واقف نہیں ہو سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ کی وحی کے ذریعہ اور اللہ اپنے پیغمبروں کے علاوہ کسی اور پر وحی نہیں کرتا ہے۔

❀❀❀❀❀

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

یہ رسول وہ ہیں جنھیں ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے، ان میں کوئی ایسا تھا اللہ نے جس سے کلام کیا، اور اُن میں سے کچھ کو اس نے بلند درجات عطا کیے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح القدس سے اُن کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے آنے کے بعد جن لوگوں کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں وہ آپس میں لڑتے۔ انھوں نے باہم اختلاف کیا پھر اُن میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر اختیار کیا۔ ہاں، اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ (۲۵۳)

ترکیب:

دَرَجٰتٍ بر بنائے حال منصوب ہے اور اس میں عامل رَفَعَ ہے اور ذوالحال بَعْضَهُمْ ہے اور گویا اس طرح ہے: رَفَعَ بَعْضَهُمْ ذَوِيْ دَرَجَاتٍ مضاف (ذَوِي) کو حذف کر دیا ہے اور یہ فعل سے فارغ ہونے کے بعد حال بھی ہوسکتا ہے اس وقت تقدیر یہ ہوگی: وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ فَاِذَا هُمْ ذُوُوْ دَرَجَاتٍ۔ دَرَجَاتٍ ظرف مکان بھی ہوسکتا ہے اور ایک ایسا اسم بھی ہوسکتا ہے جسے (مفعول مطلق) کی جگہ رکھ دیا ہے۔ گویا اس طرح وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ رَفْعاً۔

تفسیر:

انبیاء کی ایک دوسرے پر برتری

تِلْكَ، اُولٰٓئِكَ (یعنی یہ سب) کے معنی میں ہے البتہ فرق یہ ہے کہ اس کے ذریعہ جماعت کی طرف

اشارہ مراد ہے۔لفظ مفرد لایا گیا ہے جو واحد مؤنث کے لیے ہے۔اس طرح کہا جاتا ہے: اَلْقَوْمُ خَرَجَتْ (یعنی قوم خارج ہوئی) اَلرُّسُلُ یہ وہ سب انبیا ہیں جن کا ذکر کتاب میں گذر چکا ہے۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (جنھیں ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے) اللہ نے بعض پیغمبروں کی بعض (پیغمبروں) پر کچھ امور میں فضیلت بیان کی ہے:

اول: تا کہ غلطی میں مبتلا ہونے والے تمام انبیا کو فضیلت میں برابر قرار نہ دے دیں جس طرح رسالت میں برابر ہوتے ہیں۔

دوم: تا کہ وضاحت کردی جائے کہ محمد ﷺ کی تمام انبیاء (علیہم السلام) پر فضیلت سابقہ انبیا کی بعض کی بعض پر فضیلت کے مانند ہے۔

سوم: فضیلت کبھی فریضہ کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔اس مقام پر مذکورہ فضیلت وہ ہے جس سے انبیاء میں سے ہر ایک نبی منازل جلیلہ سے مخصوص ہے؛ جس طرح جناب موسیٰؑ سے کسی سفیر کے واسطہ کے بغیر اللہ کا گفتگو کرنا اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام جن وانس کی طرف بھیجنا۔کہا گیا ہے کہ آخرت کی فضیلت مراد ہے اس لئے کہ انسان کی ایک دوسرے پر برتری اعمال اور گراں قدر ذمہ داریاں اٹھانے کی بنا پر ہے۔بیان کیا گیا ہے کہ یہ برتری شرائع کے سبب ہے کہ ان میں سے بعض صاحب شریعت پیغمبر ہیں، بعض صاحب شریعت نہیں ہیں۔فضیلت کی بنا پر ابتدا اور ذاتی رجحان کے درمیان فرق یہ ہے کہ کسی کو اپنی خواہش کے مطابق کسی فائدہ سے مخصوص کرنا مصلحت کے بغیر۔لیکن فضیلت کی بنا پر آغاز میں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ فضیلت کبھی مصلحت کے سبب ہوتی ہے، اگر مصلحت نہیں ہوتی تو تدبیر فاسد ہوجاتی اور ہر ایک کے لیے ثواب سے محرومی کا سبب قرار پاتی۔لہٰذا اس انسان کے لیے حسن نظر اس پر غیر کو فضیلت دینا ہے، جب اس میں اس کے لیے مصلحت ہو۔اس وجہ (صورت) کا حکمت تقاضا کرتی ہے یہ پہلی وجہ کے مانند نہیں ہے جس کی جانب شہوت اور ذاتی چاہت کی دعوت دیتی ہے۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (ان میں کوئی ایسا تھا اللہ نے جس سے کلام کیا) یعنی جس سے اللہ نے کلام کیا وہ جناب موسیٰؑ ہیں۔ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (اور اُن میں سے کچھ کو اس نے بلند درجات عطا کیے۔) مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔اللہ نے آپؐ کو تمام انبیاء پر برتری عطا فرمائی اور آپؐ کو جن وانس میں سے تمام انسانوں کی جانب مبعوث کیا۔آپؐ کو وہ تمام آیات اور نشانیاں عطا کی جو آپؐ سے قبل

انبیا کو عطا کی تھیں اور صرف آپ کو ہی قرآن عطا کیا جو آپ کے سوا کسی کو عطا نہیں کیا، جو قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے بقیہ تمام معجزات کے برخلاف۔ اس لیے کہ وہ معجزات گذر چکے اور ان کا زمانہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ آپ کو خاتم النبیین قرار دیا، حکمت کا تقاضا تھا کہ اشرف ترین رسول کو عظیم اور اہم ترین امور کے لیے بعد میں بھیجا جائے۔

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں) یعنی ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات دیئے جیسے اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا بخشنا اور مردوں کو زندہ کرنا اور لوگ کیا کھاتے ہیں اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہیں اس بارے میں خبر دینا۔ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (اور روح القدس سے اُن کی مدد کی) اس کی تفسیر اسی سورہ کی آیت نمبر پچاسی (۸۵) میں گذر چکی ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ (اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے آنے کے بعد جن لوگوں کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں وہ آپس میں لڑتے) قتادہ اور ربیع نے کہا ہے کہ جناب موسیٰ اور جناب عیسیٰؑ کے بعد جمع کی لفظ لائی گئی ہے اس لیے کہ دونوں کا ذکر ان دونوں کے پیروکاروں کے ذکر سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیتا ہے اس فقرہ سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ انبیاء کے آنے کے بعد جھگڑا نہ کرتے کہ انھیں ایمان کی طرف مائل کر دیتا اور کفر سے روک دیتا مگر اللہ نے انھیں اس کی جانب مائل نہیں کیا اس لیے کہ کسی چیز کو جبراً منوانے اور لوگوں کو کسی چیز پر مائل کر کے مکلف بنانا حسن نہیں ہے۔ اسی طرح جزا اور انعام اسی وقت اچھی چیز ہے جب لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور انھیں اختیار دے دیا جائے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو انھیں جنگ کا حکم نہ دیتا۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (جن کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں) حجت و دلیل کے واضح ہو جانے کے بعد اس لیے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد قتال سے قبل ایمان لانے والوں کے ایمان کے ذریعہ حاصل ہو گیا ہے۔ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ (انھوں نے باہم اختلاف کیا پھر ان میں سے کوئی ایمان لایا) توفیق الٰہی، لطف خداوندی اور اپنے حسن اختیار سے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ (اور کسی نے کفر اختیار کیا) اپنے غلط اختیار کے سبب۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا (ہاں، اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے) خداوند عالم نے تاکید اور تنبیہ کی خاطر اس فقرہ کی تکرار کی ہے۔ بیان کیا گیا ہے پہلا فقرہ اکراہ (اجبار) کی مشیت ہے یعنی اگر اللہ چاہتا تو انھیں

اس حالت میں مجبور کرتا جس سے فرائض برطرف ہوجاتے، دوسرا (فقرہ) مومنین کو قتال سے روکنے کا حکم ہے۔
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (مگر اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے) یعنی اللہ اپنی مصلحت اور حکمت کے مطابق عمل انجام دیتا ہے۔

❀❀❀❀❀

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾
اے ایمان لانے والو! جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ ہی سفارش چلے گی اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ (۲۵۴)

قرائت:

ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ سب کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ ابراہیم میں لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ اور سورۂ طٰہٰ میں لَا لَغْوَ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمَ قرأت کی ہے حالانکہ بقیہ قراء نے سب کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن حضرات نے بغیر تنوین کے فتحہ دیا ہے انہوں نے اس آیت کو اس سوال کا جواب قرار دیا ہے: هَلْ فِيْهَا مِنْ لَغْوٍ اَوْ تَاْثِيْمٍ اور جن افراد نے رفع دیا ہے انہوں نے اس سوال کا جواب قرار دیا ہے: اَفِيْهَا لَغْوٌ اَوْ تَاْثِيْمٌ۔ اور ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ابتدائی حصہ نفی پر دلالت کر رہا ہے اور دونوں قرأتوں کے معنی قریب قریب ہیں کہ اس نفی سے مراد عمومیت کثرت ہے دونوں قرأتوں میں اور اس بات پر امیہ کا یہ شعر دلالت کرتا ہے:

فَلَا لَغْوٌ وَلَا تَاْثِيْمَ فِيْهَا

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ شاعر نے لغو اگرچہ اس کو رفع دیا ہے لیکن نفی سے وہی ارادہ کیا ہے جو تَاْثِيْمَ کی نفی

سے کیا ہے کہ جس کو بغیر تنوین کے فتحہ دیا ہے اور اگر آپ نے فِيهَا کو خبر قرار دیا ہے تو لَا لَغْوٌ کے لئے خبر کو پوشیدہ ماننا پڑے گا اور اگر اسے صفت قرار دیا ہے تو پھر دونوں اسموں میں سے ہر ایک کے لئے خبر کو پوشیدہ ماننا پڑے گا۔

الفاظ ومعانی:

اَلْبَيْع: کسی چیز کو قیمت کے ذریعہ ردوبدل کرنا۔ بَيْع '(فروخت کرنا) شِرَاء '(خریدنا) کی ضد ہے۔ اسی طرح (بَيْع) بھی (شِرَاء) ہے اس لیے کہ کبھی تو قیمت کے ذریعہ ردوبدل ہوتی ہے اور کبھی متاع (پونجی) کے ردوبدل ہوتا ہے۔

اَلْخُلَّة: خالص محبت۔ اَلْخَلِيْل: خالص محبت کرنے والا۔ یہ خُلَّة سے مشتق ہے چونکہ دونوں کے درمیان اسرار ورموز واقع ہوتے ہیں۔

تفسیر:

فرصت نکل جانے سے پہلے انفاق

خداوند عالم سابقہ امتوں کی خبریں بیان کرنے اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنے کے بعد اطاعت پر ترغیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (اے ایمان لانے والو!) یعنی جنھوں نے محمدؐ کی تصدیق کی جس چیز کو وہ لیکر آئے۔ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ (جو کچھ مال ومتاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو) بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زکوۃ اور اسی کے مانند فرض مراد ہے نہ کہ مستحب۔ اس لیے کہ اس سے وعید (دھمکی) وابستہ ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے اور بظاہر امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں مستحب وفرض دونوں شامل ہیں۔ یہ ابن جریح سے مروی ہے۔ اسی تفسیر کو بلخی نے اختیار کیا ہے اور یہی قول اقویٰ ہے، اس لیے کہ عام ہے۔ آیت میں ترک نفقہ پر وعدۂ عذاب نہیں ہے بلکہ اس میں قیامت کے ہولناک حالات اور اس کی سختیوں سے بڑا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ (قبل اس کے کہ وہ دن (روز قیامت) آئے) لَا بَيْعٌ فِيهِ (جس میں نہ خرید وفروخت (تجارت) ہوگی، وَلَا خُلَّةٌ (اور نہ دوستی اور محبت کام آئے گی) اس لیے کہ لوگ گناہوں اور معصیت کے سبب (ایک دوسرے کے) دشمن ہوجائیں گے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کا اپنے آپ میں

مشغول ہوجانا ہی انھیں دوسروں سے دوستی کرنے سے روک دیا گا، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (سورۂ زخرف، آیت ۶۷؛ آج کے دن صاحبانِ تقویٰ کے علاوہ تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے)

وَلَا شَفَاعَةٌ (اور نہ ہی سفارش چلے گی) غیر مومنین کے لیے تو مطلق (شفاعت نہیں ہوگی) البتہ مومنین بعض بعض کی شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت انبیاء کریں گے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (سورۂ انبیاء، آیت ۲۸؛ اور فرشتے کسی کی سفارش بھی نہیں کرسکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے) مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۵؛ کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرسکے) وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں) اللہ نے ظلم کے سبب کافر کی مذمت فرمائی ہے اگرچہ کفر ظلم سے بڑا (ظلم) ہے تو دو باتوں کے سبب:

اول: یہ بتانے کے لئے کہ کافر آتش جہنم میں ہمیشہ رہنے کے سبب خود کو ضرر و نقصان پہونچائے گا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

دوم: یہ کہ جب اس نے روز قیامت بیع، دوستی اور شفاعت کی نفی کی ہے اور خبر دی ہے کہ کافر کو ان امور سے محروم کر دیا ہے تو ارشاد فرمایا: یہ ہماری جانب سے ظلم نہیں ہے بلکہ کافر ہی ظالم ہیں اس لیے کہ انھوں نے خود وہ عمل انجام دیا ہے جس سے وہ ان امور سے محرومیت کے شکار ہوگئے ہیں۔ کافر کو ظلم کرنا اور اسی کو ظالم کہنا اور وہی کافر کا ظلم ہے تو اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے وہ یہ کہ کافر کا ظلم انتہائی درجہ کا ظلم ہے، کہ یہ ظلم جو مومنین اور دیگر افراد کے اپنے ظلم کے برابر نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ قائل کا قول ہے: فلاں شخص فقیہ شہر ہے اور فلاں شخص فاضل ہے، اس طرح وہ اسے دوسروں پر مقدم کرنا چاہتا ہے اس چیز میں جسکی جانب اس کی نسبت دی گئی ہے۔

❁❁❁❁❁

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ وہ زندہ جاوید ہے اور تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ نہ اسے نیند آتی ہے اور نہ اونگھ۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پسِ پشت ہے وہ اُن سب سے واقف ہے۔ یہ لوگ اس کے علم کے ایک حصّے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، الّا یہ کہ وہ خود ہی کسی چیز کا علم دینا چاہے۔ اس کی کرسی علم و اقتدار زمین و آسمان سے وسیع تر ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں وہ عالی مَرتبت بھی ہے اور صَاحِبِ عظمت بھی۔ (۲۵۵)

فضیلت آیت:

ابن انجویہ الفسوی نے کتاب (الترغیب) میں سند متصل کے ذریعہ ابیؑ بن کعب سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوالمنذر کتاب الٰہی میں سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ابوالمنذر کہتے ہیں: رسولؐ خدا نے میرے سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا: تمھیں علم مبارک ہو! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں مجھ محمد کی جان ہے اس آیت کی زبان اور دو ہونٹ ہیں، ساق عرش پر فرشتہ (اللہ) کی پاکیزگی بیان کرتا ہے۔

ثعلبی نے اپنی سند سے عبداللہ بن عمر سے روایت کی کہ وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص ہر فریضۂ نماز کے بعد 'آیت الکرسی' کی تلاوت کرے گا اس کی روح ذُوالۡجَلَالِ وَ الۡاِکۡرَام (خدا) قبض فرمائے گا۔ وہ اس طرح ہوگا جیسے اس نے خدا کے انبیاء (علیہم السلام) کے ہمراہ جہاد کیا

ہو اور درجۂ شہادت پر فائز ہوا ہو۔

انھیں (عبداللہ بن عمر) کی سند سے حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: میں نے تمھارے پیغمبر کو منبر سے یہ فرماتے سنا: جو شخص ہر فریضۂ نماز کے بعد آیۃ الکرسی کی تلاوت کرے گا موت کے علاوہ اسے کوئی جنت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا، دوست اور عابد کے سوا اس کی کوئی پابندی نہیں کر سکتا جو شخص اس کی تلاوت کرے گا جب اس کا وقت مرگ آئے گا تو اللہ اس کے نفس کو امان عطا کرے گا۔ (اسی طرح) اس کے ہمسایہ اور ہمسایہ کے ہمسایہ کو بھی امان (سکون) عطا کرے گا۔

امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا: اے علی! سید البشر آدم ہیں، اور سید العرب محمدؐ ہیں یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے، سید الفرس سلمان فارسی، سید روم صہیب، سید الحبشہ بلال، سید الجبال (کوہ) طور، سید الشجر السدر (درخت بیری) سید الشہور حرمت والے مہینے ہیں، سید الایام روز جمعہ، سید الکلام قرآن، سید القرآن سورۃ البقرہ، سید البقرہ آیت الکرسی ہے، اے علی! آیت الکرسی میں پچاس (ایسے) کلمات ہیں جن کے ہر کلمہ میں پچاس برکتیں ہیں۔

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے جس نے ہر شب گھر میں سورۃ البقرۃ کی دس آیتوں کی تلاوت کی صبح ہونے تک اس گھر میں شیطان داخل نہیں ہو سکتا، جس کی چار ابتدائی آیتیں اور آیت الکرسی اور دو آیتیں آیت الکرسی کے بعد اور ان کا اختتام ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: جو شخص آیت الکرسی کی تلاوت ایک مرتبہ کرتا ہے۔ خداوند عالم اس سے دنیا کی ہزار دشواریوں اور ناگواریوں کو دور کر دیتا ہے اور آخرت کی ایک ہزار تکالیف کو دور کر دیتا ہے اور دنیا کی آسان ترین دشواری اور ناگواری فقر ہے اور آخرت کی آسان ترین دشواری اور ناگواری عذاب قبر ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: ہر شے کا نمایاں ہوتا ہے اور قرآن کا نمایاں شے آیت الکرسی ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْحَیُّ: وہ ذات جو اس صفت کے ساتھ ہو اس کے ساتھ اس کا قادر و عالم ہونا محال و ناممکن نہ ہو۔ اگر

آپ چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ ذات ہے جو اس صفت سے متصف ہے کہ جس کی وجہ سے تمام مدرکات (جن اشیا کا ادراک کیا جا سکتا ہے) کا درک کرنا واجب ولازم ہے اگر وہ اشیاء موجود ہوں۔

اَلسِّنَۃ: خفیف اور معمولی نیند کے ہیں جو اونگھ۔ مفضل نے کہا ہے اَلسِّنَۃ (اونگھ) کا تعلق سر سے ہے اور اَلنَّوم (نیند) قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ نَوم، یَقظَہ کی ضد ہے۔

لیث نے بیان کیا ہے ہر وہ ذات جو کسی شئے کو گھیرے اس کا احاطہ کرلے یا اس کا علم اس کی انتہا تک پہونچ جائے وہ اس کا احاطہ کر لیتی ہے تو اسے وَسِعَ فُلَانٌ الشَّیءَ کہتے ہیں۔

ترکیب:

لفظ جلالہ اللہُ مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر اور اس کے بعد خبر ہے اور کلام کا مخرج نفی کا مخرج ہے یعنی لَا یَصلُحُ اِلٰہٌ سِوَی اللہ اور اس کی حقیقت ایک خدا کے اثبات کی ہے۔ وہ اللہ ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: اَللہُ ھُوَ الاِلٰہُ دُونَ غَیرِہٖ. لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ میں ھُوَ دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے مرفوع ہے:

۱۔ مبتدا ہونے کی بنا پر گویا اس طرح فرمایا ہے: مَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔

۲۔ بدل ہو سکتا ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: مَا اِلٰہٌ ثَابِتاً اَو مَوجُودًا اِلَّا اللہُ عربی زبان میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ میں لفظ جلالہ اللہؔ کو بر بنائے استثناء نصب دینا بھی جائز ہے۔

تفسیر:

اللہ کے صفات

خداوند عالم نے امتوں کا ذکر اور توحید وغیرہ میں کے سلسلہ میں انبیاء سے ان کے اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد توحید کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَللہُ اے وہ ذات جسے عبادت کا حق حاصل ہے، اس لئے کہ وہ نعمتوں کی اصل پر قدرت رکھتا ہے۔ ہم لفظ جلالہ اللہ اس کی اصل اور اس کے معنی کے سلسلہ میں اختلاف واقوال کو سورۃ فاتحہ کے آغاز میں ذکر کر چکے ہیں۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے) یعنی کسی ایک کو بھی عبادت کا حق حاصل نہیں ہے، نہ ہی اس کے سوا کوئی الوہیت کا حقدار ہے۔ اَلحَیُّ (وہ زندہ جاوید ہے) ہم اس کے معنی بیان کر چکے ہیں۔

اَلْقَیُّوْمُ (اور تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے) جو اپنی مخلوق کی تدبیر پر قائم ہے کہ انھیں خلق کرتا ہے اور ان تک روزی پہونچاتا ہے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یہ قتادہ سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اَلْقَیُّوْمُ جو امور کا عالم اور ان سے واقف ہے جیسا کہ عربوں کا محاورہ ہے: هٰذَا يَقُوْمُ بِهٰذَا الْكِتَابِ یعنی جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے یہ اس سے واقف ہے۔ایک قول یہ بھی ہے اس کے معنی دائمی وجود کے ہیں۔ یہ سعید بن جبیر اور ضحاک سے مروی ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ ہر نفس کے لیے جو اس نے کسب کیا ہے (کمایا ہے) اس کا قائم رکھنے والا ہے یہاں تک کہ وہ اسے اپنے علم کے مطابق جزا دے گا اس بنا پر کہ وہ اس کا عالم اور واقف ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔لفظ قَیُّوْم ان میں تمام معانی میں ہوسکتا ہے۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ (نہ اسے اونگھ آتی ہے) وَلَا نَوْمٌ (نہ نیند آتی ہے) (ایسی ثقیل نیند) جو قوت کو زائل کردے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہوتا، نہ ہی اس پر سہو طاری ہوتا ہے، جس طرح غافل سے کہا جاتا ہے: اَنْتَ نَائِمٌ وَسَنَان یعنی تم سو رہے ہو اور اونگھ رہے ہو۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے) یعنی زمین و آسمان میں اس کی حکومت واقتدار ہے اور ایسے ان دونوں میں حق تصرف حاصل ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے) یہ استفہام ہے مگر نفی اور انکار ہے یعنی قیامت کے دن کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرے گا سوائے (اللہ) کے حکم اور اجازت کے۔ مشرکین کا گمان تھا کہ بت ان کی شفاعت کریں گے تو خداوند عالم نے انھیں باخبر کردیا ہے کہ جس کسی کو حق شفاعت حاصل ہوگا وہ کسی کی شفاعت نہیں کرے گا مگر اللہ کی اجازت اور اس کے حکم سے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پسِ پشت ہے وہ اُن سب سے واقف ہے) اس میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ یعنی جو کچھ دنیا میں سے گذر چکا ہے اور جو کچھ ان کے بعد آخرت میں آنے والا ہے (اللہ اس سے واقف ہے) یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے۔

دوم: اللہ سبحانہ اس غیب کو بھی جانتا ہے جو ان لوگوں سے پہلے تھا، آپ کا یہ کہنا بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی

اس کے سامنے اور جو گذر چکا وہ چیز کا قدامہ ہے اس جملہ کو اسی معنیٰ پر حمل کیا جائے گا، نہ یہ کہ یہ لفظ ماضی میں حقیقت ہے۔ وَمَا خَلْفَهُمْ یعنی وہ غیب جو ان لوگوں کے بعد آئے گا۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔

سوم: مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ یعنی جو آئی نہیں ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ رَمَضَانُ بَيْنَ أَيْدِينَا؛ رمضان ہمارے سامنے ہے۔ وَمَا خَلْفَهُمْ گذشتہ مراد ہے جس طرح شوال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قد خلفنا رمضان؛ رمضان ہمارے پیچھے ہے۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ (یہ لوگ اس کے علم کے ایک حصے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے) من علمہ یعنی اس کے معلوم میں سے ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا عِلْمَكَ فِينَا یعنی ہمارے بارے میں تو جو جانتا ہے، (بخش دے) جب کوئی آیت اور نشانی ظاہر ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے: هٰذِهِ قُدْرَةُ اللّٰهِ ؛ یہ اللہ کی قدرت ہے یعنی اللہ کا مقدور ہے اور کسی چیز کا علم کے ذریعہ احاطہ کرنا یہ ہے کہ وہ اس چیز کو جانتا ہے جو وہ حقیقت میں ہے۔ إِلَّا بِمَا شَآءَ (الا یہ کہ وہ خود ہی کسی چیز کا علم دینا چاہے) یعنی جس کو وہ ان کے علم میں لانا چاہے اور انھیں اس پر مطلع کرنا ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ (اس کی کرسی علم و اقتدار زمین و آسمان سے وسیع تر ہے) اس فقرہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

اول: اس کا علم آسمانوں اور زمین پر وسیع ہے۔ یہ ابن عباس و مجاہد سے مروی ہے۔ اور اسی کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے۔ علماء کو كَرَاسِي (کرسیاں) کہا جاتا ہے جیسا کہ انھیں أَوْتَادُ الْأَرْضِ (زمیں کی میخیں) کہا جاتا ہے اس لیے کہ انھیں کے سبب دین و دنیا کا قوام (بقا اور ثبات) ہے۔

دوم: اس مقام پر کرسی سے مراد عرش ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ عرش کو کرسی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عرش کا بعض حصہ کرسی کے بعض حصہ مرکب ہے۔

سوم: اس مقام پر کرسی سے مراد ملک، سلطنت اور قدرت ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: اِجْعَلْ لِهٰذَا الْحَائِطِ كُرْسِيًّا: اس دیوار کے لئے ایک کرسی قرار دو یعنی اس کے لئے ایک ایسا ستون بناؤ جس پر قائم ہو، گرنے نہ پائے، نہ ہی اس میں جھکاؤ پیدا ہو پس وَسِعَ كُرْسِيُّهُ ۔۔۔ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قدرت آسمانوں اور زمین اور جو کچھ دونوں کے درمیان موجود ہے کو محیط ہے سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں)۔

چہارم: کرسی سریر (تخت) ہے نہ کہ عرش۔ اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی

ہے۔اسی سے نزدیک عطا کا قول بھی ہے کہ آسمان اور زمین کرسی کی نسبت اس طرح ہیں جیسے بیابان صحرا میں انگوٹھی کا حلقہ اور کرسی عرش کی نسبت ایسے ہے جیسے (انگوٹھی) کا حلقہ بیابان صحرا میں۔بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آسمان اور زمین سب کچھ کرسی پر ہیں، کرسی عرش کے نیچے ہے جس طرح عرش آسمان کے اوپر ہے۔

اصبغ بن نباتہ سے روایت ہے کہ علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: آسمان وزمین اور جو کچھ دونوں کے درمیان ہے سب مخلوق ہیں کرسی کے اندر داخل ہے، اس کے لیے چار فرشتے ہیں جسے وہ اذن خدا سے اٹھائے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک فرشتہ انسانی صورت میں ہے جو اللہ کے نزدیک محترم ترین صورت ہے وہ اللہ سے دعا کرتا ہے اور اس کے حضور تضرع (گریہ وزاری) کرتا ہے اور طلب شفاعت کرتا ہے اور انسانوں کے لیے رزق طلب کرتا ہے۔دوسرا فرشتہ بیل کی شکل میں ہے جو چوپاؤں کا سردار ہے جو اللہ سے دعا کرتا ہے، اس کے حضور گریہ وزاری کرتا ہے، شفاعت طلب کرتا ہے اور چوپاؤں کے لیے رزق طلب کرتا ہے۔تیسرا فرشتہ باز کی صورت میں ہے جو پرندوں کا سردار ہے، اللہ سے دعا کرتا ہے اور اس کے حضور گریہ وزاری کرتا ہے، اللہ سے شفاعت طلب کرتا ہے اور تمام پرندوں کے لیے رزق طلب کرتا ہے۔چوتھا فرشتہ شیر کی شکل میں ہے وہ درندوں کا سردار ہے، اللہ سے دعا کرتا ہے، اس کے حضور گریہ وزاری کرتا ہے اور شفاعت طلب کرتا ہے اور تمام درندوں کے لیے رزق طلب کرتا ہے۔(امام علیہ السلام نے) فرمایا: تمام شکلوں میں بیل سے اچھی شکل و صورت نہیں ہے، نہ ہی اس سے زیادہ سیدھا کوئی دوسرا جانور ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے بچھڑا بنایا اور اس کی پرستش کی۔تو بیل کی شکل میں موجود فرشتہ نے شرم وحیا کے سبب اللہ کے سامنے سر جھکا لیا کہ لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے جانور کی پرستش کی جو اس کے مشابہ ہے اور وہ خوف زدہ ہوا کہ کہیں اس کے سبب اللہ اس پر عذاب نہ نازل کردے۔

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا (اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں) یعنی اللہ پر زمین و آسمان کی حفاظت نہ تو شاق ہے، نہ ہی گراں اور دشوار ہے۔بیان کیا گیا ہے کہ يَئُودُهُ کی ضمیرہ كُرْسِيّ کی طرف پلٹ رہی ہے۔یہ اس کے قول کے مطابق ہے جس کا کہنا ہے آسمان وزمین کرسی پر ہیں۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ (وہ عالی مرتبت بھی ہے) اللہ کی ذات اشباہ (مانند اور مشابہ) اور اضداد اور امثال سے بلند و بالا ہے (اسی طرح) نقص کی علامتوں اور حدث کی دلالتوں سے بلند و بالا ہے۔بیان کیا گیا ہے کہ عَلِيّ یہ عُلُو سے مشتق ہے جس کے معنی قدرت، سلطانت اور ملک قہر (وغلبہ) بلندی وجلالت و کبریائی میں

بلند شان والا ہے۔ اَلْعَظِیْمُ (اور صاحبِ عظمت بھی) یعنی عظیم الشان ہے، ایسا قادر ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی، وہ ایسا عالم اور جاننے والے ہیں جس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں، نہ تو اس کی قدرت کی انتہا ہے، نہ ہی اس کی معلومات کی کوئی حد ہے۔علی بن ابراہیم نے اپنے والد کے واسطہ سے حسین بن خالد سے روایت کی انھوں نے بیان کیا کہ ابوالحسن الرضا علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں اس طرح فرمایا: اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَ تَحْتَ الثَّرٰی عَالِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

اہل بصرہ کے نزدیک یہ دو آیتیں ہیں اور غیر بصری کے نزدیک ایک آیت ہے۔اہل بصرہ نے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کو آیت شمار کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾
دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہوچکی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا تو گویا وہ اُس مضبوط رسی سے مُتمسّک ہوگیا ہے جس کے ٹوٹنے کا امکان باقی نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔(۲۵۶)

الفاظ ومعانی:

اَلرُّشْد (ہدایت) اَلْغَیّ (گمراہی) کی ضد ہے۔غَوٰی یَغْوِیْ غَیًّا وَ غِوَایَۃً اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی ہلاکت کا راستہ اختیار کرلے۔

اَلطَّاغُوْت دراصل فَعْلُوْت کے وزن پر ہے اور وہ رَغَبُوْت، رَھَبُوْت اور رَحَمُوْت کے مانند ہے اور اس کا استعمال واحد اور جمع دونوں کے لیے ہوتا ہے۔

عُرْوَۃ ڈول کی رسی کو کہتے ہیں چونکہ وہ ڈول سے بندھی ہوتی ہے۔عُرْوَۃ کے لغوی معنی تعلق کے

ہیں۔ازہری نے بیان کیا ہے اَلْعُرْوَۃ ہر وہ گھاس ہے جس کی جڑ ثابت ہوتی ہے مانند شیح اور قَیْصُوْم (یہ دونوں گھانس کے اقسام ہیں)۔

وُثْقٰی اَوْثَق کی تانیث ہے۔اَلْاِنْفِصَام اور اِنْقِطَاع اور اِنْصِدَاع ایک جیسے ہیں۔

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت انصار کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس کا ایک صبیح نامی ایک حبشی غلام تھا جسے وہ اسلام لانے کے لیے مجبور کرتا تھا۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انصار کے ایک شخص ابوالحصین کے بارے میں نازل ہوئی جس کے دو بیٹے تھے؛ شام کے تجار مدینہ آئے وہ زیتون لے کر آئے تھے جب انھوں نے مدینہ سے واپسی کا ارادہ کیا تو ان کے پاس حصین کے دونوں بیٹے آئے ان تجار نے دونوں کو نصرانیت کی دعوت دی اور دونوں نصرانی ہو کر شام چلے گئے۔ابوالحصین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دی (چنانچہ اللہ نے لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ نازل فرمایا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: خداوند عالم دونوں کو (اپنی رحمت سے) دور کرے! یہ دونوں وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے کفر اختیار کیا۔ابوالحصین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تئیں ناراضگی رکھی جب آپ نے ان دونوں کو بلانے کے لیے کسی قاصد نہیں بھیجا) تو خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔:فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ

بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ پیغمبر کو اہل کتاب سے جہاد کرنے سے قبل پیش آیا، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور سورۃ البرأت میں اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ یہ سدی سے مروی ہے۔اسی طرح ابن مسعود اور ابن زید نے کہا ہے کہ یہ آیت، آیت سیف کے ذریعہ منسوخ ہو چکی ہے۔باقی حضرات نے کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ انصار کی ایک ایسی خاتون تھی جس کے بچے مرجاتے تھے، وہ یہودیوں کے بچوں کو دودھ پلایا کرتی تھی، جب اسلام آیا تو مسلمانوں کے درمیان یہودی بھی تھے اور جب بنی نضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان کے درمیان انصار کے افراد بھی موجود تھے تو انھوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! ہمارے فرزند اور ہمارے برادران ہیں۔اس وقت آیت لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ نازل ہوئی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو اختیار دو، اگر وہ تمھیں اختیار کر لیں گے تو وہ تم میں شمار ہوں گے اور اگر وہ انھیں اختیار کریں گے تو انھیں وطن سے نکال دیا جائے گا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

تفسیر:

دین میں کوئی جبر نہیں

جب امتوں کے اختلاف کا ذکر گذر چکا کہ اگر خداوند عالم چاہتا تو انھیں دین پر مجبور کر سکتا تھا، پھر خداوند عالم نے دین حق اور توحید کی وضاحت فرمائی، اس کے بعد فرمایا جب کہ حق ظاہر ہو چکا ہے اور بندہ کو اختیار دے دیا ہے، کوئی جبر نہیں ہے کہ اللہ کے ارشاد: لَآ إِكْرَاهَ فِي ٱلدِّينِ (دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے)

إِكْرَاهَ میں متعدد اقوال ہیں:

اول: یہ حکم صرف اہل کتاب کا ہے کہ جن سے جزیہ لیا جائے گا۔ یہ حسن، قتادہ اور ضحاک سے مروی ہے۔

دوم: یہ حکم تمام کفار سے متعلق ہے۔ پھر منسوخ ہو گیا جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ یہ سدی وغیرہ سے مروی ہے۔

سوم: اس سے مراد یہ ہے کہ جنگ کے بعد جو شخص دین میں داخل ہوا ہے اس کے متعلق نہ کہو کہ وہ جبراً داخل ہوا ہے، اس لیے کہ جب جنگ کے بعد وہ راضی ہو گیا اور اس کا اسلام صحیح ہے تو وہ مجبور نہیں ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔

چہارم: یہ آیت انصار کے خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ ہم شان نزول میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہ ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔

پنجم: اس سے مراد یہ ہے کہ دین میں اللہ کی طرف سے جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ بندہ کو اس میں اختیار ہے، اس لیے کہ در حقیقت دین قلبی فعل کا نام ہے جب وہ واجب کے عنوان سے انجام دیا جائے، لیکن اگر شہادتین کے اظہار پر اسے مجبور کیا جائے تو یہ در حقیقت دین نہیں ہے، جس طرح انسان جس کو کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ کافر نہیں ہو سکتا۔ معروف و مشہور دین سے مراد اسلام اور دین الٰہی ہے جس سے (اللہ) راضی ہو۔

قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشْدُ مِنَ ٱلْغَيِّ (ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے) یعنی یقیناً ایمان کفر سے اور حق باطل سے عقلی اور سمعی دلائل (آیات و روایات) اور ایسے معجزات سے ظاہر و واضح ہو چکے ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔ فَمَن يَكْفُرْ بِٱلطَّٰغُوتِ (اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے) طاغوت کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: طاغوت شیطان ہے۔ یہ مجاہد و قتادہ سے مروی ہے۔ یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام

سے مروی ہے۔

دوم: کاہن ہے۔ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔

سوم: ساحر (جادوگر) ہے۔ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔

چہارم: جن اور انسانوں کے مردود اور ہر سرکشی کرنے والے مراد ہیں۔

پنجم: طاغوت بت ہیں اور وہ جن کی خدا کے سوا عبادت و پرستش کی جائے۔ فی الجملہ طاغوت سے مراد وہ ہے جو حکم خدا کا انکار کرے۔

وَيُؤْمِنۢ بِاللّٰهِ (اللہ پر ایمان لے آیا) یعنی اللہ کی اور انبیاء جو کچھ لے کر آئے ہیں ان سب کی تصدیق کرے۔ **فَقَدِ اسْتَمْسَكَ** تو گویا وہ مُتَمَسِّک اور وابستہ ہوگیا ہے **بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى** مضبوط رسی سے یعنی مضبوط وسیلہ سے اور اس نے اپنے لیے دین کا مضبوط بندھن باندھ لیا جسے کوئی شبہ کھول نہیں سکتا۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے۔ یہ مثل کے مانند آیا ہے کہ غیر محسوس چیز کو محسوس چیز کے ذریعہ کرنا اچھی بات ہے۔ **لَا انْفِصَامَ لَهَا** (جس کے ٹوٹنے کا امکان باقی نہیں) مضبوط وسیلہ کے لیے شکستگی نہیں ہے جس طرح مضبوط ریسمان اور اسی سے تمسک اختیار کرنے والے کا معاملہ منقطع نہیں ہوگا اسی طرح ایمان سے متمسک اور وابستہ ہونے والے کا معاملہ منقطع اور شکستہ نہیں ہوتا۔ **وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ** (اور اللہ سب کچھ سننے والا ہے) یعنی تمھارے باتوں کو سنتا ہے۔ **عَلِيْمٌ** (اور جاننے والا ہے) تمھارے ضمائر (رازوں) سے بھی واقف ہے۔

❁❁❁❁❁

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾
اللہ مومنین کا ولی ہے۔ وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں شیاطین (طاغوت) ان کے اَولیاء ہیں وہ انھیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں، درحقیقت وہی جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۲۵۷)

الفاظ و معانی:

اَلْوَلِیُّ وَلِیَ سے ہے۔ یعنی کسی فاصلہ کے بغیر نزدیک ہونا ہے۔ ولی وہ ہے دوسروں کے کئے خود ان کی نسبت اولی اور ان کی تدبیر کا زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ اسی سے اَلْوَالِی ہے چونکہ یہ تدبیر اور امر و نہی کے ذریعہ قوم سے متصل اور وابستہ ہوتا ہے۔ اسی سے اَلْمَوْلیٰ ہے جو اوپر اور بلند ہوتا ہے چونکہ وہ بندے کے امر کو بلا فاصلہ انجام دیتا ہے، ان پر ولایت اور سرپرستی رکھتا ہے بندے کے امر کی دیکھ بھال کرتا ہے ان کے نقص کو پورا کر کے اور ان کی حاجت برطرف کر کے۔ اسی سے نچلی طرف سے اَلْمَوْلیٰ (غلام) ہوتا ہے چونکہ اطاعت کے ذریعہ مالک کے امر کو انجام دیتا ہے۔ اسی سے اَلْمَوْلیٰ لِابْنِ الْعَمِّ (یعنی عموزاد برادر کا مولا و سرپرست ہوتا ہے) چونکہ وہ اس قرابت کے سبب اس کی نصرت و مدد کا امر انجام دیتا ہے۔ اسی سے وَلِیُّ یَتِیْم ہے چونکہ وہ اس کے مال کی حفاظت کر کے ان کے امور انجام دیتا ہے دین اور غیر دین میں یہ ولی ہے چونکہ یہ نصرت و مدد کے ذریعہ حکمت کے مطابق اس کے امر کو انجام دیتا ہے۔ اللہ سبحانہ تین وجھوں سے مومنین کا ولی (سرپرست) ہے:

۱۔ مومنین کی ہدایت کے لیے حجت و برہان قائم کر کے ان کی کمک کرنے کے سبب ان کا ولی و سرپرست ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (سورۂ محمد، آیت ۱۷؛ اور جن لوگوں نے ہدایت حاصل کر لی خدا نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا)

۲۔ دشمنوں کے خلاف مومنین کی نصرت کرنے میں ان کا ولی اور سرپرست ہے اور مخالفین کے دین پر مومنین کے دین کو غلبہ عطا کرنے میں ان کا ولی اور سرپرست ہے۔

۳۔ مومنین کو ان کی اطاعت پر ثواب اور اعمال صالحہ پر انھیں ثواب اور جزا دینے کے سبب ان کا ولی و سرپرست اور حاکم ہے۔

تفسیر:

ولایت الٰہی اور ولایت طاغوت

خداوند عالم نے مومن اور کافر کا ذکر کرنے کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کے سرپرست و ولی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اللہ مومنین کا ولی ہے) یعنی ان کا ہر ضرورت اور

حاجت میں معین و مددگار ہے جس میں ان کے دینی و دنیاوی اور اخروی امور کی صلاح و بہتری ہو۔

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے) یعنی اللہ انھیں کفر و ضلالت کی تاریکی سے نور ہدایت اور ایمان تک لاتا ہے کیونکہ کفر و گمراہی حق کو درک کرنے سے روکتے ہیں، جس طرح تاریکی دیکھی جانے والی چیزوں کے دیکھنے سے مانع ہوتی ہے البتہ کفر و ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ایمان و اطاعت کے نور تک مومنین کو لانے کا سبب یہ ہے کہ اللہ انھیں ہدایت فرماتا ہے اور ان کے لیے دلیلیں قائم کرتا ہے اور انھیں ان میں رغبت دلاتا ہے اور ان کے ساتھ وہ لطف و کرم کرتا ہے جو ان کے افعال کی طرف بلانے اور دعوت دینے میں انھیں قوت و طاقت عطا کرتے ہیں، اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو اللہ انھیں کفر سے نکال کر ایمان تک نہیں لاتا لہٰذا نکالنے کی نسبت اللہ کی جانب درست و صحیح ہے اس لیے کہ یہ امور جن کو ہم نے شمار کیا ہے اللہ ہی کی جانب سے ہیں، جس طرح یہ درست ہے اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب شہر میں داخل ہونے کا اشارہ کرے اور اس میں رغبت دلائے اور اسے ان چیزوں تک پہنچوائے جن میں اس کی صلاح اور بہتری ہو جیسے وہ کہے کہ میں نے فلاں کو فلاں شہروں میں داخل کیا اور میں نے اسے اس بنیاد پر نکالا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ (اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں شیاطین (طاغوت) ان کے اَوْلِیَاء ہیں) یعنی ان کے امور کے سرپرست اور مددگار طاغوت ہیں۔ طاغوت یہاں واحد ہے لیکن مراد جمع ہے یہ لغت میں اس وقت جائز ہے جب کلام میں جمع پر دلیل موجود ہو۔

طاغوت سے شیطان مراد ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ رؤساء ضلالت (گمراہی کے سردار) مراد ہیں۔ یہ مقاتل سے کا قول ہے۔

يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (وہ انھیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں) یعنی ایمان، ہدایت اور اطاعت کے نور سے نکال کر کفر و معصیت اور گمراہی کی تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں۔ آیت میں نور سے نکال کر گمراہی کی طرف لیجانے کی نسبت طاغوت کی طرف دی ہے جیسا کہ سابق میں گذر چکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ طاغوت ہی انھیں گمراہ کر کے گمراہی کی طرف بلاتے ہیں اور اپنے اس کام کو ان کے لیے سجا کر پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا نور سے نکالنے کی نسبت طاغوت کی طرف دینا درست ہے۔ اس سے ان لوگوں کے قول کی دلیل باطل ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پہلی اضافت نسبت کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان اللہ کی طرف

سے ہے مومن کے لیے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو دوسری اضافت ونسبت کا تقاضا تھا کہ کفر شیطان کا فعل ہو۔

ان کے نزدیک دونوں امر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کہ دونوں کام یعنی گمراہی سے نکالنا اور نور سے نکالنا اللہ کی جانب سے ہیں کہ خدا اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔ اگر صورت حال یہی ہوتی جیسا کہ ان کا خیال ہے تو اللہ مومنین کا ولی نہ ہوتا اور نہ ہی ان کا اوران کا مددگار رہتا جیسا کہ آیت اس کا تقاضا کر رہی ہے۔ ایمان اللہ کا فعل ہے نہ کہ لوگوں کا اور جب وہ کافروں کو چھوڑ دیتا ہے اوران کی ولایت کی نسبت طاغوت کی جانب دیتا ہے اور کفران کے اندر اللہ کا فعل ہے اور دونوں کے درمیان دونوں فرق نہیں ڈالا ہے۔ لہٰذا کسی انصاف پسند پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اگر معترض اعتراض کرے وہ انھیں نور سے کس طرح نکالے گا جب کہ وہ نور میں داخل ہی نہیں ہوئے ہیں ہم اس کے جواب میں دو وجہیں بیان کرتے ہیں:

اول: یہ آیت اس قول کے مانند ہے کہ جیسے کوئی کہنے والا یہ کہے کہ میرے والد نے مجھے میراث سے نکال دیا یعنی میراث میں داخل ہونے سے منع کر دینا اسی اخراج ہے یا جناب یوسف علیہ السلام کے قصہ میں آیا کہ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ' ہے (میں نے ایسی قوم کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی) حالانکہ جناب یوسف ان میں سے ہرگز نہیں تھے یا اس کا یہ ارشاد ہے: وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ (سورۂ نحل، آیت ۷۰؛ اور بعض لوگوں کو اتنی بدترین عمر تک پلٹا دیا جاتا ہے) شاعر نے کہا ہے:

دوم: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اسلام سے مرتد ہو گئے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ پہلا قول اقویٰ ہے۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (درحقیقت وہی جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے) اس کی تفسیر گذر چکی ہے۔

❀❀❀❀❀

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم کے پروردگار کے بارے میں اُن سے بحث کی اس بنیاد پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا: میرا ربّ وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت تو میرے اختیار میں بھی ہے۔ ابراہیم نے کہا: اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تُو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا، اللہ ظالمین کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔ (۲۵۸)

قرأت:

اہل مدینہ نے انا اُحی میں انا کو الف کے ساتھ قرأت کی ہے جب انا کے بعد ہمزہ مضمومہ یا مفتوحہ ہو۔ جیسے انا اخوك، اگر انا کے بعد ہمزہ مکسورہ ہو جیسے اِن انا اِلّا نذیر کو ایسی صورت میں سارے قراء نے اجماعی طور پر الف کو حذف کیا ہے۔

حجت:

انا میں اصل ہمزہ اور نون ہے الف تو وقف کی خاطر ملحق ہوتا ہے جس طرح مُسلِمُونَہ میں وقف کی خاطر ہاء ملحق ہوتا جس طرح ہاء وصل میں گر جاتا ہے اسی طرح یہ الف بھی وصل میں گر جاتا ہے۔ ہاں شعر میں انا کا الف وصل کی صورت میں بھی ثابت رہا ہے۔ جیسے اعشیٰ کا یہ شعر:

فَكَيْفَ انَا وَ انْتِحَالُ الْقَوَافِي   وَ بَعْدَ الْمَشِيْبِ كَفٰى ذَاكَ عَاراً

دوسرے شاعر نے کہا:

اَنَا شَيْخُ الْعَشِيْرَةِ فَاعْرِفُوْنِيْ   حَمِيْداً قَدْ تَذَرَّيْتُ السَّنَاما

ابوعلی نے کہا: یہ جو کہا گیا ہے کہ انا میں الف ثابت رکھا جائے گا جب الف کے بعد ہمزہ ہو تو اس بارے میں میں ہمزہ اور دیگر حروف کے درمیان کوئی فصل اور ایسی چیز نہیں جانتے ہیں کہ جس کی وجہ سے اس الف کو ثابت رکھنا واجب ہو کہ وقف کی حالت میں جس کے ثابت رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْبُهت: دلیل و حجت کے مسلط ہو جانے پر حیران و ششدر ہو جانا۔ چونکہ یہ جھوٹ سے سامنا ہونے پر حیران ہونا ہے یَبْهَتُ الرَّجُلُ یُبْهَتُ بُهْتًا حیرت زدہ انسان کو کہتے ہیں اس لیے کہ اپنے مذہب کے متعلق جھوٹ بولنے والا اَلمَكْذُوبُ عَلَیْهِ (جس پر جھوٹ بولا گیا ہو) کی طرح حیران ہو جاتا ہے۔

ترکیب:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ اس جملہ میں اِلٰی اس کافر کی حالت پر تعجب کی خاطر داخل کیا گیا ہے جو باطل باتوں کے ذریعہ محاجہ اور بحث و تکرار کرنے والا ہے، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: اَمَا تَرىٰ اِلٰى فُلَانٍ كَیْفَ یَصْنَعُ اور یہی معنیٰ هَلْ رَاَیْتَ كَفُلَانٍ فِیْ صَنِیْعَهٖ كَذَا؛ حرف جر میں سے اِلٰی اس معنیٰ کے لئے داخل ہوا ہے چونکہ الیٰ غایت و نہایت کے معنیٰ میں ہے لہٰذا کلام اس طرح ہوگا کہ هَلِ انْتَهَتْ رُؤْیَتُكَ اِلٰى مَنْ هٰذِهٖ صَفَتُهٗ تا کہ اس طرح فعل صادر ہونے کے بعد اس پر تعجب پر دلالت کرے اس لئے کہ تعجب اس بات پر کیا جاتا ہے جس کا سبب مبہم غیر واضح ہو اور عام طور سے واقع نہ ہوتا ہو۔ یہاں پر اِلیٰ کاف تشبیہ کے مانند ہے اس علت کے باعث جسے ہم نے بیان کیا ہے کہ ایسا ہونا نادر ہے جیسے وہ چیز ہوتی ہے جس کا واقع ہونا بعید ہو۔

تفسیر:

جناب ابراہیم اور نمرود کا واقعہ

خداوند عالم نے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ وہ مومنین کا ولی و سرپرست ہے اور کافروں کا طاغوت کے سوا کوئی ولی و سرپرست نہیں ہے، اس کے بعد اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کی دلداری اور اطمینان کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام و نمرود کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ کیا آپ کے علم میں نہیں آیا اور کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ (اسے جس نے ابراہیم کے پروردگار کے بارے میں اُن سے بحث کی) اس کی طرف جس نے بحث کی۔ گویا اس طرح فرمایا ہے کہ کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے بحث اور مجادلہ کیا ابراہیم سے اور وہ نمرود بن کنعان ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے سرکشی کی اور ربوبیت کا ادعا کیا۔ یہ مجاہد

وغیرہ سے مروی ہے۔ خدا نے محاجۃ کا لفظ استعمال کیا ہے اگرچہ یہ باطل کے ذریعہ مجادلہ تھا، اس میں نمرود کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں تھی، لیکن اس کے گمان میں تھا کہ اس بارے میں اس کے پاس حجت ہے۔

مجادلہ (بحث) کے وقت میں اختلاف ہے؛ بیان کیا گیا ہے: یہ مجادلہ بت شکنی کے وقت اور (ابراہیمؑ) کو آتش نمرود میں ڈالنے سے قبل (ہوا تھا) جس آگ کو خداوند عالم نے ابراہیم علیہ السلام پر سرد اور سلامتی کے ساتھ قرار دے دیا تھا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: فِي رَبِّهِ (ان کے پروردگار کے بارے میں) یعنی ابراہیم کے پروردگار کے بارے میں جو اللہ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت دیتے تھے۔

اَنۡ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ (اس بنیاد پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی) اٰتَاهُ کی ضمیر 'ہ' ابراہیم سے مجادلہ کرنے والے (نمرود) کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی اللہ نے اسے حکومت عطا کی ہے اور وہ نعمت دنیا اور مال میں وسعت ہے۔ پس ملک (حکومت) پر اترانے اور اکڑنے نے اسے ابراہیمؑ سے مجادلہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ یہ حسن اور جبائی سے مروی ہے۔ 'مُلْكَ' (حکومت) اس وجہ سے جائز ہے کہ خداوند عالم حکومت کے ذریعہ ہر ایک پر انعام کرے۔ البتہ حکومت کے ذریعہ امر و نہی اور لوگوں کے امور کی تدبیر کا مالک قرار دینا اور مخلوقات پر اس کی اطاعت کا واجب کرنا جائز نہیں کہ خداوند عالم کسی کو عطا کرے سوائے اس (شخص) کے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ صلاح و درستکاری اور سیدھے راستہ کی جانب دعوت دے گا، نہ ایسے شخص کو جو کفر و فساد کی طرف بلائے گا۔ یہ چیز اللہ کی جانب سے درست نہیں ہے چونکہ وہ ایسے شخص کو اقتدار اور حکومت سپرد کرنے کے متعلق اپنے علم غیب کے ذریعہ ان کے رازوں سے واقف ہے اس لئے کہ ایسا کرنا فساد کی دعوت دینا ہے۔ بیان کیا گیا ہے ھا کی ضمیر ابراہیم کی طرف پلٹ رہی ہے۔ یہ ابوالقاسم اور بلخی کا قول ہے۔ اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کیونکر حکومت ابراہیم کے لیے ہوسکتی ہے؟ جبکہ قید کرنا اور آزاد کرنا نمرود کے اختیار میں ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قید کرنا اور آزاد کرنا امر و نہی کرنا اللہ کی طرف سے ابراہیم کے لیے تھا، نمرود ان امور کو قہر و غلبہ کے سبب انجام دیتا تھا شرعی ولایت کے عنوان سے نہیں۔

اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ (جب ابراہیم نے کہا: میرا ربّ وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے) اس کلام میں حذف ہے، وہ اس طرح ہے: اِذۡ قَالَ لَهٗ نَمۡرُوۡدُ: مَنۡ رَّبُّكَ؟ جب نمرود نے ابراہیمؑ سے کہا: تمہارا پروردگار کون ہے؟ تو ابراہیمؑ نے کہا: میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور مارتا ہے۔ جناب ابراہیم علیہ السلام نے حیات کے ذکر سے آغاز کیا اس لیے کہ وہ پہلی نعمت ہے جسے اللہ نے

اپنی مخلوقات کو عطا فرمائی ہے، پھر انھیں موت دیتا ہے۔ اسی طرح اس پر بھی اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے اس لیے کہ موت روح کا زندہ کے جسم سے اس کے ڈھانچے کو زخم اور نقص کے بغیر خارج ہونا ہے، نہ ہی اس کے لئے بدن میں کچھ کرنا ہے، یہ چیز انسانی قدرت وطاقت سے باہر ہے۔

قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ (تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت تو میرے اختیار میں بھی ہے) یعنی نمرود نے کہا: جس کا قتل لازمی ہے میں اسے زندان سے آزادی دے کر زندہ کرنے والا ہوں اور زندہ کو قتل کر کے اسے مارنے والا ہوں (یعنی جس زندہ کو چاہوں اسے قتل کر کے مار سکتا ہوں) یہ کافر کی جہالت تھی، اس نے فقط مقابلہ میں عبارت پر اعتماد کیا، معنی پر نہیں؛ وہ مردہ کو زندہ کرنے پر اور زندہ کو مردہ کرنے کے نئے کام پر دلیل لانے سے انحراف وروگردانی کرتا ہے جو کہ صرف خدا کا کام ہے اور اس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔

قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ (ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا) بیان کیا گیا ہے ابراہیم علیہ السلام سے ایک دلیل سے دوسری دلیل کی جانب منتقل ہونے میں دو صورتیں ہیں:

اول: یہ ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے منتقل ہونا نہیں تھا اس لیے کہ ہر حکیم وعقلمند کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک دلیل کے بعد دوسری حجت ودلیل کا لائے، اس حجت کے تمام ہونے کے بعد جس سے آغاز کیا تھا اور اس کے تمام ہونے کی نشانی پر کسی قسم کے شبہہ کے وارد ہونے کے بغیر اس کا ظاہر ہونا ہے، اس میں حجت کے واقع ہونے پر غور وفکر کرنے میں تاثیر ہوتی ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

دوم: ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کہی تاکہ وہ واضح کر سکیں کہ جو ذات مُردوں کو زندہ کرنے اور زندوں کو مارنے پر قدرت رکھتی ہے وہ آفتاب کو مشرق سے نکالنے پر بھی قادر ہے، اگر تو اس پر قادر ہے تو آفتاب کو مغرب سے نکال کر دکھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ اس لیے کہا تھا کہ اگر نمرود نے اس چیز میں مبتلا ہو کہ موت اور زندگی کو کسی سبب کے بغیر گڑھ کر پیش کر دیا ہے جس سے وہاں موجود اکثریت شبہہ میں مبتلا ہو گئی ہے چنانچہ انھوں نے پہلی دلیل سے زیادہ واضح دلیل پیش کی اس لیے کہ انبیاء کو بیان اور وضاحت کے لیے بھیجا جاتا ہے، چونکہ ان کا کام دو مخالفوں کے بحث وتکرار پر قائم نہیں کہ جس میں ہر کوئی اپنے مخالف کو زیر کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ابراہیمؑ نے نمرود سے کہا: جسے تو نے قتل کیا ہے اسے زندہ

کر کے دکھا! اگر تو (اپنے دعویٰ میں) سچا ہے۔ پھر اس پر دوسری حجت پیش کی۔

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (یہ سُن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا) کافر متحیر اور حیرت زدہ ہو گیا یعنی حجت کے ظاہر ہونے سے نمرود متحیر ہو گیا۔

اگر یہ سوال کیا جائے نمرود نے ابراہیمؑ سے کیوں نہیں کہا کہ تمھارا پروردگار آفتاب کو مغرب سے نکال کر دکھائے؟

اس سوال کے دو جواب ہیں:

اول: نمرود کو آیات اور نشانیاں دیکھنے کے بعد بخوبی معلوم ہو گیا تھا کہ اگر وہ اس بات کی پیشکش کرے گا تو خداوند عالم ابراہیمؑ کی تصدیق کی خاطر اسے بھی انجام دے گا اور یہ اس کی مزید رسوائی کا باعث ہو گا۔ اس سبب سے اس نے ایسا مطالبہ کرنے سے روگردانی کی۔

دوم: بلاشبہ خداوند عالم نے نمرود کو ذلیل و رسوا کیا اور ابراہیمؑ پر لطف و کرم فرمایا، یہاں تک نمرود پھر کوئی شک و شبہہ میں ڈالنے والی بات نہ کہہ سکا۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ اللہ ظالمین کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا فساد کے ذریعہ تک پہونچنے میں مدد کے ذریعہ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ بحث و مجادلہ میں ظالموں کی ہدایت و راہنمائی نہیں کرتا، جس طرح اپنے انبیا اور اولیا کی راہنمائی فرماتا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنے لطف و کرم اور تائید کے ذریعہ ظالمین کی ہدایت نہیں کرتا، جب یہ معلوم ہو چکا کہ ظالموں کے لیے (اللہ کا) لطف نہیں ہے اور کہا گیا کہ وہ انھیں جنت کی طرف راہنمائی اور ہدایت نہیں کرتا اس کا یہ ارشاد اور اس آیت میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے کہ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ (سورۂ فصلت، آیت ۱۷) اس لیے کہ ہم ہدایت کے معنی اور اس کے طریقوں کو آیت يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا میں پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بعض ہدایت تمام مکلفین کے لیے عام ہے اور بعض مومنین سے مخصوص ہے۔

آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ معارف بدیہی نہیں ہیں اگر معارف بدیہی ہوتے تو خالق کے اثبات پر بحث و مجادلہ درست نہ ہوتا۔ آیت میں اصول دین میں تقلید کے باطل ہونے اور بحث و مجادلہ کے حسن ہونے پر دلیل ہے اور خداوند عالم اپنے ان افعال کے سبب جانا جاتا ہے کہ ان پر اس کے سوا کوئی دوسرا قدرت نہیں رکھتا۔ ابن عباس کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے کہ خداوند عالم نے نمرود پر مچھر کو مسلط کر دیا تھا جو اس کے

ہونٹوں کو کاٹ رہا تھا، جب اس نے پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اڑ کر اس کی ناک کے سوراخ میں داخل ہو گیا، اسے نکالنا چاہا تو اس کے دماغ تک پہونچ گیا، اللہ نے اس کے ذریعہ چالیس راتوں تک اسے عذاب میں مبتلا رکھا، پھر اسے ہلاک کر دیا۔

❁❁❁❁❁

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا پھر اس شخص کی طرف دیکھو، جس کا گذر ایک بستی کے پاس سے ہوا جو چھتوں کے بل اوندھی پڑی تھی (ویران تھی) تو اس نے کہا: اس بستی والوں کو جو مر چکے ہیں اللہ کس طرح دوبارہ زندگی عطا کرے گا؟! اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا، پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے؟ وہ کہنے لگا: ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ تو اللہ نے کہا: تم پر سو برس اس حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو تو دیکھو کہ اس میں ذرا سا بھی تغیّر رونما نہیں ہوا، دوسری طرف اپنے گدھے پر بھی نظر کرو اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست چڑھاتے ہیں پس جب حقیقت اس پر نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ (۲۵۹)

قرأت:

ابوعمرو، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے لَبِثّ ادغام کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اظہار کے ساتھ لَبِثْت پڑھا ہے۔

ابوعمرو اور عاصم کے علاوہ بقیہ اہل عراق نے حالت وصل میں لَمْ یَتَسَنَّ اور اِقْتَدِ ہاء کو حذف کر کے پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے حالت وصل میں ہاء کو باقی رکھا کر لَمْ یَتَسَنَّهْ اور اِقْتَدِهْ پڑھا ہے۔ وقف کی حالت میں ہاء کو باقی رکھنے کے سلسلہ میں قراء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اہل حجاز اور اہل بصرہ نے نُنْشِرُهَا کو پہلے نون اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل کوفہ اور اہل شام نے نُنْشِزُهَا زاء کے ساتھ پڑھا ہے، ابان نے عاصم سے نَنْشُرُهَا، نون کو فتحہ، سین اور راء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حمزہ اور کسائی نے قَالَ اعْلَمْ میں ہمزہ کو وصل اور میم کو ساکن (یعنی قَالَ اعْلَمْ فعل امر حاضر) پڑھا ہے۔

اور باقی قراء نے اَعْلَمُ کو ہمزہ کو قطع اور میم کو مرفوع (فعل مضارع واحد متکلم) پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن قراء نے لَبِثّ میں ادغام کیا ہے انہوں نے تاء اور ثاء کو حروف مثلین مانا ہے، اس لحاظ سے کہ یہ دونوں حروف زبان کے سرے اور اصول ثنایا سے خارج ہوتے ہیں اور ہمس میں بھی ایک جیسے ہیں اور جن قراء نے الگ الگ رکھا ہے اور ادغام نہیں کیا ہے تو انہوں نے دونوں کے مخرج کے الگ الگ ہونے کی بنا پر ایسا کیا ہے۔

جن قراء نے لَمْ یَتَسَنَّهْ وصل کی صورت میں ھاء کے ساتھ قرأت کی ہے تو انہوں نے دو باتوں کا احتمال دیا ہے:

۱۔ ھاء لفظ اَلسَّنَه کا لام الفعل ہے جس نے کہا ہے: شَجَرَةٌ مَسْنَهاء۔ ایسی صورت میں ہاء کا ساکن ہونا جزم کی بنا پر ہے۔

۲۔ یہ کلمہ اَلسَّنَۃ سے مشتق ہے اس شخص کے نزدیک جس نے اِسْتَوا و سَنَوات کہا ہے۔ یا اَلْمَسْنُون سے لیا گیا ہے کہ مراد متغیر ہے گویا لَمْ یَتَسَنَّ تھا۔ پھر اس میں اس طرح تبدیلی ہوگئی جس طرح لم یتظنَّ میں ہوئی ہے۔ حکایت کی گئی ہے کہ ابوعمرو شیبانی اس حرف کے سلسلہ میں اسی نظریہ کے قائل تھے۔

ان دونوں اقوال کی بنا پر یَتَسَنَّہْ میں ہاءِ وقف کی بنا پر ہے۔ پس مناسب ہے کہ وقف میں ملحق ہوجائے اور وصل میں ساقط ہوجائے۔

ارشاد الٰہی اِقْتَدِہ میں ہاء ممکن ہے کہ مصدر کی جانب کنایہ ہو وقف کے لئے نہ ہو۔ لیکن جب فعل کا ذکر کیا جائے تو وہ اپنے مصدر پر دلالت کرے گا تو مصدر کو اسی طرح ضمیر کی شکل میں لاتے ہیں۔ جس طرح اس آیت میں ضمیر کی صورت میں لائے ہیں: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا آتَاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۰)

شاعر نے کہا:

غَدَا شُرَاقَۃُ لِلْقُرْآنِ یَدْرُسُہٗ وَ الْمَرْءُ عِنْدَ الرَّشٰی اِنْ یَّلْقَھَا ذِئْبُ

اس شعر میں یَدْرُسُہٗ میں ھاء مصدر کے لئے ہے، مفعول کے لئے نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ فعل لام کے ذریعہ مفعول کی جانب متعدی ہوا ہے۔ اب وہ دوبارہ مفعول کی جانب متعدی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح یہ ارشاد الٰہی بھی ہے: فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ اس طرح ہے: اِقْتَدِ الاِقْتِدَاء، مصدر کو ضمیر کی صورت میں لاتے ہیں اس لئے کہ فعل اس پر دلالت کر رہا ہے۔

جن قراء نے نُنْشِرُھَا پڑھا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ کَیْفَ نُحْیِیْھَا۔ کہا جاتا ہے کہ اَنْشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ فَنَشَرَ (خدا نے میت کو زندہ کیا وہ زندہ ہوگئی)

عِظَام (ہڈیوں) کو بھی اِحْیَاء (زندہ کرنے) سے توصیف کیا ہے فرمایا: مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (سورۂ یٰس، آیت ۷۸، ۷۹)

اور جن حضرات نے کَیْفَ نُنْشِزُھَا زاء کے ساتھ پڑھا ہے تو نَشَزَ بلندی اور ارتفاع کے معنیٰ میں ہے۔ ابوالحسن نے کہا: نَشَزَ وَاَنْشَزْتُہٗ (وہ بلند ہوتے ہیں، میں نے اسے بلند کیا) پس نُنْشِزُھَا کے معنیٰ ہوں گے کہ زندہ کرنے کے لئے ہم نے بعض کو بعض پر بلند کیا۔ اسی سے عورت کا نشوز ہونا بھی ہے۔ اور وہ اس کا معاشرہ میں نے اپنے شوہر سے دوری اختیار کرنا ہے اور وہ اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتی ہے۔

اور جن قراء نے قَالَ اَعْلَمُ میں اَعْلَمُ کو فعل مضارع واحد متکلم کا صیغہ پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے خدا کے زندہ کرنے اور وفات کے بعد اپنے دوبارہ اٹھائے جانے کو دیکھ لیا تو اس نے اپنے یقین کا اعلان کیا ہے۔ یعنی اب مجھے اس طرح کا علم حاصل ہو گیا ہے جو پہلے حاصل نہ تھا۔

اور جن لوگوں نے اِعْلَمْ امر حاضر پڑھا ہے تو ان کے نزدیک معنیٰ خبر کی جانب پلٹتا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ جب اس کے لئے بات واضح ہو گئی ہے اور کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں رہ گیا تو اپنے آپ کو غیر کی جگہ پر رکھ کر اسے مخاطب قرار دیا ہے اسی طرح جیسے دوسروں کو مخاطب قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اعشیٰ کا شعر بھی ہے:

اَرْمِی بِهَا الْبَیْدَا اِذَا هَجَّرَتْ وَ اَنْتَ بَیْنَ الْقَرْوِ وَ الْعَاصِرِ

شاعر نے اَنْتَ سے خود اپنے آپ کو مراد لیا ہے۔

نیز:

وَدِّعْ هُرَیْرَةَ اِنَّ الرَّکْبَ مُرْتَحِل وَ هَلْ تُطِیْقُ وِدَاعاً اَیُّهَا الرَّجُلُ

یہاں پر بھی شاعر نے وَدِّعْ کا مخاطب خود اپنے آپ کو قرار دیا ہے جس طرح دوسروں کو خطاب کرتا ہے اور یہ معنیٰ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْخَوَاء کے لغوی معنیٰ اَلْخَلَا کے ہیں یعنی دو چیزوں کے درمیان فاصلہ۔ خَوَتِ الدَّارُ تَخْوِیْ یعنی مکان میں رہنے والے مکان چھوڑ کر چلے گئے اور وہ ان سے خالی ہو گیا۔ عَلٰی عُرُوْشِهَا یعنی اپنی بنیادوں پر، ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یہ خیمے ہیں جو اعراب (بدوؤں) کے مکانات ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے مفسر نے کہا ہے: خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا یعنی اس کی دیواریں باقی رہ گئیں جن پر چھت نہیں تھی۔ عَرَشَ یَعْرِشُ کہا جاتا ہے جب مکان کی تعمیر کی جائے۔ عَرِیْشُ الْبَیْت مکان کی دیواروں کا بلند کرنا ہے۔ اَلْعَرْش تخت کو بھی کہتے ہیں چونکہ دوسری چیزوں سے بلند ہوتا ہے۔ عَرَشَ الرَّجُلُ یعنی مرد کا کسی امر میں اعتدال کرنا (اور اسے انجام دینا) اَلتَّعْرِیْش انگور کی بیل کے نیچے لکڑی کی ٹیکی لگانا ہے تاکہ لکڑی پر انگور کی بیل کو روکا جا سکے۔ اسے سہارا دیا جا سکے۔

قَرْیَةٌ یعنی جس مقام پر لوگ قیام کرنے کے لیے اکٹھا ہوں۔

اَنّٰی یُحْیِ یعنی کہاں سے زندہ کرے گا؟ کس طرح زندہ کرے گا؟
اَلْعَامُ: سال اس کی جمع اَلْاَعْوَامُ ہے۔

ترکیب:

اَوْ حرف عطف ہے اور وہ کلام اول کے معنیٰ پر عطف ہے اس کی تقدیر یہ ہے: اَرَاَیْتَ کَالَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ۔ کاف محلاً منصوب ہے اور اس کے معنیٰ تعجب کے ہیں اس لئے کہ جو بھی اپنے باب سے خارج ہو جائے اپنے نظائر کی حد تک سے نکل جائے تو وہ ایسی چیز ہے کہ جس پر تعجب کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: مَا اَجْهَلَهٗ یعنی وہ اپنی جہالت کی بنا پر اپنے مانند افراد کی حد سے باہر نکل گیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کہیں: هَلْ رَاَیْتَ کَزَیْدٍ الْجَاهِلِ تو آپ یہ بتا رہے ہیں کہ تعجب میں وہ مَا اَجْهَلَهٗ کے مانند ہے اس لئے کہ ہم نے کہا ہے کہ مَا اَفْعَلَهٗ ایسا صیغہ ہے جسے تعجب کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ هَلْ رَاَیْتَ اس کے جیسا نہیں ہے اس لئے کہ وہ اصل میں سوال کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ کاف زائدہ ہے تاکید کے لئے جس طرح اس ارشاد الٰہی میں ہے: لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ زائدہ ہونے کا حکم صرف ضرورت کے وقت ہی لگایا جا سکتا ہے۔

اَنّٰی استفہام کے لئے اور مَنْ یُّحْیِیْ کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اَقَادِرٌ اَنْ یُّحْیِیَ۔ یہ یُحْیِیْ کا مصدر مفعول مطلق بھی ہو سکتا ہے اور تقدیر یہ ہے: اَیَّ نَوْعٍ یُّحْیِیْ یعنی اَیَّ اِحْیَاءٍ یُّحْیِیْ۔ یہ زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ احیاء کی کیفیت کے بارے میں سوال ہے، اصل احیاء کا انکار نہیں ہے۔

کَمْ محلاً منصوب ہے لَبِثْتَ کی بنا پر گویا اس طرح فرمایا ہے: اَمِئَةَ سَنَةٍ لَبِثْتَ اَمْ اَقَلَّ اَمْ اَکْثَرَ۔ وَلِنَجْعَلَكَ پر واؤ داخل ہوا ہے اس لئے کہ لام فعل محذوف سے متصل ہوا ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ فَعَلْنَا ذٰلِكَ اس لئے کہ اگر آپ واؤ کو حذف کر دیں گے تو لام فعل مقدم سے متصل ہو جائے گا۔

کَیْفَ۔ نُنْشِرُ یا نُنْشِزُ کے لئے حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے اور ذوالحال اس میں ضمیر مستتر (نَحْنُ) ہے۔ یا کَیْفَ مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور وَنُنْشِزُهَا اُنْظُرْ کا جملہ حالیہ ہے اور ذوالحال اَلْعِظَامَ ہے۔

تفسیر:

جناب عزیر کا واقعہ

اَوۡ كَالَّذِیۡ مَرَّ (یا پھر اس شخص کی طرف دیکھو، جس کا گذر ہوا) یعنی کیا آپ نے اس گذرنے والے کو دیکھا؟ مراد یہ ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اس شخص کے واقعہ کو دیکھیں جس نے جناب ابراہیم سے کج بحثی کی یا اس شخص کے واقعہ کو ملاحظہ کریں جس کا گذر ہوا عَلٰی قَرۡیَةٍ (ایک بستی کے پاس سے) وہ حضرت عزیز (پیغمبر) ہیں۔ یہ قتادہ، عکرمہ اور سدی سے مروی ہے۔ یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے اَرۡمیا تھے۔ یہ وہب کا قول ہے۔ یہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ جناب خضر کے بارے میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ ابن اسحاق سے مروی ہے۔ قریہ جس سے گذر ہوا تھا بیت المقدس تھا جسے بخت نصر (بادشاہ) نے برباد کر دیا تھا۔ یہ وہب، قتادہ، ربیع اور عکرمہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ سرزمین مقدس ہے۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ یہ بھی قول وارد ہوا ہے کہ وہ قریہ ہے جس سے موت کے خوف سے ہزاروں لوگ باہر نکل گئے تھے۔ یہ ابن زید سے مروی ہے۔ وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوۡشِهَا (جو چھتوں کے بل اوندھی پڑی تھی (ویران تھی)) یعنی خالی تھی اور کہا گیا ہے برباد اور ویران تھا۔ یہ ابن عباس، ربیع اور ضحاک سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اپنی دیواروں اور چھتوں کے بل گر گئی ہوئی تھی، گویا اس کی چھتیں گری ہوئی تھیں، اور ان پر دیواریں گری پڑی تھیں۔ قَالَ اس نے کہا: اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا (اس بستی والوں کو جو مر چکے ہیں اللہ کس طرح دوبارہ زندگی عطا کرے گا) یعنی اس قریہ کی بربادی کے بعد خداوند عالم اسے پھر سے کس طرح آباد کرے گا؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بستی کے باشندوں کو ان کے مرنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ خدا نے قَرۡیَةٍ کی لفظ استعمال کی ہے، اس سے اہل قریہ مراد ہیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاسۡئَلِ الۡقَرۡیَةَ (یعنی قریہ والوں سے پوچھ لو) جناب عزیر نے یہ بات تعجب، انکار اور ریب و شک کی وجہ سے نہیں کہی تھی بلکہ وہ چاہ رہے تھے کہ خداوند عالم ان کو مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرا دے؛ جس طرح ہم میں سے کوئی یہ کہے کہ روز قیامت لوگوں کی حالت کیا ہوگی اور جنت میں اہل جنت کی حالت کیسی ہوگی اور جہنم میں اہل جہنم کی حالت کیسی ہوگی؟ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کا کلام ہے: رَبِّ اَرِنِیۡ كَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (پروردگار مجھے دیکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا) انھوں نے چاہا کہ خداوند عالم انھیں براہ راست

مردوں کو زندہ کرتے ہوئے دکھادے تاکہ انھیں اس چیز کا علم بدیہی حاصل ہو جائے جس طرح انھیں دلیلوں کے ذریعہ حاصل ہوا تھا اس لیے کہ استدلالی علم میں کبھی شبہ بھی وارد ہو جاتا ہے۔

فَأَمَاتَهُ ٱللَّهُ مِائَةَ عَامٍ اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا ثُمَّ بَعَثَهُۥ (پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی) اس طرح زندہ کر دیا جس طرح کہ وہ پہلے تھے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ (اور اس سے پوچھا: بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے) تفسیر میں آیا ہے کہ انھوں نے آسمان سے آواز سنی تھی کہ تم کتنا سوئے؟ (یعنی تم نے نیند میں کتنا وقت گذارا؟) کہا گیا ہے کہ ان سے نبی نے کہا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرشتہ نے کہا تھا۔ یہ بھی قول وارد ہوا ہے بعض ان سن رسیدہ بزرگوں نے کہا تھا جنھوں نے انھیں مرتے ہوئے اور پھر زندہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (وہ کہنے لگا: ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا) اس لیے کہ اللہ نے انھیں دن کے ابتدائی حصہ میں موت دی تھی اور انھیں سو برس بعد دن کے آخری حصہ میں زندہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا: (ایک) دن پھر وہ متوجہ ہوئے دیکھا کہ سورج ابھی چمک رہا ہے تو کہا: یا دن کا کچھ حصہ۔ قَالَ تو اللہ نے کہا بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ (تم پر سو برس اس حالت میں گزر چکے ہیں) یعنی بلکہ تم سو برس تک سوتے رہے۔ فَٱنظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ (اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو تو دیکھو کہ اس میں ذرا سا بھی تغیر رونما نہیں ہوا) یعنی برسہا برس نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ لَمْ يَتَسَنَّهْ واحد کا صیغہ ہے درحالیکہ دو چیزوں طعام و شراب کا ذکر ہے لہٰذا صیغہ تثنیہ کا ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا اس لیے کہ اس سے کھانے اور پینے کی جنس مراد لی ہے، یعنی اسے دیکھو جو تم نے چھوڑا تھا وہ خراب نہیں ہوا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے پینے کی چیز مراد ہے، اس لیے کہ یہ مذکور چیزوں میں قریب ترین ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کا زادِ سفر شربت تین اور انگور تھا۔ یہ تینوں چیزیں بہت جلد متغیر اور خراب ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے شربت کو شیریں اور تین اور انگور کو بالکل تر و تازہ پایا جن میں کسی طرح کا تغیر اور تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

وَٱنظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ (دوسری طرف اپنے گدھے پر بھی نظر کرو) یعنی اپنے گدھے کو دیکھو کس طرح اس کے اجزا متفرق، ہڈیاں پراگندہ اور پاشیدہ ہو چکی ہیں۔ پھر ذرا دیکھو! اللہ نے اسے کس طرح زندہ کیا؟ اللہ نے ان سے یہ اس لیے فرمایا تاکہ اس طرح اس کی طولانی موت پر دلیل پیش کر دے۔

وَلِنَجْعَلَكَ ءَايَةً لِّلنَّاسِ (اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا

چاہتے ہیں) یہ ہم نے انجام دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ ہم نے تمھاری اس بات کا جواب دیا ہے جو تم چاہتے تھے۔

ارشاد: وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ یعنی تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر دلیل و حجت قرار دیں۔ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا (پھر دیکھو ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست چڑھاتے ہیں) کس طرح ہم انھیں زندہ کرتے ہیں، کس طرح زمین سے اٹھاتے ہیں اور انھیں ان کی جسمانی مقامات اور کیفیت میں پلٹاتے ہیں اور بعض کو بعض سے مرکب کرتے ہیں۔ ثُمَّ نَكْسُوهَا یعنی ہم لباس پہناتے ہیں۔ لَحْمًا (گوشت کا) اس بارے میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ ضمیر 'ہ' سے ان کے گدھے کی ہڈیاں مراد ہیں۔ یہ سدی وغیرہ سے مروی ہے۔ اس بنا پر اس کی تقدیر ہوگی: اُنْظُرْ إِلَى عِظَامِ حِمَارِكَ: اپنے گدھے کی ہڈیوں کی جانب دیکھو۔ یہ بھی کہا گیا ہے خود جناب عزیر کی ہڈیاں مراد ہیں۔ یہ ضحاک، قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے سب سے پہلے ان کی آنکھوں کو زندگی دی، جو انڈے کی سفیدی کی طرح تھی۔ انھوں نے بوسیدہ اور متفرق ہڈیوں کو دیکھا جو ان کے پاس جمع ہو رہی تھیں اور گوشت کی طرف دیکھا جسے درندے کھا چکے تھے، جو ہڈیوں پر ادھر ادھر سے اکٹھا ہو رہا تھا جو ان سے وابستہ اور پیوستہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ وہ خود اور ان کا گدھا کھڑے ہو گئے۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ (پس جب حقیقت اس پر نمایاں ہو گئی) یعنی ظاہر ہو گیا اور انھیں معلوم ہو گیا، انھیں اس بات کا علم ہو گیا کہ وہ سو برس تک مردہ رہے (اس کا علم انہیں) دو چیزوں کے سبب ہوا:

اول: ان روایات کے ذریعہ جن کے ذریعہ انھیں ان کے نفس میں معجزہ کی نشانی دکھائی گئی تھی، ان کے گدھے، کھانے اور پینے، ان کے اعضا کا پراگندہ و پاشیدہ ہونے پھر ان کے ایک دوسرے سے باہم جڑے اور اس حالت میں پلٹنے میں جن پر وہ پہلی حالت میں تھے۔

دوم: انھیں ان آثار کے ذریعہ علم ہوا جو اس پر دلالت کر رہے تھے کہ جب وہ اپنے وطن واپس پلٹے اور لوگوں کی اولاد کی اولاد (پوتوں) کو بوڑھا دیکھا جن کے باپ دادا کو جوان چھوڑا تھا، اس کے علاوہ وہ امور اور چیزیں جو متغیر ہو چکے تھے اور حالات میں بدلاؤ کا مشاہدہ کیا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ عزیر جب اپنے اہل و عیال کے پاس سے نکلے تھے تو ان کی بیوی حاملہ تھی اور جناب عزیر کی عمر پچاس برس تھی۔ خداوند عالم نے انھیں سو برس تک کے لیے موت دے دی پھر انھیں زندہ کیا تو اپنے اہل و عیال کی طرف پلٹے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس تھی اور ان کے فرزند کی عمر سو

برس تھی، اس طرح عزیر کا فرزند اپنے باپ سے بڑا تھا۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے جب وہ واپس پلٹے تو بخت نصر نے توریت کو نذر آتش کر دیا تھا جسے عزیر نے پھر سے اپنی یادداشت سے لکھوادی۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: میرے والد نے میرے جد کے واسطہ سے مجھ سے روایت کی ہے کہ توریت کو درخت انگور (یا گنجان درختوں) کے نیچے دفن کیا گیا تھا۔ اگر آپ مجھے میرے جد کے انگور کے درخت (یا گنجان درخت) دکھادیں تو میں اسے نکال کر آپ کو دے دوں گا، جناب عزیر نے اسے وہ جگہ دکھائی اور توریت کو وہاں سے نکال کر عزیر کی لکھوائی گئی تورات کے سامنے رکھا یعنی دونوں کا میلان کیا گیا اور دونوں کے درمیان ایک حرف کا بھی اختلاف نہیں تھا۔ لہٰذا وہ لوگ کہنے لگے: اللہ نے ان کے قلب میں توریت کو قرار دیا ہے، لہٰذا یہ اللہ کے فرزند ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا: عزیر ابن اللہ عزیر فرزند خدا ہیں۔ قَالَ (تو اس نے کہا) یعنی قریہ سے گزرنے والے نے کہا۔ أَعْلَمُ (میں جانتا ہوں) یعنی میں نے یقین حاصل کیا اور جس نے إِعْلَمْ کی قرأت کی اس کے معنی ہیں اس کے مطابق جس کا ذکر گذر چکا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ سے کہا (یعنی خود سے گفتگو کر رہے تھے) یہ بھی کہا گیا ہے انھیں کی طرف سے حکم دیا گیا تھا۔

أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے) یعنی میں نہیں کہتا جو کچھ میں نے کہا وہ شک اور ریب کے سبب ہے اور یہ بھی احتمال ہے انھوں نے اس لیے کہا ہو چونکہ جس کا انھوں نے مشاہدہ اور معائنہ کیا اس سے ان کے علم ویقین میں اضافہ ہوا جبکہ اس سے قبل ان کا استدلالی علم تھا۔ اس طرح ان کا علم بدیہی اور بچشم خود مشاہدہ کیا ہو گیا۔

❀❀❀❀❀

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲٦۰﴾

اور اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم نے کہا تھا: میرے مالک مجھے یہ دکھادے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ تو اللہ نے دریافت کیا: کیا تمھارا اس پر ایمان نہیں ہے؟! انھوں نے عرض کی: ایمان تو ہے مگر اطمینان قلب درکار ہے۔ فرمایا: اچھا تو چار پرندے لو اور انھیں اپنے سے مانوس کرلو پھر ان کا ایک ایک جز الگ الگ پہاڑ پر رکھ دو، اس کے بعد انھیں پکارو وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ نہایت بااقتدار اور صاحب حکمت ہے۔ (۲٦۰)

قرأت:

ابوجعفر، حمزہ، خلف، اور رویس نے یعقوب سے فَصِرْهُنَّ صاد کو کسرہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے فَصُرْهُنَّ صاد کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ شواذ قرأت میں ابن عباس سے فَصِرَّهُنَّ صاد کو کسرہ اور راء کو تشدید فتحہ کے ساتھ پڑھنے کی روایت کی گئی ہے۔ عکرمہ نے فَصَرِّهِنَّ صاد کو فتحہ اور راء کو کسرہ و تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابوبکر کی روایت میں عاصم نے جُزُءًا جیم اور زاء کو ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے جزًّا، زاء کو تشدید کے ساتھ اور بقیہ قراء نے ہمزہ اور تخفیف (زاء کو ساکن) پڑھا ہے۔

حجت:

کہا جاتا ہے: صُرْتُهُ أَصُوْرُهُ یعنی أَمَلْتُهُ میں نے اسے مائل کیا اسی سے یہ مصرعہ بھی ہے:

يَصُوْرُ عُنُوقَهَا أَحْوَىٰ زَنِيْمٌ

یعنی وہ اس بکرے کی گردن کو چارے کی جانب مائل کرتا ہے۔ صُرْتُهُ أَصُوْرُهُ کے ایک معنی قَطَعْتُهُ

(میں نے اسے منقطع کر دیا، کاٹ دیا) کے بھی ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: فَصُرْهُنَّ مصدر اَلصَّوْر سے ہے اور وہ قطع کے معنیٰ میں ہے۔ ابوالحسن نے کہا: قَطَعَ کے معنیٰ میں صَارَ یَصِیْرُ بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

وَ فَرْعٌ یَصِیْرُ الْجِیْدَ وَحْفٍ کَاَنَّهٗ عَلَی اللَّیْتِ قِنْوَانُ الْکُرُوْمِ الدَّوَالِحِ

اس کے معنی یہ ہیں کہ جید (گردن) کو کثرت سے مائل کرتا ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ میل اور قطع ان دونوں میں صَارَ یَصِیْرُ ہی بولا جاتا ہے۔ جس نے فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ کو اَمِلْهُنَّ اِلَیْكَ (انہیں اپنی جانب مائل کرو) کے معنیٰ میں لیا ہے اس نے کلام سے ایک چیز کو حذف مانا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اَمِلْهُنَّ اِلَیْكَ فَقَطِّعْهُنَّ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا اس جملہ کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے جیسا کہ اس ارشاد الٰہی سے حذف کیا گیا ہے: اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ یعنی فَضَرَبَ فَانْفَلَقَ۔

اور جس نے فَصُرْهُنَّ کو فَقَطِّعْهُنَّ کے معنیٰ میں مانا جاتا ہے اسے کچھ پوشیدہ ماننے کی ضرورت نہیں ہے دونوں وجہوں کا احتمال پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا دونوں قرائتیں ہیں:

اِلَیْكَ: اگر آپ نے صُرْهُنَّ کو قَطِّعْهُنَّ کے معنیٰ میں مانا تو اِلَیْكَ کا متعلق خُذْ ہے یعنی خُذْ اِلَیْكَ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَقَطِّعْهُنَّ ثُمَّ اجْعَلْ ---

اور اگر آپ نے اسے اَمِلْهُنَّ کے معنیٰ میں مانا ہے تو ایک احتمال یہ ہے کہ اس کا متعلق خذ ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا متعلق صُرْهُنَّ ہے اور سیبویہ کے قول کے قیاس کے مطابق اس کا متعلق فَصُرْهُنَّ ہے اس لئے کہ وہ زیادہ قریب ہے۔

اور جن قراء نے فَصِرْهُنَّ صاد کے کسرہ اور راء کے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک یہ لفظ صَرَّهٗ یَصِرُّهٗ سے ہے یعنی قَطَعَهٗ۔ اور اس باب سے متعدی آنا کم ہے۔

عکرمہ سے فصُرْهُنَّ صاد کے ضمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ تو وہ صَرَّهٗ یصُرُّهٗ سے ہے اور یہ قیاس و قاعدہ کے مطابق ہے۔

اور جس نے فصَرِّهُن تو اس نے صَرَّیٰ یُصَرِّیْ تصریة سے فَعَلِّهُنَّ کے وزن پر پڑھا ہے۔ اس کے معنی روکنے اور قطع کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا:

رُبَّ غُلَامٍ قَدْ صَرَیٰ فِیْ فَقَرَتِهٖ مَاءَ الشَّبَابِ عُنْفُوَانَ شِرَّتِهٖ

یعنی اسے روکا اور قطع کر دیا۔ اسی سے اَلشَّاۃُ الْمُصَرَّاۃ ہے یعنی وہ بکری جسے باندھ دیا جائے اور اس کے تھن کو دودھ باہر نکلنے سے روک دیا جائے۔

جن قراء نے جُزُءًا جیم اور زاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کی دلیل وہی ہے کہ جسے ہم ارشاد الٰہی: قَالُوا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

اور جس نے جُزًّا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی اصل جزءاً ہے پھر ہمزہ میں تخفیف کر دی گئی ہے پھر جب آپ اس پر وقف کریں گے تو آپ کو اختیار ہے کہ اسے ساکن پڑھئے یا اس میں اشمام کیجئے اور اَلْجُزْو پڑھئے اور اگر آپ تشدید دینا چاہیں تو الجزّ کہیں گے اور پھر وقف کی حالت میں وصل ہو جائے گا اور جزاً کہا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

بِبَازِلٍ وَجْنَاءٍ اَوْ عَيْهَلِّ كَاَنَّ مَهْوَاهَا عَلَى الْكَلْكَلِّ

یہاں پر شاعر نے وصل کو وقف کی جگہ جاری کیا ہے۔

الفاظ و معانی:

اِطْمَاَنَّ يَطْمَئِنُّ: پرسکون ہونا۔ اِطْمَاَنَّ اِلَيْهِ یعنی اس پر بھروسہ کیا اس لئے کہ اس کا نفس اس سے پر سکون ہے اور امانت کے سلسلہ میں اس کے نزدیک اس کی حالت یکساں ہے۔

اَلطَّيْرُ: پرندہ۔ طَارَ يَطِيْرُ طَيَرَانًا: کسی چیز کا ہوا میں خفیف و سبک ہونا۔ پھر اس کا استعمال ہر سرعت و تیزی کے لیے کیا جانے لگا اور تَطَيُّر، اَلطِّيَرَۃ سے ہے جو فال بد لینے کے معنی میں ہے۔ طَائِرُ الْاِنْسَان: انسان کا نامۂ اعمال ہے جسے اس کی گردن میں لٹکایا جائے گا خیر ہو یا شر۔

اَلْجُزْء: کسی چیز کا حصہ۔ جُزْء اور سَهْم میں فرق ہے۔ اَلسَّهْم مجملہ وہ حصہ ہے جس پر تقسیم کیا جاتا ہے جس طرح دس میں سے دو۔ کبھی جُزْء اس حصہ کو کہا جاتا ہے جس پر تقسیم نہیں ہو سکتی جس طرح دس میں تین اس لیے کہ دس تین سے تقسیم نہیں ہو سکتا اگرچہ تین دس کا جُزْء ہے۔

ترکیب:

وَاِذْ میں عامل معنی مقصود میں اُذْكُرْ یعنی وَاذْكُرْهُ هٰذِهِ الْقِصَّةَ۔ یہ زجاج کا قول ہے اور یہ اس

ارشاد الٰہی پر بھی عطف ہوسکتا ہے کہ: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰھٖمَ یعنی اَلَمْ تَرَ اِذْ قَالَ...
کَیْفَ محلاً منصوب ہے۔ تُحْیِ الْمَوْتٰی کی بنا پر اور مراد یہ ہے کہ تو کسی حالت میں مردوں کو زندہ کرے گا۔
لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ، لام اَرِنِیْ سے متعلق ہے یعنی اَرِنِیْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ مِنَ الطَّیْرِ، اَرْبَعَةً کی صفت ہے۔
ایسی صورت میں مِنْ تبعیض کے لئے اور مِنَ الطَّیْرِ خُذْ کے متعلق بھی ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مِنْ
صرف تبیین کے لئے ہوگا۔ مِنْهُنَّ یعنی ان پرندوں میں سے ہر ایک کا جزء۔ جب مِنْهُنَّ کو جزءاً پر مقدم
کردیا ہے تو مِنْهُنَّ جُزْءً کے لئے حال واقع ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ سَعْیاً مصدر ہے جو کہ حال واقع
ہوا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: یَسْعِیْنَ سَعْیاً یا سَاعِیَاتٍ سَعْیاً۔

تفسیر:

معاد جسمانی کی دلیل

پھر خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو مردوں کو زندہ کرنے کو عینی طور پر مشاہدہ کرانے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (اور اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم نے کہا تھا: میرے مالک مجھے یہ دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے) جناب ابراہیمؑ کے اس مطالبہ کے سبب کے سلسلہ میں اختلاف ہے اس کی چند وجہیں ہیں:

اول: وہ سبب جسے حسن، ضحاک و قتادہ نے بیان کیا ہے۔ اسی کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: ابراہیمؑ نے ایک ایسا مردار دیکھا جسے خشکی کے درندے اور ہوائی پرندے اور سمندری جانور کھا رہے تھے۔ آپ نے اللہ سے مطالبہ کرتے ہوئے عرض کیا: پروردگارا! میں جانتا ہوں تو اس مردے کو درندوں، پرندوں اور دریائی جانوروں کے شکم سے یکجا کردے گا پس مجھے دکھا دے اسے کس طرح زندہ کرے گا تاکہ اسے بچشم خود مشاہدہ کرسکوں۔

دوم: وہ سبب جس کی روایت ابن عباس، سعید بن جبیر اور سدی سے کی گئی ہے کہ ایک فرشتہ نے جناب ابراہیمؑ کو خوشخبری دی تھی کہ خداوند عالم نے انھیں اپنا خلیل بنایا ہے، وہ ان کی دعا قبول فرمائے گا اور ان کی دعا سے مردوں کو زندہ کرے گا۔ لہذا جناب ابراہیمؑ نے اللہ سے عرض کیا کہ وہ ایسا کرے تاکہ ان کا قلب مطمئن ہوجائے کہ ان کی دعا قبول ہوگئی اور اس نے انھیں اپنا خلیل بنالیا ہے۔

سوم: اس مطالبہ کا سبب نمرود کا زندہ کرنے کے بارے میں جناب ابراہیمؑ سے تنازعہ تھا، جب نمرود نے جناب ابراہیم علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور اس نے ایک قیدی کو آزاد کر دیا تھا اور ایک آزاد آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ جناب ابراہیمؑ نے فرمایا تھا: یہ زندہ کرنا نہیں ہے۔ آپ نے عرض کیا تھا: اے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا تا کہ نمرود کو بھی یہ معلوم ہو جائے۔ روایت کی گئی ہے کہ نمرود نے جناب ابراہیمؑ سے کہا تھا کہ اگر اللہ نے مردے کو اس طرح زندہ نہیں کیا جس کا وہ مشاہدہ کر سکے تو وہ انھیں قتل کر دے گا چنانچہ جناب ابراہیمؑ نے کہا: لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي یعنی میرا دل مطمئن ہو جائے کہ مجھے جابر وظالم قتل نہ کر سکے۔ یہ محمد بن اسحاق بن یسار سے مروی ہے۔

چہارم: ابراہیمؑ نے چاہ رہے تھے کہ انھیں عینی طور پر اس کا علم حاصل ہو جائے جب کہ وہ استدلال اور برہان کے ذریعہ پہلے سے جانتے تھے تا کہ قلب میں کھٹکنے والے امور اور شیطانی وسوسے برطرف ہو جائیں۔ یہ قوی ترین سبب اور تاویل ہے۔

قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن (تو اللہ نے دریافت کیا: کیا تمھارا اس پر ایمان نہیں ہے) یہ الف استفہام کا ہے ، اس سے بات کو ثابت کرنا اور تعیین مراد ہے۔

یعنی تم لامحالہ (یقینی طور پر) ایمان لا چکے ہو۔ پس کس لیے اس طرح کا مطالبہ کر رہے ہو؟ یہ ہمزہ اگر مثبت جملہ پر داخل ہوتا ہے تو اس سے نفی مراد ہوتی ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ یعنی تم نے لوگوں سے نہیں کہا۔

قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي (انھوں نے عرض کی: ایمان تو ہے مگر اطمینان قلب درکار ہے) یعنی ہاں میں ایمان رکھتا ہوں لیکن میں نے اس لیے مطالبہ کیا ہے کہ میرے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے۔ یہ حسن، قتادہ، مجاہد اور ابن عباس وجبیر کا قول ہے۔ کہا گیا ہے: تا کہ میں اسے بچشم خود دیکھ لوں اور استدلالی علم کے بعد میرا قلب علم یقین کے ساتھ اطمینان وسکون حاصل کر لے۔ کہا گیا ہے: تا کہ میرا قلب مطمئن ہو جائے کہ تو نے میرے مطالبہ کو پورا کر دیا ہے اور مجھے اپنا خلیل بنا لیا ہے جیسا کہ تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا۔

قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فرمایا: اچھا تو چار مختلف جنس پرندے لو۔ تمام پرندوں کے درمیان پرندوں کو ان کی پرواز کے سبب مخصوص کیا ہے کہا گیا ہے کہ وہ پرندے مور، مرغ، کبوتر اور کوا تھے، جن کے بارے میں ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ انھیں ذبح کریں، ان کے پروں کو ان کے خون میں آغشتہ کریں۔ یہ مجاہد، ابن

جریج، عطااور ابن زید کا قول ہے۔اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کرو۔ یہ ابن عباس وسید بن جبیر اور حسن کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں خود سے وابستہ اور مانوس کرلو۔ یہ عطاوابن زید سے مروی ہے۔ جس کا بیان قرأت کی وجہ کے بارے میں گذر چکا ہے۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا (پھر ان کا ایک ایک جز الگ الگ پہاڑ پر رکھ دو، اس کے بعد انھیں پکارو وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے) امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ مراد یہ ہے کہ (پرندوں کا گوشت) جداگانہ طور پر ہر پہاڑ پر رکھ دو جو کہ دس پہاڑ تھے، ان کی منقاریں اپنے پاس رکھو اور بزرگ و برتر (خدا) کے نام سے انھیں پکارو اور انھیں اس کی عظمت و جبروت کا واسطہ دو، وہ دوڑتے ہوئے تمھارے پاس آئیں گے۔ جناب ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا کہ دسوں پہاڑ پر (پرندوں کا گوشت رکھ دیا) پھر انھیں پکارا، انھوں نے کہا: ہم حکم الٰہی کے سامنے تسلیم ہیں۔ چنانچہ پرندوں کا گوشت اور اس کی ہڈیاں جمع ہو کر اپنے اپنے سر سے وابستہ ہوگئیں (پرندے) حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں اڑ کر پہونچ گئے۔

بیان کیا گیا ہے کہ پہاڑ سات تھے۔ یہ ابن جریج اور سدی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ چار تھے۔ یہ ابن عباس، حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے بطور عموم امکان کے مطابق ہر پہاڑ مراد ہے گویا کہا جا رہا ہے ہر پہاڑ پر متفرق طور پر قرار دو جس قدر تمھارے لیے ممکن ہو۔ یہ مجاہد اور ضحاک کا قول ہے۔

سوال وارد ہوتا ہے کہ خدا نے کس طرح فرمایا کہ: ثُمَّ ادْعُهُنَّ (پھر انھیں آواز دو) حالانکہ جمادات کو آواز دینا اور انھیں پکارنا قبیح فعل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اس بات کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ جب خداوند عالم اسے زندہ کرے تو وہ ان کے پاس آئیں گے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس مقام پر پکارنے کے معنی ان کے زندہ ہونے کی کیفیت سے متعلق خبر دینا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۶۵؛ اب ذلت کے ساتھ بندر بن جائیں) یا یہ ارشاد کہ: اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (سورۂ فصلت، آیت ۱۱؛ اسے اور زمین کو حکم دیا کہ بخوشی یا بہ کراہت ہماری طرف آؤ) یہ طبری سے روایت ہے اور اس مفسر کا قول جس نے کہا ہے کہ ہر پہاڑ پر پرندے رکھے گئے پھر انھیں آواز دی گئی یہ بات حق اور فائدہ سے بعید ہے، اس لیے کہ جس چیز کے علم کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ مردوں کو عینی طور پر زندہ کرنے پر قادر ہونا ہے، زندہ

پرندوں کے جناب ابراہیمؑ کے اشارہ پر ان کے پاس آنے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کلام میں حذف ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: فَقَطِّعْهُنَّ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (پھر انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر اس کا ایک ایک حصہ رکھ دو) خداوند عالم انھیں زندہ کر دے گا۔ جب انھیں زندہ کر دے پھر تم انھیں پکارنا۔ لہٰذا انھیں زندہ کرنے کے بعد ان کی طرف اشارہ ہوگا۔ چنانچہ جناب ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا، ان کے پروں کی جانب دیکھا تو ایک دوسرے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ اسی طرح پرندوں کی ہڈیاں اور گوشت (باہم پیوستہ ہو کر) اپنے پیروں پر چلتے ہوئے جناب ابراہیمؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ہر ایک پرندہ اپنے سر سے آکر مل گیا۔ یہ ہے اللہ کا ارشاد کہ: يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا نضر بن شمیل وہ کہتے ہیں: میں نے خلیل ابن احمد سے ارشاد الٰہی: يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا کے متعلق دریافت کیا کہ پرندے جب پرواز کرتے ہیں تو اس کے لئے سَعْی استعمال کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں، میں نے کہا: پھر اس کے کیا معنی ہیں؟ تو انھوں نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمھارے پاس آئیں گے اور تم کوشش کرو گے کوشش کرنے کی طرح (یا تم دوڑو گے دوڑنے کی طرح)

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ (یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ نہایت با اقتدار ہے) یعنی قوی (اور زبردست) ہے، وہ کسی چیز سے عاجز نہیں ہو سکتا۔ حَكِيْمٌ (اور صاحبِ حکمت ہے۔) اپنے افعال واقوال میں صاحب حکمت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ عزیز ہے یعنی اس کے سامنے ہر چیز سرنگون ہے۔ اس پر کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ حکیم ہے یعنی اس کے تمام افعال مبنی بر حکمت اور برحق ہیں۔ آیت سے متعلق جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ ہے یہ کہ آخرت سے متعلق آیات کا جناب ابراہیمؑ کو کس طرح جواب دیا گیا جبکہ موسیٰؑ کے لیے اس طرح نہیں ہوا جیسا کہ ان کا یہ کہنا تھا کہ: اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ تو اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے:

اول: جناب موسیٰؑ ایسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا جس کے ساتھ فریضہ کا باقی رہنا درست نہیں ہے، ہدایت کے واقع ہونے کے ساتھ کہ جس پر کسی وجہ سے بھی شکوک وارد نہیں ہوتے۔ کسی بھی اعتبار سے جبکہ ابراہیمؑ نے خاص چیز کا مطالبہ کیا تھا جس کے ساتھ فریضہ درست ہے۔

دوم: حالات مختلف ہوتے ہیں بعض حالات میں جواب دینا اور پورا کرنا بہت مناسب اور موزوں ہوتا ہے اور بعض حالات میں جواب نہ دینا مناسب ہوتا ہے جس میں پہلے سے اجازت نہ ہو۔

❀❀❀❀❀❀

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

جولوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی یعنی بڑھاوا عطا کرتا ہے، وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی ہے۔(۲۶۱)

الفاظ ومعانی:

اَلنَّبْت: گھاس اور زمین سے اگنے والی ہر چیز۔ سُنْبُل: بالی۔

تفسیر:

راہ خدا میں انفاق کی مثال

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (جولوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہے) بیان کیا گیا ہے اس کی تقدیر یہ ہے: مَثَلُ صَدَقَاتِ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ؛ ان لوگوں صدقات کی مثال جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں دانے کے مانند ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ كَمَثَلِ زَارِعِ حَبَّةٍ؛ خرچ کرنے والوں کی مثال دانہ ہونے والے کی ہے سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی راہ جہاد اور نیکی کے تمام ابواب کہ جن کا بیان سابق میں گذر چکا ہے۔ آیت ان تمام صورتوں میں انفاق کے سلسلہ میں عام ہے اور ہر ایک کو شامل ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ اسی کو ابوعلی الجبائی نے اختیار کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ جہاد میں انفاق سے مخصوص ہے جہاد۔ کے علاوہ دیگر اطاعتوں میں ایک کی دس گنا جزا دی جائے گی۔

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ جیسے ایک دانہ اُگائے سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (سات بالیاں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں) یعنی راہ خدا میں انفاق کا ثواب سات سو گنا ہوتا ہے اگر یہ کہا

جائے کہ کیا کسی بالی میں سو دانے دیکھے گئے ہیں کہ اس کی مثال پیش کی جائے؟ تو اس کا جواب ہے اگرچہ یہ چیز دیکھی نہیں گئی لیکن قابل تصور ضرور ہے۔

اور ارشاد الٰہی ہے: طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ اسی طرح یہ چیز جاورس (جو ایک قسم کے دانے کی بالی ہوتی ہے) میں دیکھی گئی ہے اور اسی کے مانند وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی یعنی بڑھاوا عطا کرتا ہے) یعنی جس کے لیے چاہتا ہے سات سو گنا پر اضافہ کر دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس کے لیے زیادہ پر مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ ابن عمر سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پروردگار میری امت کے لیے اضافہ فرما! اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۵؛ تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تا کہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے گھٹانا اور بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پروردگار میری امت کے لیے مزید اضافہ فرما! اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (سورۂ زمر، آیت ۱۰؛ صبر کرنے والوں کو پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا)

ارشاد الٰہی: وَاللّٰهُ وَاسِعٌ (وہ (اللہ) فراخ دست بھی ہے) وسیع قدرت والا ہے جس قدر زیادہ اور اضافہ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے دشوار نہیں ہے (نہ ہی اس پر تنگی ہوتی ہے)۔ بیان کیا گیا ہے وسیع رحمت والا ہے کئی گنا کرنے میں اس پر کوئی تنگی اور دشواری نہیں ہے۔

عَلِيْمٌ (اور علیم بھی ہے) جو زیادہ کا حقدار ہے اسے جانتا ہے۔ یہ ابن زید سے مروی ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ انفاق کے متعلق مُنفِق (انفاق کرنے والے) کی نیت اور انفاق کے مقصد کو بھی جانتا ہے۔

نظم:

یہ آیت ارشاد الٰہی: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا سے متصل ہے اور دونوں آیتوں

کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر حق کی طرف دعوت دی گئی ہے نیز دلیلوں اور عبرتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ علی بن عیسیٰ سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ نے توحید پر برہان اور دلیل اور جو کچھ اس کے پیغمبر لے کر آئے تھے کو بیان کر دیا تو جہاد پر آمادہ کیا اور بتلایا کہ جو بھی ان دلائل کے بعد عناد و سرکشی کرے گا اس سے جنگ واجب ہو جائے گی ان دلائل کے بعد کفر اختیار کرنے والوں سے جنگ کرنے پر (لوگوں کو) آمادہ کیا اور اس نے واضح کر دیا کہ کفار سے جہاد کرنے اور (جہاد در راہ خدا) میں انفاق کرنے پر ثواب عظیم ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔

❁❁❁❁❁

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ ہی کسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس ہے ان کے لیے نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی حُزن و مَلال۔ (۲۶۲)

الفاظ و معانی:

اَلْمَنّ: ایسی چیز کا ذکر کرنا جس سے نیکی کا ثواب بے فائدہ ہو جائے۔ (اجر ضائع و برباد ہو جائے) جس طرح کہنے والا یہ کہے میں نے فلاں کے ساتھ نیکی کی۔ اَلْمَنّ کے لغوی معنیٰ اَلْقَطْع (منقطع) کرنے کے ہیں۔ اس بارے میں ارشاد الٰہی ہے: لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (یعنی ان کے لئے قطع نہ ہونے والا اجر ہے) اسے مِنَّۃ کہتے ہیں چونکہ مِنَّۃ (احسان کا جتلانا) یعنی نیکی کے حاصل ہونے والے حق و ثواب کو قطع اور ختم کر دیتی ہے۔

مِنَّۃ: عظیم نعمت کے معنیٰ بھی اس کے نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ نعمت اپنی عظمت کے باعث منقطع ہونے والی نہیں ہے۔

اَلْمُنَّۃ: قلب میں قوت، اَلْمَنّ (دسترخوان) جو آسمان سے نازل ہوا تھا۔ اَلْمَنّ جس کے ذریعہ وزن

کیا جاتا ہے جو ایک مخصوص مقدار کو الگ کر دیتا ہے۔

اَذًی: ضرر و نقصان جو نقصان اٹھانے والے پر بہت جلد وارد ہوتا ہے۔

اَلْخَوْف: ضرر کی توقع جس کی بازگشت اعتقاد کی جانب ہوتی ہے۔

اَلْحُزْن: نفس پر شدید غم۔

تفسیر:

قابل قدر انفاق

خداوند عالم نے انفاق کے ذکر کے فوراً بعد ہی انفاق کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ (جو لوگ خرچ کرتے ہیں) یعنی جو لوگ نکالتے ہیں اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اپنے مال کو اللہ کی راہ میں) اس کا بیان گذر چکا ہے۔

ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا یعنی پھر خرچ کر کے نہ اس پر احسان جتلاتے ہیں جس کو عطا کیا ہے، وَلَآ اَذًى (اور نہ ہی اسے تکلیف پہنچاتے ہیں) مَنّ (احسان جتلانا) یہ ہے کہ (دینے والا لینے والے سے کہے:) کیا میں نے تمھیں یہ چیز نہیں دی؟ کیا میں نے تمھارے ساتھ نیکی نہیں کی؟ کیا میں نے تمھیں بے نیاز نہیں بنا دیا؟ اور اسی کے مثل باتیں کہے۔ اذیت یہ ہے کہ وہ (لینے والے سے کہے:) خدا مجھے تم سے راحت عطا کرے! مجھے تمھاری مصیبت سے نجات دے؟ ممکن ہے کہ اذیت کے معنی یہ ہوں کہ لینے والے کے سامنے ترش روئی سے پیش آئے یا جو کچھ اسے دیا اس کے بارے میں اسے اذیت دے یا انفاق کے سبب اسے اپنے بعض کاموں میں استعمال کرے، یہ تمام باتیں مَنّ (احسان جتانے) اور اذیت کے پہونچانے میں سے ہیں جو نیکی اور بھلائی کو مکدر و تلخ اور نعمت کو بے مزہ اور اجر و ثواب کو برباد و ضائع کر دیتی ہیں۔

ارشاد الٰہی: لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان کا اجر اُن کے رَبّ کے پاس ہے) آخر تک اس کی تفسیر گذر چکی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کے پروردگار کے یہاں ان کے اعمال کی جزا ہے۔ خدا نے عِنْدَ رَبِّهِمْ ارشاد فرمایا تا کہ نفس اس کی طرف بیشتر سکون اور وثوق و اطمینان حاصل کر سکے اس لیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس موجود ہے اس کے نہ تو فوت ہونے کا ڈر ہے نہ ہی اس میں کمی واقع ہونے کا خوف ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ (ان کے لیے نہ تو کسی قسم کا خوف ہے) ان پر قیامت کے اجر کے فوت اور اس

میں نقصان کا خوف نہیں ہے۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (اور نہ ہی حُزنُ ومَلَال) انھیں اس کے فوت اور اس میں نقصان کا حزن وملال نہیں ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ وعدہ شرط کے ساتھ درست ہے اس لیے کہ کلام کا مفہوم اس کے معنی کی تقدیر میں یہ ہے کہ انھوں نے جو (راہ خدا) میں انفاق کیا ہے اگر اس کے ساتھ احسان جتلانا اور اذیت دینا نہیں ہے تو ان کے لیے یہ اجر وثواب ہے اگر وعدہ مشروط ہو پس جب بھی شرط حاصل نہیں ہوگی ثواب کا استحقاق بھی پیدا نہیں ہوگا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: بخشش وعطا کر کے احسان جتلانے والے سے خداوند عالم نہ تو کلام کرے گا نہ ہی اس پر رحمت کی نظر فرمائے گا، نہ ہی اسے پاک کرے گا اور اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

❀❀❀❀❀

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾
نرم گفتاری اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیّت رسانی ہو اور اللہ بڑا بے نیاز اور بردبار ہے۔ (۲۶۳)

الفاظ ومعانی:

اَلْغَنِيّ: جس کی ملکیت وسیع ہو۔ اللہ غنی ہے چونکہ وہ تمام اشیا کا مالک ہے اس لئے کہ وہ ان پر قادر ہے۔ اس کے لیے کوئی امر دشوار نہیں ہے۔ اَلْغِنٰى حاجت کی ضد ہے۔

تفسیر:

پسندیدہ گفتگو بہتر ہے

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ (نرم گفتاری) یعنی اچھا اور خوب صورت کلام جس میں سائل کے لئے کسی قسم کی قباحت اور برائی کا پہلو نہ ہو۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی نیک اور صالح دعا کے ہیں جیسا کہ اس طرح کہے: خداوند عالم تمھارے ساتھ اچھا سلوک کرے! یا خدا تمھیں دوسروں کے سامنے دست سوال دراز سے بے نیاز

بنادے اور خدا تمھارے رزق میں وسعت و برکت عطا کرے۔ اسی کے مانند دیگر دعائیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی نیک وعدہ کے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ قول معروف سے لوگوں کے درمیان صلح وصفائی مراد ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

وَمَغْفِرَةٌ (اور درگذر کرنا) اس میں متعدد اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: اس کے معنی معصیت اور نافرمانی سے سلامتی کے ہیں اس لیے کہ عذاب سے محفوظ رہنے میں اس کی حالت بخشش ومغفرت کی حالت کے مانند ہے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔

دوم: سائل پر اس کے سوال کو پوشیدہ رکھنا ہے (یعنی سائل کے سوال کی پردہ پوشی کرنا ہے)

سوم: سائل کے ظلم سے مسئول (جس سے سوال کیا جاتا ہے) کا عفو ودرگذر کرنا۔ یہ حسن کا قول ہے۔

اس اعتبار سے سائل کا نامناسب اور بے وقت سوال کرنا ظلم ہوگا یا سائل کا اپنے سوال کے ذریعہ لجاجت اور مسئول سے چمٹنا یا بے ادبی سے پیش آنا ہے جیسے دروازہ کا کھولنا یا بغیر اجازت گھر میں داخل ہونا تو اس کے اس ظلم سے درگذر کرنا ہے۔

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ایسے صدقہ سے بہتر ہے جس کے ساتھ اذیت ہو۔ قول معروف (اچھی بات) اور ظلم سے درگذر کرنا ایسے صدقہ سے بہتر ہے کہ جس کے پیچھے اذیّت رسانی ہو؛ اس لیے کہ ایسا صدقہ دینے والا خیر وثواب حاصل نہیں کرتا ہے نہ تو اپنے عین مال پر دنیا میں، نہ ہی آخرت میں اپنے ثواب پر۔ قول معروف اور عفو ودرگذر سے کام لینا دونوں اطاعتیں ہیں جن پر ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جب کوئی سائل سوال کرے تو ابھی اس کا سوال منقطع نہ ہو کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے (یعنی سوال تمام ہونے سے قبل اس کی ضرورت پوری کردی جائے پھر وقار اور نرمی کے ساتھ یا مختصر عطا کر کے یا اچھائی اور خوبصورتی کے ساتھ جواب دے دو (یا اسے پلٹادو) اس لیے کہ کبھی کبھی تمھارے پاس وہ آتے ہیں جو نہ تو جنات ہوتے ہیں اور نہ ہی انسانوں میں سے وہ دیکھتے ہیں کہ تمھیں جو کچھ عطا کیا ہے اس میں تم کیا کرتے ہو۔

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ (اور اللہ بڑا بے نیاز) خداوند عالم مستغنی ہے تمھارے صدقات اور تمھاری تمام فرمانبرداریوں سے۔ اس نے ان امور کا اپنی حاجت وضرورت کے لیے حکم نہیں دیا ہے بلکہ اس نے ان امور کا حکم تمھیں اس لیے دیا ہے اور ان کی جانب تمھیں بلایا ہے کہ تم اس کے ثواب کے ضرورت مند اور محتاج ہو۔

حَلِيْمٌ اور بردبار ہے یعنی عذاب میں جلد بازی نہیں کرتا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ صدقہ دے کر احسان جتلاتے ہیں اور اذیت دیتے ہیں ان کے عذاب میں جلدی نہیں کرتا۔ اگر اس مقام پر بجائے حلیم حمید یا علیم ہوتا تو بہتر نہیں ہوتا۔

❀❀❀❀❀❀

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٌ فَتَرَكَهُۥ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٦٤﴾

اے ایمان لانے والو! اپنے صَدَقَات کو اِحسان جتلا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے، نہ اس کا ایمان اللہ پر ہے اور نہ ہی روز آخرت پر۔ اس کے خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی، جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہہ گئی اور صرف چٹان باقی رہ گئی ایسے لوگ خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، اور اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا۔ (۲۶۴)

الفاظ و معانی:

اَلرِّيَاءُ وَالْمُرَآةُ اس کی اصل اَلرُّؤْيَة سے ہے گویا وہ عمل انجام دیتا ہے تاکہ دوسرے لوگ دیکھیں۔

اَلصَّفْوَان کا واحد صَفْوَانَة ہے۔ جیسے سَعْدَان اور سَعْدَانَة مَرْجَان اور مَرْجَانَة، یہ چکنا پتھر۔

اَلتُّرَاب . اَلتُّرْب ایک ہی ہیں۔ تَرِبَ الرَّجُلُ یعنی آدمی اپنے فقر و فاقہ کی وجہ سے زمین گیر ہو گیا۔ ارشاد ہوتا ہے: مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ چونکہ وہ اپنے فقر کے سبب زمین پر بیٹھ گیا۔

اَلْوَابِل: شدید بارش۔ وَبِيْل: شدید۔ وَبَال: بدانجام۔ اَلصَّلْد: چکنا پتھر۔

ارشاد الٰہی: كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ میں كاف تُبْطِلُوْا کے واؤ کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ رِئَاءَ النَّاسِ مصدر ہے جو کہ يُنْفِقُ کی ضمیر کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اس کی تقدیر یہ

ہے: یُنۡفِقُ مَالَهٗ مُرَائِیاً۔ رِئَآءَ النَّاسِ مفعول لہ بھی ہوسکتا ہے۔عَلَیۡهِ تُرَابٌ۔ جملہ ہے جو کہ صَفۡوَانٍ کی صفت ہونے کی بنا پر محلاً مجرور ہے اور صَلۡدًا، تَرَکَهٗ کا حال ہے اور ذوالحال تَرَکَهٗ میں ضمیر ہاء ہے۔لَا یَقۡدِرُوۡنَ: جملہ فعلیہ حال ہے اور واؤ ضمیر معنیٰ اَلَّذِیۡ کی جانب پلٹ رہا ہے اس لئے کہ جنس ہے خود اس کے لئے لفظ کی جانب نہیں پلٹ رہا ہے۔(اس لئے کہ اگر لفظ کی جانب پلٹائیں گے تو اعتراض ہوجائے گا کہ واؤ ضمیر جمع کے لئے اور اَلَّذِیۡ مفرد کے لئے ہے)

تفسیر:

راہ خدا میں انفاق کے فائدے

پھر خداوند عالم نے اس آیت میں گذشتہ مثالوں پر تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (اے ایمان لانے والو!) یعنی اے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے والو! لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ (اپنے صدقات کو سائل پر احسان جتلا کر خاک میں نہ ملادو۔کہا گیا ہے کہ اللہ پر احسان جتلا کر۔وَالۡاَذٰی صدقہ لینے ولاے کو دکھ دے کر پھر خداوند عالم نے احسان جتلانے والے کے عمل اور منافق کے عمل کی مثال ایک ساتھ پیش فرمائی ہے اس لیے کہ جب یہ دونوں حکم وہدایت سے ہٹ کر عمل انجام دیں گے تو اس پر ثواب کے مستحق نہیں ہوں گے۔یہی ابطال کے معنیٰ ہیں یعنی عمل کا اس طریقہ سے ہٹ کر بجالانا جس پر ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

ارشاد فرمایا: کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ ((اس شخص کی طرح) جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے) اس مثال میں مومن اور کافر (دونوں) داخل ہیں جب یہ دونوں دکھاوے کے لیے مال خرچ کریں۔

ارشاد: وَلَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (نہ اس کا ایمان اللہ پر ہے اور نہ ہی روز آخرت پر) یہ کافر سے مخصوص ہے اس لیے کہ کافر نہ تو اللہ کی وحدانیت کی تصدیق کرتا ہے، نہ ہی قیامت اور جزا کی تصدیق کرتا ہے۔کہا گیا ہے کہ یہ منافق کی صفت ہے اس لیے کہ کافر علانیہ طور پر انجام دیتا ہے ریا کاری نہیں کرتا اور ہر ریا کار کافر ہوتا ہے یا منافق۔

ارشاد: فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفۡوَانٍ یعنی اس کے خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک صاف اور

چکنی چٹان تھی۔ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ (جس پر مٹی کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی، جب زور کا مینہ برسا) یعنی اس پر بڑی بڑی بوندوں کی شدید بارش برس ہوئی (ساری مٹی بہہ گئی) فَتَرَكَهُ صَلْدًا (اور صرف چٹان باقی رہ گئی) یعنی صاف پتھر رہ گیا۔ خداوند عالم نے منافق اور احسان جتلانے والے کی تشبیہ ایسے صاف اور چکنے پتھر سے دی ہے جس پر مٹی اور گرد ہو اور بارش اس گرد کو بہالے جائے اس لیے کہ کوئی بھی (گرد کے بہہ جانے کے بعد) اسے پلٹانے پر قدرت نہیں رکھتا۔ اسی طرح احسان جتلانے والا اگر انفاق کرے اور اس کے ساتھ احسان جتلائے تو اس نے اس عمل کو اس طرح انجام دیا ہے کہ اس کے تدارک اور دوبارہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، وہ نہ ہی اس کی تلافی کرسکتا ہے اس لیے کہ وہ عمل اس طرح واقع ہوا ہے جس پر انجام دینے والا ثواب کا مستحق نہیں بنتا اس لیے کہ افعال کی شکل وصورت اس سے انجام پانے کی تابع ہوتی ہے جب وہی فوت ہوجائے تو اس کے تدارک اور تلافی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آیت میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس بات پر دلالت کرے کہ ثابت شدہ ثواب احسان جتلانے کے بعد باطل اور ضائع ہوجاتا ہے، نہ ہی ریاکاری کے سبب باطل ہوتا جو مستقبل میں حاصل ہوگا جیسا کہ اہل وعید (معتزلہ) کہتے ہیں۔

لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا (ایسے لوگ خیرات کرکے جو نیکی کماتے ہیں اس سے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آتا) یعنی یہ لوگ اپنے نفقہ (یعنی جو مال انھوں نے خرچ کیا ہے) پر قادر نہیں ہیں، نہ ہی ثواب پر قادر ہیں، نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ وہ مال کہاں ہے اور اس کا ثواب کہاں ہے، نہ ہی اس سے کچھ حاصل کرسکتے ہیں، جس طرح اس مٹی اور خاک کو حاصل نہیں کرسکتے ہیں جسے بارش پتھر سے بہالے گئی ہو۔ اس آیت اور اس سے قبل والی آیت اس بات پر مشتمل ہے کہ جس میں صدقہ اور نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنے اور رضائے خدا کے حصول پر آمادہ کیا ہے۔ احسان جتلانے، اذیت دینے، ریاکاری کرنے، شہرت طلبی اور نفاق سے نہی کی ہے۔ ان امور کے ذریعہ عمل کے بطلان کی خبر دی ہے۔

اس کے معنی میں جو حدیث وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ابن عباس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: قیامت کے روز منادی یہ ندا دے گا جسے تمام لوگ سنیں گے: کہاں ہیں وہ لوگ جو لوگوں کی عبادت کرتے تھے، اٹھو اپنا اجر انھیں لوگوں سے لو جس کے لیے تم عمل کرتے تھے، میں ایسا عمل قبول نہیں کرتا جس میں دنیا و اہل دنیا سے ملاوٹ کی گئی ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد

فرمایا ہے: جو کسی مومن کے ساتھ کوئی کار خیر کرے پھر اسے کسی بات سے اذیت پہنچائے یا اس پر احسان جتلائے تو خداوند عالم اس کے صدقہ کو باطل کردے گا۔ پھر آپؑ نے مثال پیش کرتے ہوئے اس آیت کی تلاوت فرمائی: كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ ...الْكٰفِرِيْنَ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: وہ شخص میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے کہ جس کے ساتھ میں نے احسان کے بعد احسان کیا ہو اور اس کی زندگی کو خوشگوار بنایا ہو اس لئے کہ میں نے دیکھا ہے کہ بعد والوں کو عطا نہ کرنا شروع والوں کے شکر کی زبان کو بند کر دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (اور اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا) یعنی کافروں کو ان کے اعمال کا ثواب نہیں دے گا اس لیے کہ کفران کے اعمال کے ضائع اور برباد ہونے کا سبب ان کے مستحق ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ البتہ خدا ان مومنین کو ثواب دے گا جو اس طرح اعمال انجام دیتے ہیں جس پر وہ ثواب کے حقدار بنتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ خدا کفار کے اعمال کے سبب انھیں جنت کی جانب ہدایت و رہنمائی نہیں کرے گا جس طرح مومنین کی ہدایت و رہنمائی کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خدا انھیں وہ زیادی الطاف و توفیق دیتا ہے جو مومنین کو عطا کرتا ہے۔

❁❁❁❁❁

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور (اس کے برخلاف) جو لوگ اپنا مال محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دُگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی سی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے اور اللہ تمھارے ہر عمل کو بغور دیکھ رہا ہے۔ (۲۶۵)

قرأت:

عاصم اور ابن عامر نے بِرَبْوَةٍ راء کو فتحہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ شواذ میں ابن عباس سے راء کے کسرہ کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ ابن کثیر، نافع، اور ابو عمرو نے اُكْلَهَا (کاف کے سکون) کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے کاف کو بھی ضمہ کے ساتھ اُكُلَهَا پڑھا ہے۔

ترکیب:

اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ (اِبْتِغَاءَ) مفعول لہ ہے۔ وَ تَثْبِيْتاً اِبْتِغَاءَ پر معطوف ہے۔ بِرَبْوَةٍ جار و مجرور جَنَّةٍ کی صفت ہے۔ اَصَابَهَا وَابِلٌ محلاً مجرور ہے اس لئے کہ یہ صفت بعد از صفت ہے۔ ضِعْفَيْنِ اُكُل کے لئے حال ہے۔

زجاج نے کہا: طَلٌّ اس معنی کے لحاظ سے مرفوع ہوا ہے: فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَالَّذِيْ يُصِيْبُهَا طَلٌّ. اس بنا پر طَلٌّ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ طَلٌّ فعل مقدر کا فاعل بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی فَيُصِيْبُهَا طَلٌّ

تفسیر:

راہ خدا میں انفاق کرنے والے کی مثال

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ (اور (اس کے برخلاف) جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں نیک کاموں میں اَبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ رضائے خدا کے حصول کے لیے۔ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (اور دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ) یعنی قوت، یقین اور دین میں بصیرت کے ساتھ۔ یہ سعید بن جبیر، سدی و شعبی سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ ثابت کرتے ہیں کہ اپنے صدقات کو کہاں قرار دے رہے ہیں (یا اپنے اس عمل کی پابندی کرتے ہیں اور مستقل مزاجی سے پیش آتے ہیں)) یہ حسن و مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو اطاعت الٰہی پر ثابت رہنے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ یہ ابو علی الجبائی سے مروی ہے۔ حسن و مجاہد پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے وَتَثْبِيْتًا نہیں کہا ہے۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اس لیے کہ جب انھوں نے اپنے آپ کو ثابت کیا تو وہ ثابت ہو گئے۔

ارشاد الٰہی: كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ (ان کے خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطحِ مرتفع پر ایک باغ ہو) یعنی ایسے باغ کے مانند ہے جو زمین سے بلند مقام پر ہو۔ خدا نے خاص طور سے ربوۃ کا ذکر کیا ہے تو وہ اس لئے کہ وہاں کا سبزہ بہت اچھا اور خوشنما ہوتا ہے اور اس سرزمین سے بیشتر ہوتا ہے جس کی طرف پانی جاری ہوتا ہے اور وہاں جمع ہوجاتا ہے اور اس کا سبزہ خوشنما نہیں ہوتا۔

أَصَابَهَا وَابِلٌ یعنی اگر اس باغ پر زور کی بارش ہوجائے تو۔ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ (دُگنا پھل لائے) یعنی اس باغ سے دوگنا غلہ پیدا کرے جو سادہ اور معمولی زمین پر ہو۔ ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ ہر برس میں دو مرتبہ پھل دے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍۭ بِإِذْنِ اللّٰهِ) یعنی ہر چھ مہینے میں جیسا کہ روایت کی گئی ہے۔ اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے یعنی جو شخص اپنا مال رضائے الٰہی کی خاطر خرچ کرتا ہے اس کا اجر دوگنا ہوجاتا ہے۔

فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ اور اگر زور کی شدید بارش نہ بھی ہو تو، فَطَلٌّ (ایک ہلکی سی پھوار اور معمولی سی بارش ہی اس کے لیے کافی ہوجائے) اس کا خیر: ہر حالت پیچھے نہیں رہے گا اور کسی بھی حالت میں اس پر غبار نظر نہیں آئے گا۔

فَطَلٌّ مرفوع ہے اس تقدیر کی بنا پر کہ: فَالَّذِي يُصِيبُهَا طَلٌّ۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (اور اللہ تمھارے ہر عمل کو بغور دیکھ رہا ہے۔) یعنی (اللہ) تمھارے افعال کو جانتا ہے، انھیں کے مطابق تمھیں جزا عطا کرے گا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ تم میں سے ریاکار اور مخلص کو جانتا ہے۔ اس جملہ میں رغبت بھی دلائی گئی ہے اور خوف بھی پیدا کیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں سے لدا ہوا جس میں نہریں جاری ہوں اس باغ میں اس کے لیے ہر قسم کے پھل موجود ہوں جبکہ وہ خود بوڑھا ہو گیا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں کہ ایسے میں وہ باغ ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جھلس جائے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔ (۲۶۶)

الفاظ و معانی:

اَلْجَنَّة: وہ باغ کہ جس میں بکثرت درخت ہوں چونکہ درخت اپنی کثرت کے سبب اسے چھپا لیتے ہیں۔

اَلنَّخل نَخْلَة کی جمع ہے: کھجور کا درخت ہے یہ مذکر اور مونث دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ

اَنْهَار، نَهْر کے جمع ہے: پانی بہنے کا وسیع مجریٰ (مقام)۔

اِصَابَة: مقصد تک پہونچ جانا۔

اَلْكِبَر: دوسری مقدار پر بیشتر حالت۔ کبیر اور کثیر کے درمیان یہ فرق ہے کہ کثیر عدد پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ کبیر ایسا نہیں ہوتا۔ دَارٌ وَاحِدَةٌ كَبِيْرَةٌ کہنا صحیح ہے جبکہ كَثِيْرَة کہنا صحیح نہیں ہے۔

ضَعِيْف، ضُعَفَاء اور ضِعَاف کی جمع ہے۔

اِعْصَار: تیز بگولے، انتہائی تیز ہوا جو گرد اڑاتی ہوئی عمود کی شکل میں زمین اور آسمان کے درمیان اٹھتی ہے اور اس شکل میں ہوتی ہے جیسے کپڑے کو نچوڑا جاتا ہے۔

ترکیب:

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اس پر فعل ماضی وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ کو عطف کیا ہے۔ فراء نے کہا: يَوَدُّ میں

ایسا کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ یَوَدُّ کبھی لَوْ کے ساتھ آتا ہے اور کبھی اَنْ کے ساتھ۔ پس ایک کو دوسرے کی جگہ فرض کر سکتے ہیں معنیٰ کے متفق ہونے کی بنا پر گویا اس طرح فرمایا ہے: اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ لَوْ کَانَتْ لَهٗ جَنَّةٌ۔

علی بن عیسیٰ نے کہا: میرے نزدیک یہ صحیح ہے کہ اَنْ کے ذریعہ مستقبل پر دلالت کی ہے اور تمنی کی بنا پر کلام میں لَوْ کے معنیٰ پائے جاتے ہیں گویا اس طرح فرمایا ہے: قِیْلَ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ مُتَمَنِّیاً لَهٗ۔ تَمَنّیٰ ماضی اور مستقبل دونوں کے لئے واقع ہوتی ہے، جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یَتَمَنّیٰ اَنْ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ بھی صحیح ہے اور یَتَمَنّیٰ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ بھی صحیح ہے اور لفظ محبت صرف مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مودۃ اور محبت میں یہ فرق ہے کہ مَوَدَّۃ کبھی تمنیٰ کے معنیٰ میں بھی آتی ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: اَوَدُّ لَوْ قَدِمَ زَیْدٌ یہ تَمَنّیٰ لَوْ قَدِمَ کے معنیٰ میں ہے لیکن اُحِبُّ لَوْ قَدِمَ کہنا صحیح نہیں ہے۔

مِنْ نَّخِیْلٍ میں مِن تبیین کے لئے ہے اور یہ جار و مجرور محلاً مرفوع جَنَّةٌ کی صفت ہے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جملہ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ جَنَّةٌ کی صفت ہے یہ اس وقت ہے جب ہاء کی ضمیر جَنَّةٌ کی طرف پلٹے یا تو محلاً مجرور ہے اس لئے کہ نَخِیْل کی صفت ہے یہ ترکیب اس وقت ہوگی جب ھاء کی ضمیر نَخِیْل کی جانب پلٹے۔

تفسیر:

ایک اور مثال

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ (کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک باغ ہو) مِنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (کھجوروں اور انگوروں سے لدا ہوا جس میں نہریں جاری ہوں) لَهٗ فِیْهَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْکِبَرُ (اس باغ میں اس کے لیے ہر قسم کے پھل موجود ہوں جبکہ وہ خود بوڑھا اور سن رسیدہ ہو گیا ہو اور وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ (اور اس کے کم سن اور کمزور بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ کہ ایسے میں وہ باغ ایک تیز بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے۔ اِعْصَارٌ (تیز بگولے) شدید ہوا جو زمین سے آسمان کی طرف چلتی ہے، عمودی شکل میں ہوتی ہے جسے لوگ زوبعة کہتے ہیں۔ فِیْهِ نَارٌ اس ہوا میں آگ ہو۔ فَاحْتَرَقَتْ (جھلس جائے) اس باغ کو جلا ڈالے۔ یہ خداوند عالم نے سلب نعمت کے سبب حسرت کی مثال پیش کی ہے، اس کی مختلف تفسیریں ہیں:

اول: یہ ریاکار انفاق کرنے والے کی مثال ہے جو اس دنیا میں تو اس سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن آخرت میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا جبکہ وہ آخرت میں اس کا زیادہ محتاج اور ضرورتمند ہوگا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔

دوم: دنیاوی لذتوں کی آخرت اطاعت الٰہی میں کوتاہی کرنے والے کی مثال ہے کہ وہ آخرت میں عظیم حسرت کا سامنا کرے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اعمال صالحہ کی طرف اس کی حاجت و ضرورت اس بوڑھے کی حاجت و ضرورت کے مانند ہے جس کی کمزور اور کمسن اولاد ہوں ایسے باغ کے پھلوں کی ضرورت جو نذر آتش ہو جائیں پس ایسے آدمی کی حسرت عظیم ہوگی، اس لیے کہ اس نے جوانی میں محنت و مشقت سے جو کچھ کمایا تھا اب وہ اس کے حصول سے مایوس ہو چکا ہے اس کی آرزو سب سے کمزور اور اس کی حسرت شدید ہوگی۔ اسی طرح وہ شخص بھی ہوگا جس کے پاس آخرت میں کوئی عمل صالح نہ ہو جو اسے جنت تک پہنچا سکے تو اس کی حسرت بھی بوڑھے کے مانند ہوگی۔

سوم: اس (شخص) کی مثال ہے جو اپنے عمل کو بربادی پر ختم کرتا ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ ان تمام وجہوں کا آیت میں امکان پایا جاتا ہے۔

كَذٰلِكَ (اللہ تعالیٰ اسی طرح) یعنی اس بیان کی طرح جسے اس نے تمھارے لیے صدقہ، قصہ ابراہیم اور قریہ سے گزرنے والے وغیرہ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ (اپنی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے) یعنی وہ ہدایات جن کے تم اپنے دینی امور میں محتاج ہو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم غور فکر کرو اور سمجھو۔

❁❁❁❁❁❁

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

اے ایمان والو! جو مال تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ خرچ کرو۔ اور اس کی راہ میں دینے کے لیے بری چیز کا انتخاب نہ کرو، جس کا لینا تمھیں خود گوارا نہ ہو مگر یہ کہ اس سے چشم پوشی کرلو تمھیں یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز اور لائق حمد ہے۔ (۲۶۷)

قرأت:

ابن کثیر نے تو اس سے وَلَا تَيَمَّمُوا یہاں پر اور قرآن مجید میں ۳۱ مقامات پر تاء کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تَيَمَّمُوا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

دونوں ایک معنیٰ میں ہیں گویا ابن کثیر نے دوسری قرأت میں حرف ساقط کو پلٹا کر ادغام کر دیا ہے اس لئے کہ یہاں پر در اصل دو تاء تھیں ایک تاء مخاطب اور دوسر تاء فعل اور ادغام کر دیا ہے اس لئے کہ یہاں پر در اصل دو تاء تھیں ایک تاء مخاطب اور دوسرے تاء فعل قرأت عامہ میں تاء خطاب کر دیا جاتا ہے۔ تا کہ حروف مثلان کی تکرار نہ ہو اور وہ کلمہ خفیف ہو جائے۔

ترکیب:

فراء نے کہا: اَنْ تُغْمِضُوا میں اصل اِنْ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اس لئے کہ یہ جملہ جزا کے معنیٰ میں ہے اور اس طرح ہے: اِنْ اَغْمَضْتُمْ بَعْضَ الْاِغْمَاضِ اَخَذْتُمُوْهُ اور یہ اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (سورہ بقرہ، آیت ۲۲۹) کے مانند ہے۔

محققین نے فراء کی اس بات کو رد کرتے ہوئے کہا ہے: یہ اَنْ مصدر کے معنیٰ میں ہے جیسے اَنْ تَاْتِيَنِيْ خَيْرٌ لَّكَ (تمہارا میرے پاس آنا تمہارے لئے خیر ہے) اور آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّا لِاِغْمَاضِكُمْ فِيْهِ (تم اسے لینے والے نہیں تھے مگر اس میں چشم پوشی کی بنا پر)

شان نزول:

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے پاس زمانہ جاہلیت کے سود کے مال تھے جن میں سے وہ صدقہ دیتے تھے۔ خداوند عالم نے انھیں ایسا کرنے سے نہی فرمائی اور پاک مال سے صدقہ دینے کا حکم دیا۔

ایک قول یہ بھی وارد ہوا ہے آیت ایسے گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو گھٹیا کھوریں صدقہ کی کھوروں میں گھٹیا کھجوریں ملا دیتے تھے۔علی علیہ السلام، براء بن عازب اور حسن وقتادہ سے مروی ہے۔

تفسیر:

کیا خرچ کرو یا خرچ نہ کرو

خداوند عالم انفاق اور مُنفِق (انفاق کرنے والا) کی صفت کا ذکر سابقاً گذر چکا اور یہ کہ صدقہ میں قُرْبَةً اِلَى اللهِ کی نیت واجب ہے اور صدقہ کو باطل کرنے والی چیزوں جیسے احسان جتلانے اور اذیت دینے سے حفاظت کرے۔اس آیت نے صدقہ کی صفت اور متصدق علیہ (جسے صدقہ دیا جارہا ہے) کی صفت بیان فرمائی تاکہ بیان جامع ہوجائے، ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (اے ایمان والو!) خطاب مومنین سے ہے۔ اَنْفِقُوْا (خرچ کرو) صدقہ دو۔مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (جو مال تم نے کمایا ہے اس میں سے بہتر حصہ کو یعنی (مال) حلال سے جسے تم بذریعہ تجارت کماتے ہو۔یہ ابن مسعود اور مجاہد کا قول ہے۔کہا گیا ہے کہ اچھے اور بہترین مال سے جس کی نظیر اس کا یہ ارشاد ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (سورۂ آل عمران، آیت ۹۲؛ تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہِ خدا میں انفاق نہ کرو) عبید بن رفاعہ سے مروی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: اے گروہ تجار! تم فجار ہو بجز اس کے جو شخص تقویٰ ونیکی کا راستہ اختیار کرے اور صدقہ دے اور فرمایا: مال سے اس طرح صدقہ دے پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: دس میں سے نو حصہ رزق تجارت میں ہے اور باقی (دسویں حصہ) میں بقیہ تمام ہیں۔حضرت عائشہ کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سب سے پاکیزہ مال وہ ہے جسے انسان نے اپنی کمائی میں سے کھایا اور اگر صاحب اولاد بنا تو اپنی کمائی ہی سے۔سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا: مرد کی کون سی کمائی سب سے زیادہ پاک ہوتی ہے؟ فرمایا: مرد جسے اپنے ہاتھ سے کمائے اور ہر خرید و فروخت بابرکت ہے۔حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جو شخص علم (دو خطی نسخوں میں علم کی جگہ فقہ ہے) کے بغیر تجارت کرے گا وہ سود میں مبتلا ہوتا چلا جائے۔

اس اَنْفِقُوْا صیغۂ امر کے بارے میں اختلاف ہے جس میں متعدد وجہیں بیان کی گئی ہیں: کہا گیا ہے

کہ یہ زکوٰۃ نکالنے کا حکم ہے۔ یہ عبیدہ سلمانی اور حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی قول وارد ہوا ہے کہ مستحبی صدقہ نکالنے کا حکم ہے اس لیے کہ واجبی زکوٰۃ کی قیمت کی مقدار معین ہے اگر وہ اس میں کوتاہی کرے تو اس پر قرض ہوگا یہاں تک کہ وہ اسے مکمل طور پر ادا کرے۔ اگر مال مُزَکّٰی (زکوٰۃ میں دیا جانے والا مال) پورا کا پورا ردی اور گھٹیا ہو تو اسی میں سے دینا جائز ہے۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہی قول زیادہ صحیح و درست ہے کہ اس میں فرائض اور نوافل (دونوں) شامل ہیں۔ اس سے بطور عموم راہ خیر اور نیک اعمال میں خرچ کرنا مراد ہے۔ اس ارشاد میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ حلال کمائی سے صدقہ دینے میں زیادہ ثواب ہے اس حلا مال سے صدقہ دینے کی نسبت جسے کمایا نہ ہو جیسے میراث وغیرہ سے مل گیا ہو۔ ثواب میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ اسے بدشواری حاصل کیا ہے۔

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (اور جو کچھ ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے) ان غلوں اور پھلوں سے انفاق کرو اور نکالو جن میں زکوٰۃ واجب ہے۔

ارشادالٰہی: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ (اور اس کی راہ میں دینے کے لیے بری چیز کا انتخاب نہ کرو، جس کا لینا تمھیں خود گوارا نہ ہو مگر یہ کہ اس سے چشم پوشی کر لو) یعنی ردی اور گھٹیا مال سے (زکوٰۃ دینے کا ارادہ نہ کرو) یا جس مال کو تم نے کمایا ہے یا جسے اللہ نے تمھارے لیے زمین سے اگایا اور پیدا کیا ہے کہ تم اس میں سے انفاق کرو۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہاں پر خبیث سے حرام مال مراد ہے پہلے قول کو تقویت اس کا یہ ارشاد دے رہا ہے کہ: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ اس لیے کہ چشم پوشی فقط ردی اور بیکار مال ہی میں ہوسکتی ہے حرام مال میں نہیں۔ اس فقرہ کے بارے میں دو قول ہیں:

اول: صدقہ نہ دو اس مال سے جسے تم اپنے قرض داروں سے حاصل نہیں کرتے ہو مگر مسامحہ اور مساھلہ (یعنی انھیں چھوٹ دینے اور نرمی سے پیش آنا) کے ذریعہ۔ یہاں پر اغماض (چشم پوشی) مساہلہ (آسانی فراہم کرنے) کے معنی میں ہے۔

دوم: جس چیز کو تم ان سے نہیں لیتے ہو مگر یہ کہ تم اس قیمت میں کمی کرواتے ہو۔ یہ حسن، ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے۔ اسی کے مانند زجاج کا قول ہے اور تم اسے لینے والے نہیں ہو (یعنی ردی اور گھٹیا مال کو) مگر چشم پوشی یا کم کرا کے پس تم اسے صدقہ میں کس طرح دے سکتے ہو؟

ارشادِ الٰہی: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ (تمھیں یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ تمھارے صدقات سے بے نیاز ہے) حَمِيْدٌ (اور لائق حمد ہے) یعنی اپنی نعمتوں پر مستحق حمد ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اپنی نعمتوں کے سبب اپنی مخلوقات سے سبب طالب حمد ہے یعنی انھیں ان کاموں کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان پر حمد کو واجب قرار دیتی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حمید حامد کے معنی ہے یعنی وہ تم سے اور تمھارے صدقات سے مستغنی ہونے کے باوجود تم سے تمھارے صدقات قبول فرماتا ہے، اس پر تمھاری تعریف کرتا ہے۔ اس مقام پر حمید حلیم سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے جس طرح گذشتہ آیت میں حلیم حمید سے زیادہ موزوں تھا اس لیے کہ جب خداوند عالم نے پاکیزہ کمائی سے انفاق کرنے کا حکم دیا تو اس نے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ وہ اس سے بے نیاز ہے اور وہ انفاق کرنے والے کی تعریف کرتا ہے جب وہ اس کے مطابق عمل کرتا جس کا اسے حکم دیا گیا ہے یعنی وہ اس پر انھیں جزا عطا کرے گا۔

❁❁❁❁❁

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

شیطان تمھیں فقر و فاقہ سے ڈراتا اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ بڑا صاحبِ وُسعت اور دانا ہے۔ (۲۶۸)

الفاظ و معانی:

اَلْفَقْرُ: حاجت و ضرورت۔ یہ الغِنیٰ کی ضد ہے۔

اَلْوَعْدُ اور اَلْوَعِیْدُ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اَلْوَعِیْدُ شر (دھمکی) سے مخصوص ہے۔ اَلْوَعْدُ خیر اور شر کی قید کے ساتھ دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے مگر جب اسے مطلق بولا جائے تو خیر سے مخصوص ہوگا۔

اَلْفَحْشَاءُ، اَلْفُحْشُ (بدکاری)، اَلْفَاحِشُ: بخیل۔ علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے کہ اَلْفَحْشَاءُ یعنی معصیت اور گناہ۔ بخیل کو فَاحِش اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مہمانوں اور سوال کو واپس پلٹا کر بدی کرتا ہے۔

تفسیر:

انفاق کی راہ کی رکاوٹیں

اس آیت میں خداوند عالم نے شیطان سے ڈرایا جو راہ خدا میں خرچ کرنے سے روکتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ یعنی شیطان تمھیں راہ خیر میں اور اچھے مال میں سے انفاق کرنے پر فقر وفاقہ سے ڈراتا ہے، یعنی شیطان فقر وفاقہ کی واپسی کا خوف دلاتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تمھارے مال میں تمھارے اوپر زکوٰۃ کی ادائیگی کے ذریعہ تمھیں فقر وفاقہ سے ڈراتا ہے۔ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ یعنی اور تمھیں نافرمانیوں، ترک اطاعت اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ردی اور گھٹیا مال میں سے انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے۔ خدا نے گھٹیا مال میں سے انفاق کو فَحْشَاء کا نام دیا ہے اس لئے اس میں خدا کی نافرمانی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دولت مند کسی سبب سے ضرورت مند رشتہ داروں اور پڑوسیوں پر انفاق کو ترک کرے گا تو ایسا کرنا آپسی تعلقات کے ٹوٹنے کا باعث ہوگا۔

ارشاد: وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ (اور اللہ تمھیں اپنی بخشش کی امید دلاتا ہے) یعنی بہترین مال میں سے انفاق کرنے پر خدا تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تمھاری پردہ پوشی اور تم سے عذاب دور کردے گا۔ وَفَضْلًا (اور فضل (کی امید دلاتا ہے)) یعنی (خدا) تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تمھارے صدقات تمھیں واپس پلٹا کر تمھیں خیر عطا کرے گا اور تمھارے رزق میں اضافہ کرکے سے تم پر اپنا فضل فرمائے گا۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: دو چیزیں اللہ کی طرف سے ہیں اور دو چیزیں شیطان کی جانب سے ہیں؛ اللہ کی طرف سے گناہوں کی مغفرت اور رزق میں اضافہ ہے۔ جو دو چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں وہ فقر کا وعدہ اور برائیوں کا حکم ہے۔ ابن مسعود سے روایت کی گئی ہے انھوں نے کہا: شیطان کی جماعت ہے اور ملک (پروردگار)۔ اسی کے مانند امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی روایت کی گئی ہے پھر ابن مسعود نے کہا: شیطان کی جماعت فقر وفاقہ کا وعدہ اور برائی کا حکم دیتی ہے اور پروردگار کی جماعت انفاق کا حکم دیتی ہے اور معصیت سے روکتی ہے۔

ارشاد: وَاللّٰهُ وٰسِعٌ (اللہ بڑا صاحبِ وُسعَت ہے) اس کے معنی ہم سابق میں بیان کرچکے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ واسع کے معنی ہیں وسعت اور فراخی سے عطا کرتا ہے جس کے معنی ہیں اس کی عطا و بخشش اسے

نقصان نہیں پہنچاتی، نہ ہی اس کے خزانہ میں کمی کرتی ہے۔

ارشادالٰہی: عَلِيْمٌ جاننے والا ہے کہ کون عطیہ کا حقدار ہے اور کون عطاو بخشش کا حقدار نہیں ہے۔

❁❁❁❁❁

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾
وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت مل گئی تو اسے خیر کثیر (بڑی دولت) مل گیا۔ ان باتوں سے وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو دانش مند ہیں۔ (۲۶۹)

قرأت:

یعقوب نے وَمَن يُّؤْتِ تاء کو کسرہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے تاء کو فتحہ کے ساتھ وَمَن يُّؤْتَ قرأت کی ہے۔

حجت:

جس نے تاء کو کسرہ کے ساتھ يُؤْتِ پڑھا ہے تو اس نے مراد یہ لیا ہے کہ مَن يُّؤْتِهِ اللهُ الْحِكْمَةَ (جسے خداوند عالم حکمت عطا کردے) يُؤْتِ میں ضمیر مستتر اللهُ کی جانب پلٹ رہی ہے جس طرح يُؤْتِي الْحِكْمَةَ میں اللهُ کی جانب پلٹ رہی ہے۔ اس قرأت کی تائید اعمش کی قرأت کرتی ہے کہ وَمَن يُّؤْتِ اللهُ ضمیر مفعول کو حذف کردیا ہے جو کہ ہاء ہے جو مَنْ کی طرف پلٹ رہی ہے اور وہ مَنْ شرطیہ ہے اور وہ (مَنْ) مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے اس آیت اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللهُ رَسُوْلًا میں موصول کی جانب پلٹنے والی ضمیر کو حذف کردیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس قرأت کی بنا پر مَنْ موصولہ ہوتا کہ مَنْ موصولہ کی جانب پلٹنے والی ضمیر کو حذف کردیا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس قرأت کی بنا پر مَنْ موصولہ ہوتا کہ اَلَّذِيْ کے معنیٰ میں ہو نہ کہ جزاء (شرط) کے معنی میں۔

میں کہتا ہوں اور توفیق اللہ کی جانب سے ہے: یہاں پر مَنْ ادات شرط ہوسکتا ہے اور اسی صورت میں محلاً منصوب ہوگا يُؤْتِي کے مفعول اول کے عنوان سے اور اس کا فعل پر مقدم ہونا لازمی ہے باوجودیکہ وہ مفعول ہے اس لئے کہ وہ حرف شرط کا نائب ہے جو کہ صدارت طلب ہوتا ہے اور اسی کے مثل زہیر کے اس شعر میں مَنْ ہے:

رَأَيْتُ الْمَنَايَا خَبْطَ عَشْوَاءَ مَنْ تُصِبْ تُمِتْهُ وَ مَنْ تُخْطِئْ يُعَمَّرْ فَيَهْرَمِ

اور جن قراء نے وَمَن يُؤْتَ تاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک نائب فاعل ضمیر مستتر ہے جو مَنْ کی جانب پلٹ رہی ہے۔ اور يُؤْتَ، مَنْ کی وجہ سے مجزوم ہے اور اس کی جزاء فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا ہے۔

تفسیر:

حکمت

خداوند عالم نے اپنی توصیف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ وہ (اللہ) حکمت عطا کرتا ہے، مَن يَشَاءُ (جسے چاہتا ہے) حکمت کے معنی میں متعدد تفسیریں بیان کی گئی ہیں: بیان کیا گیا ہے کہ اس سے علم قرآن، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و مؤخر، حلال و حرام اور اس کے امثال مراد ہیں۔ یہ ابن عباس و ابن مسعود سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قول اور فعل میں صحیح ہونا مراد ہے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ علم دین ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ نبوت مراد ہے۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ اللہ کی معرفت ہے، یہ عطا سے مروی ہے۔ فہم ہے۔ یہ ابراہیم سے مروی ہے۔ خوف خدا مراد ہے۔ یہ ربیع سے مروی ہے۔ قرآن اور فقہ مراد ہے، یہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ اسی طرح مجاہد سے روایت ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حکمت ایسا علم ہے کہ جس کی منفعت عظیم اور اس کے فائدے بہت زیادہ ہیں۔ یہ قول تمام اقوال کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جسے خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں، ان کی امتوں کو عطا کیا ہے جیسے کتاب، معجزات اور وہ ہدایات کہ جن کے ذریعہ انھیں اپنی اور اپنے دین کی معرفت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ اس کا فضل ہے کہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ یہ ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔ علم کو بھی حکمت کہا گیا ہے اس لیے کہ علم کے ذریعہ انسان بری باتوں سے رکتا ہے اس لئے علم میں اچھائی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے مجھے قرآن عطا فرمایا اور حکمت عطا کی جو مثل قرآن ہے، کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں حکمت میں سے کوئی چیز نہ ہو مگر یہ کہ وہ تباہ و برباد ہوگا مگر فقہ اور علم حاصل کرو اور جاہلوں کی موت نہ مرو۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ (اور جسے حکمت مل گئی) یعنی جس کا ہم نے ذکر کیا اسے وہ چیز عطا کی گئی تو فَقَدْ أُوتِيَ اسے عطا کیا گیا خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ (خیر کثیر (بڑی دولت) مل گیا۔ ان

باتوں سے وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو دانش مند ہیں) یعنی آیات الٰہی سے نصیحت حاصل نہیں کرتے سوائے صاحبان عقل کے۔ اگر کہا جائے کیوں خداوند عالم نے تذکر یعنی نصیحت قبول کرنے کو صاحبان عقل سے مخصوص کیا ہے جبکہ ہر مکلف صاحب عقل ہی ہوتا ہے؟! تو اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے تمام مکلفین پر اس صفت کا اطلاق نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں ایک طرح کی مدح وتعریف ہے لہٰذا عقل تذکر و نصیحت قبول کرنے کو صاحبان عقل سے وابستہ اور باندھ دیا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ان باتوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں جنھیں ان کی عقل لازم قرار دیتی ہے جیسے جس چیز کا حکم نے حکم دیا ہے اور اس کی دعوت دی ہے اس میں خدا کی اطاعت کرنا۔ عقل کو لُب '(گودا خالص) کہا گیا ہے اس لیے کہ یہ انسان کے اندر سب سے نفیس چیز ہوتی ہے جس طرح پھل کا لب اس میں موجود سب سے نفیس شے ہے۔

❁❁❁❁❁

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾
تم نے جو کچھ خرچ کیا ہو یا نذر مانی ہو، اللہ کو اس کا علم ہے اور ظالمیں کا کوئی مددگار نہیں۔ (۲۷۰)

الفاظ ومعانی:

اَلنَّذۡر: انسان کا اپنے اوپر کسی نیک کام کے انجام دینے کا عہد و بیان کرنا ہے شرط کے ساتھ جو فقط اس طرح کہنے سے منعقد اور نافذ ہوتا ہے: لِلّٰهِ عَلَیَّ کَذَا (اللہ کے لئے میرے اوپر فلاں کام ہے) نَذۡر اس لفظ کے بغیر ثابت نہیں ہوگی۔ نذر کے حقیقی معنیٰ خوف کے ہیں چونکہ وہ کسی کام میں کوتاہی کے خوف سے اپنے اوپر عہد کرتا ہے۔ اسی سے اِنۡذَار بھی ہے: دشمن کی جگہ اور اس سے خوف کا اعلان کرنا تاکہ اس سے بچا جا سکے۔

اَنۡصَار، نَصِیۡر کی جمع ہے، جیسے شَرِیۡف، اَشۡرَاف۔ اَلنَّصِیۡر بدشمن کے مقابلہ میں معین اور مددگار۔

ترکیب:

مَا، اَلَّذِیۡ کے معنیٰ میں ہے اور مابعد اس کا صلہ ہے اور مَا کی جانب پلٹنے والی ضمیر مفعول اَنۡفَقۡتُمۡ

سے محذوف ہے۔اس کی تقدیر یہ ہے کہ وَ مَا اَنۡفَقۡتُمُوۡهُ۔ما مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے اس کی خبر فَاِنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُهٗ ہے۔خبر سے مبتدا کی جانب پلٹنے والی ضمیر یَعۡلَمُهٗ میں ہاء ہے اور یہ ضمیر اَلنَّفَقَة کی جانب نہیں پلٹ سکتی ہے اس لئے کہ وہ مؤنث ہے اور نہ ہی اَلنَّفَقَة اور اَلنَّذۡر کی جانب نہیں پلٹ سکتی ہے اس لئے کہ ان کی جانب پلٹنا ضمیر کے تثنیہ ہونے کا باعث ہے۔

میں یہ کہتا ہوں: مَا شرطیہ ہوسکتا ہے اور اَنۡفَقۡتُمۡ کی وجہ سے منصوب ہے ایسی صورت میں مفعول کو حذف کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور تقدیر یہ ہوگی: اَیَّ شَیۡءٍ اَنۡفَقۡتُمۡ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ میں فاء مقام جزاء میں ہے۔مِنۡ نَفَقَةٍ جار و مجرور اَنۡفَقۡتُمۡ سے حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے اور ذوالحال مَا ہے۔

تفسیر:

اللہ سب کچھ جانتا ہے

پھر خداوند عالم نے انفاق کے ذکر کی طرف پلٹتے ہوئے اور اس کی جانب ترغیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ (تم نے جو کچھ خرچ کیا ہو) یعنی تم نے واجب صدقہ (زکوٰۃ) میں سے جو کچھ بھی نکالا اور خرچ کیا جسے اللہ نے تم پر فرض کیا ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تم نے جو خیر اور نیکی کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا چاہے واجبی ہو یا واجبی اور مستحبی۔

اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ (یا نذر مانی ہو) یعنی جسے تم نے نذر کے ذریعہ اپنے اوپر واجب کرلیا ہے اور اسے پورا کیا ہے نیک اعمال انجام دے کر جیسے نماز یا روزہ یا صدقہ وخیرات وغیرہ کے ذریعہ۔

فَاِنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُهٗ (اللہ کو اس کا علم ہے) یعنی اللہ اس پر تمھیں جزا عطا کرے گا اس لیے کہ وہ عالم ہے۔علم کا ذکر جزا کے محقق وثابت ہونے پر دلالت کررہا ہے یہ کلام میں ایجاز واختصار کی خاطر ہے۔وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ (اور ظالمین کا کوئی (مددگار) نہیں) یعنی انفاق اور نذر کو غلط جگہ پر انجام دینے والے مثلاً ریا کاری کے طور پر یا نقصان پہونچانے کی غرض سے یا تفرقہ واختلاف ڈالنے کے لئے خرچ کرنے والے یا غصبی مال سے انفاق ونذر کرنے والے یا حرام راستہ سے مال حاصل کرنے والے یا گناہ کی نذر کرنے یا قدرت رکھتے ہوئے نذر کو وفا نہ کرنے والے کے لئے مِنۡ اَنۡصَارٍ (کوئی مددگار) نہیں جو ان سے عذاب الٰہی کو دور کرسکے۔

❁❁❁❁❁

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۷۱﴾

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے، اور وہ اس کے سبب تمھاری بہت سی برائیوں کو مٹا دے گا تم جو عمل کررہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (۲۷۱)

قرائت:

ابن عامر اور عاصم کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے فَنَعِمَّا هِيَ میں نون کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش کے علاوہ بقیہ اہل مدینہ نے اور ابوعمرو اور یحییٰ نے نون کو کسرہ اور عین کو سکون کے ساتھ فَنِعْمَا هِيَ قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے نِعِمَّا نون اور عین کو کسرہ کے ساتھ تلاوت کی ہے یہی صورت حال سورۂ نساء میں نِعِمَّا يَعِظُكُمْ کی بھی ہے۔

اہل مدینہ نے اور عاصم کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے وَنُكَفِّرْ نون اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن عامر نے یاء اور رفع کے ساتھ يُكَفِّرُ اور بقیہ قراء نے نون اور رفع کے ساتھ نُكَفِّرُ قرأت کی ہے۔

حجت:

جن لوگوں نے فَنَعِمَّا هِيَ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کلمہ کی اصل نَعِمَ ہے اور یہاں پر کلمہ اپنے اصل کی بنا پر آیا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

نَعِمَ السَّاعُونَ فِي الْأَمْرِ الْمُبِرِ اور جن قراء نے فَنِعْمَّا عین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے تو علمائے نحو کے نزدیک ان کی قرأت صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہاں پر دو ساکن کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔ ان دونوں میں سے پہلا حرف نہ حرف مد ہے۔ اور نہ حرف لین ہے اور علمائے نحو کے نزدیک ان مقامات پر التقائے ساکنین جائز ہے جیسے: دَابَّة، أُصَيْمَّ وَ أَتَأْمُرُونِّي اس لئے کہ حرف میں موجود مد حرکت کا عوض بن

جاتا ہے۔ سیبویہ نے ایک شعر کہا ہے کہ جس میں نَعْمّا کے مانند دو ساکن جمع ہو گئے ہیں:

كَأَنَّهُ بَعْدَ كَلالِ الزَّاجِرِ وَمَسْحِهِ مَرَّ عُقَابٌ كَاسِرِ

اس کو خود ان کے ساتھیوں (علمائے نحو) نے رد کر دیا ہے۔ شاید جس نے عین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اس میں اخفاء کیا ہو جس طرح بَارِئِكُمْ میں اخفاء کرتے ہیں تو سننے والے اخفاء سے اسکان سمجھے ہوں، اس لئے کہ وہ کان میں لطیف و خفی ہوتا ہے۔

اور جن قراء نے فَنِعِمَّا نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو انہوں نے دو ساکن کو جمع کرنے سے بچنے کی خاطر عین کو حرکت میں نون کا تابع قرار دیا ہے۔ ابو عبیدہ نے ابو عمرو کی قرأت کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تلفظ ہے، عمرو بن العاص سے مروی ایک ارشاد نبوی میں کہ نِعِمَّا الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔ یہ حدیث میں اسی طرح عین کے سکون کے ساتھ بھی مروی ہے۔

ارشاد الٰہی وَيُكَفِّرُ جن قراء نے مرفوع پڑھا ہے تو اس کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور تقدیر یہ ہے: وَنَحْنُ نُكَفِّرُ عَنْكُمْ

۲۔ یہ ایک نیا جملہ ہے جو پہلے سے جدا ہے اور حرف عطف اشتراک کے لئے نہیں ہے اور جملہ کو جملہ پر عطف کرنے کے لئے ہے۔

جن قراء نے جزم دیا ہے تو انہوں نے فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ کے محل پر حمل کیا ہے۔ اسی کے مانند اس کی قرأت ہے جس نے مَن يُّضْلِلِ اللهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ پڑھا ہے اس لئے کہ فَلَا هَادِيَ لَهُ (سورۂ اعراف آیت ۱۸۶) فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۱) کے مانند محلاً مجزوم ہے۔

اس کلمہ میں یاء اور نون کو جس نے يُكَفِّرُ پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد والا لفظ مفرد ہے اور جس نے وَنُكَفِّرُ تو وہ پہلے لفظ جمع لایا ہے پھر مفرد لایا ہے جبکہ آیت میں وہ پہلے لفظ مفرد اس کے بعد جمع لایا ہے: سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ..... پھر فرمایا: بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا۔

الفاظ ومعانی:

صَدَقَة اور زَكوٰة کے درمیان فرق ہے کہ زکوٰۃ فقط فرض ہوتی ہے جبکہ صدقہ کبھی فرض ہوتا ہے اور کبھی

مستحب ہوتا ہے۔

اِخْفَاء: پوشیدہ کرنا۔اِبدَاء ,اِظْهَار ,اِعْلَان ایک جیسے ہیں۔

اِخْفَاء ,اِسرَار ,اِغمَاض ایک جیسے ہیں۔

ترکیب:

فَنِعِمَّا هِيَ۔اس کی تقدیر یہ ہے: اِنْ تُبْدُو الصَّدَقَاتِ فَنِعْمَ شَيْئاً اِبْدَاءُهَا. مَا یہاں پر نکرۂ موصوفہ اور محلا منصوب ہے اس لئے کہ نِعْمَ میں ذکر ہونے والے فاعل ضمیر کی تفسیر کر رہا ہے اور اِبْدَاء مخصوص بالمدح ہے پس مضاف جو کہ اِبْدَاء ہے اسے حذف کے مضاف الیہ جو کہ صَدَقَات کی ضمیر هِيَ ہے اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے اس لئے کہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے اور اس لئے کہ فعل مقدم اپنے مصدر پر دلالت کرتا ہے۔نیز یہ ارشاد الٰہی: وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔یعنی اَلْاِخْفَاءُ خَيْرٌ لَكُمْ ۔جس طرح اس جملہ میں ضمیر اخفاء ہے اسی طرح لازم ہے کہ اس جملہ میں ضمیر ابداء مراد ہے۔

تفسیر:

کیسے انفاق کریں

پھر خداوند عالم نے انفاق کی تعریف اور اس کی جانب رغبت دلائے ہوئے، ارشاد فرمایا: اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ (اگر اپنے صدقات علانیہ دو) یعنی اگر تم صدقات کا اظہار کرو اور ان کا اعلان کرو۔فَنِعِمَّا هِيَ (تو یہ بھی اچھا ہے) یعنی اس کا اظہار و اعلان کرنا اچھی بات ہے یعنی ان کے ظاہر ہونے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ وَاِنْ تُخْفُوْهَا (لیکن اگر اسے چھپاؤ) یعنی اسے پوشیدہ رکھو۔وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ (اور حاجت مندوں یعنی فقراء کو دو اور خاموشی سے ان تک پہنچا دو۔فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے) یعنی پوشیدہ طور پر دینا تمھارے لیے بہتر ہے اور انتہائی ثواب کا سبب ہے۔

اس صدقہ کے متعلق اختلاف ہے جس کا پوشیدہ طور پر دینا اس کے اظہار کرنے سے افضل ہے۔کہا گیا ہے کہ وہ مستحبی صدقہ ہے جس کا پوشیدہ طور پر دینا افضل ہے اس لیے کہ پوشیدہ طور پر دینا ریاکاری سے بہت دور

ہوتا ہے لیکن واجبی صدقہ میں ریاکاری داخل نہیں ہونا چاہئے اور اسے پوشیدہ طور پر دینے والا زکوٰۃ نہ دینے کی تہمت کا شکار بن سکتا ہے لہٰذا اس کا اظہار کرنا افضل ہے۔ یہ ابن عباس اور ثوری سے مروی ہے۔ اسی طرح اس کی روایت علی بن ابراہیم نے اپنی سند سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی ہے کہ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: واجبی زکوٰۃ علانیہ طور پر نکالی جائے اور علانیہ طور پر ہی دی جائے اور زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ اگر پوشیدہ طور پر دیا جائے تو افضل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے زکوٰۃ اور غیر زکوٰۃ ہر صدقہ کو پوشیدہ طور پر دینا افضل ہے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ عموم آیت سے یہی زیادہ مناسب ہے۔

وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ (اور وہ اس کے سبب تمہاری بہت سی برائیوں کو مٹا دے گا) یعنی ہم تمہاری خطاؤں کو محو کردیں گے اور انھیں بخش دیں گے۔ جس نے نُكَفِّرُ کو رفع کے ساتھ قرأت کی ہے اس کی مراد یہ ہے کہ ہم تمھیں بخش دیں گے یا خداوند عالم تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ مِنْ کو تبعیض (بعضیت) کے لیے داخل ہوا ہے اس سے دلیل پیش کی ہے اس نے۔ جس کا یہ کہنا ہے کہ سیئات سے مراد گناہان صغیرہ ہیں لیکن ہمارے مذہب (تشیع یا ہماری رائے) کے مطابق عذاب کا برطرف کرنا فضل الٰہی ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ کچھ عذاب کو برطرف کردے اور کچھ کو باقی رہے۔ اگر آیت میں مِنْ داخل نہیں ہوتا تو اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: مِنْ زائدہ ہے بطور مثال اس طرح کہا جاتا ہے: كُلْ مِنْ طَعَامِي وَخُذْ مِنْ مَالِي مَا شِئْتَ (میرا کھانا کھالو اور میرا مال جو چاہو لے لو۔ پس یہ عمومیت کے لئے ہے لیکن پہلا قول اولیٰ ہے)

مخفیانہ صدقہ کے سلسلہ میں حدیث وارد ہوئی ہے کہ مخفیانہ صدقہ غضب الٰہی کو ٹھنڈا کرتا ہے اور خطا کو ٹھنڈا کردیتا ہے جس طرح پانی آگ کو ٹھنڈا کردیتی ہے اور مصیبتوں کے ستر دروازے بند کردیتی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: سات طرح کے لوگوں پر خداوند عالم اس دن سایہ کرے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا: امام عادل، وہ جوان جس نے اللہ کی عبادت میں نشوونما پائی ہو، جو شخص مساجد سے قلبی لگاؤ رکھتا ہو یہاں تک کہ وہ اس کی طرف پلٹ آئے، ایسے دو افراد جو خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور دونوں اس پر جمع ہوں اور اللہ ہی کی محبت میں باہم جدا ہو جائیں، ایسا شخص جسے صاحب منصب و جمال عورت (بدکاری کی) دعوت دے اور وہ کہے: میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، ایسا شخص جو پوشیدہ طور پر اس طرح صدقہ دے کہ اس کے دائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو سکے کہ اس کے بائیں ہاتھ نے کیا دیا، ایسا شخص جو تنہائی میں خدا کو یاد

کرے اور اس کی آنکھیں اشکبار ہوں۔

ارشادالہی: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (تم جو عمل کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے) یعنی اللہ اس سے بخوبی واقف ہے جو تم اپنے صدقات میں کر رہے ہو کہ پوشیدہ طور پر دے رہے ہو یا علانیہ طور پر اس پر ان میں سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی تمھیں ان سب پر جزا دے گا۔

❀❀❀❀❀

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴿۲۷۲﴾
لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچانا اے نبی! آپ کی ذمہ داری نہیں، البتہ اللہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے اور راہ خیر میں تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اس کا فائدہ خود تمھیں پہنچے گا، تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل کرو، تم راہ خیر میں جو مال بھی خرچ کرو گے تمھیں اس کی پوری پوری جزا دی جائے گی اور تمھاری حق تلفی نہیں ہوگی۔ (۲۷۲)

ترکیب:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۔ شرط و جزاء ہیں۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کہا گیا ہے لفظ کے لحاظ سے نفی ہے لیکن معنیٰ کے اعتبار سے نہی ہے۔ یعنی لَا تُنْفِقُوْا جیسے یہ ارشاد الٰہی ہے: لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (سورہ واقعہ، آیت ۷۹)

کہا گیا ہے کہ یہ خود جملہ مفیدہ ہے اور اپنے ماقبل پر عطف ہے اور ظاہری طور خبر ہے۔ اِبْتِغَآءَ منصوب ہے اس لئے کہ مفعول لہ ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ شرط و جزا ہے پہلے جملہ کے مانند اسی لئے دونوں مقام پر نون کو حذف کر دیا گیا ہے۔

شان نزول:

مسلمان غیر مسلمین کو صدقہ دینے سے پرہیز کرتے تھے تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ ابن عباس و ابن حنفیہ اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ ایک قول یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اسماء بنت ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ عمرہ قضا میں مصروف تھیں ان سے ان کی والدہ قتیلہ اور دادی دونوں نے کچھ مانگا، اس وقت یہ دونوں مشرکہ تھیں، اسماء نے کہا: میں تمھیں کچھ نہیں دے سکتی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی اجازت حاصل نہ کرلوں چونکہ تم دونوں میرے دین (اسلام) پر نہیں ہو۔ چنانچہ اسماء نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی۔ اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ کلبی سے مروی ہے۔

تفسیر:

ہدایت اور انفاق

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ (لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچانا اے نبی! آپ کی ذمہ داری نہیں) بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی متعدد وجہیں ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ ان لوگوں سے صدقہ روک کر ان کی ہدایت کرنا آپ پر واجب نہیں ہے (یا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے) کہ آپ ان پر ایمان لا دیں، یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے: أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (سورۂ یونس، آیت ۹۹: تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن بن جائیں) یہ ابن عباس اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ اسی بنا پر اس کے معنی یہ ہیں کہ غیر مسلمین کو مستحبی صدقہ دینا مباح ہے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ نیکی اور خیر کی راہ میں ان پر نفقہ (خرچ) کو لا دکر آپ پر ان کی ہدایت واجب نہیں ہے۔ یہ حسن اور ابو علی الجبائی سے مروی ہے۔ جس کی تقدیر یوں ہے: لَيْسَ عَلَيْكَ اَنْ تَهْدِيَ النَّاسَ اِلَىٰ نَيْلِ الثَّوَابِ وَ الْجَنَّةِ وَ اِنَّمَا عَلَيْكَ اَنْ تَهْدِيَهُمْ اِلَى الْاِيْمَانِ بِاَنْ تَدُلَّهُمْ عَلَيْهِ یعنی ثواب اور جنت تک پہونچانے کی ہدایت آپ پر فرض نہیں ہے، آپؐ پر تو فقط ایمان کی ہدایت فرض ہے کہ آپ ایمان کی طرف ہدایت و راہنمائی کریں۔ یہ بات پیغمبر اکرم ﷺ کی تسلی اور اطمینان کے لیے ہے، اس

لیے کہ ان لوگوں کے آپ کی ہدایت کو قبول نہ کرنے اور ایمان نہ لانے پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت اور غم ہوتا تھا، اس لیے کہ آپؐ ان کے دائمی عذاب کے انجام سے واقف تھے۔ اس ارشاد کے ذریعہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی فرمائی ہے۔

سوم: اس سے مراد ہے جب کہ آپ لوگوں کو (دین کی) دعوت دے چکے ہیں، انھیں خوف خدا سے ڈرا چکے ہیں اور جس چیز کی تبلیغ کا آپ کو حکم دیا گیا تھا وہ بھی آپؐ ان تک پہونچا چکے ہیں تو ان امور کے بعد لوگوں کی ہدایت کرنا آپؐ پر واجب نہیں ہے۔ آپ پر تو فقط پیغام کا پہونچانا فرض ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایمان واطاعت کی ہدایت آپؐ پر واجب نہیں ہے اس لیے کہ آپ کو بھیجا ہی ہدایت کے لیے گیا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (البتہ اللہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے) اللہ نے ہدایت کو مشیت سے وابستہ کیا ہے، اس شخص کے لیے جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ لطف کے ذریعہ نیک بن جائے گا یعنی اس کے لئے ہدایت وتوفیق میں زیادتی کے سبب کہ اللہ سے جس کے لیے لطف چاہتا ہے۔ یہ زجاج وابوالقاسم بلخی اور بیشتر اہل علم سے مروی ہے۔ ایک قول یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ راہ جنت کی ہدایت کرتا ہے۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (اور راہ خیر میں تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اس کا فائدہ خود تمھیں پہنچے گا) یعنی نیکی کی راہ میں تم جو مال خرچ کرتے ہو اس کا ثواب خود تمھارے ہی لیے ہے۔ اس سے غرض انفاق میں رغبت دلانا ہے، چونکہ جب انسان جان لے گا کہ اس کے انفاق اور خرچ کا فائدہ خود اسی کی جانب پلٹنے والا ہے اور اسی سے مخصوص ہے تو وہ انفاق کرنے میں فیاضی اور سخاوت کرے گا، اس میں رغبت کرے گا اور اس پر حریص ہوگا۔ اس طرح عطیہ میں عطیۂ الٰہی میں غرق پیدا ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس کی عطا کا فائدہ معطی (عطا کرنے والے) کی جانب پلٹتا ہے اور اسی سے مخصوص ہوتا ہے نہ کہ اللہ سے اور بندہ کی عطا وبخشش کا ایک بڑا فائدہ خود اسی کی طرف پلٹتا ہے اور اسی سے مخصوص ہوتا ہے نہ کہ معطی سے (جسے عطا کیا گیا ہے)

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل کرو) یعنی تم فقط رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہی تو خرچ کرتے ہو، یہ اللہ کی جانب سے کے مومنین مخلصین اور اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے انفاق کی توصیف ہے، یہ لوگ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں فقط اور فقط رضائے الٰہی کے حصول کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی نہی کے ہیں اگرچہ بظاہر خبر

ہے یعنی انفاق مت کرو سوائے رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اس وجہ کے ذکر میں دو اقوال ہیں:

اول: اس سے مراد اضافت و نسبت کی تحقیق ہے، اس لیے کہ وجہ کے ذکر سے ابہام و شک برطرف ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے یا غیر کے لئے اور جب آپ نے وجہ کا ذکر کر دیا کہ جس کے معنی نفس کے ہیں تو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ اشتراک سے وہم کو برطرف کر کے اختصاص کی تحقیق کی طرف موڑ رہے ہیں۔ اس طرح آپ اضافت اور نسبت وجود میں لانے اور شراکت کے ابہام کو زائل و برطرف کرنے والے ہوں گے۔

دوم: جب آپ کہتے ہیں کہ فَعَلْتُهُ لَوَجْهِ زَيْدٍ تو یہ ذکر و بیان میں فَعَلْتُهُ لِزَيْدٍ کہنے سے زیادہ باعزت و بااہمیت ہے، درحقیقت کسی چیز کا وَجه اشرف (یعنی عظیم شرف کی حامل ہوتا ہے یا نمایاں ہوتا ہے) جس میں وہ موجود ہوتا ہے۔ پھر وہ کثرت سے استعمال ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ وجہ کی تحقیق کے بغیر ذکر کے شرف پر دلالت کرنے لگتا ہے۔ کیا آپ غور نہیں کرتے آپ کہتے ہیں: وَجْهُ الرَّأْيِ، وَجْهُ الْأَمْرِ، وَجْهُ الدَّلِيلِ، تو آپ وجہ کو وجود میں لانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ شدت ظہور اور حسن بیان کی بنا پر اس میں موجود سب سے باشرف و بااہمیت چیز کا ارادہ کرتے ہیں۔

ارشاد الٰہی: وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ (تم راہ خیر میں جو مال بھی خرچ کرو گے تمھیں اس کی پوری پوری جزا دی جائے گی) یعنی تمھیں اس کی جزا اور ثواب بکثرت عطا فرمائے گا۔ تَوْفِيَة یعنی چیز کو مکمل کرنا۔ اس نے تمھارے ساتھ بہت اچھا کیا ہے تمھیں پوری جزا اور ثواب عطا کر کے اس لیے کہ تَوْفِيَة اپنے اندر تَأْدِيَة یعنی ادائیگی کے معنی لیے ہوئے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آخرت میں تمھیں وافر و وافی (بہت زیادہ اور کافی) جزا عطا کی جائے گی۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (اور تمھاری حق تلفی نہیں ہوگی) یعنی تمھیں ثواب سے محروم کر کے جزا کی کمی کے ذریعہ (تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا) جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا یعنی اس میں کوئی کمی نہ کرو۔

❀❀❀❀❀

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۲۷۳﴾

خاص طور پر (مدد کے مستحق) وہ ضرورت مند ہیں جو راہ خدا میں گھر گئے ہیں وہ زمین میں دوڑ دھوپ کر کے کسب معاش نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف یہ سمجھتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں، تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت کو پہچان سکتے ہو وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر ان کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے۔ ان کی اعانت میں تم جو مال صرف کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔ (۲۷۳)

قرأت:

حمزہ، عاصم، ابو جعفر اور ابن عامر نے پورے قرآن میں یَحۡسَبُہُمۡ سین کو فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سین کو کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلۡاِحۡصَار: مرض یا حاجت اور خوف کے باعث تصرف سے روک دینا، اَلۡحَصۡر: دوسرے کو روکنا۔ اس کی تفسیر ارشاد الٰہی: فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ کے موقع پر گزر چکی ہے۔

اَلضَّرۡب: زمین پر چلنا۔

اَلسِّیۡمَا: علامت جس کے ذریعہ کسی چیز کو پہچان لیا جاتا ہے۔ اس کے حقیقی معنی اِرۡتِفَاع، بلند ہونے کے ہیں چونکہ یہ علامت ہے جو ظاہر ہونے کے لئے بلند کی گئی ہے۔ اسی سے اَلسَّوۡمُ فِی الۡبَیۡعِ ہے یعنی قیمت کی مقدار میں اضافہ اس لئے کہ اس میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ قیمت کی مقدار میں اضافہ کرنا ہے۔ اسی سے سَوۡمُ الۡمَاشِیَۃ: جانوروں کو چراگاہ میں بھیجنا ہے۔

اَلتَّعَفُّف: سوال مانگنے کو ترک کرنا۔

اِلْحَاف: چمٹ کر مانگنا۔(یا مانگنے میں گڑگڑانا اور تضرع وزاری کرنا)

ترکیب:

لِلْفُقَرَاء میں عامل محذوف ہے اور اس کی تقدیر: اَلنَّفَقَةُ لِلْفُقَرَاء ہے اور اس پر دلالت کرنے والی چیز پہلے گزر چکی ہے۔بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کی بازگشت وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ لِاَنْفُسِكُمْ میں لام اول کی جانب ہو رہی ہے۔علی بن عیسیٰ نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے اس لئے کہ کسی دوسری شے سے بدل لانا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب معنیٰ اور مقصود اس پر مشتمل ہو اور یہاں پر نفس کا ذکر ویسا نہیں ہے اس لئے کہ نفس کے لئے انفاق اس لحاظ سے ہے کہ وہ اس کی جانب پلٹتا ہے اور فُقَرَاء کے لئے اس اعتبار سے ہے کہ ان تک پہونچتا ہے یہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کے عنوان سے نہیں ہے اس لئے کہ یہ امر صرف مستطیع پر لازمی ہے۔لِلْفُقَرَاءِ میں عامل تُنْفِقُوْا نہیں ہوسکتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عامل اور معمول کے درمیان اجنبی اور بے ربط چیز کے ذریعہ فاصلہ نہیں ہوتا ہے۔جس طرح یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ: كَانَتْ زَيْدًا الْحُمّٰى تَأْخُذُهٗ۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا اُحْصِرُوْا سے حال کے مقام میں جملہ ہے اور ضَرْبًا يَسْتَطِيْعُ کا مفعول ہے۔يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ بھی مقام حال میں ہے اور فُقَرَآءِ ذو الحال ہے۔اِلْحَافًا مصدر ہے جسے مَنْ يَسْأَلُوْنَ کے مقام حال میں رکھ دیا گیا ہے یعنی لَا يَسْأَلُوْنَ مُلْحِفِيْنَ ۔اِلْحَافًا مفعول مطلق بھی ہوسکتا ہے اس لئے کہ اِلْحَاف کے معنی بھی ایک طرح سے سوال کرنا ہی ہے۔

شان نزول:

امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے،کلبی نے ابن عباس سے اس کی روایت کی ہے۔اصحاب صفہ کل چار سو افراد تھے جن کے پاس مدینہ میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسا قبیلہ اور خاندان تھا جس کے پاس وہ پناہ لیتے۔لہٰذا وہ لوگ مسجد میں قیام پذیر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم ہر اس سریہ و جہاد کے لیے جائیں گے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روانہ فرمائیں گے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا۔جب کسی شخص کے پاس کھانا کھانے کے بعد فاضل

خوراک بچ جاتی تو وہ شام کے وقت ان لوگوں کو دے دیتا تھا۔

تفسیر:

انفاق کا بہترین موقع

جب اللہ نے انفاق کا حکم دے چکا اور اس میں مکمل طریقے سے رغبت دلا کر اس کا مکمل ثواب بیان کر چکا تو سب سے برتر فقرا کو بیان کیا جو صدقات کا مصرف ہیں۔ لہٰذا اللہ نے فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (خاص طور پر (مدد کے مستحق) وہ ضرورت مند ہیں جو راہ خدا میں گھر گئے ہیں) اس آیت میں انفاق ہی کے معنی ہیں کیونکہ اس کے قبل والی آیت میں ان فقراء کا تذکرہ ہے جنھیں تجارت میں تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہے یا تو کافر دشمن کے خوف سے یا مرض اور فقر و فاقہ کے سبب یا عبادت پر توجہ کے سبب۔ اللہ کا ارشاد: فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ان لوگوں نے خود کو عبادت اور اطاعت میں مشغول ہونے کی وجہ سے کسب معاش سے روک دیا تھا۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (وہ زمین میں دوڑ دھوپ کر کے کسبِ معاش نہیں کر سکتے) وہ زمین پر نہ تو چل پھر سکنے کے قابل ہیں، نہ ہی اس میں تصرف کر سکتے ہیں: ان اسباب کی بنا پر جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس لئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو تجارت کرنے سے روک دیا ہے یعنی انھوں نے راہ خدا میں جہاد کو اپنے اوپر لازم قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا ان سے کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ زمین میں دوڑ دھوپ کرنے پر قدرت نہیں رکھتے جیسا کہ کہا جاتا ہے: مجھے حاکم نے اس جگہ پر رکے رہنے کا حکم دیا ہے میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا۔ یعنی میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا اس لئے کہ میں نے اپنے اوپر حاکم کی فرمانبراری کو فرض کر لیا ہے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ (ناواقف یہ سمجھتا ہے) یعنی ان کی حالت اور ان کے باطنی کیفیات سے ناواقف انھیں سمجھتا ہے اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ان کی خودداری دیکھ کر یعنی رضائے الٰہی کی طلب اور اس کے عظیم ثواب کی خواہش کی خاطر وہ اپنی فقیری اور بدحالی کے باوجود لوگوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے اور خوبصورت لباس و پوشاک پہنتے ہیں۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ (تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت کو پہچان سکتے ہو) یعنی ان کے

چہروں کو دیکھ کر ان کی حالت کو پہچان لیا جاتا ہے کہ اس میں فقر و فاقہ کی علامت نظر آتی ہے۔ یہ سدی اور ربیع کا نظریہ ہے۔ ایک اور قول ہے کہ ان کے چہروں کو دیکھ کر خشوع و خضوع کا اندازہ ہوتا ہے جو کہ صالحین کی علامت ہے۔ یہ مجاہد کا نظریہ ہے۔

ارشاد: لَا يَسْـَٔلُونَ النَّاسَ اِلْحَافًا (وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر ان کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے) کہا گیا ہے یہ لوگ کبھی بھی لوگوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں لیکن پیچھے نہیں پڑتے۔ یہ ابن عباس کا نظریہ ہے۔ زجاج، فراء اور بیشتر ارباب معانی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ آیت میں ایک ایسا فقرہ ہے جو مذکورہ بالا مطلب پر دلالت کرتا ہے يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ اگر وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے تو جاہل انھیں بے نیاز اللہ مالدار شمار نہ کرتے اس لئے کہ ظاہراً دست سوال دراز کرنا فقر و فاقہ پر دلالت کرتا ہے۔ نیز آیت کا یہ فقرہ کہ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمٰهُمْ بھی اسی بات پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ اگر وہ دست سوال دراز کرتے تو اس کے ذریعہ پہچانے جاتے، مفسرین نے کہا کہ یہ جملہ بالکل آپ کے اس جملہ کے مانند ہے: میں نے اس کا مثل نہیں دیکھا جبکہ مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی مثل ہے جسے آپ نے نہیں دیکھا ہے بلکہ تم آپ کا مقصد یہ ہے کہ کوئی اس کا مثل کوئی نہیں ہے جو نظر آتا۔ پس مراد یہ ہے کہ یہاں پر دست سوال دراز کرنا ہی نہیں ہے کہ الحاح واصرار اور پیچھے پڑنا پڑتا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کو یہ بات پسند ہے وہ کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے، وہ فقر و فاقہ کو ناپسند کرتا ہے، اللہ اپنے بندوں میں سے بردبار اور پاک باز انسان کو پسند کرتا ہے۔ بدکلام کرنے والے اور گھٹیا گفتگو کر، گڑگڑانے اور چمٹ کر مانگنے والے کو ناپسند کرتا ہے۔ معصوم علیہ السلام سے روایت ہے کہ اللہ تمھارے لیے تین چیزوں کو ناپسند کرتا ہے:

۱۔ بے جا قیل وقال کرنا

۲۔ کثرت سے لوگوں سے سامنے دست سوال دراز کرنا۔

۳۔ مال کو برباد کرنا۔

ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور وہات روکنے سے منع کیا گیا ہے۔

معصوم علیہ السلام نے فرمایا: ہاتھ تین طرح کے ہوتے ہیں: اللہ کا ہاتھ جو سب سے بلند ہے۔ عطا

کرنے والے کا ہاتھ یہ ہاتھ اللہ کے ہاتھ سے متصل ہوتا ہے اور سائل کا ہاتھ جو قیامت تک نیچا رہے گا۔

حدیث میں وارد ہوا ہے: جو شخص بے نیاز ہونے کے باوجود بلاضرورت دست سوال دراز کرے گا روز قیامت اس کے چہرہ زخمی ہوگا ہوگا یا اس پر خراش ہوگی۔ سوا کیا گیا: غنی بے نیازی کیا ہے؟ فرمایا: پچاس درہم یا اس کے برابر سونا۔

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ (ان کی اعانت میں تم جو خیر بھی مال صرف کرو گے یا کارہائے خیر میں جو کچھ بھی صرف کرو گے۔ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا) یعنی اللہ تمھیں اس پر جزا دے گا۔

❀❀❀❀❀

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾
جو لوگ اپنا مال شب و روز پوشیدہ طور سے اور ظاہر بہ ظاہر خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رَبّ کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی قسم کا خوف اور کسی طرح کا رنج نہیں ہے۔ (۲۷۴)

ترکیب:

سِرًّا وَعَلَانِيَةً، يُنفِقُونَ کے لئے حال ہیں اس کی تقدیر مُسِرِّيْنَ وَمُعْلِنِيْنَ ہے۔ دونوں اسم ہیں جنھیں مصدر کی جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ عِندَ رَبِّهِمْ ظرف مکان ہے اور اس میں عامل وہ ہے جو لَهُمْ کے لام کا متعلق ہے۔

شان نزول:

ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ آپ کے پاس چار درہم تھے، آپ نے ایک درہم دن میں صدقہ دیا، ایک درہم رات میں صدقہ دیا، ایک درہم پوشیدہ طور پر اور ایک درہم ظاہر بظاہر صدقہ دیا۔ یہ روایت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ ایک اور روایت ابوذرؓ اور اوزاعی سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ یہ آیت راہ خدا میں

گھوڑوں پر خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ایک اور روایت ہے کہ یہ آیت ہر اس شخص کو شامل ہے جو اپنا مال اللہ کی اطاعت میں اس صفت کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔ جس کا ذکر آیت میں آیا ہے اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور آیت کا حکم تمام مقامات پر ہی ہے حضرت علی علیہ السلام کے مانند عمل کریں لہذا حضرت علی علیہ السلام کو فضیلت میں سبقت بہر حال حاصل ہے۔

تفسیر:

ہر صورت میں انفاق

پھر اللہ نے انفاق کی کیفیت اور اس کے ثواب کا تذکرہ کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً (جو لوگ اپنا مال شب و روز پوشیدہ طور سے اور ظاہر بہ ظاہر خرچ کرتے ہیں) یعنی ان تمام حالتوں میں مسلسل انفاق کرتے رہتے ہیں کیونکہ یہی اوقات صدقات کے لیے معین ہیں ان کے علاوہ ان کا کوئی وقت نہیں۔ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (تو ان کا اجر ان کے ربّ کے پاس ہے) آیت کے اس فقرہ میں فا کو جزا کے لیے لایا گیا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ جزاء اطاعت خدا میں انفاق کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ زید کے پاس درہم ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں جزا کے معنی نہیں ہیں۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ (اور ان کے لیے کسی قسم کا خوف نہیں ہے) یعنی ان کے اوپر قیامت کی ہولناک (وحشتوں) کا کوئی خوف نہیں ہے۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (اور کسی طرح کا رنج نہیں ہے) یعنی وہ لوگ قیامت میں رنجیدہ نہ ہوں گے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اجر کے فوت ہو جانے اور اس کے کم ہونے کا ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ اجر کے فوت ہونے اور اس کے کم ہونے پر رنجیدہ ہونے والے ہیں۔

❀❀❀❀❀

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

جولوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھوکر مخبوط الحواس بنا دیا ہو ان کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ وہ کہتے ہیں: تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا جس شخص کو اس کے ربّ کی جانب سے نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، کھا چکا، اب اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے تو وہ سب جہنمی ہیں جہاں پر وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۷۵)

الفاظ ومعانی:

اَلرِّبَاء کے لغوی معنیٰ زیادہ، یہ رَبَا الشَّيْءُ يَرْبُوْ سے ہے یعنی زیادہ ہوئی۔ (اضافہ کرنے) کے ہیں۔ اَلرِّبَاء رأس مال (اصل پونجی) پر اضافہ اور زیادہ ہے۔

اَلتَّخَبُّط، اَلْخَبْط: ایک قسم کی ناہمواری۔ اسی طرح تَخَبُّط: دیوانگی اور خیال پردازی۔

اَلْخُبَاط: قسم حزن جیسی بیماری اس لئے کہ یہ اور عقل میں اضطراب ہے۔

اَلسُّلُوْف: آگے بڑھنا۔ اسی سے اُمَمٌ سَالِفَةٌ یعنی گذشتہ امتیں ہے۔

اَلسَّالِفَة: گردن کا اوپری حصہ۔

الاِسْلَاف: استحقاق سے قبل عطا کرنا۔

اَلْعَوْد: اَلرُّجُوْع، واپس ہونا۔

عِيَادَةُ الْمَرِيْض: مریض کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس جانا ہے۔

اَلْمَعَادُ: جس کی طرف ہر چیز کی بازگشت ہو۔ آخرت لوگوں کی بازگشت کا مقام ہے۔

اَلْعَادَۃُ: کسی چیز کا بار بار پلٹنا۔

اَلْعِیْدُ: ہر وہ دن جس میں لوگ بکثرت جمع اور اکٹھا ہوں چونکہ یہ دن ایک برس میں یا ہفتہ میں پلٹتا ہے۔

اَلْعَائِدُ: صلہ وانعام جو اپنے مالک کے پاس نفع کے ساتھ پلٹتا ہے۔

ترکیب:

کَمَا یَقُوْمُ میں کاف محلاً منصوب ہے مفعول مطلق کی بنا پر مَا موصول حرف ہے۔ اس کی تقدیر لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا مِثْلَ قِیَامِ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ اور مِنَ الْمَسِّ کا متعلق یَتَخَبَّطُ ہے اور مِنْ تبیین (بیان) کے لئے ہے۔

تفسیر:

سودخوری حرام ہے

جب خداوند عالم نے انفاق پر تشویق اور اس بات کو بھی بیان فرمایا کہ انفاق کرنے والے کو دنیا و آخرت میں کیا اجر وثواب عطا کیا جائے گا، اس کے فوراً بعد سود کا ذکر کیا جسے جاہل مال میں اضافہ سمجھتا ہے حالانکہ وہ مال کی بربادی اور کمی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا یعنی جو لوگ دنیا میں سود کھاتے ہیں، لَا یَقُوْمُوْنَ اور قیامت ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو) یعنی وہ اس طرح کھڑا ہوگا جیسے شیطان نے اسے دیوانا بنا دیا ہو۔ یہ اہل محشر کے لیے اس بات پر علامت ونشانی ہوگی کہ وہ سود خور ہیں۔ یہ ابن عباس اور حسن وسعید بن جبیر وقتادہ اور مجاہد سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ تشبیہ کے عنوان سے ہے اس لیے کہ شیطان حقیقت میں انسان کو نہ تو پچھاڑتا ہے نہ ہی اسے مرگی کی حالت میں مبتلا کرتا ہے لیکن جس پر سود کی تلخی غالب آجاتی ہے یا اس کی عقل کمزور ہوجائے شیطان اس کے امور میں دشواریاں پیدا کرتا ہے اور اس میں وسوسہ ایجاد کرتا ہے۔ اس وقت وہ دیوانگی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ اللہ کا فعل ہے جس کی نسبت شیطان کی طرف مجازی طور پر دی گئی ہے، اس لیے کہ ایسا شیطان کے وسوسہ سے ہوتا ہے۔ یہ ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی

کہا گیا ہے کہ صراع (پچھاڑنا یا مرض مرگی میں مبتلا ہونے والی کیفیت) شیطان کی جانب سے بعض میں ہوا اور بعض میں نہ ہو۔ ابوالھذیل و ابن الاخشید سے روایت ہے کہ دونوں نے کہا ہے: چونکہ ظاہر قرآن اس کی گواہی دے رہا ہے۔ عقل میں کچھ ایسا نہیں ہے جو اس سے مانع ہو (یہ بات خلاف عقل نہیں ہے) نہ ہی خداوند عالم شیطان کو اس سے روکتا ہے بعض لوگوں کا امتحان لینے کے لیے اور گناہ پر عذاب کرنے کے لیے۔ ان میں سے بعض کو اس کے سبب اذیت و تکلیف میں مبتلا کرنے کے لیے تو یہ نہیں کرتے، جس طرح بعض لوگ بعض پر مسلط ہو جاتے ہیں، اس پر ظلم کرتے ہیں، اس کا مال چھین لیتے ہیں۔ خداوند عالم اس سے مانع نہیں ہوتا، نہ ہی اسے روکتا ہے۔ سود خور کی یہ علامت ہوگی جس کے ذریعہ لوگ اسے قیامت میں پہچان لیں گے، جس طرح ہر گناہ گار کے ساتھ ایک نشانی ہوگی جس سے اس کی شناخت ہو جائے گی، اور ہر اطاعت گذار کے ساتھ اس کی اطاعت کی علامت و نشانی ہوگی جس سے اس کی پہچان ہو جائے گی۔ یہی معنی ہیں اللہ کے اس ارشاد کا کہ: ’’فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ‘‘ (سورۂ رحمٰن، آیت ۳۹: پھر اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا)

پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے شہداء احد کے متعلق فرمایا: انھیں ان کے خون اور لباس کے ساتھ دفن کر دو۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: روز قیامت میری امت اپنی قبروں سے چمکتی ہوئی روشن پیشانیوں کے ساتھ اٹھے گی جو وضو کے آثار ہوں گے نیز آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ: جب مجھے شب معراج آسمانوں پر لے جایا گیا تو میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ان کے شکم ایسے گھروں کی طرح ہیں جن میں سانپ ہوں جو ان کے شکموں کے باہر سے نظر آرہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: یہ سب سود خور ہیں۔

ہمارے علماء نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مجھے شب معراج آسمان پر لے جایا گیا تو میں نے وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان میں سے ایک کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے شکم کے بڑا ہونے کے سبب اٹھ نہیں پا رہا تھا، میں نے کہا: اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے تھے، یہ لوگ کھڑے نہیں ہو سکتے مگر اس شخص کے مانند جسے شیطان نے مس کر کے خبط الحواس بنا دیا ہو، یہ لوگ آل فرعون کی راہ پر ہیں کہ جنھیں صبح و شام آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں: پروردگار! قیامت کب آئے گی؟

آیت میں وعید ہر سودی کاروبار کرنے والے کی جانب متوجہ ہے اگرچہ وہ سود نہ کھائے، لیکن خداوند

عالم نے سود کھانے کے ذکر کے ذریعہ سود کے مال سے ہر طرح کا استفادہ کرنے پر متنبہ اور آگاہ فرمایا ہے۔ خدا نے خاص طور سے کھانے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ مال کا بڑا مقصد کھانا ہے۔ اس کی نظیر اللہ کا یہ ارشاد ہے: لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (سورۂ نساء، آیت ۲۹؛ آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے نہ کھاجایا کرو) اور یہ ارشاد: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا (سورۂ نساء، آیت ۱۰؛ جو لوگ ظالمانہ انداز سے یتیموں کا مال کھاجاتے ہیں) دونوں مقامات پر کھانے سے مراد استفادہ کی تمام جہتیں اور شکلیں ہیں نہ کہ واقعاً فقط کھانا۔

ذٰلِكَ ان پر یہ عذاب اس لیے ہوگا کہ: بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے۔) یعنی ان پر عذاب ان کے یہ کہنے کے سبب ہے وہ بیع جس میں سود نہیں ہے اس بیع کے مانند ہے جس میں سود ہے ابن عباس نے بیان کیا ہے: جب ان میں سے کسی شخص کا مقروض کے قرض کی ادائیگی کا وقت جاتا تھا اور قرض خواہ جب اس سے تقاضا کرتا تو مقروض کہتا: میری مدت بڑھادو، میں تمھارے مال میں اضافہ کردوں گا۔ دونوں اس پر راضی ہوجاتے اور اسی پر عمل کرتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ تو سود ہے تو وہ کہتے دونوں ایک جیسے ہیں۔ اس سے ان کی مراد ہوتی بیع کی حالت میں قیمت میں زیادتی اور اضافہ مدت کے سبب قرض کا وقت (پورا) ہوجانے پر برابر ہے۔ اس طرح خداوند عالم نے ان کی مذمت فرمائی ہے اور انھیں عذاب سے ڈرایا ہے اور اپنے اس ارشاد کے ذریعہ انھیں غلط قرار دیا کہ۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام) یعنی خداوند عالم نے اس بیع کو حلال قرار دیا ہے جس میں سود نہیں ہے اور اس بیع کو حرام قرار دیا ہے جس میں سود ہے۔ دونوں کے درمیان فرق اس طرح ہے کہ ایک میں اضافہ قرض کی تاخیر کے سبب ہے اور دوسرے میں بیع کے سبب ہے۔ اسی طرح بیع، بدل کا بدل ہے، اس لیے کہ اس میں ثمن (قیمت) مثمن (جس کے عوض قیمت دی جائے) کا بدل ہے اور سود بدل کے علاوہ مدت میں تاخیر کے باعث اضافہ ہے یا جنس میں اضافہ ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے چھ چیزوں میں اضافہ اور زیادتی کا حرام ہونا وارد ہے: سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور نمک، کشمش کے لیے بھی ایک قول وارد ہوا ہے۔ بجز مثل کا مثل (کے عوض) دست بدست۔ لہٰذا جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا مطالبہ کیا وہ سود میں پڑا۔

مذکورہ چھ چیزوں میں سود کے حصول میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے علاوہ فقہاء کے درمیان

اختلاف ہے ان کے نزدیک بقیہ چیزوں کو ان چھ چیزوں پر قیاس کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک سود نہیں ہے مگر ان چیزوں میں جنھیں ناپا تولا جائے۔ البتہ سود کی حرمت کی علت اور سبب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے سبب معاش اور تجارت معطل ہوتے ہیں۔ (اسی طرح) درآمد اور تجارتی مرکز بھی معطل اور بند ہو جائیں گے جب ایسا شخص موجود ہو جو درہم بھی دے اور ساتھ میں اس پر اضافہ بھی دے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: حرمت سود میں اس وجہ سے شدت کی گئی ہے کہ لوگ کار خیر کرنے سے خود کو نہ روکیں چاہے قرض کی شکل میں ہو یا بخشش کی صورت میں۔

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (لہٰذا جس شخص کو اس کے رَبّ کی جانب سے نصیحت پہنچے) یعنی جس کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے مذمت، نہی اور نصیحت یاد دہانی پہونچی۔ فَانْتَهٰى (اور آئندہ کے لیے وہ سودخوری سے باز آجائے) یعنی اس نے خود کو (سودخوری سے) روکا اور نصیحت وعبرت حاصل کی تو فَلَهٗ مَا سَلَفَ (جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، کھا چکا) یعنی نہی وارد ہونے سے قبل جو اس نے سود کھایا اور حاصل کیا وہ اس کے لیے ہے اس کی واپسی ضروری نہیں ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے: جس نے اسلام کو درک کرے (یعنی اسلام قبول کرے) اور دور جاہلیت کے کاموں سے توبہ کرلے خداوند عالم اس کے گذشتہ گناہوں سے درگذر فرمادے گا۔ سُدی نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ جو اس نے کھایا ہے وہ اس کو واپس کرنا لازم نہیں ہے، واپسی اس پر لازمی نہیں ہے۔ البتہ جو اس نے بعد میں نہ لیا ہو اس کا لینا اس کے لیے جائز نہیں ہے اور اس کا رأس مال (اصل پونجی) ہے۔

ارشاد: جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ اور دوسرے مقام پر ہے۔ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ (سورۂ یونس، آیت ۵۷) اس کی تانیث غیر حقیقی ہے اس لئے کہ موعظہ اور وعظ ایک ہی معنی میں ہیں۔

وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (اب اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے) یعنی موعظہ اور حرمت کے آنے کے بعد اس کا معاملہ اور اللہ کی جانب سے اس کا انجام اگر وہ چاہے تو اس کو کھانے سے اس کی حفاظت کرے اور اسے سود سے باز رہنے میں اسے ثابت قدم رکھے چاہے تو اسے رسوا کردے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس کا معاملہ آخرت کے حکم میں خداوند عالم کے حضور ہوگا اگر توبہ نہیں کرے گا تو یہ چیز اللہ کے لیے محال نہیں ہے کہ وہ چاہے تو اپنے عدل کی بنا پر اس پر عذاب کرے اور چاہے تو اپنے فضل کی بنا پر اسے معاف کردے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس کا امر اللہ کے سپرد ہے کہ وہ گذشتہ سود پر اس کا مواخذہ نہیں کرے گا۔

وَمَنْ عَادَ (اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے) جو (سود) کی حرمت کے بعد سود کھانے کی طرف پلٹے۔ سود کھائے یہ موعظ آنے سے قبل جو اس طرح کہتا تھا ان البیع مثل الربا وہ موعظہ اور نصیحت آنے کے بعد بھی اسی بات کو دہرائے تو فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (وہ سب جہنمی ہیں جہاں پر وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) اس لیے کہ اب یہ بات وہی کہے گا جو کافر اور سود کو حلال سمجھنے والا ہے اسی لئے خدا نے دائمی عذاب سے ڈرایا ہے۔

فقہاء کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ سود نقد اور ادھار دونوں میں حرام ہے۔ بعض گذشتہ علماء نے کہا ہے کہ سود نہیں ہے سوائے ادھار میں، زمانۂ جاہلیت میں لوگ قرض کی تاخیر میں ایک مقام سے دوسرے مقام میں اضافہ کے ساتھ سود لیا کرتے تھے اس کی حرمت میں بھی اختلاف نہیں ہے اس سود کی حدیثوں میں سے ایک حدیث وہ ہے جس کی روایت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود سے متعلق پانچ لوگوں پر لعنت فرمائی ہے: سود کھانے والے پر، سود کھلانے والے پر، اس کے دونوں گواہوں پر اور سود کے کاتب پر۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: جب خداوند عالم کسی قریہ کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو ان میں سود ظاہر اور غالب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور روایت میں آپؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: سود کے ستر باب (دروازے) ہیں، ان میں اللہ کے نزدیک سب سے پست اس کے مانند ہے کہ 'سود خور نے' گویا اپنی ماں سے نکاح کیا ہے۔ جمیل بن دراج نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے: سود کا ایک درہم اللہ کے نزدیک ستر زنا سے بڑا (گناہ) ہے، جن میں سے تمام زنا اپنے محرم سے خانۂ کعبہ میں کیے گئے ہوں۔

❀❀❀❀❀

يَمۡحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرۡبِي ٱلصَّدَقَٰتِۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿۲۷۶﴾

اللہ سود کو بے برکت بنا دیتا ہے اور صدقات کو پروان چڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے اور خطا کار انسان کو پسند نہیں کرتا۔(۲۷۶)

الفاظ ومعانی:

اَلْمَحْق: کسی چیز کا ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں کم ہونا۔

اِمْتَحَقَ کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں (یعنی) ایک حالت سے دوسری حالت میں (رفتہ رفتہ) ختم ہونے کے ہیں۔

اَلْمِحَاق: ماہ کا آخر چونکہ ماہتاب اس زمانہ میں ختم ہونے کے نزدیک ہوتا ہے۔

الاَثِیْم: مسلسل گناہ کرنے والا۔　آثِم: گناہ کرنے والا۔

تفسیر:

صدقہ کی برکتیں اور سود خوری

خداوند عالم نے گذشتہ (بیان) کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: يَمْحَقُ اللّٰهُ (اللہ بے برکت بنا دیتا ہے) یعنی اللہ کم کر دیتا ہے۔ الرِّبٰوا (سود کو) آہستہ آہستہ یہاں تک کہ پورا مال تلف اور برباد ہو جاتا ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے مراد یہ ہے کہ اللہ اسے فنا کر دیتا ہے اور اس کی برکت کو ختم کر دیتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک شخص نے عرض کیا: دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان سود لیتا ہے اور اس کا مال بڑھتا ہے، اس میں کثرت ہوتی ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: اللہ اس کا دین برباد کر دیتا ہے اگرچہ مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابوالقاسم بلخی نے بیان کیا ہے کہ خداوند عالم دنیا میں اس کی عدالت ختم کر کے اس پر فسق کا حکم لگاتا ہے اس کا نام فاسق رکھتا ہے۔

وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (اور صدقات کو پروان چڑھاتا ہے) یعنی اس میں اضافہ کرتا ہے یعنی دنیا میں خود مال میں برکت اور اضافہ کرتا ہے اور آخرت میں اس کے اجر وثواب اضافہ فرمائے گا۔ یہ بات اس سے استفادہ کرنے اور اور اس میں حسن نیت کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ

نے فرمایا بلاشبہ خداوند عالم صدقات قبول فرماتا ہے اور ان میں سے صرف پاک صدقات ہی کو قبول کرتا ہے اور صدقہ دینے والے کے لیے (صدقہ) کو اس طرح پروان چڑھاتا ہے جس طرح تم اپنی گھوڑی کے بچھیرے اور بچھیری کو پروان چڑھاتے اور پالتے ہو یہاں تک کہ لقمہ کو وہ احد کے مانند ہو جاتا ہے۔

آیت میں اہم بات یہ ہے کہ سود خور سود کے ذریعہ مال میں زیادتی اور اضافہ چاہتا ہے اور صدقہ نہ دینے والا مال میں اضافہ کے لیے صدقہ روکتا ہے۔ اللہ نے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ سود مال میں کمی کا سبب ہے، اضافہ کا نہیں اور صدقہ اضافہ کا ذریعہ ہے نقصان اور کمی کا نہیں۔

ارشاد الٰہی: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (اور اللہ کسی ناشکرے اور خطا کار انسان کو پسند نہیں کرتا) الکفار فعال کے وزن پر کفر سے ہے کفار یعنی جو کفر پر قائم ہو، اس سے وابستہ ہو اور اس کا عادی ہو چکا ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنی ہر نعمت کا انکار کرنے والے کو دشمن رکھتا ہے جو سود کے ذریعہ حلال کی گئی ہو وہ کھانے کے ذریعہ اس کے گناہ میں اضافہ کرتا ہے۔

اللہ نے كُلَّ كَافِرٍ نہیں فرمایا اس لیے کہ جب وہ سود کو حلال قرار دیتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے اور جب اسے حلال سمجھ کر بکثرت کھاتا ہے تو اس کے کفر میں مزید کفر کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جب سود کو حلال و جائز سمجھتا ہے اور اسے سود نہیں سمجھتا نہ ہی اسے کسی طرح کی شرمندگی محسوس ہوتی ہے تو ان دونوں باتوں کا جمع ہونا غضب الٰہی کا تقاضا کرتا ہے جس کا تقاضا دو باتوں سے ایک بات نہیں کرتی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: لوگوں پر ایسا زمانہ آنے والا ہے سود کھانے سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکے جو سود نہیں بھی کھائے گا اس تک سود کا غبار (معمولی اثر) ضرور پہونچے گا۔

❀❀❀❀❀

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے، نماز قائم کی اور زکوۃ دی تو ان کا اجر ان کے ربّ کے پاس موجود ہے، ان کے لیے نہ کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی کسی طرح کا رنج۔ (۲۷۷)

تفسیر:

ایمان و عمل صالح

اس آیت کے معنی واضح ہیں اور اس کی تفسیر سابق میں گذر چکی ہے۔ خدا نے ان صفات کو یکجا بیان کیا ہے یہ اس لیے نہیں ہے کہ (ان ان میں سے ہر ایک پر ثواب کا مستحق نہیں ہوگا اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو ان میں سے ہر حکم کو سبک شمار ہونا ہوتا بلکہ ان احکام کو یکجا جمع کرنے کا مقصد ان کو عظیم سمجھنا اور ان کو اہمیت دینا ہے یا اس بات کو بیان کرنا ہے کہ ان سارے احکام کو بجالانا ان میں سے کسی ایک کو بجالانے سے زیادہ اجر و ثواب رکھتا ہے جس کی نظیر اللہ کے اس ارشاد میں موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ (سورۂ فرقان، آیت ۶۸: اور وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس نفس کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے)

ان احکام کو وعید میں جمع کر دیا ہے تا کہ وضاحت کر دے کہ ان میں سے ہر ایک صفت کا حامل عذاب کا مستحق ہے اور ان میں سے ہر صفت سے ڈرانے کے لئے ہے اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارتا ہے اس کے وعید کے مستحق ہونے میں دوسرے عمل کی شرط کی کوئی ضرورت نہیں ہے جب وعید کا استحقاق ان تمام صفات کے حامل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو ان میں سے ہر صفت کے لیے وعید کا ہونا آسان ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس طرح کی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ایمان جوارح کے افعال سے نہیں ہے، نہ ہی وہ اعضا و جوارح پر مشتمل ہے اگر ایسا ہوتا تو ان افعال کا ایمان پر عطف کرنے کا کوئی مطلب نہ ہوتا اس لئے کہ کسی چیز کو خود اپنے اوپر عطف کرنا صحیح نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ کے اس قول کے مانند ہے کہ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (اور وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا) ہم اس کے جواب میں کہیں گے: یہاں کا اختلاف وہاں کے اختلاف کی طرح ہے، اس لیے کہ تکذیب ہمارے نزدیک بذات خود کفر نہیں ہے بلکہ کفر پر دلالت ہے۔ اسی طرح راہ خدا سے روکنا بھی ہے۔ اس آیت میں اور اسی کے مانند دیگر آیات سے (اعمال کے) حبط (ضائع

ہونا) پر استدلال کیا جاتا ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے ان صفات کے ہونے کی صورت میں ثواب کی ضمانت دی ہے اور اس نے شرط قرار نہیں دی ہے کہ کوئی ایسا عمل نہ کرے جو ان اعمال کو حبط و برباد کر دے۔

لوگ اگر وہ یہ کہیں کہ اس شرط کا ہونا ضروری ہے جس طرح کفر پر وعید توبہ کے برطرف ہونے سے مشروط ہونی چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں پر توبہ اجماع مسلمین کی بنا پر شرط ہے نہ یہ کہ عذاب کو ساقط کرنے کا سبب ہے۔ خداوند عالم نے توبہ کی صورت میں عذاب ساقط کر دینے کا وعدہ فرمایا تو وہ اس کے فضل و کرم کی بنا پر ہے اور جو ان حضرات نے آیات وعد میں شرط کا دعویٰ کیا ہے تو اس پر کوئی اجماع نہیں ہے۔ پس دونوں باتوں کے درمیان فرق واضح ہو گیا۔

❁❁❁❁❁

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۷۸﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۷۹﴾
اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم واقعی مومن ہو۔ (۲۷۸) لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو تم اپنا اصل سرمایہ لینے کے حقدار ہو، نہ تم کو اختیار ہے کہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔ (۲۷۹)

قرائت:

عاصم نے ابی بکر کی روایت جو کہ ابن غالب کے علاوہ ہے اور برجمی نے حمزہ نے فَآذِنُوا اور ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فَأْذَنُوا پڑھا ہے اور شواذ میں لا تُظْلَمُونَ وَ لَا تَظْلِمُونَ پڑھا گیا ہے۔

حجت:

سیبویہ نے کہا: آذَنْتُ یعنی أَعْلَمْتُ و أَذَّنْتُ کے معنیٰ ہے اور تَأْذِین یعنی نِدَاء، اَلتَّصْوِیْتُ

بِالۡاِعۡلَامِ (اعلان کرنا، آواز لگانا) نیز کہا: بعض عرب آذَنۡتُ کو اَذَّنۡتُ کے مانند قرار دیا ہے جو آواز لگانے اور پکارنے کے معنیٰ میں ہے، ابوعبیدہ نے کہا: آذَنۡتُكَ اٰذَنۡتُ بِحَرۡبٍ فَاَذَّنۡتُ بِهٖ تَاَذَّنَ اِذۡنًا یعنی عَلِمۡتُ پس جس نے فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ پڑھا ہے اس نے مد نہیں دیا ہے۔ تو معنیٰ یہ ہیں کہ فَاعۡلَمُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی تم لوگ جان لو کہ تم اس سے انکار کیا تو یہ خدا اور رسول سے جنگ ہے۔

اور جن قراء نے فَاٰذِنُوۡا مد کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی تقدیر یہ ہے کہ جو ربا لینے سے باز نہیں آئے تو اس سے اعلان جنگ کر دو۔ یہاں پر اس بات کے پیش نظر مفعول حذف کر دیا گیا ہے کہ جب انہیں دوسروں کے درمیان اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ خود لامحالہ اس سے آگاہ ہیں۔ ان کو اعلان کا حکم دینے میں کہ جو وہ جانتے ہیں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے جس سے ان کو منع کیا گیا ہے تو وہ خود بھی حالت جنگ میں ہیں اور اس علم میں دوسروں کے بتانے پر دلالت نہیں ہے۔ پس یہ ابلاغ اور پہونچانے میں زیادہ زوردار ہے۔

ترکیب:

اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ، جواب شرط محذوف ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ فَذَرُوۡا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰٓوا۔ لَا تَظۡلِمُوۡنَ فَلَكُمۡ سے حال کی بنا پر منصوب ہے۔ تقدیر یہ ہے: فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ غَيۡرَ ظَالِمِيۡنَ وَلَا مَظۡلُوۡمِيۡنَ۔

شان نزول:

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ دور جاہلیت میں سود لیا کرتا تھا۔ اس کا (قبیلہ) ثقیف پر بقایا (پیسہ) تھا۔ اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد خالد بن ولید نے (بقیہ پیسہ) کا مطالبہ کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ سُدی و عکرمہ نے بیان کیا ہے یہ آیت عباس و خالد بن ولید کے باقی ماندہ سود کے بارے میں نازل ہوئی جو زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار میں شریک تھے۔ (خاندان) ثقیف کے افراد بنی عمرو بن عمیر دکو (سود پر پیسہ) دیا کرتے تھے جس وقت اسلام آیا دونوں کے پاس سود کا بہت زیادہ مال تھا۔ لہذا خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آگاہ ہو جاؤ زمانۂ جاہلیت کا ہر سود معاف کیا جا چکا ہے، پہلا سود جسے میں معاف کر رہا ہوں وہ ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا سود ہے اور زمانۂ جاہلیت کا ہر خون معاف کیا جاتا ہے پہلا خون جسے میں معاف کر رہا ہوں وہ ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون ہے جو بنی لیث کا رضاعی بھائی تھا جسے ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ بنی ثقیف کے چار بھائیوں مسعود، عبد یالیل ،حبیب ، ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی جو بنی عمرو ابن عمیر بن عوف ثقفی تھے۔ جو بنی المغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے اور ان سے سود لیتے تھے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف میں وارد ہوئے اور (قبیلہ) ثقیف سے مصالحت فرمائی تو ان چاروں برادران نے اسلام قبول کر لیا اور بنی المغیرہ سے اپنے سود کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنا معاملہ مکہ میں موجود رسول اللہ ﷺ کے عامل عتاب بن اسید کے سامنے پیش کیا، عتاب نے پورا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریر کیا۔ پس اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تفسیر:

سود خوری کے نقصانات

خداوند عالم نے سود کے باقی حکم کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ (اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو) سود کے بارے میں اور ہر اس چیز کے بارے میں جس سے تمھیں روکا ہے۔ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا (اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو) یعنی باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو اسے مت لو اور اپنے رأس مال (اصل پونجی پر) اکتفا کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (اگر تم واقعی مومن ہو) یعنی جو مومن ہے اس کے لیے یہ حکم ہے اور جو مومن نہیں ہے اس سے جنگ ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اگر تم سود کی حرمت پر ایمان رکھتے ہو، اور تم اس میں موجود فساد اور خرابی کی تصدیق کرتے ہو جس کی اللہ نے تعلیم دی ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا (لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا) یعنی اگر تم نے امر الٰہی کو قبول نہیں کیا اور اس کی اطاعت نہیں کی اور سود کو ترک کرنے سے متعلق آیت کے نازل ہونے کے باوجود بقیہ سود کو نہیں چھوڑا تو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے) یعنی تو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا یقین کر لو اور جان لو یعنی تم اس بات کا یقین کر لو کہ تم دنیا میں قتل

کے مستحق ہو اور آخرت میں آتش جہنم کے اس لئے کہ تم نے خدا اور رسول کے حکم کی مخالفت کی ہے اور جب نے آذنوا پڑھا ہے تو اس کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہیں کہ جو سود لینے سے باز نہیں آ رہا ہے اس سے جنگ کا اعلان کر دیجئے۔ جنگ کے معنی اللہ اور اس کے رسولؐ سے عداوت و دشمنی ہے۔ یہ سودخوری کے گناہ کبیرہ ہونے کی خبر ہے۔ ابن عباس، قتادہ اور ربیع سے مروی ہے کہ جو سود لے اور امام اس سے توبہ طلب کرے اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: سود کھانے والے کی بینہ (گواہی) کے بعد تادیب کی جائے گی، اگر وہ دوبارہ ایسا کرے تو پھر اس کی تادیب کی جائے گی اگر پھر ایسا ہی کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

ارشاد: وَإِنْ تُبْتُمْ (اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو)) یعنی سود کو حلال ماننے سے توبہ کر لو اور اس کے حرام ہونے کا اقرار کر لو فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (تو تم اپنا اصل سرمایہ لینے کے حقدار ہو) نہ کہ زیادہ اور اضافہ کا۔ لَا تَظْلِمُونَ (نہ تم کو اختیار ہے کہ کسی پر ظلم کرو) یعنی اس سے رأس مال سے زیادہ اور اضافی لے کر۔ وَلَا تُظْلَمُونَ (اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا) یعنی نہ ہی تمھارے رأس مال میں کوئی کمی کی جائے گی

❀❀❀❀❀

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۸۰﴾
تمھارا قرض دار تنگ دست ہو تو آسودگی پیدا ہونے تک اسے مہلت دو، اور صدقہ کر دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم یہ بات سمجھتے ہو۔ (۲۸۰)

قرأت:

ابو جعفر نے عُسُرَة سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لفظ کے یہ دونوں تلفظ ہیں۔

زید نے یعقوب سے مَیْسُرَة سین کو ضمہ کے ساتھ یاء کی طرف مضاف پڑھا ہے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔

عاصم نے تَصَدَّقُوا صاد کو بغیر تشدید کے قرأت کی ہے۔ اس طرح کے فعل کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے اس لئے کہ دونوں قرأتوں میں تَتَصَدَّقُوا ہے۔ دونوں میں سے ایک میں دو تاء میں سے ایک کو

حذف کر کے اور دوسرے میں ادغام کر کے تخفیف کی گئی ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلنَّظِرَۃ: تاخیر کرنا، ٹالنا، یہ اسم ہے جو انظار کا قائم مقام ہے (یعنی مہلت دینا)

المَیْسِرَۃ اور اَلْمَیْسُوْر کشائش اور دولت و وسعت۔

ترکیب:

یہ کَانَ تامہ ہے اور یہ اپنے فاعل پر مکمل ہو جا رہا ہے اور اسی پر اکتفاء کی جا رہی ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: وَاِنْ وَقَعَ ذُوْ عُسْرَۃٍ۔

کہا گیا ہے: یہ کَانَ ناقصہ ہے اس کی خبر محذوف ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ غَرِیْماً لَّکُمْ۔ اور اس طرح پڑھا جاتا تب بھی صحیح تھا کہ وَاِنْ کَانَ ذَا عُسْرَۃٍ یعنی اِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْہِ الدَّیْنُ ذَا عُسْرَۃٍ۔ شواذ میں ابی سے یہی مروی ہے۔ فَنَظِرَۃٌ مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس میں فاء جزاء کے لئے ہے تقدیر یہ ہے: فَالَّذِیْ تُعَامِلُوْنَہٗ بِہٖ نَظِرَۃٌ

وَاَنْ تَصَدَّقُوْا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا ہے اور اس کی خبر خَیْرٌ لَّکُمْ ہے۔

تفسیر:

مقروض کو مہلت دینا

جب خداوند عالم نے مقروض سے رأس مال (اصل مال) لینے کا حکم دیا اس کے بعد مقروض کی حالت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ (تمہارا قرض دار تنگ دست ہو) یعنی اگر تمہارا مقروض تنگی میں مبتلا ہو۔ ممکن ہے اس کی تقدیر اس طرح ہو: وَاِنْ کَانَ غَرِیْماً لَّکُمْ ذُوْعُسْرَۃٍ یعنی اگر تمہارا مقروض تنگ حالی کا شکار ہو جائے۔ فَنَظِرَۃٌ (تو اسے مہلت دو) یعنی اس کے ساتھ مہلت والا برتاؤ کرنا۔ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ (آسودگی پیدا ہونے تک) وسعت پیدا ہونے تک یعنی مہلت دینا واجب ہے۔ صیغہ خبر کا ہے۔ لیکن اس سے مراد حکم ہے یعنی (مقروض) کو اس کی وسعت کے وقت تک کے لیے مہلت دو۔ تنگی کی حد کے سلسلہ میں

اختلاف ہے؛امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: جب تک مقروض میانہ روی کے ساتھ اپنی اور اپنے عیال روزی اور خوراک سے اضافہ پر قادر نہ ہو جائے۔ ابوعلی الجبائی نے کہا ہے: مال ومتاع کے فقدان اور اس کے کساد سے معذور ہونا ہے۔

اسی طرح تنگ دست کو مہلت دینے کے واجب ہونے کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

اول: ہر قرض میں (مہلت دینا) واجب ہے۔ یہ ابن عباس اور ضحاک اور حسن سے مروی ہے۔ یہی حکم امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی مروی ہے۔

دوم: فقط سود کے قرض میں مہلت دینا واجب ہے۔ یہ شریح وابراہیم نخعی سے مروی ہے۔

سوم: آیت کے ذریعہ سودی قرض میں مہلت واجب ہے اور ہر قرض میں مہلت دینا سودی قرض پر قیاس کے سبب واجب ہے۔ امام باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خبر امام تک پہونچ جائے پس وہ زکوٰۃ کے مصرف سہم غارمین (مقروض) سے اس کا قرض ادا کرے گا جب مقروض نے قرضہ کو کار خیر میں خرچ کیا ہوگا۔

وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ (اور صدقہ کردو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے) یعنی تنگ دست پر موجود قرض کو صدقہ قرار دینا تمھارے لیے بہتر ہے۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (اگر تم یہ بات سمجھتے ہو) خیر وشر کو تم الگ الگ کرتے ہو کہ کیا تمھارے حق اور فائدہ میں ہے اور کیا تمھارے نقصان میں ہے۔ آیت کی تفسیر میں یہ حدیث آئی ہے وہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص تنگ دست کو مہلت دے یا اس سے قرض کو اٹھالے تو خداوند عالم اسے اس روز عرش کے نیچے سایہ عطا کرے گا (جس دن) اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

برید ہ نے امام علیہ السلام سے روایت کی ہے آپ نے ارشاد فرمایا: جو کسی تنگ دست کو مہلت دے گا اس کے لیے ہر دن صدقہ ہوگا۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ اس کا مقروض تنگ حال ہے تو اس کو قید کرنا، اسے پابند کرنا اور اس سے مطالبہ کرنا حرام ہے اسے مہلت دینا واجب ہے، اس کی وسعت اور کشائش کی حالت پیدا ہونے کے انتظار میں رأس مال کو تنگ دست پر صدقہ کرنا اس کی وسعت حال کے انتظار سے افضل ہے۔ ابن عباس وابن عمر سے روایت کی گئی ہے کہ قرآن کے سب سے آخر میں سود کی آیت نازل ہوئی۔

❀❀❀❀❀

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اس دن (کی رسوائی اور مصیبت) سے بچو جبکہ تم اللہ کی طرف واپس جاؤ گے، وہاں ہر شخص کو اس کی کارکردگی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۸۱)

قرائت:

ابوعمرو اور یعقوب نے تَرْجِعُوْنَ کو تاء کے فتحہ کے ساتھ فعل معلوم اور باقی قراء نے تاء کے ضمہ کے ساتھ (فعل مجہول) پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعمرو کی دلیل یہ ارشاد الٰہی: اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ہے، کہ مصدر کو فاعل کی جانب مضاف کیا گیا ہے اور یہ تَرْجِعُوْن کے مقام میں ہے۔ اور آب، رَجَعَ کے مانند ہے اور جن قراء کی دلیل وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ہے ان کے نزدیک فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ہے۔

ترکیب:

يَوْماً منصوب ہے اس لئے کہ مفعول بہ ہے اور یہاں پر اسے ظرف کی بنا پر نصب نہیں دے سکتے ہیں اس لئے کہ اِتَّقُوْا فِي هٰذَا الْيَوْمِ کے معنیٰ میں نہیں ہے اور ارشاد الٰہی: تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ جملہ ہے جو کہ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ يَوْمًا کی صفت ہے اور تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ محلاً منصوب ہے کہ يَوْمًا کی صفت پر عطف کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں فِيْهِ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ پہلا فِيْهِ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

شان نزول:

یہ قرآن کریم کی نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔ جبرئیلؑ نے کہا: اسے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۰

کے اوپر میں قرار دیجئے! یہ ابن عباس وسدی سے مروی ہے۔ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (سورۂ زمر، آیت ۳۰؛ پیغمبر آپ کو بھی موت آنے والی ہے اور یہ سب مرجانے والے ہیں) تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کاش مجھے معلوم ہوتا یہ کب ہوگا؟ اس وقت خداوند عالم نے سورۂ النصر نازل فرمایا: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ رسولؐ اس سورہ کے نزول کے بعد تکبیر اور قرأت کے درمیان سکوت فرماتے تھے، پھر فرماتے تھے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ لوگوں نے عرض کیا: آپؐ اس سے قبل تو یہ نہیں کہتے تھے؟ آپؐ نے فرمایا: میرے نفس نے مجھے رنج وغم کی خبر دی ہے، پھر آپؐ نے شدید گریہ فرمایا۔ لوگوں نے عرض کی: یارسولؐ اللہ! کیا آپ خوف موت سے گریہ فرمارہے ہیں جبکہ خداوند عالم نے آپؐ کے اگلے پچھلے گناہوں کو بخش دیا ہے؟! آپؐ نے کہا: کہاں قیامت کا خوف؟! کہاں وہ تنگی قبر اور تاریکی لحد؟! کہاں وہ قیامت اور اس کی ہولناکی؟! اس سورہ کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکمل ایک برس زندہ رہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (سورۂ توبہ، آیت ۱۲۹-۱۲۸؛ لوگوں تمھارے پاس تم میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں جو تمھیں ناگوار ہے وہ ان پر بھی بہت شاق ہے وہ تمھاری بھلائی کے خواہش مند ہیں اور مومنین پر مہربان اور بے حد شفیق ہیں۔ اب اگر یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں تو (اے نبی!) آپ فرمادیجئے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے، نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور وہی مالک عرش عظیم ہے)

سورۂ نصر قرآن کا نازل ہونے والا آخری مکمل سورہ ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ ماہ تک زندہ رہے۔ جب آپؐ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تو راستہ میں آپ پر آیت يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ ...الی آخر آیۃ (سورۂ نساء، آیت ۱۲۷) نازل ہوئی۔ اسے آیت صیف کہا گیا ہے۔ جب آپ عرفہ میں تھے اس وقت آپ پر آیت: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ اکیاسی (۸۱) روز زندہ رہے، پھر آپ پر آیت ربا نازل ہوئی، پھر آیت: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ نازل ہوئی۔ آسمان سے نازل ہونے والی یہ آخری آیت تھی۔ اس

کے نزول کے بعد رسول اللہ اکیس دن زندہ رہے۔ ابن جریج نے کہا: نو راتیں۔ سعید بن جبیر اور مقاتل نے کہا: سات راتوں راتیں پھر دوشنبہ کو حضورؐ کی وفات ہوگئی اور ابھی ربیع الاول کی دو شبیں گزریں تھیں جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ ہمارے علما سے روایت کی گئی ہے کہ جب حضورؐ کا وصال ہوا ۱۱ سنہ ھ صفر کی دو راتیں باقی تھیں (یعنی ۲۸ صفر) ہماری جان قربان ہو آپ کی حیات طیبہ پر اور آپؐ کے وصال کے بعد بھی۔

تفسیر:

اس دن سے بچو

حدود اور احکام کی آیات کے بعد خداوند عالم نے مکلفین کو خوف دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوْا يَوْمًا (اس دن (کی رسوائی اور مصیبت) سے بچو) یعنی اس دن سے ڈرو، اس دن سے خوف کرو۔

تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (جب کہ تم اللہ کی طرف واپس جاؤ گے) جب تم سب کو اللہ کی جزا کی طرف پلٹایا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اقتدار اور ملک کی طرف پلٹایا جائے گا تمھارے فائدہ اور نقصان کے لیے نہ کہ غیر کی جانب کہ دنیا میں کس کے مالک تھے۔ یہی مراد ہے قرآن میں موجود ہر اس لفظ سے اس لیے کہ خدا کی ذات کسی سے غائب و پوشیدہ نہیں نہ ہی کوئی اس کے علم و ملک اور اقتدار و حکومت سے پوشیدہ اور مخفی ہے اور اس پر خدا کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (سورۂ حدید، آیت ۴؛ اور وہ تمھارے ساتھ ہے چاہے تم جہاں کہیں رہو) مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (سورۂ مجادلہ، آیت ۵۸؛ جب بھی تین آدمیوں میں سرگوشی ہوتی ہے اللہ ان میں چوتھا ہوتا ہے)

روز قیامت کو اس صفت سے مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگ محشور ہوں گے تو ان کا امر منقطع اور ملک (اقتدار) ختم ہو جائے گا اور ان میں سے کسی ایک کا بھی نہ امر باقی رہے گا اور نہ نہی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ (سورۂ غافر، آیت ۱۶)

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (وہاں ہر شخص کو اس کی کارکردگی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا) اس میں دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

اول: ان کے اعمال کی پوری پوری جزا دی جائے گی۔

دوم: انھوں نے ثواب اور عذاب میں سے جو کمایا ہوگا اسے پورا پورا دیا جائے گا اس لیے کہ کسب کی

دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو براہ راست خود انسان کا عمل وفعل ہے دوسرے وہ چیز جو اس کے عمل وفعل کا نتیجہ ہے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔) یعنی جس ثواب کے وہ مستحق ہیں اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس عذاب کے وہ حقدار ہیں اس میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

❁❁❁❁❁

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـــمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اے ایمان لانے والو! جب تم ایک مقررہ میعاد کے لیے آپس میں قرض کا لین دین کرو تو لکھا پڑھی کرلیا کرو۔ اور لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ عدل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معاہدہ تحریر کرے۔ اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ جس طرح اللہ نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے اسے بغیر کسی عذر کے لکھنا چاہیے اور جس کے

ذمّے قرض عائد ہوتا ہے اسے چاہیے کہ دستاویز کی عبارت کو بتاتا جائے اور اس معاملہ میں اللہ سے ڈرتا رہے اور بتاتے وقت قرض دینے والے کے حقوق میں کچھ کمی نہ کرے اور اگر قرض لینے والا کم عقل یا ضعیف ہو یا تحریر لکھوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو ایسی حالت میں اس کا سرپرست عدل کے ساتھ دستاویز کی تحریر رقم کرائے اور اس دستاویز پر کم از کم دو مردوں کی گواہی کرالیا کرو جنھیں تم پسند کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنیں کیونکہ ان میں سے ایک اگر بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔ اور جب گواہوں کو گواہی دینے کے لیے حاکم کے سامنے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اور قرض کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی معینہ مدت تک کی دستاویز لکھوانے میں کاہلی روا نہیں ہے۔ خدا کے نزدیک لکھا پڑھی بہت ہی منصفانہ کارروائی ہے اور گواہی کے اعتبار سے بھی مضبوط دستاویز ہے اور یہ اس لیے بھی ہے کہ آئندہ تم کسی شک وشبے میں نہ پڑو۔ اور اگر نقد لین دین ہو تو نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ لیکن جب خرید وفروخت کا معاملہ ہو تو گواہ بنالیا کرو اور یاد رکھو کہ دستاویز لکھنے والے اور گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے۔ اگر تم ایسا کر بیٹھے تو یہ تمھاری جانب سے فسق وفجور کا عمل ہوگا، اللہ سے ڈرو۔ خدا (معاملہ کرنے کی بابت) تمھاری رہنمائی کرتا ہے اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (۲۸۲)

قرائت:

صرف حمزہ نے اِنْ تَضِلَّ ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے بقیہ قراء نے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابوعمرو نے فَتُذَكِّرَ کو بغیر تشدید کے منصوب پڑھا ہے، حمزہ نے فَتُذَكِّرُ مشدد اور مرفوع پڑھا ہے۔ بقیہ قراء نے تشدید اور منصوب کے ساتھ پڑھا ہے۔

صرف عاصم نے تِجَارَةً حَاضِرَةً منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے مرفوع پڑھا ہے۔

ابوجعفر نے وَلَا يُضَارّْ راء کو تشدید اور سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے نصب اور تشدید کے

ساتھ قرأت کی ہے۔

حجت:

حمزہ کے اِنْ تَضِلَّ اِحْدَاهُمَا میں ہمزہ کو مکسور پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اِنْ کو شرطیہ قرار دیا ہے اور فَتُذَكِّرَ میں فاء کو جواب جزاء اور شرط و جزاء محلاً مرفوع ہیں فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ میں دونکرے اِمْرَاَتَانِ کی صفت ہے۔ رَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر یہ ہے: فَمَنْ شَهِدَ رَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ۔ لفظ رَجُلٌ مبتدا کی بنا پر اور اِمْرَاَتَانِ اس پر عطف کی بنا پر بھی مرفوع ہو سکتے ہیں اور اس مبتدا کی خبر محذوف ہے تقدیر یہ ہے: فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ یَشْهَدُوْنَ۔

ارشاد الٰہی: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ میں ایک ایسا ذکر ہے جو موصوفین یعنی رَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ کی جانب پلٹ رہا ہے اور یہ کہ اس جملہ میں ان دو گواہوں کا ذکر ہو کہ جس کا تذکرہ گزر چکا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ موصوفین کے اعراب مختلف ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ لفظ شَهِيْدَيْنِ منصوب ہے اور لفظ رَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ کا اعراب رفع ہے۔ جب ایسا ہے تو آپ نے جان لیا کہ وصف جو کہ ظرف ہے وہ فَرَجُلٌ وَ امْرَاَتَانِ کی صفت ہے، شَهِيْدَيْنِ کی صفت نہیں ہے کہ جن کا تذکرہ گزر چکا ہے اور شرط و جزاء اِمْرَاَتَانِ کی صفت ہے اس لئے کہ جملہ شرطیہ جس طرح اس کے ذریعہ صلہ لایا جاتا ہے اسی طرح اس کو صفت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (میں جملہ شرطیہ کو اَلَّذِيْنَ کا صلہ قرار دیا گیا ہے)

اِنْ تَضِلَّ میں لام ان قراء کے نزدیک جنہوں نے اِنْ شرطیہ مانا ہے مجزوم ہے اور اسے فتحہ التقاء ساکنین کی بنا پر دیا گیا ہے اور اگر ماقبل (ضاد) کے مکسور ہونے کی بنا پر اسے کسرہ دیا ہوتا تب بھی قیاس اور قاعدہ کی بنا پر صحیح تھا۔

فَتُذَكِّرَ سیبویہ کے ارشاد الٰہی: وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ اور بعد والی آیت (مائدہ آیت ۹۵) پر قیاس کی بنا پر ہے کہ فَتُذَكِّرَ میں فاء کے بعد ایک مبتدا محذوف ہے اگر آپ نے اسے ظاہر کیا تو فَهُمَا تُذَكِّرُ اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰى ہوگا اور مبتدا محذوف کی جانب پلٹنے والا ذکر اِحْدٰهُمَا کی ضمیر ہے۔ تُذَكِّرُ میں اصل یہ ہے کہ وہ ذکر سے مشتق ہے اور اس کی ضد نسیان ہے۔ ذَكَرْتُ (ثلاثی مجرد) ایک مفعول

کی جانب متعدی ہے اور جب آپ اسے باب افعال یا باب تفعیل میں لے جائیں گے تو دو مفعول کی جانب متعدی ہو جائے گا جیسے فَرَّحْتُهٗ اور اَفْرَحْتُهٗ۔

جس نے فَتُذَكِّرَ پڑھا ہے تو وہ باب تفعیل میں لے گیا ہے اور جس نے فَتُذْكِرَ پڑھا ہے تو وہ باب افعال میں لے گیا ہے اور دونوں جائز وصحیح ہے۔

ارشاد الٰہی: فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى میں مفعول دوم محذوف ہے اور مراد یہ ہے:

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى الشَّهَادَةَ الَّتِىْ تَحَمَّلَتَاهَا۔

حالانکہ زیادہ تر قراء کی قرأت اَنْ تَضِلَّ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے پس اَنْ ایک پوشیدہ فعل سے متعلق ہے کہ جس پر جملہ دلالت کر رہا ہے اور وہ مندرجہ ذیل تین چیزوں میں سے کوئی ایک ہے:

۱۔ ارشاد الٰہی: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ آپ کے جملہ: اِسْتَشْهِدُوْا رَجُلًا وَّ اَمْرَاَتَيْنِ پر دلالت کر رہا ہے۔ اس قول کی بنا پر تقدیر یہ ہے: فَلْيَشْهَدْ رَجُلٌ وَ امْرَاَتَانِ۔ پس اَنْ کا تعلق اس فعل سے ہے۔

۲۔ ابوالحسن نے جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی تقدیر فَلْيَكُنْ رَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ ہے اس قول کی بنا پر مراد یہ ہے کہ فَلْيُحْدِثْ شَهَادَةَ رَجُلٍ وَّ امْرَاَتَانِ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔

۳۔ رَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ جو کہ مبتدا ہے اس کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا ہے یعنی فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ يَشْهَدُوْنَ پس ان میں عامل يَشْهَدُوْنَ ہے اور جس نے اَنْ يَضِلَّ اَن کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے اس کے نزدیک فعل کو پوشیدہ رکھنے کی جگہ اَن سے پہلے ہے اور جس نے اِنْ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے نزدیک جزاء کہ جگہ شرط کے ختم ہونے کے بعد ہے اور اس اَن کا مقام منصوب ہے اور تقدیر یہ ہے: لِاَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ۔

اگر کہا جائے کہ گواہی تو یاد ہونے پر دی جاتی ہے ضَلَال یعنی نسیان اور بھولنے کی صورت میں گواہی نہیں دی جاتی ہے۔ تو اس کا جواب سیبویہ نے اس طرح دیا ہے: خداوند عالم نے اِشْهاد (گواہ بنانے) کا حکم دیا ہے کہ ایک دوسرے کو یاد دلا دے۔ اَنْ تَضِلَّ ذکر کیا ہے اس لئے کہ یہ ضلال ونسیان یاد دہانی کا باعث ہے جیسا کہ کہنے والا کہتا ہے: اَعْدَدْتُهٗ اَنْ يَّمِيْلَ الْحَائِطُ فَاُدْعِمَهٗ میں نے فراہم کیا کہ دیوار جھک رہی تھی

اور میں نے اسے مضبوط بنادیا۔وہ ایسا کر کے دیوار کے میلان اور جھکاؤ کا طلبگار نہیں ہے بلکہ اس نے مضبوط بنانے کی علت کا ذکر کیا ہے۔پس فَتُذَكِّرَ یا فَتُذْكِرَ آن کی وجہ سے منصوب فعل پر عطف ہے۔

جس قاری نے اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ مرفوع پڑھا ہے تو اس کی دلیل یہ ہوسکتی ہے کہ كَانَ وَقَعَ اور حَدَثَ (وجود میں آنے اور واقع ہونے کے) کے معنیٰ میں ہے گویا اس طرح فرمایا ہے:

اِلَّا اَنْ تَقَعَ تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ جیسے ارشادالٰہی کہ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ۔

اور جن قراء نے تِجَارَةً حَاضِرَةً منصوب پڑھا ہے تو ایسی صورت میں وہ كَانَ کی خبر ہے۔ایسی صورت میں كَانَ کا اسم دو چیزوں میں کوئی ایک ہوگا:

۱۔کلام جس کا تقاضا کررہا ہو جیسے اَلْاِشْهَادُ وَ الْاِرْتِهَانُ جو تَبَايُع کے مفہوم سے معلوم ہے پس تَبَايُع کو حال کے اس پر دلالت کی بنا پر پوشیدہ کردیا گیا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے:اِذَا كَانَ غَدًا فَأْتِنِيْ

۲۔اَلتِّجَارَةُ پوشیدہ ہے گویا اس طرح کہا ہے:اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ التِّجَارَةُ تِجَارَةً حَاضِرَةً اس کے مثل شاعر کا شعر بھی ہے:

فَدًى لِبَنِىْ ذِهْلِ بْنِ شَيْبَانَ نَاقَتِىْ اِذَا كَانَ يَوْماً ذَا كَوَاكِبَ اَشْنَعَا

یعنی اِذَا كَانَ الْيَوْمُ يَوْمًا

ارشادالٰہی:لَا يُضَارَّ کے بارے میں دو قول ہیں:

۱۔اس کی اصل لَا يُضَارِرْ ہے۔راء میں ادغام کر کے التقائے ساکنین کی بنا پر اسے فتحہ دے دیا گیا ہے۔پس مقصود یہ ہے کہ کاتب صرف اور صرف برحق لکھے اور گواہ صرف اور صرف برحق گواہی دے۔

۲۔اس کی اصل لَا يُضَارَرْ ہ ہے راء کو فتحہ کے ساتھ اور ادغام کردیا گیا۔پس معنیٰ یہ ہوگا کہ کاتب کو اس طرح مدعی نہ بنایا جائے کہ اس کے ذریعہ اسے نقصان پہونچے اور نہ ہی گواہ کو۔

پہلی صورت زیادہ واضح ہے۔

اور ابوجعفر نے تشدید کے ساتھ راء کو جو ساکن پڑھا ہے تو وہ قابل اعتراض ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وصل کو وقف کے مانند قرار دیا ہے جیسے یہ مصرعہ

بِبَازِلٍ وَجْنَا اَوْ عَيْهَلِ

اس کے نمونے پہلے بھی گذر چکے ہیں۔

الفاظ ومعانی:

اِمۡلَال اور اِمۡلَاء ایک جیسے ہیں۔لکھوانا۔دَايَنۡتُ الرَّجُلَ مُدَايَنَةً یعنی میں نے اس مرد کے ساتھ قرض کا معاملہ کیا۔یعنی اس سے قرض لیا یا اسے قرض دیا۔

اَلۡبَخۡس: ظلم کے ذریعہ نقص اور کمی کرنا۔ثَمَنٌ بَخۡسٌ یعنی حق سے ناقص قیمت۔

اَلسَّفِيۡه: جاہل۔اَلسَّفه کے لغوی معنیٰ اَلۡخِفَّة (سبک سر) کے ہیں۔جاہل کو سَفِيۡه کہنے کی وجہ اس کی عقل کو کمزور ہونا ہے۔

اَلضَّلَال: ہلاکت ہونا اور فنا ہونا۔عرب کہتے ہیں: ضَلَّ الۡمَاءُ فِي اللَّبَنِ یعنی پانی دودھ میں فنا (غائب) ہو گیا۔اسی سے اللہ کا ارشاد ہے: اِنَّ الۡمُجۡرِمِيۡنَ فِيۡ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ (سورۂ قمر، آیت ۴۷: بیشک مجرمین گمراہی اور دیوانگی میں مبتلا ہیں) کہا گیا ہے کہ اس کے لغوی معنیٰ اس طرح نابود اور ختم ہونا ہے کہ اس کا نام (ونشان) باقی نہ رہے۔اسی سے اللہ کا ارشاد ہے: اَئِذَا ضَلَلۡنَا فِي الۡاَرۡضِ۔

سَئِمَ: تھکنا، ملول ہونا۔

اَقۡسَط: اَعۡدَلَ (یعنی عدل سے کام لیا) قَسَطَ، يَقۡسِطُ قُسُوۡطاً یعنی ظلم وجور کیا۔اَلۡقِسۡط: عدل۔ اَلۡقِسۡط کے معنی حصہ کے بھی ہیں۔

تفسیر:

تجارتی اصول

خداوند عالم نے تنگ دست کو مہلت دینے اور اس کے قرض میں تاخیر کا حکم فرمایا پھر حقوق مؤجلہ (جن حقوق میں مدت معین کی جائے) اور عقود مداینہ (قرض کے عقود) کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا (اے ایمان لانے والو!) یعنی اے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کرنے والو!

اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ (جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو) جب تم معاملہ کرو اور ایک دوسرے کو قرض دو۔بِدَيۡنٍ کے سلسلہ میں دو قول بیان کئے گئے ہیں:

اول: یہ تاکید کے لیے ہے اور ذہن میں بات کو بٹھانے کے لئے ہے، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَلَا

طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ (سورۂ انعام، آیت ۳۸؛ دونوں پروں سے پرواز کرنے والا طائر ایسا نہیں ہے)

دوم: بِدَيْنٍ چونکہ تم قرض دیتے ہو ایک دوسرے کو جس کے معنی قرض کے ذریعہ تمھیں جزا دینا ہے ایک دوسرے کو جو کہ جزا اور بدلہ ہے، کبھی ان معنی میں ہوتا ہے: تم ایک دوسرے کے ساتھ قرض کا معاملہ کرتے ہو۔ اسے دَيْن (قرض) سے اس لیے مقید کیا تا کہ لفظ کو اس کے اشتراک سے آزاد کیا جاسکے۔

اِلَى اَجَلٍ مُّسَمًّى (ایک مقررہ میعاد کے لیے) یعنی مذکور اور معلوم وقت جو بیان کر دیا جائے۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ آیت السَّلَم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خاص طور پر اور وہ اس طرح کہتے تھے: میں گواہی دیتا ہوں اللہ نے اَلسَّلَمُ الْمَضْمُوْن کو معلوم مدت تک مباح فرمایا ہے اور اس بارے میں اس نے اپنی کتاب میں طویل ترین آیت نازل فرمائی ہے۔ پھر ابن عباس نے اس آیت کی تلاوت کی۔ آیت کا ظاہر ہر ایسے قرض کو شامل ہے جس میں مدت معین کی گئی ہو سلم ہو یا اس کے علاوہ۔ یہی نظریہ ہے مفسرین اور فقہاء کا۔

فَاكْتُبُوْهُ (تو لکھا پڑھی کر لیا کرو) یعنی قرض کا تحریری معاہدہ کر لو تا کہ اس میں بھول چوک اور انکار واقع نہ ہو سکے اور یہ مبنی برحق دستاویز قرار پائے اس پر نظر کرتے ہوئے کہ جس کا حق ہے اور اس کو پیش نظر کرتے ہوئے کہ جس پر حق ہے اور گواہوں کو توجہ کرتے ہوئے اس پر جس کا حق ہے تا کہ اس کا حق تحریری معاہدہ اور گواہوں کے ذریعہ قابل بھروسہ و لائق اطمینان بن جائے اور اس کا حق ضائع نہ ہو سکے اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جس پر حق ہے تا کہ وہ انکار سے دور رہے اور عذاب اور عقاب کا مستحق قرار نہ پائے نیز گواہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جب وہ (دستاویز) اپنے ہاتھ سے لکھے گا تو یہ گواہی کے لیے زیادہ مضبوط، سہو سے دور اور یاددہانی (حفظ) سے قریب تر ہوگا۔

اس امر (حکم) کے بارے میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ یہ مستحب ہے۔ یہ ابوسعید خدری، حسن اور شعبی سے مروی ہے۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے اور بیشتر مفسرین کا نظریہ یہی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ فرض ہے۔ یہ ربیع اور کعب سے مروی ہے۔ پہلے قول کے صحیح ہونے پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے کہ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ جس کا ظاہری مفہوم یہ ہے اگر اسے اپنے مال پر امین بنائے تو اس کی امانتداری قبول کرے (اس پر امین بن جائے)

پھر اللہ تعالیٰ نے کتابت (تحریر) کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (اور لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ عدل کو مدِّنظر رکھتے ہوئے معاہدہ تحریر کرے) یعنی قرض اور

خرید وفروخت کے دستاویز لکھنے والے کو چاہئے کہ وہ معاملہ کرنے والوں کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ تحریر کرے جو مبنی برحق ہو، صفت اور مقدار کے اعتبار سے اس میں نہ تو زیادتی ہو، نہ ہی کمی، نہ ہی کسی قسم کی تبدیلی کرے، نہ ہی کوئی ایسی چیز لکھے جو دونوں میں سے کسی ایک کے لیے نقصان دہ ہو سوائے علم کے (یعنی ہر چیز کو علم کے مطابق تحریر کرے)

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ (کاتب کو انکار نہیں کرنا چاہیے) یعنی کاتب منع نہ کرے اَن يَّكْتُبَ تحریر لکھنے سے، طے شدہ امر کے مطابق۔ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ (بلکہ جس طرح اللہ نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے) یعنی عدل کے ساتھ لکھنے کو اللہ نے اسے سکھایا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح خداوند عالم نے اپنی تعلیم سے اس پر فضل فرمایا ہے وہ دوسروں کے لئے لکھنے میں کنجوسی نہ کرے۔ کتابت (لکھا پڑھی) کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا یہ واجب ہے یا نہیں؟ تو کہا گیا ہے کہ لکھا پڑھی جہاد وغیرہ کی طرح واجب کفائی ہے، یہ شعبی اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اسی قول کو رمانی اور جبائی نے اختیار کیا ہے اور جبائی نے اس عمل پر کاتب اور گواہوں کے اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔

شیخ ابو جعفر طوسی قدس اللہ روحہ نے اس طرح فرمایا ہے: ہمارے نزدیک اجرت لینا جائز نہیں ہے اور جن کاغذات پر (قرض) کی دستاویز لکھی جائے گی، وہ قرض دینے والے کے پاس رہیں گے، نہ کہ قرض لینے والے کے پاس۔ کاغذات قرض دینے والے کے پاس ہی رہیں گے چونکہ وہ اسی کا حق ہے۔ کہا گیا ہے کہ واجب ہے کاتب فراغت کی حالت میں (قرض) کی دستاویز لکھے۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس پر واجب ہے جب اسے حکم دیا جائے۔ یہ مجاہد اور عطا سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ حکم اس مقام پر ہے جہاں کاتب کے علاوہ کوئی دوسرا قادر نہ ہو پس اگر وہ منع کرتا ہے تو صاحب قرض کو نقصان ہوگا۔ لہٰذا اگر ایسا ہو تو یہ فریضہ ہے اگر کاتب کے علاوہ کو دوسرا بھی لکھنے پر قادر ہو تو اسے اجازت ہے جب دوسرا اسے انجام دے دے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلے کتابت واجب تھی پھر یہ (حکم) منسوخ ہو گیا اس ارشاد سے: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ یہ ضحاک سے مروی ہے۔

ارشاد: فَلْيَكْتُبْ خدا نے کاتب کو یہ حکم دیا ہے یعنی کاتب تحریری معاہدہ اس طرح لکھے اس کو لکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں کاتب بہت کم تھے۔ اسی لئے خدا نے فَلْيَكْتُبْ کہہ کر اس پر زور دیا ہے۔ جب کسی کام کے انجام دینے کے حکم اور اس کو ترک کرنے کی نہی کو ایک

ہی کلام میں جمع کر دیا جائے تو دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنے سے زیادہ اس عمل کو انجام دینے کی طرف دعوت دینے والا ہوتا ہے۔

پھر خداوند عالم نے کاتب کو املاء کرنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ (اور جس کے ذمّے قرض عائد ہوتا ہے اسے چاہیے کہ دستاویز کی عبارت کو بتاتا جائے) یعنی مقروض اپنی زبان سے اپنے اوپر اقرار کرتا جائے تا کہ معلوم ہو سکے اس پر کیا ہے۔

وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (اور اس معاملہ میں اللہ سے ڈرتا رہے) یعنی وہ شخص جس پر املاء فرض ہے وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا یعنی اور بتاتے وقت قرض دینے والے کے حقوق میں کچھ کمی نہ کرے نہ تو اس کی مقدار میں سے، نہ ہی اس کی صفت میں سے۔

پھر خداوند عالم نے اس کی حالت بیان فرمائی جس سے املا کرانا (قرض کی دستاویز لکھوانا) درست نہیں ہے، فرمایا: فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا (اور اگر قرض لینے والا کم عقل ہو یعنی لکھنے سے جاہل و ناواقف ہو۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کمسن اور بچہ ہو۔ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ عاجز و احمق ہو۔ یہ ابن زید سے مروی ہے۔

أَوْ ضَعِيفًا یا کمزور یعنی دیوانگی اور جنون کے سبب ضعیف العقل ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بہت زیادہ بوڑھا ہونے کے سبب کم ہو جائے۔ أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ (یا تحریر لکھوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو) یعنی مجنون و دیوانہ ہو یا گونگا ہو۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اقرب یہ ہے اسے تین الگ الگ صفات پر حمل کیا جائے تا کہ تکرار لازم نہ آئے۔ پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ تین صفات کون کون سے ہیں؟ کہا گیا ہے کہ سَفِيهٌ یعنی دیوانہ ضَعِيفٌ یعنی بچہ اور مَن لَّا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ یعنی گونگا وغیرہ پھر ان میں ہر ایک وہ داخل ہے جو ان کے مانند ہے۔ کہا گیا ہے کہ سَفِيهٌ یعنی فضول خرچی کرنے والا۔ ضَعِيفٌ یعنی بلوغ کے قریب بچہ اور لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ یعنی مجنون، دیوانہ۔ یہ قاضی سے مروی ہے۔

ارشاد: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ (تو اس کا سرپرست عدل کے ساتھ دستاویز کی تحریر رقم کرائے) کہا گیا ہے کہ اس کا ولی و سرپرست املا کرے (لکھوائے) جس پر حق ہے یعنی مقروض جب وہ خود املا کرنے سے عاجز ہو۔ یہ ضحاک اور ابن زید سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ولی حق وہ ہے جس کا حق ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے اس لیے کہ وہ اپنے قرض کے متعلق زیادہ جانتا ہے لہٰذا وہ حق اور عدل کے ساتھ لکھے۔

پھر خداوند عالم نے گواہ بنانے کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ (اور اس دستاویز پر کم از کم دو مردوں کی گواہی کرا لیا کرو جنھیں تم پسند کرو) یعنی اپنے مردوں میں سے دو مردوں کو گواہی کے لیے طلب کرو جو مکتوب (تحریری دستاویز) پر گواہی دیں جو تمھارے دین سے ہوں) اور مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ دونوں آزاد، واقف کار، بالغ اور مسلمان ہوں نہ کہ غلام اور کافر۔ گواہی کی قبولیت میں ہمارے نزدیک آزادی شرط نہیں ہے بلکہ عدالت کے ساتھ اسلام شرط ہے۔ یہی قول شریح، لیث اور ابو ثور کا بھی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ قاضیوں کہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کے وقت مدعی سے دو گواہوں کا مطالبہ کریں جب مدعا علیہ انکار کر رہا ہو اس طرح (سین) یعنی واستشھد وا کا باب استفعال سے ہونا جو کہ طلب وسوال کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے، دونوں صورتوں میں سوال اور طلب والا سین ہوگا۔

فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ (اور اگر دو مرد نہ ہوں) یعنی اگر دونوں گواہ مرد نہ ہوں۔ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ (تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنیں) یعنی ایک مرد اور دو عورتیں ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں۔

مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ (جنھیں تم پسند کرو) جس کی عدالت سے تم راضی ہو۔ یہ جملہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ گواہوں میں عدالت شرط ہے اور اس بات پر بھی دلالت کر رہا ہے کہ خدا نے ہمیں حکم نہیں دیا کہ وہ دو گواہ ہر ایک کے نزدیک (خدا اور بندوں کے نزدیک) پسندیدہ ہوں اس لئے کہ اس نے فرمایا ہے: مِمَّن تَرْضَوْنَ، جنھیں تم پسند کرو اور جن سے تم راضی ہو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ گواہ مَرْضِيِّينَ میں سے ہوں اس لیے کہ ہمارے پاس اللہ کے نزدیک پسندیدہ شخص کی شناخت ومعرفت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ہم تو اس کی گواہی کے پابند قرار دیئے گئے ہیں جو بظاہر ہمارے نزدیک پسندیدہ ہو اور وہ ایسا شخص ہے جس کی دینداری، امانتداری ہمارے نزدیک (مقبول و) پسندیدہ ہو۔ جس کی ہم (بظاہر) خیر وخوبی سے واقف ہوں۔

ارشاد الٰہی: أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا کیوں کہ ان دونوں میں سے ایک عورت اگر بھول جائے گی فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ (تو دوسری اسے یاد دلا دے گی) کہا گیا ہے کہ یہ وہی ذکر (یاد دہانی) ہے جو نسیان (بھول اور فراموشی) کی ضد ہے۔ ربیع، سدی، ضحاک اور بیشتر مفسرین کا یہی نظریہ ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے: فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ الشَّهَادَةَ الَّتِي تَحَمَّلَتَاهَا؛ ایک عورت دوسری عورت کو اس گواہی کو یاد دلائے جو اس نے دی تھی۔ جس نے فَتُذْكِرَ بغیر تشدید کے قرأت کی ہے اذکار سے تو وہ بھی انھیں معنیٰ میں ہے ایک عورت اس طرح کہے گی: کیا تمھیں وہ دن یاد ہے کہ جس دن ہم نے فلاں مقام پر اور اپنی

موجودگی میں مرد یا فلاں عورت کو دیکھا، یہاں تک کہ اسے وہ موقع یاد آجائے۔ یہ اس لیے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں پر زیادہ نسیان طاری ہوتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ذَکَر سے (مذکر) ہے یعنی اسے مذکر کے مانند قرار دے۔ یہ سفیان بن عیینہ سے مروی ہے۔ قول اول اقویٰ ہے۔

دوم: حسین بن علی المغربی نے اس طرح کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اگر دو میں سے ایک گواہی سے بھٹک جائے یعنی نسیان وفراموشی کے سبب اسے ضائع کردے تو ایک عورت دوسری عورت کو یاد دلا دے تا کہ احداہما کی تکرار بے معنیٰ نہ ہو اس بات کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ گواہی کو فراموش کرنے والے کو 'ضَالًّا' کہا گیا ہے اور ضَلَّتِ الشَّهَادَةُ اس وقت بولتے ہیں جب وہ گواہی کو ضائع کردے جیسا کہ پروردگار کا ارشاد ہے: قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا یعنی ان لوگوں نے کہا: وہ ہم سے ضائع ہو گئے۔

پھر خداوند علم نے گواہوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (اور جب گواہوں کو گواہی دینے کے لیے حاکم کے سامنے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں) اس جملہ کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

اگر سوال کیا جائے کہ کیوں لفظ اِحْدٰهُمَا کی تکرار کی ہے اور یہ کیوں نہیں فرمایا کہ فَتُذَكِّرَهُمَا الْاُخْرٰى؟ تو اس کا جواب دو طرح سے ہے:

اول: اس لئے تکرار کی ہے تا کہ فاعل مفعول پر مقدم رہے اور اگر فَتُذَكِّرَهُمَا الْاُخْرٰى کہتا تو فعل و فاعل کے درمیان مفعول کے ذریعہ فاعل ہو جاتا اور یہ پسندیدہ نہیں ہے۔

اول: جب گواہی کے لیے گواہوں کو بلایا جائے تو وہ منع نہ کریں۔ یہ مجاہد، عطا وسعید بن جبیر سے مروی ہے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ وہ گواہی کا علم رکھتے ہوں اس طرح کہ اس میں شک نہ کریں اور انھیں اس کی ادائیگی میں نقصان کا خوف بھی نہ ہو۔

دوم: جب انھیں گواہ بننے کے لیے بلایا جائے۔ یہ قتادہ وربیع سے مروی ہے۔

سوم: جب انھیں گواہ بننے اور گواہی دینے کے لیے بلایا جائے۔ یہ ابن عباس وحسن اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔ چونکہ اس کا فائدہ زیادہ ہے۔

ارشاد: وَلَا تَسْئَمُوْٓا (اور کاہلی روا نہیں ہے) تنگ دلی وغم وغصہ اور ناگواری کا اظہار نہ کرنا کہ اَنْ تَكْتُبُوْهُ (اسے لکھوانے میں) یعنی حق لکھنے سے۔ صَغِيْرًا حق چھوٹا ہو اَوْ كَبِيْرًا (یا بڑا ہو) بیان کیا گیا ہے

کہ یہ خطاب گواہ سے ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ برحق گواہی لکھنے میں ناگواری کا اظہار نہ کریں۔ اِلٰٓى اَجَلِهٖ یعنی قرض کی مدت تک۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ گواہ کی مدت تک یعنی اس وقت تک کے لیے جس میں گواہی نافذ ہے۔ پہلا قول اقویٰ ہے۔

ذٰلِكُمْ یعنی دستاویز یا گواہی اور دستاویز لکھنا اَقْسَطُ (لکھا پڑھی بہت ہی منصفانہ کارروائی ہے) اَیْ اَعْدَلُ یعنی بہت زیادہ عادلانہ ہے۔ عِنْدَ اللّٰهِ (خدا کے نزدیک) چونکہ اللہ سبحانہ نے عدل وانصاف کا حکم دیا ہے اور اس کے امر کی پیروی کرنا اس کے ترک کرنے کے مقابلہ میں سے عدالت سے بہت زیادہ نزدیک ہے۔

ارشاد: وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ (اور گواہی کے اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط دستاویز ہے) گواہی کے لیے مبنی برحق، زیادتی، کمی، بھول چوک، غلطی اور نسیان سے بہت زیادہ دور ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ گواہی کو زیادہ یاد رکھنے کے لئے ہے۔

وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا (اور یہ اس لیے بھی ہے کہ آئندہ تم کسی شک وشبے میں نہ پڑو) یعنی اس سے بہت زیادہ نزدیک ہے کہ تم حق کی ادائیگی اور مدت کے بارے میں شک میں مبتلا نہ ہو۔ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً (اور اگر نقد لین دین ہو) یعنی مگر یہ کہ تجارت واقع ہو قرض کے بطور اور بیع کے بطور نقد الین دین ہو۔

تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ یعنی جس کو تم منتقل کرتے ہو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک نقد نہ کہ ادھار۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ (توتم پر کوئی الزام نہیں ہے) یعنی حرج اور سختی نہیں ہے۔

اَلَّا تَكْتُبُوْهَا (اسے لکھنے میں) یعنی اس کی لکھا پڑھی نہ کرنے پر تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس لیے کہ لکھا پڑھی، وثیقہ اور دستاویز کے لیے ہوتی ہے اور وثیقہ کی ضرورت صرف ادھار میں ہوتی ہے، نقد میں نہیں۔

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (لیکن جب خرید وفروخت کا معاملہ ہو تو گواہ بنا لیا کرو) اور اپنی خرید و فروخت پر گواہوں کو گواہ بنا لو جب تم خرید وفروخت کرو۔ یہ حکم مستحب اور سنتی ہے۔ یہ حسن اور تمام فقہا کا قول ہے۔ ظاہر کی حجیت کے قائل علماء نے کہا ہے کہ خرید وفروخت میں گواہ بنانا واجب ہے۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (اور یاد رکھو کہ دستاویز لکھنے والے اور گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے) يُضَآرُّ دراصل يُضَارِرْ پہلی 'ر' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ حسن، قتادہ اور ابن زید کا قول ہے۔ پس کاتب اور گواہ کو نقصان پہونچانے سے منع کیا ہے۔ اس اعتبار سے ضرر پہنچانا یہ ہے کہ کاتب اس چیز کو لکھے جو اس سے لکھوائی نہ جائے اور گواہ اس چیز پر گواہی دے جس بارے میں اس سے گواہی طلب نہ کی جائے یا گواہی دینے سے منع

کرے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یُضَآرَّ دراصل لَا یُضَارَرْ 'پہلی رٗ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ ابن مسعود ومجاہد کا قول ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ عذر کی حالت میں کاتب کو کتابت پر مجبور نہ کیا جائے اور نہ ہی گواہ پر امر کے ذریعہ تنگی کی جائے گی کہ وہ مجبوری کی حالت میں اس کو گواہ بننے اور گواہی دینے کی دعوت دی جائے نہ ہی ان دونوں پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ زجاج نے کہا ہے: پہلا قول زیادہ واضح ہے اس لئے کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌ بِكُمۡ (اگر تم ایسا کر بیٹھے تو یہ تمھاری جانب سے فسق وفجور کا عمل ہوگا) فاسق غیر عدل سے بہت زیادہ مشابہ ہے اور کتابت (دستاویز) کی تحریف کرنے والے سے اس کی نسبت جو گواہ کو گواہی دینے کے لیے بلائے اور کاتب کو کتابت کے لیے بلائے تاکہ وہ دستاویز لکھے جبکہ وہ مشغول ہو۔ ان دیگر علماء نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اگر تم نے کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچایا اس لیے کہ کتابت اور گواہی میں نقصان پہنچانا تمھارے لیے فسق ہے یعنی اس چیز سے خارج ہونا ہے جس کا اللہ سبحانہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرو۔ اس چیز کے بارے میں کہ جس کا اس نے تمھیں حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے تمھیں روکا ہے۔

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (تمھیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ تمھاری رہنمائی کرتا ہے ان امور کی جانب جن کی تمھیں ضرورت ہے (اللہ نے تمھیں اس کی تعلیم دے دی ہے)

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ (اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے) اللہ اس بارے میں باخوبی جانتا ہے اور اس کے علاوہ ہر معلومات کو۔ علی ابن ابراہیم بن ہاشم نے اپنی تفسیر (قمی) میں بیان کیا ہے کہ سورۂ بقرہ میں پانچ سو احکام ہیں اور اس آیت میں پندرہ احکام بیان کیے گئے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمٰنَـتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور اگر تم مسافرت کے عالم میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے اور قرض دینا ہو تو رہن با قبضہ رکھ لو اور اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسا کرے تو یوں ہی قرضہ دیا جا سکتا ہے۔ تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے یعنی قرض لینے والے کو چاہئے کہ قرض دینے والے کی امانت پوری پوری ادا کر دے۔ اور اپنے پالنے والے اللہ سے ڈرتا رہے۔ (مسلمانو!) تم گواہی کو ہرگز نہ چھپانا جو گواہی کو چھپاتا ہے بے شک اس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم کیا کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ (۲۸۳)

قرأت:

ابن کثیر اور ابو عمرو نے فرُهُن بروزن فُعُل اور باقی قراء نے فرِهَان بروزن فِعَال پڑھا ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: الرهن مصدر ہے جب اسے مصدر سے منقول کر کے اسم اور نام بنا دیا گیا تو راء کو کسرہ دے دیا جس طرح اسماء کو کسرہ دیا جاتا ہے اور اس کی جمع، جمع منتہی الجموع کے دو وزن پر بنائی گئی ہے: فُعُل اور فِعَال یہ دونوں جمع کثرت کے اوزان میں سے ہیں۔ کبھی کبھی رُهُن کے عین الفعل میں تخفیف کر کے اسے ساکن کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رُسُل اور کتُب میں ہوتا ہے جیسے رُهُن اور رُهْن سُقُف اور سُقْف اعشیٰ نے کہا:

آلَیْتُ لَا أُعْطِیهِ مِنْ اَبْنَآئِنَا رُهْنًا فَیُفْسِدُهُمْ کَمَنْ قَدْ اَفْسَدَا

الفاظ و معانی:

رَهَنْتُ عِنْدَ الرَّجُلِ وَ رَهَنْتُهُ رَهْنًا۔ دونوں بولا جاتا ہے۔ اَنَا اَرْهَنُهُ یعنی میں اس کے پاس گروی رکھتا ہوں۔ اَرْهَنْتُهُ (باب افعال سے) بھی بولا جاتا ہے لیکن رَهَنْتُ ثلاثی مجرد سے زیادہ بولا جاتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رہن کے بارے میں فرمایا ہے: لَا یُغْلَقُ الرَّهْنُ یعنی رہن پر رکھنے والے نے اپنا کوئی سامان گروی رکھے۔ گروی رکھنے والا اس طرح کہے: اگر میں اپنی اس جنس کو چھڑانے کے لیے آپ کے پاس ایک ماہ بعد آیا تو ٹھیک ورنہ یہ قرض کے عوض آپ کی ہو جائے گی۔ یہ رہن باطل ہے اس میں

کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تفسیر:

اگر کاتب نہ ملے۔۔۔

پھر خداوند عالم نے گواہ بنانے دستاویز کی عدم موجودگی) میں رہن کے دستاویز کا حکم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ یعنی اے قرض دینے اور خرید و فروخت کرنے والو! اگر تم عَلٰی سَفَرٍ مسافرت کے عالم میں ہو وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب اور گواہ نہ ملیں کہ جنھیں تم گواہ بنا سکو۔ فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (تو رہن با قبضہ رکھ لو) اس کی تقدیر یہ ہے: فَالْوَثِيْقَةُ رَهْنٌ؛ وثیقہ (رہن کی دستاویز) ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تقدیر یوں ہو: فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ تَقُوْمُ مَقَامَ الْوَثِيْقَةِ بِالصِّكِّ وَ الشُّهُوْدِ یعنی رہن مقبوضہ تحریری وثیقہ اور گواہ کا قائم مقام ہوگی۔ قبض (قبضہ میں دینا) رہن کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔ اگر اپنے قبضہ میں نہ لے تو رہن واقع نہیں ہوگا۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے۔

ارشاد: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (اور اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسا کرے) اگر صاحب حق کو اس پر اعتبار ہو جس پر حق ہے اور اس پر اطمینان و بھروسہ ہے تو اسے حق پر امین بنا دے تو وثیقہ کے لیے تحریری دستاویز نہ لے، نہ ہی رہن پر۔

فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ (تو یوں ہی قرضہ دیا جا سکتا ہے۔ تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے یعنی قرض لینے والے کو چاہیے کہ قرض دینے والے کی امانت پوری پوری ادا کر دے۔) یعنی اس کے حق (قرض) سے انکار نہ کرے، نہ ہی اس میں کسی چیز کی کمی واقع کرے اور وقت آنے پر اس کی پوری ادائیگی کر دے کسی تاخیر کے بغیر اَمَانَتَهٗ یعنی جس چیز کا امانت دار بنایا گیا ہے۔ یہ مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں۔ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (اور اپنے پالنے والے اللہ سے ڈرتا رہے) جس پر قرض ہے وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے اس کا انکار کرنے سے اور اس میں کمی واقع کرنے سے جس چیز میں اسے امین بنایا گیا ہے

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ((مسلمانو!) تم گواہی کو ہرگز نہ چھپانا گواہی کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد۔ یہ گواہوں سے خطاب ہے اور انھیں گواہی کے چھپانے سے نہی کی گئی ہے جب انھیں گواہی کے لیے بلایا جائے۔ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا (جو شہادت کو چھپاتا ہے) یعنی جو شخص گواہی کو جاننے، اس میں شک نہ ہونے اور بغیر

نقصان اٹھائے گواہی دینے کو چھپاتا ہے فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بے شک اس کا دل گناہ گار ہے) خدا نے گناہ کی نسبت قلب کی جانب دی ہے اگرچہ اس کا پورا وجود گنہگار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گواہی کو چھپا کر گناہ کرنا قلب ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ گواہی کو چھپانے کا عزم وارادہ قلب ہی کے ذریعہ ہوتا ہے اسی لیے گناہ کی نسبت قلب کی طرف دینا مذمت کے لیے بہت زیادہ بلیغ ہے جس طرح ایمان کی نسبت قلب کی جانب دینا مدح کے لئے بہت زیادہ بلیغ ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (اور جو کچھ تم کیا کرتے ہو اللہ) یعنی جسے تم چھپاتے اور پوشیدہ رکھتے ہو۔ عَلِیْمٌ (اس سے اچھی طرح باخبر ہے) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: قاضی کے سامنے ظلم وجور پر گواہی دینے والے کا کلام منقطع نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کا ٹھکانہ جہنم قرار پاجاتا ہے اسی طرح گواہی چھپانے والے کا گناہ ہے۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا میں اس بات پر دلالت ہے کہ قرض دینے میں گواہ بنانا اور لکھا پڑھی کرنا واجب نہیں ہیں بلکہ احتیاط کے طور پر ہے۔

یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت اللہ کے عجیب وغریب لطف اور بندگان خدا کے معاش ومعاد پر اس کی نظر کرم پر مشتمل ہیں اور ان احکام کی تعلیم پر مشتمل ہے جن میں جہالت کی گنجائش نہیں ہے۔ جس میں آگاہی پیدا کرنے والے کے لیے سرمایۂ بصیرت اور غور وفکر کرنے والے کے لیے کفایت ہیں۔

❀❀❀❀❀

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا تو ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں چاہے ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ ان کا مُحاسَبہ تم سے ضرور کرے گا۔ پھر اسے اختیار ہے جسے چاہے بخش دے اور جس پر چاہے عذاب نازل کرے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۲۸۴)

قرأت:

ابن عامر، عاصم، ابوجعفر اور یعقوب نے فَيَغْفِرُ اور يُعَذِّبُ کو مرفوع اور باقی قراء نے دونوں کو مجزوم (ساکن) پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا، مجزوم پڑھنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ماقبل کا تابع قرار دیا ہے اور ماقبل سے جدا نہیں مانا ہے یہ ان کے کلام سے زیادہ مشابہ ہے جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ مشاکلہ کے خواہاں ہیں اور اسے لازمی مانتے ہیں اسی سے یہ بھی ہے کہ جو چیز فعل و فاعل سے مرکب جملہ پر معطوف ہوتی ہے اور وہ جملہ کہ جس پر فعل معطوف ہوتا ہے تو اس جملہ کے اسم سے روگردانی کر لیتے ہیں تو اس فعل کو نصب دینے کو اختیار کیا جاتا ہے اور اگر اس سے پہلے فعل و فاعل نہ ہو تو رفع اختیار کرتے ہیں۔قرآن مجید میں اس قاعدہ کے مطابق جو آیا ہے وہ یہ ہے: وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ. فَفَرِيقاً هَدَىٰ وَفَرِيقاً حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ (سورہ اعراف، آیت ۳۰) اسی طرح مناسب ہے کہ جزم زیادہ بہتر اور خوبصورت ہوتا کہ وہ لفظ میں اپنے ماقبل سے مشابہ ہو جاتا۔اس طرح سے مشاکلہ اور مشابہ کا خواہاں ہونا زیادہ ہے۔

اور جن قراء نے جزم نہیں دیا ہے انہوں نے ماقبل سے الگ کر دیا ہے اور ماقبل سے جدا کرنے کی دو وجہوں میں سے ایک کوئی وجہ ضروری ہے:

۱۔ یا تو فعل کو مبتدا محذوف کی خبر قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ یا فعل و فاعل سے مرکب جملہ کو گذشتہ جملہ پر عطف کیا گیا ہے۔

تفسیر:

سب کچھ اللہ کا ہے

لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا تو ہے) اللہ میں لام، لام ملکیت ہے یعنی اللہ کو آسمانوں، زمین اور ان دونوں میں جو کچھ ہے ان میں تصرف اور ان کی تدبیر کا حق حاصل ہے اس لئے کہ وہ ان پر قدرت رکھتا ہے اور اس لئے کہ اس نے ان کو خلق کیا ہے اور انہیں وجود

بخشا ہے۔ یہ تمام چیزیں اسی کی ملکیت ہیں۔ جو کسی چیز کا مالک ہوتا ہے وہ اس میں جس طرح چاہتا تصرف کرتا ہے۔

ارشاد: وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ أَنْفُسِكُمْ (تم اپنے دل کی باتیں چاہے ظاہر کرو) یعنی تمھارے دلوں میں اطاعت و نافرمانی میں سے جو کچھ بھی ہے اسے علانیہ طور پر ظاہر کرو۔ أَوْ تُخْفُوْهُ یا سے چھپاؤ اور پوشیدہ رکھو۔ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (اللہ ان کا محاسبہ تم سے ضرور کرے گا) یعنی اللہ ان سب سے واقف ہے اس پر تمھیں جزا اور بدلہ دے گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تم گواہی کا اظہار کرو یا اسے چھپاؤ اللہ اسے جانتا اور اس سے واقف ہے اور تمھیں اس کی جزا دے گا۔ یہ ابن عباس اور ایک جماعت سے مروی ہے۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ یہ حکم ان احکام کو شامل ہے جن کا ذکر اس سورہ میں گذر چکا ہے۔ خدا نے ان احکام کی خلاف ورزی کرنے سے ڈرایا ہے۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ إِلَّا وُسْعَهَا کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے اور اس بارے میں انھوں نے ایک ضعیف روایت بیان کی ہے ایک قول درست نہیں ہے اس لیے کہ جب طاقت و وسعت سے زائد تکلیف دینا محال ہے تو یہ آیت کس طرح منسوخ ہو سکتی ہے؟ آیت سے مراد وہ عقائد اور ارادے ہم سے پوشیدہ چیزیں ہیں کہ جن کو امر و نہی شامل ہوتے ہیں اور وہ چیزیں جو حکم میں داخل نہیں ہیں جیسے وسوسے خیالات اور وہ اوہام و تخیلات کہ جن سے اپنے آپ کو بچانا ممکن نہیں ہے وہ اس سے خارج ہیں، دلیل عقل کی بنا پر اور اس ارشاد نبوی کی بنا پر کہ تَجُوْزُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَنْ نِسْيَانِهَا وَمَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا اس امت کے لیے اس کے نسیان (بھول چوک) اور دل میں پیدا ہونے والے خیالات کو جائز و مباح قرار دیا گیا اس اعتبار سے ممکن ہے، دوسری آیت پہلی آیت کی وضاحت کر رہی ہو اور اس سے پیدا ہونے والے اس توہم کو دور کر رہی ہو جو کسی اور سبب کی طرف لے جاتا ہے اور یہ اس گمان کو بھی دور کرتی ہے کہ جو کچھ فکر اور ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وجود پاتا ہے کہ جو حکم کے دائرہ میں نہیں آتے خدا ان پر مواخذہ اور گرفت کرے گا جبکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے: فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ (پھر اسے اختیار ہے جسے چاہے بخش دے) یعنی ان میں جسے چاہے اپنی رحمت و فضل سے بخش دے۔ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (اور جس پر چاہے عذاب نازل کرے) ان میں سے جس پر چاہے اپنے عدل کے مطابق عذاب کرے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اور اللہ ہر چیز یعنی مغفرت اور عذاب پر قدرت رکھتا ہے)۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ آیت کی لفظ چیز کو شامل ہے۔ جو گفتگو اس بارے میں کہ گناہ ذہن میں خطور کرتے ہیں خدا ان

پر مواخذہ نہیں فرمائے گا البتہ انسان جس کے بارے میں پکا ارادہ کرلے اور اسے دل سے باندھ لے وہ اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا ہو تو یہ افعال قلوب میں سے ہو جائے گا، خدا اس پر ویسے ہی مواخذہ کرے گا جس طرح اعضاء و جوارح سے انجام پانے والے افعال پر مواخذہ کرتا ہے۔ البتہ عزم و ارادہ پر مواخذہ کرے گا نہ کہ خود اس گناہ پر اس لیے کہ اس نے معصیت انجام نہیں دی ہے۔ یہ بات اطاعت پر ارادہ کے برخلاف ہے اس لیے کہ اطاعت کا ارادہ کرنے والے کو اس کے ارادہ پر جزا دی جائے گی اس اطاعت کی جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ (نماز کا انتظار کرنے والا جب تک وہ انتظار کر رہا ہے اس کا شمار نمازی ہی میں ہوگا) یہ خداوند عالم کی اپنے بندوں پر لطیف ترین نعمت ہے۔

نظم: اس آیت کے اپنے ماقبل آیت سے متصل ہونے کی کیفیت کی کئی صورتیں ہیں:

اول: جب اللہ احکام شریعت کو بیان کر چکا تو اس نے توحید و موعظہ اور جزا کے اقرار پر سورہ کا اختتام فرمایا۔

دوم: جب اس نے فرمایا کہ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ: اس پر کوئی چیز مخفی و پوشیدہ نہیں ہے اس لیے کہ آسمان و زمین کا اقتدار و اختیار اسی کو حاصل ہے۔ یہ ابو مسلم سے مروی ہے۔

سوم: جب اس نے (آیات قرض و رہن میں) ان وثیقوں اور دستاویزوں کا حکم دیا تو یہ بھی بیان کر دیا کہ اس نے یہ اہتمام اس لئے کیا ہے کہ وہ لوگوں کی جانب ہی پلٹتا ہے، یہ حکم اور اس کا فائدہ آمر (خدا) کو نہیں پہنچتا ہے اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے سب اسی کی ملکیت ہے

❁❁❁❁❁

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ٭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴿۲۸۵﴾

پیغمبر پر جو کچھ ان کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا وہ اس پر ایمان لائے اوران کے ساتھ مومنین بھی سب کے سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اوراس کے رسولوں پر ایمان لائے اوران کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کوایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے اور انھوں نے کہا ہم نے تیرے احکام سنے اوراطاعت قبول کی خداوندا ہمیں تیری مغفرت چاہیے اور ہمیں تو تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔(۲۸۵)

قرائت:

عاصم کے علاوہ دیگر اہل کوفہ نے کِتَابِهٖ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے کُتُبِهٖ (جمع) پڑھا ہے۔یعقوب نے لَا یُفَرِّقُ یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے نُفَرِّقُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جن افراد نے کِتَابِهٖ واحد پڑھا ہے تواس کی دو وجہیں ہیں:

ا۔اس سے مراد قرآن ہے۔

۲۔ کِتَابِهٖ جنس کے معنیٰ میں ہے۔پس ایسی صورت میں وہ جمع (کُتُبِهٖ) والی دوسری قرأت کے مطابق ہے۔

اسماء میں سے مضاف کثرت کے معنیٰ میں بھی آئے ہیں جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۔حدیث میں آیا ہے: مَنَعَتِ الْعِرَاقُ دِرْهَمَهَا وَ قَفِيْزَهَا اس سے کثرت مراد ہے جس طرح اس اسم سے کثرت مراد ہوتی ہے جس پر لام تعریف داخل ہوتا ہے اس آیت میں جسے اختیار کیا گیا ہے وہ جمع (کتب) ہے تا کہ وہ ماقبل اور مابعد کے مشابہ ہوجائے اور دوسری بات یہ ہے کہ قراء کی کثرت اس کی قائل ہے۔

جس قاری نے لَا یُفَرِّقُ پڑھا ہے تو اس نے تقدیر میں لَا یُفَرِّقُ الرَّسُوْلُ یا کُلٌّ لَا یُفَرِّقُ مانا ہے اور جن قراء نے لَا نُفَرِّقُ پڑھا ہے تو انہوں نے یہ تقدیر مانی ہے: وَقَالُوْا لَا نُفَرِّقُ جس طرح یہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا (سورۂ سجدہ، آیت ۱۲) یعنی وَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا۔

ترکیب:

غُفْرَانَكَ، منصوب ہے اس لئے کہ یہ اس فعل کا بدل ہے جس سے یہ مشتق ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا غُفْرَانَكَ دعا میں مصدر کو ذکر کر کے فعل سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ پس یہ مصدر فعل کا بدل اور اس کی جگہ آیا ہے۔

تفسیر:

بندگی کا اقرار

جب خداوند عالم نے نماز وزکوۃ کے فرض ہونے، احکام شرع اور انبیاء کے واقعات کو بیان کر دیا، اپنی عظمت اور پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ان تمام چیزوں کی تصدیق پر سورہ کا اختتام کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ءَامَنَ الرَّسُوْلُ (پیغمبر ایمان لائے) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصدیق کی بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (جو کچھ ان کے ربّ کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا وہ اس پر ایمان لائے) اس سورہ اور دیگر سوروں میں مذکور احکام۔

ارشاد: وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ (اور ان کے ساتھ مومنین بھی سب کے سب) اٰمَنَ بِاللّٰهِ (اللہ پر (ایمان لائے)) یعنی اس کے وجود وصفات کی تصدیق کی، اس سے تشبیہ کی نفی کی اور اسے ان چیزوں سے پاک ومنزہ مانا جو اس کے شایان شان نہیں ہیں۔ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ یعنی اس کے فرشتوں پر ایمان لائے کہ سب معصوم اور مطہر و پاکیزہ ہیں۔ وَكُتُبِهٖ یعنی اس کی کتابوں پر ایمان لائے یہ کہ قرآن اور تمام نازل شدہ کتابیں حق اور سچ ہیں۔ وَرُسُلِهٖ اور اس کے رسولوں اور تمام نبیوں پر ایمان لائے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسولوں میں ان پر ایمان رکھنے کی بابت فرق نہیں کرتے کہ

بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کر دیں جس طرح اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے کیا۔

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (اور انھوں نے کہا: ہم نے تیرے احکام سنے اور اطاعت قبول کی) یعنی ہم نے تیرا فرمان سنا اور تیرے امر کی اطاعت کی جب آپ اسے اللہ سے متعلق قرار دیں یا ہم نے ان کا فرمان سنا اور ان کے امر کی اطاعت کی جب آپ اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق قرار دیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے فرمان اور رسول کے فرمان کو مطیع و فرماں بردار مومنین کے سننے کی طرح سنا۔ یہ اس کے برعکس ہے جس کی خبر اللہ نے کفار کے بارے میں دی ہے کہ جب انھوں نے اس طرح کہا تھا: سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا؛ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔

ارشاد: غُفْرَانَكَ رَبَّنَا (خداوندا! ہمیں تیری مغفرت چاہیے) یعنی وہ کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہماری مغفرت فرما۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم تیری مغفرت و بخشش چاہتے ہیں۔

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (اور ہمیں تو تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے) یعنی بازگشت تیری جزا کی طرف ہے جزاء کی طرف بازگشت کو خدا کی جانب بازگشت قرار دیا ہے یہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کے مانند ہے کہ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ مراد یہ ہے کہ اپنے پروردگار کے ثواب کی طرف جا رہا ہوں یا اس چیز کی جانب جس کا حکم میرے پروردگار نے مجھے دیا ہے اور یہی بعث و نشور (دوبارہ زندہ کیے جانے اور اٹھائے جانے) کا اقرار ہے۔

❁❁❁❁❁

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا فائدہ اس کو ملے گا اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال بھی اسی کے ذمے ہوگا۔ (ایمان لانے والو! تم اس طرح دعا طلب کرو) پروردگارا! اگر ہم سے

بھول چوک یا کوئی خطا سرزد ہو جائے تو ہم سے اس کے بارے میں باز پرس نہ کرنا۔ بارالہا! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ خدایا! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہمیں نہیں ہے وہ ہم پر نہ ڈال۔ تو ہمیں معاف کردے، ہماری مغفرت فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولا ہے۔ کافروں کے مقابلے میں تو ہماری مدد فرما۔ (۲۸۶)

الفاظ ومعانی:

اَلْوُسْع: طاقت کے اندر، اسے وسع اس لئے کہا گیا ہے کہ انسان کر سکتا ہے، اس پر دشوار نہیں ہے۔

اَخْطَاْنَا یعنی ہم نے خطا کی۔ ابوعبیدہ نے کہا: اَخْطَأَ وَ خَطِئَ دو الفاظ ہیں۔ البتہ دونوں کے درمیان فرق ہے: اَخْطَأَ کبھی گناہ اور غیر گناہ دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن خَطِئَ فقط گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اَلْاِصْر لغت میں بوجھ کے معنی ہیں۔

تفسیر:

طاقت بھر ذمہ داری

پھر خداوند عالم نے ان چیزوں کی وضاحت فرمائی کہ جن کا اس نے حکم دیا ہے اور جن سے نہی فرمائی ہے کہ وہ ان میں انسان کی طاقت سے زیادہ فرائض نہیں رکھے ہیں، ارشاد فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا) یعنی نہ تو کسی کو حکم دیتا ہے نہ ہی کسی کو نہی کرتا ہے مگر جس چیز کی وہ استطاعت (طاقت وصلاحیت) رکھتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے ارشاد: اِلَّا وُسْعَهَا کے معنی یہ ہیں: مگر یہ کہ نفس کے لیے آسانی ہو، نہ کہ تنگی ودشواری۔ اس کی طاقت بھر تکلیف نہیں دیتا اگر اس کی طاقت بھر تکلیف دیتا تو کوشش کرنے والا اس تک پہونچتا۔ یہ سفیان بن عیینہ سے مروی ہے۔ یہ قول حسن ہے۔ اس قول میں مجبرہ کے عقیدہ کے باطن ہونے پر دلیل ہے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں کی طاقت سے زائد انھیں دینا صحیح ہے۔ اس لیے کہ وسع وہ (چیز) ہے انسان کی قدرت وطاقت میں ہے اور وہ مجھود اور پوری طاقت وقدرت کو صرف کرنے سے مافوق ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ سوائے اس کے کہ نفس

اس کی وسعت رکھتا ہو اور اس کے لیے حلال ہو۔ یہ قول غلط ہے اس لیے کہ جو شخص اپنے خادم سے کہتا ہے: میں تجھے حکم نہیں دیتا ہوں مگر ان چیزوں کا کہ ان کے انجام دینے کی تجھے آزادی اور اجازت دوں۔ اس طرح سے بات کرنا غلط ہے اس لئے کہ مولا کا حکم دینا ہی غلام کو آزادی اور اجازت دینا ہے۔

ارشادِ الٰہی: لَهَا مَا كَسَبَتْ (ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا فائدہ اس کو ملے گا) یعنی اس نے جو اطاعت کی ہے اس کا ثواب اس کے لئے ہے۔ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اور گناہوں میں سے جو کچھ سمیٹا ہے اس کا وبال اور جزا بھی اسی کے ذمے ہوگا) ثواب اور عذاب کو کسب (کمائی) کہنا صحیح ہے اس لیے کہ ان دونوں کو اس نے کسب کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ (ایمان لانے والو! تم اس طرح دعا کرو) پروردگارا! ہم سے باز پرس نہ کرنا) بیان کیا گیا ہے کہ اس کی تقدیر یوں ہے قُوْلُوْا رَبَّنَا یہ حکایت اور ثنا کے عنوان سے ہے اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اگر ہم سے بھول چوک یا کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ یہ دعا کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہے: يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا کہا گیا ہے۔ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا کی چند تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

اول: نَسِيْنَا سے تَرَكْنَا (یعنی ہم نے ترک کر دیا) مراد ہے۔ جیسے یہ آیت کہ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ یعنی انھوں نے اللہ کی اطاعت ترک کر دی، اللہ نے ان کے ثواب کو ترک کر دیا۔ اس کا ارشاد ہے: وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ یعنی تم اپنے آپ کو چھوڑ دیتے ہو۔

اَخْطَاْنَا سے اَذْنَبْنَا (یعنی ہم نے گناہ کیا) مراد ہے اس لیے کہ گناہ کو خطا سے تعبیر کیا جاتا ہے چونکہ یہ صواب (صحیح) کی ضد ہے۔ اگرچہ اس کا فاعل اسے عمداً اور جان بوجھ کر انجام دے گویا خداوند عالم نے انھیں حکم دیا ہے انھوں نے جن واجبات کو چھوڑ دیا ہے ان سے اور جن برائیوں کو انجام دیا ہے ان سے استغفار کریں۔

دوم: اِنْ نَّسِيْنَآ اگر ہم وہ کام کریں کہ جن کی وجہ سے تیرے حکم کہ تو بھول جاتے اور واجب سے غفلت ہو جاتی ہے۔ اَوْ اَخْطَاْنَا یعنی وہ کام کریں جن کی وجہ سے خطا اور غلطی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح دعا کرنا حسن ہے نیز اس طرح عذر خواہی کرنا بھی حسن ہے۔

سوم: لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ یعنی اگر ہم سہو اور غفلت کے باعث وہ فعل انجام نہ دیں جس کا انجام دینا واجب تھا اَوْ اَخْطَاْنَا اور کسی قصد و ارادہ کے بغیر وہ فعل انجام دے دیں جس کا ترک واجب تھا۔ یہ بھی اللہ کے حضور بازگشت کے لئے دعا اچھی ہے اور اس کی بارگاہ میں دعا اور اس سے مدد طلب کرنے کا اظہار

ہے اگچہ اس کی جانب سے اس بات کا اطمینان ہے کہ وہ ان چیزوں پر مواخذہ نہیں کرے گا: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ جوابوں میں سے ایک جواب کی بنا پر اس آیت کے مانند ہے کسی ایک جواب کے ساتھ اس کا ارشاد ہے: رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ایسی مثالوں کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے۔

چہارم: ابن عباس اور عطا سے مروی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں ہمیں عذاب نہ کرنا اگر ہم سے بسبب جہالت یا عمداً گناہ ہو جائے

ارشادالٰہی: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا (بارالٰہا! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال) اس کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

اول: ہم پر کوئی ایسا عمل نہ لاد دینا جسے بجالانے سے ہم عاجز ہوں، نہ ہی اس کے ترک کرنے پر ہمیں عذاب میں مبتلا کرنا۔ یہ ابن عباس، قتادہ، مجاہد، ربیع اور سُدی سے مروی ہے۔

دوم: ہم پر کوئی بوجھ مت لاد دینا۔ یہ ربیع، مالک اور عطا سے مروی ہے یعنی معاملات کو ہم پر سخت مت کرنا۔

ارشاد: كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا (جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا) یعنی تو نے گذشتہ امتوں کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ جب وہ کوئی گناہ کرتے تو ان پر بہت جلد عذاب نازل ہوتا اور ان پر اس گناہ کے سبب کھانے کی حلال اشیا بھی حرام کردی جاتی تھیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا (سورۂ نساء، آیت ۱۶۰؛ ان یہودیوں کے ظالمانہ رویہ کی بنا پر جن پاکیزہ چیزوں کو ہم نے ان کے لیے حلال قرار دیا تھا ان پر حرام کردیں اور اس وجہ سے بھی وہ اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روک رہے تھے) اور ان سے اس پر عہد و پیمان لیے جاتے اور ان پر مختلف جو اس امت (محمدیہ) پر نہیں ڈالے گئے اس امت کو ان میں چھوٹ دی گئی سے ان امور کی تخفیف کرتے ہوئے۔

ارشاد: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (خدایا! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہمیں نہیں ہے وہ ہم پر نہ ڈال) بیان کیا گیا ہے کہ اس کی چند تفسیریں ہیں:

اول: جن تکالیف و امتحان کا برداشت کرنا ہمارے لیے سنگین و گراں ہو مثلاً توبہ کے طور پر خود کو قتل کرنا، انسان ایسے کام کے لیے جو اس پر دشوار ہوتا ہے اس طرح کہتا ہے: إِنِّي لَا أُطِيقُهُ میں اس کام کی

طاقت نہیں رکھتا۔

دوم: فوری طور پر اور بعد میں جس کا عذاب برداشت کرنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔

سوم: یہ تعبد کے عنوان سے ہے، اگرچہ خداوند عالم کسی پر بھی اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف اور ذمہ داری عائد نہیں کرتا جیسا کہ ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں۔

ارشاد: وَاعْفُ عَنَّا (تو ہمارے گناہوں کو معاف کردے!) وَاغْفِرْ لَنَا (اور ہماری خطاؤں کی مغفرت فرما اور ان کی پردہ پوشی فرما!) وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحم کر) دنیا میں ہم پر اپنا انعام عطا فرما کر اور آخرت میں بخش کر اور جنت میں داخل کر کے!

اَنْتَ مَوْلٰىنَا (تو ہمارا مولا ہے) یعنی تو ہمارا ولی و سرپرست، ہم پر اولیٰ بالتصرف اور ہمارا مددگار ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (کافروں کے مقابلے میں تو ہماری مدد فرما) یعنی کافروں پر ہمیں غلبہ عطا کر کے ہماری نصرت فرما اور حجت (دلیل) کے ذریعہ ان پر قہر و غلبہ عطا فرما!

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ خداوند عالم اس دعا کے ہر فقرہ پر فرماتا ہے: فَعَلْتُ وَ اسْتَجَبْتُ؛ میں نے اسے انجام دے دیا اور قبول کر لیا اسی لئے اس دعا کا بکثرت پڑھنا مستحب ہے۔ مشہور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوا ہے آپؐ نے فرمایا: جو شخص شب میں سورۂ بقرہ کی دو آخری آیتوں کی تلاوت کرے گا تو یہ دونوں آیتیں اس کی شب بھر کی عبادت کے لیے کفایت کریں گی اور عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے: جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر لے جایا گیا اور آپؐ سدرۃ المنتہیٰ پر پہونچے تو آپؐ کو تین پانچ چیزیں عطا کی گئیں: نمازہائے پنجگانہ سورۂ بقرہ کی اختتامی آیتیں اور یہ کہ آپؐ کی امت میں سے جو اللہ کا شریک قرار نہ دے گا اس کی بخشش مگر یہ کہ وہ ان گناہوں کو انجام دے جو جہنم میں جھونک دیتی ہیں۔

ابن مکندر کے واسطے سے حدیث مرفوعہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: سورۂ بقرہ کے آخر میں (بعض) آیات ہیں جو (مکمل) قرآن ہیں وہ آیتیں دعا ہیں اور رحمن کی خوشنودی کا سبب ہیں۔

تفسیر کلبی میں انھوں نے اپنی سند سے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ابن عباس نے کہا:

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ اتنے میں آپ نے ایک آواز سنی، آپؐ نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا کہ آسمان کا ایک دروازہ کھلا ہوا، اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا، اس نے عرض کی: خداوند عالم

آپ کو ایسے دو نور کی بشارت دیتا ہے جو آپ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے: فاتحۃ الکتاب اور خواتیم سورۂ بقرہ جو بھی ان دونوں کی تلاوت کرے گا میں اس کی حاجت پوری کروں گا۔

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا: جب کوئی شخص سورۂ بقرہ سیکھ لیتا تھا تو وہ ہمارے درمیان باعظمت بن جاتا تھا۔

سُورَةُ آلِ عِمْرَان

یہ مکمل سورہ مدنی ہے۔ یہ ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور تمام مفسرین سے مروی ہے۔
اس سورہ میں دوسو آیات ہیں۔

فضیلت سورہ:

اُبَی بن کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جو شخص سورۂ آل عمران کی تلاوت کرے گا خداوند عالم اسے اس کی ہر آیت کے عوض جہنم کے پل پر امان عطا کرے گا۔

ابن عباس بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص روز جمعہ سورۂ آل عمران کی تلاوت کرے گا اس پر غروب آفتاب تک اللہ اور اس کے فرشتے درود پڑھیں گے (یعنی اللہ اپنی نعمت نازل کرے گا اور فرشتے اس شخص کے لیے اللہ سے طلب رحمت کریں گے)

بریدہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تعلیم حاصل کرو، اس لئے کہ یہ دونوں پھول ہیں اور یہ روز قیامت ان کی تلاوت کرنے والے پر دو بادلوں یا دو پرندوں یا پرندوں کی دو صفوں کے مانند سایہ فگن ہوں گے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ الۡحَـىُّ الۡقَيُّوۡمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ﴿۳﴾ مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخۡفٰى عَلَيۡهِ شَىۡءٌ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ﴿۵﴾

بنامِ خدا، مہربان وشفیق

الف۔لام۔میم (۱) اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہ زندہ ہے اور نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے (۲) (اے رسول) اس نے تم پر کتاب نازل کی جو برحق ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس سے پہلے آچکی ہیں اور اس نے توریت اور انجیل کو بھی نازل کیا ہے (۳) اس سے پہلے انسانوں کی ہدایت کے لیے اور اس نے فرقان کو بھی نازل کیا۔ جن لوگوں نے آیات خداوندی کو قبول کرنے سے انکار کیا ان کے لیے شدید عذاب ہے۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ لینے والا ہے۔ (۴) اللہ سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے زمین میں اور نہ ہی آسمان میں (۵)

قرأت:

ابو جعفر، اعشیٰ اور برجمی نے ابو بکر سے، انھوں نے عاصم سے الٓمّٓ کے میم کو ساکن اور لفظ جلالہ اللّٰہُ کے ہمزہ کو ہمزہ قطع پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ہمزہ وصل اور میم کو مفتوح پڑھا ہے۔ شواذ میں عمر بن خطاب، ابن مسعود، ابراہیم نخعی اور اعمش سے اور زید بن علی بن الحسین علیہم السلام سے، جعفر بن محمد الصادق علیہما السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اَلۡحَیُّ الۡقَیَّامُ کی روایت کی گئی ہے۔ حسن سے اَلۡاَنۡجِیۡل ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: سارے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسم جلالہ اللہ میں ہمزہ وصل کو ساقط کر دیا جاتا

ہے یہ اتفاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ میم ساکن ہے جس طرح سارے حروف تہجی مبنی بر وقف ہوتے ہیں۔ جب میم ساکن اور لام تعریف ایک جگہ جمع ہو جائیں تو میم کو تیسرے حرف ساکن یعنی لام تعریف کی بنا پر فتحہ دیں گے۔ میم کو تیسرے ساکن کی بنا پر فتحہ دینے کی دلیل سیبویہ کا قول ہے کہ حروف تہجی میں دو ساکن جمع ہو جاتے ہیں جیسے حامیم، عین سین قاف اور ایسا اس لئے ہے کہ یہ حروف تہجی مبنی بر سکون (وقف) ہیں جیسا کہ اسماء عدد بھی اسی کے مانند مبنی بر وقف (سکون) ہیں پس میم کو تیسرے ساکن کی بنا پر فتحہ دے دیا گیا ہے۔ جس طرح مِنَ اللهِ (سورۂ بقرہ، آیت ۶۱) میں نون کو التقائے ساکنین کی بنا پر فتحہ دیا گیا ہے۔

اور جنہوں نے لفظ جلالہ اللہ کے ہمزہ سے آغاز کی بنا پر اسے ہمزہ قطع مانا ہے تو گویا انہوں نے، میم پر وقف کیا ہے اور ہمزہ سے آغاز کی بنا پر اسے ہمزہ قطع مانا ہے۔

الْقَيَّامُ ابن جنی نے کہا: یہ قَامَ يَقُوْمُ سے فِيْعَال کے وزن پر صفت مشبہ ہے اسی کے مانند اَلْغِيْدَاق بھی ہے۔ قیام کی اصل قِيْوَام ہے یاء اور واؤ کو ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں یاء ساکن پہلے ہے لہٰذا واؤ کو یاء سے بدل کر دونوں میں ادغام کر دیا گیا ہے۔

اَلْقَيُّوْم والی قرأت بھی قَامَ يَقُوْمُ سے فَيْعُوْل کے وزن پر ہے۔

لفظ اَنْجِيْل ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ کلام عرب میں اس کی نظیر معروف نہیں ہے اس لئے کہ ان کے یہاں اَفْعِيْل ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، کوئی وزن نہیں ہے۔ اگر یہ لفظ غیر عربی اعجمی ہوتا تو ان کے نزدیک ایک طرح کی دلیل ہوتی ہے اور وہ ان کے نزدیک عربی ہے یہ نَجَلَ يَنْجُلُ سے اَفْعِيْل کے وزن پر ہے جس کے معنی ابھارنے اور باہر نکالنے کے ہیں۔

اسی سے نَجَلَ الرَّجُلُ لِوَلَدِهٖ ہے اس لئے وہ اسے اپنے صلب اور شکم مادر سے باہر نکالتے ہیں۔ اعشیٰ نے کہا:

اَنْجَبَ اَزْمَانٍ وَالِدَاهُ بِهٖ اِذْ نَجَلَاهُ فَنِعْمَ مَا نَجَلَا

یعنی اَنْجَبَ وَالِدَاهُ اَزْمَانٌ اِذَا نَجَلَاهُ۔ شاعر نے مضاف جو کہ اَزْمَانٌ ہے اور مضاف الیہ جو کہ اِذْ ہے جیسے حِيْنَئِذٍ، يَوْمَئِذٍ) کے درمیان فاعل کے ذریعہ فاصلہ ڈال دیا ہے اور اس کتاب کو انجیل اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ حلال وحرام کے علم کا استخراج کیا جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ تَوَارَةٌ فَوْعَلَةٌ کے وزن پر ہے وَرَیَ الزَّنْدُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ قَدَحَ (آگ جلانے) کے ہیں اور تَوْرَاة کی اصل

وَوْرَاۃ ہے کہ واو کو تاء سے بدل دیا گیا ہے جیسے ان کلمات میں ہے: التِجَاہ والتَخمَۃ التِکْلَان وَ التُّرَاث کہ ان کلمات کی اصل بالترتیب یہ ہے۔

اَلوَجہ ،الوِخَامَۃ ، الوَکْل اور الوِرَاثَۃ ۔پس تَوْرَات وَرَیٰ الزَّنْدُ سے مشتق ہے۔ جو ظَهرَتْ نَارُہٗ (اس کی آگ ظاہر ہوگئی ہے چنگاری نکل گئی ہے) کے معنیٰ میں ہے اور اِنْجِیل نَجَلَ یَنْجُلُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ اِسْتَخرَجَ کے ہیں اس لئے کہ ان دونوں کتابوں میں حلال وحرام کی شناخت ہے جس طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب میں حلال وحرام کی شناخت ہے۔ جس طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب کو فُرقَان کہا گیا ہے اس لئے کہ وہ حق وباطل کے درمیان جدائی ڈالتی ہے۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ان سب کے معنیٰ قریب قریب ہیں اور سب اظہار، ابراز اور چیزوں کے درمیان فرق کے ہیں۔

علی بن عیسیٰ نے کہا: نَجَل کے معنیٰ اصل کے ہیں گو یا اِنجِیل علم کی جڑوں میں سے ایک جڑ ہے۔

ایک دوسرے عالم نے کہا: اس کے معنیٰ فَرْع کے ہیں اس لئے کہ اولاد کو نَجَل کہا گیا ہے اور اس کتاب کو اِنجِیل اس لئے کہا گیا ہے کہ گو یا اِنجِیل تورات کی فرع ہے اور اسی سے نکلتی ہے۔

ابن فضال نے کہا: اِنجِیل نَجَل سے مشتق ہے جس کے معنیٰ وسعت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: عَیْنٌ نَجلَاءُ وَ طَعْنَۃٌ نَجلَاءُ (وسیع آنکھ) (وسیع زخم) گو یا انجیل میں ان کے لئے اس چیز میں وسعت دے دی گئی ہے جو اہل تورات پر تنگ تھی۔ یہ سارے اقوال محتمل وممکن ہیں۔

ترکیب:

مُصَدِّقاً بر بنائے حال منصوب ہے۔ مِنْ قَبْلُ یعنی مِنْ قَبْلِ اِنْزَالِ الْکِتَابِ جب قَبْل کو اضافت سے جدا کر دیا گیا ہے تو وہ مبنی بر ضمہ ہو گیا۔ هُدیً تورات وانجیل کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی هَادِیَیْنِ۔ هُدیً مبتدا محذوف کی خبر بھی ہوسکتا ہے۔ تقدیر یہ ہے: هُمَا هُدیً۔

شان نزول:

کلبی، محمد بن اسحاق اور ربیع بن انس نے بیان کیا ہے: اس سورہ کی ابتدائی اسی (۸۰) اور سے کچھ زیادہ

آیتیں نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئیں۔ یہ ساٹھ (۶۰) سوار تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، جن میں چودہ افراد ان کے اشراف اور بزرگان قبیلہ تھے، ان چودہ افراد میں تین افراد ایسے تھے جو ان کے معاملات کے نگراں تھے، عاقب امیر قوم اور ان کا ایسا مشیر تھا جس کی رائے کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اس کا نام عبدالمسیح تھا اور سید ان کا امیر کاروان تھا، اس کا نام الایہم تھا۔ ابو حارثہ بن علقمہ ان کا رہبر و پیشوا اور ان کے مدارس کا نگراں تھا، اس کی ان کے درمیان بڑی عظمت و منزلت تھی وہ انھیں ان کی کتب پڑھاتا تھا۔ روم کے بادشاہوں نے اسے شرف واحترام عطا کیا تھا اور اس کے علم واجتہاد کے سبب اس کے لیے کنیسے بنوائے تھے۔

یہ تمام افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں وارد مدینہ ہوئے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ اس وقت عصر کی نماز ادا کی جارہی تھی، ان کے بدن پر بیش قیمتی لباس جبے اور ردائیں تھیں۔ یہ لوگ بنی حارث بن کعب کے مردوں کے قیافہ میں تھے۔ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے جن لوگوں نے انھیں دیکھا تھا ان میں سے بعض افراد نے کہا: ہم نے ان کے جیسا وفد ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ جب ان کی عبادت کا وقت آیا تو انھوں نے ناقوس بجایا اور کھڑے ہو کر مسجد پیغمبرؐ میں نماز پڑھنے لگے۔ اصحاب پیغمبرؐ نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! یہ آپؐ کی مسجد میں (نماز پڑھ رہے) ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انھیں چھوڑ دو (ان سے کچھ نہ کہو) انھوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔ اس کے بعد سید اور عاقب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرنا شروع کی، آپؐ نے ان دونوں سے فرمایا: تم اسلام قبول کرلو! انھوں نے کہا: ہم آپ سے پہلے ہی اسلام لا چکے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم دونوں جھوٹے ہو، تمھارا اللہ کے لیے فرزند قرار دینا، صلیب کی عبادت کرنا اور خنزیر کا گوشت کھانا اسلام سے مانع ہے۔ انھوں نے کہا: اگر عیسیٰ اللہ کے فرزند نہیں تو عیسیٰؑ کا باپ کون ہے؟ اس طرح سب نے پیغمبرؐ سے جناب عیسیٰؑ کے متعلق بحث شروع کردی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ فرزند اپنے باپ سے ضرور مشابہ ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں! ایسا ہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو ہمارا پروردگار ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں آئے گی؟ جبکہ عیسیٰؑ کو موت آئی، انھوں نے کہا: ہاں ایسا ہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو ہر چیز پر ہمارا پروردگار حاکم و نگراں ہے، ہر چیز کا وجود ہمارے پروردگار کا مرہون منت ہے؟ جس کی وہ حفاظت کرتا ہے، انھیں رزق عطا کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں ایسا ہی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا

عیسیٰؑ کو ان چیزوں میں سے کسی پر اختیار حاصل تھا؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تمھیں معلوم ہے خداوند عالم سے زمین وآسمان کی کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! ایسا ہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا عیسیٰؑ اس بارے میں کچھ جانتے تھے سوائے اس کے جس کی انھیں تعلیم دی گئی تھی؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہمارے پروردگار نے (شکم مادر میں) جس طرح چاہا عیسیٰؑ کی صورت گری کی، ہمارا پروردگار نہ کھاتا ہے، نہ ہی پیتا ہے، نہ ہی اسے رفع حاجت کی احتیاج ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا: ہاں ایسا ہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ مادر عیسیٰؑ اس طرح حمل سے رہیں جس طرح کوئی عام عورت حمل سے رہتی ہے، اسی طرح انھوں نے وضع حمل کیا جس طرح کوئی ماں اپنے بچہ کو جنم دیتی ہے؟ پھر انھیں اسی طرح غذا دی گئی جس طرح بچہ کو غذا دی جاتی ہے۔ پھر وہ کھاتے پیتے اور انھیں رفع حاجت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ انھوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ کس طرح ممکن ہے جس کا تم گمان کر رہے ہو؟ چنانچہ تمام لوگ خاموش ہو گئے اور خداوند عالم نے سورۂ آل عمران کی اسی (۸۰) اور سے کچھ زیادہ آیتیں نازل فرمائیں۔

تفسیر:

توحید اور عظمت قرآن کریم

جب خداوند عالم نے سورۂ بقرہ کا توحید وایمان کے ذکر پر اختتام فرمایا تو اسی طرح اس سورہ کا آغاز بھی توحید اور ایمان سے کیا، ارشاد فرمایا: الٓمّٓ اس کے بارے میں اختلاف اور اس کے معنی کا ذکر ہم اس کے مقام پر سورۂ بقرہ کی ابتدا میں کر چکے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہ زندہ ہے اور نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے) اس کی تفسیر ہم آیۃ الکرسی میں ذکر کر چکے ہیں۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اسم اعظم الٰہی ہے۔ یہی وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعہ جناب سلیمانؑ کے وزیر آصف ابن برخیا نے تخت بلقیس کو شہر سبا سے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر کر دیا تھا قبل اس کے کہ ان کی پلک جھپکتی۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اے محمدؐ! اس نے تم پر کتاب یعنی قرآن نازل کیا بالحق جو برحق ہے۔

بِالْحَقِّ (جو برحق ہے) بِالْحَقِّ کے بارے میں دو اقوال ہیں:

اول: اس کی خبروں میں صداقت اور سچائی ہے۔

دوم: اَلْحَقِّ یعنی حکمت و مصلحت جس کا تقاضا کرتی ہے اس کے مطابق بھیجا ہے یعنی اَلْحَقِّ حکمت کے معنیٰ میں ہے۔ قرآن ان دونوں معنیٰ میں حق ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ (اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس سے پہلے آچکی ہیں) یعنی اس سے پہلے جو کتابیں اور رسول گذر چکے ہیں ان کی تصدیق کر رہی ہے۔ یہ مجاہد، قتادہ، ربیع اور تمام مفسرین کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یعنی جو کچھ بھی اس سے پہلے گزر چکا ہے اس لیے کہ اس کے معنیٰ وہی ہیں جو اَلَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ کے معنیٰ ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے مُصَدِّقًا کے بارے میں یہاں پر دو اقوال ہیں:

اول: جو ان کے سامنے ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہے یعنی گذشتہ خبر کی موافقت کرنے والا ہے۔ (یہ قرآن) اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے صحیح ہونے پر دلالت ہے، اس اعتبار سے کہ یہ اس طرح نہیں ہوسکتا مگر یہ کہ آپ علام الغیوب اللہ کی طرف سے ہو۔

دوم: (قرآن) انبیاء کی صداقت اور جو کتابیں انھیں عطا کی گئیں ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ بعض کی تصدیق کرے اور بعض کی تکذیب۔

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ (اور اس نے توریت نازل کی) موسیٰؑ پر۔ وَالْاِنْجِیْلَ (اور انجیل کو بھی نازل کیا ہے) عیسیٰؑ پر۔

مِنْ قَبْلُ (اس سے پہلے) یعنی قرآن کے نازل کئے جانے سے پہلے هُدًى لِّلنَّاسِ (انسانوں کی ہدایت کے لیے) مفعول لہ ہے یعنی رہنمائی اور وضاحت کے لئے نازل کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تین کتب ہیں یعنی تا کہ ہر کتاب والا اپنی کتاب سے ہدایت حاصل کرے اور ہر زمانہ والا جو اس کے زمانہ میں نازل کیا گیا ہے اس سے ہدایت حاصل کرے۔ بیان کیا گیا ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ. اَلْكِتَاب کے لیے حال ہے یعنی اس حالت میں کہ لوگوں کے لیے ہدایت کرنے والی ہے۔

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ (اور اس نے فرقان کو بھی نازل کیا) اس (فرقان) سے قرآن مراد ہے۔ اس کے مکرر بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے صفات کی دلالتیں مختلف ہیں؛ اگر چہ موصوف (قرآن) ایک ہی ہے۔ اس لیے کہ ہر صفت کے الگ الگ فائدے موجود جو دوسری صفت میں نہیں ہیں، اس لیے کہ (فرقان)

کے ذریعہ حق اور باطل کے درمیان فرق کیا جاتا ہے، جن میں امور دین کی احتیاج ہوتی ہے جیسے حج وغیرہ کے احکام جو تمام قرآن میں موجود ہیں اور قرآن کو اَلْکِتَاب کہنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کی شان یہ ہے کہ اسے لکھا جائے۔

عبداللہ بن سنان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: فرقان قرآن کی ہر محکم آیت ہے اور وہ ہے جس میں اس سے ماقبل انبیاؑ کی تصدیق کی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ فرقان حق و باطل کے درمیان فاصلہ کرنے والا ہے۔ یہ ابو مسلم کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے اس سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حجت قاطعہ مراد ہے، اس کے برخلاف جس نے آپ سے عیسیٰؑ کے بارے میں بحث ومباحثہ اور کٹ حجتی کی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے نصرت و مدد مراد ہے۔

ارشاد الٰہی: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ (جن لوگوں نے آیات خداوندی کو قبول کرنے سے انکار کیا) لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (ان کے لیے شدید عذاب ہے) جب خداوند عالم نے اپنے ان دلائل کی وضاحت فرمادی جو اس کی توحید اور انبیا کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں تو اس کے فوراً بعد اس نے ان کی مخالفت اور انکار کرنے والوں کو وعید کی ہے اور خبردار کیا ہے تاکہ اس طرح ان کی تکلیف کو مکمل کر دیا جائے۔

ارشاد: وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ (اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے) یعنی (وہ) قادر ہے، جسے وہ عذاب کرنا چاہے اسے اس کے عذاب سے کوئی روک نہیں سکتا۔ عِزَّۃ کے لغوی معنی اِمْتِنَاع کے ہیں۔ اسی سے اَرْضٌ عِزَازٌ ہے یعنی ایسی زمین جو سخت ہونے کے سبب کسی کو چلنے نہ دے۔ اسی سے یہ محاورہ بھی ہے کہ مَنْ عَزَّ بَزَّ جو غالب آجاتا ہے اس لئے کہ غالب ظلم و زیادتی سے روک دیتا ہے۔ خداوند عالم عزیز ہے یعنی ممتنع ہے اس اعتبار سے کہ وہ ذاتی طور پر قادر ہے، اسے کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی۔ ذُو انْتِقَامٍ (اور برائی کا بدلہ لینے والا ہے) یعنی کفار سے انتقام لینے میں صاحب قدرت ہے، جس سے روکنے میں کسی کی مجال اور (جرأت) نہیں ہے۔ انتقام یعنی برے کو اس کی برائی پر اس کے عمل کا بدلہ دینا ہے۔

ارشاد الٰہی: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ (اللہ سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے زمین میں اور نہ ہی آسمان میں) جب خداوند عالم نے اپنی توحید اور انبیاء کی صداقت پر دلیلیں قائم کرنے کے باوجود اس کی معرفت حاصل کرنے میں کوتاہی کرنے والوں کو خبردار کر دیا تو یہ اس بات کے ذکر کا مقتضی تھا کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے تاکہ معصیت و نافرمانی کے ذریعہ اسے چھپانے والے کے لیے تحذیر کی جائے

اور اسے ڈرایا جائے کہ اس لیے کہ جزا اور بدلہ دینے والے پر کوئی (معمولی سی معمولی) چیز پوشیدہ نہیں ہوتی۔

اگر (اعتراضا) یہ بات کہی جائے کہ یہ کیوں فرمایا: لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (اس پر زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے) یہ کیوں ارشاد نہیں فرمایا: لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ عَلٰى وَجْهٍ مِّنَ الْوُجُوْهِ (یعنی اس پر کسی بھی طرح کی کوئی شی مخفی نہیں ہے۔) اس طرح کہنے میں مبالغہ شدید ہوتا؟! تو ہم کہیں گے: اس سے غرض اور مقصد ہمیں تعلیم دینا ہے کہ وہ جانتا ہے جس کے ذریعہ زمین و آسمان میں پوشیدہ کیا جاتا ہے (مخفی اور پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کیا جاتا ہے) اس طرح ذکر کرنا نفس کے لیے عظیم ترین اور قلب کے لیے زیادہ خوف و دہشت کا سبب ہے، اس دلالت کے ساتھ کہ وہ ہر چیز کا عالم اور واقف کار ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اِنَّهٗ عَالِمٌ بِكُلِّ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَ السَّمَآءِ (اللہ زمین و آسمان میں موجود ہر چیز کو جانتا ہے) کیوں نہیں کہا گیا؟ تو ہم کہتے ہیں: یہ صفت بیان کرنا (کہ اس پر کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے) اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ ہر اس جہت کے بارے میں علم رکھتا ہے کہ جس کے بارے میں علم رکھنا صحیح و درست ہو۔ جب کہ عبارت میں تصرف ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس کے بارے میں ذاتی طور پر علم رکھتا ہے۔ لہٰذا واجب ہے ہر اس چیز کا جاننا جس کا معلوم ہونا صحیح اور درست ہو اور جس چیز کا معلوم ہونا درست ہوگا اس کے لیے کوئی انتہا نہیں ہے اور (اللہ پر) کسی بھی جہت سے اس چیز کا مخفی اور پوشیدہ ہونا ممکن نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾
وہی تو ہے جو شکمِ مادر میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں وہ زبردست اور صاحبِ حکمت ہے۔ (۶)

الفاظ و معانی:

اَلتَّصْوِيْر کے معنی کسی چیز کو اس شکل و صورت پر بنانا جس شکل پر وہ پہلے نہیں تھی۔

اَلصُّوْرَة وہ ہیئت (شکل) ہے جس پر چیز تالیف ہوتی ہے (تشکیل پاتی ہے) اَلصُّوْرَة اور صِيْغَة کے درمیان فرق ہے کہ اَلصِّيْغَة یعنی وہ چیز جسے لغت میں وضع کیا گیا ہوتا کہ امور میں سے کسی امر پر دلالت

کرے جبکہ صُوۡرَۃ اس طرح نہیں ہے اس لیے کہ اس کی دلالت چیز کے بنانے والے پر ہوتی ہے۔

اَرۡحَام رَحِم کی جمع ہے۔اس کی اصل اَلرَّحۡمَۃ ہے چونکہ اسی کے ذریعہ (ایک دوسرے پر) رحم اور لطف ومہربانی کی جاتی ہے۔اَلۡمَشِیَّۃ کے معنی ارادہ کے ہیں۔

ترکیب:

کَیۡفَ بر بنائے مصدر (مفعول مطلق) محلا منصوب ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اَیَّ نَوۡعٍ یَّشَآءُ جملہ یَشَآءُ، مَن یُّصَوِّرُ کا حال ہے یعنی یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ یعنی یَخۡلُقُ صُوَرَکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ شَآئِیاً مُرِیۡداً اَیَّ نَوۡعٍ اِرَادَۃٍ (وہ ارحام میں تمہاری تصویریں خلق کرتا ہے جس نوع کیفیت کا ارادہ کرتا ہے، جیسا وہ چاہتا ہے ویسے ہی چاہتے ہو۔

تفسیر:

تخلیق کا شاہکار

هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ (وہی تو ہے جو شکمِ مادر میں تمہاری صورتیں بناتا ہے) یعنی وہ ارحام میں تمہاری شکلیں بناتا ہے۔ کَیۡفَ یَشَآءُ (جیسی چاہتا ہے بناتا ہے) جس صورت میں وہ چاہتا ہے، جس صفت میں وہ چاہتا ہے، مذکر ہو یا مؤنث، خوبصورت ہو یا بدصورت، طویل ہو یا کوتاہ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں وہ زبردست اور صاحبِ حکمت ہے) اپنے اقتدار وحکومت میں (زبردست ہے) اَلۡحَکِیۡمُ اپنے افعال میں صاحب حکمت ہے۔

یہ آیت اللہ کی وحدانیت، اس کے کمال قدرت اور مکمل حکمت پر دلالت کر رہی ہے، چونکہ وہ بچہ کو شکم مادر میں اس صفت کے ساتھ اس کی شکل وصورت پر بناتا ہے اور بغیر کسی آلہ اور مشقت کے عجیب وغریب انواع واقسام (نو بنو اقسام) پر اس کی ترکیب کرتا ہے۔اس نے ہر صاحب عقل کے عقل وشعور میں یہ بات جاں گزیں کردی ہے کہ اگر پوری کائنات بھی اکٹھا ہو کر پانی سے ایک مچھر بنانا چاہے اور اسے وہ شکل وصورت دینا چاہے جس کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں اور جس کا وہ استعمال کر رہے ہیں تو اس پر وہ قادر نہیں ہیں، نہ ہی ان کی پاس اس کا کوئی راستہ ہے۔ پس وہ شکم مادر میں کس طرح خلق کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں؟ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ

اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ بابرکت ہے خداوند عالم کی ذات جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ یہ استدلال امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

❀❀❀❀❀

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۷﴾

وہی تو ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس میں بعض آیات محکم ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ آیات مُتشابہات ہیں، پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور انھیں اپنے مطلب کے موافق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان آیات کا صحیح مفہوم اللہ اور رَاسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے۔ محکم ہوں یا متشابہ سب ہمارے رَبّ کی جانب سے ہیں اور صاحبان عقل ہی اس بات سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (۷)

الفاظ و معانی:

اَلۡمُحۡکَمُ ، اَحۡکَمۡتُ الشَّیۡءَ سے مشتق ہے۔ یعنی میں نے چیز کو محکم، مضبوط بنایا۔

اُمُّ الۡکِتَابِ (اصل کتاب ہے) مَکَّۃ، اُمُّ الۡقُرٰی ہے۔ لشکر کے پرچم کو اُمّ کہتے ہیں۔ اس کی اصل اُمَّھَۃ ہے۔ اسی سبب سے اس کی جمع اُمَّھَات ہے۔

مُتَشَابِھَۃ جس کے معنی ایک دوسرے سے مشابہ اور پیچیدہ ہوں، یہ اَلشِّبۡہ سے مشتق ہے چونکہ اس سے مراد مشکوک ہو جاتی ہے۔

اَلزَّیۡغ کے معنی جھکاؤ (ٹیڑھا پن اور کجی) کے ہیں۔

اِبْتِغَآء کے معنی طلب کے ہیں۔

اَلْفِتْنَۃ کے لغوی معنی اختیار اور آزمائش کے ہیں، فَتَنْتُ الذَّھَبَ بِالنَّارِ یعنی میں نے سونے کو آگ کے ذریعہ آزمایا۔ کہا گیا ہے کہ فِتْنَۃ کے معنی خالص بنانے کے ہیں۔

اَلتَّاوِیْل: تفسیر۔ اس کے لغوی معنی مرجع (بازگشت کے ہیں۔

اَلرَّاسِخُوْن کے معنی ثابت رہنے والوں کے ہیں جب اپنے مقام پر ثابت وقائم ہو تو رَسَخَ رُسُوْخًا بولا جاتا ہے۔

ترکیب:

مِنْہُ آیَاتٌ جملہ ہے جو کہ مبتدا خبر سے مرکب ہے۔ اَنْزَلَ کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اس کی تقدیر یہ ہے کہ اَنْزَلَ الْکِتَابَ مُحْکَماً وَّ مُتَشَابِھاً۔

ھُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ، جملہ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ آیَاتٌ کی صفت ہے اور اُخَرُ، آیات پر معطوف ہے وہ مبتدأ محذوف کی صفت اور تقدیر یہ ہے: وَ مِنْہُ آیَاتٌ اُخَرُ ۔مُتَشَابِھَاتٌ صفت بعد از صفت ہے اُخَر غیر منصرف ہے۔ سیبویہ نے کہا: اُخَر اپنے مانند دوسرے اسماء اور اصل (قانون) سے جدا ہے کہ جن کی اصل مبنی ہونا ہے اس لئے کہ اُخَر کی اصل یہ ہے کہ وہ الف لام کے ذریعہ صفت واقع ہوتا ہے جیسے اَلصُّغْرٰی وَ الصُّغَر جب یہ الف لام کے قانون سے ہٹ گیا اور اَفْعَل کی اصل یہ ہے کہ وہ صرف صفت واقع ہوتا ہے لہٰذا وہ غیر منصرف ہو گیا۔ کسائی نے کہا: یہ غیر منصرف نہیں ہے اس لئے کہ صفت ہے۔ یہ بات غلط ہے اس لئے کہ عرب کا یہ قول ہے کہ مَال، بُعَد و حُطَم منصرف ہیں حالانکہ دونوں صفت ہیں۔

اِبْتِغَاءَ دونوں مقام پر مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا مبتدا اور خبر ہے۔ کُلٌّ ایک ایسا اسم ہے جو مضاف الیہ پر دلالت کرتا ہے اور اہل بصرہ کے نزدیک کلام میں زیادہ تر اس سے مضاف الیہ کو حذف کر دیا جاتا ہے اور وہ لوگ اِنَّا کُلًّا فِیْھَا کو بر بنائے صفت جائز قرار نہیں دیتے ہیں حالانکہ اہل کوفہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ ان کے نزدیک محذوف ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے چاہے اسم ہو یا صفت۔ قَبْل غایت کی بنا پر مبنی ہے اور کُلّ مبنی نہیں ہے اگرچہ ان دونوں میں سے ہر ایک سے مضاف الیہ حذف ہو جاتا ہے اس لئے کہ قَبْل ظرف ہے کبھی معرفہ تو کبھی نکرہ ہوتا ہے۔ ان

کے درمیان مبنی کے ذریعہ فرق ڈالا جاتا ہے جو مضاف الیہ کی وجہ سے اس کے مبنی ہونے پر دلالت کرتا ہے اور معرب ہونے کے ذریعہ جو کہ انفصال کی وجہ سے اس کے نکرہ ہونے پر دلالت کرتا ہے حالانکہ کُلّ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ وہ افراد میں معرفہ ہوتا ہے، نکرہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن غیر مشابہ نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ اس میں امر کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

تفسیر:

آیات محکم ومتشابہ

جب قرآن کے نزول کا بیان گذر چکا تو اس کے فوراً بعد اس کے نزول کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ، اے محمد! (وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب یعنی قرآن نازل کیا ہے) مِنْهُ اس کتاب میں۔ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ (بعض آیات محکم ہیں جو اصل کتاب ہیں) وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (اور کچھ آیات متشابہات ہیں)

محکم اور متشابہ کے سلسلہ میں متعدد اقوال بیان کئے گئے ہیں:

اول: محکم وہ ہے کہ قرینہ کے بغیر ظاہر سے ہی اس کی مراد معلوم ہو جائے ایسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے جو اس کی مراد پر دلالت کرے اس کے واضح ہونے کی وجہ سے جیسے یہ آیت کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا (سورۂ یونس، آیت ۴۴: اللہ انسانوں پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (سورۂ نساء، آیت ۴۰: اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا) اور اسی طرح وہ چیزیں کہ جس کی مراد کی معرفت کے لیے دلیل کی ضرورت نہ ہو اور متشابہ وہ ہے کہ اس کے التباس اور متشابہ ہونے کی وجہ سے اس کے ظاہر سے اس کی مراد کا علم حاصل نہ ہو سکے، جب تک کہ اس سے وہ قرینہ وابستہ نہ ہو جو اس کی مراد کو واضح کرے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (سورۂ جاثیہ، آیت ۲۳: اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے) اس آیت میں اور اس جملہ میں وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (اور سامری نے انھیں بھٹکا دیا ہے) میں فرق ہے اس لیے کہ سامری کا گمراہ کرنا قبیح اور اللہ کا گمراہی میں مبتلا کرنا حسن ہے (یعنی بندہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا) یہ مجاہد کے قول کے معنیٰ ہیں۔ محکم وہ ہے جس کے معانی آپس میں مشتبہ (ایک جیسے) نہ ہوں اور متشابہ جس کے معانی آپس میں مثبت ہوں اور اشتباہ دینی امور میں واقع ہوتا ہے جیسے توحید،

اور تشبیہ وظلم کی نفی۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کرتے ہیں کہ ارشاد الٰہی ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ لغوی اعتبار سے یہ احتمال دیا جاتا ہے کہ خدا کا عرش پر استواء تخت پر بیٹھنے والے کے بیٹھنے جیسا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قہر وغلبہ اور مسلط ہونے کے معنی میں ہو۔ پہلی صورت اللہ سبحانہ کے لیے ممکن نہیں ہے۔

دوم: محکم ناسخ ہے اور متشابہ منسوخ ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

سوم: محکم وہ ہے جس کی تاویل میں فقط ایک ہی صورت کا احتمال ہو اور متشابہ وہ ہے جس میں دو یا اس سے زیادہ صورتوں کا احتمال ہو۔ یہ محمد بن جعفر بن زبیر اور ابو علی الجبائی کا قول ہے۔

چہارم: محکم وہ ہے جس کے الفاظ مکرر نہ ہوں اور متشابہ جس کے الفاظ کی تکرار ہو جیسے جناب موسیٰؑ کا واقعہ وغیرہ۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔

پنجم: محکم وہ ہے جس کی تاویل کے تعین کا علم ہو اور متشابہ جس کی تاویل کے تعین کا علم نہ ہو۔ جیسے قیامت کا برپا ہونا۔ یہ جابر بن عبد اللہ کا قول ہے۔

ام الکتاب کو واحد لایا ہے هُنَّ اُمَّهَاتُ الْكِتٰبِ نہیں فرمایا ہے اس کی دو وجہیں ہیں:

اول: یہ جواب کی صورت میں ہے گویا سوال کیا گیا کہ مَا اُمُّ الْكِتٰبِ (یعنی ام الکتاب کیا ہے؟) تو جواب میں فرمایا: هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ جس طرح سوال کیا جائے کہ مَنْ نَّظِيْرُ زَيْدٍ؟ (زید کے مثل کون ہے) تو جواب دیا جائے: نَحْنُ نَظِيْرُ زَيْدٍ یعنی ہم زید کے مثل ہیں۔

دوم: آیات کا مجموعہ اصل کتاب ہے، ہر محکم آیت ام الکتاب اور اصل کتاب نہیں ہے، اس لیے کہ یہ آیات بیان اور حکمت میں ایک ہی چیز کے مانند ہیں، اس جیسے یہ ارشاد الٰہی: وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ ہم نے عیسیٰؑ اور ان کی ماں کو آیت (نشانی) قرار دیا۔ یہاں پر آیت کہا گیا ہے (جبکہ مریم وعیسیٰؑ دو ہیں) آیتیں نہیں فرمایا، اس لیے کہ دونوں کی ایک ہی شان ہے کہ مریم نے عیسیٰؑ کو کسی مرد کے بغیر پیدا کیا، مریم کے لیے نشانی نہیں تھی مگر حضرت عیسیٰؑ کے سبب اسی طرح عیسیٰؑ کے لیے نشانی نہیں تھی مگر مریم کے ذریعہ، اگر الگ الگ دونوں میں سے ہر ایک آیت مراد ہوتی تو آیَتَيْنِ کہا جاتا۔

ارشاد الٰہی: فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ (پس جن کے دلوں میں کجی ہے) حق سے انحراف۔ زَيْغ (کجی) شک سے یا جہالت سے حاصل ہوتی ہے۔ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ (وہ ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں) یعنی متشابہ کے ذریعہ اپنے باطل (خیالات وعقائد) پر دلیل پیش کرتے ہیں۔

اَبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ (فتنے کی تلاش میں) ضلالت و گمراہی چاہنے اور لوگوں کے دین کو برباد کرنے کے لئے۔ بیان کیا گیا ہے کہ کمزور مخلوق کو فریب (شک وشبہ) میں مبتلا کرنے کے لیے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ شرف اور مال کی چاہت میں، جیسا کہ اللہ نے اپنی کتاب قرآن میں مختلف مقامات پر مال کو فتنہ کہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہاں پر فتنہ سے کفر مراد ہے۔ یہی امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے، ربیع اور سدی کا قول بھی یہی ہے۔

وَابْتِغَآءَ تَأْوِيْلِهِ (اور انھیں اپنے مطلب کے موافق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں) خلاف حق تاویل کرنا چاہتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ کھانے کی مدت کی طلب وخواہش میں (یعنی دنیا سے رزق اور اپنا حصہ پانے کی خواہش میں) (بطور مثال کہا جاتا ہے) محمدؐ اپنے جمل (اونٹ) کے حساب میں ہے اور اپنے انجام کا خواہش مند ہے۔ اس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَأْوِيْلًا یعنی عاقبت و انجام۔ عرب تَأَوَّلَ الشَّيْءُ اس وقت کہتے ہیں جب وہ چیز تمام ہو جائے۔ زجاج نے بیان کیا ہے ان کی تاویل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ اپنے دوبارہ زندہ کیے جانے کی تاویل چاہتے ہیں تو خداوند عالم نے انھیں بتا دیا اس کی (تاویل) سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: هَلْ يَنظُرُونَ اِلَّا تَأْوِيْلَهٗ (سورۂ اعراف، آیت ۵۳: کیا یہ لوگ صرف انجام کار کا انتظار کر رہے ہیں) اس سے جو لوگ مراد ہیں ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نجران کا وفد ہے جب انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جناب عیسیٰؑ کے بارے میں بحث ومباحثہ کیا تھا اور انھوں نے آپؐ سے سوال کیا تھا کیا کہ عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ انھوں نے کہا: ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ اس وقت اللہ نے آیت نازل فرمائی: فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ اس طرح ان کا کہنا تھا کہ روح وہ چیز ہے جس کے ذریعہ جسم کی بقا ہے۔ اس طرح انھوں نے آیت سے اس کے ظاہری معنی کو مراد لیا، جب کہ مسلمان اس بات پر حمل کرتے ہیں کہ جسم کی بقا روح کے ذریعہ اپنے وقت میں ہے (یعنی وقتی طور پر جسم کی بقا روح کے سبب ہے)

جبکہ دلیل اس بات پر قائم ہو چکی ہے کہ خدا کی قدیم ذات کے لیے اجزا و اعضا نہیں ہیں تو روح کی نسبت اللہ کی جانب دینا روح کو شرف بخشنے کے سبب ہے جس طرح البیت (کعبہ) کی نسبت اللہ کی جانب دی جاتی ہے۔ پھر خداوند عالم نے نازل فرمایا: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَؑ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ

(سورۂ آل عمران، آیت ۵۹: عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا) یہ ربیع کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ یہودی تھے جو اس امت کا انجام معلوم کرنا چاہتے تھے اور اسے حساب کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ کلبی کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد منافقین ہیں۔ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلکہ ہر وہ (شخص) مراد ہے جو متشابہ کے ذریعہ اپنے باطل عقائد پر حجت و دلیل پیش کرتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت اس بارے میں حروریہ (خوارج) اور سبائیہ (عبداللہ بن سبا کے پیروکار جیسوں کو شامل ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ (حالاں کہ ان آیات کا صحیح مفہوم اللہ اور رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا) علم میں ثابت، اس کے محافظ اور اس میں مضبوط و مستحکم ہیں۔ آیت کے نظم اور حکم کے بارے میں دو قول ہیں:

اول: اَلرَّاسِخُونَ واؤ کے ذریعہ لفظ جلالہ اللہ پر معطوف ہے، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ متشابہ کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کے، یہی حضرات اس کی تاویل جانتے ہیں۔

يَقُولُونَ (وہ لوگ کہتے ہیں) یہ جملہ محلاً منصوب میں ہے حال ہونے کی بنا پر جس کی تقدیر یہ ہے: قَائِلِينَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ (یہ کہتے ہوئے کہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے)

یہ ابن عباس، ربیع و محمد بن جعفر بن زبیر کا قول ہے اور ابو مسلم کا اختیار کردہ ہے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم میں افضل ترین راسخ تھے۔ جو کچھ اللہ نے آپؐ پر نازل فرمایا تھا: آپ اس کی تمامتر تاویل و تنزیل سے واقف تھے، آپؐ پر خداوند عالم نے کوئی ایسی چیز نازل نہیں فرمائی جس کی تاویل آپ کو تعلیم نہ کردی ہو، آپؐ کے بعد آپؐ کے اوصیا اور جانشین ہیں جو اس کی (تاویل و تنزیل) کے متعلق مکمل طور سے واقف ہیں۔

پہلے قول کی تائید یہ بات کر رہی ہے کہ صحابہ اور تابعین نے قرآن کی تمام آیات کی تفسیر پر اجماع کیا ہے، ہم نہیں دیکھتے کہ انھوں نے اس بارے میں کسی آیت پر توقف کیا ہو اور اس کی تفسیر نہ کی ہو اور یہ کہا کہ: یہ (آیت) متشابہ ہے، اس کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔ ابن عباس اس آیت کے متعلق کہا کرتے تھے: میں رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ میں سے ہوں۔

دوم: دوسرا قول یہ ہے کہ وَالرَّاسِخُونَ میں واؤ استئناف (یعنی آغاز اور شروع کرنے والا)

ہے، اس کے مطابق متشابہ کی تاویل یہ ہوگی کہ اللہ کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا اور وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ پر وقف (ٹھہرنا) ہوگا اور پھر اس طرح آغاز ہوگا: وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ اس طرح مبتدا وخبر ہوگی۔ یہ عائشہ، عروہ بن زبیر، حسن اور مالک کا قول ہے۔ اسی قول کو کسائی، فراء اور جبائی نے اختیار کیا ہے، ان کا کہنا ہے: الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ علم میں راسخ حضرات، آیات متشابہات کی تاویل نہیں جانتے لیکن اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس تاویل کے مطابق آیت کی بازگشت اس امت کے انجام، قیامت برپا ہونے کے وقت، دنیا کے فنا ہونے اور آفتاب کے مغرب سے طلوع کرنے، نزول عیسیٰؑ، خروج دجال کی طرف ہوگی اور اس چیز کی جانب ہے جو اللہ کو (متشابہات) کے علم سے مخصوص قرار دیتا ہے۔ اس قول کے مطابق تاویل متاول کے معنی میں ہوگی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ یعنی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔: كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا یعنی محکم اور متشابہ سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہیں۔

ارشاد: وَمَا يَذَّكَّرُ (اور اس بات سے نصیحت حاصل نہیں کرتے ہیں) یعنی آیات الٰہی میں غور وفکر اور تدبر نہیں کرتے اور متشابہ کو محکم کی طرف نہیں پلٹاتے إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ سوائے صاحبان عقل کے۔

اگر کہا جائے کہ خداوند عالم نے قرآن میں متشابہ آیات کیوں نازل فرمائیں؟ تمام کو محکم کیوں قرار نہیں دیا؟ اس کا جواب سے ہے: اگر تمام (آیات) کو محکم قرار دیا جاتا تو ہر کوئی خبر ہی پر بھروسہ اور اعتبار کرتے اور غور وفکر کرنے سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا۔ علماء کا غیر علماء پر فضل وشرف واضح نہ ہوتا، معنی کے استنباط میں قلب ونظر سے غور وفکر کرنے کا ثواب حاصل نہیں ہو پاتا۔ قاضی الماوردی نے کہا ہے: خداوند عالم نے پورے قرآن کی وصف بیان کی ہے کہ وہ محکم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: الر أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ اس طرح پورے قرآن کو متشابہ کہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا احکام (محکم) کے معنی اتقان اور منع کے ہیں یعنی وہ اپنے معنی کے (محکم ومضبوط کے ہونے) سبب اس میں خلل واقع سے محفوظ ہے، اس اعتبار سے سارا قرآن محکم ہے اس کا ارشاد: مُتَشَابِهًا (قرآن کی آیات) اپنے حسن صداقت وثواب اور خلل و تناقض سے دور ہونے میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، اس طرح پورا قرآن متشابہ ہے۔

❀❀❀❀❀

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٩﴾

ان کا کہنا ہے کہ اے ہمارے پروردگار جب تو نے ہمیں نعمتِ ہدایت سے نوازا ہے تو اب ہمارے دلوں میں کجی نہ آنے پائے اور ہمیں اپنی جانب سے رحمت عطا فرما کہ تو بہترین عطا کرنے والا ہے۔ (۸) خدایا! تو تمام انسانوں کو اس دن جمع کرے گا جس کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ (۹)

الفاظ ومعانی:

اَلْهِبَة یعنی کوئی قیمت لئے بغیر کسی چیز کا مالک بنا دینا ہے۔ اَلْهِبَة، اَلنِّحْلَة اور الصِّلَة ایک جیسے ہیں۔ مِیْعَاد وعدے کے معنی میں ہے جس طرح میقات وقت کے معنی میں ہے۔

ترکیب:

ارشادالٰہی لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ میں لام کے معنی فِيْ يَوْمٍ کے ہیں اور یہ صحیح ہے اس لئے کہ جب جملہ میں لام داخل ہوا ہے تو اس میں تقدیر یہ ہے: جَامِعُ النَّاسِ لِلْجَزَآءِ فِيْ يَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ جب اَلْجَزَآءِ کو حذف کر دیا گیا ہے تو لام اس پر داخل ہو گیا ہے جو اس کے بعد تھا اور اسی لام نے فی لانے سے بے نیاز کر دیا اس لئے کہ حروف اضافہ اس چیز کے برابر ہوتے ہیں جن کو معنیٰ اضافت جمع کرتے ہیں۔

ارشادالٰہی: إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ میں اَنّ (ہمزہ کو فتحہ دینا بھی جائز تھا) اس بات کو مانتے ہوئے کہ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ لِاَنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ حالانکہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قرأت نہیں کی گئی ہے۔

تفسیر

راسخون فی العلم کی دعائیں

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا (ان کا کہنا ہے کہ اے ہمارے پروردگار جب تو نے ہمیں

نعمتِ ہدایت سے نوازا ہے تو اب ہمارے دلوں میں کجی نہ آنے پائے) یہ ان رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کے قول کی حکایت ہے، جن کا تذکرہ اللہ نے گذشتہ آیت میں کیا ہے، اس کی تاویل میں مختلف وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: اس لطف و کرم کو ہم سے نہ روکنا جس کے سبب قلوب راہ مستقیم پر قائم رہتے ہیں کہ تیرے لطف و عنایات کو روکنے کے سبب کے بعد ہمارے قلوب (راہ مستقیم) سے منحرف ہو جائیں۔ یہاں تک کہ تو نے ہماری اپنی جانب ہماری راہنمائی کی۔ یہ دعا ہے الطاف و توفیقات کے ذریعہ ہدایت و امداد پر ثابت قدم رہنے کے لیے۔ اسی کے مثل ان کی یہ دعا ہے: اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا (پروردگار ہم پر کسی ایسے کو مسلط نہ کرنا جو ہم پر رحم نہ کرے) یعنی ہم پر رحم نہ کرنے والے کے درمیان ہمیں تنہا نہ چھوڑ دینا جو ہم پر مسلط ہو جائے، گویا وہ کہتے ہیں: ہم سے اپنی توفیق اور لطف و عنایات کو روک کر ہمیں اور ہمارے نفوس کے حوالہ نہ چھوڑ دینا کہ ہمارے اندر کجی واقع ہو جائے اور ہم گمراہ ہو جائیں۔ اس چیز سے بندہ اپنے اس معصیت اور گناہ کے ذریعہ مانع (محروم) ہو جاتا ہے جسے وہ خود انجام دیتا ہے اور توبہ کے باوجود اس میں تفریط و زیادتی کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یعنی انھوں نے کجی اختیار کی تو خداوند عالم ان کے قلوب کو کج اور ٹیڑھا کر دیا۔

دوم: ہمیں ایسے شدائد کا مکلف قرار نہ دینا جس کا بجالانا اور ترک کرنا ہمارے لیے دشوار اور مشکل ہو کہ ہدایت پانے کے بعد ہمارے قلوب میں کجی واقع ہو جائے۔ اسی کے مانند اللہ کا یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا یعنی جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو انھوں نے اس سے انحراف کیا۔ انھوں نے قلوب کی کجی کی نسبت کو خداوند عالم کی طرف دی اس لیے کہ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب خداوند عالم ان پر سختی کرتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (سورۂ توبہ، آیت ۱۲۵؛ اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے مرض میں سورہ ہی سے اضافہ ہو جاتا ہے) فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا (سورۂ نوح، آیت ۶؛ پھر بھی میری دعوت کا کوئی اثر سوائے اس کے نہ ہوا کہ انھوں نے فرار اختیار کیا)

سوم: ابو علی الجبائی نے بیان کیا ہے لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا سے مراد ہے اپنے ثواب اور رحمت سے ہمارے دل میں کجی پیدا نہ کر دینا) اور وہ رحمت و ثواب سعۂ صدر ہے جسے خداند عالم نے اس طرح بیان فرمایا ہے: يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ اور بیان فرمایا ہے کہ اس شرح اور وسعت کی ضد تنگی اور حرج ہے جو کفار

کے لیے بطور عذاب قرار دئے جاتے ہیں ۔ اسی طرح طہارت (پاکیزگی) ہے جو مومنین کے دلوں میں قرار دی جاتی ہے اور کافروں کو اس سے محروم کر دیا جاتا ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ اسی طرح اللہ کا مومنین کے قلوب میں ایمان کی کتابت (ایمان کو لازمی قرار دینا) ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے) اس کتابت کی ضد کفر کی علامتیں اور نشانیاں ہیں جو کافر کے دلوں میں موجود ہوتی ہیں، گو یا ان لوگوں اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کی ہے کہ ان کے دلوں کو اس ثواب ست اس کی ضد عقاب کی جانب نہ موڑ دے ۔

چہارم: اس آیت کو دعا پر حمل کیا گیا ہے کہ ان کے دل یقین اور ایمان سے مڑ نہ جائیں ۔ یہ بات اس چیز کی مقتضی نہیں ہے کہ اللہ سے جس چیز کا سوال کیا گیا ہے اگر سوال نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ خدا اسے انجام دے دیتا اس لیے کہ یہ بات مانع نہیں ہے کہ اس سے اس کی ذات پر انحصار کرتے ہوئے اور محتاجی کے بطور سوال کیا جائے، اس چیز کا جو اس کے پاس موجود ہے کہ وہ اسے انجام دے جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ اسے انجام دے گا اور جسے ہم جانتے ہیں اسے انجام نہیں دے گا کہ واجب (ضروری) ہے وہ اسے انجام نہیں دے گا جب اس کا تعلق کسی مصلحت سے ہو جیسا کہ پروردگار کا ارشاد ہے: قُلْ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ کہہ دیجئے کہ پروردگارا! حق کے ساتھ فیصلہ فرما ۔ نیز آیت میں آیا: رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۹۴؛ پروردگار جو تو نے اپنے رسولوں سے وعدہ کیا ہے اسے عطا فرما) جناب ابراہیمؑ کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (سورۂ شعراء، آیت ۸۷؛ اور مجھے اس دن رسوا نہ کرنا جب سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے)

اگر کہا جائے کیا اس طرح کہنا کیوں جائز نہیں ہے کہ: رَبَّنَا لَا تَظْلِمْنَا وَلَا تَجُرْ عَلَيْنَا ؟! (خدایا! ہم پر ظلم و جور نہ کرنا) اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کہنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں سائل کی طرف سے نافرمانی اور اس کے لیے غضب کا باعث ہوگا اور اس کا استعمال اس شخص کے لیے کیا جاتا ہے جس کی عادت ہی ظلم و جور کرنا ہو اور یہاں پر ایسا نہیں ہے ۔

ارشاد: وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً (اور ہمیں اپنی جانب سے رحمت عطا فرما) یعنی اپنی جانب سے لطف و کرم عطا فرما جس کی بنا پر ہم ایمان پر ثابت قدم رہ سکیں (وابستہ رہ سکیں) اس لیے کہ ہم تیرے لطف و کرم کے بغیر ایمان پر ثابت قدم نہیں رہ سکتے جس طرح ہم (ایمان) کے آغاز میں تیرے لطف کے بغیر اس تک

نہیں پہنچ سکتے تھے۔کہا گیا ہے کہ رَحْمَۃ سے مراد نِعْمَۃ ہے۔

اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ (کہ تو بہترین عطا کرنے والا ہے) نعمت کا عطا کرنے والا تو ہی ہے جس کی شان ہی ہبہ کرنا اور عطیہ دینا ہے۔

رَبَّنَآ (خدایا!) یعنی وہ کہتے ہیں ہمارے آقا اور ہمارے خالق و پروردگار! اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ (تو تمام انسانوں کو جمع کرے گا) جزا کے لیے لِيَوۡمٍ (اس دن لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ (جس دن کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں) جس میں کسی ریب وشک کی گنجائش نہیں ہے؛ اس کے واضح ہونے کے سبب۔ یہ ان کے قیامت کے اقرار پر مشتمل ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ یعنی بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ اپنے ماقبل راسخون فی العلم کی دعا سے متصل ہے، اگر چہ آخر کلام خطاب اور غیبت میں اپنے پہلے کلام کے مخالف ہے۔ یہ اس کے ارشاد کے مانند ہوگا: حَتّٰۤى اِذَا كُنۡتُمۡ فِى الۡفُلۡكِ‌ۚ وَجَرَيۡنَ بِهِمۡ (سورۂ یونس، آیت ۲۲؛ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں تھے اور پاکیزہ ہوائیں چلیں) اس کی تقدیر یوں ہوگی: ہمیں بخش دے تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے استیناف (آغاز وابتدا) کے طور پر ہے جسے جبائی نے اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس طرح اللہ کی طرف سے خبر دینا ہے۔

❀❀❀❀❀

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـــًٔا‌ ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِۙ ﴿۱۰﴾
بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے انھیں خدا کے عذاب سے نہ ان کا مال بچائے گا اور نہ ہی ان کی اولاد اور یہی لوگ جہنّم کا ایندھن بنیں گے۔(۱۰)

الفاظ ومعانی:

اَلۡوَقُوۡد کے معنی لکڑی کے ہیں۔اِيۡقَاد کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں۔

تفسیر:

یہی لوگ جہنم کے ایندھن ہیں

پھر خداوند عالم نے ان لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے جن کے قلوب میں کجی پائی جاتی ہے، ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے) یعنی جنھوں نے اللہ کی نشانیوں اور اس کے پیغمبروں کا انکار کیا۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ ان سے خدا کے عذاب کو دفع نہیں کریں گے۔

اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا (نہ ان کے مال اور نہ ہی ان کی اولاد ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہاں مِنْ کے معنی عِنْدَ (پاس) کے ہیں۔ مبرد نے کہا ہے کہ یہ اپنی اصل ابتدائے غایت پر ہی ہے جس کی تقدیر یہ ہوگی: انھیں ابتدا اور انتہا میں کوئی ثروت و دولت نہیں بچا سکتی اور بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ عذاب الٰہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ (اور یہی لوگ جہنّم کا ایندھن بنیں گے) یعنی آگ کی (لکڑی) ایندھن ہیں۔ آگ ان کے جسموں سے روشن کی جائے گی (بھڑکائی جائے گی) جس طرح دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے: حَصَبُ جَهَنَّمَ.

❀❀❀❀❀

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾
ان لوگوں کا حال قوم فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں جیسا ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا تو خداوند عالم نے ان کے گناہوں کے بدلے میں ان کی گرفت کی تھی اور خدا تو سخت سزا دینے والا ہے۔ (۱۱)

الفاظ و معانی:

اَلدَّأْب کے معنی عادت کے ہیں۔ اَلدَّأْب کے معنی (اجتہاد) کوشش کرنے کے بھی ہیں۔ اسی معنی کی بنا پر داب کو عادت کی طرف منتقل کیا گیا ہے اس لئے کہ اس نے اس راہ میں نہایت کوشش کی یہاں تک کہ وہ اس

کی عادت بن گئی۔

ذَنْب اور جُرْم ایک ہی ہیں۔ ذَنْب یعنی کسی شے کے پیچھے پیچھے آنا۔ جب کوئی کسی کے پیچھے پیچھے آتا ہے تو کہتے ہیں: ذَنَبَہٗ یَذْنُبُہٗ۔ اَلذَّنُوْب ڈول ہے چونکہ وہ کھینچتے وقت رسی کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔ ذَنُوْب حصہ کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ وہ بھی ڈول کے مانند ہے انعام میں۔

اَلذَّنُوْب وہ گھوڑا ہے جس کی دُم کے بال بکثرت ہوں۔ ذَنْب کے حقیقی معنی تِلْو (پیچھے آنے) کے ہیں۔

اَلذَّنْب جرم ہے چونکہ اس کے پیچھے مذمت کا استحقاق آتا ہے جیسا کہ عقاب (عذاب) کو عقاب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ جرم کے بعد عقاب کا حقدار قرار پاتا ہے؛ اس لیے کہا گیا ہے چونکہ وہ گناہ کے بعد مستحق ہوتا ہے۔

ترکیب:

كَدَاْبِ میں کاف محذوف کے متعلق ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: عَادَتُهُمْ كَعَادَةِ آلِ فِرْعَوْنَ۔ پس کاف محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے اس میں كَفَرُوْا عمل نہیں کرسکتا ہے اس لئے کہ وہ اَلَّذِيْنَ کا صلہ ہے خبر ہونے سے جدا ہو گیا ہے البتہ وہ وَقُوْدُ النَّارِ کی وجہ سے محلاً منصوب ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس میں فعل کے معنی ہیں۔ اس تقدیر کی بنا پر تَتَّقِدُ النَّارُ بِاَجْسَامِهِمْ كَمَا تَتَّقِدُ بِاَجْسَامِ آلِ فِرْعَوْنَ۔ كَذَّبُوْا جملہ مقام حال میں ہے اس میں عامل معنوی ہے جو دَاْبِ آلِ فِرْعَوْنَ میں ہے اور وہ اس کے ساتھ مقدر (پوشیدہ) ہے۔

تفسیر:

آل فرعون کی عادت

ان تمام کفار کی آپ کی تکذیب اور جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اس کی تکذیب کرنے کی عادت كَدَاْبِ آلِ فِرْعَوْنَ آل فرعون کی عادت کے مانند ہے، ان کے رسولوں اور جو کچھ ان پر نازل کیا گیا ہے کی تکذیب کرنے میں۔ یہ ابن عباس، عکرمہ، مجاہد، ضحاک اور سدی سے کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کافروں کی آپ پر قہر و غلبہ اور آپ کے معاملہ کو باطل و ناکام کرنے کی کوشش موسیٰؑ پر قہر و غلبہ میں آل فرعون کی کوشش کے مانند ہے۔ یہ اصم اور زجاج کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ آل فرعون پر عذاب

نازل کئے جانے میں ان کے گذشتہ گناہوں کے سبب اللہ کی عادت کی طرح ہے۔ کہا گیا ہے کہ آل فرعون کے طریقۂ کار کی طرح ہے۔ یہ ربیع، کسائی اور ابوعبیدہ کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ آل فرعون کے معاملہ کی طرح ہے۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ آل فرعون کی حالت کے مانند ہے۔ یہ قطرب کا قول ہے۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (اوران سے پہلے کے لوگوں جیسا ہے) یعنی گذشتہ امتوں کفار کے۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ (جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا تو خداوند عالم نے ان کے گناہوں کے بدلے میں ان کی گرفت کی تھی) یعنی اللہ نے ان کے گناہوں کے سبب ان پر عذاب کیا۔ معاقبہ (عذاب کرنے کو) (مواخذہ) کہا گیا ہے اس لیے کہ گناہوں کے سبب گرفت کی ہے) پس گناہ کے سبب گرفت کرنا یعنی سزادینا ہے۔

ارشاد: وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (اورخدا تو سخت سزادینے والا ہے) جس کو وہ سزا دینا ہے۔

❀❀❀❀❀

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

(اے رسول!) آپ کافروں کو بتلادیں کہ اے کافرو! تم مسلمانوں کے مقابلے میں شکست خوردہ رہو گے اور جہنم میں اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (۱۲)

قراءت:

عاصم کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے سَيُغْلَبُوْنَ وَيُحْشَرُوْنَ کو یاء کے ساتھ اور بقیہ قراء نے دونوں کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جنہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ارشاد الٰہی قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ کی بنا پر ہے۔ پس سب کو مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اور جنہوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے کلام میں تصرف اور روبرو خطاب سے لفظ غائب کے

ذریعہ خبر کی طرف منقول ہونے کی بنا پر ایسا کیا ہے اور اس کی تائید یہ ارشاد الٰہی کرتا ہے: قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَغْفِرُوْا کہا گیا ہے کہ خطاب یہودیوں سے ہے اور سَتُغْلَبُوْنَ کی ضمیر جانب پلٹ رہی ہے اس لئے کہ مشرکین نے یوم احد جو کچھ کیا تھا یہود اس پر خوش ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں صرف یاء ہی صحیح ہے اس لئے کہ مشرکین غائب ہیں (یعنی انہیں مخاطب نہیں قرار دیا ہے)

الفاظ و معانی:

اَلْحَشْرُ کے معنی کھینچ کر لانے، ہنکا کر لانے، جمع کر کے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اَلْحَاشِر کہا جاتا ہے اس لیے کہ تمام لوگ اپنے قدموں پر جمع ہوں گے، آپ لوگوں کے سامنے ہوں گے اور لوگ آپ کے پیچھے ہوں گے چونکہ آپ آخری پیغمبر ہیں لہٰذا لوگ آپ کے زمانہ اور ملت پر جمع کیے جائیں گے۔

جَهَنَّم آگ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے اَلْجِهْنَام سے مشتق ہے جو بہت گہرا کنواں ہے۔

اَلْمِهَاد وہ مقام ہے جسے گہوارہ اور فرش کی طرح مہیا اور آمادہ کیا جاتا ہے جس پر لوگ فرش کی طرح سوئیں گے۔

شان نزول:

محمد بن اسحاق بن یسار نے اپنے احباب سے روایت کی ہے کہ جب جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قریش سے مقابلہ ہوا تو یہودیوں کی بھیڑ مدینہ میں قینقاع کے بازار میں آئی۔ اس وقت آنحضرتؑ نے فرمایا: اے گروہ یہود! اللہ سے اس عذاب سے ڈرو جیسا کہ روز بدر قریش پر نازل ہوا قبل اس کے کہ تم پر بھی ان کی طرح (عذاب) نازل ہو۔ اسلام لے آؤ! یقیناً تم واقف ہو کہ میں نبی مرسل ہوں، اس بارے میں تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔ انھوں نے کہا: محمد آپ کو یہ خبر فریب اور دھوکہ میں مبتلا کر نہ دے کہ آپ کا سامنا ایسی قوم سے ہوا تھا جو حرب و ضرب سے نا آشنا تھی۔ آپ کو ان (قریش) سے فرصت مل گئی، خدا کی قسم اگر ہم آپ سے جنگ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم ہی انسان ہیں۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اسی روایت کو عکرمہ اور سعید بن جبیر نے بھی ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے بھی اس

روایت کو نقل کیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ تم عنقریب بدر کے دن مغلوب ہو جاؤ گے۔ یہ مقاتل کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ بلکہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی جب جنگ بدر میں کفار قتل ہوئے اور انھیں شکست ہوئی تو یہودیوں نے کہا: یہ وہ امی پیغمبر ہیں جن کی بشارت جناب موسیٰؑ نے ہمیں دی ہے، جن کی تعریف اور اوصاف ہم اپنی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ ان کا پرچم واپس نہیں پلٹے گا۔ پھر انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ جلد بازی نہ کرو یہاں تک دوسرے واقعہ کو دیکھو۔ جب جنگ احد کے موقع پر اصحاب رسولؐ نے اپنے راستہ سے انحراف کیا تو یہودیوں کو شک پیدا ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ خدا کی قسم یہ وہ (رسول) نہیں ہیں۔ اس طرح ان پر شقاوت و بدبختی غالب آ گئی اور انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ یہودیوں اور رسولؐ اللہ کے درمیان ایک عرصہ سے عہد و پیمان چلا آ رہا تھا جو نہیں ٹوٹا تھا، چنانچہ انھوں نے اس عہد کو بھی اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے توڑ دیا اور کعب بن اشرف ساٹھ سواروں کے ہمراہ مکہ روانہ ہو گیا اور اس نے مکہ والوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اتحاد کر لیا تاکہ ان کی بات ایک ہو جائے۔ پھر وہ لوگ مدینہ واپس پلٹے ان کے بارے میں اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہ کلبی، ابو صالح کی روایت ہے ابن عباس سے مروی ہے۔

تفسیر:

کفار کا انجام

جب خداوند عالم نے گذشتہ صدیوں میں پیغمبروں کی تکذیب کی بنا پر نازل ہونے والے عذاب کا تذکرہ گذر چکا تو کفار کو اس بات سے خبردار کیا کہ کہیں ان پر بھی وہی عذاب نازل نہ ہو جائے جو گذشتہ امتوں پر نازل ہو چکا ہے، ارشاد فرمایا: قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ((اے رسول) آپ کافروں کو بتلا دیں) اس سے یا تو مشرکین مکہ مراد ہیں یا یہودی جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ سَتُغْلَبُوْنَ (کہ اے کافرو! تم مسلمانوں کے مقابلے میں عنقریب شکست کھا جاؤ گے اور دنیا میں مغلوب ہو جاؤ گے۔ وَتُحْشَرُوْنَ (اور اکٹھے کیے جاؤ گے) اِلٰى جَهَنَّمَ (جہنم میں) آخرت میں۔ یقیناً اللہ نے ایسا ہی کیا کہ یہودی جزیہ اور ٹیکس ادا کر کے شکست خوردہ ہوئے اور مشرکین شمشیر کے ذریعہ مغلوب ہوئے۔ اگر اس کی قرأت یا کے ساتھ سَيُغْلَبُوْنَ کی جائے تو ممکن ہے مغلوب اور محشور ہونے والے مخاطبین کے علاوہ ہوں گے کہ وہ دیگر قوم (گروہ) ہیں۔ ممکن ہے (خطاب)

انھیں سے ہو۔ فراء نے کہا ہے: اس طرح کہا جاتا ہے: قُلْ لِعَبْدِ اللهِ اِنَّهٗ قَآئِمٌ وَّ اِنَّكَ قَآئِمٌ عبداللہ سے کہو کہ وہ کھڑا ہے اور تم کھڑے ہو اور اگر اس کی قرأت تاء کے ساتھ کی جائے تو اس طرح کا گمان جائز نہیں ہے یعنی غائب مراد نہیں ہوں گے۔

وَبِئْسَ الْمِهَادُ '(اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے) یعنی بہت بری چیز ہے جو تمھارے لیے مہیا کی گئی ہے اور بہت بری چیز ہے جسے خود تم نے اپنے لیے مہیا کیا ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت برا مقام ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ بہت برا فرش ہے جسے ان کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔

آیت میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر دلالت ہے اس لیے کہ جس کی آپؐ نے خبر دی تھی وہ آپ کی خبر کے مطابق پیش آیا (ظاہر ہوا) جو آپؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔ یہ بات اتفاقیہ طور پر پیش نہیں آسکتی اس لیے کہ آپ نے مستقبل کی بکثرت خبریں دی ہیں جو سب کی سب اسی طرح پیش آئیں جس طرح آپؐ نے فرمایا تھا۔ جس طرح ان میں سے ہر ایک معجزہ تھی اس لیے کہ اللہ اپنے غیب پر کسی کو باخبر نہیں فرماتا سوائے اس رسول کے جس سے وہ راضی اور خوشنود ہو۔ اسی طرح یہ آیت ہے کہ جب پیغمبرؐ کی صداقت دونوں خبروں میں سے ایک میں ثابت ہو چکی کہ وہ عنقریب مغلوب ہوں گے، اسی طرح آپؐ کی دوسری خبر کی صداقت بھی ثابت ہوگئی کہ وہ سب جہنم میں محشور اور یکجا کئے جائیں گے۔

❀❀❀❀❀

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

بے شک تمھارے سمجھنے کے لیے ان دو مخالف گروہوں میں جو (غزوۂ بدر کے موقع پر) ایک دوسرے سے جنگ کر رہے تھے رسول کی صداقت کی ایک بہت بڑی نشانی موجود ہے کہ ایک گروہ راہ خدا میں مصروف جہاد تھا اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا جو مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے صاحبانِ بصیرت کے لیے اس واقعے میں عبرت موجود ہے۔ (۱۳)

قرائت:

اہل مدینہ نے اور اہل بصرہ نے ابو عمرو سے تَرَوْنَهُمْ تاء کے ساتھ اور باقی نے یاء کے ساتھ (يَرَوْنَهُمْ) پڑھا ہے۔شواذ میں ابن عباس سے يُرَوْنَهُمْ یاء کو ضمہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن قراء نے يَرَوْنَهُمْ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ خطاب کے بعد غیبت کی بنا پر اور وہ ارشاد الٰہی: فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَ أُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ یعنی راہ خدا میں جہاد کرنے والا گروہ کافر گروہ کو اپنے دو برابر سمجھتا ہے ہے۔یاء کی قرأت کی تاکید کرنے والا لفظ مِثْلَيْهِمْ ہے اگر تاء کے ساتھ ہوتا تو مِثْلَيْكُمْ ہوتا اگر چہ یہ بھی وارد ہوا ہے کہ: وَ مَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (سورہ روم، آیت ۳۹)

یہاں پر رَأَيْتُ ایک مفعول ہے اور اس کی دلیل اسے رائ العین کے ذریعہ قید لگانا ہے جب ایسا ہے تو مِثْلَيْهِمْ کا منصوب ہونا بر بنائے حال ہے، اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ مفعول دوم ہے۔لفظ مِثْل کبھی کبھی تثنیہ اور جمع کے جگہ پر مفرد ہی آتا ہے۔تثنیہ میں مفرد ہونے کا ایک نمونہ یہ جملہ ہے: وَسَاقِيَيْنِ مِثْلُ زَيْدٍ وَ جُعَل۔جمع میں مفرد لانے کی مثال یہ جملہ ہے: اِنَّكُمْ اِذاً مِثْلُهُمْ۔اور مِثْل کے جمع آنے کی مثال یہ آیت ہے: ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔

اور جس نے تَرَوْنَهُمْ پڑھا ہے تو وہ اس سے پہلے خطاب کی بنا پر ہے اور وہ یہ ارشاد الٰہی ہے: قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ تَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ۔پس تَرَوْنَ کی ضمیر فاعلی مسلمانوں کے لئے اور ضمیر مفعولی مشرکین کے لئے ہے۔یعنی تَرَوْنَ أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ الْمُشْرِكِينَ مِثْلَيِ الْمُسْلِمِينَ۔

جہاں تک ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے يُرَوْنَهُمْ پڑھا ہے تو اس کی وجہ ابن جنی نے اس طرح بیان کی ہے: اُرِيتُ اور اُرىٰ یقین میں رَأَيْتُ سے زیادہ قوی ہے۔آپ کہتے ہیں: اَرىٰ اَنْ سَيَكُونُ كذا یعنی یہ میرا گمان غالب ہے۔اور اُرىٰ اَنْ سَيَكُونُ كذا یعنی مجھے یقین ہے میں جانتا ہوں۔

الفاظ ومعانی:

الفئة کے معنی ہم ارشادالٰہی: کَمۡ مِنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةً کے موقع پر بیان کر چکے ہیں۔

اَلۡاِلۡتِقَاءُ وَ التَّلَاقِيۡ اور اَلۡاِجۡتِمَاعُ ایک ہی ہیں۔

اَلۡاَيۡدِ کے معنی قوت کے ہیں۔ اس سلسلہ میں اللہ کا یہ ارشاد ہے: وَ دَاوٗدَ ذَا الۡاَيۡدِ

اَلۡعِبۡرَةُ کے معنی نشانی کے ہیں۔ عِبۡرَة اور عُبُوۡر کے معنی ایک جانب سے دوسری طرف جانا اور گذرنا ہیں۔ نشانی کو عبرت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان جہالت سے علم کی طرف آتا ہے۔ اَلۡمُعۡتَبِرُ بِالشَّيۡءِ یعنی اپنی جہالت و ناواقفیت کو ترک کرنے والا اور اس علم سے متصل ہو جاتا ہے جسے اس نے دیکھا ہے۔

عِبَارَت وہ کلام ہے جو اور مراد کو مخاطب تک پہونچتا ہے۔ اَلۡعِبَارَة: تفسیر خواب اور تعبیر ہے۔ تعبیر یعنی درہم وغیرہ کو وزن کرنا۔ اَلۡعَبۡرَة: آنسو۔ حقیقی معنی نفوذ کے ہیں۔

ترکیب:

فِئَةٌ میں تین طرح کے اعراب کا احتمال پایا جاتا ہے:

۱۔ استیناف اور نیا جملہ ہونے کی بنا پر رفع۔ اس کی تقدیر یہ ہے: مِنۡهُمۡ فِئَةٌ كَذَا وَ اُخۡرٰى كَذَا

۲۔ بدل کی بنا پر جر

۳۔ حال کی بنا پر نصب جیسا کہ کثیر کا یہ شعر ہے:

وَ كُنۡتُ كَذِيۡ رِجۡلَيۡنِ رِجۡلٌ صَحِيۡحَةٌ وَ رِجۡلٌ رَمٰى فِيۡهَا الزَّمَانُ فَشُلَّتۡ

ابن مفرغ نے کہا:

وَ كُنۡتُ كَذِيۡ رِجۡلَيۡنِ رِجۡلٌ صَحِيۡحَةٌ وَ رِجۡلٌ رَمَاهَا صَائِبُ الۡحَدَثَانِ

فَاَمَّا الَّتِيۡ صَحَّتۡ فَاَزۡدُ شَنُوۡءَةً وَ اَمَّا الَّتِيۡ شُلَّتۡ فَاَزۡدُ عُمَان

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

اِذَا مِتُّ كَانَ النَّاسُ صِنۡفَيۡنِ شَامِتٌ وَ آخِرُ مَثۡنٍ بِالَّذِيۡ كُنۡتُ اَصۡنَعُ

ہاں مَرَرۡتُ بِثَلَاثَةٍ مَرِيۡضٍ وَ جَرِيۡحٍ کو جر کے ساتھ پڑھنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ بدل میں عدد کو پورا نہیں کیا گیا ہے صرف دو کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ رفع دینا صحیح ہے اس تقدیر کی بنا پر کہ مِنۡهُمۡ صَرِيۡعٌ وَّ

مِنْهُمْ جَرِيحٌ۔اگر یہ کہا کہ مَرَرْتُ بِثَلَاثَةٍ صَرِيعٍ وَّ جَرِيحٍ وَمُسْلِمٍ تو رفع دینا اور جر دینا دونوں صحیح ہے اور اگر آپ نے اس میں اِقْتَتَلُوْا کا اضافہ کر دیا تو تین اعراب صحیح ہیں لیکن یہاں پر آیت میں فِئَةٌ کو صرف رفع دیا جائے گا کوئی دوسرا اعراب نہیں دیا جائے گا۔

ارشاد الٰہی: رَأْيَ الْعَيْنِ، يَرَوْنَ کا مفعول مطلق بھی ہوسکتا ہے اور لفظ اَلْعَيْنِ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ فاعل ہے اور ظرف مکان بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں: تَرَوْنَهُمْ اَمَامَكُمْ۔

شان نزول:

یہ آیت جنگ بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) افراد پر مشتمل تھی۔طالوت کے اصحاب کی مانند جو طالوت کے ہمراہ نہر سے گذرے تھے۔جن میں ستتر (۷۷) مہاجرین اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین کا پرچم علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے پاس تھا۔گروہ انصار کے علمبردار سعد بن عبادہ تھے۔آنحضرتؐ کے لشکر میں ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ جن میں سے ایک گھوڑا مقداد بن اسود اور ایک مرثد بن ابو مرثد کا تھا۔اسلحوں میں چھ عدد ذرع اور آٹھ تلواریں تھیں۔ان شہید ہونے والوں میں چودہ لوگ مہاجرین اور آٹھ انصار سے تھے۔

مشرکین کی تعداد میں اختلاف ہے؛ حضرت علی علیہ السلام اور ابن مسعود سے روایت ہے ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ یہ قتادہ، عروہ، ابن زبیر اور ربیع سے روایت ہے۔نو سو سے ایک ہزار کے درمیان تھی، ان کے پاس سو گھوڑے تھے، ان کا سردار عتبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس تھا، جنگ بدر وہ پہلی جنگ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرکت فرمائی جس کا سبب ابوسفیان کا کارواں تھا۔

تفسیر:

دو گروہ

جب خداوند عالم نے صاحبان ایمان سے فتح و کامرانی کا وعدہ فرمایا تو بیان فرمایا کہ جنگ بدر میں اس نے کافروں اور سرکشوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا، ارشاد فرمایا: قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ (بے شک تمھارے سمجھنے کے لیے (رسول کی صداقت کی) ایک بہت بڑی نشانی موجود ہے) کہا گیا ہے کہ ان یہودیوں سے خطاب ہے

جنھوں نے عہد شکنی کی تھی۔ اے یہودیو! تمھارے لیے دلیل بالکل واضح تھی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے واقعہ میں موجود تمام لوگوں سے خطاب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرکین اور یہودیوں کے لیے آیۃ ہے یعنی حجت و علامت اور معجزہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر دلیل ہے۔ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا (دو گروہ جو ایک دوسرے سے جنگ کررہے تھے) مسلمانوں اور کافروں کے دو گروہ جو بدر میں جمع ہوئے۔ فِئَةٌ فرقہ، تُقَاتِلُ جنگ کر رہا تھا۔ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (اللہ کی راہ میں) اللہ کے دین اور اس کی اطاعت میں جو رسولؐ اور اس کے اصحاب ہیں۔ وَأُخْرَىٰ دوسرا فرقہ كَافِرَةٌ سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ (جو مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھ رہا تھا) یعنی دوگنا دیکھ رہے تھے۔

رَأْيَ الْعَيْنِ یعنی ظاہری آنکھوں میں، اس کے معنی میں اختلاف ہے: بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان مشرکین کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، اللہ نے انھیں ان کی نظروں میں قلیل اور مختصر کردیا، یہاں تک کہ ان کو چھ سو چھبیس (۶۲۶) افراد نظر آنے لگے، یہ مسلمانوں کی تقویت قلب کے لیے تھا، اس لیے کہ ان سے کہا گیا تھا: فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ (سورۂ انفال، آیت ۶۶) یعنی اگر تم سو (۱۰۰) صبر کرنے والے ہوں گے تو دوسو (۲۰۰) پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ خداوند عالم نے ان کی تعداد کو اس حد کے مطابق دکھا دیا جو ان کے لیے معین کی گئی تھی، جو ان کے لیے لازمی تھا کہ وہ ان پر پیش قدمی کریں اور ان سے پہلو تہی نہ کریں جو ان کے تین گنا تھے۔ پھر مختصر تعداد بڑی تعداد پر غالب آگئی۔ یہ ابن مسعود اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرکین مسلمانوں کو ان کی تعداد سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ خداوند عالم نے جنگ سے قبل مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کو مختصر اور کم کردیا تھا تاکہ وہ ان پر جری اور دلیر بن جائیں (مسلمانوں کے مقابلہ میں جرأت کا مظاہرہ کریں) اور جنگ سے پہلو تہی نہ کریں لیکن جب وہ جنگ میں مصروف ہوئے تو اللہ نے مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کو کثرت سے ظاہر کردیا تھا تاکہ وہ بزدلی کا مظاہرہ کریں اور مسلمانوں کی نظروں میں مشرکین کو قلیل و مختصر کردیا تاکہ مسلمان ان پر جری اور دلیر بن جائیں، جس کی تصدیق اللہ کا یہ ارشاد کررہا ہے: وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ (سورۂ انفال، آیت ۴۴؛ اور یاد کرو جب مقابلے کے وقت خدا تمھاری نظروں میں دشمنوں کو کم کرکے دکھا رہا تھا اور ان کی نگاہوں میں بھی تمھاری تعداد کم دکھائی جارہی تھی)

یہ مسلمانوں کی نصرت اور کافروں کی رسوائی کا بہترین سبب ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ یہ قول اس قاری

کی قرأت کے مطابق ہے جس نے یا کے ساتھ سَیُغْلَبُوْنَ قرأت کی ہے اور جس نے ت کے ساتھ قرأت کی ہے کہ تو اس میں قول اول کا احتمال نہیں ہے اس لئے کہ خطاب ان یہودیوں سے ہے جو حاضر نہیں ہوئے تھے اور اس ارشاد سے وہی لوگ مراد ہیں: قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ یہ بنی قینقاع کے یہودی ہیں، گویا اس طرح فرمایا ہے: تَرَوْنَ اَيُّهَا الْيَهُوْدُ الْمُشْرِكِيْنَ مِثْلَى الْمُسْلِمِيْنَ مَعَ اَنَّ اللّٰهَ اَظْهَرَهُمْ عَلَيْهِمْ فَلَا تَغْتَرُّوْا بِكَثْرَتِكُمْ اے یہودیو! تم دیکھ رہے ہو مشرکین مسلمانوں کے دوگنا ہیں اس کے باوجود اللہ نے مسلمانوں کو مشرکین پر غلبہ اور فتح دی، لہٰذا تم اپنی کثرت پر فریب میں مبتلا نہ ہو جانا۔ اس تفسیر کو بلخی نے اختیار کیا ہے۔ یا خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو اس واقعہ میں موجود تھے، یعنی اے مسلمانو! تم دیکھ رہے ہو مشرکین مسلمانوں کے دو برابر ہیں۔ فراء نے کہا ہے۔ ارشاد: يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ سے احتمال ہے کہ تین گنا ہوں اس لیے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ میرے پاس ایک ہزار ہیں میں اسی کے مانند چاہتا ہوں، اس طرح آپ کو دو ہزار کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ آپ اسی کے مثل اس میں اضافہ چاہتے ہیں نہ ان معنی میں کہ آپ اس کا بدل چاہتے ہیں، گویا آپ کہہ رہے ہیں میں اس کے دو برابر چاہتا ہوں، جب آپ نے کہا کہ مجھے اس کے دو برابر کی ضرورت ہے، اس طرح آپ کو تین ہزار کی احتیاج ہے۔ اسی طرح آیت میں ہے يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ ہے اس میں اضافہ کرتے ہوئے اس طرح تین گنا ہوں گے۔ فراء نے کہا: اس میں اعجاز یہ ہے کہ قلیل تعداد کو کثیر تعداد پر غلبہ حاصل ہوا۔

ظاہری کلام کی مخالفت کے سبب زجاج نے اس تفسیر سے انکار کیا ہے اور اس وجہ کے سبب جو آیت انفال میں کم تعداد کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رؤیت کے حصول اور موانع کے برطرف ہونے کے باوجود تعداد کا قلیل و مختصر ہونا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ کیا یہ چیز اس قول کے علاوہ ہے جس نے یہ ممکن قرار دیا ہے کہ وہاں اجسام ہوں جو نظر نہ آ رہے ہوں یا بعض نظر آ رہے ہوں اور بعض نظر نہ آ رہے ہوں؟ ہم کہتے ہیں: ممکن ہے کہ مومنین کی نظروں میں قلیل اور مختصر ہوں (یعنی کم اور مختصر دکھائے گئے ہوں) کہ وہ انھیں مختصر تعداد میں خیال کر رہے ہوں، نہ یہ کہ بعض کا ادراک کر رہے ہوں اور بعض کا نہیں، اس لیے کہ علم جس کا انسان ادراک کرتا ہے بطور اجمالی وہ اس علم کے علاوہ ہے جس کا وہ تفصیلی طور پر ادراک کرتا ہے اور کبھی ہم ایک بڑی تعداد کا ادراک کرتے ہیں البتہ اس کی تعداد میں شک کرتے ہیں یہاں تک کہ اختلاف ان کی تعداد کے تعین میں واقع ہو جاتا ہے۔ پس اس

بنیاد پر تعداد کے مختصر اور قلیل ہونے میں تاویل کی وجہ ہوگی۔

ارشاد: وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (اللہ اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے) اللہ کی طرف سے دشمن پر نصرت کی دو قسمیں ہیں: غلبہ کے سبب نصرت اور حجت کے ذریعہ نصرت۔ غلبہ کے ذریعہ نصرت قلیل تعداد کے کثیر تعداد پر غلبہ کے سبب ہوگی جو جاری عادت کے برخلاف ہوگی (جس طرح) خداوند عالم نے ملائکہ کے ذریعہ مومنین کی مدد فرمائی، ان کے نفسوں کو تقویت بخشی۔ تعداد کی کمی کے باوجود حجت کے ذریعہ ان کی نصرت اس طرح کی کہ ان سے یقینی طور پر ایک گروہ کو غلبہ عطا کرنے کا پہلے وعدہ فرمایا جسے علام الغیوب خداوند عالم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ یعنی مسلمانوں کا مختصر تعداد کے باوجود مشرکین پر ان کی کثرت کے باوجود غلبہ حاصل کرنا مسلمانوں کی نظروں میں مشرکین کا مختصر اور کم قرار دینا اور مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کا بیشتر قرار دینا۔ اس میں لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ یعنی صاحبان عقول کے لیے عبرت و نصیحت ہے جس طرح کہا جاتا ہے: فُلَانٌ بَصِيْرٌ بِالْاُمُوْرِ (فلاں شخص امور اور معاملات میں بصارت رکھتا ہے) اس سے حواس والی (ظاہری) بصارت مراد نہیں ہے جو تمام حیوانات میں مشترک ہے۔

❀❀❀❀❀

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾
دنیا میں لوگوں کے لیے دل کو لبھانے والی چیزیں عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ہیں جن کی محبت کو زینت بنا دیا گیا ہے مگر یہ سب دنیوی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ (۱۴)

الفاظ و معانی:

اَلشَّهَوَات، شَهْوَة کی جمع ہے۔ یہ نفس کا خواہشات کی طرف مائل ہونا ہے۔ خواہش اللہ کی جانب

سے ایک فعل ہے، اس پر کوئی بشر بھی قدرت نہیں رکھتا، اس کا ہمارے اندر ہونا ضروری ہے۔ جس کا ہمارے نفس سے دور کرنا ہمارے امکان میں نہیں ہے۔

اَلْقَنَاطِیْر، قِنْطَار کی جمع ہے اس کے معنی مال کثیر کے ہیں۔ اس کے حقیقی معنی مضبوط بنانے کے ہیں۔ بولا جاتا ہے کہ قَنْطَرْتُ الشَّیْءَ یعنی نے اس کو مضبوط بنایا۔ قَنْطَرُ دَاهِیَة مصیبت کے معنی میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی اصل قَنْطَرَة ہے اور وہ پل ہے جسے عبور کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ مُقَنْطَرَة یعنی قَنَاطِیْر کا ڈھیر۔ کہا گیا ہے کہ مُقَنْطَرَة تاکید کے لئے آیا ہے۔ کبھی کبھی اسم مفعول اور اسم فاعل کو تاکید کے لئے لایا جاتا ہے۔ مفعول جیسے حِجْراً مَّحْجُوْراً، نَسْیاً مَّنْسِیّاً، فاعل جیسے شِعْرٌ شَاعِر، مَوْت مَائِت۔ ان سب سے مراد مبالغہ اور تاکید ہے۔

خَیْل یعنی عمدہ گھوڑے۔ خَیْل، خَیَال سے مشتق ہے اس کو خیل اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سوار ہونے والا اپنے اندر عظمت و بزرگی کا خیال کرتا ہے۔

اَلْمَآب کے معنی بازگشت کے ہیں جو اَلْاَوْب سے مشتق ہے یعنی رجوع کرنا۔

تفسیر:

امور مادی کو زینت کی گئی

پھر خداوند عالم نے ان چیزوں کے بارے میں آیت نازل فرمائی جس کے ذریعہ اس سبب کے بارے میں باخبر کیا جاتا ہے جو لوگوں کو حق اور ہدایت سے انحراف اور دنیا پر اعتماد کرنے کی دعوت دیتے ہیں: زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ (دنیا میں لوگوں کے لیے دل کو لبھانے والی چیزیں جن کی محبت کو زینت بنا دیا گیا ہے) یعنی خواہشات (وہ اشیا جن سے خواہشات متعلق ہوتے ہیں) کی محبت۔ خداوند عالم نے یہاں پر شہوت کو نہیں لیا ہے، لہٰذا شہوت کی تفسیر عورتوں اور فرزندوں وغیرہ سے کی ہے

زینت دے کر پیش کرنے والے کے سلسلہ میں ہے: کہا گیا ہے کہ شیطان زینت دیتا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کی قسم میں خلق شدہ اشیاء میں دنیا سے زائد کسی چیز کو قابل مذمت نہیں پاتا۔ بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے لوگوں کے لیے شہوات کو زینت دی ہے کہ ان کی طبیعتوں میں شہوت کی طرف رجحان قرار دیا ہے اور ان چیزوں میں زینت خلق کر کے لوگوں کے امتحان اور تکلیف میں ان کے لیے شدت

قرار دی ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (سورۂ کہف، آیت ۷؛ جو کچھ روئے زمین پر موجود ہے اسے ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تا کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں کہ عمل کے اعتبار سے ان میں سب سے بہتر کون ہے)

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے ان چیزوں کو زینت دی ہے جن میں حسن اور خوبی پائی جاتی ہے اور قبیح چیزوں شیطان نے زینت دی ہے۔ یہ ابوعلی الجبائی کا قول ہے۔ اللہ سبحانہ نے عورت کا ذکر مقدم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مِنَ النِّسَآءِ (عورتیں) اس لیے کہ عورتوں کا فتنہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: میرے بعد مردوں پر عورتوں زیادہ نقصان دہ کوئی دوسرا فتنہ نہیں چھوڑا ہے۔ نیز ارشاد فرمایا: عورتیں شیطان کے پھندے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: عورت مکمل شر ہے جس کا شر یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے، جو ایسا بچھو ہے جس سے لپٹنا لطف اندوز ہوتا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا: وَالۡبَنِيۡنَ (اولاد) اس لیے کہ اولاد کی محبت مال حرام کے جمع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشعث بن قیس سے ارشاد فرمایا: کیا حمزہ کی دختر سے تمھارے پاس کوئی فرزند ہے؟ اس نے کہا: ہاں! میرے پاس اس سے ایک فرزند ہے۔ میں اسے بہت چاہتا ہوں، میرے پاس بڑا پیالہ بھی ہے جس سے میں اسے کھانا کھلاتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر تم یہ کہتے وہ میرے لیے ثمرۂ قلب اور خنکی چشم ہے (تو بہتر ہوتا) اس کے باوجود (اولاد) بزدلی، بخل اور غم واندوہ کا سبب ہوتی ہے۔ وَالۡقَنَاطِيۡرِ قِنۡطَار کی جمع ہے اس کی مقدار میں اختلاف ہے: ایک قول کے مطابق بارہ سو مثقال (سونا) اوقیہ ہے۔ یہ معاذ بن جبل سے مروی ہے۔ یہی روایت اُبی بن کعب، عبداللہ بن عمر سے بھی مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے ایک ہزار دو سو مثقال (سونا) ہے۔ یہ ابن عباس، حسن اور ضحاک سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم ہیں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ اس کے برخلاف کہا گیا ہے کہ اسی ہزار درہم یا سو (۱۰۰) رطل سونا ہے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ستر ہزار دینار ہیں۔ یہ مجاہد وعطا سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک بیل کی کھال میں بھرا ہوا سونا ہے۔ ابونضرہ سے روایت ہے۔ اس کو فراءؔ نے بیان کیا ہے اسی کی روایت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے۔

الۡمُقَنۡطَرَةِ قتادہ سے مروی ہے کہ دوگنا۔ بیان کیا گیا ہے نو (۹) قناطیر ہیں۔ یہ فراء سے مروی

ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے وہ اموال ہیں جنھیں ایک دوسرے پر ڈھیر لگایا گیا ہو۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جمع شدہ مکمل (مال) ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ ڈھیر مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ، سونے اور چاندی کا بھی ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے جس نے فقط سونے کا ڈھیر کہا ہے اس کا قول صحیح نہیں ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے قِنْطَار کا ذکر کیا ہے جو دونوں (سونے اور چاندی) کے لیے ایک ساتھ ہے۔ ان تمام اقوال کی بازگشت کثرت کی جانب ہوتی ہے۔

وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ (عمدہ گھوڑے) کہا گیا ہے کہ مراد تندرست گھوڑے ہیں۔ یہ سعید بن جبیر، ابن عباس، حسن اور ربیع کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بہترین سیمیا (حسن) مراد ہے۔ یہ مجاہد، عکرمہ اور سُدی کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے معلمہ (اور سدھائے ہوئے گھوڑے) مراد ہیں۔ ابن عباس کی روایت میں ہے کہ وہ گھوڑے جنھیں جہاد کے لیے مہیا کیا گیا ہو۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔

وَالْأَنْعَامِ (مویشی) نِعم کی جمع ہے یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، مینڈھا اور بکری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی جنس کو انفرادی طور پر 'نعم' نہیں کہا جاتا سوائے اونٹ کے اس لیے کہ نِعم اونٹ پر تفصیلی اور اجمالی طور پر بولا جاتا ہے۔ وَالْحَرْثِ (اور زرعی زمینیں) اس کے معنی زراعت کے ہیں۔ یہ تمام چیزیں انسان کی محبت کا ذریعہ اور سبب ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ذکر فرمایا ہے۔

پھر بیان فرمایا ہے یہ تمام چیزیں وہ ہیں جن سے زندگی میں استفادہ کیا جاتا ہے پھر یہ اپنے مالک سے زائل ہو جاتی ہیں۔ پھر سب کی بازگشت اللہ کی جانب ہے۔ انسان کے لیے دنیا میں ان چیزوں سے پرہیز کرنا بہت زیادہ مناسب اور بہتر ہے اور وہ اللہ کے پاس موجود چیزوں میں رغبت رکھے۔ ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (مگر یہ سب دنیوی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں) یعنی وہ تمام (چیزیں) جن کا ذکر گذر چکا ہے جن سے دنیاوی زندگی میں استفادہ کیا جاتا ہے اور پھر وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے) یعنی بازگشت کا بہترین مقام (اللہ کے پاس) ہے۔ مآب مصدر ہے جسے پلٹنے کی جگہ کہا گیا ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

کہو! کیا میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ تو سنو جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے ان کے رَبّ کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہاں انھیں دائمی زندگی ملے گی اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ لوگ رضائے الٰہی سے سرفراز ہوں گے اور اللہ اپنے بندوں کے ہر عمل پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ (۱۵)

قرأت:

ابوبکر نے عاصم سے پورے قرآن میں رُضْوَان راء کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ رِضْوَان پڑھا ہے۔

حجت:

اَلرِّضْوَان مصدر ہے جس نے راء کو کسرہ دیا ہے اس نے رِئْمَان اور حِرْمَان کے مانند قرار دیا ہے اور جس نے ضمہ دیا ہے اس نے رُجْحَان، شُکْرَان اور کُفْرَان کے مثل قرار دیا ہے۔

ترکیب:

اَؤُنَبِّئُكُمْ میں استفہام کی انتہاء عِنْدَ رَبِّهِمْ پر ہے۔ پھر جَنّٰتٌ سے نئے جملہ کا آغاز ہے۔ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ یہ جواب کے فرض کی صورت میں ہے گویا کہا گیا ہے کہ مَا ذٰلِكَ خَيْرٌ؟ فرمایا: هُوَ جَنّٰتٌ۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ استفہام کی انتہا بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ پر ہے۔ پھر خدا نے نیا جملہ شروع کرتے ہوئے فرمایا: لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ۔

عربی زبان میں لفظ جَنّٰت کو رفع اور جر دینا دونوں جائز ہے جر اس بنا پر کہ آخر کلام عِنْدَ رَبِّهِمْ

ہے۔ جس طرح اَمَرْتُ لَكَ بِاَلْفَيْنِ وَلِاَخِيْكَ مِئَتَيْنِ کہنا صحیح نہیں ہے جب تک بِمِئَتَيْنِ نہ کہیے اور اگر آپ نے اسے مقدم کر دیا اور مِئَتَيْنِ لِاَخِيْكَ کہا تو جائز ہے۔ خَالِدِيْنَ بر بنائے حال منصوب ہے۔

تفسیر:

خیر کی خبر

جب گذشتہ آیت میں خداوند عالم نے دنیا کی حقارت اور اس سے زہد و بے تعلقی کا ذکر کر دیا تو اب موجودہ آیت میں آخرت کی عظمت، اس کا شرف اور اس میں رغبت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: قُلْ اے محمد! آپ اپنی امت سے کہہ دیجیے: اَؤُنَبِّئُكُمْ میں تمھیں خبر دے رہا ہوں، بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ (کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟) جو تمھارے لیے زیادہ منفعت بخش ہیں اس چیز سے جس کا ذکر گذشتہ آیت میں دنیاوی شہوتوں اور لذتوں سے متعلق گذر چکا ہے۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا (تو سنو جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے) جو (چیزیں) اللہ نے ان پر حرام قرار دی ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (ان کے رَبّ کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں) یعنی اس کے درختوں کے نیچے نہریں ہیں۔ ایک دوسرے قول میں ہے کہ میں تمھیں باخبر کر رہا ہوں اس خیر سے جو گذر چکا ہے، ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے پروردگار کے یہاں تقویٰ اختیار کیا، پھر آغاز کرتے ہوئے فرمایا: باغات ہیں یعنی وہ خیر باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اس طرح خداوند عالم نے وضاحت فرمادی ہے کہ جنت کی نہریں ہمیشہ جاری رہتی ہیں جو دنیاوی نہروں کی طرح نہیں ہیں جن کا پانی کبھی جاری ہوتا ہے اور کبھی منقطع (خشک) ہو جاتا ہے۔

ارشاد: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (وہاں انھیں دائمی زندگی ملے گی) یعنی وہ لوگ ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے۔ وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی) ان کی بیویاں حیض و نفاس ہر طرح کی نجاست و کثافت اور قابل مذمت اخلاق سے پاک صاف ہوں گی۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (اور وہ لوگ رضائے الٰہی سے سرفراز ہوں گے) ان باغات کے پیچھے اللہ کی خوشنودی ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (اور اللہ اپنے بندوں کے ہر عمل پر نظر رکھے ہوئے ہے) یعنی اللہ ان کے افعال و احوال سے باخبر ہے۔

❀❀❀❀❀

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ إِنَّنَآ ءَامَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ الصَّٰبِرِينَ وَ الصَّٰدِقِينَ وَالْقَٰنِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہمیں جہنّم کے عذاب سے بچالے۔(۱۶) وہ لوگ صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے، فرماں بردار اور فیّاض ہیں اور رات کے پچھلے پہر اللہ سے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔(۱۷)

الفاظ ومعانی:

اَلْمَغْفِرَۃ کے معنی گناہ کا ڈھانپنا ہے۔اس (گناہ) سے حاصل ہونے والے نتیجہ (سزا اور عذاب) کو برطرف کرتے ہوئے۔ذَنْب (گناہ) اور جُرْم کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ دونوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ ذَنْب کے حقیقی معنیٰ اتباع کے ہیں کہ انسان کے برے اعمال اس کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔جُرْم کے حقیقی معنیٰ قطع کے ہیں، یعنی ایسا برا کام جس کے ذریعہ (انسان) واجب سے منقطع ہوجاتا ہے۔

قَوْل اور کَلَام کے درمیان یہ فرق ہے کہ قول میں حکایت کے معنی ہوتے ہیں جبکہ کلام ایسا نہیں ہوتا۔

اَلصَّابِر یعنی اپنے آپ کو خدا کی تمام تر نافرمانیوں سے روکنے والا اور عبادات میں سے خدا نے اس پر جو کچھ فرض کیا ہے اسے بجالانے پر قائم وثابت رہنے والا۔

اَلصَّادِق یعنی کسی چیز کے بارے میں جیسی وہ ہے اسی کے مطابق خبر دینے والا۔

اَلْقَانِت: مطیع وفرماں بردار۔

اَسْحَار جمع ہے سَحَر کی، یہ طلوع فجر سے پہلے کا وقت ہے۔اس کے لغوی معنیٰ اَلْخِفَاء ہے چونکہ اس وقت انسان چھپا ہوتا ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِيْنَ محلاً مرفوع، منصوب اور مجرور تینوں میں سے کوئی ایک بھی ہوسکتا ہے: جر لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا کا تابع

ہونے کی بنا پر، رفع اور نصب مدح کی بنا پر اور اسی طرح باقی صفات ہیں۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا کی صفت ہونے کی بنا پر بھی مجرور ہو سکتا ہے۔

تفسیر:

متقین کی دعا

پھر خدا نے ان متقین کی تعریف و توصیف کی ہے جن کا ذکر: لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا کے ذریعہ گذشتہ آیت میں آچکا ہے، ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ (وہ کہتے ہیں کہ) یعنی متقین کہتے ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا (اے ہمارے پروردگار ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں) یعنی ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کی۔ فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (تو ہمارے گناہوں کو معاف کردے) ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما اور ان سے درگذر فرما۔ وَقِنَا ہم سے دور فرما۔ عَذَابَ النَّارِ (جہنم کے عذاب کو)

پھر متقین کے دیگر صفات بیان کرتے ہوئے ان کی مدح وثنا کی ہے، ارشاد فرمایا: اَلصّٰبِرِيْنَ (یعنی صبر کرتے ہیں) اس فعل پر جس کا اللہ نے انھیں حکم دیا ہے اور اسے ترک کرتے ہیں جس سے اللہ نے انھیں روکا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت پر صبر کرنے والے اور معصیت سے بچنے والے۔

وَالصّٰدِقِيْنَ (اور سچے ہیں) اپنے ایمان اور اقوال (گفتگو) میں۔ وَالْقٰنِتِيْنَ (اور فرماں بردار ہیں) کہا گیا ہے کہ اطاعت کرنے والے ہیں۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت و عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ واجبات پر قائم رہتے ہیں۔ قاضی کا قول ہے۔ وَالْمُنْفِقِيْنَ (اور فیاض ہیں) اپنے اموال راہ خیر میں خرچ کرتے ہیں، اس میں واجبی زکوۃ اور مستحبی انفاق داخل ہے۔

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (اور رات کے پچھلے پہر اللہ سے مغفرت کی دعائیں طلب کرتے ہیں) سحر کے وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ اس کی روایت امام رضا علیہ السلام نے اپنے والد کے واسطہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ وقت سحر مغفرت کا سوال کرتے ہیں۔ یہ انس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وقت صبح با جماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ زید بن اسلم سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نماز وقت سحر ختم ہوتی ہے، پھر اللہ سے استغفار اور دعا

کرتے ہیں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ جو شخص وقت سحر ستر مرتبہ استغفر اللہ کہے گا (یا استغفار کرے گا) وہ اس آیت کا اہل (مصداق) ہوگا۔ انس بن مالک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خداوند عالم فرماتا ہے: جب میں اہل زمین پر عذاب کا ارادہ کرتا ہوں اور اپنے گھر کے آباد کرنے والوں، تہجد گذاروں، میری محبت میں غرق اور وقت سحر استغفار کرنے والوں کو دیکھتا ہوں تو ان سے درگذر کرتا ہوں۔

❀❀❀❀❀

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۫ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور تمام فرشتے اور صاحبانِ علم بھی عدل وانصاف کے ساتھ اس بات پر گواہی دے رہے ہیں کہ اس زبردست اور صاحبِ حکمت کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ بے شک سچا دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ (۱۸) اہلِ کتاب نے اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اختیار کیے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے حقیقت امر معلوم ہوجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ جو شخص اللہ کی آیات (نشانیوں) کا انکار کردے تو اللہ کو اس سے حساب لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ (۱۹)

قراءت:

کسائی نے اَنَّ الدِّیْنَ (اَنَّ کے) ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ اِنَّ پڑھا ہے۔ زجاج نے کہا: ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کے اِنَّهٗ میں ہمزہ کو کسرہ

کے ساتھ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ اَنَّہٗ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: اِنَّ کے کسرہ کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے والی بات مکمل ہو چکی ہے اور جس نے فتحہ دیا ہے اس نے بدل قرار دیا ہے۔ بدل اگرچہ دو جملوں کے مانند ہوتا ہے لیکن چونکہ دوسرا عامل ظاہر نہیں ہوتا ہے لہٰذا وہ صفت سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ جب آپ اسے بدل قرار دیں گے تو اسے مندرجہ ذیل دو چیزوں میں سے کسی ایک کا بدل قرار دے سکتے ہیں:

۱۔ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کا بدل قرار دے سکتے ہیں گویا تقدیر اس طرح ہے: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ایسی صورت میں یہ بدل ایسا ہوگا کہ شے اس میں وہی ہوتی ہے۔

۲۔ اگر آپ چاہیں تو اسے بدل اشتمال قرار دے سکتے ہیں اس لئے کہ اسلام توحید اور عدل پر مشتمل ہے۔

اور اگر چاہیں تو اسے اَلْقِسْطِ کا بدل قرار دے سکتے ہیں اس لئے کہ دین جو کہ اسلام ہے وہ قسط وعدل ہے پس یہ عدل بھی اس چیز سے ہوگا کہ جس میں وہ خود موجود ہے۔

ابوعلی کے علاوہ ایک دوسرے عالم نے کہا: عربی میں پہلے اور دوسرے اَنَّ کے ہمزہ کو دونوں جگہ فتحہ بھی دے سکتے ہیں اور دونوں کو کسرہ بھی دے سکتے ہیں نیز پہلے اِنَّ کو فتحہ اور دوسرے ان کو کسرہ اور پہلے کو کسرہ اور دوسرے کو فتحہ بھی دے سکتے ہیں۔ جس نے دونوں کو فتحہ دیا ہے اس نے شھادۃ کو اَنَّ ثانیہ پر واقع کیا ہے اور پہلے والے سے حرف اضافت کو حذف کر دیا ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔

اور جس نے دونوں کو کسرہ دیا ہے اس نے پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی بنا پر جملہ معترضہ پر حمل کیا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: لَبَّيْكَ اَنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ لَكَ۔

جس نے دوسرے ان کو کسرہ دیا ہے اس نے حکایت کی بنا پر ایسا کیا ہے اس لئے کہ شَهِدَ کے معنی قَالَ کے معنیٰ کے ہیں مورج نے کہا: قیس عیلان کی لغت میں شَهِدَ، قَالَ کے معنیٰ میں ہے۔

جس نے پہلے ان کو کسرہ اور دوسرے کو فتحہ دیا ہے اس نے پہلے والے کو جملہ معترضہ قرار دے کر شَهِدَ کو دوسرے دن پر قرار دیا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلشَّهَادَةَ کے حقیقی معنیٰ کسی چیز کے متعلق مشاہدہ کے ذریعہ خبر دینے کے ہیں یا اس چیز کے ذریعہ جو مشاہدہ کا قائم مقام ہو۔

یہاں اس آیت میں اَلدِّیْن کے معنی اطاعت ہیں حالانکہ اس کے لغوی معنیٰ جزا کے ہیں۔ اطاعت کو دین کہا گیا ہے چونکہ یہ اطاعت جزا کے لیے ہے اسی سے اَلدَّیْن (قرض) ہے چونکہ یہ ادائیگی کے واجب ہونے میں جزا کی طرح ہے۔

اَلْاِسْلَامُ کی اصل السِلْم ہے، اور کے معنی سلام میں داخل ہونے کے ہیں اور اَلسِّلْم کے لغوی معنیٰ 'اَلسَّلَامَة' (سلامتی) کے ہیں چونکہ یہ سلامتی کے ساتھ اطاعت کرنے کا نام ہے۔ اسلام کی اصل اَلتَّسْلِیْم بھی ہوسکتی ہے چونکہ (اسلام) امر الٰہی کو تسلیم کرنا ہے۔ اَلتَّسْلِیْم اَلسَّلَامَة (سلامتی) سے ہے جو کسی کام کو فساد سے سلامتی کے ساتھ انجام دینا ہے (یا بجالانا ہے) لہٰذا اسلام فرائض کو فریب، خیانت اور خرابی سے سلامتی کے ساتھ بجالانا ہے۔

ہمارے نزدیک اسلام اور ایمان کے ایک ہی معنی ہیں البتہ معتزلہ کے نزدیک واجبات اعضاو جوارح کے افعال ایمان سے ہیں اور ہمارے نزدیک ایمان واجبی افعال قلوب میں سے ہے، افعال جوارح سے نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ اسلام ہر اس چیز کی اطاعت اور تسلیم کا فائدہ دیتا ہے جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرعی عبادات کے متعلق لے کر آئے ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور اس سے انکار نہ کیا جائے (اعتراض نہ کیا جائے) جب ہم کہتے ہیں مومن کا دین تو وہی ایمان اور وہی اسلام ہے پس اسلام ہی ایمان ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں: انسان بشر ہے۔ انسان حیوان (جاندار) ہے جو کہ انسانی شکل وصورت پر ہے اور حیوان (جاندار) انسانی شکل میں بشر ہے۔

اَلْاِخْتِلَاف یعنی دو آدمیوں ہی سے ایک کا اس کے برخلاف راستہ پر چلتا ہے جس پر دوسرا چل رہا ہے اور یہی ادیان میں اختلاف ہے اور اجناس میں اختلاف یہ ہے کہ دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز دوسری شے کی جانب پلٹنے والے کاموں میں اس کی جگہ نہ لے سکے۔

اَلْبَغْی کے معنی ظلم کے ذریعہ سربلندی چاہنا ہیں۔

ترکیب:

قَآئِماً کے منصوب ہونے کے سلسلہ میں دواقوال ہیں:

۱۔وہ اسم جلالہ اللہ کے لئے حال وموکد ہے اس لئے کہ حال موکد غیر اشارہ میں اسماء کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔آپ کہتے ہیں: اِنَّہٗ زَیْدٌ مَعْرُوْفًا۔ ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا شَھِدَ اللہُ قَآئِماً بِالْقِسْطِ یعنی قَآئِماً بِالْعَدْلِ۔

۲۔قَآئِماً لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ میں ھُوَ کا حال ہے۔

بَغْیاً کے منصوب ہونے کی دو وجہیں ہیں:

۱۔مفعول لہ ہے معنیٰ یہ ہے کہ: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لِلْبَغْیِ بَیْنَھُمْ جیسے حَذَرَ الشَّرِّ وغیرہ

۲۔اس چیز کی وجہ سے منصوب ہے جس پر ''وَمَا اخْتَلَفَ'' دلالت کرتا ہے۔گویا اس طرح کہا گیا ہے: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ دلالت کرتا ہے کہ وَمَا بَغَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ، پس بَغْیاً کو اس پر حمل کیا گیا ہے۔

تفسیر:

خدا کی یکتائی کی گواہی

جب اللہ نے ارباب دین کا ذکر کردیا تو اس کے فوراً بعد ہی دین کے صفات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: شَھِدَ اللہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے) خداوند عالم نے اس بات سے باخبر کیا ہے کہ جو اس کی وحدانیت، عجیب وغریب صنعت گری اور بہترین حکمت پر گواہی دے رہی ہے۔ بیان کیا گیا ہے شَھِدَ اللہُ کے معنی اللہ کا فیصلہ ہے۔یہ ابوعبیدہ سے مروی ہے۔زجاج نے کہا ہے کہ اس کی حقیقت کو اللہ جانتا ہے اور اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ شہادت وگواہی دینے والا ایسا عالم ہے کہ جس چیز کو جانتا ہے اس کو بیان کرتا ہے۔اسی سے شَھِدَ فُلَانٌ عِنْدَ الْقَاضِیْ ہے یعنی جس چیز کو وہ جانتا تھا اسے بیان کیا۔لہٰذا خداوند عالم نے اپنی تمام مخلوقات کے ذریعہ اپنی توحید کی جانب

رہنمائی کی ہے اور واضح کیا ہے کہ کوئی بھی کسی ایک چیز کو وجود عطا کرنے پر قادر نہیں ہے جس کو اس (اللہ) نے خلق کیا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ اور ملائکہ شہادت دے رہے ہیں اس چیز کے ذریعہ جس کا انھوں نے اس کی عظیم قدرت کا مشاہدہ کیا ہے۔ وَاُولُوا الْعِلْمِ (اور صاحبانِ علم بھی) اور اہل علم شہادت دے رہے ہیں اس چیز کے ذریعہ جو ان کے نزدیک ثابت اور اس کی صنعت وکاری گری سے واضح ہو چکا ہے جس پر کوئی دوسرا قادر نہیں ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (عدل وانصاف کے ساتھ (اس بات پر گواہی دے رہے ہیں)) ملائکہ گواہی دے رہے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے جس کی ذات عدل پر قائم ہے اور اہل علم گواہی دے رہے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کی ذات عدل پر قائم ہے۔۔ قسط وہ عدل ہے جس کے سبب آسمان وزمین قائم ہیں۔ اس کی روایت ہمارے علماء نے بھی تفسیر میں کی ہے۔ اُولُوا الْعِلْمِ مومنین علماء ہیں۔ یہ سدی اور کلبی سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے قَآئِمًا بِالْقِسْطِ کے معنی ہیں اللہ کی ذات امور کو انجام دینے، خلق کی تدبیر کرنے اور اعمال کی جزا دینے میں عدل پر قائم ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: فُلَانٌ قَآئِمٌ بِالتَّدْبِيْرِ یعنی وہ اپنے افعال مستقیم طور پر انجام دیتا ہے۔ اس نے اپنے ارشاد لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کو اس لیے مکرر بیان کیا ہے پہلے والے سے اس نے بیان فرمایا ہے کہ وہ توحید کا مستحق ہے، اس کے سوا کوئی توحید کا حقدار نہیں ہے۔ دوسرے سے مراد یہ ہے کہ اس کی ذات مخلوق کو رزق عطا کرنے اور ان کی تدبیر کرنے میں عدل پر قائم ہے۔ اس کے افعال میں ظلم نہیں ہے۔

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (زبردست اور صاحب حکمت) اس کی تفسیر گذر چکی ہے۔

یہ آیت علم وعلما کی فضیلت کے بیان پر مشتمل ہے، اس لیے کہ خداوند عالم نے علما کو ملائکہ کے ساتھ اور ان کی گواہی کو ملائکہ کی گواہی سے متصل بیان کیا ہے اور ان کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ گویا علما کے علاوہ کسی کا شمار نہیں کیا گیا ہے۔ اس علم سے توحید سے متعلق دینی علوم مراد ہیں اس لیے کہ گواہی اسی پر واقع ہوئی ہے۔

علم اور علما کی فضیلت سے متعلق جو حدیث میں وارد ہوا ہے اس کی روایت جابر بن عبداللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: عالم کا ایک گھنٹہ اپنے بستر پر جس میں وہ اپنے علم میں غور وفکر کرتا ہے عابد کی ستر برس کی عبادت سے بہتر وافضل ہے۔ انس بن مالک نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: علم حاصل کرو، اس لئے کہ اس کا سیکھنا نیکی ہے، سکھانا تسبیح ہے، اس میں بحث کرنا جہاد، نہ

جاننے والوں کو تعلیم دینا صدقہ ہے، اس کے اہل کے لیے یاد دہانی ہے، اس سے حلال وحرام کا علم حاصل ہوتا ہے، علم جنت وجہنم کے راستہ کا منارہ ہے (یعنی علم کے سبب جنت وجہنم کے راستے کا علم حاصل ہوتا ہے) علم تنہائی ووحشت میں دوست ہے، غربت میں ساتھی ہے، خلوت میں محوِ گفتگو وکلام ہوتا ہے، آسانی وشدت میں دلیل ہے، دشمن کے مقابل میں اسلحہ ہے، غربا سے نزدیکی کا ذریعہ ہے، علم کے طفیل خداوند عالم اقوام کے درجات بلند فرماتا ہے، انھیں خیر کا قائد وسردار بناتا ہے جن کی اقتدا کی جاتی ہے اوران کے آثار پر عمل پیرا ہوا جاتا ہے، ان کی رائے کو آخری رائے قرار دیا جاتا ہے، ملائکہ ان سے دوستی کے خواہاں ہوتے ہیں، اپنے پروں سے اہل علم کو مس کرتے ہیں، نمازوں میں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں (دنیا کا) ہر خشک وتر ان کے لیے استغفار کرتا ہے یہاں تک کہ دریاؤں کی مچھلیاں، زمین کے درندے اور چوپائے، آسمان اور اس کے ستارے۔ آگاہ ہوجاؤ! علم میں قلوب کی زندگی ہے، آنکھوں کے لیے نور اور جسموں کے لیے قوت ہے، اس کے ذریعہ غلام آزاد انسانوں کے مقامات حاصل کرتا ہے، بادشاہوں کے دربار تک رسائی ہوتی ہے، اس میں غور و فکر کرنا روزوں کے برابر ہے، اسے سیکھنا، سکھانا شب زندہ داری ہے، علم کے ذریعہ حلال اور حرام کی معرفت ہوتی ہے، اسی کے ذریعہ صلہ رحم کیا جاتا ہے، علم عمل کا امام وپیشوا ہے، عمل اس کا تابع ہے، نیک افراد کو الہام کیا جاتا ہے اور اشقیا اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس آیت کی فضیلت میں جو وارد ہوا ہے اس کی روایت انس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جس نے آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ... الخ کی تلاوت سوتے وقت کی خداوند عالم اس سے ستر ہزار مخلوق خلق فرمائے گا جو اس کے لیے قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔

زبیر بن العوام کہتے ہیں میں شب عرفہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزدیک ہوا تا کہ سنوں کہ آپ کیا فرماتے ہیں (کیا پڑھتے ہیں) چنانچہ میں نے اپنی اونٹنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کے قریب باندھ دی، وہیں پر ایک دوسرے شخص کی اونٹنی تھی۔ میں نے سنا کہ آپؐ آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ... الخ کی تلاوت فرما رہے ہیں اور آپؐ اس کی مسلسل تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ غالب القطان کھڑا ہوا، اس نے کہا: میں کوفہ بغرض تجارت گیا تھا اور اعمش کے یہاں قیام کیا تھا، میں اس کے پاس آتا جاتا رہتا تھا، جب میں نے ایک شب بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو اعمش کھڑے ہوگئے اور نماز شب پڑھنا شروع کردی جب وہ آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ... الخ پر پہونچے کہا: میں اس چیز کی گواہی دیتا ہوں جس چیز کی اللہ

گواہی دے رہا ہے اور میں اس گواہی کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں جو اللہ کے یہاں میرے لیے امانت ہے (پھر انھوں نے) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (بے شک سچا دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے) کو کئی بار دہرایا۔ میں نے کہا: اس میں انھوں نے کچھ سنا، پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، اور میں نے ان سے کہا: میں نے آپ سے ایک آیت کی تکرار سنی، اس بارے میں آپ تک کون سی روایت پہونچی ہے؟ انھوں نے کہا: ایک برس تک میں تم سے اس متعلق بات نہیں کروں گا۔ میں نے ان کے دروازے پر اس روز کے بارے میں لکھ دیا اور ایک برس تک قیام کیا، جب ایک برس گذر گیا تو میں نے کہا: اے ابومحمد! ایک برس گذر چکا ہے، انھوں نے کہا: مجھ سے ابووائل نے عبداللہ کے واسطہ سے حدیث بیان کی، عبداللہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اس آیت کی تلاوت کرنے والا) جب روز قیامت لایا جائے گا، تو خدا فرمائے گا اس بندے کا میرے پاس عہد (وعدہ) ہے اور ایفائے عہد کا میں زیادہ حق دار ہوں، میرے بندے میری اس جنت میں داخل ہوجا! (یا میرے بندے کو داخل جنت کرو)

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ کعبہ کے اطراف میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے، جب آیت شَهِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ... الخ نازل ہوئی، تمام بت سجدے میں گر پڑے۔

اِنَّ الدِّیْنَ (بے شک دین) یعنی اطاعت۔ عِنْدَ اللّٰہِ (اللہ کے نزدیک) الْاِسْلَامُ (اسلام ہے) بیان کیا گیا ہے کہ اسلام سے مراد اللہ اور اس کے اولیاء کے سامنے تسلیم ہونا ہے جو کہ تصدیق ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک خطبہ کی روایت کی گئی ہے جس میں آپؑ نے اس طرح فرمایا: میں اسلام کی ایسی تعریف بیان کررہا ہوں جو مجھ سے قبل کسی نے بیان نہیں کی ہوگی؛ اسلام تسلیم ہے، تسلیم یقین ہے، یقین تصدیق ہے، تصدیق اقرار کرنے کا نام ہے، اقرار ادائیگی کا نام ہے اور ادائیگی عمل ہے۔

اس کی روایت علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں کی ہے وہ کہتے ہیں: پھر (امیرالمومنین علیہ السلام) نے ارشاد فرمایا: مومن اپنا دین اپنے پروردگار سے لیتا ہے، اپنی رائے سے حاصل نہیں کرتا، مومن کا ایمان اس کے عمل سے پہچانا جاتا ہے، کافر کو اس کے انکار سے پہچانا جاتا ہے، اے لوگو! اپنے دین کی حفاظت کرو، اپنے دین کی حفاظت کرو اس لیے کہ دین میں رہتے ہوئے گناہ کرنا بے دینی کی نیکی سے بہتر وافضل ہے۔ دین پر قائم رہتے ہوئے گناہ اور غلطی قابل بخشش ہے اور بے دین رہتے ہوئے نیکی کرنا قابل قبول نہیں۔

ارشاد الٰہی: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (اہلِ کتاب نے اس دین سے ہٹ کر جو مختلف

طریقے اختیار کیے) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صداقت میں جو یہود ونصاریٰ نے اختلاف کیا جبکہ وہ اپنی کتابوں میں آنحضرتؐ کے اوصاف وتعریف اور آپؐ کی آمد کے وقت کے بارے میں دیکھتے تھے۔

اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ (تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے حقیقت امر معلوم ہوجانے کے بعد) ان کے پاس علم آنے کے بعد، پھر ان کے اختلاف کے سبب کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ (آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا ہے) یعنی بسبب حسد (انھوں نے ایسا کیا) اس کی تقدیر اس طرح ہے: اہل کتاب نے آپسی ظلم وسرکشی کے باعث اختلاف نہیں کیا مگر ان تک علم پہونچنے کے بعد، مذکورہ علم سے ممکن ہے کہ وہ بینات اور معجزات مراد ہوں جو علم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اس میں اہل کتاب کے باطل پرست افراد داخل ہیں، چاہے علم رکھتے ہوں یا علم نہ رکھتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے خود علم مراد ہو لہٰذا اس میں وہی داخل ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و صفات جانتا ہو اور بسبب بغض وعناد انھیں پوشیدہ رکھا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے اَلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا سے یہودی اور الکتاب سے توارت مراد ہے، جب جناب موسیٰؑ نے ان سے عہد لیا اور ان کے درمیان یوشع بن نون کو مقرر کیا اور تین صدیاں گذر گئیں اور انھوں نے اختلاف کیا۔ یہ ربیع کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اَلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا سے نصاریٰ اور اَلۡكِتَابَ سے انجیل مراد ہے، انھوں نے جناب عیسیٰؑ کے بارے میں اختلاف کیا۔ یہ محمد بن جعفر بن زہیر کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ جناب عیسیٰؑ کے بعد انھوں نے دین میں اختلاف کیا، یہ جبائی کا قول ہے۔

وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (جو شخص اللہ کی آیات (نشانیوں) کا انکار کردے) یعنی اللہ کی حجتوں اور دلیلوں کا انکار کردے۔ کہا گیا ہے کہ تورات وانجیل کے ذریعہ اور ان میں موجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات کا انکار کردے۔ کہا گیا ہے قرآن کا اور جو چیز اس پر دلالت کررہی ہے اس کا انکار کردے۔

ارشاد: فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (تو اللہ کو اس سے حساب لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی) ان کے اعمال میں سے کوئی چیز نہیں چھوٹ سکے گی۔ کہا گیا ہے کہ اللہ بہت جلد جزا اور بدلہ (عطا کرنے والا ہے) اور حساب کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز تمھاری ہے اسے لے لو اور جو چیز تم پر ہے اسے عطا کردو۔

❁❁❁❁❁

فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِلَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيِّنَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ
وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

اب اگر یہ لوگ آپ سے بلا وجہ جھگڑا کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ میں نے اور میرے پیروکاروں نے تو اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ پھر اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب دونوں سے پوچھیے کیا تم نے بھی اطاعت و بندگی قبول کر لی؟ پس اگر وہ اسلام لے آئے تو ہدایت پا گئے اور اگر انھوں نے منہ پھیر لیا تو اے رسول! آپ پر صرف پیغام رسانی کی ذمّے داری تھی اور اللہ اپنے بندوں کے معاملات کو دیکھ رہا ہے۔ (۲۰)

قرأت:

عاصم، حمزہ اور کسائی نے اتَّبَعَنِيْ سے یاء کو کسرہ پر اکتفاء کی اور مصحف کے اتباع میں حذف کر دیا ہے۔ باقی قراء نے باقی رکھا ہے۔

حجت:

آخر آیات میں یاء کو حذف کرنا زیادہ اچھا ہے اس لئے کہ وہ قافیہ کے مانند ہے۔ درمیان آیت میں بھی ایسا کرنا جائز ہے اور سب سے اچھا وہاں پر ہے جہاں یاء سے پہلے نون ہو جیسے: وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اگر نون نہ ہو تب بھی جائز ہے جیسے: هٰذَا غُلَامِ (دراصل هٰذَا غُلَامِيْ تھا) وغیرہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ یاء کو باقی رکھا جائے اور اگر آپ چاہیں تو یاء کو ساکن بھی رکھ سکتے ہیں اور اسے فتحہ بھی دے سکتے ہیں۔

ترکیب:

وَمَنِ اتَّبَعَنِ میں مَنْ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ اَسْلَمْتُ کی تاء پر عطف ہے اور ضمیر اس کی تاکید نہیں کر رہی ہے: اَسْلَمْتُ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ نہیں کہا ہے اگر آپ اَسْلَمْتُ وَزَيْدٌ کہیں تو اچھا نہیں ہے مگر

یہ کہ اَسۡلَمۡتُ اَنَا وَ زَیۡدٌ کہیں۔ لیکن یہاں پر جائز ہے طول کلام کی بنا پر۔ پس کلام کا طولانی ہونا ہی ضمیر متصل کی ضمیر منفصل کے ذریعہ تاکید کا عوض ہے۔

تفسیر:

کٹ حجتی کرنے والوں کا جواب

خداوند عالم نے ایمان واسلام کے ذکر کے بعد اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ (اب اگر یہ لوگ آپ سے بلاوجہ جھگڑا کریں) اگر آپ سے نصاریٰ نجران کا وفد کٹ حجتی کریں تو فَقُلۡ اے محمدؐ! (ان سے کہہ دیجیے کہ) اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِیَ لِلّٰهِ (میں نے تو اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے)

اس میں دو وجہیں ہیں:

اول: میں نے امر خدا کو اخلاص توحید کے اور اس میں موجود حجت کو تسلیم کرلیا، اس لئے کہ لوگوں پر لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کریں اور اس کے حکم کا اتباع کریں کہ وہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں گے۔

دوم: میں نے اللہ کے سوا ہر معبود سے روگردانی اور دوری اختیار کی اور اس کی عبادت کے لیے اپنے قصد وارادہ کو خالص قرار دے دیا ہے۔ خدا نے ایک ایسے قانون کا ذکر کیا ہے جس کا اقرار کرنا تمام مکلفین پر لازم وضروری ہے اس لیے کہ دین میں جس عمل کی ضرورت ہے اس کے کا جزء جزء نہیں ہوسکتا وہ دین جو کہ عذاب سے نعمتوں کی طرف راہ نجات ہے۔ یہاں پر (وَجۡهِیَ) کے معنی میرا نفس ہے۔ اسلام کی نسبت وجہ (چہرہ) کی طرف اس لیے دی گئی ہے کہ کسی چیز کا چہرہ اس میں موجود سب سے افضل (حصہ) ہوتا ہے، چونکہ وہ حواس کا جامع ہوتا ہے جس پر غم واندوہ اور سرور وشادمانی کی علامت ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا جس نے اپنے چہرہ کو تسلیم کر دیا اس نے مکمل طور پر تسلیم کر دیا (یعنی خود سپردگی کر دی)۔ اللہ کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے:

كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ

وَمَنِ اتَّبَعَنِ (اور میرے پیروکاروں نے (بھی اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے)) یعنی مسلمانوں میں سے جس نے دین میں مجھ سے ہدایت حاصل کی۔ لہٰذا وہ بھی اسی طرح اسلام لایا ہے جس طرح میں اسلام لایا ہوں۔

ارشاد: وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (پھر اے محمدؐ! اہل کتاب سے پوچھیے) یعنی یہودیوں ونصاریٰ سے پوچھیے۔ وَالْأُمِّيِّينَ (اور غیر اہل کتاب (سے پوچھیے)) یعنی جن کے پاس کتاب نہیں ہے۔ یہ ابن عباس و غیرہ سے مروی ہے۔ یہ مشرکین عرب ہیں۔ اُمّی اور اس کے اشتقاق کی تفسیر وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ کے تفسیر کے موقع پر گذر چکی ہے۔

ءَأَسْلَمْتُمْ (کیا تم نے بھی اطاعت و بندگی قبول کر لی؟) یعنی تم نے خود کو خالص قرار دے دیا جس طرح میں نے خود کو (اسلام کے لیے) خالص قرار دے دیا ہے۔ یہ لفظ استفہام ہے لیکن توقیف وتہدید (سرزنش اور مذمت) کے معنی میں ہے جو امر پر مشتمل ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام قبول کرلو، اس لیے کہ خداوند عالم نے بہانہ بازیوں کو دور اور سبیل (راہ ہدایت) کی وضاحت فرما دی ہے۔ جس کی نظیر اس طرح ہے: فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ کیا تمھیں نہی کی گئی ہے؟ (روکا گیا) یعنی تم خود کو روکو جس طرح کوئی شخص کسی سے کہے: میں نے اسے اپنے مواعظ سے وعظ ونصیحت کی کیا تم نے میری نصیحت قبول کی؟ (یعنی) اس طرح اسے نصیحت کے قبول کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا پس اگر وہ اسلام لے آئے تو راہ حق کی طرف ہدایت پا گئے وَّإِن تَوَلَّوْا (اور اگر انھوں نے منہ پھیر لیا تو) یعنی (اگر) وہ کفر اختیار کریں، راہ حق قبول نہ کریں اور اس سے انحراف کریں تو فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ (اے رسول آپ پر صرف پیغام رسانی کی ذمّے داری تھی) یعنی آپ کا کام پہونچانا اور حجت و دلیل کا قائم کرنا ہے۔ ان کے انحراف اور روگردانی نہ کرنے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (اور اللہ اپنے بندوں کے معاملات کو دیکھ رہا ہے) یعنی ان کے اعمال میں سے ذرہ برابر کوئی چیز نہیں چھوٹ سکے گی جس پر انھیں جزا دی جائے گی اس لیے کہ اللہ ان کے بارے میں بصیر ہے (یعنی) ان کے رازہائے سربستہ سے واقف ہے، اس پر کوئی معمولی سے معمولی چیز بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ آپ کی تبلیغ کے بارے میں جانتا ہے اور ان کے ایمان و کفر سے واقف ہے۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۱﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿۲۲﴾

اور جو لوگ اللہ کی آیات (نشانیوں) کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان لینے سے دریغ نہیں کرتے جو خلقِ خُدا میں عدل وراستی کا حکم دیتے ہیں تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو۔(۲۱) یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو گے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔(۲۲)

قرأت:

حمزہ نے يُقَاتِلُونَ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔کہا گیا ہے کہ انہوں نے يُقَاتِلُونَ عبداللہ بن مسعود کے مصحف کا اتباع کرتے ہوئے پڑھا ہے اس لئے کہ اس میں وَيُقَاتِلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ آیا ہے اور باقی قراء نے يَقْتُلُونَ پڑھا ہے اور یہی غالب ورائج قرأت ہے۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی فَبَشِّرْهُمْ پر فاء داخل ہوا ہے اس لئے کہ یہ جزاء سے مشابہ ہے۔حالانکہ لَيْتَ الَّذِي لَيَقُومُ فَيُكْرِمُكَ کہنا جائز نہیں ہے بلکہ إِنَّ الَّذِي يَقُومُ فَيُكْرِمُكَ کہنا جائز ہے اس لئے کہ الَّذِي کی خبر پر فاء داخل ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جملہ میں جزاء کے معنیٰ پائے جاتے ہیں اور لَيْتَ جزاء کے معنیٰ کو ختم کر دیتا ہے جب کہ إِنَّ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ وہ ابتداء (مبتدا ہونے) کے مقام میں ہوتا ہے۔

تفسیر:

دردناک عذاب کی بشارت

خداوند عالم نے اہل کتاب سے احتجاج اور اگر وہ اسلام لے آئے تو ان سے اور وعدۂ حسن (بہترین

وعدہ) اگر انکار کریں تو ان پر عذاب کی شدید وعید کا ذکر فرمانے کے بعد موجودہ آیت میں اہل کتاب کے کفر کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ (اور جو لوگ اللہ کی آیات (نشانیوں) کو ماننے سے انکار کرتے ہیں) یعنی جو اللہ کی حجتوں اور معجزوں کا انکار کرتے ہیں۔

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ (اور انبیاء کو قتل کرتے ہیں) کہا گیا ہے کہ یہ یہودی ہیں۔ ابو عبیدہ بن جراح سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! روز قیامت کس شخص پر سب سے سخت عذاب ہوگا؟ فرمایا: جس نے پیغمبر کا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کا قتل کیا ہوگا۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ (اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان لینے سے دریغ نہیں کرتے جو خلقِ خدا میں عدل وراستی کا حکم دیتے ہیں) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! بنی اسرائیل نے دن کے ابتدائی حصہ میں ایک گھنٹہ میں تینتالیس (۴۳) پیغمبروں کو قتل کر دیا، پھر بنی اسرائیل کے ایک سو بارہ (۱۱۲) عابد وزاہد افراد پیغمبروں کے قاتلوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو انھوں نے اسی روز دن کے آخری حصہ میں انھیں بھی قتل کر ڈالا۔ اسی کا ذکر اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے۔

ارشاد: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو) یعنی انھیں خبر دے دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان کے بارے میں (بَشِّرْهُمْ) بشارت دینے کی بات کہی ہے جو اتباع اور استعارہ کے طریقہ پر ہے جبکہ بشارت خیر میں ہوتی ہے، شر میں نہیں؛ اس لیے کہ یہ ان کے لیے مومنین کو بشارت کی جگہ پر ہے چونکہ لفظ بَشَارَة اَلْبَشَرَة سے مشتق ہے اس لیے کہ چہرہ کی جلد (اور اس کا ظاہری حصہ) خیر میں بسبب سرور وشادمانی اور شر میں غم کے سبب متغیر ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہودیوں کے لیے فَبَشِّرْهُمْ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جبکہ ان کے بزرگوں نے انبیا کا قتل کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ اپنے بزرگوں کے کرتوت پر راضی تھے اور ان کی پیروی کر رہے تھے لہٰذا انھیں بھی ان بزرگوں کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کو ان کے آباء واجداد کے دردناک عذاب کی خبر دے دو اللہ کا ارشاد بِغَيْرِ حَقٍّ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ پیغمبروں کا قتل برحق بھی ہو سکتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوگا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (سورۂ مومنون، آیت ۱۱۷؛ اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کو پکارے گا جس کی کوئی دلیل بھی

نہیں ہے) اس سے نفی کی تاکید اور مبالغہ مراد ہے جس طرح کہا جاتا ہے: فلاں (شخص) سے خیر کی امید نہیں کی جاسکتی اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کے پاس کسی بھی طرح کا کوئی خیر نہیں ہے۔

اس اعتبار سے قتل کو اس کی ضروری صفت سے متصف کرتے ہوئے بیان کیا ہے اور وہ اس کا خلاف حق واقع ہونا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں دعاء ہے کہ: وَمَن يَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرۡهَانَ لَهٗ بِهٖ اس کی صفت یہ ہے کہ ایسی دعا برہان ودلیل کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتی۔ علی بن عیسیٰ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ قتل کے خوف کے باوجود برائی سے روکنا جائز ہے اور اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ جس کی حسن نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: اَفۡضَلُ الۡجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنۡدَ سُلۡطَانٍ جَائِرٍ يُقۡتَلُ عَلَيۡهِ (ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے جس کے سبب اسے قتل کر دیا جائے) علی بن عیسیٰ کے اس قول میں نظر اور غور وفکر کی گنجائش ہے اس لیے کہ برائی سے روکنے کے حُسن (بہتر اور اچھا) قرار پانے کی شرط یہ ہے کہ اس سے روکنے میں کوئی خطرہ نہ ہو اور جب نوبت قتل تک پہنچ جائے تو اس سے (یہ شرط) برطرف ہو جائے گی۔ یہ شرط قبیح ہو جائے گی اس آیت اور دیگر روایات میں جو بات بیان کی گئی ہے اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ برائی سے روکنے سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا تو اس میں حسن اور بہتری ہے بلکہ واجب ہے اگرچہ اس کے بعد قتل کر دیا جائے اس کے لیے شرط نہیں ہے کہ اس کا علم ویقین حاصل ہو بلکہ اس میں ظن غالب ہی کافی ہے۔

ارشاد: اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ جنھوں نے آیات الٰہی کا انکار کیا اور پیغمبروں کو قتل کیا اور ان لوگوں کو قتل کیا جو نیکیوں کا حکم دیتے تھے حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ (ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو گئے) ان کے اعمال سے ان کی توریت سے وابستگی اور شریعت جناب موسیٰؑ پر قائم رہنے کا ادعا مراد ہے۔ دنیا میں نابود ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کی جان اور مال کی حفاظت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی انھوں نے ان چیزوں کے ذریعہ کوئی تعریف حاصل کی۔ آخرت میں نابودی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کے سبب ثواب کے مستحق قرار نہیں پائیں گے گویا کہ انھوں نے اعمال انجام ہی نہیں دیئے اس لیے کہ عمل کا حبط اور اکارت ہونا اس شکل کے خلاف انجام دینا ہے جس پر اجر وثواب اور مدح اور حسن ذکر (تعریف) کا استحقاق پیدا ہوتا ہے اور عبادت نابود ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ایسی ہو جاتی ہے کہ اسے انجام ہی نہیں دیا گیا ہے جب وہ ایسی صورت میں انجام پائے جو کہ حکم کے برخلاف ہو۔

ارشادالٰہی: وَمَا لَهُم مِّن نَّٰصِرِينَ (اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے) ان سے عذاب کو دفع کرنے والا کوئی ناصرومددگار نہیں ہوگا۔

❁❁❁❁❁

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

کیا تم نے نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ ملا ہے ان کا کیا حال ہے؟ انھیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کر دے تو ان میں سے ایک فریق اس فیصلے سے روگردانی کرتے ہوئے پہلوتہی کرتا ہے۔(۲۳) ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جہنّم کی آگ ہمیں مس نہیں کرے گی سوائے چند دنوں کے۔ ان کے اس خودساختہ عقیدے نے دین کے معاملے میں انھیں دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے۔(۲۴)

الفاظ ومعانی:

اَلنَّصِيب کے معنی کسی چیز کے حصہ کے ہیں۔ یہ وہ قسم (حصہ) ہے جسے اس چیز کے لیے قرار دیا گیا ہے جس کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے۔

اَلدُّعَاء: کسی کام کی دعوت دینا۔ یہ کبھی صیغۂ امر اور کبھی خبر ہے قرینہ کے ساتھ۔

اَلْحُكْم وہ خبر ہے جو حق کو باطل سے علیحدہ کرتی ہے، یہ حَكَمة سے مشتق ہے، اس کے معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں۔

اَلْغُرُوْر: اس چیز میں طمع کرنا ہے جو درست نہیں ہے۔ غَرُور یعنی شیطان، اس لئے کہ وہ انسان کو مغرور بناتا ہے، فریب دیتا ہے۔

اَلْغَارّ یعنی غافل اس لئے کہ وہ بھی فریب خوردہ کے مانند ہوتا ہے۔ غرارۃ یعنی دنیا، اس لئے کہ دنیا

والوں کو دھوکا دیتی ہے۔

اَلْغِرُّ (غمر) وہ آدمی جو کاموں میں تجربہ کار نہ ہو۔

اَلْاِفْتِرَاء: جھوٹ بولنا، بہتان باندھنا۔

ترکیب:

جملہ یُدْعَوْنَ، اُوْتُوا کے لئے مقام حال میں ہے جملہ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ، یُدْعَوْنَ پر معطوف ہے۔ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ، یَتَوَلّٰی کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اَیَّامًا ظرف کی بنا پر منصوب ہے اس لئے کہ آگ کو مس کرنا انہیں ایام میں ہوگا۔ مَعْدُوْدَاتٍ، اَیَّامًا کی صفت ہے۔

تفسیر:

اہل کتاب کی روگردانی اور اس کا سبب

خداوند عالم نے یہودیوں پر حجتوں اور دلائل کو بیان کرنے کے بعد اس بات کی وضاحت فرمائی کہ جب ان پر حجت دشوار ہوتی ہے تو وہ چیخ پکار اور شور شرابہ کرتے ہیں اور واضح راستہ سے ہٹ جاتے ہیں: اَلَمْ تَرَ (کیا تم نے نہیں دیکھا) یعنی کیا آپ بات آپ کے علم میں آئی؟ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا (جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ ملا ہے، ان کا کیا حال ہے؟) انھیں کتاب کا حصہ عطا کیا گیا تو وہ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰهِ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ (انھیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے مابین فیصلہ کردے) انھیں کتاب خدا کی طرف بلایا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے، کہا گیا ہے کہ تورات مراد ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ یہودیوں کو تورات کی طرف بلایا گیا تو انھوں نے انکار کردیا یہ جانتے ہوئے کہ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور آپ کی صداقت کی دلیلیں موجود تھیں اسی لیے ارشاد ہوا کہ یہودیوں کو کتاب کا کچھ حصہ عطا کیا گیا اس لیے کہ وہ اس میں موجود بعض چیزوں سے واقف تھے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے: کتاب اللہ سے مراد قرآن ہے۔ یہ حسن وقتادہ کا قول ہے۔ انھیں قرآن کی طرف بلایا گیا اس لیے کہ اس میں توریت کے موافق اصول دیانت، ارکان شریعت اور وہ صفت ہے جس کی بشارت گذر چکی ہے۔

لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ (تا کہ وہ ان کے مابین فیصلہ کردے) اس میں تین باتوں کا احتمال وامکان ہے:

اول: تا کہ ان کے درمیان محمد ﷺ کی نبوت کے متعلق حکم کرے۔ یہ ابو مسلم اور مفسرین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔

دوم: تا کہ ان کے درمیان ابراہیم اور ان کے دین اسلام کے بارے میں حکم کرے۔

سوم: تا کہ ان کے درمیان رجم کے بارے میں حکم کرے۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ اہل خیبر سے ایک مرد اور عورت نے زنا کیا جو ان کے درمیان صاحب شرف (باعزت) تھے جبکہ ان کی کتاب میں حکم (رجم) موجود تھا۔ اہل خیبر نے دونوں کے شرف کے پیش نظر انھیں رجم کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس امید کے ساتھ کہ دونوں کو پیغمبر ﷺ کے یہاں چھٹکارا مل جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے یہاں دونوں کا معاملہ پیش کیا گیا، آنحضرتؐ نے دونوں پر رجم کا حکم فرمایا۔ آپؐ سے نعمان بن اوفی اور بحری بن عمرو نے کہا: آپ نے دونوں کے ساتھ زیادتی کی ہے ان پر حکم رجم نافذ نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: میرے اور تمھارے درمیان توریت موجود ہے۔ انھوں نے کہا: آپؐ نے انصاف کی بات کی۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں کون توریت کا بڑا عالم (اور جانکار) ہے؟ انھوں نے کہا: ایک بھینگا انسان ہے، جو فدک میں رہتا ہے۔ جسے ابن صوریا کہتے ہیں۔ اس کی طرف قاصد بھیج کر اسے مدینہ بلایا گیا۔ ادھر جبرئیلؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس کے بارے میں بتلا دیا تھا۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس سے فرمایا: تو ہی ابن صوریا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! فرمایا: تو یہودیوں میں سب سے زیادہ جانتا ہے؟ اس نے کہا: لوگ اس طرح گمان کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تورات کا وہ جز منگوایا جس میں رجم کے بارے میں لکھا تھا اور فرمایا: اسے پڑھ! جب وہ آیت رجم پر پہنچا تو اس پر اس نے ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بعد کی آیت پڑھنے لگا۔ یہ سن کر ابن سلام نے کہا: یارسول اللہ! وہ آیت سے آگے بڑھ گیا! پھر ابن سلام نے ابن صوریا کا ہاتھ وہاں سے ہٹا کر رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں کے سامنے اس کی تلاوت کی (جو اس طرح تھی): جب محصن (شادی شدہ مرد) اور محصنہ (شوہر دار عورت) زنا کریں اور ان پر بینہ اور ثبوت قائم ہو جائے تو دونوں کو سنگسار کیا جائے گا۔ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کے وضع حمل کا انتظار کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کا وضع حمل ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دو یہودیوں کو حکم دیا اور انھوں نے دونوں کو سنگسار کر دیا۔ اس فیصلہ پر یہودی کافی غضبناک ہوئے تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ (تو ان میں سے ایک فریق اس فیصلے سے روگردانی کرتے ہوئے) یعنی

ان میں کا (ایک) گروہ بلانے والے سے روگردانی کر جاتا ہے۔ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ یعنی حق کی پیروی کرنے سے انحراف کرتا ہے۔

ارشاد: ذٰلِكَ ان کا یہ طرزِ عمل اور ان کی حالت یہ ہے۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، خداوند عالم نے ان کے اتباع حق سے انحراف کرنے کی وجہ بیان فرمائی ہے، ان کے جانتے تھے اور وہ سبب جس نے انھیں انکار پر جری بنایا تھا کہ یہ تھا کہ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ (کہ وہ کہتے ہیں کہ جہنّم کی آگ ہمیں مس نہیں کرے گی) یعنی آگ ہم تک نہیں پہونچے گی اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (سوائے چند دنوں کے) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: وہ دن ہیں جن میں انھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی اور وہ چالیس دن تھے۔ یہ ربیع، قتادہ اور حسن سے مروی ہے مگر حسن نے سات دن کہا ہے۔

دوم: اس سے ان کی مراد الگ الگ دن ہیں۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

ارشاد: وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ (ان کے اس خودساختہ عقیدے نے دین کے معاملے میں) یعنی انھیں غیر طمع والی چیزوں نے طمع میں مبتلا کر دیا تھا۔ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ان کے افترا اور جھوٹ نے۔ اس افترا کے متعلق اختلاف ہے جس نے انھیں دھوکہ میں ڈال دیا، اس میں دو اقوال ہیں:

اول: ان کا یہ کہنا تھا: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم اللہ کے فرزند اور چہیتے ہیں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

دوم: ان کا یہ کہنا تھا کہ: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ یعنی آگ ہمیں نہیں چھوئے گی مگر چند روز۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ یہودیوں کا کہنا ہمارے اختیار کردہ نظریہ کے برخلاف دلالت کرتا ہے۔ (ہمارا نظریہ) یہ ہے کہ اہل نماز میں سے سزا میں مبتلا لوگوں کو معاف اور انھیں جہنم سے نکالا جا سکتا ہے اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کا اس کے ایمان کے سبب دائمی ثواب ثابت ہے اس پر عذاب نہیں ہوگا مگر بطور منقطع (یعنی دائمی شکل میں نہیں ہوگا) اگرچہ اس کی سزا کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ ہم گناہ اور نافرمانی کے دنوں کے مطابق عذاب کے دنوں کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ یہودی کہتے ہیں۔ دونوں قول کے درمیان فرق ظاہر و عیاں ہے۔

❀❀❀❀❀

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

مگراس وقت ان کی کیا کیفیت ہوگی جب ہم انھیں اس دن اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔اس روز ہر شخص کواس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔(۲۵)

ترکیب:

كَيْفَ حال کے بارے میں سوال کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ یہاں آیت میں اس کے معنی تنبیہ اور آگاہ کرنے کے ہیں اس شخص کی حالت کے بارے میں سوال کر کے جسے آگ (جہنم) کی طرف کھینچ کرلے جایا جائے گا۔اس جملہ میں بلاغت اور نہایت اختصار ہے اس لئے کہ اس کی تقدیر یہ ہے: اَیُّ حَالٍ يَّكُوْنُ حَالَ مَنِ اغْتَرَّ بِالدَّعَاوِی الْبَاطِلَةِ حَتّٰى اَدَّاهُ ذٰلِكَ اِلَى الْخُلُوْدِ فِي النَّارِ (اس شخص کی حالت کیسی حالت ہوگی جو باطل دعوؤں کے ذریعہ دھوکا کھا گیا ہے یہاں تک کہ انہیں باطل دعوؤں نے اسے جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پہونچا دیا ہے)

اس کے مانند یہ جملہ بھی ہے: اَنَا اُكْرِمُكَ وَ اَن لَّمْ تَجِئْنِيْ فَكَيْفَ اِذَا جِئْتَنِيْ۔ (میں تمھارا احترام واکرام کروں گا اگر چہ تم میرے پاس نہ آؤ اور اس وقت کیا ہوگا جب تم میرے پاس آؤ گے)

کیا ہوگا جب تم میرے پاس آؤ گے آپ کی مراد عظیم اکرام ہے۔آیت کے اس فقرہ کی تقدیر یہ ہے: فَكَيْفَ حَالُهُمْ اِذَا جَمَعْنَاهُمْ یعنی انہیں جمع اور اکٹھا کرتے وقت اس لئے یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

تفسیر:

ایک اہم سوال

پھر خداوند عالم نے گذشتہ مطالب پر تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: فَكَيْفَ ان کی حالت کیا ہوگی اِذَا جَمَعْنٰهُمْ جس وقت ہم انہیں جمع اور اکٹھا کریں گے لِيَوْمٍ جزاء کے لئے اس دن کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ (جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے) جس کی نظر دلائل پر ہے اس کے لیے اس بارے میں کوئی شک نہیں

ہے یعنی اس میں شک اور ریب کا مقام نہیں ہے اگر خداوند عالم اس طرح فرماتا: جَمَعْنٰاهُمْ فِيْ يَوْمٍ تو یہ جملہ جزا پر دلالت نہ کرتا اس لئے کہ لام جزا پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: جِئْتُهُ لِيَوْمِ الْخَمِيْسِ یعنی میں پنجشنبہ کو جو کچھ ہونے والا ہے اس کے لئے آیا ہے لیکن جملہ جِئْتُهُ فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ: میں جمعہ کے دن آیا، یہ معنیٰ نہیں دیتا ہے۔

ارشاد: وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (اس روز ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: ہر نفس کے لیے جو اس نے ثواب اور عذاب کمایا ہوگا اس کی جزا وافر (مقدار) میں ہوگی۔ (یا پوری جزا دی جائے گی)

دوم: اس نے جو اپنے عمل کے ذریعہ (کمایا اور) حاصل کیا ہوگا اس کا ثواب اور عذاب عطا کیا جائے گا۔ جس طرح کہا جاتا ہے فلاں شخص نے تجارت اور زراعت سے مال کمایا۔

ارشاد الٰہی: وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا) یعنی جس ثواب کے وہ مستحق ہوں گے اس میں کمی نہیں کی جائے گی اور جس عذاب کے وہ حق دار ہوں گے اس میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

❁❁❁❁❁

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

کہو! خدایا مُلک کے مالک تُو جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، حکومت چھین لیتا ہے۔ جسے چاہے عزّت بخشے اور جس کو چاہے ذلت سے دوچار کردے بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۲۶) تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ بے جان میں سے جاندار نکالتا ہے اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (۲۷)

فضیلت آیت:

حضرت جعفر بن محمد علیہما السلام نے اپنے آباء و اجداد کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، آيَةُ الْكُرْسِيِّ، شَهِدَ اللهُ وَ قُلِ اللّٰهُمَّ ..... بِغَيْرِ حِسَابٍ کو نازل کرنا چاہا (یہ سورے) عرش الٰہی پر معلق ہو گئے، ان کے اور اللہ کے مابین کسی طرح کا حجاب نہیں تھا، انھوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: پروردگارا! تو ہمیں مرکز گناہ اور تیری نافرمانی کرنے والوں کے درمیان نازل کر رہا ہے ہم پاکیزہ مقام اور عرش پر معلق (آویزاں) ہیں۔ اللہ نے ارشاد فرمایا: مجھے اپنے عزت وجلال کی قسم کوئی بندہ ہر واجب نماز کے بعد ان کی تلاوت نہیں کرے گا مگر یہ کہ میں اس کو جنت میں جگہ دوں گا جس میں وہ رہے گا اور اس پر ہر دن ستر مرتبہ اپنی نظر (کرم) کروں گا اور ہر دن اس کی ستر (۷۰) حاجتیں پوری کروں گا جن میں سب سے معمولی اور ادنیٰ اس کی بخشش ہے، اس کی ہر دشمن سے حفاظت کروں گا اور دشمن کے مقابلہ میں اس کی نصرت و مدد کروں گا، اسے جنت میں داخل ہونے سے کوئی نہ روک سکے گا یہاں تک کہ اس کی موت آئے۔

معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدار میں نماز جمعہ ادا کرنے سے محروم ہو گیا۔ تو آنحضرتؐ نے مجھ سے فرمایا: معاذ! نماز جمعہ ادا کرنے سے کون سی چیز مانع بنی؟ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یوحنا یہودی کا مجھ پر ایک اوقیہ سونا ہے اور وہ میرے دروازہ پر میری تاک میں بیٹھا تھا، میں ڈرا کہ کہیں مجھے آپ کی خدمت میں آنے سے روک نہ دے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: معاذ! کیا تم چاہتے ہو کہ خدا تمھارا قرض ادا کر دے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! اللہ کے رسولؐ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس طرح پڑھو: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ يَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَ رَحِيْمَهَا تُعْطِيْ مِنْهَا مَا تَشَآءُ وَ تَمْنَعُ مِنْهَا مَا تَشَآءُ اِقْضِ عَنِّيْ دَيْنِيْ (اس کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا) اگر تم پر زمین کے برابر بھی سونا قرض ہو گا خداوند عالم اسے ادائیگی فرما دے گا۔

قرأت:

نافع، حمزہ، کسائی، حفص اور یعقوب نے اَلْمَیِّت کو مشدد پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر تشدید کے اَلْمَیْت قرأت کی ہے۔

حجت:

مبرد نے کہا: علمائے بصرہ کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ میّت اور میت دونوں برابر ہیں شاعر نے ابن رعلاء غسانی کے لئے یہ اشعار کہے:

لَیْسَ مَنْ مَاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَیْتٍ　　اِنَّمَا الْمَیْتُ مَیِّتُ الْاَحْیَاۤءِ

اِنَّمَا الْمَیْتُ مَنْ یَّعِیْشُ کَئِیْبًا　　کَاسِفًا بَالُهٗ قَلِیْلَ الرَّجَاۤءِ

شاعر نے دونوں تلفظ کو جمع کر دیا ہے جو مر چکا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس باب میں دونوں استعمال میں برابر ہیں یعنی دونوں کو میت کہا جاتا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ جو ابھی نہیں مرا ہے اسے میّت (بالتشدید) کہتے ہیں اور جو مر چکا ہے اسے میت (بغیر تشدید) کے کہتے ہیں۔ پہلا قول صحیح ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ ایسا کم وارد ہوا ہے:

وَمَنْهَلٌ فِیْهِ الْغُرَابُ مَیْتٌ　　سَقَیْتُ مِنْهُ الْقَوْمَ وَ اسْتَقَیْتُ

اور ایک چشمہ کہ جس میں ایک مرا کوا تھا میں نے اس چشمہ سے لوگوں کو بھی پانی پلایا اور خود بھی سیراب ہوا) اَلْغُرَابُ مَیْتٌ یعنی کوا مر چکا تھا۔

الفاظ و معانی:

اَلنَّزْع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز سے جدا کرنے اور اکھاڑنے کے ہیں۔

اِیْلَاج کے معنی داخل کرنے کے ہیں۔

ترکیب:

اَللّٰھُمَّ: یَا اللہُ کے معنی میں ہے سیبویہ اور خلیل کے نزدیک میم مشدد یاء کا عوض ہے اس لئے کہ عربوں

کے کلام میں یاء میم کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوگا کہ اَللّٰھُمَّ کے آخر میں میم اول کلمہ میں یاء کی جگہ پر ہے۔ اس کے شروع میں جو ضمہ ہے وہ اسم منادیٰ مفرد کا ضمہ ہے اور میم مفتوحہ ہو گیا ہے اس لئے کہ خود وہ بھی ساکن ہے اور اس سے پہلے والا میم بھی ساکن تھا۔

فراء نے کہا: اَللّٰھُمَّ کی اصل یَا اللهُ اُمَّ بِخَیْرٍ (اے اللہ کہ جس سے خیر کی امید کی جاتی ہے) ہمزہ کو حذف کر کے اس کی حرکت کو ماقبل کو دے دیا گیا۔ اسی کے مانند هَلُمَّ بھی ہے اس کی اصل هَلْ اُمَّ تھی۔

خلیل کے اس قول پر اعتراض کیا گیا ہے کہ فَمٌ اور ابنمٌ جیسے کلمات میں میم کو بغیر تشدید کے بڑھا دیا گیا ہے اور اَللّٰھُمَّ اس لئے کہ یا کے ساتھ جمع ہو گیا ہے شاعر کے اس شعر میں:

وَ مَا عَلَیْكِ اَنْ تَقُوْلِیْ كُلَّمَا سَبَّحْتِ اَوْ صَلَّیْتِ یَا اَللّٰھُمَّا

اُرْدُدْ عَلَیْنَا شَیْخَنَا مُسَلَّمَا

علی بن عیسیٰ نے کہا: ایسا کچھ بھی نہیں ہے اس لئے کہ میم یہاں پر دو حرف کا عوض ہے لہٰذا اسے تشدید دی گئی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: قُمْتُنَّ، ضَرَبْتُنَّ اس لئے ان صیغوں میں نون قُمْتُمُوا یا ضَرَبْتُمُوا کے دو حرف کا عوض ہے۔ شعر میں ضرورت شعری کی بنا پر ایسا کرنا جائز ہے۔ جہاں تک هَلُمَّ کی بات ہے تو خلیل کے نزدیک اس کی اصل یہ ہے کہ اس میں حرف تنبیہ ھاء ہے جو لَمَّ پر داخل ہوا ہے۔

ارشاد الٰہی: مَالِكَ الْمُلْكِ تو زیادہ تر نحوی اس بات کے قائل ہیں کہ مالک منادی مضاف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: مَالِكَ، اَللّٰھُمَّ کی صفت بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ اَللّٰھُمَّ یَا اللهُ کی جگہ پر آیا ہے پس یہ اس جملہ کے مانند ہوگا: یَازَیْدُ ذَا الْجُمَّةِ۔

تُؤْتِی الْمُلْكَ فعل و فاعل ہے حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہیں اس میں عامل حرف ندا اور ذوالحال اَللّٰھُمَّ یا مَالِكَ ہے۔ مَنْ تَشَآءُ مفعول ثانی ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ اَنْ تُؤْتِیَهٗ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ اَنْ تَنْزِعَ مِنْهُ۔ بِیَدِكَ الْخَیْرُ میں باء بھی اسی کے مانند ہے یعنی مبتدا اور خبر مقام حال میں ہے اور اس میں عامل تُؤْتِی، تَنْزِع تُعِزُّ وَ تُذِلُّ ہے اور ذوالحال ان افعال کی ضمیر مستتر ہے (اَنْتَ)

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور اپنی امت سے ملک فارس و روم

کی فتح کا وعدہ کیا تو منافقوں اور یہودیوں نے کہا: محمدؐ کے لیے ملک فارس وروم کیوں کر فتح ہو سکتے ہیں (یہ ان سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے) کہاں محمدؐ اور (کہاں) ملک فارس وروم! کیا ان کے لیے مدینہ اور مکہ کافی نہیں کہ وہ روم اور فارس کی طمع کرنے لگے؟! اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ ابن عباس اور انس بن مالک سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے جنگ احزاب کے موقعہ پر خندق کے لیے نشان مقرر کیا تھا اور ہر دس لوگوں پر چالیس ہاتھ خندق کھودنا تقسیم کیا تھا۔ مہاجرین وانصار نے سلمان فارسی کے سلسلہ میں آپس میں بحث کرنے لگے اس لیے کہ سلمان فارسیؓ تو طاقت ور انسان تھے، مہاجرین نے کہا: سلمان ہم میں سے ہیں اور انصار نے کہا: سلمان ہم سے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ (سلمان ہم اہل بیت سے ہیں)

عمرو بن عوف بیان کرتے ہیں: ہم سلمان وحذیفہ، نعمان بن مقرن مزنی اور چھ عدد انصاری تھے جنھیں چالیس ہاتھ خندق کھودنا تھی چنانچہ ہم نے خندق کھودنا شروع کی یہاں تک کہ ہم ذی ناب تک پہنچے، خندق میں خداوند عالم نے ایک سخت پتھر ظاہر فرمایا جس سے ہمارے اوزار ٹوٹ گئے جو ہم پر نہایت دشوار گزرا تھا۔ ہم نے کہا: اے سلمان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گذارش کرو اور پتھر کا ماجرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرو کہ ہم اس پتھر کی جگہ کو کھودنے کے بجائے دوسری جگہ کھدائی کریں یا ہمیں حضورؐ اس بارے میں کوئی حکم دیتے ہیں؟ ہم حضورؐ کے مقررہ خط سے تجاوز کرنا نہیں چاہتے۔ عبد اللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ سلمانؓ پیغمبرؐ کی خدمت میں خبر لے کر پہنچے اس وقت آپؐ ترکی قبہ میں موجود تھے۔ عرض کیا: اللہ کے رسول! خندق کے درمیان سے سفید پتھر برآمد ہوا ہے جس سے ہمارے اوزار ٹوٹ گئے ہیں، یہ بات ہم پر بہت شاق اور گراں ہے، آپؐ اس بارے میں ہمیں حکم فرمایئے ہم آپؐ کے خط (مقررہ حدود) سے تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے۔ (ابن عباس کہتے ہیں:) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلمانؓ کے ہمراہ خندق میں اترے اور نو (۹) افراد خندق کے دہانے پر تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیلچہ سلمانؓ کے ہاتھ سے لیکر پتھر پر مارا جس سے اس میں شگاف پیدا ہو گیا، اس سے اس طرح کی روشنی اور نور نکلا جیسے تاریک گھر میں چراغ روشن ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر بلند کی جو فتح کی تکبیر تھی۔ مسلمانوں نے بھی تکبیر کا نعرہ بلند کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری بار پتھر پر مارا جس سے پتھر ٹوٹ گیا اور اس سے اس طرح روشنی پھیلی جیسے تاریک گھر میں چراغ روشن کر دیا جائے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر فتح

بلند فرمائی اور مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر تیسری مرتبہ پتھر پر مارا جس سے پتھر مزید ٹوٹ گیا جس سے ایسی روشنی نکلی جیسے تاریک گھر میں چراغ روشن کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر فتح کہی اور مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور ایک بلندی پر گئے۔ سلمان نے آنحضرت سے عرض کی: اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں! میں نے آپ سے وہ چیز دیکھی ایسی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: تم نے دیکھا سلمان نے کیا کہا؟ لوگوں نے عرض کی: ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے پہلی مرتبہ ضرب لگائی جس روشنی کا تم نے مشاہدہ کیا اس سے میرے لیے حیرہ کے قصر اور کسریٰ کے شہر اس طرح روشن ہو گئے جیسے کتے کے (سامنے والے) دانت، پس جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی میری امت اسے فتح کرے گی۔ پھر میں نے دوسری ضرب لگائی جس کی روشنی تم نے مشاہدہ کی، جس سے میرے لیے سرزمین روم کے قصور حمر (سرخ محلات) اس طرح روشن ہو گئے جس طرح کتے کے دانت۔ جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی کہ میری امت اسے فتح کرے گی۔ پھر میں نے تیسری ضرب لگائی اس سے وہی روشنی ظاہر ہوئی جس کا تم نے مشاہدہ کیا جس سے میرے لیے صنعا کے محل اس طرح روشن اور ظاہر ہو گئے جیسے کتے کے دانت۔ جبرئیل نے مجھے خبر دی کہ میری امت اسے فتح کرے گی۔ پس مسلمانو! تمھیں بشارت ہو! مسلمان بھی مسرور اور خوش حال ہو گئے، سب نے کہا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمارے گھر جانے کے بعد نصرت کا سچا وعدہ کیا (یعنی ہم سے نصرت کا کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا)۔ منافقین کہنے لگے: کیا تمھیں تعجب نہیں ہوتا کہ تمھیں امیدیں دلائی جا رہی ہیں اور باطل وعدے کیے جا رہے ہیں اور تمھیں خبر دی گئی ہے کہ یثرب اور حیرہ کے قصور و محلات اور کسریٰ کے شہر دکھائے گئے ہیں کہ وہ تمھارے لیے فتح کیے جائیں گے حال آں کہ تم خندق کھود رہے ہو جس پر تم کامیاب بھی نہیں ہو پا رہے ہو! اس میں کس قدر فرق ہے؟! چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی:

وَاِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا

(سورۂ احزاب، آیت ۱۲؛ یاد کیجیے جب منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سراسر فریب تھا)

خداوند عالم نے اس واقعہ سے متعلق یہ آیت نازل فرمائی: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ... الخ اس کی روایت ثعلبی نے اپنی سند سے عمرو بن عوف سے کی ہے۔

تفسیر:

اللہ ہی مالک الملک ہے

خداوند عالم نے اہل کتاب کی دسیسہ کاریاں اور مکاریاں بیان فرمانے کے بعد اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے جھگڑے، بحث ومباحثہ اور جواب کی کیفیت سے آگاہ فرمادیا، جب وہ سوال کریں تو اس کا (کس طرح) جواب دیں، چنانچہ اللہ نے فرمایا: قُلِ اے محمد! کہہ دیجیے: اَللّٰهُمَّ (خدایا) اے اللہ! مٰلِكَ الْمُلْكِ (مُلک کے مَالِکْ) ہر بادشاہ اور ملک واقتدار کے مالک تیرے علاوہ ہر مالک ہلاک ہونے والا ہے اور ہر مُلک تیرے مُلک واقتدار کے سوا فنا ہونے والا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ بندوں اور جس چیز کے وہ مالک ہیں ان کا مالک۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا و آخرت کے امر کا مالک اور نبوت کا مالک بھی کہا گیا ہے۔ یہ مجاہد وسعید بن جبیر سے مروی ہے۔

ارشادالٰہی: تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ تو جسے چاہتا ہے اقتدار وحکومت عطا کرتا ہے، اس فقرہ میں ایک لفظ محذوف ہے: مَنْ تَشَآءُ اَنْ تُؤْتِيَهٗ: جسے (اقتدار) دینا چاہتا ہے (اسے اقتدار دے دیتا ہے)

وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: خُذْ مَا شِئْتَ وَدَعْ مَا شِئْتَ؛ جو تم چاہو لے لو اور جسے چاہو اسے چھوڑ دو آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس سے تو اقتدار کو ختم کرنا چاہتا ہے اس سے ختم کردیتا ہے جیسے تیری حکمت لازم قرار دیتی ہے اور مصلحت متقاضی ہوتی ہے۔ اس فقرہ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ کے معنی میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے: خدایا! تو حضرت محمدؐ اور آپ کے اصحاب اور آپ کی امت کو حکومت واقتدار اور دنیا کے اسباب عطا کرتا ہے اور صنادید قریش، روم اور فارس سے اقتدار کو چھین کرلیتا ہے۔ قیامت آنے سے قبل مسلمان انھیں فتح کرلیں گے، یہ کلبی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنے بندوں میں جسے تو چاہتا ہے نبوت وامامت عطا کرتا ہے اور اپنی مخلوقات اور اپنے شہروں پر انھیں حق تصرف عطا کرتا ہے (والی بناتا ہے، حکومت واقتدار عطا کرتا ہے) اور ظالموں سے ان کے قہر وظلم کے سبب حکومت واقتدار چھین لیتا ہے اور ان کے ہاتھوں سے اقتدار کا خاتمہ کردیتا ہے۔ اگر کافر و فاسق غلبہ و اقتدار حاصل کرلیں تو یہ اللہ کا عطا کردہ ملک واقتدار نہیں ہوگا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ یہ اللہ کی عطاو بخشش کیوں کر ہوسکتی ہے جبکہ اللہ نے ان کے ہاتھ اقتدار تک نہ پہنچنے اور ان سے

اقتدار کو چھین لینے کا حکم دیا ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ اور تو جسے چاہے ایمان و اطاعت کے سبب کو عزت بخشتا ہے۔وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ اور جس کو چاہے کفر و نافرمانی کے ذریعہ ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدح وثنا اور تعریف کے ذریعہ مومن کو عزت دیتا ہے اور کافر کو جزیہ اور اسیری کے سبب ذلت دیتا ہے۔ کہا گیا ہے: مقتولین بدر کے سبب محمدؐ اور ان کے اصحاب کو عزت دیتا ہے، ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کو ذلت دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ دنیا اور دین میں اپنے اولیاء اور احباب کو جسے چاہتا ہے ہر قسم کی عزت سے نوازتا ہے اور دنیا و آخرت میں اپنے دشمنوں کو جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیا اور دوستداروں کو ذلیل و رسوا نہیں کرتا اگرچہ وہ انھیں فقیری و تنگی میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کرتا ہے۔ یہ انھیں ذلیل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ آخرت میں ان کا احترام کرے گا، انھیں عزت دے گا اور ان کی انتہائی عزت و احترام فرمائے گا۔

بِيَدِكَ الْخَيْرُ (بھلائی تیرے اختیار میں ہے) لام جنس ہے یعنی دنیا و آخرت کے تمام خیر تیری طرف سے ہیں ارشاد الٰہی: بِيَدِكَ الْخَيْرُ (تمام خیر تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت اللہ کی جانب رغبت پیدا کرانے پر مشتمل ہے، اس حالت میں ذکر خیر کے سوا اور کچھ بہتر ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ فقط خیر ہی کی جانب ترغیب کی جاسکتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کہا جائے: اَمْرُ فُلَانٍ بِيَدِ فُلَانٍ؛ معاملہ فلاں (شخص) کے ہاتھ میں ہے۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) یعنی تمام اشیاء پر قادر ہے، کوئی چیز تجھے عاجز و درماندہ نہیں بنا سکتی تو معدوم کے ایجاد کرنے موجود کے فنا کرنے اور موجود تھا سے واپس پلٹانے پر قادر ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے) اس کے معنی میں دو اقوال ہیں:

اول: شب میں کمی کر کے اس کمی کا دن میں اضافہ کر دیتا ہے اور دن سے کم کر کے اس کمی کا شب میں اضافہ کر دیتا ہے، دن کے طولانی اور کمی کم ہونے کی مقدار بھر۔ یہ ابن عباس، حسن، مجاہد اور عام مفسرین سے مروی ہے۔

دوم: ایک کو دوسرے میں داخل کرتا ہے کہ اس کی جگہ پر بدل قرار دیتے ہوئے (یا اس کی جگہ پر

اس کے بدل کو لاکر) یہ ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ (بے جان میں سے جاندار نکالتا ہے) نطفہ سے جو کہ مردہ ہے (زندہ کو پیدا کرتا ہے) جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلیل ہے: وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔

وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے) یعنی نطفہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے جس طرح مرغی کو انڈے سے اور انڈے کو مرغی سے پیدا کرتا ہے۔ یہ ابن عباس، ابن مسعود، مجاہد، قتادہ اور سُدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مومن کو کافر سے نکالتا ہے، کافر کو مومن سے، یہ حسن سے مروی ہے۔ اس بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (اور جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے) یعنی جسے چاہتا ہے بغیر کسی تنگی کے رزق عطا کرتا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: فلاں (شخص) بے حساب خرچ کرتا ہے اس لیے کہ تنگی اور بخل سے خرچ کرنے والے کی عادت فقط حساب سے خرچ کرنے کی ہوتی ہے۔ (یعنی بلا حساب خرچ نہیں کرتا) یہ زجاج نے بیان کیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ نقصان کے خوف کے بغیر ہے جو کچھ اس کے پاس ہے اس لیے کہ اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے جو بھی اس سے لیا جائے گا اس میں کمی نہیں ہوگی، نہ ہی اس کے کسی جز اور حصہ کا حساب ہے کہ یہ اس کا حصہ ہے، جس طرح ہم میں سے کوئی سو میں سے دس دیتا ہے اور ہزار سے دو سو دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ... اس سے مراد اہل جنت ہیں اس لیے کہ نہ تو ان سے کوئی حساب لیا جائے گا، نہ ہی عدد کا شمار کیا جائے گا، (انھیں بلا حد و حساب اور بلا عدد و شمار عطا کرتا ہے) اس اعتبار سے کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے اس کے اپنے اس ارشاد کے مطابق: فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

❁❁❁❁❁

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَّيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

خبردار! مومنین کو چاہیے کہ صاحبانِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بنائیں جو بھی ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مگر یہ کہ تمھیں کفّار سے خوف ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اللہ تمھیں اپنی ذات کا خوف دلاتا ہے اور اللہ ہی کی جانب پلٹ کر جانا ہے۔ (۲۸)

قراءت:

یعقوب اور سہل نے تَقِيَّةً پڑھا ہے اور یہی حسن اور مجاہد کی بھی قرأت ہے۔ باقی قراء نے تُقَاةً پڑھا ہے اور کسائی نے تُقَاةً میں امالہ کیا ہے۔ نافع اور حمزہ نے تفخیم اور امالہ کے درمیان پڑھا ہے اور باقی نے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

تُقَاةً میں حرف استعلاء قاف کی بنا پر تفخیم کرنا زیادہ بہتر ہے اور امالہ بھی جائز ہے تاکہ امالہ یہ بتائے کہ الف یاء سے بدل کر آیا ہے۔ تُقَاة فُعَلَة کے وزن پر ہے جیسے تُؤَدَة او تُخَمَة یہ دونوں اِتَّقٰی کا مصدر ہیں تَقِيَّة، تُقَاة، اِتِّقَاء اور تَقْوٰی اس کی اصل وُقَاء ہے فرق یہ ہے کہ واوٗ مضمومہ کو ثقیل ہونے کی بنا پر تاء سے بدل دیا گیا ہے اس لئے کہ عرب واوٗ پر ضمہ سے ہمزہ یا تاء کی طرف فرار کرتے ہیں۔

تاء کی طرف فرار اس کے لئے ہے کہ وہ واوٗ سے قریب ہے حالانکہ وہ حروف زائدہ میں سے ہے اور ہمزہ کی طرف فرار اس لئے کہ وہ مخارج حروف میں سے ہے۔ آخری حصہ میں ہمزہ واوٗ کا نظیر ہے چاہے وہ اس کے زائدہ ہونے کے حسن کے ساتھ ہو یا نہ ہو۔

تَقِيَّة کے معنیٰ جان کے خوف سے زبان سے ایسی بات ظاہر کرنا جو دل میں موجودات کے خلاف ہو۔

ترکیب:

مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ میں من کے معنی ابتدائے غایت کے ہیں اس تقدیر کی بنا پر لَا تَجۡعَلُوۡا ابۡتِدَاءَ الۡوِلَايَةِ مَكَانًا دُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (مومنین کو چھوڑ کر ابتدائے ولایت کو کسی اور جگہ مت رکھو اس لئے کہ مومن کا مقام و مرتبہ سب سے زیادہ بلند و بالا ہوتا ہے اور کافر کا مقام سب سے پست ہوتا ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں: زَيۡدٌ دُوۡنَكَ (زید تم سے پست ہے) آپ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ زید پست جگہ میں یا یہ کہ وہ بلند جگہ پر ہے۔ بلکہ آپ نے شرف کو بلندی اور پستی وخست کو نیچی جگہ کے مانند قرار دیا ہے۔

فَلَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَيۡءٍ میں مِنَ اللّٰهِ کے مِنۡ کا متعلق محذوف ہے اور وہ حال ہے اور اس میں عامل وہ ہے، جس سے فِيۡ متعلق ہے اس کی تقدیر یہ ہے: فَلَيۡسَ فِيۡ شَيۡءٍ مِنَ اللّٰهِ پس مِنَ اللّٰهِ، شَيۡءٍ کے لئے صفت ہے جب شَيۡءٍ پر مقدم ہو گیا تو حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اَنۡ تَتَّقُوۡا یا تو باء محذوف کی بنا پر محلاً مجرور ہے یا باء کے حذف ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے جیسا کہ اس کے مانند گزر چکا ہے۔

تفسیر:

مومنین کفار کو اپنا دوست نہ بنائیں

جب اللہ سبحانہ نے بیان فرمایا کہ وہ دنیا و آخرت کا مالک ہے، وہ عزت اور ذلت دینے پر قادر ہے، اس نے مومنین کو اپنے دشمنوں جن کے پاس نہ عزت ہے، نہ ہی ذلت کا اختیار، سے دوستی کرنے سے منع فرمایا ہے تاکہ انھیں اللہ اور اس کے اولیا مومنین کے پاس موجود (چیز میں) رغبت پیدا ہو یہ خطاب اس کے دشمن کافروں سے ہے ارشاد فرمایا: لَا يَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ یعنی مومنین کے لیے سزاوار و مناسب نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا سرپرست بنائیں، ان سے طالب امداد ہوں اور ان سے پناہ طلب کریں اور ان سے اظہار محبت کریں جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے، منجملہ: لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ (سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲؛ (اے نبی) آپ کوئی ایسی قوم نہ پائیں گے کہ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو وہ اُن لوگوں سے محبت کرے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں)

ارشاد ہوتا ہے: لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۵۱: اے مومنو! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا معاون و مددگار نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں، پس جو بھی انھیں اپنا سرپرست بنائے گا تو اس کا شمار بھی انھیں میں سے ہوگا۔ بے شک اللہ ایسی قوم کی رہنمائی نہیں کرتا جو ظالم ہو)

ارشاد الٰہی: مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (صاحبان ایمان کو چھوڑ کر) یعنی واجب ہے کہ دوستی مومنین کے ساتھ ہو، یہ مومنین کو کافروں سے محبت، موالات اور ان کی مدد کرنے کی نہی ہے۔ کہا گیا ہے کہ کفار سے لطف و مہربانی سے پیش آنے کی نہی کی گئی ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ اَوْلِيَآءَ وَلِیّ کی جمع ہے اور ولی وہ (انسان) ہے جو اس کے امر کا نگراں اور سرپرست ہوتا ہے جس کے فعل سے راضی ہوتا ہے، مدد اور نصرت کے ذریعہ جو دو صورتوں میں جاری ہوتی ہے:

اول: نصرت کے ذریعہ مددگار۔

دوم: مُعَان یعنی جس کی مدد کی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی اللہ اپنی نصرت کے ذریعہ ان کا مددگار ہے۔ کہا جاتا ہے: اَلْمُؤْمِنُ وَلِیُّ اللّٰهِ یعنی اللہ کی نصرت کے ذریعہ اس کی مدد ہوئی ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ (جو بھی ایسا کرے گا) یعنی جو بھی مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست اور اولیا قرار دے گا فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ (اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) یعنی وہ اولیائے الٰہی میں سے نہیں ہے، اللہ اس سے بری الذمہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا اللہ کی ولایت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ دین خدا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر استثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (مگر یہ کہ تمھیں کفّار سے خوف ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے) یعنی کفار غالب ہوں اور مومنین مغلوب ہوں اور مومن کو کافروں سے موافقت کا اظہار نہ کرنے اور ان سے حسن معاشرت نہ کرنے میں کسی طرح کا خوف لاحق ہو تو ایسے موقع پر اپنا دفاع کرتے ہوئے ان سے زبانی اظہار محبت کرنا اور تقیہ کے عنوان سے اظہار مدارات کرنا اس کا عقیدہ رکھے بغیر جائز ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جان کے خوف سے دین میں تقیہ جائز ہے۔ ہمارے علمانے بیان کیا ہے کہ تقیہ وقت ضرورت تمام حالات میں جائز ہے اور کبھی تقیہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔ لطف و مہربانی اور طلب اصلاح کی غرض سے مومن کے قتل میں تقیہ کا جواز نہیں ہے۔ نہ ہی افعال میں جائز ہے اس لیے کہ یا تو علم

رکھتا ہے یا ظن غالب رکھتا ہے کہ ایسا کرنے میں دین کی بربادی ہے۔ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں: کبھی تقیہ واجب ہوتا ہے اور وہ فریضہ بن جاتا ہے اور کبھی جائز ہوتا ہے واجب نہیں ہوتا اور کبھی تقیہ کرنا تقیہ نہ کرنے سے افضل ہوتا ہے، کبھی تقیہ نہ کرنا افضل ہوتا ہے اور اگر تقیہ کرنے والے معذور اور معفوعنہ (قابل معافی) ہو تو اس کی ملامت و سرزنش نہ کر کے اس کو برتری دی جائے گی۔ شیخ ابو جعفر طوسیؒ فرماتے ہیں: ظاہر روایات اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ جان پر خوف سے تقیہ واجب ہے اور اس کے نزدیک اظہار حق کے جواز میں رخصت (چھوٹ) کی روایت کی گئی ہے۔ حسن نے روایت کی ہے کہ مسیلمہ کذاب نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو اصحاب کو گرفتار کر کے ایک سے کہا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا: ہاں! پھر اس نے کہا: کیا تم گواہی دیتے ہو میں اللہ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا: ہاں، پھر اس نے دوسرے کو بلا کر کہا کیا: تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا: ہاں! پھر اس نے کہا: تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا: میں گونگا ہوں۔ اسی طرح سے (مسیلمہ کذاب نے) تین مرتبہ کہا، جواب میں اس نے تینوں مرتبہ وہی پہلا فقرہ دہرایا۔ مسیلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ پیغمبرؐ کی خدمت میں جب یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: وہ مقتول صداقت و یقین کی راہ پر گامزن رہا، اس نے اپنا فضل و شرف حاصل کیا، اسے مبارک ہو! لیکن دوسرا شخص اس نے اللہ کی چھوٹ سے استفادہ کیا اس پر کوئی تاوان نہیں ہے۔ اس اعتبار سے تقیہ میں چھوٹ ہے اور اظہار حق میں فضیلت ہے۔

ارشاد: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ اور اللہ تمھیں اپنی ذات کا خوف دلاتا ہے۔ اللہ نے اِيَّاهُ کی جگہ نَفْسَهٗ قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست بنانے پر اللہ تمھیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور تمام گناہوں سے ڈراتا ہے۔ اس نے نَفْسَه (اپنی ذات) کا ذکر فرمایا ہے تاکہ اضافت محقق و ثابت ہو جائے جس طرح کہا جاتا ہے: اِحْذَرِ الْاَسَدَ (شیر سے ڈرو) یعنی اس کے حملہ اور پھاڑ کھانے سے ڈرو نہ کہ خود شیر سے۔

ارشاد: وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (اور اللہ ہی کی جانب پلٹ کر جانا ہے) یعنی اللہ کی جزا کی طرف بازگشت ہے۔ اس کے حکم کی طرف بازگشت کے لیے بھی کہا گیا ہے۔

❁❁❁❁❁

قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ یَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۹﴾

(اے نبی) لوگوں کو آگاہ کردو! کہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے خواہ تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا تو بہرحال اسے جانتا ہے۔ زمین وآسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور اس کا اقتدار ہر چیز پر قائم ہے۔ (۲۹)

الفاظ ومعانی:

اَلصَّدۡر (سینہ مشہور ہے) یہ ہر چیز کا بلند اور مقدم (سامنے کا) حصہ ہے۔

اَلصَّدَر: سیراب ہو کر گھاٹ سے پلٹنا۔

اَلتَّصۡدِیۡر: مرد کی شمشیر کا اس کے سینہ کی طرف مائل ہونا۔

اَلصِّدَار بُقَیۡرَۃ سے مشابہ ہوتی ہے۔ بُقَیۡرَۃ: عورتوں کی بغیر آستین والی قمیص یہ چھوٹی ہوتی ہے جو سینہ اور سامنے کے حصہ کو ڈھانپ لیتی ہے۔

ترکیب:

یَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ مجزوم ہے اس لئے کہ جواب شرط ہے۔ اگرچہ خداوند عالم جانتا ہے چاہے ہو یا نہ ہو اور اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم اس کے ہونے کو جانتا ہے اور اس کے وجود میں آنے سے پہلے اسے عالم کہنا صحیح نہیں ہے اور یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰت میں یَعۡلَمُ کا مرفوع ہونا استیناف (نئے جملہ) کی بنا پر ہے۔

تفسیر:

اللہ سب کچھ جانتا ہے

خدا نے کفار کو سرپرست واولیاء قرار دینے کی نہی کے بعد اس کو پوشیدہ رکھنے سے ڈرایا ہے جو کہ اظہار کے خلاف ہے ان چیزوں میں جن سے نہی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قُلۡ اے محمد! (لوگوں کو آگاہ کردو کہ!) اِنۡ تُخۡفُوۡا اگر تم پوشیدہ رکھو اور چھپاؤ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے۔ صَدۡر (سینہ) کا

ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ وہ قلب کا مقام و محل ہے۔ اَوْ تُبْدُوْهُ یا اسے ظاہر کرو یَعْلَمْهُ اللّٰهُ (خدا تو بہر حال اسے جانتا ہے) اس کا پوشیدہ رکھنا اور چھپانا تمھارے لیے نفع بخش نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (وہ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں) یہ اس لیے فرمایا تا کہ وہ تفصیلی طور پر اپنے معلومات کی یاد دہانی کرائے تا کہ ڈرایا جانا مکمل ہو جائے کہ جب وہ (اللہ) آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو تفصیلی طور پر جانتا اور ان سے تو واقف ہے، ضمیر (اور قلب) کی بات کو بھی جانتا ہے۔

ارشاد: وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اور اس کا اقتدار ہر چیز پر قائم ہے) اللہ تمھاری گرفت کرنے اور تمھیں سزا دینے پر قادر ہے۔

❀❀❀❀❀

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

وہ دن آنے والا ہے جس دن ہر شخص اپنے کیے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی۔ اس روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور برے کاموں کے درمیان طویل فاصلہ ہو جاتا اور اللہ تمھیں اپنی ذات کا خوف دلاتا ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ (۳۰)

الفاظ و معانی:

اَلْاَمَدُ کے معنی غایت اور انجام کے ہیں جس طرف انتہا ہوتی ہے۔

ترکیب:

يَوْمَ کے منصوب ہونے کی چند وجہیں ہیں:

۱۔ يُحَذِّرُكُمْ کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ يَوْمَ تَجِدُ...

۲۔ اَلْمَصِيْرُ کی بنا پر منصوب ہے اس کی تقدیر یہ ہے: اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ يَوْمَ تَجِدُ...

۳۔اُذْکُرْ یَوْمَ تَجِدُ (اذکر محذوف کا مفعول بہ ہے)

مَا عَمِلَتْ یہاں پر مَا، اَلَّذِیْ کے معنیٰ میں ہے اس لئے کہ اس میں تَجِدُ نے عمل کیا ہے اور وہ محلاً منصوب ہے۔ایک احتمال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ مَا اپنے مابعد کے ساتھ مصدر کے معنیٰ میں ہو تو اس کی تقدیر یہ ہوگی: یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ عَمَلَهَا۔یعنی جس دن ہر کوئی اپنے عمل کی جزاء پائے گا۔مُحْضَرًا، تَجِدُ کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔اگر آپ نے تَجِدُ کو وِجْدَان سے مشتق قرار دیا ہے اور اگر آپ نے اسے عَلِمَ کے معنیٰ میں مانا ہے تو مُحْضَرًا مفعول دوم ہے۔

وَ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ اس فقرہ میں مَا، اَلَّذِیْ کے معنیٰ میں بھی ہوسکتا ہے اور اس احتمال کو یَوَدُّ مرفوع قوی بناتا ہے اور اگر یہاں پر مَا شرطیہ کے معنیٰ میں ہوتا تو وہ مفتوح یا مکسور ہوتا۔رفع دینا جائز تو ہوتا مگر کمزور ہوتا۔

میں (شیخ طبرسی) کہتا ہوں: یہاں پر لَوْ کا جواب محذوف ہے۔

اور تقدیر کلام یہ ہے: تَوَدُّ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗ اَمَدًا بَعِیْدًا لَوْ ثَبَتَ ذٰلِكَ (اگر یہ ثابت ہوجائے تو وہ آرزو کرے گا کہ اس کے اور اس کے برے عمل کے درمیان طولانی مدت (فاصلہ) ہوتی) اس لئے کہ لَوْ فعل کا تقاضا کرتا ہے اور وہ اسم پر داخل نہیں ہوتا ہے اور اَنَّ اپنے اسم وخبر کے ساتھ مصدر کے مقام میں ہے۔ پس تقدیر یہ ہوگی: لَوْ ثَبَتَ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗ اَمَدًا بَعِیْدًا ایسی صورت میں لَوْ کے بعد فعل مقدر کے فاعل کو ذکر کرنے میں تَوَدُّ کے مفعول محذوف پر دلالت ہے۔لفظ تَوَدُّ میں لَوْ کے جواب پر دلالت ہے۔یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے لئے ابھی پیش آئی ہیں اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ بِحَمْدِ اللّٰهِ واضح ہیں۔

تفسیر:

تجسم اور حضور اعمال

اللہ نے گذشتہ آیت میں اپنے عذاب سے خوف دلا کر عذاب کا وقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا (وہ دن آنے والا ہے جس دن ہر شخص دنیا میں اپنے کیے خیر واطاعت کا پھل پائے گا) اس کی نظیر اس کا یہ ارشاد ہے: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (سورۂ کہف، آیت ۴۹؛ سب اپنے اعمال کو بالکل حاضر پائیں گے) اور عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ (سورۂ تکویر،

آیت ۱۴: تب ہر نفس کو معلوم ہوگا کہ اس نے کیا حاضر کیا ہے) عمل کے حاضر ہونے کی کیفیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔کہا گیا ہے کہ (ہر نفس) اچھائی اور برائی کے صحیفے نامۂ اعمال پائے گا، یہ ابو مسلم وغیرہ سے مروی ہے۔اسی قول کو قاضی نے اختیار کیا ہے۔کہا گیا ہے کہ نفس اپنے عمل کے ثواب وعذاب کی جزا دیکھے گا البتہ لوگوں کے اعمال اعراض ہیں جو باطل ہوجاتے ہیں (یعنی شکل عمل باطل ہوجاتی ہے، نتیجۂ عمل نیکی ہو یا بدی باقی رہتا ہے) جن کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔جن کا موجود نظر آنا ناممکنات سے ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ (یا برائی کی ہو) یعنی ہر نفس جس نے نافرمانی اور گناہ کیا ہے وہ اسے حاضر وموجود پائے گا۔

ارشاد: تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗ (اس روز انسان تمنّا کرے گا کہ کاش اس کے اور برے کاموں یعنی گناہوں کے درمیان) "اَمَدًا بَعِیْدًا" طویل فاصلہ ہوتا یعنی (نفس) خواہش وتمنا کرے گا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہوتا۔کہا گیا ہے کہ اس کے معنی دور کی جگہ کے ہیں۔یہ سُدی سے مروی ہے۔کہا گیا ہے کہ مشرق اور مغرب کا درمیانی فاصلہ مراد ہے، یہ مقاتل سے مروی ہے۔

ارشاد الٰہی: وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (اور اللہ تمھیں اپنی ذات کا خوف دلاتا ہے) اس کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے۔وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے) یعنی ان پر رحم کرنے والا ہے، یہ حسن نے بیان کیا ہے۔لوگوں پر اللہ کی مکمل مہربانی یہ ہے کہ اس نے انھیں اپنی نافرمانی کے عذاب سے ڈرایا ہے۔

❁❁❁❁❁

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

(اے پیغمبر) کہہ دیجیے اگر تم اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری پیروی کرو تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور وہ تمھارے تمام گناہوں سے درگزر کردے گا، اللہ تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔(۳۱) کہہ دیجیے تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پس اگر تم نے روگردانی کی تو اللہ کافروں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔(۳۲)

الفاظ و معانی:

اَلْمَحَبَّۃ یعنی ارادہ ہے۔ البتہ کبھی یہ ارادہ مراد (مقصود) سے وابستہ ہوتا ہے اور کبھی مراد سے متعلق شے سے وابستہ ہوتا ہے، آپ کہتے ہیں: اُحِبُّ زَیْدًا وَ اُحِبُّ اِکْرَامَ زَیْدٍ؛ میں زید سے محبت کرتا ہوں اور میں زید کے احترام سے محبت کرتا ہوں، لیکن آپ ارادہ میں ایسا نہیں کہتے ہیں۔ آپ اُرِیْدُ اِکْرَامَ زَیْدٍ تو کہتے ہیں لیکن اُرِیْدُ زَیْدًا انہیں کہتے ہیں اور ایسا اس لئے ہے کہ محبت طبیعت کے میلان کے مقام میں بہت قوی اثر پیدا کرتی ہے جو شہوت کے مانند ہوتی ہے لہٰذا اضافت میں اس کے ساتھ وہی طریقہ اپنایا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا بندے سے محبت کرنا اس کا بندے کے ثواب کا ارادہ ہے اور بندے کا اللہ سے محبت کرنا اس کے فرامین کی اطاعت کا ارادہ ہے۔

طَاعَۃ یعنی بلانے والے کا ان باتوں میں اتباع کرنا جن کی طرف وہ حکم یا ارادہ کے ذریعہ بلا رہا ہے اسی لئے کبھی کبھی انسان شیطان کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے ان باتوں میں جن کی طرف وہ بلاتا ہے۔ اگرچہ انسان اس کی اطاعت کا ارادہ اور قصد نہیں کرتا ہے اس لئے کہ جب وہ اپنے اندر معصیت کی طرف دعوت ماننا ہے تو اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے پس وہ معصیت کی بلانے والے کی اطاعت کر لیتا ہے۔

شان نزول:

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے یہ دونوں آیتیں نصاریٰ نجران کے بارے میں اس وقت نازل ہوئیں جب انھوں نے کہا کہ ہم عیسیٰؑ کی تعظیم اللہ کی محبت میں کرتے ہیں۔

تفسیر:

محبت خدا اور اتباع رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پھر خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ اس پر ایمان لانا اس وقت تک نفع بخش اور مفید ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے رسول پر ایمان نہ رکھا جائے۔ ارشاد فرمایا: قُلْ (اے محمد! کہہ دیجیے) اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ (اگر تم اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو) جیسا کہ تمھارا خیال ہے کہ تم اللہ سے محبت کرتے ہو

فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَیَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ (تو میری پیروی کرو تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور وہ تمھارے تمام گناہوں سے درگزر کر دے گا) بیان کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں اگر تم دین خدا سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میرے دین کا اتباع کرو، تمھاری محبت میں اضافہ کیا جائے گا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے دعوائے محبت میں سچے ہو تو میرا اتباع کرو، اگر تم نے ایسا کیا اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمھیں بخش دے گا۔

وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ اللہ بہت زیادہ بخشنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ اے محمد! آپ کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ذریعہ اپنے دعوے کے سچ ہونے پر دلیل پیش کرو، یہی اتباع و اطاعت تمھارے دعوے کی صداقت کی علامت ونشانی ہے۔

ارشاد: فَاِنۡ تَوَلَّوۡا اگر تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے روگردانی کی تو فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡكٰفِرِیۡنَ (اللہ کافروں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا) یعنی اللہ ان سے نفرت کرتا ہے (ان پر ناراض اور غضب ناک ہوتا ہے) ان کے لیے ثواب نہیں چاہتا، خدا نفی کے ذریعہ اثبات پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ طریقہ نہایت بلیغ ہے اس لیے کہ اگر اس طرح کہتا کہ یُبۡغِضُهُمۡ تو اس بات کا گمان دینا ممکن تھا کہ ان سے نفرت کسی اور وجہ سے کرتا ہے اور محبت کسی دوسری وجہ سے کرتا ہے۔ جس طرح ممکن ہے کسی چیز کو ایک وجہ سے جانتا ہے اور کسی دوسری وجہ سے نہیں جانتا۔

اس آیت میں مجبرہ کے عقیدہ کے بطلان پر دلیل ہے، اس لیے کہ جب اللہ کافروں سے ان کے کفر کے باعث محبت نہیں کرتا تو اسی وجہ سے ان کا ثواب نہیں چاہتا، اسی طرح ان سے کفر بھی نہیں چاہتا اس لیے کہ اگر ان سے کفر چاہتا تو ان سے ان کے کفر کے سبب محبت کی نفی نہ کرتا۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾

یقیناً اللہ نے چن لیا ہے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے، (۳۳) جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے اور اللہ ہر بات کو سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ (۳۴)

الفاظ و معانی:

اِلْاِصْطِفَاء، اِخْتِيَار اور اِجْتِبَاء ایک جیسے ہیں۔ اِصْطِفَاء باب افتعال سے مصدر صَفْوَة سے ہے۔ یہ بہترین بیان ہے جس کے معلوم کی مثال نظر آنے والی چیز سے دی گئی ہے چونکہ اَلصَّافِي ہر طرح کے تکدر اور گدلے پن سے پاک چیز ہوتی ہے جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ سبحانہ نے اس قوم انبیاء علیہم السلام کے برائیوں سے خالص اور پاک ہونے کی مثال ان کے ہر قسم کی کثافت (گناہوں کی آلودگی) سے پاک صاف ہونے سے دی ہے۔

اَلْاٰل کے معنی ہم ارشاد الٰہی: وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ کے موقع پر بیان کر چکے ہیں۔

ذُرِّيَّة کے معنی اور اس کی اصل ارشاد: مِنْ ذُرِّيَّتِي کے موقعہ پر بیان کر چکے ہیں۔

ترکیب:

ذُرِّيَّةً کے منصوب ہونے کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ حال ہے اور اس میں عامل اِصْطَفٰى ہے

۲۔ اِصْطَفٰى کے مفعول کا بدل ہے

تفسیر:

انبیاء کا امتیاز

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى یعنی یقیناً اللہ نے منتخب کیا چن لیا آدَمَ وَ نُوحًا (آدم، نوح) کو اپنی نبوت کے

لیے۔ وَآلَ إِبْرٰهِيمَ وَآلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ اور (آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر) یعنی ان کے اپنے زمانے کے عالمین پر کہ ان میں سے انبیاء قرار دیئے۔ کہا گیا ہے کہ ان کے دین کو منتخب فرمایا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ فراء سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ انھیں ان دوسروں پر ان امور جلیلہ میں سے نبوت وغیرہ کے ذریعہ فضیلت میں منتخب کیا جن امور کو اللہ نے مخلوقات کی مصلحتوں کے لیے مرتب ومعین کیا تھا۔ کہا گیا ہے کہ آدمؑ کو منتخب فرمایا کہ انھیں کسی واسطہ کے بغیر خلق فرمایا، انھیں جنت میں سکونت بخشی، فرشتوں سے سجدہ کروایا، انھیں فرشتوں اور انسانوں کی طرف بھیجا، نوحؑ کو نبوت کے ذریعہ منتخب کیا، انھیں طول عمر اور دعا کی قبولیت عطا کی، ان کی قوم کو غرق کر دیا اور کشتی کے ذریعہ انھیں نجات بخشی۔ ابراہیمؑ کو خلت کے ذریعہ منتخب فرمایا، ان کے لیے آتش نمرود کو سرد کر دیا اور نمرود کو ہلاک کر دیا۔

وَآلَ إِبْرٰهِيمَ وَآلَ عِمْرٰنَ کہا گیا ہے کہ اس سے خود ابراہیم اور عمران مراد ہیں چنانچہ اس کا ارشاد ہے: وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسٰى وَآلُ هٰرُونَ یعنی موسیٰ و ہارون۔ کہا گیا ہے کہ آل ابراہیم جناب ابراہیمؑ کی اولاد اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اسباط ہیں جن میں داؤد و سلیمان و یونس و زکریا، یحییٰ و عیسیٰ اور ان میں ہمارے پیغمبرؐ ہیں جو جناب اسماعیلؑ کی اولاد سے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل ابراہیم آپ کے دین سے وابستہ مومنین ہیں جو کہ دین اسلام ہے۔ یہ ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔ البتہ آل عمران کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح آل ابراہیمؑ سے ہیں جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ (یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے، جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے) وہ جناب موسیٰؑ، جناب ہارونؑ، عمران کے فرزند تھے وہ عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب تھے۔ کہا گیا ہے کہ آل عمران سے جناب مریمؑ و جناب عیسیٰؑ مراد ہیں اور یہ عمران بن ہشم بن امون جناب سلیمانؑ بن داؤدؑ کی اولاد ہیں اور وہ مریمؑ کے باپ ہیں اس لیے کہ مرد کی آل و اولاد اس کے اہلبیت ہیں جن کی جانب اسے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ حسن اور وہب سے مروی ہے۔ اہل بیت علیہم السلام کی قرأت میں اس طرح ہے: آل محمد کا عالمین پر انتخاب کیا گیا۔

اسی طرح لوگوں نے بیان کیا ہے کہ آل ابراہیمؑ ہی آل محمدؐ ہیں جو محمدؐ کے اہل (بیت) ہیں۔ واجب و لازم ہے کہ یہی وہ افراد ہوں کہ جنھیں اللہ نے منتخب کیا ہے جو مطہر و معصوم اور ہر طرح کی برائی سے پاک وصاف ہیں؛ اس لیے کہ خداوند عالم منتخب نہیں فرمائے گا مگر ہی ایسے افراد کو اور طہارت وعصمت میں جن کا ظاہر ان کے باطن جیسا ہو۔ پس اس بنیاد پر اصطفا اور انتخاب آل ابراہیمؑ اور آل عمران کے معصومین سے مخصوص ہے چاہے

نبی ہوں یا امام۔

کہا جاتا ہے کہ اصطفاء اور انتخاب کی دو قسمیں ہیں:

اول: اللہ نے انھیں اپنے لیے اصطفا کیا یعنی اپنے لیے خالص بنایا جو اسی سے مخصوص ہے۔

دوم: انھیں دوسروں پر اصطفا اور انتخاب کیا یعنی انھیں دوسروں پر برتری دینے میں مخصوص کیا ہے اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں فضیلت میں کس طرح مخصوص فرمایا ان کے عمل سے قبل؟! اس کا جواب یہ ہے کہ جب معلوم ہے کہ مکلفین کی اصلاح ان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تو ان کے متعلق پہلے سے بشارت اور ان کے حسن اخلاق وافعال اعلیٰ صفات کی خبریں لوگوں تک پہونچانا ضروری تھیں تاکہ ان کی جانب لوگوں کو تشویق ہو جیسا کہ ان حضرات کی جلالت قدر اور ان کی پاکیزہ دوستی کی خبریں تھیں تاکہ لوگوں کو انھیں قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور ان کی قیادت وسرپرستی تسلیم کرلیں۔

اس آیت میں انبیاء کی تمام ملائکہ پر افضلیت کی دلیل موجود ہے اس لیے کہ عالمین ملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور تمام مخلوقات کو شامل ہے اللہ سبحانہ نے انبیا علیہم السلام کو فضیلت عطا کی ہے اور انھیں ہر ایک پر منتخب کیا ہے۔

ذُرِّيَّةً یعنی اولاد اور بعد والی پشتیں (نسلیں) جو بعض بعض سے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات دین میں ایک دوسرے کے مددگار رہیں وہ اسلام ہے یعنی بعض کا دین بعض سے ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ منافقین اور منافقات بعض بعض سے ہیں یعنی ایک دوسرے کی گمراہی پر امداد کرنے اور پشت پناہی کرنے میں۔ یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تناسل اور توالد (ایک دوسرے کی نسل اور اولاد) میں بعض بعض سے ہیں اس لیے کہ سب ذریت آدمؑ ہیں۔ پھر ذریت نوحؑ ہے اس کے بعد ذریت ابراہیمؑ ہے۔ اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے اس لیے کہ حضرت نے ارشاد فرمایا ہے اللہ نے ان کا اصطفا کیا بعض کا بعض کی نسل سے۔ اسی قول کو ابو علی الجبائی نے اختیار کیا ہے۔

ارشاد الٰہی: **وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ** (اور اللہ ہر بات کو سنتا اور سب کچھ جانتا ہے) اس بارے میں دو اقوال ہیں:

اول: یعنی اللہ اس چیز کا سننے والا ہے جو ذریت کہتی ہے اور جاننے والا ہے ان باتوں کا جن کو وہ

پوشیدہ رکھتی ہے اسی لیے انھیں دوسروں پر فضیلت عطا کی ہے چونکہ ان کے اقوال و افعال کی استقامت (راستی) کے متعلق معلوم ہے۔

دوم: اللہ سننے والا ہے اس بات کا جسے زوجۂ عمران نے نذر کے بارے میں کہی تھی اللہ اسے بھی جانتا ہے جس بات کو انھوں نے (دل میں) پوشیدہ رکھا تھا۔ اس طرح خداوند عالم نے زوجہ عمران کے عمل کو قابل تعریف بتانے کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب جناب ابراہیمؑ و جناب عیسیٰؑ کے سلسلہ میں تنازعہ اور جھگڑا ہوا اور نصاریٰ و یہود کی باتیں دونوں کے حضرات متعلق مختلف ہوگئیں تو خداوند عالم نے وضاحت فرمائی کہ جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان حضرات کے بارے میں وہی کہے گا جو رسول کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا اور مشرکین نے اس کا انکار کیا تو خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ جس طرح اس نے رسالت کے لیے اپنے پیغمبرؐ کا اصطفاء و انتخاب کیا ہے اسی طرح ان سے پہلے والے انبیاء کا بھی انتخاب کیا ہے لہٰذا ان لوگوں کے پیغمبر کی رسالت کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۳۶﴾

اس وقت کو یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا کہ میرے پروردگار میں اس بچّے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہو گا۔ میری اس پیشکش کو قبول فرمالے بے شک تو ہر ایک کی سننے والا اور ہر بات کو

جاننے والا ہے۔(۳۵) پھر اس کے بعد جب ولادت ہوئی تو اس نے کہا : میرے مالک میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی۔اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔خیر میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔(۳۶)

قرأت:

ابن عامر، ابو بکر نے عاصم سے اور یعقوب نے بِمَا وَضَعْتُ تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت علی علیہ السلام سے بھی اس کی روایت کی گئی ہے اور باقی قراء نے وَضَعَتْ بر بنائے حکایت (واحد مؤنث غائب) پڑھا ہے۔

حجت:

جن حضرات نے تاء کے ضمہ کے ساتھ وَضَعْتُ پڑھا ہے انہوں نے اسے مادر مریم کا جملہ قرار دیا ہے اور جنہوں نے تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے خدا کا ارشاد قرار دیا ہے۔جنہوں نے تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ان کے قول کی تقویت یہ جملہ کر رہا ہے: وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ اگر یہ جملہ مادر مریم کا جملہ ہوتا تو وہ اس طرح بیان کرتیں: وَاَنْتَ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتُ اس لئے کہ وہ خدا سے مخاطب تھیں۔

الفاظ و معانی:

لغت میں مُحَرَّر کے معنی میں دو باتوں کا امکان ہے:

۱۔ آزاد کرنے والا۔

۲۔ کتاب تحریر کرنا۔(دستاویز لکھنا) کہا جاتا ہے کہ حَرَّرْتُ الْكِتَابَ تَحْرِيْراً یعنی میں نے کتاب کو غلطیوں سے پاک صاف کیا اور اس کی اصلاح کی۔

اَلتَّقَبُّل : کسی چیز کا رضا مندی کے ساتھ حاصل کرنا جیسے ہدیہ قبول کرنا۔ اَلتَّقَبُّل کی اصل المقابلة ہے۔

اَلْوَضْع کی اصل اَلْحَطّ (اترنا، نازل ہونا اور چھوڑنا) ہے۔ وَضَعَتِ الْمَرْاَۃُ الْوَلَدَ (عورت نے بچہ جنا) مَوْضِع: رکھنے کی جگہ۔ ضَعَۃ یعنی خساست وپستی اس لئے کہ انسان کی قدر و قیمت کو گرا دیتی ہے۔ اِیْضَاعٌ فِی السَّیْر یعنی آہستہ چلنا اس لئے کہ یہ تیزی سے چلنے کو کم کرتا ہے۔

ترکیب:

اِذْ قَالَتْ کے محل اعراب کے بارے میں چند اقوال ہیں:

۱۔ اُذْکُرْ کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ اخفش اور مبرد کا قول ہے۔

۲۔ یہ اِصْطَفٰی آلَ عِمْرَانَ سے متعلق ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

۳۔ یہ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ کے متعلق ہے پس اس میں عامل ان دونوں کے صفتوں کے معنیٰ میں ہے اس کی تقدیر یہ ہے: وَاللّٰہُ یُدْرِكُ قَوْلَهَا وَنِيَّتَهَا اِذْ قَالَتْ۔ یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے۔

۴۔ اِذْ زائدہ ہے اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ اہل بصرہ کے نزدیک یہ قول غلط اور خطا ہے۔

مُحَرَّرًا، ما کا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور تقدیر یہ ہے: نَذَرْتُ لَكَ الَّذِیْ فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا اس میں عامل نَذَرْتُ ہے۔ اُنْثٰی بربنائے حال منصوب ہے۔

تفسیر:

حضرت مریمؑ کی ولادت

خداوند عالم نے آل عمران کے اصطفاء وانتخاب کا ذکر کرنے کے فوراً بعد ہی مریم بنت عمران کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ (اس وقت کو یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا) اس بارے میں گفتگو سابق میں گذر چکی ہے، زوجۂ عمران کا نام حنہ تھا، عیسیٰؑ کی جدہ (نانی) تھیں، یہ دو بہنیں تھیں جن میں سے ایک عمران بن ہشم کے یہاں تھیں جو سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عمران بن ماثان ہیں۔ یہ ابن عباس ومقاتل سے مروی ہے۔ یہ عمران جناب موسیٰؑ کے باپ نہیں ہیں دونوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو برس کا فاصلہ ہے۔ بنو ماثان بنی اسرائیل کے سردار تھے، دوسری بہن جناب زکریا

کی زوجیت میں تھیں جن کا نام اشیاع تھا، باپ کا نام قاقود بن قبیل تھا، اس طرح یحییٰ و مریم خالہ زاد بھائی تھے۔

رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ (کہ میرے پروردگار میں اس بچّے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں) یعنی میں نے تیرے لیے فرض قرار دیا ہے کہ میں اپنے شکم میں موجود (بچہ) کو قرار دوں۔ مُحَرَّرًا (وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا) بیعہ (عبادت خانہ) کا خدمت گذار ہوگا جو سارے عبادت گذاروں کی خدمت کرے گا۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ عبادت کے لیے آزاد قرار دے جو اس کے لیے مخلص ہو۔ یہ شعبی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ خالص و آزاد قرار دے تیری اطاعت کے لیے جسے میں اپنے منافع کے لیے استعمال نہ کروں نہ ہی اپنی ضروریات میں اس کا استعمال کروں۔ یہ محمد بن جعفر بن زبیر سے مروی ہے۔ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب کوئی آزاد کرنے والا کسی کو آزاد کرتا تھا تو اسے کنیسہ کے حوالے کر دیتا تھا جو وہاں رہتا تھا جھاڑو اور صفائی کرتا اور وہاں کے خدمات انجام دیتا تھا اور بالغ ہونے تک اسی کام میں مصروف رہتا پھر اسے اختیار ہوتا تھا اگر اسے وہاں رہنا پسند ہوتا تو وہیں پر رہتا اور جانا پسند ہوتا تو جہاں چاہتا وہاں چلا جاتا۔ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حنہ کے یہاں ولادت نہیں ہو رہی تھی لہٰذا انھوں نے دعا کی یہاں تک کہ وہ یائسہ ہوگئیں، ایک مرتبہ وہ درخت کے نیچے بیٹھی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو دانہ بھرا رہا ہے تو اولاد ان کے دل میں بھی اولاد کی چاہت پیدا ہوئی چنانچہ انھوں نے دعا کی کہ اللہ انھیں اولاد عطا فرمائے چنانچہ وہ مریم کے حمل سے حاملہ ہوئیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم نے عمران پر وحی فرمائی تھی کہ میں تمھیں مبارک فرزند عطا کروں گا جو حکم خدا سے نابینا اور مبروص لوگوں کو شفا دے گا اور حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا۔ میں اسے بنی اسرائیل کے لیے رسول قرار دوں گا۔ عمران نے اپنی زوجہ حنہ یعنی مادر مریم سے اس بشارت کا تذکرہ کیا، جب وہ حضرت مریم کے حمل سے حاملہ ہوئیں تو انھوں نے کہا: پروردگار! میں نے جو میرے شکم میں ہے اس کی تیرے لیے نذر کی ہے۔

فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ (میری اس پیشکش کو قبول فرمالے) یعنی میری نذر کو قبول فرما اپنی خوشنودی کے ساتھ۔

اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ (بے شک تو ہر ایک کی سننے والا) جو میں نے کہا تو اس کا سننے والا ہے۔ اَلۡعَلِیۡمُ (اور ہر بات کو جاننے والا ہے) جس کی میں نے نیت کی اس کا تو جاننے والا ہے لہٰذا یہ بھروسہ اور اطمینان میرے لئے صحیح ہے۔

ارشادِ الٰہی: فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا (پھر اس کے بعد جب ولادت ہوئی) کہا گیا ہے کہ عمران کا انتقال ہو چکا

تھا اس وقت وہ حاملہ تھیں، اس کے بعد جناب مریمؑ کی ولادت ہوئی چونکہ حنہ کو امید تھی کہ ان کے یہاں فرزند پیدا ہوگا لیکن جب انھوں نے مریم کو جنا تو وہ شرمندہ اور پشیمان ہوئیں قَالَتۡ تو انھوں نے شرمندگی کی حالت میں سر جھکا کر کہا: رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰی (میرے مالک میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے) اس میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: اس جملہ کے ذریعہ نذر سے عدول (واپسی) پر معذرت مراد ہے اس لیے کہ مریم دختر تھیں۔

دوم: مراد یہ ہے کہ جب مادر مریم نے مریم کے لئے دعا کرنے کا ارادہ کیا تو پہلے یہ کہا کہ یہ تو بیٹی ہے اس لئے کہ کوشش کمزور اور عقل ناقص ہوتی ہے۔ لہٰذا مریم کے ذکر کو مقدم کیا تا کہ وَاِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِكَ کے ذریعہ دعا میں ان کا مقصد صحیح ہو۔

وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ یعنی خداوند عالم خبر دے رہا ہے کہ وہ ان کے پیدا کرنے کے بارے میں بخوبی واقف ہے اس لیے کہ اسی نے انھیں خلق کیا ہے اور ان کی صورت گری فرمائی ہے۔ دوسری قرأت کی بنا پر یہ معنیٰ ہوں گے کہ: وَ اَنۡتَ یَا رَبِّ اَعۡلَمُ مِنِّیۡ بِمَا وَضَعۡتُ پروردگار تو بخوبی جانتا ہے کہ جو کچھ میں نے جنا ہے وَلَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی (اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا) اس لیے کہ مؤنث میں وہ خوبی اور صلاحیت نہیں ہوتی جو مذکر میں ہوتی ہے، ان لوگوں کا بیت المقدس کی خدمت کے لیے بیٹے کی نذر جائز تھی دختر کی نہیں، چونکہ مردوں کے لیے بیت المقدس کی خدمت گذاری لڑکوں کے لیے جائز تھی دختر کے لیے نہیں (یا انھیں خدمت گذاری کے لیے وقف کرنا) اس لیے کہ جو چیز لڑکوں کے لیے مناسب اور بہتر تھی وہ دختر کے لیے بہتر نہیں تھی (یا جو صلاحیت و خوبی لڑکوں میں ہوتی ہے دختر میں نہیں ہوتی) اس لیے کہ لڑکی کو حیض و نفاس عارض ہوتے ہیں اور لوگوں کے سامنے (بے حجاب) ہونے سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ قتادہ نے کہا: تحریر (بیت المقدس کی خدمت کے لیے نذر) فقط لڑکوں میں ہوا کرتی تھی جس کا رواج ہو چکا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ مادر مریم کا مقصد تھا یہ کہ عام طور پر فرزند دختر سے افضل ہوتے ہیں اور بہت سے کاموں کے لیے بھی مناسب ہوتے ہیں۔ جملہ: وَضَعۡتُهَا میں هَا ان کے قول: مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مَا سے کنایہ ہے اور یہ استعمال جائز ہے اس لئے کہ ما مؤنث کے لئے بولا گیا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ معلوم سے کنایہ ہو جس پر یہ جملہ دلالت کر رہا ہے۔

وَاِنِّیۡ سَمَّیۡتُهَا مَرۡیَمَ یعنی میں نے اس کا نام مریم رکھا مَرۡیَمَ لفظ مریم ان کی زبان میں عابدہ اور خادمہ کے معنی میں ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ جناب مریم اپنے زمانہ کی عورتوں کی سب سے بافضیلت اور

صاحب جلالت خاتون تھیں۔ ثعلبی نے اپنی سند سے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمھارے لیے عالمین کی خواتین میں سے چار کافی ہیں: مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون، خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمدؐ۔

وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (اور میں اس کو اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں) مادرِ مریم پر خوف طاری ہو گیا جو کسی مصیبت اور پریشانی کے وقت عورتوں پر غالب آجاتا ہے، اس لیے انھوں نے یہ دعا کی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شیطانی حملہ سے انھوں نے پناہ چاہی اس چیز سے جو ان کے پہلو میں تھی جس سے بچے کی چیخ پکار کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ نے مریم اور ان کے فرزند کی حجاب کے ذریعہ حفاظت فرمائی۔

ابوہریرہ سے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو فرزند بھی پیدا ہوتا ہے ولادت کے وقت شیطان اسے مس کرتا ہے اور وہ شیطان کے مس کرنے سے چیختا چلاتا ہے سوائے مریم اور ان کے فرزند عیسیٰؑ کے۔ کہا گیا ہے کہ مادر مریم نے مریم کو شیطان رجیم کے گمراہ کرنے سے پناہ چاہی۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

❀❀❀❀❀

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَكِ هٰذَا ۚ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

آخر کار اس کے رَبّ نے اس لڑکی کو بخوشی قبول کر لیا اور اس کی پرورش نہایت اچھے انداز میں کی اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا۔ زکریا جب بھی اس کے پاس محراب میں جاتے اس کے پاس رزق دیکھتے تو پوچھتے: اے مریم! یہ تمھارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ وہ جواب دیتیں: یہ سب کچھ اللہ کے پاس سے آیا ہے بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رِزق عطا کرتا ہے۔ (۳۷)

قرأت:

اہل کوفہ نے کَفَّلَهَا کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی نے بغیر تشدید کے۔ اہل کوفہ نے سوائے ابوبکر کے لفظ زکریا کو مقصور (الف مقصورہ) کے ساتھ اور باقی نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ زکریاء کو مد کے ساتھ صرف ابوبکر نے نصب دیا ہے اور دیگر قراء نے رفع دیا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: بغیر تشدید کے کَفَلَهَا پڑھنے والے کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے کہ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ۔ لفظ زَكَرِيَّا مرفوع ہے اس لئے کفالت آپ کی جانب منسوب ہے اور اور جن لوگوں نے کَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کی نظر میں کَفَّلَهَا کی ضمیر فاعل (هُوَ) فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا میں رَبٌّ کی جانب پلٹ رہی ہے اور کَفَّلَ پڑھنے کے بعد زَكَرِيَّا مفعول دوم ہے بن جائے گا۔

زَكَرِيَّا کا ممدود اور مقصور ہونا یہ دو تلفظ ہیں۔

الفاظ و معانی:

فقہ میں مَكْفُوْلٌ عَنْهُ وہ شخص ہے جس پر قرض ہو۔ مَكْفُوْلٌ لَهٗ وہ شخص ہے جس کا قرض ہو۔ مَكْفُوْلٌ بِهٖ قرض ہے۔ كَفِيْل وہ (شخص) ہے جس پر قرض ثابت ہو۔

اَلْمِحْرَاب مسجد میں امام جماعت کی جگہ۔ مسجد کو بھی محراب کہتے ہیں۔ اسی سے مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ ہے یعنی مساجد اور کہا گیا ہے کہ مِحْرَاب، اَلْحَرْب (جنگ) سے مشتق ہے چونکہ مِحْرَابٌ میں شیطان سے جنگ کی جاتی ہے۔

تفسیر:

جناب مریمؑ کی کفالت

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا آخر کار اس کے رَبّ نے اس کے لڑکی ہونے کے باوجود) اس کو قبول کر لیا اور اس سے راضی ہو گیا اس نذر میں جسے حنہ نے بیت المقدس کی عبادت کے لئے کیا تھا۔ اس سے قبل دختر کو اس مقصد

کے لئے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے رب نے ان کی تربیت اور ان کے امور کی انجام دہی میں ان کی ذمہ داری لی اور کفالت کی۔ یہ حسن سے مروی ہے اور اللہ نے ان کی اس زحمت اور تکلیف کو قبول کر لیا جس کے متعلق وہ شب و روز فکر مند تھیں۔ بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ (بخوشی) اس فقرہ کی اصل بِتَقَبُّلٍ حَسَنٍ ہے لیکن اسے فَتَقَبَّلَهَا قَبُوۡلًا حَسَنًا پر حمل کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں نیک لوگوں کی راہ پر گامزن کیا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

وَاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (اور اس کی پرورش نہایت اچھے انداز میں کی) یعنی ان کی نشوونما کو اچھا اور بہتر قرار دیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کی خلقت کو درست فرمایا: وہ ایک دن میں اس قدر بڑھتی تھیں جتنا دوسرے بچے ایک برس میں بڑھتے ہیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کے رزق اور غذا میں نشوونما کی یہاں تک کہ وہ مکمل بالغ عورت ہو گئیں۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ ابن عباس نے کہا: جب مریم کا سن نو برس کا ہو گیا تو وہ دن میں روزہ رکھتیں اور شب عبادت میں بسر کرتیں اور دنیا سے بے تعلق ہو گئیں یہاں تک کہ احبار پر غالب آ گئیں۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا) لفظ كَفَّلَ تشدید کے ساتھ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مریم کو زکریا کے ذمہ میں دے دیا (سپرد کر دیا) یعنی زکریا کو مریم کا کفیل و نگراں بنا دیا جو مریم کے امور انجام دیتے تھے اور كَفَلَ بغیر تشدید کے معنی یہ ہیں کہ زکریا نے مریم کو خود سے وابستہ کر لیا اور ان کے امور کی انجام دہی کے ضامن ہو گئے (ان کا امر انجام دینے لگے)

علماء نے بیان کیا ہے کہ جناب مریم کی ماں انھیں کپڑے میں لپیٹ کر مسجد لے کر آئیں اور کہنے لگیں: یہ نذر شدہ ہے اسے لے لو۔ مریم کے بارے میں احبار کے درمیان مقابلہ شروع ہو گیا اس لیے کہ مریم ان کے امام اور اللہ سے قربت رکھنے والے بندہ کی بیٹی تھیں۔ زکریا نے ان لوگوں سے کہا: میں مریم پر زیادہ حق رکھتا ہوں اس لیے کہ مریم کی خالہ میری زوجہ ہیں۔ احبار نے کہا: اگر انھیں سب سے زیادہ حق دار انسان کے لیے چھوڑا جائے تو ان کی ماں کے لیے چھوڑ دیا جائے جس نے انھیں جنا ہے، لیکن ہم اس سلسلہ میں قرعہ اندازی کرتے ہیں جس کے نام قرعہ نکلے گا وہ اسی کی کفالت قرار پائیں گی۔ چنانچہ انتیس (۲۹) افراد جاری نہر کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے اپنے قلم پانی میں ڈالے تمام لوگوں کے قلم پانی میں ڈوب گئے لیکن زکریا کا قلم پانی اوپر ہی رہا۔ یہ ابن اسحاق اور ایک جماعت سے مروی ہے اور بیان کیا گیا ہے زکریا کا قلم ثابت

رہااور پانی کے اوپر رہااور دوسروں کے قلم پانی میں ڈوب گئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جناب زکریاؑ کا قلم ثابت رہا اور پانی پر اس طرح کھڑا رہا جیسے مٹی میں کھڑا ہو اور دوسروں کے قلم پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ گئے۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ جناب زکریاؑ احبار کے سردار اور ان کے پیغمبر تھے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا زکریا سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے تھے۔ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جس وقت زکریا نے مریم کو خود سے وابستہ کرلیا تو ان کے لیے ایک گھر بنایا اور ان کی رضاعت کا انتظام کیا۔ محمد بن اسحاق نے کہا ہے: جناب مریمؑ ان کی خالہ مادر یحییٰ کے ساتھ رہنے کے لیے چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب وہ جوان ہو گئیں تو مسجد میں ان کے لیے محراب بنادی جس کا دروازہ اس کے درمیان میں قرار دیا جس تک سیڑھی کے بغیر نہیں پہونچا جا سکتا تھا۔ کعبہ کے دروازہ کے مانند جہاں زکریا کے سوا کوئی نہیں جاتا تھا جو ہر روز ان کے لیے کھانے پینے کا سامان اور روغن وغیرہ لے کر جاتے تھے۔

ارشاد: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا (زکریا جب بھی اس کے پاس محراب میں جاتے اس کے پاس رزق دیکھتے) یعنی زکریا مریم کے پاس بے موسم کے پھل یعنی موسم گرما کے میوے سردی میں اور موسم سرما کے میوے گرمی میں تر و تازہ پاتے تھے۔ یہ ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور سُدی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ انھوں نے ہرگز دودھ نہیں پیا، ان کا رزق جنت سے آتا تھا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا (تو پوچھتے اے مریم! یہ تمھارے پاس کہاں سے آیا ہے؟) یعنی جناب زکریاؑ جناب مریمؑ سے کہتے تھے کہ یہ سب تمھارے پاس کس طرح اور کہاں سے آئے ہیں؟ یہ ان سے تعجب کے انداز میں کہتے تھے۔ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (وہ جواب دیتیں: یہ سب کچھ اللہ کے پاس سے آیا ہے) یعنی جنت سے آئے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کا احترام تھا اگرچہ یہ امر خارق العادۃ تھا، ہمارے نزدیک خارق العادۃ آیات (نشانیوں) کا ظہور غیر انبیا میں اولیا و برگزیدہ حضرات کے لیے جائز و ممکن ہے اور معتزلہ میں سے جس نے اسے نہیں مانا ہے انھوں نے کہا ہے کہ اس میں دو اقوال ہیں:

اول: یہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی تاسیس (بنیاد گذاری) کے لیے ہے۔ یہ بلخی سے مروی ہے۔

دوم: یہ زکریا کی مریم کے لیے اجمالی طور پر رزق کی دعا کی وجہ سے تھا جو جناب زکریاؑ کا معجزہ ہے۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

ارشادالٰہی: اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ (بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے) اس کی تفسیر سابق میں گذر چکی ہے۔

نظم:

آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ حضرت مریم کے اس فقرہ کی حکایت وترجمانی ہے: بِغَيۡرِ حِسَابٍ یعنی عمل پر استحقاق کے ہوں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اپنی مخلوق میں جس سے چاہتا ہے اس سے آغاز کرتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کی طرف سے ازسرنو خبر دینا ہو۔

❁❁❁❁❁

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۳۹﴾

اس جگہ زکریاؑ نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے پروردگار! مجھے اپنی طرف سے ایک پاک و پاکیزہ اولاد عطا فرما کہ تو ہر ایک کی دعا کو سننے والا ہے۔(۳۸) تو جواب میں ملائکہ نے انھیں آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے کہ اے زکریا! اللہ تمھیں یحییٰ کی بشارت دے رہا ہے جو اللہ کی جانب سے ہر آنے والے کلمے کی تصدیق کرے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی وہ پاکیزہ کردار ہوگا نبوّت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا۔(۳۹)

قرأت:

عاصم کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے فَنَادَاهُ الۡمَلَائِكَةُ مذکر اور امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فَنَادَتۡهُ مؤنث پڑھا ہے۔ ابن عامر اور حمزہ نے اِنَّ اللّٰهَ میں اِنَّ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ اَنَّ پڑھا ہے۔

حمزہ اور کسائی نے يَبْشُرُكَ یاء کو فتحہ کے ساتھ اور بغیر تشدید کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کو ضمہ اور تشدید کے ساتھ يُبَشِّرُكَ پڑھا ہے۔

حجت:

جنہوں نے فَنَادَتْهُ تاء کے ساتھ قرأت کی ہے تو انہوں نے یہاں پر لفظ جَمَاعَةٌ کو فرض کیا ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: هِيَ الرِّجَالُ (یعنی هِيَ جَمَاعَةُ الرِّجَالِ) اور جنہوں نے فَنَادَاهُ پڑھا ہے تو انہوں نے معنی کے لحاظ سے پڑھا ہے۔

جنہوں نے أن کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تو ان کے نزدیک مراد یہ ہے کہ فَنَادَتْهُ بِأَنَّ اللهَ، جار کو حذف کر کے فعل کو اس سے ملا دیا ہے اور محلا منصوب قرار دیا ہے محلا مجرور کے سلسلے میں خلیل کے قول پر قیاس کرتے ہوئے اور جس نے إِنَّ کے ہمزہ کو کسرہ دیا ہے اس نے اس سے پہلے قَالَتْ کو پوشیدہ مانا ہے گویا اس نے اس طرح فرض کیا ہے: فَنَادَتْهُ فَقَالَتْ: إِنَّ اللهَ پھر قَالَتْ کو حذف کر دیا جس طرح اس آیت میں جس نے کسرہ دیا ہے تو قَالَ کو حذف کر دیا ہے: فَدَعَا رَبَّهُ اَنِّي مَغْلُوبٌ قول (اور اس کے مشتقات) کو پوشیدہ ماننا بہت زیادہ رائج ہے۔

يَبْشُرُكَ کو ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ يَبْشُرُكَ اور يُبَشِّرُكَ دونوں ایک ہیں۔

زجاج نے کہا: بَشَرَ يَبْشُرُكَ سے مشتق ہے یعنی خوش ہوا۔ ان سب کی اصل ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ خوشی کے وقت انسان کا کھال پھیل جاتی ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْهِبَة: کسی چیز کا قیمت کے بغیر مالک بنانا۔ (یا بلا قیمت کسی کی ملکیت میں دے دینا ہے)

سَيِّد کو سَوَادُ الشَّخص سے مشتق ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: سَيِّدُ الْقَوْمِ یعنی سواد اعظم کا مالک اور یہ وہ شخص جس کی اطاعت اس کے مالک کے لئے واجب ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے اضافت یا قید کے ساتھ استعمال کیا جائے اگر مطلق طور پر استعمال کیا جائے تو فقط اللہ ہی کے لیے جائز ہوگا۔

اَلْحَصُوْر: وہ انسان جو جماع سے ممنوع قرار دیا گیا ہو حصور اس آدمی کو بھی کہا گیا ہے جو اپنے ساتھیوں

کے ساتھ کوئی نفقہ دینے سے منع کرے۔

ترکیب:

هُنَالِكَ اس میں اصل اس کا ظرف مکان ہونا ہے جیسے رَأَيْتُهٗ هُنَا ۔هُنَا، هُنَاكَ وَ هُنَالِكَ میں فرق یہ ہے کہ هُنَا نزدیکی کو بیان کرنے کے لئے هُنَالِكَ دوری کو بیان کرنے کے لئے اور هُنَاكَ دونوں کے درمیان حال کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے مِنْ هَا هُنَا ۔ میں نے کہا: كَذَا يَعْنِي مِنْ هٰذَا الْوَجْه (اس طرح سے) اس میں اشارہ کے معنیٰ ہیں جیسے آپ کا یہ کہنا: ذَا، ذَاكَ۔ هُنَالِكَ میں تعریف میں تاکید کی خاطر لام کر دیا گیا ہے اور اسے کسرہ دیا گیا ہے التقائے ساکنین کی بنا پر جس طرح ذٰلِكَ میں لام کو کسرہ دیا گیا ہے۔

لفظ لَدُنْ مبنی ہے اور عِنْدَ مبنی نہیں ہے اگر چہ لَدُنْ کے معنیٰ میں ہے اس لئے کہ وہ حروف میں ابہام کے مانند وہم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اَيْنَ کے جواب میں نہیں آتا ہے جس طرح عِنْدَ آتا ہے جیسے اَيْنَ زَيْدٌ؟ جواب دیا جاتا ہے: عِنْدَكَ۔ لَدُنْكَ نہیں کہا جاتا ہے۔

وَهُوَ قَائِمٌ جملہ حالیہ ہے اور نَادَتْهُ میں ھاء کے لئے حال ہے۔

يُصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ یہ بھی جملہ حالیہ ہے اور وہ قَائِمٌ میں مستتر ضمیر هُوَ کے لئے حال ہے۔

مُصَدِّقاً منصوب ہے اس لئے کہ بِيَحْيٰى کے لئے حال ہے۔

مِنَ الصَّالِحِيْنَ یہاں پر مِنْ صفت کی تبیین و وضاحت کے لئے ہے مراد تبعیض نہیں ہے اس لئے کہ نبی صرف صالح ہی ہوسکتا ہے۔

تفسیر:

جناب یحییٰؑ کی بشارت

هُنَالِكَ (اس جگہ) جب زکریا نے عادت کے برعکس موسم گرما کے میوے سردی میں اور موسم سرما کے میوے گرمی میں دیکھے ' تو دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ (زکریّا نے اپنے رَبّ سے دعا کی) قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (کہ اے پروردگار! مجھے اپنی طرف سے ایک پاک و پاکیزہ اولاد عطا فرما) یعنی انھیں

بانجھ (عورت) میں جاری عادت کے برخلاف فرزند کی ولادت کی طمع وخواہش پیدا ہوئی چنانچہ انھوں نے دعا کی طَيِّبَةً یعنی مبارک۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے: طَيِّبَةً یعنی صالح اور جس کا عمل پاک صاف ہو۔ طَيِّبَةً کی لفظ مؤنث بیان کی گئی ہے جبکہ انھوں نے لڑکے کی دعا کی تھی۔ تو یہاں پر لفظ ذُرِّيَّة کی خاطر لفظ 'طَيِّبَةً' لائے ہیں۔

اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (کہ تو ہر ایک کی دعا کو سننے والا ہے) یعنی دعا قبول کرنے والا اور اسے مستجاب کرنے والا ہے سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ بھی اسی معنی میں ہے یعنی اللہ نے اس کی دعا قبول کی۔ قبول کرنے والے کو سامع (سننے والا) کہا گیا ہے اس لیے کہ جو اس بات کا اہل ہے کہ اس کی بات سنی جائے تو وہ اس بات کا بھی اہل ہے کہ اس کی بات قبول کی جائے اور جس شخص کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اس کی بات سن سنی باتوں کے مانند ہوتی ہے۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ (تو جواب میں ملائکہ نے انھیں آواز دی) کہا گیا ہے کہ انھیں جبرئیلؑ نے آواز دی تھی۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ اس قول کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے پاس آواز آئی، جس طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کشتیوں میں سوار ہوا جبکہ وہ ایک ہی کشتی میں سوار ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آواز ملائکہ کی طرف سے آئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں ملائکہ کی ایک جماعت نے آواز دی تھی۔

وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ (جب کہ وہ محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے) یعنی مسجد میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ کہا گیا ہے کہ مسجد کی محراب میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے۔

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى (کہ اے زکریا! اللہ تمھیں یحییٰ کی بشارت دے رہا ہے) خداوند عالم نے جناب یحییٰؑ کی ولادت سے قبل ان کا یہ نام رکھ دیا تھا، اس بات میں اختلاف ہے کہ ان کا نام یحییٰ کیوں رکھا گیا۔ تو بیان کیا گیا ہے کہ چونکہ اللہ نے ان کے ذریعہ ان کی والدہ کے بانجھ پن کو زندگی دی (بانجھ پن کو دور کر دیا) یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے انھیں ایمان کے سبب حیات دی تھی۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ اللہ نے ان کے قلب کو نبوت کے ذریعہ حیات دی تھی، ان سے قبل کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا گیا۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (جو اللہ کی جانب سے ہر آنے والے کلمے کی تصدیق کرے گا۔) یعنی عیسیٰؑ کی تصدیق کرے گا۔ اس پر تمام مفسرین اور اہل تاویل کا اتفاق ہے سوائے اس قول کے جس کی حکایت ابو عبیدہ سے کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا ہے: کتاب الٰہی کی تصدیق کرے گا۔ جس طرح لوگ کہتے ہیں: اَنْشَدَتُ

كَلِمَةَ فُلَانٍ یعنی قَصِيْدَتَهٗ وَاِنْ طَالَتْ؛ میں نے فلاں کا کلمہ یعنی اس کا قصیدہ پڑھا یا پیش کیا اگرچہ وہ طولانی تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے کلمۃ اللہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بغیر باپ کے کلام الٰہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَلِمَةُ اللّٰهِ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان سے اسی طرح ہدایت حاصل کرتے ہیں جس طرح کلام الٰہی سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہا گیا ہے کہ لوگ اپنی دینداری میں ان سے اسی طرح زندگی حاصل کرتے ہیں جس طرح اپنی ارواح سے زندہ رہتے ہیں۔ جناب یحییٰؑ جناب عیسیٰؑ سے چھ ماہ بڑے تھے، انھیں جناب عیسیٰؑ کی تصدیق کی ذمہ داری دی گئی تھی پس جناب یحییٰؑ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان کی تصدیق کی گئی اور گواہی دی گئی کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں۔ یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے اور ان کے اظہار امر کا قوی ترین سبب ہے، اس لیے کہ لوگ یحییٰ کے قول کو ان کی معرفت وصداقت وزہد کے سبب قبول کرتے تھے۔

وَسَيِّدًا (اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی) علم وعبادت میں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ حلم وتقویٰ اور حسن اخلاق میں سید و سردار ہیں۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کے نزدیک صاحب عزت ہیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ فقیہ و عالم ہیں۔ یہ سعید بن مسیب سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کے مطیع ہیں۔ یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ لائق اطاعت ہیں۔ یہ خلیل سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مومنین پر بسبب ریاست سردار ہیں۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ یہ تمام (اقوال) کی بازگشت ایک اصل کی جانب ہے اور وہ یہ کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام ملکیت اور تدبیر کے اہل ہیں جن پر ان کی اطاعت واجب ہے اس وجہ سے کہ وہ ان حالات میں ہیں۔

وَحَصُوْرًا (وہ پاکیزہ کردار ہوگا) وہ انسان ہے جو عورتوں سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ ابن عباس، ابن مسعود، حسن اور قتادہ سے مروی ہے اور یہی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلْحَصُوْر وہ ہے جو لہو ولعب اور لغو و باطل (باتوں) میں داخل نہیں ہوتا۔ یہ مبرد سے مروی ہے۔ عِنِّيْن (مقطوع الذکر) کے معنی میں بھی ہے۔ یہ ابن مسیب اور ضحاک سے مروی ہے۔ یہ چیز انبیا کے لیے جائز نہیں ہے چونکہ یہ عیب (ونقص) اور قابل مذمت بات ہے اور کلام مدح کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد: وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (نبوّت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا) صاحب شرف

رسول جملہ انبیا میں بلند مرتبہ والے ہیں اس لیے کہ تمام انبیاء صالحین ہیں۔

اس آیت میں اس امر پر دلالت ہے کہ جناب زکریاؑ نے فرزند کی خواہش وتمنا اس وقت کی جب انھوں نے معجزات کا مشاہدہ کیا باوجودیکہ وہ جانتے تھے کہ خداوند عالم بانجھ (عورت) سے فرزند پیدا کرنے پر قادر ہے ممکن تھا بعض تدبیر کے سبب ایسا نہ کرتا۔ چنانچہ جب انھوں نے خلاف عادت بے موسم کے پھل اور میوے دیکھے تو ان کا ظن وگمان قوی ہوگیا کہ اللہ ایسا کرے گا، اگر مصلحت مقتضی ہوگی جیسا کہ ابراہیمؑ جانتے تھے کہ اللہ مردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے چنانچہ انھوں نے دیکھنے کا سوال کیا تاکہ ان کی معرفت مزید مستحکم ہوجائے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ فرزند صالح بندے پر نعمت خدا ہے اسی لیے جناب زکریاؑ کو فرزند کی بشارت دی ہے۔

❁❁❁❁❁

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾
زکریا نے کہا: پروردگارا! بھلا میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جب کہ مجھ پر بڑھاپا آگیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ جواب ملا ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔(۴۰)

الفاظ ومعانی:

اَلْعَاقِرِ مردوں میں وہ شخص جس کے یہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی ہو اور عَاقِرِ عورتوں میں وہ عورت جو بانجھ ہو۔

تفسیر:

جناب زکریاؑ کا تعجب

قَالَ (زکریا نے کہا) رَبِّ (پروردگار!) اللہ سے کہا نہ کہ جبرئیل سے اَنّٰى يَكُوْنُ یعنی کہاں سے ہوگا؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کس طرح ہوگا؟ لِىْ غُلٰمٌ (میرے یہاں لڑکا) وَقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ یعنی میں سن رسیدہ اور بوڑھا ہوچکا ہوں آپ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ کبر (بڑھاپا) انسان کے طلبگار کے مانند ہوتا ہے

وہ اس میں پیدا ہو کر اس تک پہنچتا ہے اسی طرح انسان پر بھی برس گذرنے کے ساتھ بڑھاپا آتا ہے۔ اگر آپ بَلَغَنِیَ الْبَلَدُ' کو بَلَغْتُ الْبَلَدَ کے معنیٰ میں کہیں کہ میں شہر پہنچ گیا تو اور مراد لیں کہ شہر آپ تک پہنچا تو یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ شہر آپ کے پاس بالکل نہیں آسکتا۔ ابن عباس نے کہا ہے: جس روز جناب زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت دی گئی آپؑ کا سن ایک سو بیس (۱۲۰) برس تھا اور ان کی زوجہ اٹھانویں (۹۸) برس کی تھیں۔

وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ (اور میری بیوی بانجھ ہے) یعنی عقیم (بانجھ) ہے، اولاد پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر کہا جائے کہ جناب زکریاؑ نے یہ بات کیوں کہی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے جبکہ اللہ نے ان کی دعا کے بعد انھیں بشارت دے دی تھی کہ انھیں پاکیزہ ذریت عطا فرمائے گا۔ تو کہا گیا ہے کہ انھوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی تاکہ فرزند کے حاصل ہونے کی کیفیت معلوم کر سکیں کہ آیا ان دونوں کو اسی بڑھاپے کے عالم میں عطا کرے گا یا انھیں جوانی کی طرف پلٹا کر فرزند عطا کرے گا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ ان پر یہ معاملہ مشتبہ ہو گیا ہو کہ خدا انھیں اسی بوڑھی عورت سے فرزند عطا کرے گا یا کسی دوسری جوان عورت سے؟

قَالَ (جواب ملا) (اللہ نے ارشاد فرمایا) كَذٰلِكَ (ایسا ہی ہوگا) جس کی تقدیر یہ ہے: كَذٰلِكَ الْاَمْرُ الَّذِیْ اَنْتُمَا عَلَیْهِ وَ عَلٰی تِلْكَ الْحَالِ یعنی معاملہ اسی طرح ہے جس پر تم دونوں ہو اور جس حالت میں بھی ہو۔ اَللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے) اللہ تمھیں تمھاری (اسی) زوجہ سے فرزند عطا فرمائے گا، اس پر یہ بات بہت آسان ہے جس طرح اس نے تم دونوں کو وجود بخشا جبکہ تم کچھ نہیں تھے، خداوند عالم قادر ہے جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ زکریا نے یہ بات اللہ کی قدرت کو عظیم قرار دیتے ہوئے اور اس چیز سے تعجب کرتے ہوئے کہی جو انسان کو عظیم آیت (نشانی) کے ظہور پر حاصل ہوتا ہے جس طرح کوئی شخص کسی کی سخاوت پر تعجب کرتے ہوئے اس طرح کہے کہ تمھارے نفس نے ہاتھوں سے تمھارے ہی اس قدر نفیس مال کے نکالنے پر کس طرح اجازت دے دی؟ بیان کیا گیا ہے کہ یہ بات انھوں نے تعجب کے سبب کہی تھی کہ خداوند عالم کس طرح ان کی مراد قبول فرمائے گا (یا جواب دے گا) جس کی انھوں نے دعا کی تھی اور وہ کیونکر اس کے مستحق قرار پائیں گے؟ جس کا یہ گمان ہے کہ جناب زکریاؑ نے یہ بات شیطانی وسوسہ کے سبب کہی تھی جو ان کے قلب میں پیدا ہوا تھا یا انھیں خیال پیدا ہوا تھا کہ آواز ملائکہ کی آواز نہیں تھی تو اس نے غلطی کی ہے اس لیے کہ انبیا کے لیے فرشتہ اور شیطانی وسوسہ کے درمیان فرق کا جاننا ضروری ہے، انبیا سے شیطان کھیل نہیں سکتا یہاں تک کہ ان پر سمجھنے کی راہ خلط ملط اور مشتبہ ہو جائے۔

❀❀❀❀❀

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

انھوں نے عرض کی: اے مالک میرے لیے قبولیت دعا کی کوئی نشانی مقرّر فرما دے ارشاد ہوا نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشاروں کے علاوہ کوئی بات نہ کرسکو گے دیکھو اِس دوران اپنے پروردگار کا ذکر کثرت سے کرتے رہنا اور صبح وشام اسی کی تسبیح میں مصروف رہنا۔(۴۱)

ترکیب:

آیَة کے وزن کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

۱۔فَعَلَة کے وزن پر ہے مگر یہ عین میں اعلال کے لحاظ سے رہ گیا ہے باوجودیکہ لام حرف علت ہے اور اس طرح کے اسم میں قاعدہ لام میں اعلال ہونا ہے۔جیسے حَیَاة نَوَاة اسی کے مانند رَایَة، غَایَة اور طَایَة ہیں۔

۲۔فَعْلَة کے وزن پر ہے اور آیَة کی تقدیر اَیَّیَة ہے البتہ مضاعف کے ناپسندیدہ ہونے کی بنا پر یاء کو بدل دیا گیا ہے جیسے: طَیّ سے طَائی۔

۳۔فَاعَلَة کے وزن پر اسم منقوص ہے۔

علی بن عیسیٰ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے اس لئے کہ آیَة کی تصغیر اُیَیَّہ آتی ہے۔اگر وہ فَاعَلَة کے وزن پر ہوتی ہے تو علماء اُوَیِّیَة کہتے۔ہاں مصغر میں ترخیم کی بنا پر یہ قول صحیح ہوسکتا ہے۔جیسے فُطَیْمَة (فَاطِمَة کا مصغر اور مرخم ہے)

رَمْز کے معنیٰ ہونٹوں سے اشارہ کے ہیں اور یہ لفظ بھنوں، آنکھوں اور ہاتھ سے اشارہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔حالانکہ پہلا قول راجح واغلب ہے۔جوبة بن مابد نے کہا:

كَانَ تَكَلُّمُ الْاَبْطَالِ رَمْزًا　　وَ غَمْغَمَةٌ لَّهُمْ مِثْلَ الْهَرِيْرِ

اَلْعَشِیّ مجاہد کے قول کے مطابق زوال شمس سے غروب آفتاب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اَلْعِشَاء : غروب آفتاب سے لے کر رات کے ابتدائی حصہ کے ختم ہونے تک کو کہا جاتا ہے۔

الْعَشَاءُ رات کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔ الْعَشَا الف مقصورہ کے ساتھ، بینائی کی کمزوری کے معنیٰ میں ہے حالانکہ اس کے حقیقی معنی تاریکی کے ہیں۔

اِبْکَار: طلوع آفتاب سے لے کر چاشت کے وقت تک کو کہا جاتا ہے حالانکہ اس کے حقیقی معنی کسی کام میں جلدی کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اَبْکَرَ بُکُوْراً اور اسی سے اَلْبَاکُوْرَۃ بھی ہے۔

تفسیر:

ولادت یحییٰؑ کی نشانی

جناب زکریا نے خداوند عالم سے اس علامت و نشانی کے متعلق دریافت کیا جس کو وہ اپنی زوجہ کے وقت حمل کے متعلق سمجھ سکیں تاکہ اس کا شکر کرتے ہوئے عبادت میں اضافہ کریں۔ یہ بھی کہا گیا ہے تاکہ اس سے سرور و خوش حالی میں جلدی کریں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَۃً (انھوں نے عرض کی: اے مالک میرے لیے قبولیت دعا کی کوئی نشانی مقرر فرما دے!) یعنی پروردگار میرے لیے وقت حمل اور فرزند کی نشانی قرار دے تو خداوند عالم نے ان کے لیے زبان سے کلام نہ کرنے کی نشانی قرار دی کہ وہ فقط اشاروں سے (کلام) کریں اور ان کی زبان میں کوئی پریشانی اور دشواری واقع ہوئے بغیر۔

ارشاد فرمایا: قَالَ اٰیَتُكَ (ارشاد ہوا نشانی یہ ہے) یعنی اللہ نے فرمایا۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد ہو قال جبرئیلؑ ہو آپ کی علامت و نشانی یہ ہے کہ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا یعنی تم تین دن تک لوگوں سے اشاروں کے علاوہ کوئی بات نہ کر سکو گے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ رمز کے معنی دونوں ہونٹوں کو حرکت دینا ہے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے تین روز کے روزے مراد ہیں اس لیے کہ جب لوگ روزہ رکھتے تھے تو وہ اشاروں کے علاوہ کلام نہیں کرتے تھے۔ یہ عطا سے مروی ہے۔

ارشاد: وَاذْکُرْ رَّبَّكَ کَثِیْرًا (دیکھو اِس دوران اپنے پروردگار کا ذکر کثرت سے کرتے رہنا) یعنی ان تین دنوں میں، اس کے یہ معنی ہیں کہ جب انھیں کلام کرنے سے منع کیا گیا تو معلوم ہو گیا انھیں ذکر الٰہی اور اس کی تسبیح سے نہیں روکا گیا ہے جو انتہائی بلیغ اعجاز ہے۔ وَسَبِّحْ (اور اسی کی تسبیح میں مصروف رہنا) اللہ کی پاکیزگی بیان کرنا اس سے مشہور تسبیح مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی صَلِّ (یعنی نماز پڑھو) جیسا کہ کہا جاتا ہے: فَرَغْتُ مِنْ تَسْبِیْحِیْ؛ میں نماز سے فارغ ہو گیا۔

بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡکَارِ '(صبح وشام) دن کے آخری اور ابتدائی حصہ میں۔

❀❀❀❀❀❀

وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۲﴾ یٰمَرۡیَمُ اقۡنُتِیۡ لِرَبِّکِ وَ اسۡجُدِیۡ وَارۡکَعِیۡ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾

اور یاد کرو جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ نے تمھیں برگزیدہ کیا ہے، پاک و پاکیزہ بنایا ہے اور تمھیں دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ہے۔ (۴۲) اے مریم! تم اپنے پروردگار کی اطاعت کرو، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ (۴۳)

تفسیر:

جناب مریمؑ کا انتخاب وطہارت

اللہ تعالیٰ نے پہلے عمران اور ان کی دختر کی فضیلت کو اجمالی طور پر بیان کیا، پھر اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (اور یاد کرو جب فرشتوں نے کہا) یہ اِذۡ اس آیت پر معطوف ہے کہ: اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ جب عمران کی زوجہ نے کہا یا اس اِذۡ کے معنی یہ ہوں کہ اُذۡکُرۡ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ؛ یاد کیجیے اس وقت کو جب ملائکہ نے کہا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اَلۡمَلٰٓئِکَۃُ سے مراد فقط جبرئیل ہیں۔

یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ (اے مریم! بلاشبہ اللہ نے تمھیں برگزیدہ کیا ہے،) یعنی تمھیں منتخب کیا، تم پر لطف و مہربانی کی، یہاں تک کہ تم نے اپنے آپ کو اللہ کی عبادت اور اس کی خوشنودی اور مرضی کے اتباع کے لئے فارغ اور خالی کرلیا۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تمھیں ولادت عیسیٰ کے لئے منتخب کیا۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

وَطَہَّرَکِ (اور تمھیں پاک و پاکیزہ بنایا ہے) یعنی تمھیں ایمان کے ذریعہ کفر سے اور اطاعت کے ذریعہ معصیت سے پاک کیا۔ یہ حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ عورتوں کو پیش آنے

والی، حیض، نفاس جیسی نجاستوں اور کثافتوں سے پاک بنایا یہاں تک کہ تم مسجد کی خدمت کے قابل ہو گئی۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ناپسندیدہ اخلاق اور پست وحقیر طبیعتوں اور مزاج سے تمھیں پاک بنایا۔

وَاصۡطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ (اور تمھیں دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ہے) یعنی تمھارے زمانے کی عورتوں پر تمھارا انتخاب کیا گیا اس لیے کہ فاطمہ زہرا (خداوند عالم آپؑ کے والد وشوہر اور دونوں فرزندوں پر اپنی رحمت نازل کرے) تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں، یہ امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: خدیجہ کو میری امت کی عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے جس طرح مریم کو عالمین کی عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے۔

ابوجعفر نے بیان کیا ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ذریت انبیاء سے منتخب کیا اور خون کی کثافت و نجاست سے آپ کو پاک بنایا شوہر کے بغیر (عیسیٰ کی ولادت کے ذریعہ آپ کو برگزیدہ کیا) اس تشریح کے ذریعہ (آیت) تکرار سے خارج ہو گئی اس لیے کہ اصطفاء کے دو مختلف معنی ہیں۔

ارشاد: يٰمَرۡيَمُ اقۡنُتِىۡ لِرَبِّكِ (اے مریم! تم اپنے پروردگار کی اطاعت کرو) یعنی (اللہ) کی عبادت کرو اور اس کے لیے خالص عبادت قرار دو۔ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لیے دائمی اطاعت کرو (مسلسل عبادت کرتی رہو) یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نماز میں قیام کو طول دو۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔

وَاسۡجُدِىۡ وَارۡكَعِىۡ مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ (سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو) (یعنی اس طرح سجدہ اور رکوع کرو) جس طرح سَاجِدِيۡنَ اور رَاكِعِيۡنَ سجدے اور رکوع کرتے ہیں۔ جناب مریمؑ کو یہ حکم نہیں ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ سجود اور رکوع بجالائیں۔ سجدہ کو رکوع پر مقدم کیا گیا ہے اس لیے کہ واوؑ ترتیب کو لازم قرار نہیں دیتا۔ اس طرح باہم متغایر اشیا میں پایا جاتا ہے جس کی مثال متماثل (ایک جیسی) تثنیہ میں موجود ہے بلکہ ؤ، جمع اور اشتراک کو بیان کرنا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کا شکر کرتے ہوئے اس کا سجدہ کرو اور رکوع کرو یعنی نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھو۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت سے نماز پڑھو۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

❀❀❀❀❀

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ؕ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ ۖ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾

(اے محمد) یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم آپ کو وحی کے ذریعے بتلا رہے ہیں۔ آپ اس وقت ان کے پاس نہ تھے جب ہیکل کے خادم قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا اور نہ ہی آپ اس وقت وہاں موجود تھے جب وہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ (۴۴)

الفاظ و معانی:

اَنۡبَاء: اخبار، اس کا واحد نَبَأٌ ہے۔

اَلۡاِیۡحَاء: غیر تک پوشیدہ اور مخفی طور پر معنی کا القاء کرنا (پہونچانا)

اَلۡاِیۡحَاء: انبیاء تک 'وحی' پہونچانا، آپ کہتے ہیں 'اَوۡحَی اللّٰہُ اِلَیۡہِ یعنی اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس فرشتہ کو بھیجا۔

اِیۡحَاء کے معنی الہام کے بھی ہیں، اسی سے ارشاد الٰہی ہے: وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ یا یہ ارشاد ہے: بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَہَا یعنی شہد کی مکھی پر اللہ نے ان باتوں کا القاء کر دیا جو اس سے چاہا تھا۔ اِیۡحَاء کے معنی اشارے کے بھی ہیں، اسی سے اللہ کا ارشاد ہے: فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡہِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡا بُکۡرَۃً وَّ عَشِیًّا یعنی ان کی جانب اشارہ کر دیا۔

اَلۡوَحۡی کے معنی کتابت (تحریر) کے بھی ہیں۔

قَلَمۡ جس کے ذریعہ لکھا جاتا ہے، قلم وہ بھی ہے جسے قوم کے درمیان ہر شخص گردش دیتا ہے۔ اس کا قلم قدح (پیالہ) ہے، قلم کے معنی ناخون تراشنے کے بھی ہیں۔

ترکیب:

ابو علی نے کہا: ارشاد الٰہی: اِذۡ یُلۡقُوۡنَ میں اِذۡ، کُنۡتَ کے متعلق ہے اور یَخۡتَصِمُوۡنَ کے بعد اِذۡ

قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ میں اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ سے متعلق ہے۔ یہ اِذْ بھی کُنْتَ سے متعلق ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْقَالَتِ الْمَلَائِكَةُ۔ یہ میرے نزدیک اس وقت جائز ہے جب دوسرے اِذْکو پہلے اِذْ کا بدل مانا جائے۔ اگر ایسا فرض نہیں کیا گیا تو پھر جائز نہیں ہے اور اس میں بدل قرار دینا جائز ہے جب ان کے آپس میں اختلاف کے وقت ملائکہ کے یہ کہنے کا وقت ہوتا ہے کہ بدل معنیٰ کے لحاظ سے مبدل منہ ہو۔

تفسیر:

جناب مریمؑ کی کفالت کے لئے اختلاف

ذٰلِكَ (یہ سب) مریم وزکریا اور یحییٰ کی گذشتہ قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ (غیب کی باتیں ہیں) یعنی خبر ہے اس چیز کے بارے میں جو تم سے اور تمھاری قوم سے پوشیدہ اور غائب تھی۔

ارشاد: نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (جو ہم آپ کو وحی کے ذریعے بتلا رہے ہیں) یعنی ہم آپ پر معجزہ، نصیحت، آگاہی وموعظہ اور عبرت کا القا کر رہے ہیں۔ اس میں اعجاز کی وجہ اور صورت یہ ہے کہ جو چیز انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے اس کا علم کتابوں کے پڑھنے، تعلیم حاصل کرنے اور وحی کے ذریعہ حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا، نہ ہی کتابوں میں پڑھا تھا، نہ ہی ان کی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے کہ آپؐ کی پرورش اہل مکہ کے درمیان ہوئی تھی جو اہل کتاب نہیں تھے چنانچہ اللہ نے وضاحت فرمادی کہ ان واقعات کی آپؐ پر وحی کی جارہی ہے، اس میں آپؐ کی نبوت کے صحیح اور برحق ہونے کی دلیل ہے۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اے محمدؐ! آپ اس وقت ان کے پاس نہ تھے اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (جب وہ لوگ اپنے قلم پانی میں ڈال رہے تھے) جن کے ذریعہ وہ توریت لکھتے تھے۔ جس کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے قلم ان کے قرعہ اندازی کے پیالے (یا نوک اور پر کے بغیر تیر) تھے جن پر انھوں نے نشانی لگا رکھی تھی جن کے ذریعہ پہچان رہے تھے کہ قرعہ کے ذریعہ مریم کی کفالت کون کرے گا۔

اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا) اس جملہ میں ایک بات

حذف ہے یعنی لِيَنْظُرُوْا اَيُّهُمْ تَظْهَرُ بِهَا قُرْعَتُهٗ لِيَكْفُلَ مَرْيَمَ؛ تاکہ وہ دیکھیں ان میں سے قرعہ کس کے لیے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مریم کی کفالت کرے۔ یہ ارشاد ان لوگوں کا جناب مریمؑ کی کفالت اور ان کے معاملات کو انجام دینے کے لیے شدت سے حریص ہونے پر اللہ کا اپنے پیغمبر کو تعجب میں ڈالنا ہے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جناب مریمؑ کی کفالت کے سلسلہ میں ان لوگوں کا شدت سے ایک دوسرے کا باہم دفاع کرنا جو ان کے ساتھ پیش آرہا تھا یہاں تک کہ ان کے لیے بہترین کفیل جناب زکریاؑ نے کامیابی حاصل کی اس بات پر اللہ کی جانب سے تعجب میں ڈالنا ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (اور نہ ہی آپ اس وقت وہاں موجود تھے جب وہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے) یہ فقرہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ جناب مریمؑ کے سلسلہ میں ان کی بحث و تکرار جھگڑے کی حد تک پہونچ گئی تھی یہ جھگڑا کس وقت پیش آیا اس بارے میں دو اقوال ہیں:

اول: جناب مریم کی ولادت کے وقت جب ان کی والدہ انھیں کنیسہ کی طرف لے کر آئیں۔ تو لوگوں نے ان کی دیکھ بھال اور تربیت کے متعلق آپس میں جھگڑا کیا (کہ ان کی کفالت کون کرے گا) بیشتر مفسرین کا قول یہی ہے۔

دوم: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات مریم کے بڑا ہونے اور جناب زکریا کے جناب مریمؑ کی تربیت سے عاجز ہونے پر پیش آئی۔

آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے حق کو واضح اور تعین کرنے میں قرعہ کی دخالت ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے: جو لوگ بھی قرعہ کے ذریعہ اپنے معاملہ کو خدا کے حوالے کرتے ہیں تو اس کے حق میں قرعہ برآمد ہوتا ہے (امامؑ نے) فرمایا: کون سا معاملہ اور قضیہ ہے جو قرعہ سے زیادہ عدل پر مبنی ہوگا؟ جب معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ امام باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے قرعہ جناب مریم دختر عمران پر نکالا گیا، پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ

قرعے چھ ہیں: لوگوں نے حضرت یونسؑ کے بارے میں قرعہ ڈالا۔ پھر حضرت عبد المطلب نے جب ان کے نو فرزند پیدا ہوئے، دسویں بیٹے پر انھوں نے نذر کی اگر اللہ انھیں فرزند عطا کرے گا وہ اس کی قربانی دیں گے۔ جب ان کے یہاں حضرت عبد اللہ کی ولادت ہوئی تو ان کے ذبح کرنے کی ہمت نہ ہو سکی، اس لیے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلب حضرت عبداللہ میں تھے، چنانچہ انھوں نے دس اونٹ اور حضرت عبد اللہ کے درمیان قرعہ کیا، قرعہ حضرت عبداللہ کے نام نکلا، پھر انھوں نے دس اونٹوں کا اضافہ کیا قرعہ پھر حضرت عبداللہ کے نام نکلا، حضرت عبدالمطلب اسی طرح ہر بار دس دس اونٹوں کا اضافہ کرتے رہے لیکن جب سو(۱۰۰) اونٹ اور حضرت عبداللہ کے نام قرعہ کیا تو قرعہ اونٹوں پر نکلا۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا: میں نے اپنے پروردگار سے انصاف نہیں کیا اور اسی طرح قرعہ کی تین مرتبہ تکرار کی۔ قرعہ تینوں بار اونٹوں پر ہی نکلا۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا: مجھے اب معلوم ہو گیا میرا پروردگار قرعہ سے راضی ہو گیا۔ پھر حضرت عبد المطلب نے تمام اونٹ ذبح کر دیئے۔

❀❀❀❀❀

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٤٦﴾

جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تمھیں ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں صاحبِ عزّت ہوگا اور اللہ کی بارگاہ میں مُقرّب ہوگا۔ (۴۵) وہ لوگوں سے گہوارے میں ہم کلام ہوگا اور بڑا ہو کر بھی، اور وہ صالحین میں سے ہوگا۔ (۴۶)

قرائت:

يُبَشِّرُكِ کی قرائت اور اس کے سلسلہ میں قول وکلام کو بیان کر چکے ہیں۔

الفاظ ومعانی:

اَلْمَسِيح فَعِيل کے وزن پر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے، اس کے لغوی معنیٰ کثافت ونجاست سے پاک وصاف ہونا ہے۔ اسی طرح مسیح اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس کے چہرے کی ایک جانب ایسی صاف اور سپاٹ ہو جس میں آنکھ اور حاجب (بھویں) موجود نہ ہوں۔ اسی لئے دجال کو بھی مسیح کہا گیا ہے۔ کہا گیا

ہے کہ المَسِیْح میم کے فتح کے ساتھ اور سین بغیر تشدید کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور وہ صدیق ہے۔ اَلْمِسِّیح میم کے زیر کے ساتھ اور سین کی تشدید کے ساتھ دجال ہے۔ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے، دیگر افراد نے اس نظریہ کو رد کیا ہے۔

وَجِیْہ وہ کریم اور آبرومند جس سے لوگ حاجت طلب کریں اور وہ اپنی آبرو کی خاطر رد نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ لَهٗ وِجَاهَةٌ عِنْدَ النَّاسِ وَ جَاهٌ یعنی اسے لوگوں کے نزدیک بلند منزلت حاصل ہے۔

اَلْکَهْل جوانی اور بڑھاپے کی درمیانی منزل ہے۔ اسی سے اَلْکَاهِل ہے پشت سے بلند گردن سے متصل حصے کو کہتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اَلْکُهُوْلَة چونتیس (۳۴) برس کی عمر تک پہونچ جانا ہے۔

ترکیب:

وَجِیْهًا بر بنائے حال منصوب ہے۔ مراد یہ ہے کہ خداوند عالم تمھیں اس بچے کی بشارت دے رہا ہے اس حالت میں کہ وہ وَجِیْہ ہوگا۔

وَ یُکَلِّمُ بھی وَجِیْهًا پر عطف ہونے کی بنا پر حال اور منصوب ہے۔ جائز ہے کہ یُفَعِّلُ کو یَفْعَلُ مضارع سے مشتق کے فاعل پر عطف کیا جائے جیسا کہ شاعر نے کہا:

بَاتَ یُغَشِّیْهَا بِعَضْبٍ بَاتِرٍ　یَقْصِدُ فِیْ اَسْوُقِهَا وَجَائِر

یعنی قَاصِدٌ اَسْوُقَهَا وَ جَائِرٌ۔

وَ کَهْلًا، یَتَکَلَّمُ کا حال ہے۔

تفسیر:

جناب عیسیٰؑ کی بشارت

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ (جب فرشتوں نے کہا) ابن عباس نے کہا ہے کہ جبرئیل مراد ہیں۔ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکِ (اے مریم! اللہ تمھیں بشارت دیتا ہے) تمھیں ایسی خبر دے رہا ہے جو تمھیں خوش اور مسرور کر دے گی۔

بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ (اپنی جانب سے ایک کلمہ کی) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: خدا نے مسیح کو کلمہ کہا ہے۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور مفسرین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ جناب عیسیٰؑ کو کلمۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے کلمہ سے بغیر باپ کے (وجود میں آئے) ہیں۔ وہ کلمہ ارشاد الٰہی: کُنۡ فَیَکُوۡنُ ہے، جس پر اس کا یہ ارشاد الٰہی دلالت کر رہا ہے: اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ۔

بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ اللہ نے ان کی گذشتہ کتب میں بشارت دی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی بشارت تورات میں دی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ عیسیٰؑ کے ذریعہ ہدایت فرمائے گا جس طرح وہ اپنے کلمہ کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے۔

دوم: کلمہ بشارت کے معنی میں ہے، گویا اس طرح کہا ہے بشارۃ منہ۔

اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ (جس کا نام مسیح) قول اول اقویٰ ہے، جس کی تائید اس کا یہ ارشاد کر رہا ہے: اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ اَلۡقٰھَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡہُ عیسیٰؑ کے نام کے ساتھ ضمیر مذکر کی ذکر کی گئی ہے جو کلمہ کی طرف پلٹ رہی ہے، جو مذکر کے لیے واقع ہوئی ہے جو معنی کی طرف جا رہی ہے۔

جناب عیسیٰؑ کا نام مسیح کو رکھا گیا اس بارے میں اختلاف ہے؛ کہا گیا ہے انھیں برکت (وخیر) کے ذریعہ مسح کیا گیا ہے۔ یہ حسن، قتادہ اور سعید سے مروی ہے اس لیے کہ انھوں گناہوں سے طہارت کے ذریعہ مسح کیا گیا ہے (یعنی گناہوں کی آلائش اور آلودگی سے پاک وصاف کیے گئے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں زیتون کے تیل سے مسح کیا گیا (مالش کی گئی) جس تیل کو بابرکت بنا گیا ہے، انبیاؑ کو اس کے ذریعہ مسح کیا جاتا تھا۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ولادت کے وقت انھیں جبرئیلؑ نے اپنے پروں سے مس کیا تھا اپنے پروں کو ان پر پھیرا تھا تاکہ وہ شیطان سے محفوظ رہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لیے (جناب عیسیٰؑ) یتیموں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نابینا کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے، مس کرتے تھے تو وہ دیکھنے لگتے تھے۔ یہ کلبی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کسی بھی بیماری میں مبتلا انسان کو اپنے ہاتھ سے مس کرتے (ہاتھ پھیرتے) تو وہ شفایاب ہو جاتا تھا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ عطا اور ضحاک نے روایت کی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ لفظ مسیح سریانی زبان میں مشیحا ہے۔ عربوں نے اسے عربی زبان میں (مسیح) بنا لیا۔

عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ (عیسیٰ بن مریم ہوگا) ان کی والدہ کی طرف نسبت ہے جو نصاریٰ کے اس عقیدہ

کی رد ہے کہ عیسیٰؑ فرزند خدا ہیں۔

وَجِيهًا (وہ صاحب عزت ہوگا) صاحب جاہ و قدر و منزلت ہوگا۔ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (دنیا و آخرت میں، اور اللہ کی بارگاہ میں مُقرّب ہوگا) اللہ کے ثواب اور کرامت سے (نزدیک) ہوگا۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ (وہ لوگوں سے گہوارے میں یعنی بچپنے میں ہم کلام ہوگا)۔ مَهْد (گہوارہ) وہ مقام ہے جو بچہ کے سونے کے لیے مہیا کیا جاتا ہے۔ یعنی گہوارہ میں کلام کرنے سے مراد ان کا یہ کہنا ہے کہ: إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ ہے۔ گہوارہ میں عیسیٰؑ کے کلام کرنے کی وجہ اپنی والدہ پر لگے الزام سے انھیں بری کرنا تھا اور معجزہ کے ذریعہ جناب عیسیٰؑ کو عظمت عطا کرنی تھی جوان میں ظاہر ہوئی۔

ارشاد: وَكَهْلًا (اور بڑا ہو کر بھی (باعزت ہوگا)) اور لوگوں سے بڑھاپے میں اس وحی کے ذریعہ کلام کریں گے جو اللہ کی جانب سے آئے گی۔ اللہ حضرت مریم کو بتلا رہا ہے جناب عیسیٰؑ بڑھاپے کی حالت تک باقی رہیں گے۔ اس میں اعجاز ہے اس لیے کہ مُخْبَر (جس کے متعلق خبر دی گئی تھی) خبر کے مطابق واقع ہوئی۔ (یعنی خبر مطابق واقعہ ثابت ہوئی) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے نصاریٰ کی رد مراد ہے چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات میں جو تبدیلیاں اور انقلابات رونما ہوئے تھے، اس لیے کہ یہ چیزیں الوہیت کی صفت کے منافی ہیں۔

وَمِنَ الصَّالِحِينَ (اور وہ صالحین میں سے ہوگا) یعنی وہ ابراہیم و موسیٰ کے مانند انبیا سے ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ گہوارہ میں لوگوں سے کلام کرنے سے مراد اللہ کی طرف دعوت دینا ہے اور كَهْلًا یعنی بڑھاپے میں آسمان سے نازل ہونا ہے تاکہ دجال کو قتل کریں یہ اس لیے کہ جب انھیں آسمان پر اٹھایا گیا اس وقت ان کی عمر تینتیس (۳۳) برس کا سن تھی جو بڑھاپے سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ یہ زید بن اسلم سے مروی ہے۔ گہوارہ میں معجزہ ظاہر ہونے کے متعلق دو اقوال ہیں:

اول: یہ معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے متصل تھا، چونکہ اللہ نے اسی حالت میں ان کی عقل کو مکمل کر دیا تھا اور نبی بنا دیا تھا اور ان پر وحی فرمائی تھی، جس کے ذریعہ انھوں نے کلام کیا تھا۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ دوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ان کی نبوت کی تاسیس اور ان خارق العادت کیفیات کے لیے تھا جو پیغمبر کے لیے اس کی بعثت سے قبل ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ابن اخشید سے مروی ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں

صورتیں ممکن ہیں، اسی طرح مریم کا معجزہ ہونا بھی ممکن ہے جو ان کی طہارت اور پاک دامنی پر دلالت کر رہا ہے۔ اس میں کوئی مانع نہیں ہے، اس کے جواز پر واضح ادلہ دلالت کر رہی ہیں؛ نصاریٰ نے جناب عیسیٰؑ کے گوارہ میں کلام کے آیت (نشانی) اور معجزہ ہونے سے انکار کیا ہے، اس لیے کہ اس میں ان کے مذہب کا بطلان ہے چونکہ عیسیٰ نے کہا تھا: انی عبد اللہ (میں بندۂ خدا ہوں) یہ عیسائیوں کے عقیدہ کہ عیسیٰ علیہ السلام 'ابن اللہ' (فرزند خدا) ہیں کے خلاف ہے۔ لہٰذا وہ اس کی تکذیب پر باقی رہے جو خبر دے رہا ہے وہ اسی طرح اس کی گواہی دے رہا ہے۔

❀❀❀❀❀

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾
مریم نے کہا: اے میرے پروردگار! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ جواب ملا: ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی کام کے انجام دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (۴۷)

ترکیب:

یہاں پر فَيَكُوْنُ میں رفع کے علاوہ کوئی دوسرا اعراب صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وہ امر کا جواب نہیں ہو سکتا ہے جو کہ كُنْ ہے اس لئے کہ جواب اس وقت ہوگا جب پہلے کا وجود ہو جیسے اِئْتِنِيْ فَاُكْرِمَكَ وَ قُمْ فَاَقُوْمُ مَعَكَ، قُمْ فَيَقُوْمُ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس کی تقدیر یہ ہوگی: قُمْ فَاِنَّكَ اِنْ تَقُمْ يَقُمْ اور اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن صحیح صورت رفع ہے خبر دینے کی بنا پر کہ وہ سَيَقُوْمُ۔

ہاں آن يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ میں نصب جائز ہے يَقُوْلَ پر عطف کرتے ہوئے۔

تفسیر:

جناب مریمؑ کا تعجب اور اس کا جواب

قَالَتْ، مریم نے کہا: رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ (اے میرے پروردگار! میرے یہاں بچہ کیسے اور

کس طرح ہوگا، وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ (مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے) مریم نے اس امر کو بعید سمجھتے ہوئے اور انکار کرتے ہوئے نہیں کہا بلکہ بعنوان استفہام اور اللہ کی قدرت کو عظیم بزرگ و برتر سمجھتے ہوئے کہا تھا، اس لیے کہ انسان کی طبیعت ہے کہ عام عادت سے خارج چیز پر اسے تعجب ہوتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ جاننا چاہ رہی تھیں کہ اللہ انھیں اس حالت میں فرزند عطا کرے گا جبکہ انھیں کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے یا ان کے لیے شوہر مقرر فرمائے گا۔ پھر انھیں طبیعی عادت کے مطابق فرزند عطا کرے گا۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (جواب ملا ایسا ہی ہوگا اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) یعنی جیسا چاہے گا اسی کے مثل خلق کرے گا۔ یہ جملہ اس بات کی حکایت ہے جسے فرشتہ نے مریم سے کہا تھا یعنی اللہ تمھیں فرزند عطا کرے گا ایسی حالت میں کہ تمھیں بشر نے چھوا تک نہیں ہے۔

اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا (جب وہ کسی کام کے انجام دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے) یعنی جب کسی چیز کو خلق کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب کسی امر کو مقدر (معین) کرتا ہے۔

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے) کہا گیا ہے کہ اس جملہ کے معنی میں دو اقوال ہیں:

اول: ہر چیز جس کا خدا نے ارادہ کر لیا ہے اس میں مراد الٰہی کے حصول میں سرعت کی خبر دی گئی ہے جبکہ وہ چیز کسی مہلت وسستی وسبب کی زحمت اور آلہ کے بغیر حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لفظ سے لفظ كُنْ فَيَكُوْنُ کنایہ کیا گیا ہے اس لیے کہ بندوں کے وہم وگمان میں كُنْ فَيَكُوْنُ سے زیادہ جلدی کوئی بات داخل نہیں ہوتی ہے۔

دوم: یہ وہ کلمہ ہے جسے خداوند عالم نے فرشتوں کے لیے ان چیزوں کی علامت ونشانی قرار دیا ہے جنھیں وہ وجود بخشنا اور ایجاد کرنا چاہتا ہے جن میں اس کی مصلحت اور نصیحت وعبرت ہوتی ہے، اس نے لفظ امر کا استعمال کیا ہے اس چیز کے بارے میں جو یہاں پر امر نہیں ہے تاکہ اس بات کی جانب رہنمائی فرمائے کہ اس کا فعل مامور (امر شدہ فعل) کی منزل میں ہے جس کے متعلق اسے امر پر کوئی تکلیف اور زحمت نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور اللہ اُسے کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا اور اُسے توریت اور انجیل کا علم عطا کرے گا۔(۴۸) اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا (عیسیٰ نے کہا) میں تمھارے رَبّ کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے سامنے مٹی کی مورت بصورت پرندہ بناتا ہوں پھر اس میں پھونک ماروں گا تو وہ حکم خدا سے سچ مچ پرندہ بن جائے گا۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے کیا رکھتے ہو۔ یقیناً اس میں تمھارے لیے نشانی موجود ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔(۴۹)

قراءت:

اہل مدینہ، عاصم، یعقوب اور سہل نے وَيُعَلِّمُهُ یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے نون کے ساتھ نُعَلِّمُهُ پڑھا ہے۔

نافع نے اِنِّیْ اَخْلُقُ میں اِنِّیْ کے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ اور بقیہ قراء نے فتحہ کے ساتھ اَنِّیْ پڑھا ہے۔

اہل مدینہ اور یعقوب نے اس آیت میں اور سورۂ مائدہ میں طَآئِرًا پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے دونوں مقام پر كَهَيْـَٔةِ الطَّآئِرِ اور باقی قراء نے طَيْرًا بغیر الف کے پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے وَيُعَلِّمُهُ پڑھا ہے تو انھوں نے اسے اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ پر عطف کیا ہے اور جن حضرات نے وَنُعَلِّمُهُ پڑھا ہے انھوں نے نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ کے مانند قرار دیا ہے۔

جن قراء نے اَنِّيْ ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے انھوں نے مِنْ آيَةٍ کا بدل قرار دیا ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَجِئْتُكُمْ بِاَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ۔

اور جنھوں نے ہمزہ کو کسرہ دیا ہے انھوں نے دو صورتوں کا احتمال دیا ہے:

(۱) نیا جملہ قرار دیا ہے، ماقبل سے الگ اور جدا کلام مانا ہے۔

(۲) اس نے قول کے ذریعہ آیت کی تفسیر کی ہے: اِنِّيْ اَخْلُقُ جس طرح اس آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی تفسیر لَهُمْ مَغْفِرَةٌ کے ذریعہ کی ہے اور كَمَثَلِ آدَمَ میں مَثَل کی تفسیر خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ سے کی ہے۔

یہ صورت زیادہ اچھی ہے اس لئے کہ معنی میں اس کے مانند ہے جس نے فتحہ دیا ہے اور آيَةٍ کا بدل قرار دیا ہے۔

جس نے طَائِراً پڑھا ہے اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ فَيَكُوْنُ مَا اَنْفُخُ فِيْهِ طَائِراً یا فَيَكُوْنُ مَا اَخْلُقُهُ طَائِرًا اسی لئے لفظ طَائِرًا کو مفرد لایا ہے۔ اس کی تفسیر کی ہے یا ارادہ کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک طَائِرًا یعنی پرندہ بن جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا ہے: فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً یعنی اِجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ، انھیں اسی کوڑے لگاؤ یعنی ان میں سے ہر ایک کو اسی کوڑے مارو۔

الفاظ ومعانی:

اَلْحِكْمَةُ اور اَلْحُكْمُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس کی مثال اَلذِّلَّةُ اور اَلذُّلُّ جیسی ہے۔

اَلطِّيْنُ: گیلی مٹی۔

اَلْهَيْئَةُ: ظاہری حالت۔

اَلْاَكْمَهُ: اندھے اور نابینا۔

ترکیب:

وَ یُعَلِّمُهُ کے مقام و محل کے سلسلہ میں ایک احتمال کو یہ پایا جاتا ہے کہ وہ وَجِیْهًا پر عطف ہونے کے بنا پر محلاً منصوب ہو اور دوسرا احتمال یہ پایا جاتا ہے کہ اس کا کوئی اعراب ہی نہ ہو اس لئے کہ وہ ایک ایسے جملہ پر عطف ہے کہ جس کا کوئی محل اعراب ہی نہیں ہے اور وہ کَذٰلِكَ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ۔

کہا گیا ہے کہ یہ جملہ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ پر عطف ہے اور یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ جملہ جناب مریمؑ کے لئے بشارت کے معنی سے خارج ہے (یعنی بشارت کے دائرہ میں نہیں ہے) وَ رَسُوْلًا اس تقدیر کی بنا پر منصوب ہے کہ وَ نَجْعَلُهٗ رَسُوْلًا سے حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ بشارت اس پر دلالت کر رہی ہے نیز وَجِيْهًا پر عطف کی بنا پر حال اور منصوب بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت رَسُوْلًا اس معنی میں ہوگا کہ اَنَّهٗ يُرْسِلُ رَسُوْلًا۔

زجاج نے کہا: مراد یہ ہے کہ: يُكَلِّمُهُمْ رَسُوْلًا بِاَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ، اگر کسرہ کے ساتھ اِنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ تب بھی صحیح ہوتا اور معنی یہ ہوتے: يَقُوْلُ: اِنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ۔

اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ محلاً مجرور اور مرفوع دونوں ہو سکتا ہے، مجرور بِاٰيَةٍ کا بدل ہونے کی بنا پر اور مرفوع اس چیز کی بنا پر کہ جس کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔

بِمَا تَاْكُلُوْنَ میں مَا، اَلَّذِيْ کے معنی میں ہو سکتا ہے یعنی بِمَا تَاْكُلُوْنَهٗ وَ تَدَّخِرُوْنَهٗ اور مَا، مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے یعنی: وَاُنَبِّئُكُمْ بِاَكْلِكُمْ وَادِّخَارِكُمْ۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

تفسیر:

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ (اور اللہ اُسے کتاب کی تعلیم دے گا) کتاب سے مراد کتابت ہے۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے، انھوں نے بیان کیا ہے: اللہ نے عیسیٰؑ کو خط (تحریر) کے نو اجزا (حصے) عطا کئے تھے اور لوگوں کو ایک جزء عطا کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض کتب مراد ہیں جنھیں اللہ نے اپنے پیغمبروں پر نازل فرمایا تورات اور انجیل کے علاوہ جیسے زبور وغیرہ۔ یہ ابو علی الجبائی سے مروی ہے۔ یہی قول ظاہر سے زیادہ مناسب ہے۔

وَالْحِكْمَةَ (اور حکمت کی تعلیم دے گا) یعنی فقہ اور حلال وحرام کا علم۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے، آپؐ نے فرمایا: مجھے قرآن عطا کیا گیا اور (قرآن) کا دوگنا عطا کیا گیا تو لوگوں نے بیان کیا ہے اس سے سنن مراد ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے اصول دین کا تمام علم مراد ہے جس کی آپ کو تعلیم دی گئی تھی۔

وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ اگر سوال کیا جائے کہ دونوں کو الگ سے کیوں ذکر کیا ہے جب کہ دونوں حکمت میں داخل ہیں؟ تو اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ کہا یہ دونوں کتابوں کی جلالت اور مقام ومرتبہ کو بتانے کے لئے ہے، جس طرح یہ ارشاد الٰہی ہے: وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ۔

اس مقام پر جناب مریم علیہا السلام اور ان کی ولادت کا واقعہ روک دیا گیا ہے۔ مکمل واقعہ سورہ مریم میں آئے گا۔

یہاں سے حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ کی ابتدا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ (اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا) اس کی تقدیر ہم بیان کر چکے ہیں جس کے معنی اس کے اطراف میں گردش کر رہے ہیں۔

اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ ((عیسیٰ نے کہا:) میں تمھارے پاس لے کر آیا ہوں) یعنی جناب عیسیٰؑ نے لوگوں سے کہا: جب انھیں ان کی طرف بھیجا گیا میں تمھاری طرف آیا ہوں۔ بِاٰيَةٍ (نشانی) یعنی دلالت وحجت کے ساتھ۔ مِّنْ رَّبِّكُمْ (تمھارے پروردگار کی جانب سے) جو میری نبوت پر دلالت کر رہے ہیں۔

پھر باء کو حذف کر کے فعل کو وصل کر دیا: اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ (میں تمھارے سامنے مٹی کی مورت بصورت پرندہ بناتا ہوں) میں تمھارے لیے مٹی سے مورت بناتا ہوں جو پرندہ کی شکل وصورت کے مانند ہے۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ (پھر اس میں پھونک ماروں گا) مٹی سے بنائے ہوئے پرندہ میں (پھونک ماروں گا، دوسرے مقام پر فِیْهَا فرمایا ہے یعنی مقرر شکل وہیئت میں۔

ارشاد الٰہی: فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (تو وہ حکم خدا سے سچ مچ پرندہ بن جائے گا) یعنی قدرت خدا سے اور کہا گیا ہے کہ امر الٰہی سے، جناب عیسیٰؑ نے بِاِذْنِ اللّٰهِ کو فَيَكُوْنُ طَيْرًا سے متصل کیا ہے، اس کے ماقبل نہیں، اس لیے کہ مٹی کو پرندہ کی شکل وصورت میں بنانا اور اس میں پھونک مارنا بندہ کی قدرت وطاقت میں داخل ہیں، البتہ مٹی کا اس طرح پرندہ بنانا جس میں گوشت، خون وزندگی پیدا کرنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر خدا

کے علاوہ کوئی طاقت وقدرت نہیں رکھتا۔ چنانچہ جناب عیسیٰؑ نے کہا: بِاِذْنِ اللّٰہِ حکم خدا سے، تا کہ جان لیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، عیسیٰ کا کام نہیں ہے۔ تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ جناب عیسیٰؑ نے مٹی سے چمگادڑ کی شکل اورمورت بنائی تھی، اس میں پھونک ماری تھی جو اڑنے لگی تھی۔

وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ (مادرزاد اندھے کو اچھا کرتا ہوں) جو مادرزاد اندھے ہوتے تھے۔ یہ ابن عباس و قتادہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ (عام) اندھے تھے۔ یہ حسن وسدی سے مروی ہے۔

وَالْاَبْرَصَ (اور کوڑھی کو (اچھا کرتا ہوں) جسے کوڑھ ہے وہب نے بیان کیا ہے کہ کبھی حضرت عیسیٰؑ کے پاس ایک دن میں پچاس ہزار مریض جمع ہو جاتے تھے، جو مریض حضرت عیسیٰؑ تک نہیں پہونچ پاتے تھے تو حضرت عیسیٰؑ خود ان کے پاس چلے جاتے اور ایمان کی شرط کے ساتھ دعا سے ان کا علاج ومعالجہ کرتے تھے۔

وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ (اور مردے کو زندہ کرتا ہوں اذن خدا سے) عیسیٰؑ نے زندہ کرنے کی نسبت مجازاً اپنی طرف دی ہے اس لیے کہ خداوند عالم ان کی دعا سے مردوں کو زندہ کرتا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ جناب عیسیٰؑ نے چار لوگوں کو زندہ کیا:

۱۔ عازر جناب عیسیٰؑ کا دوست تھا۔ اسے انتقال کئے ہوئے تین دن گذر چکے تھے، جناب عیسیٰؑ نے اس کی بہن سے فرمایا: مجھے اس کی قبر تک لے چلو پھر آپ نے اس طرح دعا کی: اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْاَرَضِیْنَ السَّبْعِ اِنَّكَ اَرْسَلْتَنِیْ اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اَدْعُوْھُمْ اِلٰی دِیْنِكَ وَ اُخْبِرُھُمْ بِاَنِّیْ اُحْیِی الْمَوْتَ فَاَحْیِ عَازَرَ (ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمین کے پروردگار! تو نے مجھے بنی اسرائیل کی جانب (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے، انھیں میں تیرے دین کی دعوت دیتا اور انھیں خبر دیتا ہوں کہ میں مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ لہٰذا عازر کو زندہ کردے!)

پس عازر اپنی قبر سے باہر نکلا وہ زندہ رہا اور اس کے یہاں فرزند کی ولادت بھی ہوئی۔

۲۔ ایک دوسرا شخص جو ایک بوڑھے آدمی کا بیٹا تھا اس کے پاس سے جناب عیسیٰؑ کا گذر ہوا۔ وہ تابوت پر مردہ پڑا تھا، حضرت عیسیٰؑ نے اس کے لیے اللہ سے دعا کی اور وہ تابوت پر اٹھ کر بیٹھ گیا، لوگوں کے کاندھے سے اترا، اپنا لباس پہنا اور اپنے اہل وعیال کی طرف چلا گیا اور بعد میں زندہ رہا اور اس کے یہاں فرزند پیدا ہوا۔

۳۔ اسی طرح دس سالہ لڑکی کے متعلق حضرت عیسیٰؑ سے لوگوں نے کہا: کیا آپؑ اس لڑکی کو زندہ کر

دیں گے؟ اس کا انتقال کل ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اللہ سے دعا کی وہ بھی زندہ ہوگئی اور باقی رہی اور اس کے یہاں ولادت ہوئی۔

۴۔ اسی طرح سام بن نوح جن کے لیے عیسیٰؑ نے اللہ کے اسم اعظم کے ذریعہ دعا کی، چنانچہ وہ اپنی قبر سے اس طرح برآمد ہوئے کہ ان کا نصف سر سفید تھا۔ انھوں نے کہا: کیا قیامت آگئی ہے؟ حضرت عیسیٰؑ نے کہا: نہیں میں نے تمھارے لیے اسم اعظم الٰہی کے ذریعہ دعا کی تھی۔ (وھب راوی کہتے ہیں): اس زمانہ تک لوگوں کے بال سفید نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ سام بن نوح نے پانچ سو برس زندگی بسر کی اور وہ جوان تھے، پھر عیسیٰؑ نے ان سے کہا: مرجاؤ انھوں نے کہا: بشرطیکہ خداوند عالم مجھے سکرات موت سے پناہ دے (محفوظ رکھے) جناب عیسیٰؑ نے اللہ سے دعا کی اور پس ایسا ہی ہوا۔

کلبی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ: یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ کہہ کر مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہ معجزات حضرت عیسیٰؑ سے مخصوص ہیں چونکہ ان کے زمانہ میں علم طب کا غلبہ اور دور دورہ تھا لہٰذا خداوند عالم نے بھی اسی جنس سے اپنی آیات اور نشانیاں دکھلائیں جو ان کے درمیان رائج تھیں تاکہ اس طرح معجزہ کو غلبہ حاصل ہو اور وہ نمایاں ہو، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں سحر و جادو کا غلبہ تھا، لہٰذا اللہ نے انھیں اسی جنس کا معجزہ عطا کیا تاکہ لوگوں کو اس کے مثل پیش کرنے سے عاجز و درماندہ قرار دے اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بیان و فصاحت و بلاغت کو غلبہ حاصل تھا لہٰذا اللہ نے لوگوں کو قرآن جیسا معجزہ دکھایا جو اپنے عجیب نظم اور منفرد بیان کے ذریعہ ان پر سبقت لے گیا، تاکہ اعجاز کی نسبت بلیغ ترین قرار پائے اور تمام انبیا کی امتیں اس کا مثل پیش کریں جس ہنر و کمال پر وہ قائم ہے یا جو چیز ان کے پاس ہے اور اس کا جواب پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہو جائیں، اگر انبیا کو ایسی چیز عطا کی جاتی جسے لوگ نہ سمجھ سکتے، نہ ہی پہچان سکتے تو ان کے ذہن وفکر میں یہ بات آتی، یہ چیز انسان کے لیے ممکن تھی مگر یہ کہ انھوں نے اس کی جانب راہنمائی حاصل نہیں کی یا اس تک پہونچ نہیں سکے۔

ارشاد الٰہی: وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (میں تمھیں بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے کیا رکھتے ہو) گویا وہ انسانوں سے فرماتے تھے کہ تم نے یہ چیز کھائی ہے اور رات کے لئے ایسی ایسی چیزیں اٹھا رکھی ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (یقیناً اس میں) جس کا ذکر میں نے تم سے کیا اس میں لَاٰيَةً (نشانی ہے) یعنی حجت،

معجزہ اور دلالت ہے۔

لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (تمھارے لیے موجود ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو) اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اس لیے کہ معجزہ کے مدلول اور نتیجہ کا علم صحیح اور درست ہو ہی نہیں ہوسکتا مگر اس شخص کے لیے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔ اس لیے کہ مرسل (بھیجنے والے) کا علم رسول کے علم سے پہلے ہونا لازمی ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تمام بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا۔ عیسیٰؑ کا قول: اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ بندہ سے فعل صادر ہوتا ہے اور وہ عمل کرتا اور خلق کرتا ہے۔ یہ مجبرہ کے قول (اور نظریہ) کے خلاف ہے لیکن مطلق طور پر خالق اللہ ہی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اور جو میرے سامنے توریت نامی کتاب ہے میں اس کی تصدیق کرنے کے لیے آیا ہوں اور میں اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمھارے لیے اللہ کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ (۵۰) یقیناً اللہ میرا اور تمھارا دونوں کا رب ہے۔ لہٰذا تم اسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستا ہے۔ (۵۱)

الفاظ و معانی:

تصدیق اور تقلید کے درمیان فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ تصدیق اسی چیز کی ہوتی ہے جب صاحب تصدیق کے نزدیک برہان قائم ہو جائے جبکہ تقلید وہاں بھی ہو جاتی ہے جہاں پر برہان و دلیل قائم نہ ہو لہٰذا ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقلدین نہیں بلکہ ہو سکتے۔ ہم آنحضرتؐ کی تصدیق کرنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔

اِحلال یعنی فعل کو حسن قرار دے کر اس کا حکم دینا اور تحریم یعنی فعل کو قبیح قرار دے کر اس سے منع کرنا ہے۔

اِسۡتِقَامَة (سیدھا ہونا) اِعۡوِجَاج (کجی) کے برعکس ہے۔

ترکیب:

وَمُصَدِّقًا بربنائے حال منصوب ہے اور اسی کی تفسیر وَ جِئۡتُکُمۡ مُصَدِّقًا ہے اس لئے کہ اول کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور اس کے مانند جِئۡتُهٗ بِمَا یُحِبُّ وَ مُعَرِّفًا لَهٗ ہے۔ مُصَدِّقًا نہ ہی وَجِیۡهًا پر عطف ہوسکتا اور نہ ہی رَسُوۡلًا پر اس لئے کہ لِمَا بَیۡنَ یَدَیَّ آیا ہے، یہ نہیں فرمایا ہے کہ لِمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ۔

ابوعبیدہ نے کہا: بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ سے مراد کُلَّ الَّذِیۡ حُرِّمَ ہے اور اس قول کے لئے لبید کے اس شعر کو بطور شاہد پیش کیا ہے:

تَرَّاكُ أَمكنةٍ إِذا لم ارضها أَوۡ یَعتلِقۡ بعضَ النفوس حِمَامُها

ابوعبیدہ نے کہا: مراد یہ ہے کہ اَوۡ تَعۡتَلِقُ کلَّ النُّفوسِ

زجاج نے اس قول کو رد کیا ہے اور کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اَوۡ تَعۡتَلِقَ نَفۡسِیۡ حِمَامُها۔ زجاج نے ابوعبیدہ کے قول کو دو لحاظ سے غلط ٹھہرایا ہے:

(۱) بَعۡض، کُل کے معنی میں نہیں ہوسکتا ہے۔

(۲) سارے محرمات کو حلال کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ سارے محرمات میں جھوٹ، ظلم اور قتل وغیرہ بھی شامل ہیں۔

تفسیر:

جناب عیسیٰؑ کی ذمہ داریاں

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ (اور جو میرے سامنے (توریت) ہے اس کی تصدیق کرنے آیا ہوں) اور جو مجھ سے قبل توریت نازل کی گئی ہے اور جو کچھ اس میں میرے متعلق بشارت ہے اور جو انبیا مجھ سے قبل بھیجے گئے (میں ان کی تصدیق کرنے والا ہوں) مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ (اور میں اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئی تھیں) یہ مُصَدِّقًا کے معنی پر معطوف ہے جس کی تقدیر یوں ہے: وَ لِاُصَدِّقَ مَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ

التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ ۔ تا کہ میں توریت کی تصدیق کروں جو مجھ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور تمہارے لیے حلال کروں گا (اس چیز کو جو تم پر حرام تھی) بیان کیا گیا ہے جو چیز ان کے لیے حلال کی گئی تھی وہ اونٹ کا گوشت اور آنتوں اور اوجھڑ کے اطراف میں موجود چربی اور بعض پرندے اور مچھلیاں بنی اسرائیل پر حرام تھیں ۔ یہ قتادہ، ربیع، ابن جریح اور وہب سے مروی ہے ۔ کہا گیا ہے کہ تا کہ میں تمہارے لیے روز شنبہ شکار کو حلال کر دوں ۔ یہ کلبی سے مروی ہے ۔

وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (اور میں تمہارے لیے اللہ کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں) (میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے) ایسی حجت کے ساتھ آیا ہوں جو میری صداقت کی گواہی دیتی ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) میری مخالفت اور میری تکذیب کرنے میں ۔ وَاَطِيْعُوْنِ (اور میری اطاعت کرو) جیسا کہ اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ (یقیناً اللہ میرا اور تمہارا دونوں کا ربّ ہے) یعنی میرا اور تمہارا مالک ہے ۔ جناب عیسیٰؑ نے یہ بات اس لیے کہی تا کہ نصاریٰ کے اس عقیدہ کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں کے خلاف حجت بن جائے جس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے اللہ کا بیٹا مت کہو، میں تو اس کا بندہ ہوں، جس طرح تم سب اس کے بندے ہو ۔

فَاعْبُدُوْهُ (لہٰذا تم اسی خدائے یکتا کی بندگی اختیار کرو)

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (یہی سیدھا راستا ہے) یعنی دین الٰہی ہے یعنی اس کی عبادت ہی سیدھا دین ہے ۔ رب اور صراط مستقیم کے متعلق ہم سورہ حمد میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں ۔

❀❀❀❀❀

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

پس جب عیسیٰ نے یہ محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو ان سے کہا کہ کون ہے جو خدا کی راہ میں میرا مددگار ہوگا؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔(۵۲) ہمارے پروردگار جو کچھ تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا ہے اور تیرے رسول کا اتباع کیا ہے تو ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔(۵۳) پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے جواب میں اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیر کرنے والوں میں اللہ سب سے بہتر ہے۔(۵۴)

الفاظ و معانی:

اِحْسَاس کے معنی قوتِ حاسة کے ذریعہ ادراک کرنا ہیں۔ اَلْحَسّ قَتْل ہے چونکہ اس کی تکلیف واذیت محسوس ہوتے ہیں۔

اَنْصَار نَصِيْر کی جمع ہے جیسے اَشْرَاف شَرِيْف کی جمع ہے۔

اَلْحَوَارِى کے لغوی معنی اَلْحَوْر کے ہیں اور یہ انتہائی شدید سفیدی ہے۔اسی سے اَلْحَوَارِىُّ مِنَ الطَّعَامِ (کھانا) ہے اپنی بہت زیادہ سفیدی کے سبب۔

اَلشَّاهِد: دیکھ کر کسی چیز کی خبر دینے والا ہے۔ یہ حقیقی معنی ہیں کبھی اس معنی میں تصرف کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: اَلْبُرْهَانُ شَاهِدٌ بِحَقٍّ (یعنی دلیل و برہان حق کے ساتھ گواہی ہے) یعنی یہ مشاہدہ کے ذریعہ مُخْبَرٌ بِہ (جس کی خبر دی جاتی ہے) کے مقام و منزل میں ہے۔ کہا جاتا ہے هٰذَا شَاهِدٌ (یعنی اسے شہادت و گواہی کے لیے آمادہ اور مہیا کیا گیا ہے)

اَلْمَكْر: التفات اور متوجہ ہونا۔ مکر اور حیلہ کے درمیان فرق ہے: حیلہ کبھی اس کا اظہار دشوار فعل کے

لئے ہوتا ہے جس سے بندے کو نقصان پہونچانے کا قصد وارادہ نہیں ہوتا۔ مکر ایسا حیلہ ہے جس کے ذریعہ غلام کو ایسے پھندے میں گرفتار کرنا اور باندھنا ہے جس کے ایک جانب گرہ ہوتی ہے جسے جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔

ترکیب:

کہا گیا ہے کہ یہاں مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ میں اِلٰی، مَعَ کے معنی میں ہے جیسے عرب کا یہ جملہ کہ اَلذَّوْدُ اِلَی الذَّوْدِ اِبِلٌ یعنی مَعَ الذَّوْدِ۔

زجاج نے کہا: یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حروف معانی میں سے بعض حروف دوسرے حروف کے معنی میں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لفظ کو مَعَ کے ذریعہ بیان کیا جاتا تو اس معنی کا فائدہ پہنچاتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اِلٰی ہی مَعَ کے معنی میں ہے۔ اگر آپ کہتے کہ ذَهَبَ زَيْدٌ اِلٰی عَمْرٍو تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ ذَهَبَ زَيْدٌ مَعَ عَمْرٍو اس لئے کہ اِلٰی غایت کے لئے ہے اور مع ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے معنی میں ہے۔ حروف کبھی کبھی فائدہ اور معنی پہنچانے میں قریب قریب ہوجاتے ہیں اور جو لغت کے علم میں کمزور ہوتا ہے وہ دونوں کا ایک معنی سمجھ لیتا ہے۔ اسی سے یہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ۔ اگر یہاں پر عَلٰی ہوتا تو یہی فائدہ پہنچاتا۔ فِی کے لغوی معنی ظرف کے ہیں اور عَلٰی کے معنی استعلاء کے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ اَلتَّمْرُ فِی الْجِرَابِ (کھجوریں بورے میں ہیں) اگر آپ عَلَی الْجِرَابِ کہتے تو صحیح نہ ہوتا۔ لیکن فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ کہنا صحیح ہے اس لئے کہ جذع (ڈالی) مصلوب پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جِذْع نے مصلوب کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔ اگر آپ زَيْدٌ عَلَی الْجَبَلِ یا فِی الْجَبَلِ کہتے تو دونوں صحیح ہے اس لئے کہ جَبَل زید پر مشتمل ہے۔ اس بیان کی بنا پر یہ معانی ان حروف میں معانی مجازی ہیں۔

تفسیر:

حواریون کا اعلان

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ (پس جب یہ محسوس کیا) یعنی پایا۔ کہا گیا ہے کہ دیکھا۔ کہا گیا ہے کہ جان لیا۔

عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ (عیسیٰؑ نے کہ بنی اسرائیل کفر وانکار پر آمادہ ہیں) ان کا کفر پر اصرار بڑھتا

جار ہا ہے، آیات اور معجزات کے ظاہر ہونے کے بعد تو جناب عیسیٰؑ نے اپنی قوم کے صاحبان ایمان سے سوال کرتے ہوئے ان کی آزمائش و امتحان لیا کہ ان کی نصرت و مدد سے متعلق ان کا عقیدہ کیا ہے؟

قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ (تو ان حواریون سے کہا کہ کون ہے جو خدا کی راہ میں میرا مددگار ہوگا؟) بیان کیا گیا ہے کہ جب جناب عیسیٰؑ نے اپنے قتل پر ان لوگوں کا عزم وارادہ جان لیا تو انھوں نے کہا: اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: اس کے معنی ہیں ان کافروں کے مقابلہ میں اللہ کی معاونت و مدد کے ساتھ میرا کون مددگار ہے؟ سدی اور ابن جریح سے روایت ہے۔

دوم: اللہ کی راہ میں میرا کون مددگار ہے؟ یہ حسن سے مروی ہے۔ اس لیے کہ جناب عیسیٰؑ نے لوگوں کو راہ خدا کی صرف دعوت دی تھی۔

سوم: دین کو قائم کرنے میں میرا مددگار کون ہے جو دین اللہ تک پہونچانے والا ہے؟ یعنی اس کے ثواب تک پہونچانے والا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ یہاں پر جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب عیسیٰؑ کو وعظ و نصیحت کے لیے بھیجا گیا تھا نہ کہ جنگ کے لیے تو انھوں نے حواریون سے مخالفت کرنے والوں کے مقابلہ میں کیوں مدد طلب کی، یہ سوال کرنے والوں سے کہا جائے گا کہ کافروں کی اس جماعت کے مقابلہ میں مدد طلب کی تھی جو جناب عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہتے تھے، ان کے دعوت دین کے اظہار کے موقع پر۔ یہ حسن اور مجاہد سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ممکن ہے قیام حجت کے لیے نصرت چاہی ہو نیز تاکہ موافق مخالف کا پتہ چل جائے۔

قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ (حوارِیُّوں نے جواب دیا) حواریون کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے اور اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: یہ لوگ اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھتے تھے۔ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔

دوم: ان کا پیشہ کپڑے دھونا تھا، وہ کپڑے کو کوٹ کوٹ کر سفید کرتے تھے۔ یہ ابن ابو نجیح اور ابوارطاۃ سے مروی ہے۔

سوم: یہ لوگ شکاری تھے، مچھلیاں شکار کرتے تھے۔ یہ ابن عباس و سدی کا قول ہے۔

چہارم: انبیاء کے مخصوصین تھے۔ یہ قتادہ اور ضحاک سے مروی ہے۔

یہ وجہ زیادہ مناسب ہے چونکہ ان کی اس نام کے ذریعہ مدح کی گئی ہے گویا ان لوگوں نے اپنے قلوب کو حضرت عیسیٰؑ کی نصرت ومدد سے ایسا پاک صاف بنالیا تھا جیسے سفید کپڑے کو دھوکر پاک صاف کیا جاتا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا: میرے پھوپھی زاد بھائی اور زبیر میرے حواری (اصحاب) میری امت سے ہیں۔ حسن نے کہا ہے کہ حواری یعنی مددگار اور حواریون یعنی انصار۔ کلبی اور ابوروق نے بیان کیا ہے کہ حواریون حضرت عیسیٰؑ کے منتخب (مخلص اور خالص دوست) تھے جو بارہ مرد تھے۔ عبداللہ بن مبارک نے بیان کیا ہے کہ انھیں حواری کہنے کی وجہ ان کا نورانی ہونا ہے، ان پر عبادت کے آثار، عبادت کا نور اور حسن تھا جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (سورۂ فتح، آیت ۲۹: کثرتِ سجود کی بنا پر ان کے چہروں پر سجدہ کے نشانات پائے جاتے ہیں)

نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ (ہم اللہ کے مددگار ہیں) یعنی ہم آپ کی قوم سے کافروں کے مقابلہ میں اللہ کے مددگار ہیں یعنی اللہ کے رسول کے مددگار ہیں اور اللہ کے دین کے ناصر ومددگار ہیں۔

آمَنَّا بِاللَّهِ (ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں) یعنی ہم اللہ کے یکتا ہونے کی تصدیق کرتے ہیں، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

وَاشْهَدْ (اور آپ گواہ رہیں) اے عیسیٰ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (کہ ہم مسلمان ہیں) یعنی ہمارے لیے اللہ کی بارگاہ میں گواہ بن جایئے ہمارے اسلام پر گواہی دیجیے، اس لیے کہ انبیاء قیامت کے روز اس کی مخلوق پر گواہی دیں گے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا (سورۂ نحل، آیت ۸۹: اور قیامت کے دن ہم ہر گروہ کے خلاف ان ہی میں کا ایک گواہ اٹھائیں گے)

رَبَّنَا اے ہمارے پروردگار آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ (جو کچھ تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا ہے) یعنی جو تو نے حضرت عیسیٰؑ پر نازل فرمایا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ (اور تیرے رسول کا اتباع کیا ہے) یعنی ہم نے اس کی پیروی کی۔ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (تو ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے) ہمیں ان تمام چیزوں کی گواہی دینے والوں میں (قرار دے) جو تو نے نازل فرمائی ہیں تاکہ ہم بھی اسی طرح کامیاب ہوں جس طرح وہ لوگ کامیاب ہوئے اور وہ تیری جس کرامت وبزرگی تک پہونچے اس تک ہماری بھی رسائی ہو۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت سے قرار دے دے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے اس لئے کہ اللہ نے اپنے اس ارشاد میں انھیں شہداء کہا ہے:

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ تیری جانب سے حق پر گواہ ہوں۔ یہ تمام حواریوں کے قول کی حکایت ہے۔

روایت کی گئی ہے کہ حواریوں نے جناب عیسیٰؑ کی پیروی کی جب انھیں بھوک لگتی تو کہتے: اے روح اللہ! ہم بھوکے ہیں۔ جناب عیسیٰؑ اپنا ہاتھ زمین پر مارتے چاہے میدانی علاقہ ہوتا یا پہاڑی علاقہ، اس سے ہر انسان کے لیے دو روٹیاں باہر نکلتیں جنھیں وہ کھا لیتے۔ جب انھیں پیاس لگتی تو کہتے اے روح اللہ! ہمیں پیاس لگی ہے۔ عیسیٰؑ زمین پر اپنا ہاتھ مارتے چاہے علاقہ میدانی ہوتا یا پہاڑی علاقہ، اس سے پانی نکلتا جسے وہ پی لیتے۔ پھر کہتے: اے روح اللہ! ہم میں کون افضل ہے؟ جب ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں کھانا کھلا دیتے ہیں، جب چاہتے ہیں پانی پلا دیتے ہیں، ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: تم میں افضل شخص وہ ہے جو اپنے ہاتھ سے کام کرے اور اپنی کمائی سے کھائے۔ اس طرح انھوں نے کپڑے دھونا شروع کر دیئے۔

وَمَكَرُوا (پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے) یعنی بنی اسرائیل کے ان کفار نے مکر کیا، جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے: فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی انھوں نے قتل عیسیٰ کی تدبیر کی۔ وَمَكَرَ اللَّهُ (جواب میں اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی) یعنی اللہ نے ان کے مکر کی جزا دی۔ اللہ نے مکر پر جزا اور بدلہ کو بھی مکر کہا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۵؛ حالانکہ خدا خود ان کو مذاق بنائے ہوئے ہے)

تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آپ کی قوم کے ذریعہ نکالے جانے کے بعد اپنے حوارین کے ساتھ ان کی طرف واپس آئے اور انھیں (اللہ کی طرف) بلاتے ہوئے باآواز بلند دعوت دی، قوم نے ان کے قتل کرنے کی کوشش کی اور کھلم کھلا سب نے مل کر ان کے قتل پر اتفاق کیا، اس طرح انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مکر کیا اور اللہ نے ان کے ساتھ اس طرح مکر کیا کہ جس نے جناب عیسیٰؑ کے قتل کا ارادہ کیا کہ خود انھیں کے ساتھی کے درمیان شبہ پیدا کر دیا انھوں نے اسے قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا لیا۔

ابن عباس نے کہا ہے: جب بنی اسرائیل کے بادشاہ نے جناب عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تو ان کے پاس چھوٹے دروازے سے داخل ہوا جس میں روشن دان تھا، جبرئیلؑ نے انھیں روشن دان سے آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ بادشاہ نے ان میں سے ایک خبیث انسان سے کہا اندر داخل ہو جا اور عیسیٰؑ کو قتل کر دے۔ وہ اندر داخل ہوا، اللہ نے اس کو جناب عیسیٰؑ کی شبیہ بنا دیا، وہ اپنے ساتھیوں کو خبر دینے کے لیے باہر آیا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے اسے عیسیٰ خیال کرتے ہوئے قتل کر دیا اور سولی پر لٹکا دیا۔

وہب نے بیان کیا کہ لوگوں نے جناب عیسیٰؑ کو اسیر کیا اور انھیں سولی پر چڑھانے کے لیے صلیب کو نصب کیا، روئے زمین پر تاریکی پھیل گئی اور خداوند عالم نے فرشتوں کو بھیجا اور وہ جناب عیسیٰؑ اور لوگوں کے درمیان حائل ہو گئے، ان لوگوں نے یھوذا نام کے ایک شخص کو پکڑ لیا۔ اسی نے عیسیٰؑ کے بارے میں انھیں بتلایا تھا۔ اسی رات جناب عیسیٰؑ نے اپنے حواریین کو اکھٹا کر کے ان سے کہا تھا: تم میں سے ایک شخص مرغ کے صدا دینے سے قبل میرا ضرور انکار کرے گا اور بہت مختصر درہموں میں مجھے فروخت کر دے گا۔ حواریین وہاں سے نکل کر متفرق ہو گئے۔ ادھر یہودی عیسیٰؑ کو تلاش کر رہے تھے، ان کے پاس جناب عیسیٰؑ کا ایک حواری آ کر کہنے لگا: اگر میں تمھیں عیسیٰؑ کا پتہ بتاؤں تو مجھے کیا دو گے؟ انھوں نے اس کے لیے تیس درہم مقرر کیے۔ اس نے درہم لے کر جناب عیسیٰؑ کا پتہ بتا دیا۔ اللہ نے اس شخص کو جناب عیسیٰؑ کی شبیہ بنا دیا۔ لوگ گھر میں داخل ہوئے جناب عیسیٰؑ کو اٹھا لیا گیا لوگوں نے اس شخص کو پکڑ لیا وہ کہنے لگا: میں نے ہی تمھیں عیسیٰ کے بارے میں بتلایا ہے۔ وہ لوگ اس کی بات کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہوئے اور اسے عیسیٰ خیال کرتے ہوئے سولی پر لٹکا دیا، جب سولی پر لٹکا دیا گیا تو عیسیٰ کے مشابہ ہو گیا، ساتویں دن اللہ نے عیسیٰ سے فرمایا: مریم کے پاس جاؤ تا کہ وہ تمہارے لیے حواریین کو جمع کریں اور تم انھیں (اللہ کی جانب) بلانے اور دعوت دینے کے لیے زمین پر پھیلا دو حضرت عیسیٰؑ وہاں پہونچے پہاڑ روشن و منور ہو گیا۔ جناب عیسیٰؑ کے حواریین اکٹھا ہوئے پھر خداوند عالم نے جناب عیسیٰؑ کو اٹھا لیا۔ اسی شب میں نصاریٰ دھونی دے رہے تھے۔ جب حواریین نے صبح کی تو ان میں سے ہر ایک ان لوگوں کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جن کی طرف عیسیٰؑ کو بھیجا گیا تھا یہی ہے اللہ کے اس ارشاد کا مطلب کہ: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (اور ایسی تدبیر کرنے والوں میں اللہ سب سے بہتر ہے) یعنی اللہ بہترین اور سب سے برتر معاون و مددگار ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مکر کرنے والوں میں بہت زیادہ انصاف اور ان میں بہت زیادہ عدل کرنے والا ہے، اس لیے کہ ان لوگوں کا مکر ظلم ہے اور اللہ کا مکر عدل و انصاف ہے۔ اللہ نے مکر کی نسبت اپنی طرف دی ہے تا کہ کلام میں مزاوجت رہے (یعنی کلام کو ایک دوسرے کے مثل قرار دینا) جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۴: لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تم بھی ویسا ہی برتاؤ کرو جیسی زیادتی اس نے کی ہے) دوسری مرتبہ کہنا اعتدیٰ (یعنی زیادتی نہیں ہے) بلکہ وہ پہلے والے اعتدیٰ کا بدلہ اور جزا ہے۔ یہ بھی مجانست (ایک جیسا ہونے) مطابقت اور مقابلہ کے مانند بلاغت کی ایک قسم ہے۔ مجانست اس طرح ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (سورۂ نور، آیت ۳۷؛ جس دن کے ہول سے دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گی) مطابقت کی مثال اس کا یہ ارشاد ہے مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا (سورۂ نحل، آیت ۳۰؛ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ سب خیر ہے) مقابلہ کی مثال ہے: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۔ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۔ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۔ (سورۂ قیامت، آیات ۲۲ تا ۲۵؛ اس دن بعض چہرے شاداب ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی نعمتوں پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے اور بعض چہرے افسردہ ہوں گے۔ جنہیں یہ خیال ہوگا کہ کب کمر توڑ مصیبت وارد ہو جائے)

❁❁❁❁❁

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۵۵﴾

اور جب خدا نے فرمایا: اے عیسیٰ ہم تمھاری مدّتِ قیام دنیا میں پوری کرنے والے اور تمھیں اپنی طرف اٹھا لینے والے اور کفار کی خباثت سے نجات دلانے والے ہیں اور تمھاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر برتری عطا کرنے والے ہیں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کی بازگشت ہماری طرف ہوگی۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کردوں گا جن کے بارے میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ (۵۵)

ترکیب:

إِذْ میں عامل ارشاد الٰہی: وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ہے إِذْ قَالَ، یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ اس کی تقدیر یہ ہو سکتی ہے کہ: ذَٰلِكَ إِذْ قَالَ اللَّهُ وَتَمْثِيلُهُ ذَاكَ وَاقِعٌ إِذْ قَالَ اللَّهُ۔ پھر وَاقِعٌ کو حذف کر دیا گیا اور وہ إِذْ میں عامل ہے اور إِذْ کو اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا۔

لفظ عِيسَىٰ تقدیراً مضموم ہے اس لئے کہ منادیٰ مفرد ہے البتہ اس پر اعراب ظاہر نہیں ہوگا اس لئے

کہ اسم منقوص (مقصور) ہے اور یہ غیر منصرف ہے اس لئے کہ اسباب منع صرف میں سے دو سبب عجمہ اور تعریف (معرفہ ہونا) جمع ہیں۔

تفسیر

جناب عیسیٰؑ کی عظمتیں

خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مکر وفریب اور ان کے قتل کی کوشش کی وضاحت فرمانے کے فوراً بعد ہی جناب عیسیٰؑ پر اپنے لطف وعنایات اور حسن تدبیر کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰٓى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ (اور جب خدا نے فرمایا اے عیسیٰ ہم تمھاری مدّتِ قیام دنیا میں پوری کرنے والے ہیں) اس سے مراد کے سلسلہ میں متعدد اقوال بیان کئے گئے ہیں:

اول: میں تمھیں موت اور وفات دیئے بغیر زمین سے آسمان پر اٹھالوں گا۔ یہ حسن وکعب ابن جریح، ابن زید وکلبی وغیرہ کا قول ہے۔ اس قول کے مطابق متوفی کی دو تاویلیں ہوں گی:

اول: میں تمھیں اپنی جانب مکمل طور پر اٹھالوں گا، ان میں سے تمھیں کوئی (ضرر ونقصان) نہیں پہونچا سکتا، جیسا کہ عربوں کا یہ کہنا ہے: تَوَفَّيۡتُ كَذَا وَاسۡتَوۡفَيۡتُهٗ یعنی میں نے اسے مکمل حاصل کرلیا۔

دوم: میں نے تمھیں بطور سالم حاصل کرلیا۔

دوم: میں تمھیں نیند والی وفات دوں گا اور تمھیں اپنی طرف نیند (کی حالت) میں اٹھالوں گا۔ یہ ربیع سے مروی ہے۔ جناب عیسیٰؑ کو نیند کی حالت میں اٹھالیا جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کررہا ہے: وَهُوَ الَّذِىۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ بِالَّيۡلِ (یعنی وہ تمھیں رات میں موت دیتا ہے) اس لیے کہ نیند موت کا برادر ہے، خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الۡاَنۡفُسَ حِيۡنَ مَوۡتِهَا وَالَّتِىۡ لَمۡ تَمُتۡ فِىۡ مَنَامِهَا (سورۂ زمر، آیت ۴۲؛ اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اپنی طرف بلالیتا ہے اور جو نہیں مرتے ہیں ان کی روحوں کو بھی نیند کے وقت طلب کرلیتا ہے)

سوم: میں تمھیں نیند والی وفات دوں گا۔ یہ ابن عباس اور وہب سے مروی ہے۔ ان دونوں نے بیان کیا ہے: اللہ نے جناب عیسیٰؑ کو تین گھنٹوں کے لیے موت دی تھی لیکن نحویوں کا کہنا ہے کہ یہاں پر مقدم و مؤخر ہے یعنی اِنِّىۡ رَافِعُكَ وَ مُتَوَفِّيۡكَ میں تمھیں اٹھالوں گا اور تمھیں وفات (موت) دوں گا، اس لیے کہ

واؤ ترتیب کو ضروری قرار نہیں دیتی جیسا کہ اس کے ارشاد میں دلالت موجود ہے: فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (سورۂ قمر، آیت ۳۰؛ پھر سب نے دیکھا کہ ہمارا عذاب اور ڈرانا کیسا ثابت ہوا) اور نذر عذاب سے قبل ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (سورۂ اسراء، آیت ۱۵؛ ہم تو اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں) یہ ضحاک سے مروی ہے۔ اس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ روایت دلالت کر رہی ہے؛ آپ نے ارشاد فرمایا: عیسیٰؑ بن مریم مرے نہیں ہیں قیامت سے قبل وہ تمھاری طرف پلٹ کر آئیں گے۔

اسی طرح آنحضرتؐ سے صحیح السند روایت میں وارد ہوا ہے آپؐ نے فرمایا: اس وقت تم کیا کرو گے جب فرزند مریم تمھارے درمیان نازل ہوں گے اور تمھارا امام تمھیں میں سے ہوگا؟ اس روایت کو بخاری اور مسلم نے اپنی صحیح (کتب میں) نقل کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی تقدیر یوں ہوگی میں تمھارے آسمان سے نازل ہونے کے بعد موت کے ذریعہ تمھاری قبض (روح) کروں گا۔

وَرَافِعُكَ إِلَيَّ (اور تمھیں اپنی طرف اٹھا لینے والے ہیں) اس سلسلہ میں دو اقوال ہیں:

اول: میں تمھیں اپنے آسمان پر اٹھا لوں گا۔ (عیسیٰؑ کو) آسمان پر بلند کرنے کے لیے (بلندی کا نام) آسمان کی عظمت اور اس کے بلند مقام کے پیش نظر کہا گیا ہے یعنی میں تمھیں اس مقام پر بلند کروں گا جہاں تم پر میرے حکم کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

دوم: میں تمھیں اپنی کرامت کی طرف اٹھا لوں گا جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں ارشاد ہوتا ہے: إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ یعنی (میں وہاں جا رہا ہوں) جہاں کے لیے میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے۔ ابراہیمؑ کے شام جانے کو ان کے پروردگار کی طرف جانا کہا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا (اور کفار کی خباثت سے نجات دلانے والے ہیں) اس بارے میں دو اقوال ہیں:

اول: میں تمھیں ان کے درمیان سے نکال کر اور ان سے نجات دے کر تمھیں پاک کروں گا۔ اس لیے کہ یہ لوگ رجس (نجس و پلید) ہیں، جناب عیسیٰؑ کے لوگوں کے درمیان سکونت کو نجاست سے ملاقات جیسا قرار دیا ہے، اس اعتبار سے کہ (جناب عیسیٰؑ کو) ان لوگوں میں اور ان کے نزدیک رہنے کی احتیاج و ضرورت تھی۔

دوم: جناب عیسیٰؑ کا پاک کرنا اور ان کی طہارت کرنا انھیں کفر سے روکنا ہے جسے وہ لوگ (عیسیٰؑ)

کے قتل کے ذریعہ انجام دینا چاہتے تھے اس لیے کہ یہ عمل رجس (نجاست و کثافت) ہے جس سے اللہ نے جناب عیسیٰؑ کو پاک قرار دیا ہے۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (اور تمھاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر برتری عطا کرنے والے ہیں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے) یعنی جو لوگ آپ پر ایمان لائے انھیں ان پر توفیت دوں گا، جنھوں نے آپ کو جھٹلایا عزت، غلبہ فتح وظفر اور نصرت میں آپ کی تکذیب کی۔ کہا گیا ہے کہ برہان اور حجت میں آپ کی تکذیب کی، اس سے نصاریٰ مقصود ہیں۔ یہ ابن زید نے بیان کیا ہے۔ لہٰذا آپ یہودیوں کو نصاریٰ سے زیادہ ذلیل پائیں گے یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کا اقتدار ختم ہو چکا ہے اگرچہ نصاریٰ روم وغیرہ میں باقی اور موجود ہیں اور نصاریٰ یہودیوں سے زیادہ باوقار و باعزت ہیں اور قیامت تک ان کا مقام یہودیوں سے بلند رہے گا۔ جبائی نے کہا ہے کہ یہ چیز اس بات پر دلالت کر رہی ہے قیامت تک یہودیوں میں حکومت نہیں آئے گی جس طرح روم میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت مراد ہے انھیں تبعاً پیروی کرنے کا نام اسی لیے دیا گیا ہے اگرچہ ان کی شریعت جداگانہ اور علیحدہ ہے، ان کے درمیان شکل کے اعتبار سے (متابعت) پیروی پائی جاتی ہے باعتبار شکل پیروی کے معنی میں اس طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں انسان فلاں کا اتباع کرتا ہے جب وہ اس کے بعد آتا ہے اور یہ فلاں ہمارے پیغمبرؐ ہیں۔ آپؐ کی تصدیق جناب عیسیٰؑ نے کی اور ان کی کتاب کے ذریعہ آنحضرتؐ کی تصدیق کی گئی ہے جو کسی غیر کی تصدیق کرتا ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کی اتباع کرتا ہے۔ بلاشبہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام انبیا کی شریعت توحید کے ابواب میں متحد ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر وہ اس کے متبع اور پیروی کرنے والے ہیں، جب اس کے عقیدہ کے ماننے والے اور اس کے قول کے قائل ہوں یہ قول صحیح میں ہے، چونکہ اس میں اسلام کی طرف رغبت اور اس پر دلالت ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیامت تک غلبہ حاصل رہے گا اس لیے کہ جو جناب عیسیٰؑ کو اپنا الٰہ کہتا ہے وہ درحقیقت ان کا پیروکار نہیں ہے۔

ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ (پھر تم سب کی بازگشت ہماری طرف ہوگی) تمھاری بازگشت میری جانب ہے۔

فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ (اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا) یعنی میں تمھارے درمیان فیصلہ کروں گا۔ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (جن کے بارے میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے) یعنی جناب عیسیٰؑ کے بارے میں۔

❀❀❀❀❀

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِکَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡکَ مِنَ الۡاٰیٰتِ وَ الذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۵۸﴾

پس جن لوگوں نے کفر کی رَوِش اِختیار کی ہے انھیں مَیں دنیا و آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔(۵۶) اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے ہیں انھیں ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا اور خدا ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(۵۷) یہ جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں یہ ہماری نشانیاں اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں۔(۵۸)

قرائت:

حفص نے اور یعقوب سے رویس نے فَیُوَفِّیۡهِمۡ یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے نون کے ساتھ فَنُوَفِّیۡهِمۡ پڑھا ہے۔

حجت:

جن حضرات نے نون کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ فَاُعَذِّبُهُمۡ کے مانند ہے اور ارشاد الٰہی ذٰلِکَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡکَ مِنَ الۡاٰیَاتِ اس کو بہتر قرار دیتا ہے۔

اور جن قراء نے یاء کے ساتھ قرائت کی ہے تو وہ اس لئے ہے کہ ارشاد الٰہی: اِذۡ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَ رَافِعُکَ... میں ذکر الٰہی گزر چکا ہے۔ یہ لفظ خطاب (متکلم) سے غائب کی طرف پلٹ گیا ہے جیسے یہ آیت کہ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ہے۔ آیت الٰہی وَ مَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوةٍ کے بعد۔

ترکیب:

نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡکَ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ ذٰلِکَ کی خبر ہے اور ذٰلِکَ کا صلہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور ذٰلِکَ،

اَلَّذِیۡ کے معنی میں ہوگا۔ایسی صورت میں نَتۡلُوۡہُ کا کوئی محل اعراب نہ ہوگا اور تقدیر یہ ہوگی: اَلَّذِیۡ نَتۡلُوۡہُ۔

مِنَ الۡاٰیٰتِ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ خبر ہے۔اس کے مانند شعراء نے شعر کہے ہیں:

عدس ما لعباد عليك إمارة نجوت و هذا تحملين طليق

اس کی تقدیر وَالَّذِیۡ تَحۡمِلِیۡنَ طَلِیۡقٌ ہے۔

تفسیر

کافروں کی سخت سزا

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ (پس جن لوگوں نے کفر کی رَوِش اِختیار کی ہے انھیں میں دنیا وآخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا) دنیا میں ان پر عذاب ان کے قتل و اسیری، ذلت و رسوائی، ان کے زمین میں دھنس جانے اور ان پر جزیہ کے سبب ہے اور ہر اس چیز کے ذریعہ جس سے ان کی اہانت و توہین اور ان کی تحقیر ہو اور آخرت میں ان پر عذاب ان کا آتش جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ (اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا) یعنی ان سے عذاب الٰہی کا ٹالنے والا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ (اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے ہیں انھیں ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا) انھیں ان کے اعمال کی جزا فراوانی کے ساتھ مکمل عطا کیا جائے گا۔

وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ (اور خدا ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) اللہ انھیں بڑا بنانا اور انھیں ثواب دینا نہیں چاہتا، نہ ہی ان پر رحم کرے گا، نہ ہی ان کی تعریف کرے گا۔

یہ آیت اعمال کے احباط (بربادی) کے قائل کے خلاف دلیل و حجت ہے، اس لیے کہ خداوند عالم نے پورا پورا اجر و ثواب عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور ثواب کا پورا پورا عطا کیا جانا احباط کے منافی اور برعکس ہے۔

ذٰلِكَ یہ جناب عیسیٰ و جناب زکریا اور جناب یحییٰ علیہم السلام وغیرہ کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡكَ (ہم آپ کو سنا رہے ہیں) اسے ہم آپ پر پڑھتے ہیں اور اس کے بارے میں ہم آپ سے کلام (گفتگو) کرتے ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم جبرئیلؑ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اس کی آپ پر تلاوت

کریں۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

مِنَ الْاٰیٰتِ (یہ ہماری نشانیاں ہیں) یعنی تمام آیات اور حجتیں ہیں جو آپ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں جبکہ آپ نے انھیں جان لیا ہے جنھیں نہیں جانتا ہے سوائے قاری کتاب اور معلم (کتاب) کے، آپ ان میں سے کوئی ایک نہیں ہیں پس کوئی (صورت) باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ آپ نے اسے بذریعہ وحی جانا ہے۔

وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں) محکم قرآن کی صفت حکیم کہہ کر بیان فرمائی ہے، چونکہ اس میں حکمت موجود ہے، گویا یہ حکمت کے ذریعہ گفتگو کرتا ہے، جس طرح دلالت کو دلیل کہا جاتا ہے، اس میں موجود بیان کے سبب، اس لیے کہ وہ بیان اور برہان کے ذریعہ گفتگو کرتی ہے اگر چہ دلیل درحقیقت دالّ (رہنما ہی) ہے۔

❁❁❁❁❁

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۱﴾

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اللہ نے انھیں مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جاؤ اور وہ ہو گئے۔ (۵۹) یہ حق بات ہے جو تمھارے ربّ کی جانب سے بیان کی جا رہی ہے لہٰذا خبردار تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جانا جو اِس میں شک کرتے ہیں۔ (۶۰) علم آ جانے کے بعد (اے محمد) جو آپ سے اس بارے میں جھگڑا کرے تو اس سے کہہ دیجیے کہ آؤ ہم اور تم اپنے اپنے فرزندوں اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفوس کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں۔ (۶۱)

الفاظ و معانی:

اَلْمَثَل: ان تمام باتوں کا ذکر کرنا جو اس بات پر دلالت کریں کہ دوسرے راستہ وہی ہے جو پہلے کا راستہ ہے۔

تَعَالَوْا: اس کا مصدر عُلُو ہے، حقیقی معنیٰ بلندی کی طرف آنے کے ہیں۔ کثرت استعمال میں هَلُمَّ (آؤ) کے معنیٰ میں ہو گیا ہے۔

اِبْتِهَال کے بارے میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: اِلْتِعَان: ایک دوسرے پر لعنت کرنا

دوم: ہلاکت کی بد دعا کرنا۔ لبید شاعر کا ایک مصرع ہے:

نَظَرَ الدَّهْرُ اِلَيْهِمْ فَابْتَهَلَ

(زمانہ نے ان کی طرف دیکھا اور ان کے لیے ہلاکت کی بد دعا کی)

اَلْبَهْل مانند اَللَّعْن ہے اور یہ معصیت پر عذاب کے ذریعہ رحمت الٰہی سے دور ہونا ہے لہٰذا بے گناہ بچے اور کسی جانور اور ان دونوں کے مانند پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔

ترکیب:

جملہ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ کا کوئی محل اعراب نہیں ہے اس لئے کہ وہ نہ تو آدَمَ کی صفت ہوسکتا ہے اس لئے کہ نکرہ ہے اور نہ ہی آدم کے لئے حال ہوسکتا ہے اس لئے کہ ماضی ہے۔ وہ معنی میں متصل ہے لیکن لفظ میں علامات اتصال میں سے کسی علامت سے متصل نہیں ہے۔ پس یَکُوْنُ کی تقدیر پر رفع ہوگا۔

اَلْحَقُّ ، مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: ذٰلِكَ الْاِخْبَارُ فِيْ اَمْرِ عِيْسٰى الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ. ذٰلِكَ کو حذف کر دیا گیا اس لئے کہ شاہد حال اس پر دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَلْهِلَالُ وَاللّٰهِ یعنی هٰذَا الْهِلَالُ۔

کہا گیا ہے کہ اَلْحَقُّ مبتدا اور مِنْ رَّبِّكَ اس کی خبر ہے۔

شانِ نزول:

کہا گیا ہے یہ آیتیں نجران کے وفد عاقب وسید اور دونوں کے ساتھ موجود افراد کے بارے میں نازل ہوئیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے عرض کیا: آپ نے مرد کے بغیر فرزند کو دیکھا ہے؟! اس وقت اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ (بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے) آیات نازل ہوئیں اور آپ نے ان لوگوں کے سامنے ان تلاوت فرمائی۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور حسن سے مروی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآل وسلم نے ان لوگوں کو مباہلہ کے لیے دعوت دی تو انھوں نے اس میں ایک روز تک غور وفکر کی مہلت چاہی، جب وہ لوگ اپنے آدمیوں کے ہمراہ واپس پلٹ رہے تھے تو اسقف نے ان لوگوں سے کہا: اگر کل محمدؐ اپنے اہل وفرزند کے ہمراہ ہوں تو ان سے مباہلہ کرنے سے ڈرنا، اگر اپنے اصحاب کے ہمراہ ہوں تو ان سے مباہلہ کرنا۔ (اگر ایسا ہوا) تو وہ کسی دوسری چیز پر ہوں گے (نہ کہ دین پر) اگلے روز پیغمبر صلی اللہ وآلہ وسلم اپنے ہمراہ علی علیہ السلام اور حسنین علیہما السلام کو لیکر روانہ ہوئے جبکہ حضرت فاطمہ علیہا السلام آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ نصاریٰ کے آگے اسقف تھا، جب اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ہمراہ افراد کو آتے دیکھا تو ان کے بارے میں سوال کیا۔ اس سے کہا گیا کہ یہ ان کے چچا زاد برادر (علیؑ) ان کی دختر کے شوہر ہیں جو تمام مخلوق میں پیغمبرؐ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں، یہ دو ان کے نواسے ہیں جن کے والد علی علیہ السلام ہیں، یہ خاتون ان کی بیٹی فاطمہؑ ہیں جو ان کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ عزیز اور ان کے قلب سے بہت قریب ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے اور دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ ابو حارثہ اسقف نے کہا: بخدا یہ مباہلہ کے لیے اس طرح دو زانو ہو کر بیٹھے ہیں جس طرح انبیاء (علیہم السلام) بیٹھتے تھے، اس پر بزدلی طاری ہوگئی اور مباہلہ کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ سید نے کہا: اے ابو حارثہ! مباہلہ کے لیے آگے بڑھو! اس نے کہا: بخدا میں مباہلہ پر جری اور بہادر انسان کو دیکھ رہا ہوں، مجھے خوف ہے۔ اگر وہ صادق وسچا ہو تو خدا کی قسم ہم پر ایک سال نہیں گذرے گا کہ دنیا میں کوئی پانی پینے والا نصرانی باقی نہیں رہے گا۔ اسقف نے کہا: اے ابو القاسم: ہم آپ سے مباہلہ نہیں کریں گے بلکہ آپ سے مصالحت کریں گے، لہٰذا آپ ہم سے مقابلہ کے بجائے صلح کر لیجیے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو ہزار لباس جن میں ہر لباس کی قیمت چالیس درہم ہو اس سے جو کمی بیشی ہوگی وہ ان کے حساب میں ہوگی

تیس عدد ذرہوں اور تیس عدد نیزوں اور تیس عدد گھوڑوں پر صلح فرمائی۔ اگر آپ یمن میں ہوں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ضامن ہوگئے جب تک کہ وہ یہ چیزیں ادا کریں گے اس پر انھیں تحریر بھی لکھ کردی گئی۔

روایت کی گئی ہے کہ اسقف نے اپنے ساتھیوں سے کہا: میں وہ چہرے دیکھ رہا ہوں اگر وہ خدا سے پہاڑ کو اس کے مقام سے ہٹانے کی دعا کریں گے تو پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دے گا۔ مباہلہ نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، روئے زمین پر قیامت تک کوئی نصرانی باقی نہیں رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر یہ لوگ ہمارے سامنے انکساری اور ہماری فرماں برداری نہ کرتے تو بندروں اور سوروں کی صورت میں مسخ ہوجاتے اور ان کی وادی (علاقہ) میں آگ کے شعلے بھڑکتے اور نصاریٰ پر سال نہیں گذرتا کہ مگر یہ سب کے سب ہلاک ہوجاتے۔ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب نجران کا وفد واپس پلٹا، تو سید اور عاقب پر کچھ ہی زمانہ گذرا تھا کہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے اور عاقب نے آنحضرت کو عصا اور لباس، پیالہ اور نعلین ہدیہ کیے اور دونوں نے اسلام قبول کرلیا۔

تفسیر:

آیۂ مباہلہ

خداوند عالم نے نصاریٰ کے اس عقیدہ کہ عیسیٰؑ فرزند خدا ہیں کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے) یعنی مخلوق خدا میں عیسیٰؑ کی مثال بغیر باپ کے پیدا ہونے میں آدم کے مانند ہے جنھیں اللہ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر خلق فرمایا ہے۔ لہٰذا عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے پیدا کیا جانا آدمؑ کی خلقت سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے، پس نصاریٰ نے جناب عیسیٰ کی خلقت سے کیوں کر انکار کردیا جبکہ وہ آدمؑ کی خلقت کا اقرار کرچکے ہیں؟!

پھر خداوند عالم نے آدم کی خلقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: خَلَقَهٗ (کہ اللہ نے انھیں پیدا کیا) انھیں وجود بخشا مِنْ تُرَابٍ (مٹی سے) یہ آدمؑ کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسیٰؑ کو ہوا سے خلق کیا، اس سے قبل کسی کو ہوا سے خلق نہیں کیا تھا۔ جس طرح جناب آدم کو مٹی سے خلق کیا اور ان سے قبل کسی کو مٹی سے خلق نہیں کیا تھا۔

ثُمَّ قَالَ لَهٗ (اور حکم دیا) یعنی آدم کو ایک قول یہ بھی ہے کہ عیسیٰؑ کو حکم دیا کہ کُنۡ (ہو جاؤ) یعنی زندہ ٹھیک ٹھاک انسان ہو جا۔ فَیَکُوۡنُ (اور وہ ہو گئے) یعنی فوراً موجود ہو گئے جیسا کہ اللہ نے ارادہ کیا تھا۔ اس فقرہ کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے اور ہم نے اس کی وہاں پر وضاحت کی ہے۔

اس آیت میں غور و فکر کرنے اور استدلال کرنے کے صحیح ہونے پر دلالت ہے، اس لیے کہ خداوند عالم نے نصاریٰ پر حجت پیش کی ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے پیدا کیے جانے کے امکان پر جناب آدمؑ کے بغیر ماں باپ کے مانند پیدا کرنے پر دلیل پیش کی ہے۔

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ (یہ حق بات ہے جو تمھارے ربّ کی جانب سے بیان کی جارہی ہے) یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے حق ہے، اللہ نے تاکید اور بیانِ علت کے طور پر اپنی طرف نسبت دی ہے، یعنی یہ بات حق ہے چونکہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

فَلَا تَکُنۡ (لہٰذا اے سننے والے خبردار تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جانا!) مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ (جو اِس میں شک کرتے ہیں) اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔

فَمَنۡ حَآجَّکَ (اے محمد!) جو آپ سے اس بارے میں جھگڑا اور بحث و مجادلہ کرے) فیہ جناب عیسیٰؑ کے سلسلہ میں مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ (علم آجانے کے بعد) یعنی واضح برہان و دلیل آنے کے بعد کہ عیسیٰ میرے بندے اور رسول ہیں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جو آپ سے کٹ حجتی کرے حق کے بارے میں۔ فِیۡهِ کی ضمیرہٗ: اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ کی طرف پلٹ رہی ہے۔ فَقُلۡ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپؐ ان نصاریٰ سے کہہ دیجیے آؤ۔

نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَکُمۡ (ہم اپنے فرزندوں کو بلائیں تم اپنے فرزندوں کو بلاؤ) تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اَبۡنَآءَنَا سے حسن و حسین علیہما السلام مراد ہیں۔ ابو بکر رازی نے کہا ہے: یہ جملہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ حسنؑ و حسینؑ فرزندان رسولؐ ہیں اور دختر کا فرزند در حقیقت فرزند ہی ہے۔ معتزلہ کے ایک امام ابن ابو علان کا کہنا ہے: یہ جملہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ حسنؑ و حسینؑ اس وقت بھی مکلف تھے اس لیے کہ مباہلہ صرف بالغوں کے ساتھ جائز ہے۔ ہمارے علماء (شیعوں) نے کہا ہے: بچپنا اور عمر کا حد بلوغ سے کم ہونا کمال عقل کے منافی نہیں ہے۔ بلوغ کو احکام شرعیہ کے متعلق ہونے کے لیے حد قرار دیا گیا ہے۔ اس وقت بھی دونوں حضرات کی عمران کے کامل عقل ہونے سے مانع نہیں تھی، ہمارے نزدیک اللہ کا ائمہ کے

لیے خارق العادۃ امر قرار دینا اور انھیں اس چیز سے مخصوص قرار دینا جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو جائز و ممکن ہے۔ پس اس عمر میں غیر عادی کمال عقل ممکن ہے تو ان کے لیے اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا ظہور بھی ممکن ہیں جو ان حضرات کے اللہ کے نزدیک مقام و منزلت اور اس سے مخصوص ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ جس کی تائید روایات کر رہی ہیں؛ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اِبْنَایَ هٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا (میرے یہ دونوں فرزند (حسنؑ و حسینؑ) امام ہیں چاہے کھڑے ہوں چاہے بیٹھے ہوں۔)

وَنِسَآءَنَا (ہم اپنی عورتوں (کو بلائیں)) اس پر اتفاق ہے کہ اس سے فاطمہ زہرا علیہا السلام مراد ہیں اس لیے کہ خواتین میں آپ کے علاوہ مباہلہ میں کوئی دوسرا نہیں گیا تھا۔ یہ بات حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی تمام خواتین پر افضلیت پر دلالت کر رہی ہے، اس کی تائید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ روایت کر رہی ہے؛ آپؑ نے فرمایا کہ فاطمہ میرا پارۂ جگر ہے، جس نے فاطمہ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔ نیز آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: فاطمہ کے غضبناک ہونے سے اللہ غضبناک ہوتا ہے اور فاطمہؑ کے راضی ہونے سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ حذیفہ سے صحیح خبر میں وارد ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: میرے پاس فرشتہ آیا اور مجھے بشارت دی فاطمہؑ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں اور میری امت کی سردار ہیں۔ شعبی نے مسروق سے روایت کی کہ انھوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے، حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: پیغمبرؐ نے فاطمہؑ سے ایک راز کی بات کہی، جس سے وہ مسکرانے لگیں۔ میں نے اس بارے میں ان سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا: بابا نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم راضی نہیں ہو کہ تم اس امت کی عورتوں کی سردار ہو اور مومنین کی عورتوں کی سردار ہو؟! میرے مسکرانے کا سبب یہ بات ہے۔

وَنِسَآءَكُمْ (اے محمد! اپنی عورتوں کو بلاؤ) یعنی تم اپنی عورتوں میں سے جس کو چاہو بلاؤ۔

وَاَنْفُسَنَا (ہم اپنے نفوس کو بلائیں) یعنی خاص طور پر علی علیہ السلام مراد ہیں، اس سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہو سکتے اس لیے کہ خود پیغمبرؐ ہی دعوت دینے اور بلانے والے ہیں۔ انسان کا اپنے آپ کو کا دعوت دینا صحیح نہیں ہے، دوسروں کو دعوت دینا صحیح ہے، جب اَنْفُسَنَا ہے تو اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کی طرف اشارہ ہونا ضروری ہے، لہٰذا علی علیہ السلام کی طرف اشارہ ہونا واجب ہے اس لیے کسی نے مباہلہ میں علی علیہ السلام، آپؑ کی زوجہ اور آپؑ کے دونوں فرزندوں کے علاوہ کسی ان کے جانے دعویٰ نہیں کیا۔ یہ بات حضرت علی علیہ السلام کی انتہائی فضیلت اور آپؑ کے بلند مرتبہ پر دلالت کر رہی ہے۔ جس تک کسی کی رسائی ممکن

نہیں ہے، چونکہ آپؑ کو اللہ نے نفس رسولؐ قرار دیا ہے، یہ وہ شرف ہے جس تک کوئی نہیں پہونچ سکتا ہے، نہ ہی کوئی اس کے نزدیک جاسکا، اس کی تائید پیغمبرؐ سے وارد شدہ صحیح روایات کررہی ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے ایک صحابی کے متعلق دریافت فرمایا، قائل نے آپؐ سے کہا: پس علیؑ، آپؐ نے فرمایا: تم نے لوگوں کے متعلق سوال کیا ہے، تم نے میرے نفس کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد بریدہ اسلمی سے کہ: اے بریدہ علیؑ سے دشمنی نہ کرنا، اس لیے کہ علی مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں، لوگ مختلف درختوں سے خلق کیئے گئے ہیں۔ میری اور علیؑ کی خلقت ایک درخت سے ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد جنگ احد کے موقع پر جس وقت مشرکین سے جنگ زوروں پر تھی اور علیؑ اپنی جان کی بازی لگا کر پیغمبرؐ کی حفاظت میں مصروف تھے یہاں تک کہ جبرئیلؑ نے پیغمبرؐ سے عرض کی: یہ ہے مواسات وجاں نثاری! پیغمبرؐ نے فرمایا: اے جبرئیل! علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔ جبرئیل نے عرض کیا: میں آپ دونوں سے ہوں۔

وَاَنْفُسَكُمْ (تم اپنے نفوس کو بلاؤ) یعنی تم اپنے مردوں سے چاہے جسے لیکر آؤ۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ (اور پھر خدا کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ دعا کریں) ہم دعا میں گڑگڑائیں۔ ابن عباس سے روایت ہے۔ کہا گیا ہے، ہم لعنت کریں اور اس طرح کہیں اللہ جھوٹوں پر لعنت کرے۔

فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (ہم میں جو بھی جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت قرار دیں)

آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ نصاریٰ نے جان لیا تھا کہ حق پیغمبرؐ کے ساتھ ہے۔ اسی لئے انھوں نے مباہلہ نہیں کیا اور جزیہ قبول کر کے ذلت ورسوائی کا اقرار کرلیا۔ اگر وہ ایسا نہیں جانتے ہوتے تو یقیناً مباہلہ کرتے اور ایسا ہی ظاہر ہوتا جیسا کہ انھوں نے (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قول کے باطل ہونے کا گمان کیا تھا اور اگر پیغمبرؐ کو اپنے دشمن پر نزول عذاب کا یقین نہیں ہوتا تو آپؐ اپنی اولاد اور اہلبیتؑ کو ان سے شدید محبت کے باوجود اس مباہلہ میں شامل نہ فرماتے۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

یہ بالکل صحیح واقعات ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور وہ اللہ ہی ہے جس کی طاقت سب پر غالب اور جس کی حِکمت نِظامِ عالَم پر مُحِیط ہے۔ (۶۲) پس اگر یہ لوگ مقابلے سے منہ موڑیں تو اللہ مُفسِدوں کے حال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ (۶۳)

الفاظ ومعانی:

اَلْقَصَص جمع ہے قِصَّۃ کی، اسی سے قِصَاص مشتق ہے۔ قَصَص وہ خبر ہے جس کے ہمراہ معنی ہوں۔

اَلتَّوَلِّی عَنِ الْحَقِّ (حق سے انحراف) یعنی حق کے خلاف عقیدہ رکھنا یعنی حق کی طرف نے کے بعد اس سے پھر جانا۔ اَلتَّوَلِّی کے لغوی معنیٰ کسی چیز کا دوسری چیز کے ساتھ کسی فاصلہ کے بغیر آنا ہے (یا متصل ہونا ہے یعنی پہلی چیز کا دوسری چیز سے کوئی فاصلہ نہ ہونا)

اِفْسَاد: کسی کام کو حکمت کے تقاضوں کے برخلاف انجام دینا۔

اِصْلَاح کسی کام کو اس کی حکمت کے تقاضے کے مطابق انجام دینا۔

فساد اور قبیح کے درمیان فرق یہ ہے، کسی چیز کا اس کی اس مقدار سے بدل دینا جس کی طرف حکمت (عقل) دعوت دیتی ہے فساد ہے جبکہ قبیح ایسا نہیں ہے چونکہ قبیح میں مقدار کے معنی نہیں ہیں بلکہ قبیح (ہر وہ چیز ہے) جس سے حکمت روکتی اور مانع ہوتی ہے جس طرح حسن وہ ہے جس کی طرف حکمت (عقل) دعوت دیتی ہے۔

ترکیب:

وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ اس میں مِنْ کا داخل ہونا اللہ کے علاوہ سارے معبودوں کی نفی کی عمومیت کے لئے ہے اور مِنْ ہی یہ معنی دیتا ہے اس لئے کہ اس کے معنی ابتدائے غایت کے ہیں۔ لہٰذا دلالت کرتا ہے کہ نفی ابتدائے غایت سے انتہا تک سب کو شامل ہے۔ لَهُوَ ضمیر فصل بھی ہوسکتا ہے اور اہل کوفہ اسے عماد کہتے ہیں۔

اگر ضمیر فصل ہے تو اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوگا اور اَلْقَصَصُ، إِنَّ کی خبر ہے۔ لَهُوَ مبتدا بھی ہوسکتا

ہے اور اَلْقَصَصُ اس کی خبر اور پورا جملہ اِنَّ کی خبر۔

تفسیر:

برحق قصے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (یہ بالکل صحیح واقعات ہیں) یعنی ہم نے عیسیٰؑ وغیرہ کے سلسلہ میں جو آپؐ پر وحی کی ہے، وہ بالکل سچی گفتگو ہے۔ لہٰذا امر کے واضح ہونے کے بعد جو آپؐ کی مخالفت کرے وہ کھلا ہوا دشمن ہے۔ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے) یعنی تم میں سے الوہیت کے اسم کا کوئی مستحق نہیں ہے بجز خدا کے اور عیسیٰؑ الٰہ نہیں ہیں جیسا کہ نصاریٰ نے گمان کیا ہے بلکہ وہ تو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اگر چہ لوگ وہ مِنْ کے بغیر مَا اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ تو گذشتہ معنی حاصل نہ ہوتے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ (اور وہ اللہ ہی ہے جس کی طاقت سب پر غالب ہے) یعنی کمال پر قادر ہے۔ اَلْحَكِيْمُ (اور جس کی حکمت نظامِ عالم پر محیط ہے) وہ افعال و اقوال، تدبیر اور تقدیر میں صاحب حکمت ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر یہ لوگ آپؐ کا اتباع اور تصدیق کرنے سے اور آپ کی لائی ہوئی دلیلوں سے روگردانی کریں فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ (تو اللہ مُفسِدوں کے حال سے اچھی طرح باخبر ہے) یعنی اپنی مخلوق یہی سے فساد کرنے والے کو اس کے فساد کی جزا اور بدلہ دے گا۔ اللہ نے اسے وعید (عذاب سے ڈرانے) کے عنوان سے ذکر کیا ہے وگرنہ اللہ مفسد و مصلح ہر ایک کو جانتا ہے، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کسی سے کہے: میں تمھارے شر اور خرابیوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ (اللہ) ان ناحق مجادلہ کرنے والوں کو جانتا ہے کہ وہ آپؐ سے مباہلہ کرنے پر اقدام نہیں کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے نبی ہونے کو جانتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾

(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں: اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا رب نہ بنالے۔ (اے نبی) اب اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو صاف کہہ دیجیے کہ گواہ رہو ہم تو اطاعت گزار لوگ ہیں۔ (۶۴)

الفاظ و معانی:

زجاج نے کہا ہے: كَلِمَة یعنی ایسا کلام جس میں کسی بات کی شرح ہو، چاہے طولانی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے عرب قصیدہ کو كَلِمَة کہتے ہیں۔

سَوَآء یعنی عِدْل (برابر) سُوی بھی اسی معنی میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ سَوَآء مُسْتَوِی کے معنی میں ہے۔ مصدر ہے جسے اسم فاعل کی جگہ استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنی كَلِمَةٌ مُسْتَوِيَةٌ کے ہیں۔ زجاج کے نزدیک سَوَاء اسم ہے، صفت نہیں ہے۔

ترکیب:

اَلَّا نَعْبُدَ کے محل اعراب کے بارے میں دو صورتیں ہیں:

(۱) كَلِمَةٍ کا بدل ہونے کی بنا پر محلہ مجرور ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ۔

(۲) محلہ مرفوع ہے اس تقدیر کی بنا پر کہ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ۔

اگر اَنْ لَّا نَعْبُدُ بالرفع پڑھا جائے تو اَنْ، اَنَّ کا مخفف ہوگا گویا اس طرح فرمایا ہے: اِنَّهٗ لَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ جیسے یہ ارشاد الٰہی ہے: اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا (سورۂ طٰہٰ آیت ۸۹) ایسی صورت

میں نون لکھنے میں ثابت رہے گا اور اَنْ اسماء میں عمل کرنے والے حروف میں سے ہوگا اور پہلے قول کی بنا پر افعال میں عمل کرنے والے حروف میں سے ہوگا نون اور کتابت میں باقی نہیں رہے گا۔

اور اگر اَنْ لَّا نَعْبُدُ اِلَّا اللہ سکون کے ساتھ پڑھا گیا تو اَنْ مفسرہ ہوگا جیسا کہ ارشاد الٰہی اَنِ امْشُوْا (سورۂ ص آیت ۶ میں ہے) نَعْبُدَ نہی ہے۔

شانِ نزول:

اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: نصاریٰ نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ حسن، سدی، ابن زید، محمد بن جعفر بن زبیر سے مروی ہے۔

دوم: مدینہ کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ قتادہ، ربیع، ابن جریج سے مروی ہے۔ ہمارے علماء (شیعہ) نے بھی اس کی روایت کی ہے۔

سوم: بظاہر اہل کتاب کے دو فریقوں (گروہوں) کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ ابو علی جبائی کا نظریہ ہے۔ یہی نظریہ زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ عام ہے اور ہر ایک کو شامل ہے۔

تفسیر:

اہل کتاب کو یکساں بات کی طرف دعوت

اللہ نے قوم پر حجت تمام کرنے کے بعد انھیں توحید اور جس چیز پر ان کا اتفاق تھا اس کی پیروی کی دعوت دی کہ وہ حق ہے ارشاد فرمایا: قُلْ اے محمد! آپ کہہ دیں: یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا (اے اہلِ کتاب آؤ) اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ (ایک ایسی بات کی طرف جو یکساں ہے) یعنی کلمۂ عدل۔ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ (ہمارے اور تمھارے درمیان) یعنی (جو کلمہ) مبنی بر عدل ہے جس میں کسی طرف میلان اور جھکاؤ نہیں ہے جس طرح کہا جاتا ہے رَجُلٌ عَدْلٌ یعنی عادل شخص، جس میں کوئی جھکاؤ نہیں ہوتا۔ یعنی جو کلمہ ہمارے اور تمھارے درمیان برابر اور مساوی ہے جس میں غیر خدا کی عبادت ترک کرنا ہے وہ یہ ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللہَ (کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں) اس لیے کہ اللہ کے علاوہ عبادت کا کوئی سزاوار نہیں ہے۔

وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا (اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں) عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دیں۔ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ (اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا رَبّ نہ بنا لے) اس سے مراد کیا ہے اس میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ ہم میں سے بعض عیسیٰؑ کو پروردگار قرار نہ دیں، اس لیے کہ وہ انسانوں کی طرح ہیں۔ ہم احبار کو خدائی کا درجہ نہ دیں کہ ہم انھیں خدائی کا درجہ دیتے ہوئے ان کی اطاعت کریں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ (سورۂ توبہ، آیت ۳۱: ان لوگوں نے اپنے عالموں اور راہبوں اور مسیح بن مریم کو خدا کو چھوڑ کر اپنا رب بنالیا ہے)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: انھوں نے غیر اللہ کی عبادت نہیں کی لیکن انھوں نے لوگوں کے لیے حلال کو حرام کر دیا اور حرام کو حلال کر دیا یہی کام ان کا غیر اللہ کو خدائی کا درجہ دینا تھا نیز روایت کی گئی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: کیا وہ تمھارے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار نہیں دیتے تھے اور تم ان کی باتیں مانتے تھے کہا: ہاں۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ وہی تو ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا ((اے نبی) اب اگر وہ اس سے منہ موڑیں) اگر یہ لوگ بندگی کے اقرار سے انحراف کریں کہ کوئی بھی اس کے علاوہ عبادت کا سزاوار نہیں ہے۔ فَقُولُوا (تو صاف کہہ دیجیے) اے مسلمانو! تم ان کے حق سے انحراف کے مقابلہ میں اقرار کی تجدید کرتے ہوئے اور ان کی مخالفت میں اس طرح کہو: اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (کہ گواہ رہو ہم تو اطاعت گزار لوگ ہیں) (تم گواہ رہنا) ہم توحید کے مخلص اور اس کا اقرار کرنے والے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے جو اللہ کی جانب سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا اور انبیاء پر نازل کیا گیا ہم اسے تسلیم کرنے اور اس کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ کہا گیا ہے اسلام پر قائم رہنے والے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے اس کے بندہ کی تادیب و تربیت اور تعلیم ہے کہ وہ حجت و دلیل کے ظاہر ہونے کے بعد مخالف کے انحراف کرنے پر کیا کرے تاکہ باطل (انسان) کو معلوم ہو جائے کہ اس کی مخالفت اس کے حق میں مؤثر نہیں ہوگی تاکہ دلالت کرے اقلیت اور اکثریت کی پرواہ کیے بغیر اتباع حق واجب ہے۔

❀❀❀❀❀

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو، توریت اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو؟ (۶۵) جن چیزوں کا تمھیں علم تھا ان میں تو تم خوب بحثیں کر چکے اب ان معاملات میں کیوں الجھ رہے ہو جن کا تمھیں سرے سے علم ہی نہیں ہے بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۶۶)

قرائت:

اہل کوفہ نے هَآاَنْتُمْ مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور ابوعمرو نے بغیر ہمزہ اور بغیر مد کے پڑھا ہے مگر الف ساکن کے نکلنے کی حدف تک۔ ابن کثیر اور یعقوب نے ہمزہ اور قصر کے ساتھ بغیر مد کے هَاعَنْتُمْ کے وزن پر پڑھا ہے۔ ابن عامر نے راء کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔

حجت:

مد اور ہمزہ کے سلسلہ میں باتیں زیادہ ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ جس نے باقی رکھا ہے اس نے اصل کی بنا پر ایسا کیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں دو حروف ہیں۔ ھَا اور آنْتُمْ اور جس نے مد اور ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے تو اس کی دلیل معنی میں خلل ایجاد کئے بغیر تخفیف اور آسانی ہے۔

الفاظ و معانی:

حِجَاج (باہم جھگڑنے) اور جِدَال (بحث) کے درمیان فرق ہے۔ حِجَاج یا تو حُجت (دلیل) پر مشتمل ہوتا ہے یا حجت کی شکل وصورت کے مشابہ ہوگا۔

اَلْجِدَال: مخالف کو حجت یا شبہہ کے ذریعہ مختلف نظریات کی طرف فریب دینا ہے یا حقیقت کے وہم میں مبتلا کرنا ہے اس لیے کہ اس کی اصل جَدَل سے ہے جو شدید فریب دینا ہے۔

حُجَّة ایسا بیان ہے جو گفتگو کی صحیح ہونے گواہی دے حجت اور دلالت کے ایک ہی معنی ہیں۔

ترکیب:

هَاَنْتُمْ ۔ھَا تنبیہ کے لئے اور اس میں زیادہ تفسیر ہے اور ھا اَنْتَ میں زیادہ تنبیہ نہیں ہے اس لئے کہ هَاَنْتُمْ مبہم ہے۔ وہ ہر حاضر کو شامل ہوسکتا ہے اور اس میں یعنی ھا اَنْتَ میں مراد بعینہ مخاطب ہے کہ صرف اس کو شامل ہوگا۔ پس تنبیہ کے ذریعہ اسے قول بنایا گیا ہے تاکہ انسان کو بعینہ مخاطب کو تلاش کرنے پرا بھارا جائے۔ حالانکہ اَنْتَ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ فی الجملہ پر حاضر کو شامل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے بلکہ وہ صرف مخاطب کو شامل ہے۔

اَنْتُمْ کی خبر حَاجَجْتُمْ بھی ہوسکتا ہے اس بات پر ھٰٓؤُلَآءِ عطف بیان ہے اور اس کی خبر ھٰٓؤُلَآءِ بھی ہوسکتا ہے۔ اس بات پر بنا رکھتے ہوئے کہ اُولَآء، اَلَّذِیْنَ کے معنی میں ہے اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہے۔

شان نزول:

ابن عباس، حسن وقتادہ نے بیان کیا ہے کہ یہود کے احبار اور نصاریٰ نجران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہوئے اور ابراہیمؑ کے بارے میں تنازعہ شروع کردیا۔ یہودیوں نے کہا: (ابراہیمؑ) صرف یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا: صرف نصرانی تھے، اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

حضرت ابراہیمؑ کی عظمت

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ (اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟) یعنی اے اہل کتاب ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں تنازعہ اور مجادلہ کررہے ہو؟ اور دعویٰ کررہے ہو کہ وہ تمھارے دین پر تھے؟! وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ (توریت

اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں) یعنی انجیل و توریت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو؟) کہ برہان و دلیل کے بغیر دعویٰ پیش کرنا عقل کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس چیز پر دعویٰ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے جس کا غلط ہونا (پہلے ہی) ظاہر ہو چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اگر تم توریت و انجیل کے ابراہیم کے بعد نازل ہونا اس بات پر دلیل ہے کہ ابراہیم نہ تو یہودیت پر تھے، نہ ہی نصرانیت پر، تو لازمی ہے کہ قرآن کا ابراہیمؑ کے بعد نازل ہونا اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اسلام پر نہیں تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ (جناب ابراہیمؑ) کی ذات اسلام سے موسوم ہے، اس کے علاوہ یہودی دعویٰ کرتے ہیں اسلام یہودیت ہے، نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں اسلام نصرانیت ہے، جب کہ توریت و انجیل ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں، دونوں میں (ابراہیمؑ) کا نام اسلام ہی ہے۔ دونوں (توریت و انجیل) میں سے کسی میں بھی نہیں ہے کہ (ابراہیمؑ) دین یہودیت یا دین نصرانیت پر تھے البتہ قرآن اگرچہ جناب ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوا ہے اس میں ابراہیمؑ کے دین اسلام پر ہونا بیان کیا گیا ہے اور ان کے یہودی یا عیسائی ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ یہ ابراہیمؑ کے مسلمان ہونے کی واضح ترین دلیل اور حجت ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے اسلام کا نام ہی اولیٰ ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کا عقیدہ تھا یہودی توریت سے وابستگی رکھنے والے کا نام ہے جو شریعت موسوی کا عقیدہ رکھتا ہے۔ نصاریٰ کا ماننا تھا کہ نصرانی انجیل سے تمسک رکھنے والے اور ان کی شریعت کا عقیدہ رکھنے والے کا نام ہے۔ خداوند عالم نے دونوں فریقوں (گروہوں) کی رد فرمائی ہے اور باخبر کیا ہے کہ توریت و انجیل ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں، پس (ابراہیمؑ) ان دونوں کے حکم سے کس طرح متمسک اور وابستہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ حکم قرآن سے تمسک رکھنے والا مسلمان ہے جبکہ اسلام دین ہے احکام شریعت کے علاوہ۔ پس ہم جناب ابراہیم علیہ السلام کو مسلمان کہیں گے جس طرح قرآن نے کہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیا ابراہیمؑ ان تمام اسلامی احکام سے وابستہ تھے جن پر ہم ہیں؟! تو ہم کہیں گے کہ جناب ابراہیمؑ دین اسلام اور ہمارے پیغمبر کی شریعت کے بعض احکام سے وابستہ تھے، نہ کہ تمام احکام سے، اس لیے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت حکم شریعت ہے جو ابراہیمؑ کی شریعت میں نہیں تھا۔ ہم نے کہا: ابراہیمؑ مسلمان تھے، اگرچہ وہ شریعت کے بعض احکام سے وابستہ تھے۔ اس لیے کہ اصحاب پیغمبر آغاز اسلام میں شریعت کی تکمیل سے قبل اور قرآن کے مکمل نزول سے پہلے مسلمان تھے اور ہم میں ہر ایک درحقیقت مسلمان ہے اگرچہ وہ شریعت کے تمام

احکام پر عمل نہیں کرتا۔

هَٰأَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ اے یہود و نصاریٰ کے گروہ! بظاہر یہ انھیں خود اپنے آپ سے آگاہ کرنا ہے اس سے ان کی حالت کی طرف متوجہ کرنا مراد ہے، اس لیے کہ آگاہ کرنا اور توجہ دلانا اس وقت ہوتا ہے جب انسان غافل ہو اس وقت نہیں ہوتی جب وہ جانتا ہو۔

حَاجَجْتُمْ (تم خوب بحثیں کر چکے ہو) تم نے مجادلہ اور بحث و مباحثہ کیا۔ فِيمَا لَكُم بِهِ عِلْمٌ (جن چیزوں کا تمھیں علم تھا) یعنی تم نے بحث و مباحثہ کیا جب کہ تمھیں تورات و انجیل میں (ابراہیمؑ) کا نام موجود ہونے کا علم ہے۔

فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ (اب ان معاملات میں کیوں الجھ رہے ہو جن کا تمھیں سرے سے علم ہی نہیں ہے) یعنی تم (ابراہیمؑ) کے دین اور شریعت میں بحث و مباحثہ کیوں کر رہے ہو؟ جس کا تمھیں بالکل ہی علم نہیں ہے۔ اللہ نے انھیں اس بارے میں بحث و مباحثہ سے نہیں روکا ہے جس کا انھیں علم تھا بلکہ اس چیز میں بحث کرنے سے منع کیا ہے جس کا انھیں علم نہیں تھا۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ (بے شک اللہ جانتا ہے) اللہ ابراہیمؑ کی شان اور ان کے دین کے متعلق جانتا ہے اور وہ ہر اس چیز سے واقف ہے جس پر دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تمام معلومات کا عالم اور واقف کار ہے۔ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (اور تم نہیں جانتے) اس لیے ان کے متعلق گفتگو اور بحث نہ کرو اور جس چیز کے متعلق تم نہیں جانتے اس کی اللہ کی طرف نسبت نہ دو اور اس کا علم رکھنے والوں سے علم حاصل کرو۔

❀❀❀❀❀

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ وہ باطل سے کنارہ کش اور مسلمان تھے اور مشرکین میں سے ہرگز نہیں تھے۔(۶۷) ابراہیم سے سب سے زیادہ قربت کا حق انھیں پہنچتا ہے جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ اب یہ نبی اور مومنین اس قربت کے زیادہ حقدار ہیں اور اللہ مومنین کا حامی و مددگار ہے۔(۶۸)

الفاظ و معانی:

يَهُوْد و نَصَارٰى اور اَلْحَنِيْف کے حقیقی معنیٰ ہم سورۂ بقرہ میں بیان کر چکے ہیں۔

تفسیر:

حنیف مسلم

پھر اللہ نے یہود و نصاریٰ کی تکذیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا (ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی) اللہ نے ابراہیمؑ کو یہودیت اور نصرانیت سے منزہ (پاک و صاف) اور بری قرار دیا ہے۔ یہ دونوں لائق مذمت صفتیں ہیں جس پر قرآن اور اجماع دلالت کر رہے ہیں، یہ اس پر بھی دلالت کر رہا ہے کہ اسی طرح نہ تو موسیٰؑ یہودی تھے اور نہ ہی عیسیٰؑ نصرانی (عیسائی) تھے۔ بیشک دین اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے۔ یہودیت جناب موسیٰؑ کی تحریف شدہ شریعت ہے اور نصرانیت جناب عیسیٰؑ کی تحریف شدہ شریعت ہے۔ یہ دونوں یہودیت و نصرانیت مذموم صفتیں ہیں جو دونوں گمراہ فرقوں (گروہوں) پر جاری اور استعمال ہوتی ہیں۔

وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا (بلکہ وہ باطل سے کنارہ کش تھے) یعنی (ابراہیمؑ) تمام ادیان کو چھوڑ کر دین اسلام کی طرف مائل تھے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دین میں سیدھے اور مستقیم تھے۔ مُّسْلِمًا (اور مسلمان تھے) یعنی دین اسلام پر قائم تھے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (اور مشرکین میں سے ہرگز نہیں تھے) کہا گیا ہے کہ اس فقرہ میں یہودیت اور نصرانیت کے مشرک ہونے کا بیان ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد

یہ ہے کہ (جناب ابراہیمؑ) مشرک نہیں تھے جیسا کہ مشرکین عرب ادعا کرتے ہیں۔
اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ (ابراہیم سے سب سے زیادہ قربت کا حق انھیں پہنچتا ہے) حجت یا نصرت کے ذریعہ ابراہیمؑ کی مدد کے سب سے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ (جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے) ان کے وقت اور زمانہ میں، ان کے دشمن کے مقابلہ میں نصرت کے ذریعہ ان سے محبت کی، یہاں تک کہ ان کا امر غالب اور کلمہ بلند ہوا۔ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (اب یہ نبی اور مومنین اس قربت کے زیادہ حقدار ہیں) حجت کے ذریعہ ان کی نصرت و مدد کرتے ہیں جس پر ان کا حق ہے اور انھیں ہر عیب سے بری قرار دیتے ہیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے یہ کہنا سزاوار اور مناسب ہے کہ ہم دین ابراہیمؑ پر ہیں اور ان کے لیے ابراہیمؑ کی ولایت (محبت و دوستی) ہے۔
وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (اور اللہ مومنین کا حامی و مددگار ہے) اللہ مومنین کی نصرت و مدد کا (ولی) ذمہ دار ہے اور مومن اللہ کا ولی بالکل انھیں معنی میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس لیے کہ مومن کو اللہ دین میں جس کی نصرت کا حکم دیتا ہے وہ اس کی نصرت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر جداگانہ اور انفرادی طور پر آپ کی عظمت اور جلالت قدر کے سبب کیا ہے جیسا کہ جبرئیلؑ و میکائیلؑ کو انفرادی طور پر بیان کیا ہے۔ کہا گیا ہے: تاکہ ولایت میں داخل ہوں اور کنایہ ان کی طرف پلٹ رہی ہے، اس کی تقدیر یوں ہے: وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ۔
آیت میں اس چیز پر دلالت ہے کہ ولایت دین کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے، نسب سے نہیں۔ اس بات کو امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد تقویت پہونچا رہا ہے: اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِالۡاَنۡبِيَآءِ اَعۡلَمُهُمۡ بِمَا جَآؤُا بِهٖ انبیاء کی نسبت اولیٰ ترین انسان وہ ہے جو ان کے لائے ہوئے احکام کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ بعض نسخوں میں اَعۡمَلُهُمۡ ہے (یعنی انبیاء (علیہم السلام) کی لائی چیزوں پر سب سے زیادہ عمل کرنے والا ہو) پھر حضرتؑ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی اور فرمایا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دوست اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے اگرچہ وہ رشتہ میں آپؐ سے دور ہو اور آپؐ کا دشمن اللہ کی نافرمانی اور گناہ کرنے والا ہے اگرچہ وہ آپ کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔
عمر بن یزید سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں: امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم! تم آل محمدؐ میں سے ہو۔ میں نے عرض کی: میں خود انھیں میں سے ہوں؟! میں آپؑ پر قربان ہو جاؤں؟ امامؑ نے

فرمایا: ہاں بخدا انھیں میں سے ہو یہی فقرہ حضرتؑ نے تین مرتبہ دہرایا، پھر میری طرف دیکھا، میں نے امامؑ کی جانب دیکھا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: اے عمر! اللہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔

علی ابن ابراہیم نے اس کی روایت اپنے والد سے، انھوں نے ابن ابوعمیر سے، انھوں نے منصور بن یونس سے کی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَدَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ يُضِلُّوۡنَكُمۡ ؕ وَ مَا يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۹﴾
اے ایمان لانے والو! اہل کتاب کا ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں کسی طرح راہ راست سے ہٹا دے حالاں کہ وہ خود اپنے آپ کو گمراہی میں ڈال رہے ہیں مگر اس کا شعور نہیں رکھتے۔ (۶۹)

الفاظ و معانی:

'وَدَّتۡ': تمنا اور خواہش کی، وَدَّ جب تمنا کے معنی میں ہو تو ماضی، حال اور استقبال سب کی صلاحیت رکھتا ہے اسی لئے 'لَوۡ' کے ساتھ بھی لانا جائز ہے اور اگر محبت اور ارادہ کے معنیٰ میں ہو تو ایسا نہیں ہے چونکہ ان دونوں کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے، لہٰذا اس طرح کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ: اَرَادُوۡا لَوۡ يُضِلُّوۡنَكُمۡ اس لیے کہ ارادہ فعل کی طرف دعوت دینے کے موقع و محل میں آتا ہے یا ترتیب فعل کی علت کے محل میں آتا ہے البتہ تمنا کرنا یعنی کسی چیز کا نفس کے اندر مقرر اور جاگزیں کرنا ہے جس کے مقرر ہونے سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ وَدَّ لَوۡ تُضِلُّهٗ اور وَدَّ اَنۡ تُضِلَّهٗ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اَنۡ مستقبل کے لئے آتا ہے اور لَوۡ ایسا نہیں ہے۔

تفسیر:

اہل کتاب کی دلی تمنا!

اس آیت میں خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ چونکہ یہ لوگ گمراہ ہیں لہٰذا گمراہی کی طرف دعوت دیتے

ہیں، ارشاد ہوتا ہے: وَدَّتْ (اے ایمان لانے والو! (ایک گروہ) یہ تمنا کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ارادہ کرتا ہے۔ طَّآئِفَةٌ (گروہ) یعنی جماعت۔ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (اہل کتاب) یعنی یہود و نصاریٰ میں سے کہا گیا ہے کہ صرف یہود میں سے۔ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ (تمھیں کسی طرح راہ راست سے ہٹا دے) یعنی تمھیں گمراہی میں داخل کرکے اور اس کی طرف دعوت دے کر ہلاک کردیں۔ اَلضَّلَال گمراہی کو ہلاکت کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ یعنی کیا جب ہم زمین پر ہلاک ہو جائیں گے۔۔۔

وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (حالاں کہ وہ خود اپنے آپ کو گمراہی میں ڈال رہے ہیں) یعنی ان کی گمراہی کا وبال اور مصیبت نہیں پلٹیں گے مگر خود انھیں کی جانب اور ان کا ضرر انھیں سے ملحق ہوگا، یہ جو مسلمانوں کو اسلام چھوڑ کر دوسرے ادیان کو اپنانے کی طرف دعوت دے رہے ہیں مسلمان ان کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا ان لوگوں پر ایک تو کفر کا گناہ اور دوسرے کفر کی طرف بلانے کا وبال باقی رہے گا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے آپ ہی کو ہلاک کر رہے ہیں۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ (مگر اس کا شعور نہیں رکھتے) یہ نہیں جانتے کہ اس کا وبال خود انھیں کی طرف پلٹ رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں اس بات کا شعور نہیں ہے کہ خداوند عالم مومنین کو ان لوگوں کے گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کی باتیں بتا رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں شعور نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت کے سبب گمراہ ہیں۔ یہ ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔

❁❁❁❁❁

يَآهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يَآهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

اے اہلِ کتاب! تم آیات خداوندی کا انکار کیوں کر رہے ہو حالاں کہ تم خود ان کے گواہ ہو۔ (۷۰) اے اہلِ کتاب! تم حق کو باطل سے کیوں مُشتبہ کرتے ہو اور جانتے بوجھتے ہوئے حق کو کیوں چھپاتے ہو؟ (۷۱)

ترکیب:

لِمَ کی اصل لِمَا ہے۔ مَا سے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حرف جر کے متصل ہونے کی بنا پر۔ نیز وہ جار و مجرور واقع ہوا ہے اور اس لئے فتحہ الف پر دلالت کر رہا ہے۔ لِمَ کی طرح بِمَ اور عَمَّ بھی ہے۔

تفسیر

اہل کتاب کی سرزنش

خداوند عالم نے دونوں فریقوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ (اے اہلِ کتاب! تم انکار کیوں کر رہے ہو؟) اس چیز کا کیوں انکار کرتے ہو جس کی تم پر تلاوت کی جاتی ہے، بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (آیات خداوندی میں سے) یعنی قرآن کا۔

وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ (حالاں کہ تم خود ان کے گواہ ہو) یعنی تم جانتے ہو اور تم تورات و انجیل میں ان باتوں کا مشاہدہ کر رہے ہو جو اس قرآن کے صحیح ہونے اور اس کے اقرار کے فرض ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ دونوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر، آپؐ کی نبوت کی صداقت کی خبریں اور آپ کے صفات کا بیان موجود ہے۔ کہا گیا ہے کہ آیات الٰہی سے مراد ان کی کتب میں موجود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی بشارت ہے اور تم ان دلائل کو دیکھ رہے ہو جو آنحضرتؐ کی نبوت پر دلالت کر رہی ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آیات سے مراد ان کی کتب میں موجود ہے کہ ابراہیمؑ خالص مسلمان تھے اور دین دین اسلام ہے اور تم اس چیز کو دیکھ رہے ہو۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان پر تلاوت کی جانے والی عجیب وغریب باتیں ہیں جن کے متعلق یہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ ان کی کتب میں موجود ہیں۔ یہ ابو مسلم سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیات سے مقصود وہ حجتیں اور دلائل ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر دلالت کر رہی ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ پہلی چیز وہ معجزہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی صداقت اور نبوت کے ثبوت پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تم تنہائی میں ہوتے ہو تو دین اسلام کے صحیح اور برحق ہونے کی گواہی دیتے ہو۔

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ (اے اہلِ کتاب! تم حق کو باطل سے کیوں مشتبہ کرتے ہو؟) یعنی تم کو حق کو باطل سے میں کیوں ملاتے ہو؟ اس میں چند اقوال ہیں:

اول: اس سے ان لوگوں کا تورات وانجیل میں تحریف کرنا مراد ہے۔ یہ حسن اور ابن زید سے مروی ہے۔

دوم: اس سے ان لوگوں کا اسلام کا اظہار کرنا اور یہودیوں اور عیسائیوں کا دلوں میں نفاق کا پوشیدہ رکھنا مراد ہے اس لیے کہ یہ لوگ دن کے ابتدائی حصہ میں اسلام کا اظہار کرتے اور دن کے آخری حصہ میں دین اسلام سے پھر جاتے تھے تاکہ لوگوں کے درمیان شک پیدا کرسکیں۔ یہ ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے۔

سوم: اس سے موسیٰ وعیسیٰ پر ایمان اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے انکار مراد ہے۔

چہارم: اس سے مراد ہے وہ اپنے دل سے جانتے ہیں کہ محمدؐ زیادہ حق پر ہیں جن کی تکذیب کا وہ اظہار کررہے ہیں۔ یہ جبائی اور ابومسلم سے مروی ہے۔

وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (اور حق کو کیوں چھپاتے ہو؟) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور جس چیز کو تم نے ان کی صفت اور بشارت کے بارے میں اپنی کتابوں میں پایا ہے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (جانتے بوجھتے ہوئے) تم جانتے ہو کہ وہ حق ہیں۔ یہ آیت اہل کتاب کے علماء کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ پوشیدہ رکھنا چھوٹے گروہ سے ممکن ہے نہ کہ بڑے گروہ سے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم ان امور کے بارے میں جانتے ہو جن کے ذریعہ فرائض عائد کرنا درست ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ آیت میں (حق کو) پوشیدہ رکھنے کی مذمت کی گئی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۴﴾

اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ نبی کے ایمان لانے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کے وقت

انکار کر دو شاید اس ترکیب سے یہ لوگ بھی ایمان سے برگشتہ ہو جائیں۔(۷۲) نیز یہ لوگ آپس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ خبردار اپنے مذہب والوں کے سوا کسی اور کی بات کا اعتبار نہ کرنا۔ (پیغمبر) آپ کہہ دیجیے کہ اصل میں ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے (اور یہودی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرگز نہ ماننا) کہ خدا ویسی ہی فضیلت اور کرامت کسی اور کو دے سکتا ہے جیسی تم کو دی ہے (اور یہ بھی نہ ماننا) کہ خدا کے یہاں تم سے کوئی جھگڑا کرے گا۔ (اے رسول) آپ ان سے کہہ دیجیے کہ فضل و کرم تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا فرمادے (۷۳) اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے۔ (۷۴)

قرائت:

ابن کثیر نے آنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ میں آنْ کو مد کے ساتھ اور باقی قراء نے اَنْ یُّؤْتٰٓی بغیر مد اور استفہام کے پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن حضرات نے آنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ میں آنْ مد کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک اس کی تقدیر یہ ہے: لَا تُؤْمِنُوْٓا بِاَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ اور ارشاد الٰہی: قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ مفعول اور اس کے فعل کے درمیان جملہ معترضہ ہے اور جب آپ نے جار مِنْ کو مِنْ آنْ سے حذف کر دیا تو وہ برخلاف ہو جائے گا۔ خلیل کے قول کے مطابق جر ہوگا اور سیبویہ کے قول کے مطابق نصب ہوگا۔

لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ میں لام کو آسان نہیں ہے کہ آپ اسے تُؤْمِنُوْٓا کے متعلق قرار دیں جبکہ آپ اسے دوسرے حرف جر سے وصل کیے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ ایک فعل کو دو حرف جر کا متعلق قرار دیں گے۔ جس طرح ایک مفعولی فعل کو دو مفعول کی جانب متعدی کرنا صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ

فعل کو حرف جر کے ذریعہ متعدی بنانا اسے باب افعال اور باب تفعیل میں لے جا کر متعدی بنانے کے مانند ہے جس طرح یہ دونوں ابواب تکرار نہیں ہوتے ہیں۔ اسی طرح جار بھی تکرار نہیں ہوتا ہے۔

جب دو مفعول کو اس کا متعلق قرار دینا آسان نہیں ہے تو آپ اسے معنی پر حمل کریں گے اور مراد یہ ہوگا کہ لَا تُقِرُّوْا بِاَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ جس طرح آپ یہ کہتے ہیں: اَقْرَرْتُ لِزَيْدٍ بِاَلْفٍ ایسی صورت میں لام معنی سے متعلق ہوگا، زائدہ نہیں ہوگا۔ اس تعریف کی روشنی میں کہ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ لیکن جار اقرار سے متعلق ہے اور اگر آپ چاہیں تو اس جملہ کو معنی جحود پر بھی حمل کر سکتے ہیں گویا کہا ہے:

اِجْحَدُوا النَّاسَ اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۔ ایسی صورت میں لام زائدہ ہوگا۔

اس آیت کے علاوہ دیگر آیات میں اٰمَنَ کو لام کے ذریعہ بھی متعدی بنایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ (سورۂ یونس، آیت ۸۳) اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (سورۂ شعراء، آیت ۴۹) يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ توبہ آیت ۶۱) اس آیت میں ایک بار باء کے ذریعہ اور ایک بار لام کے ذریعہ متعدی ہوا ہے۔

ابن کثیر کی قرائت کی دلیل یہ ہے کہ اَنْ اپنے مابعد کے ساتھ متبدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ اسے ماقبل فعل پر حمل نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ استفہام نے دونوں میں جدائی ڈال دی ہے اور اس کی خبر تُصَدِّقُوْنَ بِهٖ وَ تَعْتَرِفُوْنَ بِهٖ اور اس جیسی کوئی اور چیز ہے جس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے: وَلَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۔ یہ ترکیب اس شخص کے قول کی بنا پر ہے جس نے اَزَيْدٌ ضَرَبْتَهٗ کہا ہے اور جس نے اَزَيْدًا ضَرَبْتَهٗ کہا ہے اس کے نزدیک اَنْ محلاً منصوب ہوگا۔ اَنْ اس معنی کی بنا پر محلاً منصوب ہوسکتا ہے کہ: تَذْكُرُوْنَ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ يا تَشِيْعُوْنَ۔۔۔ اس ترکیب پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے: اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ۔ ان لوگوں کا اس بارے میں بات کرنا ان کی جانب سے پھیلانا اور اعلان کرنا ہے اور اسی بات کی وجہ سے بعض نے بعض کی توبیخ کی ہے اسلئے کہ وہ جان گئے تھے کہ یہ امر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور پہچان گئے تھے کہ یہ آپ کی صفت ہے۔ پس یہ آیت ابن کثیر کی قرائت کے معنی میں ہے اور شاید یہ انھوں نے اپنی قرائت میں اسے معتبر مانا ہے۔

الفاظ ومعانی:

اَلطَّائِفَة: جماعت، گروہ۔ اس لغوی کے متعلق دو اقوال ہیں:

اول: ساتھیوں کی ایسی جماعت ہے جس کی یہ حالت ہے کہ وہ سفر کے دوران شہروں میں گھومتے ہیں جس سفر پر اجتماع واقع ہوتا ہے۔

دوم: ایسی جماعت ہے اس کے ذریعہ حلقہ اور دائرہ بنالیتے ہیں جس کے اطراف میں وہ گردش کرتے ہیں۔

وَجْهَ النَّهَار: دن کا ابتدائی حصہ۔ دن کے ابتدائی حصہ کو وَجْه (چہرہ) کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ابتدائی حصہ کا رخ تمھاری جانب ہوتا ہے اس طرح کپڑے کے پہلے حصہ کو وَجْهُ الثَّوب کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے چونکہ یہ اپنے اعلیٰ ہونے اور اس میں جو کچھ ہے اس کے اشرف ہونے میں چہرے کے مانند ہے۔

شان نزول:

حسن وسُدی کا بیان ہے کہ خیبر اور عرینہ قریوں کے بارہ (۱۲) یہودی احبار نے اس امر پر اتفاق کیا اور انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ دن کے ابتدائی حصہ میں زبانی طور پر محمدؐ کے دین میں داخل ہو جاؤ، عقیدہ کے اعتبار سے نہیں، اور دن کے آخری حصہ میں اس کا انکار کردو اور اس طرح کہو کہ ہم نے اپنی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنے علماء سے مشورہ کیا تو ہم نے پایا کہ محمدؐ اس طرح نہیں ہیں، ہم پر ان کا کذب اور ان کے دین کا باطل ہونا ظاہر وعیاں ہو گیا ہے، جب تم ایسا کرو گے تو ان کے اصحاب بھی ان کے دین میں شک کرنے لگیں گے اور کہیں گے کہ یہ اہل کتاب ہیں جو دین کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس وہ بھی اپنے دین سے پلٹ کر تمھارے دین کی طرف آجائیں گے۔

مجاہد، مقاتل اور کلبی نے بیان کیا ہے کہ یہ قبلہ سے متعلق ہے کہ جب کعبہ قبلہ قرار پایا تو یہودیوں پر بہت شاق گذرا۔ کعب بن اشرف نے اپنے ساتھیوں سے کہا: دن کے ابتدائی حصہ میں اللہ پر ایمان لے آؤ اور جو حکم کعبہ کے بارے میں محمدؐ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے ابتدائی حصہ میں کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لو اور دن کے آخری حصہ میں اپنے قبلہ کی طرف پلٹ جاؤ تا کہ ان کے درمیان شک پیدا ہو جائے (تا کہ وہ شک میں مبتلا ہو جائیں)

تفسیر:

اہل کتاب کی سازش اور اس کا جواب

اللہ نے سب سے پہلے اہل کتاب کے فریب کاریوں کا ذکر کیا اور اس کے فوراً ہی بعد اس شدید فریب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ ایک جماعت نے اپنے ساتھیوں سے کہا، مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (اہل کتاب میں سے) آپس میں ایک دوسرے سے کہا: اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (کہ نبی کے ایمان لانے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آؤ) اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب مراد ہیں۔

وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ (صبح کو اور شام کے وقت انکار کر دو) اس سے مراد کیا ہے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

اول: دن کے ابتدائی حصہ میں ان کے سامنے اظہار ایمان کرو اور دن کے آخری حصہ میں اس سے پلٹ جاؤ۔ یہ عمل ان کے دین سے پلٹنے کے لیے بہت مناسب اور بہتر ہوگی۔ یہ حسن اور ایک جماعت کا قول ہے۔

دوم: دن کے ابتدائی حصہ میں کعبہ کی جانب ان کے ساتھ نماز پڑھنے میں ایمان لے آؤ اور دن کے آخری حصہ میں اس سے انکار کر دو تاکہ وہ اپنے دین سے پلٹ جائیں۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔

سوم: دن کے ابتدائی حصہ میں اس پر ایمان ظاہر کرو جو تمھارے بارے میں محمدؐ کی صفت کے متعلق اقرار سے متعلق گذر چکا ہے۔ پھر دن کے آخری حصہ میں پلٹ جاؤ تاکہ انھیں وہم وشک میں مبتلا کر دو کہ محمدؐ کی صفت میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ بھی اپنے دین اسلام سے برگشتہ ہو جائیں پلٹ جائیں۔ یہ ابن عباس اور ایک جماعت سے مروی ہے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا (نیز یہ لوگ آپس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ خبردار کسی کی بات کا اعتبار نہ کرنا) یعنی تم تصدیق نہ کرنا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (اپنے مذہب والوں کے سوا) بجز یہودیت اور جو تمھاری شریعت پر قائم ہے، یہ گذشتہ پر عطف ہے۔ آیت کے معنی میں مختلف اقوال ہیں:

اول: تم اس بات کی تصدیق نہ کرنا کہ کسی کو بھی وہ چیز عطا کی گئی ہے جس طرح تمھیں علم وحکمت

، بیان اور حجت (دلیل) عطا کی گئی ہیں بجز اس کے جو اہل کتاب کے جو تمھارے دین کی پیروی کرے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بات خیبر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں سے اس لیے کہی تھی تا کہ وہ اس کا اعتراف نہ کرلیں اور وہ اس کے صحیح ہونے کے اقرار کے سبب ان کی ملامت کریں۔ (مخطوطہ نسخہ میں فَيَلُوْمُوْنَهُمْ بِهٖ' کے بجائے' فَيَلْزِمُهُمُ الْعَمَلُ بِهٖ ہے) جس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرح ان پر اس کا عمل کرنا واجب ہوجائے گا اس کی صحت کا اقرار کرنے کے سبب۔

یہ بھی کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حق کا اعتراف نہ کرنا بجز اس کے جو تمھارے دین کی پیروی کرے۔ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ تم باعتبار دین ان سے بہت زیادہ درست اور صحیح ہو ان کے لیے تم پر اللہ کی طرف سے حجت و دلیل نہیں ہوگی، یہ سب یہودیوں کی باتیں ہیں۔

یہ ارشاد الٰہی کہ: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۔ وَ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کلام الٰہی ہے جو یہودیوں کے جواب اور ان کی رد میں ہے یعنی اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو فقط اللہ کی ہدایت ہے اور کہہ دیجئے کہ فضل اللہ کے اختیار میں ہے لہٰذا انھیں اس بات کے انکار کا حق نہیں ہے کہ کسی کو اس طرح عطا کیا گیا ہے جس طرح انھیں دیا گیا ہے۔ یہ حسن اور ابوعلی الفارسی کا قول ہے۔

دوم: اس کا ارشاد: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ یہودیوں کا کلام ہو اور اس کے بعد والا جملہ اللہ کا کلام ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَيُّهَا الْمُسْلِمُوْنَ ((پیغمبر) آپ کہہ دیجیے کہ اصل میں ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے (اور یہودی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرگز نہ ماننا) کہ خدا ویسی ہی فضیلت اور کرامت کسی اور کو دے سکتا ہے جیسی تم کو دی ہے (اے مسلمانو!)) جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی تا کہ تم گمراہ نہ ہو اور یہ کہ وہ تمھارے پروردگار کے بارے میں تم سے بحث نہ کریں اس لیے کہ ان کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہے۔

اس آیت قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اس بات کی کراہت کے ساتھ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ یعنی اس شخص کو دے جو دین خدا کی مخالفت کرتا ہے اس لیے کہ اللہ جھوٹے اور کفار کی ہدایت نہیں فرماتا۔ لہٰذا غیر مومنین سے اللہ کی ہدایت دور ہے۔ اس طرح یہ اس کے قول کی تقدیر ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ كَرَاهَةَ اَنْ تَضِلُّوْا (خدا تمھارے لئے واضح کرتا ہے تمھاری گمراہی کو ناپسند کرتے ہوئے) ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہے: اے محمدؐ! آپ کہہ دیجیے کہ خیر کی طرف ہدایت اللہ کی ہدایت ہے، اے یہودیو اس

بات سے انکار نہ کرو کہ کسی کو اس کے مثل عطا کیا گیا ہے جس طرح تمھیں نبوت عطا کی گئی ہے۔

'اَوۡ' کہ یُحَآجُّوۡكُمۡ ((اور یہ بھی نہ ماننا) کہ تم سے کوئی جھگڑا کرے گا) اس سلسلہ میں تم سے بحث اور جھگڑا کرے گا۔ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ (خدا کے یہاں) اگر تم ان سے یہ قبول نہ کرو۔ یہ قتادہ ربیع اور جبائی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اس کے معنی ہیں یقیناً حق وہی ہے جس کا اللہ حکم کرتا ہے۔ پھر ہدایت کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے فرمایا: اَنۡ یُّؤۡتٰۤی اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ اَوۡ یُحَآجُّوۡكُمۡ کہ کسی کو وہ عطا کیا جائے جس طرح تمھیں دیا گیا ہے یا تم سے بحث کریں۔ پس عطا کی ہوئی چیز شریعت ہے اور جس کے ذریعہ بحث کی جاتی ہے وہ عقل ہے کلام کی تقدیر یہ ہے: اِنَّ هُدَى اللّٰهِ مَا شَرَعَ یعنی اللہ کی ہدایت اس کی شریعت اور احکام ہیں جس کا عقل سے عہد لیا گیا ہے۔ پس یہ چار اقوال ہیں۔

سوم: آیت کے شروع سے اس کے آخر تک اللہ کا کلام ہو جس کی تقدیر یوں ہو: اے صاحبان ایمان! تم ایمان نہ لانا سوائے اس کے جو تمھارے دین کی پیروی کرے اور وہ دین اسلام ہے، نہ ہی تصدیق کرنا کہ کسی کو دین سے سلسلہ میں وہ چیز عطا کی گئی ہے جیسی تمھیں دی گئی ہیں کہ تمھارے پیغمبرؐ کے بعد کوئی پیغمبرؐ نہیں آئے گا، نہ ہی تمھاری شریعت کے بعد قیامت تک کوئی شریعت ہوگی، نہ ہی تصدیق کرنا کہ تمھارے پروردگار کی جانب سے تم پر کسی کے لیے حجت ہوگی اس لیے کہ تمھارا دین ادیان میں سب سے بہتر ہے اور ہدایت فقط اللہ کی ہدایت ہے اور فضل (وشرف) اللہ کے اختیار میں ہے لہٰذا آیت کا پورا خطاب اللہ کی جانب سے مومنین سے ہے۔ مومنین پر یہودیوں کے (حق کو باطل سے مشتبہ کرنے) کے سبب تاکہ مسلمان راہ حق سے نہ ہٹ جائیں۔ اس پر وہ چیز دلالت کر رہی ہے جسے ضحاک نے بیان کیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں: ہم اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنے دین کے مخالف کے سامنے حجت پیش کریں گے پس خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ یہودی مغلوب ہوں گے اور مومنین ہی غالب ہیں۔

ارشاد: قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ ((اے رسول) آپ ان سے کہہ دیجیے کہ فضل وکرم تو) کہا گیا ہے کہ فضل سے نبوت مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ فضل سے وہ دلائل اور حجتیں مراد ہیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے ساتھیوں کو عطا کی گئی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دین اور دنیا کی نعمتیں مراد ہیں۔ بِیَدِ اللّٰهِ (اللہ کے ہاتھ میں ہے) یعنی خدا کی ملکیت میں ہیں جس پر وہ قادر ہے، اس کے محل ومقام کا عالم ہے۔

یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ (وہ جسے چاہے عطا فرمادے) اس جملہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ نبوت کسی کا

حق نہیں ہے اسی طرح امامت بھی ہے اس لیے کہ اللہ نے نبوت کو مشیت سے معلق کیا ہے۔ وَاللّٰهُ وٰسِعٌ (اور اللہ بڑی وسعت والا) رحمت میں جوادو سخی ہے۔ کہا گیا ہے کہ وسیع قدرت رکھتا ہے جو چاہتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔ عَلِيْمٌ (اور سب کچھ جاننے والا ہے) مخلوق کی مصلحتوں سے واقف اور کہا گیا ہے کہ بخوبی جانتا ہے اپنی رسالت (پیغام) کو کہاں قرار دے۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے) اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ ان آیات میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روشن اور واضح معجزہ ہے چونکہ اس میں قوم کے ان رازہائے سربستہ کی خبر دی گئی ہے جنھیں علام الغیوب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس آیت میں اہل کتاب کی فریب کاریوں سے دفاع اور مومنین کے لیے ان کے عقائد کے ثبات میں لطف ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس مال و دولت کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دو تو وہ تمھیں واپس کر دیں گے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک دینار کے معاملے میں تم ان پر بھروسا کرو تو وہ ادا نہ کریں گے الّا یہ کہ تم ان کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عرب کے جاہلوں کا حق مار لینے میں ہم پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرتے ہیں حالاں کہ انھیں معلوم ہے (کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ (۷۵) ہاں جو اپنے عہد کو پورا کرے اور برائی سے بچتا رہے تو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۷۶)

قرائت:

حمزہ نے اور ابوبکر سے عالم نے یُؤَدِّہٖ ھاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی بات ابوعمرو سے بھی مروی ہے۔ ابوجعفر اور یعقوب نے ہاء کو کسرہ اور اختلاس (امالہ) کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوعمرو کے نظریہ کے مطابق یہی صحیح ہے اور باقی قراء نے کسرہ اور اشباع کے ساتھ قرائت کی ہے۔

حجت:

جہاں تک ہاء کو ساکن کرنے کی بات ہے تو زیادہ تر علمائے نحو کہتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور زجاج نے اس بارے میں راوی کو غلط بتایا ہے۔ ابوعمرو سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: اور سیبویہ نے اس سے حکایت کی ہے اور اس طرح کے کلمہ کے لئے وہ قانون ہے کہ اسے ہلکا کسرہ دیا جائے گا۔

فراء نے کہا: یہ بعض عرب کا نظریہ ہے کہ ہاء کو ساکن کر دیتے ہیں جب اس سے پہلے حرف متحرک ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ضَرَبْتُہٗ جس طرح اَنْتُمْ اور قُمْتُمْ کے میم کو ساکن کر دیتے ہیں اور جہاں تک اختلاس (امالہ) کی بات ہے تو یاء کے بجائے کسرہ پر اکتفاء کی بنا پر ہے اور اشباع اصل اور قاعدہ کی بنا پر ہے۔

ترکیب:

تَأْمَنْہُ بِقِنْطَارٍ اور عَلٰی قِنْطَارٍ کے درمیان فرق یہ ہے کہ باء کے معنی الصاق امانت کے ہیں اور عَلٰی کے معنی استعلاء امانت کے ہیں اور معنی میں قربت کی بنا پر اس مقام پر دونوں پے در پے آتے ہیں جیسے آپ کا یہ کہنا: مَرَرْتُ بِہٖ وَ مَرَرْتُ عَلَیْہِ۔

بَلٰی کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

(ا) پہلے کے انکار کی بنا پر اس سے اضراب (اعراض) کیا ہے۔ اس معنی کی بنا پر جملہ: مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ... یہی کافی اور مکمل ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: مَا قَدِمَ زَیْدٌ اور کہا جائے: بَلٰی یعنی بَلٰی قَدْ قَدِمَ زَیْدٌ۔

زجاج نے کہا: یہاں پر وقف تام ہے پھر جملہ مَنْ اَوْفٰی اِلٰی آخِرِہٖ شروع ہوتا اس لئے کہ جب ان لوگوں نے کہا: لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ تو کہا گیا: بَلٰی عَلَیْھِمْ سَبِیْلٌ۔

(۲) پہلے والے سے اضراب واعراض اور دوسرے بیان پر اعتماد کیا گیا ہے۔ایسی صورت میں جملہٗ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مکمل جملہ نہیں ہے۔

بَلٰی اور نَعَمۡ میں فرق یہ ہے کہ بَلٰی نفی کے جواب میں آتا ہے اور نَعَمۡ مثبت کے جواب میں آتا ہے۔

بَلٰی میں امالہ جائز ہے اس لئے کہ وہ دو جہتوں سے اسم سے مشابہت رکھتا ہے:

(۱) اس پر وقف کیا جاتا ہے جس طرح اسم پر وقف کیا جاتا ہے۔

(۲) وہ تین حرفی ہے اسی لئے امالہ میں لا کے برخلاف ہے۔

شانِ نزول:

ابن عباس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: اللہ کے ارشاد: مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیۡكَ سے عبداللہ بن سلام مراد ہیں، جن کے پاس ایک شخص نے دو ہزار دو سو اوقیہ سونا بطور امانت رکھوایا تھا جسے انھوں نے ادا کر دیا۔ اللہ سبحانہ نے ان کی تعریف کی ہے اور: مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِیۡنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیۡكَ سے فنحاص بن عازورا مراد ہے۔ قریش کے ایک شخص نے ایک دینار اس کے پاس بطور امانت رکھوایا تھا جس میں اس نے خیانت کی۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ امانت کی ادائے گی کرنے والے نصاریٰ ہیں اور امانت کی ادائے گی نہ کرنے والے یہودی ہیں۔

تفسیر:

اہل کتاب میں دو کردار والے

پھر خداوند عالم نے اہل کتاب کی ایک جماعت کے عیوب (برائیوں) کا ذکر کیا، ان میں وہ بھی ہیں جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ (اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس مال و دولت کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دو) یعنی اہل کتاب میں سے (وہ لوگ) جنھیں آپ مال کثیر کا امین بنائیں، اس میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں ان کا ذکر ابتدائے سورہ میں گذر چکا ہے۔

يُؤَدِّهٖٓ اِلَيۡكَ (تو وہ تمھیں واپس کر دیں گے) جب بھی ان سے مطالبہ کیا جائے گا اس میں خیانت نہیں کریں گے۔ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ (اور بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک دینار کے معاملے میں تم ان پر بھروسا کرو) یعنی ایک دینار کے برابر قیمت، اس سے مراد ہے اگر آپ انھیں مختصر مال پر بھی امین بنائیں۔ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيۡكَ تو وہ مطالبہ کے وقت (آپ کو ادا نہیں کریں گے) یہ یہودی کفار ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔

اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآٮِٕمًا (الاّ یہ کہ تم ان کے سر پر سوار ہو جاؤ) یعنی آپ ان کے پیچھے لگے رہیں اور ان سے تقاضا کرتے رہیں۔ یہ حسن و ابن زید سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ ان سے مسلسل تقاضا اور مطالبہ کرتے رہیں۔ یہ قتادہ اور مجاہد کا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ ہمیشہ ان پر سوار رہیں، اجتماع کے ساتھ اور ان سے وابستہ رہیں۔ یہ سدی کا قول ہے، انھوں نے کہا ہے: آپ ان پر ہمیشہ قائم رہیں۔ ابن عباس سے روایت ہے۔ ذٰلِكَ اس خیانت کے حلال و جائز قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ (اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عرب کے جاہلوں کا حق مار لینے میں ہم پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا) یہ اس علت کا بیان ہے جس کے سبب وہ لوگ امانت ادا نہیں کرتے تھے اور خیانت کی طرف مائل رہتے تھے۔ یعنی یہودیوں کا کہنا تھا کہ عربوں کے اموال جو ہمیں حاصل ہوئے ہیں ان میں ہم پر کوئی سبیل (الزام) نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو مشرک ہیں، یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ وہ اپنے اس دین سے خارج ہو چکے ہیں جس پر ہم نے ان سے معاملہ کیا تھا، اس لیے کہ انھوں نے ان کی جماعت سے معاملہ کیا تھا، پھر جس کا حق تھا اس نے اسلام قبول کر لیا، جس پر حق تھا وہ ادائے حق سے مانع ہوا (حق سے انکار کر دیا) انھوں نے کہا کہ ہم نے تم سے معاملہ کیا تھا اس وقت تم ہمارے دین پر تھے لہٰذا جب تم نے اسے ترک کر دیا تو تمھارا حق ساقط ہو گیا، انھوں نے دعویٰ کیا یہ بات ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ اللہ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ ان کی تکذیب فرمائی ہے کہ: وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (وہ اللہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرتے ہیں حالاں کہ انھیں معلوم ہے (کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی) یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں اس لیے کہ خدا نے انھیں اس کے برخلاف حکم دیا ہے جو وہ کہہ رہے ہیں۔ یہ حسن و ابن جریج سے مروی ہے۔ انھیں ان کے اہل کتاب نہ ہونے اور ان کے مکہ کا ہونے جو کہ ام القریٰ ہے کے سبب امیین کہا گیا ہے۔ خدا نے ان اہل کتاب کی باتوں کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: بَلٰى (ہاں!) اس میں ماقبل کی نفی اور

مابعد کا اثبات ہے، گویا کہا ہے کہ اللہ نے انھیں اس کا حکم نہیں دیا ہے، نہ ہی وہ اسے پسند کرتا ہے، نہ ہی اسے چاہتا ہے بلکہ اس نے ایفائے عہد اور ادائے امانت کو واجب قرار دیا ہے۔

مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ (جو اپنے عہد کو پورا کرے) ممکن ہے بِعَهْدِهٖ کی 'ہ' اسم اللہ کی طرف پلٹ رہی ہو، اس کا ارشاد ہے: وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اس کے معنی عہد الٰہی کے ہیں۔ بندوں سے اللہ کا عہد اس کا امر و نہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے ضمیر 'ہ' 'مَنْ' کی طرف پلٹ رہی ہو تو ایسی صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خود اپنے عہد کو پورا کرنے والے سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ کبھی عہد کی نسبت عَاهِد (عہد کرنے والا) کی طرف ہوتی ہے، کبھی مَعْهُوْدٌ لَهٗ (جس کے لیے عہد کیا جائے) کی جانب ہوتی ہے۔

وَاتَّقٰى (اور برائی سے بچتا رہے) خیانت اور نقض عہد (سے پرہیز کرے) فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (تو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ متقین سے محبت کرتا ہے مگر اس نے ذکر متقین کی طرف عدول کیا تاکہ اس صفت کو بیان کرے جس سے اللہ کی محبت واجب ہوتی ہے اور یہ صفتِ مومن ہے گویا وہ فرما رہا ہے اللہ مومنین سے محبت کرتا ہے، یہودیوں سے محبت نہیں کرتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے، راوی کہتا ہے کہ جب اس آیت کی تلاوت کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: دشمنان خدا نے جھوٹ بولا ہے جو چیز بھی دور جاہلیت میں تھی وہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے امانت کے اس لیے کہ امانت نیک اور فاجر ہر ایک کی ادا کی جائے گی۔ یہ روایت بھی آپ سے ہی منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس میں تین صفتیں موجود ہوں وہ منافق ہے اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور وہ گمان کرتا ہو کہ وہ مومن ہے:

۱۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲۔ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔

۳۔ جب اسے امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

نیز ارشاد فرمایا ہے: اگر کسی (شخص) کو کسی امانت کا امین بنایا جائے اگر وہ چاہتا ادا نہ کرتا پھر بھی ادا کرے تو خداوند عالم اس شخص کی حور العین سے شادی کرائے گا جس حور سے وہ چاہے گا۔

❀❀❀❀❀❀

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

بے شک جولوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت میں بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں، اللہ نہ تو اُن سے ہم کلام ہوگا اور نہ ہی قیامت کے دن اُن کی طرف دیکھے گا اور نہ ہی انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ (۷۷)

شانِ نزول:

یہ آیت یہودی احبار کی جماعت ابورافع وکنانہ بن ابوحقیق اور حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے تورات میں موجود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاملہ کو چھپایا تھا اور اس کے علاوہ اپنے ہاتھوں سے لکھ دیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ رسالت اور پیروکاروں پر اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکلنے نہ پائے۔ یہ عکرمہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اشعث بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ ایک زمین کے بارے میں اس سے اختلاف کیا گیا تو وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور قسم کھانے کے لئے کھڑا ہوا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور حق کا اعتراف کرتے ہوئے زمین واپس پلٹادی۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے جنس کے انفاق پر جھوٹی قسم کھائی تھی۔ یہ مجاہد اور شعبی سے مروی ہے۔

تفسیر:

عہدِ الٰہی کا سودا کرنے والوں کا انجام

پھر خداوند عالم نے لوگوں کے افعال خبیثہ پر وعید (عذاب سے ڈرانے) کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ (بے شک جولوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو بیچ ڈالتے ہیں) (عہد الٰہی کو) تبدیل کر لیتے ہیں بِعَهْدِ اللّٰهِ یعنی امر الٰہی، جس کا پورا کرنا واجب ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ

جو لوگ حاصل کرتے ہیں عہد الٰہی کو توڑ کر۔

وَاَيْمَانِهِمْ (اور اپنی قسموں کو) جھوٹی قسموں کے ذریعہ، ثَمَنًا قَلِيْلًا (تھوڑی سی قیمت میں) عوض میں مختصر عطیہ۔ قلیل اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ قیمت ان سے فوت اور ضائع ہونے والے ثواب کے مقابل قلیل و مختصر ہے اور انھیں ملنے والے عذاب کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ کہا گیا ہے کہ عہد سے مراد انسان پر اللہ کی طرف سے واجب کی گئی اطاعت کرنا اور معصیت سے باز رہنا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عہد سے مراد وہ چیز ہے جو انسانی عقل میں باطل سے روکنے اور حق کی اطاعت میں سے موجود ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں) یعنی ان کے لیے آخرت کی نعمتوں میں وافر مقدار میں حصہ نہیں ہے۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ (اللہ نہ تو اُن سے ہم کلام ہوگا) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: (اللہ) ان سے مسرور اور خوش کرنے والی گفتگو نہیں کرے گا بلکہ حساب و کتاب کے وقت ان سے ایسی گفتگو کرے گا جو انھیں بری معلوم ہوگا۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

دوم: اللہ ان سے بالکل ہی کلام نہیں کرے گا، بلکہ حکم خدا سے ملائکہ کے کلام سے ان سے محاسبہ کیا جائے گا، جس سے ان کی تحقیر و توہین ہوگی۔

وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور نہ ہی قیامت کے دن اُن کی طرف دیکھے گا) یعنی ان پر لطف و مہربانی نہیں ہوگی جس طرح کہنے والا کسی سے کہتا ہے کہ اُنْظُرْ اِلَيَّ یعنی مجھ پر رحم کرو۔ اس فقرہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ جب نَظَرَ حرف اِلٰی کے ساتھ متعدی ہو تو رویت (ظاہری طور پر دیکھنے کے معنیٰ میں نہیں ہوگا اس لئے کہ یہاں پر اس معنیٰ پر حمل کرنا صحیح نہیں ہے کہ خدا انھیں نہیں دیکھے گا بلکہ خدا ان پر نظر رحمت نہیں کرے گا۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔

وَلَا يُزَكِّيْهِمْ اور نہ ہی انھیں پاک کرے گا؛ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھیں ازکیاء (پاکیزہ افراد) کے مقام و مرتبہ میں قرار نہیں دے گا۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے انھیں مغفرت کے ذریعہ گناہوں کی نجاست سے پاک نہیں کرے گا بلکہ ان پر عذاب کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان ازکیاء نہیں کہے گا بلکہ انھیں کافر و فاجر کہے گا۔ یہ قاضی سے مروی ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان کے لیے دردناک، تکلیف دہ اور اذیت ناک عذاب ہوگا۔ تفسیر کلبی میں

ابن مسعود سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: جو شخص اس لیے جھوٹی قسم کھائے کہ اپنے برادر مسلم کے مال کو اس سے لے لے تو وہ پروردگار سے اس عالم میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضبناک ہوگا۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

مسلم بن حجاج نے صحیح (روایت میں) اپنی سند سے مختلف اسناد سے ابوذر غفاری کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین قسم کے لوگوں سے خداوند عالم قیامت کے روز کلام نہیں کرے گا، نہ ہی ان کی طرف (بنظر رحمت) دیکھے گا، نہ ہی انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

۱۔ اَلْمَنَّان ایسا احسان کرنے والا جو کوئی چیز عطا نہیں کرتا مگر احسان جتلا کر۔

۲۔ جھوٹی قسم کے ذریعہ اپنی جنس کا انفاق کرنے والا۔

۳۔ لمبی تہبند (پائجامہ) وغیرہ باندھنے والا۔

عبداللہ بن مسعود کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: جو شخص جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال اچکنا چاہتا ہے اس میں فاجر ہے، اللہ سے اس عالم میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضبناک ہوگا۔ اس روایت کو مسلم نے بھی اپنی صحیح میں تحریر کیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور ان اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ یہ عبارت کتاب کی ہے حالاں کہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہے حالاں کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتے ہیں۔ (۷۸)

ترکیب:

لَفَرِيْقًا منصوب ہے اس لئے کہ اِنَّ کا اسم ہے اور تاکید کی خاطر لام اِنَّ کے اسم پر داخل ہوتا ہے جب اسم اِنَّ موخر ہو۔ اِنَّ لَزَيْدًا فِي الدَّارِ کہنا صحیح نہیں ہے تا کہ دو حرف تاکید ایک جگہ جمع نہ ہو جائیں۔ جس طرح معرفہ پر لام تعریف داخل کرنا صحیح نہیں ہے۔ البتہ عرب کا یہ کہنا کہ جَآءَنِي الْقَوْمُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ تو كُلَّ، الْقَوْمُ کی تاکید ہے اور اَجْمَعُوْنَ كُلَّ کی تاکید ہے۔

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے یہ آیت یہودی احبار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت وغیرہ کے متعلق وہ بات تحریر کی جو کتاب خدا میں نہیں تھی اور اس کی نسبت کتاب خدا کی طرف دے دی۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت ان یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے تورات و انجیل میں تحریف کی تھی اور کتاب خدا کے بعض حصہ کو بعض کے برعکس اور ایک دوسرے کے برخلاف پیش کیا جو (کتاب خدا) میں سے نہیں تھا اسے اس سے ملحق اور وابستہ کر دیا اور اس سے دین حنیف کو جدا کر دیا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

تفسیر:

دھوکہ باز اہل کتاب

وَاِنَّ مِنْهُمْ (اور ان میں ایسے لوگ ہیں) یعنی اہل کتاب سے یہ جملہ اس آیت پر عطف ہے کہ: وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ۔

يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ (جو اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں) یعنی کتاب میں تحریف کرتے ہیں اور اپنی زبان کے ذریعہ مقصد (حقیقی) سے انحراف کرتے ہیں۔ خداوند عالم نے زبان سے الٹ پھیر کے ذریعہ کتاب میں تبدیلی کو تحریف قرار دیا ہے۔ یہ مجاہد، قتادہ، ابن جریج اور ربیع کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی تفسیر حق کے خلاف کرتے ہیں۔ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ (کہ تم سمجھو کہ یہ عبارت کتاب کی ہے)

اے مسلمانو! تا کہ تم اس کے متعلق کتاب خدا کا گمان کرو جبکہ یہ موسیٰ پر نازل ہونے والی کتاب نہیں ہے بلکہ انھوں نے اسے اپنی جانب سے گڑھا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔

وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (حالاں کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا)

اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ معصیت اور گناہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتے، نہ ہی اللہ کا فعل ہیں اس لیے کہ اگر اس کا فعل ہوتے تو اس کی جانب سے ہوتے جس کی تاکیدی وجہیں ہوتیں (اگر اس طرح ہوتا) تو نفی مطلق طور پر صحیح نہ ہوتی کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ اسی طرح کسی بھی صورت اس کا کتاب سے ہونا جائز نہیں ہے اس لیے کہ نفی مطلق ہے کہ یہ سب کتاب سے نہیں ہے۔ نفی کے مطلق طور پر ہونے کی وجہ سے اس کا اللہ کی طرف سے ہونا ممکن نہیں ہے۔

وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (وہ اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتے ہیں) یعنی ان لوگوں کا اس کی نسبت کتاب کی طرف دینے میں (اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا ہے) وَهُمْ يَعْلَمُونَ (جان بوجھ کر) جبکہ وہ اس کے جھوٹ ہونے کو جانتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ اس بارے میں خود پر عذاب کے متعلق جانتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

کسی انسان کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب، حکمت اور نبوّت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ (۷۹) وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ تم فرشتوں یا پیغمبروں کو اپنا ربّ بناؤ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نبی تمھیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو۔ (۸۰)

قرائت:

ابن کثیر عامر اور اہل کوفہ نے تُعَلِّمُوْنَ تشدید کے ساتھ اور باقی نے تَعْلَمُوْنَ بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔

عاصم نے اعشیٰ اور برجمی کے واسطہ کے بغیر اور حمزہ ابن عامر اور یعقوب نے وَلَا يَأْمُرَكُمْ کو راء کے نصب کے ساتھ اور بقیہ قراء نے رفع کے ساتھ يَأْمُرُكُمْ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے تُعَلِّمُوْنَ کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ تعلیم اس موضوع میں زیادہ بلیغ ہے اس لئے کہ جب انسان کو بتایا جائے اور وہ اپنے علم پر عمل نہ کرے، تو اپنے علم کو نظر انداز کرنے پر اس کی مذمت کی جائے گی اور وہ اس ارشاد الٰہی میں جن لوگوں کی توبیخ کی ہے ان کے دائرہ میں شامل ہوگا کہ أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔

اور جن قراء نے تَعْلَمُوْنَ کو بغیر تشدید کے پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ عالم اور طالب علم اپنے علم اور طلب علم کے ذریعہ ایسی چیز کو حاصل کر لیتا ہے کہ جو اسے اپنے علم سے تمسک کرنے اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتی ہے جیسے جو عالم معلم اپنی تدریس میں حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

جن قراء نے يَأْمُرُكُمْ بالرفع پڑھا ہے تو انھوں نے اسے پہلے جملہ سے جدا مانا ہے اور لَا يَأْمُرُكُمُ اللّٰهُ قرار دیا ہے اور جن قراء نے نصب دیا ہے تو وہ اس آیت کی بنا پر ہے: وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوْا۔

رفع کو قوی بنانے والی دلیلوں میں سے ایک ابن مسعود کی قرائت يَأْمُرُكُمْ ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملہ سے جدا ہے اور جو چیز نصب کو قوی بناتی ہے، کتب تاریخ کی یہ بات ہے کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے محمدؐ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو رب مان لیں؟ تو خداوند عالم نے فرمایا: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَلَا اَنْ يَّأْمُرَكُمْ۔

الفاظ و معانی:

اَلْبَشَر کم اور زیادہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ مصدر کی طرح ہے جیسے اَلْخَلْق، آپ کہتے ہیں:

هٰذَا بَشَرٌ، وَ هٰؤُلَاءِ بَشَرٌ جس طرح آپ یہ کہتے ہیں کہ: هٰذَا خَلْقٌ، وَ هٰؤُلَاءِ خَلْقٌ۔ مصدر کم اور زیادہ (دونوں) کے لیے استعمال ہوتا ہے چونکہ جنس فعل ہے لہٰذا اسماء اجناس کی طرح ہو گیا ہے جیسے اَلْمَاءُ (پانی)، اَلتُّرَاب (مٹی) وغیرہ۔

اَلرَّبَّانِیُّ وہ ہے جو لوگوں کے امر کی اپنی تدبیر سے پرورش کرتا ہے اور انھیں پروان چڑھاتا ہے اور لوگوں کی اصلاح کرتا ہے۔ اسی طرح عالم ربانی ہے اس لیے کہ وہ علم کے ذریعہ پروردگاران کے امر (معاملات) کی تربیت اور اصلاح کرتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے علم رب کی جانب مضاف ہے جو کہ علم دین ہے اور اس کا حکم دیتا ہے مگر اسے اضافت میں تبدیل کر دیا تا کہ اس معنی پر دلالت کرے جس طرح بحرین کی جانب اضافت ونسبت میں بحرانی کہا جاتا ہے، جس طرح لمبی گردن والے کو اَلرَّقَبَة کی نسبت سے رَقَبَانِیُّ اور بڑی لَحْیَة (داڑھی) والے کو لَحْیَانی اور علم دین کے حامل کہ جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کو ربانی کہتے ہیں۔

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے یہودی ابورافع القرضی اور نجران کے وفد کے سردار نے آنحضرتؐ سے کہا: اے محمدؐ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں؟ اور آپؐ کو پروردگار سمجھنے لگیں؟ آپؐ نے فرمایا: معاذ اللہ! میں غیر خدا کی عبادت کروں یا غیر اللہ کی عبادت کا حکم دوں، نہ تو مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے، نہ ہی مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ ابن عباس اور عطا سے مروی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نصاریٰ نجران کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ یہ ضحاک اور مقاتل سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم آپؐ پر اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں کیا ہم آپؐ کے لیے سجدہ نہ کریں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے سوا کسی کے لیے سجدہ سزاوار و جائز نہیں ہے البتہ اپنے پیغمبر کا احترام کرو اور حق کو پہچانو اس کے اہل سے۔ پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

کسی بشر کو یہ حق حاصل نہیں کہ۔۔۔

جب اہل کتاب کا ذکر گذر چکا کہ انھوں نے انبیاء کی طرف ان چیزوں کی نسبت دی جنھیں وہ دین سمجھتے

تھے، خداوند عالم نے اس سے انھیں منزہ اور پاک قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَا كَانَ لِبَشَرٍ (کسی انسان کے لیے یہ زیبا نہیں ہے) یعنی کسی بشر کے لیے سزاوار و مناسب نہیں ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا اور مَا كَانَ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهٰذَا یعنی سزاوار نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ کسی بشر کے لیے جائز و حلال نہیں ہے۔

أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ کہ اللہ اسے عطا کرے الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ کتاب، حکمت اور نبوّت علم یا لوگوں کی جانب رسالت۔ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللّٰهِ (اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ) یعنی اللہ کے بجائے میری عبادت کرو یا اس کی عبادت کے ساتھ ساتھ میری بھی عبادت کرو۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جن انبیا کو خداوند عالم نے اپنی رسالت کے لیے مخصوص کیا اور انھیں اپنی نبوت کے لیے منتخب کیا۔ ان پر اپنی کتابوں کو نازل کیا انھیں صاحب حکمت و صاحب علم قرار دیا، ان کی صفت یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دیں، خداوند عالم کا یہ ارشاد اپنے پیغمبر کو اس طرح کی باتوں سے منزہ اور پاک قرار دینے کے لیے ہے۔ نہی اور منع کرنے کے اعتبار سے۔ لفظ عِبَادًا عبادت سے مشتق ہے۔ قاضی نے کہا ہے کہ لفظ عَبِيْد لفظ عِبَاد کے برخلاف ہے اس لیے لفظ عبید عبودیت (بندگی) معنی میں ہے، ان کا اللہ علاوہ کسی اور بندہ ہونا محال نہیں ہے۔

وَلٰكِنْ كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ (بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ) اس جملہ میں ایک بات حذف ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پیغمبر کے لیے یہ سزاوار و مناسب نہیں کہ لوگوں سے یہ کہے کہ میری عبادت کرو بلکہ اس کے لئے سزاوار ہے کہ وہ ان سے اس طرح کہے: اللہ والے بن جاؤ، وَلٰكِنْ كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ کے بارے میں چند اقوال ہیں:

اول: علماء اور فقہاء بن جاؤ۔ یہ علی وابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔

دوم: علماء اور حکماء بن جاؤ۔ یہ قتادہ، سدی اور ابن ابو رزین سے مروی ہے۔

سوم: حکماء اور متقین بن جاؤ! یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے۔

چہارم: ولایت و سرپرستی میں اصلاح کے ذریعہ لوگوں کے امور کے مدبر و نگراں بن جاؤ۔ یہ ابن زید سے مروی ہے۔

پنجم: اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کے معلم بن جاؤ! یہ زجاج سے مروی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: نہ تو کوئی مومن و مومنہ ہے، نہ ہی آزاد و غلام مگر یہ کہ اس پر اللہ کا واجب حق ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور اس میں غور و فکر کرے۔

ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے ایک عالم کو یہ کہتے سنا: ربانی وہ ہے جو حلال و حرام، امر و نہی، گذشتہ وآئندہ کا جاننے والا ہے ابو عبیدہ نے کہا ہے: عرب ربانی سے واقف نہیں تھے۔ یہ نظریہ غلط ہے اس لیے کہ قرآن عربوں کی لغت میں نازل ہوا ہے۔

جس دن ابن عباسؓ کا انتقال ہوا تھا اس دن محمد بن حنفیہ نے کہا تھا: مَاتَ رَبَّانِيُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ؛ اس امت کے ربانی کا انتقال ہو گیا اس کا اشتقاق ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ (جیسا کہ اس کتاب (قرآن) کی تعلیم دیتے ہو) وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو) جس نے تشدید کے ساتھ قرأت کی ہے اس سے مراد لیا ہے کہ تم دوسرے کو اس کی تعلیم دیتے ہو جو اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ وہ جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہیں اور جنھوں نے بغیر تنوین کے پڑھا ہے تو اس سے ان کے عالم ہونے سے زیادہ کا فائدہ نہیں دیتا، اس کے ارشاد: بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ میں باء تین معانی میں سے کسی ایک معنی کے لیے داخل کی گئی ہے:

۱۔ اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کے معلم بنو، جس طرح کہا جاتا ہے اَنْفِقُوْهُمْ بِمَالِكُمْ یعنی اپنے مال میں سے لوگوں پر انفاق کرو۔

۲۔ اپنے علم اور دوسروں کو تعلیم دینے میں اللہ والے بنو! یہاں پر 'با'، 'فِي' کی جگہ آیا ہے۔

۳۔ اس طرح بنو جس کے لیے اس کے علم کے سبب مدح و تعریف کے ذریعہ عالم کہے جانے کا استحقاق پیدا ہو جائے یعنی جو چیز تم جانتے ہو اس پر عمل کرو۔ یہ اس لیے کہ انسان عالم کہے جانے کا حقدار اس وقت ہوتا ہے جب اپنے علم پر عمل کرتا ہے، جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورہ فاطر، آیت ۲۸؛ اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں میں صرف صاحبانِ معرفت ہیں)

وَلَا يَأْمُرَكُمْ (وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا) یعنی اللہ تمھیں حکم نہیں دے گا۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمدؐ تمھیں حکم نہیں دیتے۔ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عیسیٰؑ تمھیں حکم نہیں دیتے۔ جس نے راء کو نصب دیا ہے اس نے اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ پر عطف کیا ہے۔ یعنی اس نبی کے لیے (سزاوار اور مناسب) نہیں تھا کہ وہ تمھیں حکم دے۔

اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا (کہ تم فرشتوں یا پیغمبروں کو اپنا ربّ بناؤ) یعنی تم ملائکہ اورانبیا کو پروردگار کا شریک قرار دو جس طرح صابئین اور نصاریٰ نے کیا۔

ارشاد: اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نبی تمھیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو) ہمزہ استفہام انکاری ہے اس کے حقیقی معنی استفہام کے ہیں یہاں پر اسے انکار کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اگر مخاطب اس کا اقرار کرتا ہے تو اس کی فضیحت ورسوائی ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا سوال کی صورت میں آیا ہے اگرچہ اس کا مقصد جواب کا جاننا نہیں ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؑ کو لوگوں کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا ہے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو کفر کی دعوت دیں۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

اور یاد کرو، جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا: ہم نے جو تمھیں کتاب وحکمت سے نوازا ہے اس کے بعد تمھارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا (یہ ارشاد فرما کر) اللہ نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور اس کی ذمّے داری کا عہد اٹھالیا؟ انھوں نے کہا: ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ (۸۱) اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائیں گے تو وہ لوگ فاسق ہوں گے۔ (۸۲)

قرائت:

صرف حمزہ نے لِمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یعقوب نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع نے آتَيْنٰكُمْ جمع متکلم اور بقیہ نے واحد متکلم آتَيْتُكُمْ پڑھا ہے۔

حجت:

حمزہ کی قرائت بِمَا آتَيْتُكُمْ لام کے کسرہ کی دلیل یہ ہے کہ اس کا تعلق اخذ ہے گویا مراد یہ ہے کہ أَخَذَ مِيثَاقَهُمْ لهذا، اس ترکیب کی بنا پر پڑھنا موصولہ ہے اور جملہ معطوفہ برصلہ موصول کی جانب پلٹنے والی شے جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ ہے جو ضمیر کے بجائے ظاہر ہے اور وہ قول الٰہی لِمَا مَعَكُمْ ہے۔ اس لئے کہ یہ مَا أُوتُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَ الْحِكْمَةِ کے مقام پر ہے۔ پس یہ اس ارشاد الٰہی کے مانند ہے کہ إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ اس لئے کہ وہ لَا يُضِيعُ أَجْرَهُمْ کے معنی میں ہے۔

اس قرائت کی بنا پر یہ ما حرف ہو بھی سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ مصدر کے معنی میں ہوگا۔ ابوعلی نے کہا: جس نے لام کو فتحہ دیا ہے اور لَمَا آتَيْتُكُمْ پڑھا ہے تو ایسی صورت میں مَا میں دو تاویل کا احتمال دیا ہے:

(۱) ما موصولہ ہے۔

(۲) ما شرطیہ ہے۔

جس نے موصولہ مانا ہے تو موصولہ ماننے کا تقاضا کرنے والا اور ارشاد الٰہی: ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ ہے موصول کی جانب پلٹنے والی شے وہی ہے جس کا ذکر حمزہ کی قرائت میں گزر چکا ہے۔

پہلے جملہ میں موصول کی جانب پلٹنے والی شے صلہ میں ضمیر محذوف ہے۔ اس کی تقدیر لَمَآ آتَيْتُكُمُوهُ ہے۔ جس نے مَا کو موصولہ مانا ہے اس نے لَمَا کے لام کو لام ابتدا مانا ہے اور اس لام کو جملہ قسم کا قائم مقام مانا گیا ہے: وَإِذْ أَخَذَ اللهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ سے۔

لَمَا میں مَا محلاً مرفوع ہے۔ مبتدا ہونے کی بنا پر اور اس کی خبر لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ ہے۔ اور لَتُؤْمِنُنَّ قسم محذوف قسم کے متعلق ہے۔ مراد یہ ہے: وَ اللهِ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ۔ بِهِ کی ضمیر الَّذِي آتَيْتُكُمُوهُ کی جانب پلٹ رہی ہے جو کہ مبتدا ہے۔ اسی کے مانند آپ کا عبداللہ سے یہ کہنا ہے کہ وَ اللهِ لَتَأْتِيَنَّهُ لَتَنْصُرَنَّهُ میں ہاء کی ضمیر رسول اللہ کی جانب پلٹ رہی ہے کہ جن کا ذکر گزر چکا ہے۔

اور جب آپ مَا کو شرطیہ مانیں گے تو وہ آتَيْتُكُمْ کی بنا پر محلاً منصوب ہوگا اور آتَيْتُكُمْ شرط کی بنا پر

محلہ مجزوم ہوگا اور جَآءَ كُمْ آتَيْتُمْ پر عطف کی بنا پر محلاً مجزوم ہوگا۔ مَا پر داخل لام، لام قسم نہیں مانا جائے گا اور نہ ہی لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ میں داخل لام کے مانند ہوگا اور نہ ہی لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ پر داخل لام کے مانند ہوگا۔ جس طرح لام لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ۔ اور آیت: لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ میں ہے۔ یہ لام اَنْ پر داخل ہوا ہے، قسم نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے اسی لئے اسے کبھی حذف کرنا اور کبھی باقی رکھنا دونوں جائز ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ یہ لام کبھی اَنْ سے ملحقہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا جیسا کہ ان جملوں میں: وَاللّٰهِ اِنْ لَوْ فَعَلْتَ لَفَعَلْتُ وَ اللّٰهِ لَوْ فَعَلْتَ لَفَعَلْتُ۔

تفسیر:

عہد و پیمان الٰہی

اللہ نے انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد فوراً ہی بعد ہمارے پیغمبرؐ کے بارے میں اس عہد کا ذکر کیا جو تمام انبیاء (علیہم السلام) سے لیا گیا تھا، ارشاد فرمایا: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ (اور یاد کرو، جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا) اِذْ کا عامل محذوف ہے جس کی تقدیر یوں ہے: وَاذْكُرْ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ یعنی اس وقت کو یاد کیجیے جب اللہ نے عہد لیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت گذشتہ آیت پر عطف ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، ابن عباس وقتادہ سے روایت ہے کہ خداوند عالم نے ہمارے پیغمبرؐ سے قبل دیگر پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ وہ اپنی امتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور اس کے فوائد کے بارے میں مطلع کریں، انھیں آپؐ کی آمد کی بشارت دیں اور ان کی تصدیق کا حکم دیں۔

طاؤس نے کہا ہے کہ خداوند عالم نے انبیا سے اول اور آخر کا عہد لیا تھا، اول سے میثاق (عہد) لیا کہ وہ جس چیز کو آخر (پیغمبر آخرؐ) لے کر آئے اس پر ایمان لائیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے: اس آیت کی تقدیر یوں ہے: جب اللہ نے پیغمبروں کی امتوں سے اپنے پیغمبر کی تصدیق اور ان کی لائے ہوئے احکام الٰہی پر عمل کرنے کا عہد لیا بعد میں لوگوں نے ان کی مخالفت کی، ایفائے عہد نہیں کیا اور بہت سے لوگوں نے ان کی شریعت کو ترک کر دیا اور بیشتر میں تحریف کر دی۔

لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ (اور یاد کرو، جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا ہم نے جو تمھیں نوازا ہے) لام کے فتحہ کے ساتھ جبکہ ما موصولہ ہو، اس کی تقدیر یوں ہوگی: اَلَّذِيْٓ اٰتَيْتُكُمُوْهُ یعنی جو چیز ہم نے تمھیں عطا کی۔

مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (جیسے کتاب وحکمت اس کے بعد تمھارے پاس کوئی رسول آئے) کہا گیا ہے کہ رسول سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔

مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ (اس کی تصدیق کرتا ہوا جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے) یعنی جو کتاب تمھیں دی گئی۔ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ (تو تم ضرور اس پر ایمان لانا) رسول پر ضرور ایمان لانا اور رسول کی نصرت ضرور کرنا یا اس سے مراد یہ ہے کہ جو چیز تمھیں عطا کی گئی ہے اس پر ضرور ایمان لانا اور رسول کی نصرت ضرور کرنا، اس اعتبار سے یہ معنی ہوں گے کہ انبیاء (علیہم السلام) سے عہد لیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور ایک دوسرے کو ایمان کا حکم دیں، نصرت و مدد، تصدیق اور حجت کے ذریعہ ہوگی۔ یہی چیز حسن، سعید بن جبیر اور طاؤس سے مروی ہے

اور جب مَا جزا کے لیے ہوگا تو اس کی تقدیر یہ ہوگی: اَيُّ شَيْءٍ اٰتَيْتُكُمْ وَمَهْمَا اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ لَتُؤْمِنُنَّ؛ جو چیز بھی ہم تمھیں عطا کریں اور جب بھی میں تمھیں کتاب دیں تو اس پر ایمان لانا۔ پس شرط انھیں کتاب وحکمت کا دینا اور رسول کا آنا ہے اور جزا قسم اور مقسم علیہ ہے وہ اس کا ارشاد لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ ہے جواب قسم نے جزاء سے بے نیاز کردیا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (سورۂ زمر، آیت ۶۵؛ اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد کردیے جائیں گے)۔ ارشاد الٰہی: مِنْ كِتَابٍ میں مِنْ تبیین اور بیان ووضاحت کے لیے ہے جس طرح آپ کا یہ کہنا ہے کہ: ما عندك من ورق و عين (تمھارے پاس کتنے ورق اور سامان ہیں؟) یا یہ کہنا: هٰذَا خَاتَمٌ مِّنْ فِضَّةٍ (یہ انگوٹھی چاندی کی ہے) اس اعتبار سے آیت کے اس حصہ کی تقدیر ہوگی: خداوند عالم نے ان لوگوں سے ارشاد فرمایا: میں جب بھی تمھیں کتاب وحکمت عطا کروں پھر رسول اسے لے کر تمہارے پاس آئے اس کتاب وحکمت کی تصدیق کرتے ہوئے جو تمھارے پاس موجود ہے تو بخدا تم اس پر ضرور ایمان لانا، اس کی نصرت ضرور کرنا، اس کا اقرار کرنا اور اس پر عہد و پیمان کرنا، یہ تقدیر اس بات سے بہت زیادہ مشابہ ہے جس کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ انبیا سے عہد لیا گیا کہ وہ اپنی امتوں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کا عہد لیں جب آپ کو بھیجا جائے اور اگر انھیں درک کریں تو ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرنے کا حکم دیں۔ یہی بات علی وابن عباس، قتادہ

اور سدی سے مروی ہے۔ اسی کو ابو علی الجبائی اور ابو مسلم نے اختیار کیا ہے۔ اللہ کے ارشاد جَآءَ كُمۡ کے معنی یہ ہوں گے کہ تمھاری امتیں اور تمھارے پیروکاروں کے پاس آئیں اور کلام انبیاء علیہم السلام سے ہوا ہے اس لیے کہ جو ان پر لازم ہے وہ ان کی امتوں پر بھی لازم و ضروری ہے، جس نے لِمَآ اٰتَيۡتُكُمۡ کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے اس کے نزدیک یہ معنی ہوں گے: اللہ نے ان سے عہد لیا اس چیز کا جس کے سبب انھیں کتاب اور حکمت عطا کی گئی اس لیے کہ (یہ لوگ) افضل بہترین لوگ ہیں (اس طرح) لام تعلیل (علت) کے لیے ہوگا جس کا تقاضا یہ ہوگا کہ سابق میں کرنا عہد لینے کے لیے ہے اس کا ارشاد لَتُؤۡمِنُنَّ اَخَذَ الۡمِيۡثَاقِ عہد لینے سے متعلق ہے جو نتیجہ میں شرط و جزا کے معنی کی طرف پلٹتا ہے۔

وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ (اور اس کی مدد کرنا) یعنی امتوں کو ان کی بشارت دینا۔ قَالَ یعنی اللہ نے انبیا سے پوچھا، ارشاد فرمایا: ءَاَقۡرَرۡتُمۡ بِهٖ (کیا تم نے اقرار کرلیا) یعنی تم نے اس کی تصدیق کی وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ (اور اس کی ذمے داری کا عہد اٹھالیا؟) یعنی تم نے اس پر میرا عہد قبول کیا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر یہ (چیز) تمھیں دی جائے اسے لے لینا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ تم نے اپنی امتوں سے عہد لے لیا۔ قَالُوۡۤا (انھوں نے کہا ہاں!) یعنی انبیا اور ان کی امتوں نے کہا اَقۡرَرۡنَا (ہم اقرار کرتے ہیں) یعنی جس چیز کے اقرار کرنے کا تو نے ہمیں حکم دیا ہے ہم نے اس کا اقرار کرلیا۔ قَالَ اللہ نے فرمایا: فَاشۡهَدُوۡا (اچھا تو گواہ رہو) اس پر اپنی امتوں کی گواہی دینا (یا گواہ بننا) وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ (اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں) میں تم پر اور تمھاری امتوں پر گواہ ہوں۔ یہ علی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ گواہی دو یعنی یہ جان لو میں تمھارے ساتھ ہوں جاننے والا ہوں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے تاکہ تم میں سے بعض بعض کی گواہی دیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے ملائکہ سے فرمایا: ان پر گواہی دو یہ غیر مذکور سے کنایہ ہوگا۔ سعید بن مسیب سے روایت ہے۔ یہ آیت قرآن کریم کی مشکل ترین آیات میں سے ہے جس کے اعراب کی وجہوں میں نحویوں نے نہایت غور و فکر کیا ہے اس کی تحقیق کے دوران بال کی کھال نکالی ہے آپ کسی مقام پر باعتبار لفظ نہایت مختصر اور فائدہ کے اعتبار سے بہت زیادہ اور انتہائی شستہ اور شائستہ اس طرح نہیں پائیں گے جس کا ہم نے اس مقام پر ذکر کیا ہے۔ اللہ کی توفیق کا سہارا ہے۔

فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ (اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائیں گے) یعنی ان دلالتوں اور حجتوں کے بعد اگر کوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور ان پیغمبروں سے عہد لینے کے بعد (جن کا ذکر سابق میں گذر

چکا ہے) سے اعراض وانحراف کریں۔ مقصود یہ امتیں ہیں نہ کہ انبیاء چونکہ ان کا زمانہ گذر چکا ہے۔ یہ صحیح ہے اس لیے کہ انبیا سے عہد لینا ان کی امتوں سے عہد لینے کو شامل ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم نے جناب آدمؑ اور ان کے بعد کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس سے یہ عہد لیا جب خدا محمدؐ کو بھیجے اور یہ حضرات زندہ ہوں تو پیغمبرؐ پر ضرور ایمان لائے اور ان کی نصرت ضرور کرے اور اس نے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ اس پر اپنی قوم سے عہد لے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (تو وہ لوگ فاسق ہوں گے) کَافِرُوْنَ ارشاد نہیں ہوا اس لئے کہ مراد کفر میں اس کے بدترین درجہ و مرتبہ کی طرف نکل جانے والے ہیں اپنی سرکشی کے باعث اس لیے کہ اصلِ فِسق امر الٰہی سے اس حالت کی طرف نکل جانا ہے جو اسے برباد کردے اور کفر میں جو اس سے بڑا ہو جس طرح کفر سے کم درجہ کا گناہ جو اس سے بڑا ہو اور جو اس کی نسبت کے اعتبار سے اس سے چھوٹا ہو۔

❀❀❀❀❀

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین تلاش کر رہے ہیں حالاں کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابعِ فرماں ہیں اور سب اسی کی طرف پلٹائے جائیں گے۔ (۸۳) (اے نبی) آپ کہہ دیجیے! ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان تمام چیزوں پر جو ہم پر نازل کی گئیں اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئی ہیں اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ اور خدا کی طرف سے آنے والے دوسرے پیغمبروں کو ان کے ربّ کی طرف

سے دی گئیں ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم سب اللہ کے فرماں بردار ہیں۔(۸۴) اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ دین ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نا کام و نامراد رہے گا۔(۸۵)

قرائت:

ابو عمرو نے يَبْغُوْنَ یاء کے ساتھ اور وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ کو تاء مضمومہ کے ساتھ تُرْجَعُوْنَ پڑھا ہے۔
ابن عباس نے دونوں کو یاء کے ساتھ، حفص، یعقوب، سہل اور باقی قراء نے دونوں کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے دونوں کلمے کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ آغاز آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے۔

جن لوگوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے تو انھوں نے یہ مقدر مانا ہے: قُلْ لَهُمْ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ تو یہاں پر غائب کا صیغہ ہے اس لئے کہ وہ غائب ہے۔ يُرْجَعُوْنَ اور تُرْجَعُوْنَ کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔

ترکیب:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ عطف جملہ بر جملہ ہے جیسے یہ کہا جائے: اَوَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ بس فرق یہ ہے کہ فاء نے ترتیب دے دی ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے: اَبَعْدَ تِلْكَ الْاٰيَاتِ غَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں حال کی جگہ واقع ہوئے ہیں۔ تقدیر یہ ہے: طَائِعِيْنَ وَ كَارِهِيْنَ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَتَانِيْ رَكْضًا یعنی رَاكِضًا۔ البتہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے: اَتَانِيْ كَلَامًا یعنی مُتَكَلِّمًا اس لئے کہ کلام، اِتْيَان (آنے) کی کوئی قسم نہیں ہے حالانکہ رَكْض (دوڑنا) ایک طرح کا اتیان ہے۔

شانِ نزول:

ابن عباس سے مروی ہے کہ اہل کتاب دین ابراہیمؑ سے متعلق اپنے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جھگڑا کر رہے تھے ان میں سے ہر فرقہ کا یہی خیال تھا کہ وہ دین ابراہیمؑ کی نسبت اولیٰ ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دونوں فریق دین ابراہیم سے بری ہیں۔ اس پر وہ لوگ غضبناک ہوئے اور کہنے لگے: بخدا ہم آپؐ کے فیصلہ پر راضی نہیں ہیں نہ ہی ہم آپ کا دین اختیار کریں گے، اس وقت اللہ نے أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

دین اسلام

خداوند عالم نے یہودیت اور اسلام کے علاوہ تمام ملتوں کے بطلان کو واضح طور پر بیان کرنے کے فوراً ہی بعد بیان فرمایا کہ اللہ کے دین کے علاوہ کسی دوسرے دین کی خواہش کرنے والا گمراہ ہے، اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا چنانچہ ارشاد فرمایا: أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ (کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین تلاش کر رہے ہیں) یعنی ان آیات اور حجتوں کے بعد دین الٰہی کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں۔

وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا (حالاں کہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں چارونا چار اللہ ہی کی تابع فرماں ہیں) اس میں متعدد اقوال ہیں:

اول: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ اپنی حالت میں خدا کے حضور خود کو تسلیم کیے ہوئے اس کے بارے میں اپنی زبان حال سے گویا ہے، اس وقت جب ان سے عہد لیا گیا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

دوم: أَسْلَمَ یعنی (ہر چیز) اس کی بندگی کا اقرار کر رہی ہے اگرچہ ان کے درمیان وہ (لوگ) بھی موجود ہیں جو اس کی عبادت میں شرک کرتے ہیں جیسا کہ اللہ کا خطاب ہے: وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (سورۂ زخرف، آیت ۸۷) یعنی اور اگر آپ ان سے سوال کریں گے کہ انھیں کس

نے خلق کیا تو وہ یہی کہیں گے: اللہ نے۔ مخلوقات کی عقلوں میں خداوند عالم نے اس کی ربوبیت کا اقرار کرنے کی جانب بلانے کے لیے جو (چیز) قرار دی ہے تاکہ وہ اس میں پائی جانے والی دلالت کی طرف متوجہ اور آگاہ ہوں۔ یہ مجاہد اور ابوالعالیہ سے مروی ہے۔

سوم: مومن برضا و رغبت اسلام لاتا ہے اور کافر حالت اکراہ میں اپنی موت کے وقت تسلیم ہوتا ہے (اسلام لاتا ہے) جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا (سورۂ غافر، آیت ۸۵؛ تو عذاب کے دیکھنے کے بعد کوئی ایمان کام آنے والا نہیں تھا) یہ قتادہ سے مروی ہے۔ اسی کو بلخی نے اختیار کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں اس راستہ سے پیچھے رہ جانے پر ڈر گیا ہے۔

چہارم: اطاعت وذکر (یاد الٰہی) کے ذریعہ خدا کے حضور تسلیم ہوتے (تابعدار) ہیں، اس کا ارشاد ہے: قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا (سورۂ حجرات، آیت ۱۴؛ یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں) یعنی ہم تسلیم (تابع دار) ہوتے ہیں۔ یہ شعبی، جبائی اور زجاج سے مروی ہے۔

پنجم: کچھ لوگوں کو اسلام لانے پر مجبور کیا گیا اور (بعض) اپنی مرضی سے اسلام کی طرف آئیں۔ یہ حسن سے مروی یہی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: كَرْهًا یعنی شمشیر کے ڈر سے۔ حسن اور مفضل نے کہا: اَلطَّوْع (برضا ورغبت) صرف آسمان والوں سے مخصوص ہے لیکن اہل زمین میں کچھ لوگ اپنی مرضی سے بخوشی اسلام لانے والے بھی ہیں اور انھیں میں بحالت مجبوری اسلام قبول کرنے والے ہیں۔

وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (اور سب اسی کی طرف پلٹائے جائیں گے) یعنی اس کی جزا کی طرف پلٹائے جائیں گے لہٰذا اس کے دین کی طرف جلدی کرو، اسلام کی مخالفت نہ کرو۔ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ ((اے نبی) آپ کہہ دیجیے! ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں) خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، آپؐ کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپؐ اپنے آپ سے اور اپنی امت سے کہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے (یا ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان تمام چیزوں پر جو ہم پر نازل کی گئیں)

جس طرح قوم کا سردار اپنی جانب سے اور اپنی رعایا کی طرف سے کہتا ہے۔ اس آیت کے معنی سورۂ بقرہ میں گذر چکے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ اس ارشاد کے کیا معنی ہیں کہ: وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ہم سابق میں

مفصل طور پر ایمان کا اقرار کر چکے ہیں؟ ہم کہتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ہم ان تمام چیزوں جن کا حکم دیا گیا ہے اور جن سے نہی کی گئی ہے سب کی اطاعت کے ذریعہ اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ اسی طرح اہل ملت جو مخالف اسلام ہیں سب کے سب ایمان کا اقرار کرتے ہیں، لیکن لفظ اسلام کے ذریعہ اقرار نہیں کرتے لہٰذا کہا گیا: وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلٰمِ (اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا) یعنی چاہے گا تلاش کرے گا دِيْنًا جس کو بطور دین مانے یا اس کی پابندی کرے۔ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (تو وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا) بلکہ اس پر عذاب کیا جائے گا جس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا) یعنی ہلاک ہونے والوں میں ہوگا اس لیے کہ خسران (نقصان) رأس مال کا ضائع و برباد ہونا ہے۔

آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو دین اسلام کا خواہاں ہوگا اس سے قبول کیا جائے گا جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ دین اور اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہیں، ایک ہی چیز کو مختلف عبارتوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

❁❁❁❁❁

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کی ہدایت کرے جنھوں نے نعمت ایمان پالینے کے بعد کفر اختیار کیا حالاں کہ وہ گواہی دے چکے ہیں کہ بے شک رسول برحق ہیں اور ان لوگوں کے پاس نشانیاں بھی آچکی ہیں اور اللہ ظلم کرنے والوں کی ہدایت نہیں کیا کرتا۔(۸۶) ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ فرشتوں اور تمام لوگوں کی طرف سے

لعنت ہو۔ (۸۷) وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے، نہ ان کی سزا میں کمی ہوگی اور نہ ہی انھیں مہلت دی جائے گی۔ (۸۸) البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اس کے بعد توبہ کر کے اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں تو اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (۸۹)

الفاظ و معانی:

لغت میں اَلْخُلُوْد طولانی قیام کو کہتے ہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے: خَلَدَ فُلَانٌ فِي السِّجْنِ فلاں شخص طولانی مدت تک قید خانہ میں رہا۔ خلود اور دوام کے درمیان فرق ہے۔ خُلُوْد طویل قیام کا تقاضا کرتا ہے جبکہ دوام اس طرح کا تقاضا نہیں کرتا، اسی لئے اللہ کی صفت دائم بیان کی گئی ہے نہ کہ خالد البتہ کفار کے خلود سے مراد ان کا ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ اس میں امت کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔

اِنْظَار: بندے کو مہلت دینا ہے تا کہ وہ اپنے معاملہ میں غور و فکر کرلے۔ اِنْظَار اور اِمْهَال کے درمیان فرق ہے کہ اِمْهَال یعنی بندے کو مہلت دینا تا کہ اس کا جو کام اپنے ذمہ لیا ہے اسے بآسانی انجام دے سکے۔

ترکیب:

كَيْفَ کے حقیقی معنی استفہام کے ہیں۔ یہاں پر اس سے مراد انکار ہے اس لئے کہ یہ ہدایت اللہ کی جانب سے واقع نہیں ہوتی ہے۔ یعنی اللہ ان کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔ جیسے خداوند عالم کا یہ ارشاد: كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللهِ وَ عِنْدَ رَسُولِهٖ (سورۂ توبہ، آیت ۷) یعنی لَا يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ ... شاعر نے کہا:

كَيْفَ نَوْمًا عَلَى الْفِرَاشِ وَلَمَّا　يَشْمُلِ الشَّامَ غَارَةٌ شَعْوَاءُ

یہاں پر انکار کے معنی آگئے ہیں حالانکہ اس کی اصل استفہام ہے اس لئے کہ سوال مختلف اغراض و مقاصد سے کئے جاتے ہیں۔ کبھی برہان قائم کرنے سے عاجز بنانے کے لئے سوال کیا جاتا ہے، کبھی توبیخ و سرزنش کی خاطر سوال کیا جاتا ہے، جو سوال میں جواب کے معنی سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی ایسی چیز کی خاطر سوال کیا جاتا ہے جو ظاہر ہوتی ہے جیسے انکار۔ فعل شَهِدُوْا، اِيْمَانِهِمْ پر عطف ہے جو کہ اسم ہے اس لئے کہ ایمان مصدر ہے اور اس سے مراد فعل ہے اور تقدیر یہ ہے: بَعْدَ اَنْ اٰمَنُوْا وَ شَهِدُوْا ۔ اَجْمَعِيْنَ، اَلنَّاسِ کی

تاکید کرتا ہے۔ارشادالٰہی: فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ پر فاء داخل ہوا ہے۔اس لئے کہ وہ جزا کے مانند ہے۔ جب کلام میں إِنْ تَابُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ لَهُمْ کے معنی پائے جاتے ہوں۔ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اَلَّذِيْنَ کی خبر کے مقام میں نہیں ہے اس لئے کہ اَلَّذِيْنَ جملہ أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ سے استثناء کی بنا پر محلاً منصوب ہے۔ اَلَّذِيْنَ کو مستثنیٰ منقطع پر حمل نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ متصل پر حمل کرنا بہتر ہے اس لئے کہ کلام میں اصل متصل ہونا اور سمجھانے میں زیادہ سبقت کرنے والا ہے۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیتیں انصار کے ایک شخص حارث بن سوید بن صامت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جس نے عہد شکنی کرتے ہوئے مخذر بن زیاد پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا تھا اور مرتد ہو کر مکہ فرار کر گیا تھا پھر اسے اپنے کیے پر ندامت ہوئی چنانچہ اس نے ایک قاصد اپنی قوم کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرے کیا کہ اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ لوگوں نے پیغمبرؐ سے سوال کیا، تو اس وقت اس ارشاد تک آیت نازل ہوئی: إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا اس کی قوم کا ایک شخص آیت کا پیغام لے کر حارث بن سوید کے پاس پہونچا۔ اس نے (سوید سے) کہا: میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ تم سچے انسان ہو اور اللہ کا رسول تم سے زیادہ سچا ہے اور اللہ تینوں میں سب سے زیادہ سچا ہے چنانچہ وہ مدینہ واپس پلٹا توبہ کی اور اسلام کو بخوبی تسلیم کیا۔ یہ مجاہد وسدی سے مروی ہے۔ یہی شان نزول امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپؐ کی بعثت سے قبل ایمان رکھتے تھے لیکن بعثت کے بعد حسد اور دشمنی کے سبب آپؐ کا انکار کر دیا۔ یہ حسن، جبائی اور ابو مسلم سے مروی ہے۔

تفسیر:

مرتد کی سزا

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام دین نجات ہے اس کے بعد اس کے مخالفین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ (یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ ان

لوگوں کی ہدایت کرے جنھوں نے نعمت ایمان پالینے کے بعد کفر اختیار کیا) اس میں متعدد صورتیں ہیں:

اول: ان لوگوں کے ساتھ خداوند عالم ہدایت یافتہ لوگوں کے مانند ثواب اور ان کی مدح و ثنا کرنے جیسا کس طرح سلوک کرسکتا ہے جبکہ انھوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا۔

دوم: یہ لوگ نہایت دوری کی راہ پر ہیں جس طرح کہا جاتا ہے میں تمھیں راستہ کی کیوں کر ہدایت کرسکتا ہوں جبکہ تم نے راہ ہدایت ترک کردیا ہے یعنی کوئی ایسا راستہ نہیں جو انھیں ایمان کی طرف ہدایت کرسکے سوائے اس صورت کے جس کے ذریعہ انھیں ہدایت دی گئی ہے جسے انھوں نے چھوڑ دیا ہے اس کے سوا کوئی راستہ اور طریقہ نہیں ہے۔

سوم: خداوند عالم کس طرح انھیں جنت کی ہدایت کرسکتا اور انھیں ثواب عطا کرتا ہے جبکہ صورت حال یہ ہے۔

وَشَهِدُوٓا أَنَّ ٱلرَّسُولَ حَقٌّ (حالاں کہ وہ گواہی دے چکے ہیں کہ بے شک رسول برحق ہیں) یہ جملہ: بَعْدَ إِيمَٰنِهِمْ پر عطف ہے نہ کہ 'كَفَرُوا' پر، جس کی تقدیر یوں ہے: بَعْدَ أَنْ آمَنُوا وَ شَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ یعنی ان کے ایمان لانے اور اس طرح گواہی دینے کے بعد کہ رسول حق ہیں۔ وَجَآءَهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ (اور ان لوگوں کے پاس نشانیاں بھی آچکی ہیں) یعنی براہین اور حجتیں آنے کے بعد۔ کہا گیا ہے کہ قرآن کے آنے کے بعد۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی کتابوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت کے آنے کے بعد۔

وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ (اور اللہ ظلم کرنے والوں کی ہدایت نہیں کیا کرتا) ظالمین کے ساتھ ہدایت یافتہ لوگوں کی طرح راہ اختیار نہیں کرے گا، (سلوک نہیں کرے گا) نہ تو انھیں ثواب عطا کرے گا، نہ ہی جنت کے راستہ کی راہنمائی کرے گا۔ اس سے ہدایت یافتہ لوگوں سے مخصوص ہدایت مراد ہے نہ کہ عام ہدایت جیسا کہ اس کے ارشاد میں مراد ہے: وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَٰهُمْ یہاں ایمان سے مراد ایمان کا اظہار ہے نہ کہ وہ ایمان جس سے انسان ثواب کا مستحق ہوتا ہے، نہ ہی آیت میں اس طرح کی کوئی دلالت موجود ہے کہ وہ اپنے باطن اور دل سے صاحب ایمان تھے اور ثواب کے مستحق اور ان کا ایمان کفر کے سبب زائل ہوگیا، پس اس کے مخالف سے متعلق نہیں ہے۔ أُو۟لَٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ (ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے) یعنی ان کے اعمال کی جزا اور بدلہ یہی ہے کہ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ ٱللَّهِ (ان پر اللہ کی طرف سے لعنت ہو) یہ انھیں اللہ کا اپنی رحمت و مغفرت سے دور کرنا ہے۔ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ (فرشتوں اور تمام لوگوں کی طرف (سے

لعنت ہو)) یہ ان لوگوں پر لعنت کی بددعا کرنا ہے کہ اللہ انھیں اپنی رحمت سے دور کرے۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے) یعنی جس لعنت اور عذاب کے یہ وہ مستحق ہیں اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (نہ ان کی سزا میں کمی ہوگی) یعنی ان کے عذاب میں کوئی آسانی نہیں کی جائے گی۔ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (اور نہ ہی انھیں کوئی مہلت دی جائے گی) یعنی انھیں توبہ کی مہلت نہیں دی جائے گی، نہ ہی ان کے عذاب میں تاخیر کی جائے گی۔ اور نہ ہی ان کے عذاب کو ٹالا جائے گا انھیں توبہ اور انابت کی مہلت نہ دینا ان کی حالت سے واقفیت کے سبب ہے کہ یہ لوگ توبہ نہیں کریں گے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (سورۂ انعام، آیت ۲۸؛ اور اگر یہ پلٹا بھی دیئے جائیں تو وہی کریں گے جس سے یہ روکے گئے ہیں) بیشتر متکلمین کے نزدیک اگر معلوم ہو انھیں اس حالت میں رکھا جائے تو توبہ کرلیں گے تو انھیں باقی رکھنا واجب نہیں ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا (البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اس کے بعد توبہ کرکے اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں) سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے کفر سے توبہ کرکے ایمان کی طرف بازگشت کی، اپنے (قلب و) ضمیر کی اصلاح کی اور اسلام پر باقی رہنے کا عزم مصمم کیا۔ یہ آیت کا مذکورہ بالا جملہ قائل کے اس قول سے بہت بہتر جس کا یہ کہنا ہے کہ: وَ اَصْلَحُوْا اَعْمَالَهُمْ بَعْدَ التَّوْبَةِ وَ صَلُّوْا وَ صَامُوْا جنھوں نے توبہ کے بعد اپنے اعمال کی اصلاح کی، نمازیں پڑھیں اور روزے رکھے اس لیے کہ یہ اعمال توبہ کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہیں، اس لیے کہ اگر وہ نیک اعمال انجام دینے سے قبل مر جائے تب بھی مومن ہی مرے گا۔ اس پر اجماع ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ بے شک اللہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا۔ رَحِیْمٌ (اور رحم فرمانے والا ہے) ان کے لیے جنت واجب قرار دے گا۔ مغفرت کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ توبہ کے ذریعہ عذاب کا برطرف ہونا فضل الٰہی ہے جس عمل بالکل مؤاخذہ (باز پرس) جائز نہ ہو اس کو مغفرت پر معلق کرنا بھی جائز نہیں ہے اور جس چیز کو مغفرت پر معلق کیا جاتا ہے اس پر مؤاخذہ اور باز پرس بھی ہو سکتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿۹۰﴾

مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی اور یہی لوگ پکے گمراہ ہیں۔(۹۰)

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپ کی بعثت سے قبل ایمان لے آئے تھے، پھر آپؐ کے مبعوث ہونے کے بعد انھوں نے آپ کا انکار کر دیا۔
یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے اپنے انبیاء اور ان کی کتب پر ایمان لانے کے بعد جناب عیسیٰؑ اور انجیل کا انکار کر دیا پھر وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کا انکار کر کے اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہ قتادہ وعطا سے مروی ہے۔
یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت حرث بن سوید کے گیارہ (۱۱) ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب حرث واپس پلٹا تو انھوں نے کہا ہم مکہ میں کفر پر باقی رہیں گے جب تک ہم چاہیں گے جب ہم پلٹ جائیں گے، تو ہمارے بارے میں وہی آیت نازل ہوگی جو حرث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کیا تو ان میں سے جنھیں اسلام میں داخل ہونا تھا وہ داخل ہوا اس کی توبہ قبول ہوئی ان میں سے جو کافر مرا اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ۔

تفسیر:

اس مرتد کی توبہ قبول نہیں

توبہ مقبولہ کے ذکر کے فوراً بعد اللہ نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا (مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے) آیت کے سبب نزول کے اختلاف کا ذکر ہم بیان کر چکے ہیں جس

پر آیت کے مقصود کا دار و مدار ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اس کا انکار کر دیتے اور کفر میں بڑھتے ہی چلے جاتے تھے)

لَّن تُقۡبَلَ تَوۡبَتُهُمۡ (ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی) اس لیے کہ ان کی توبہ اخلاص کی بنا پر واقع نہیں ہوگی اس بات پر جملہ: وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلضَّآلُّونَ (اور یہی لوگ پکے گمراہ ہیں) دلالت کر رہا ہے اگر یہ لوگ اپنی توبہ میں برحق ہوتے تو ہدایت یافتہ ہو جاتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی اس لیے کہ یہ مجبوری والی توبہ ہوگی۔ یعنی یہ لوگ توبہ نہیں کرتے مگر موت کے حاضر ہونے اور اس کے نظر آنے پر۔ یہ حسن، قتادہ اور جبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کا بطور توریہ اظہار کیا تھا، اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی باطنی سرشت اور روش (راز ہائے سربستہ) سے باخبر کر دیا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ آیت وحدیث قبولیت کے توبہ کے لازم ہونے پر دلیل ہیں، اگر اس کے شرائط موجود ہوں اس پر اجماع امت بھی ہے۔ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلضَّآلُّونَ (یہ لوگ) حق اور ثواب سے گمراہ ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہلاکت اور عذاب میں مبتلا ہیں۔

❁❁❁❁❁

إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَمَاتُواْ وَهُمۡ كُفَّارٞ فَلَن يُقۡبَلَ مِنۡ أَحَدِهِم مِّلۡءُ ٱلۡأَرۡضِ ذَهَبٗا وَلَوِ ٱفۡتَدَىٰ بِهِۦٓۗ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ وَمَا لَهُم مِّن نَّٰصِرِينَ ﴿۹۱﴾

یقیناً جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اسی حالت میں مر گئے تو اگر وہ اپنی گلو خلاصی کے لیے اتنا سونا بھی دیں کہ زمین بھر جائے تب بھی یہ بدلہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا ایسے ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا۔ (۹۱)

الفاظ و معانی:

اَلۡمِلۡءُ کی اصل اَلۡمَلَأُ ہے، جس کے معنی برتن کا پر ہونا ہے، اسی سے اَلۡمَلَأُ، اَلۡاَشۡرَاف ہے چونکہ وہ (لوگ) اپنی ہیبت و جلالت سے آنکھیں پر کر دیتے ہیں۔

اَلْفِدْیَۃ: اذیت وتکلیف دور کرنے کے لیے کسی چیز کا بدل وعوض۔اسی سے فَدَاْ اَسِیْرٌ ہے چونکہ یہ اس کے قتل اور اسیری کے دور کرنے کے لیے اس کا بدل وعوض ہے۔

ترکیب:

ذَھَبًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ ذَھَبًا نصب کا حقدار ہے اس لئے کہ اس کا عامل اضافت کی بنا پر یا اس کے بعد آنے والے نون زائدہ کی بنا پر عمل کرنے سے باز رہ گیا ہے۔پس عامل کے ذوالحال میں عمل کرنے سے باز رہ جانے میں حال کا قائم مقام ہے اور جب فاعل کی بنا پر وہ اس میں عمل نہ کرے تو مفعول کے مانند ہوگا۔

وَلَوِ افْتَدٰی بِہٖ۔فراء نے کہا: یہ واؤ زائدہ ہے اور زجاج نے اسے غلط قرار دیا ہے اس لئے کہ کلام کو جب کسی فائدہ پر حمل کرنا ممکن ہو تو اسے اسی پر حمل کیا جائے گا، زائدہ پر حمل نہیں کریں گے۔ جب اس طرح کے جملہ پر واؤ داخل کیا جائے، تو وہ تاکید میں زیادہ بلیغ ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: لَا آتِیْکَ وَ اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ اس لئے کہ یہ واؤ اجمال کے بعد قبول کی نفی کی تفصیل بیان کرنے کے لئے داخل ہوا ہے۔

اگر ہم واؤ کو زائدہ قرار دیں گے تو یہ وہم پیدا ہوگا کہ وہ ان سے زمین بھر سونے کو قبول نہیں کرے گا لیکن دوسری چیز کو قبول کرلے گا۔

تفسیر:

کافر مرنے والے سے کچھ بھی قبول نہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا) وہ اپنے کفر کی حالت میں مرے (یعنی جنھیں کفر کے عالم میں موت آئی) فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا (تو اگر وہ اپنی گلوخلاصی کے لیے اتنا سونا بھی دیں کہ زمین بھر جائے تب بھی یہ عوض ان سے قبول نہیں کیا جائے گا) ان سے زمین کو پر کرنے والا سونا بھی (بطور فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا) وَلَوِ افْتَدٰی بِہٖ اگر وہ اس کے عوض (مال) خرچ کرے یعنی وہ کافر جو عقیدۂ کفر رکھتا ہے اگرچہ ایمان کا اظہار کرے اسے یہ انفاق نفع نہیں بخشے گا یعنی اس کے لیے ثواب کا باعث نہیں بنے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آخرت میں اس سے قبول نہیں کیا جائے

گا اگر وہ اس کی طرف راہ بھی پالے گا۔ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کیا تو دیکھ رہا ہے اگر تیرے پاس تمام زمین کو بھر دینے کے برابر سونا ہوتا تو تو اسے فدیہ میں دے دیتا؟ وہ کہے گا: ہاں، پس اس سے کہا جائے گا: تجھ سے اس سے کہیں زیادہ آسان چیز کا مطالبہ کیا لیکن کیا گیا تھا تو نے اسے انجام نہیں دیا۔ انس نے بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی روایت کی ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ (ایسے ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا) اس کے معنی ہم بیان کر چکے ہیں۔

❀❀❀❀❀

پارہ ۴

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۹۲﴾
تم ہرگز نیکی کو نہ پاسکو گے جب تک وہ چیز راہ خدا میں صَرف نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو اور تم جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کرو گے اللہ اس کا جاننے والا ہے۔ (۹۲)

الفاظ و معانی:

اَلْبِرّ کے لغوی معنیٰ وسعت کے ہیں، اسی سے اَلْبَرّ (خشکی) ہے جو اَلْبَحر (دریا یا سمندر) کے برعکس ہے۔ البِرّ اور اَلْخَیر کے درمیان یہ فرق ہے کہ البِرّ وہ نفع اور فائدہ ہے جو قصد و ارادہ کے ساتھ دوسرے تک پہونچتا ہے، خیر خیر ہوتا ہے اگرچہ وہ سہو اور فراموشی سے واقع ہو۔ البِرّ کی ضد عقوق ہے اور خیر کی ضد شَرّ ہے۔

تفسیر:

ایمان کی نشانی

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ (تم ہرگز نیکی کو نہ پاسکو گے) یعنی تم ہرگز اللہ کی اطاعت کرنے والوں کے ساتھ اس کی نیکی کو نہیں پاسکو گے۔ اس مقام پر 'البِرّ' میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ جنت ہے۔ یہ ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت اور تقویٰ ہے۔ یہ مقاتل اور عطا سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ

تم نیک صالح اور متقی پرہیز گار نہیں بن سکتے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (جب تک وہ چیز راہ خدا میں صَرف نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو) یعنی جب تک کہ تم مال خرچ نہ کرو۔ لفظ 'مِمَّا تُحِبُّوْنَ' سے مال کا کنایہ کیا گیا ہے اس لیے کہ ہر کوئی مال سے محبت کرتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس نفیس اموال سے تم محبت کرتے ہو، گھٹیا اور حقیر مال سے نہیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۷: اور خبردار انفاق کے ارادے سے خراب مال کو ہاتھ بھی نہ لگانا) کہا گیا ہے کہ یہ واجبی زکوٰۃ ہے جسے اللہ نے اموال میں واجب کیا ہے۔ یہ ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے انسان راہ خیر میں خرچ کرتا ہے۔ یہ مجاہد اور ایک جماعت سے مروی ہے۔ ابوطفیل سے روایت کی گئی ہے کہ اس نے کہا: حضرت علی علیہ السلام نے ایک کپڑا خریدا جو آپؑ کو اچھا لگا تو اسے آپؑ نے (راہ خدا میں) صدقہ دے دیا اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو اپنے نفس پر ایثار کرتا ہے (یعنی اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے) خداوند عالم قیامت کے روز جنت سے اس پر ایثار (احسان) کرے گا۔ جو شخص کسی چیز کو پسند کرتا ہو اور اسے اللہ کے لیے قرار دے قیامت کے دن اللہ اس طرح فرمائے گا: جو (شخص) بندوں کے درمیان نیکی کے ذریعہ مدد کرتا تھا میں آج جنت کے ذریعہ تیری مدد کروں گا (بدلہ دوں گا)

روایت کی گئی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر ابوطلحہ نے اپنی دیوار اپنے رشتہ دار کو (برابر) سے تقسیم کر کے دے دی جو اس کے نزدیک مال سے زیادہ محبوب تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا تمھیں مبارک ہو مبارک ہو یہ تمھارے لیے فائدہ بخش مال ہے۔

زید بن حارثہ اپنے لیے گھوڑا لے کر آئے جو انھیں بہت زیادہ پسند تھا، انھوں نے کہا: یہ راہ خدا کے لیے ہے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ بن زید کو بٹھا دیا۔ زید نے اپنے دل میں کچھ محسوس کیا زید بن حارثہ نے کہا: میں اس گھوڑے کو صدقہ میں دینا چاہتا ہوں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ نے تمھارا صدقہ قبول کر لیا۔

ابن عمر نے اپنی اس کنیز کو آزاد کر دیا جسے وہ بہت چاہتے تھے اور اس آیت کی تلاوت کی اور اس طرح کہا: جس چیز کو میں اللہ کے لیے قرار دے چکا ہوں اگر یہ میری عادت نہیں ہوتی تو میں اس (کنیز) سے عقد کر لیتا۔

ابوذر غفاری نے ایک مہمان کی ضیافت کی، انھوں نے مہمان سے کہا: میں مشغول ہوں، میرے پاس اونٹ ہیں تم مجھے سب سے بہتر اونٹ لا کر دو۔ مہمان گیا اور ایک کمزور اور لاغر اونٹنی لے کر چلا آیا۔ ابوذرؓ نے اس سے کہا: تم نے اس اونٹنی کے ذریعہ میرے ساتھ خیانت کی۔ اس نے کہا: میں نے اسے اونٹ سے بہتر پایا لیکن مجھے تمھاری اس کی حاجت و ضرورت کا دن یاد آ گیا۔ ابوذرؓ نے کہا: اونٹ کی نسبت میری حاجت و ضرورت کا دن وہ ہے جس دن مجھے سپرد لحد کیا جائے گا، جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ابوذرؓ نے کہا: مال کے تین شریک ہیں:

اول: القدر جو تم سے مشورہ نہیں کرے گا چاہے وہ خیر میں جائے یا شر میں ہلاکت کے سبب ہو یا موت کے سبب۔ **دوم:** تمھارے وارث جو تمھارے دفن کے منتظر ہوں گے کہ تمھارا سر (قبر میں) رکھا جائے گا اور پھر اسے گھسیٹا جائے گا جس کے تم ذمہ دار ہو گے اور تیسرے تم خود ہو اگر تم ان تینوں میں عاجز ترین بننا نہیں چاہتے ہو تو نہ بنو۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ میں اپنے اس اونٹ کو اپنے مال سے بہت زیادہ چاہتا تھا، میں نے چاہا میں اسے اپنے لیے پیش کروں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے اس آیت کے ذریعہ فتویٰ پر دلیل پیش کی ہے۔ لَن تَنَالُوا الْبِرَّ یعنی تم میری نیکی تک نہیں پہونچ سکتے ہو بجز تمھاری نیکی کے تمھارے برادران پر تمھارے اموال اور تمھاری جاہ و حشم کا ان پر انفاق کرنا جسے تم پسند کرتے ہو، اگر تم نے اس عمل کو انجام دیا تو تم تک میری نیکی اور مہربانی پہونچ جائے گی۔

وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (اور تم جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کرو گے اللہ اس کا جاننے والا ہے) جواب شرط کو (فا) کے ساتھ لایا گیا ہے، اگرچہ اللہ اسے ہر حالت میں جانتا اور اس سے واقف ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں:

اول: اس کی تقدیر یوں ہے کہ جو چیز بھی تم انفاق کرتے ہو اللہ تمھیں اس کی جزا عطا کرے گا (چاہے وہ چیز) کم ہو یا زیادہ، اس لیے کہ وہ علیم (جانتا ہے اور واقف) ہے اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

دوم: اس کی تقدیر یوں ہے کہ اللہ موجود کو اس کی حد کے ساتھ جانتا ہے جسے تم انجام دیتے ہو، اچھی نیت سے یا بری نیت سے، اگر کہا جائے اللہ نے کس طرح فرمایا: لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ جبکہ مفلس و نادار جنت حاصل کر لیتا ہے اگرچہ وہ انفاق بھی نہیں کرتا (اس کا جواب یہ ہے) کہ یہ کلام کو انفاق پر آمادہ کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے جو امکان کے ساتھ مفید ہے۔ رغبت دلانے کے لیے مبالغہ کے

طریقہ پر مطلق طور پر بیان کیا ہے، اولیٰ اور بہتر ہے کہ اس سے مراد ہو تم مکمل نیکی اور اس کے اعلیٰ درجات تک نہیں پہونچ سکتے یہاں تک کہ وہ چیز انفاق (راہ خدا میں صرف کرو) کرو جو تمھاری محبوب اور پسندیدہ ہو۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا آپؐ نے فرمایا: یہ ہے کہ بندہ مال خرچ کرے اور وہ خود کم خرچ و بخیل ہو دنیا کی خواہش کرتا ہو اور فقر و تنگدستی سے ڈرتا ہو۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے چونکہ اس سے پہلی آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ: فَلَن يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا جسے اس ارشاد کے ذریعہ متصل کیا گیا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا تاکہ ثروت مند کی جانب سے فدیہ کے روکنے کے سبب صدقہ میں کوتاہی اور سستی پیدا نہ ہو یا اسی کے مانند جو (دیگر) اطاعتیں ہیں۔

❁❁❁❁❁

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾
تمام کھانے بنی اسرائیل پر حلال تھے مگر وہ جو توریت کے نازل ہونے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیے تھے۔ (اے نبی!) آپ یہودیوں سے کہہ دیجیے کہ توریت لاؤ اور اگر سچے ہو تو اسے ہمارے سامنے پڑھ کر سناؤ۔ (۹۳) اس کے بعد جو اللہ پر افترا پردازی کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ (۹۴)

الفاظ ومعانی:

اِفْتِرَاء: بہتان باندھنا۔ اس کے لغوی معنی کھال کے معین حصہ کو قطع کرنے کے ہیں۔

عَلٰى اِسْتِعْلَاء (بلندی) کے لیے ہے یہاں پر اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کا پیغمبر صلی اللہ علیہ و

آنحضرتؐ کی طرف اس جہت سے جھوٹ کی نسبت دینا ہے کہ آپؐ نے اس کام کا حکم دیا ہے جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا ہے اور اس چیز کو واجب قرار دیتے ہیں جسے اللہ نے واجب قرار نہیں دیا ہے۔

كَذِبَ عَلَيْهِ اور كَذِبَ لَهُ کے درمیان فرق ہے كَذِبَ عَلَيْهِ کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز کے متعلق جھوٹ بولا گیا جو اسے ناپسند ہے اور كَذِبَ لَهُ یعنی جس کے لیے جھوٹ بولا جائے ممکن ہے اس بارے میں ہو جسے وہ چاہتا ہو۔

تفسیر:

طعام کی حلیت وحرمت

كُلُّ الطَّعَامِ، یعنی تمام ماکولات (کھائی جانے والی اشیاء) كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَآءِيلَ نبی اسرائیل یعنی یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کے لیے حلال تھیں۔ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ (گروہ جسے اسرائیل نے حرام کر لیے تھے) یعنی یعقوب نے، عَلَىٰ نَفْسِهِ (خود اپنے اوپر)

اس طعام (کھانے) کے متعلق اختلاف ہے: بیان کیا گیا ہے کہ یعقوب عرق (رگ) کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، جسے عِرقُ النساء کہتے ہیں جس کے لیے انھوں نے نذر کی تھی اگر اللہ انھیں اس مرض سے شفا عطا کرے گا تو وہ خود پر عروق (رگوں اور نسوں) اور اونٹ کا گوشت حرام کر لیں گے، جو کہ انھیں بہت زیادہ پسند تھے۔ یہ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ضحاک سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اسرائیل نے اللہ کی خوشنودی کی خاطر خود پر اونٹنی کا گوشت حرام کر لیا تھا اور انھوں نے اللہ سے دعا کی تھی ان کے لیے اس کی اجازت دے دے (جائز قرار دے) اللہ نے ان کی اولاد پر اسے حرام کر دیا تھا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان پر جگر، گردے اور چربی کو حرام کیا گیا تھا سوائے اس کے جو (جانوروں کی) پشت پر حمل کیا جاتا ہے (یا جسے پشت اٹھائے ہوتی ہے) عکرمہ سے روایت ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ انھوں نے خود پر کیوں کر حرام کیا؟ کہا گیا ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ نذر کے لیے بھی کہا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس نص (حکم) کے ذریعہ جو ان پر وارد ہوا تھا، بیان کیا گیا ہے اس طرح حرام کیا تھا جس طرح اپنے دین کا اظہار کرنے والے زہاد (لوگ) (یا دین پر غلبہ حاصل کرنے والے زہاد) خود پر لذت کو حرام کر لیتے ہیں۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ (توریت کے نازل ہونے سے پہلے) یعنی جناب موسیٰؑ پر تورات نازل ہونے سے قبل تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے۔ آیت بعض (کھانے) کی حرمت پر مشتمل ہے جو بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ تورات کے نزول کے بعد ان پر کیا چیز حرام کی گئی تھی؟! کہا گیا ہے کہ ان پر وہی چیز حرام کی گئی تھی جسے انھوں نے تورات کے نزول سے قبل اپنے باپ یعقوبؑ کی پیروی کرتے ہوئے (خود پر) حرام کی تھی۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان پر تورات میں اللہ نے حرام نہیں کیا تھا بلکہ تورات کے بعد ان کے ظلم اور کفر کے باعث ان پر حرام کیا گیا تھا جب بنی اسرائیل گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے اللہ ان پر پاک کھانا حرام کر دیتا تھا اور ان پر موت کی صورت میں عذاب نازل کرتا تھا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا (سورۂ نساء، آیت ۱۶۰؛ ان یہودیوں کے ظالمانہ رویّے کی بنا پر جن پاکیزہ چیزوں کو ہم نے ان کے لیے حلال قرار دیا تھا ان پر حرام کر دیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روک رہے تھے۔) یہ کلبی کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ تورات میں ان میں سے کوئی چیز ان پر حرام نہیں تھی بلکہ اس چیز کو انھوں نے اپنے باپ کی پیروی کرتے ہوئے خود پر حرام کر لیا تھا اور اس حرمت کی نسبت اللہ کی طرف دے دی تھی۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ اللہ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا: اے محمدؐ! آپ یہودیوں سے کہہ دیجیے کہ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ توریت لاؤ اور اسے ہمارے سامنے پڑھ کر سناؤ) تاکہ واضح ہو جائے کہ حقیقت وہی ہے جسے میں نے بیان کیا ہے کہ نہ وہ جو تم کہہ رہے ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ تورات کے ذریعہ ان پر دلیل و حجت پیش کی ہے اور اسے پیش کرنے کا حکم دیا ہے اگرچہ انھوں نے اس میں موجود (حکم اور بیان) کو نہیں پڑھا تھا لہٰذا تورات میں موجود تھا کہ (ہر چیز کا کھانا) انبیاءؑ کے لیے حلال تھا فقط اسے اسرائیل نے حرام قرار دیا تھا ان لوگوں نے تورات لانے پر اقدام اور پیش قدمی نہیں کی چونکہ انھیں پیغمبرؐ کی صداقت اور اپنے جھوٹ کا علم تھا، یہ بات ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل ہے اس لیے کہ آپؐ کو تورات کی تعلیم اور اس کے پڑھے بغیر ان لوگوں کے جھوٹ کا علم تھا۔

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ (اس کے بعد جو اللہ پر افترا پردازی کرے) یعنی کون ہے جو حجت کے قائم ہونے اور معجزہ ظاہر ہونے کے بعد اللہ پر افترا پردازی کرے؟ فَاُولٰٓئِكَ (تو

ایسے ہی لوگ) اللہ پر جھوٹ باندھنے والے (افترا پردازی کرنے والے) اور هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (ظالم ہیں) یہ لوگ اپنے اوپر عذاب والا کام کرنے ظلم کرنے والے ہیں۔ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فرمایا ہے جبکہ وہ اللہ پر بہتان باندھ کر ہر حالت میں وعید کے مستحق ہوگئے ہیں بیان کا مقصد یہ ہے کہ ان پر حجت قائم ہونے کے بعد ان سے مؤاخذہ کیا جائے گا اور جس نے اس چیز میں جھوٹ بولا جس پر حجت قائم نہ کی گئی ہو وہ بچے کے مانند ہے جو اپنے جھوٹ کے باعث وعید کا مستحق نہیں ہوتا۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ گذشتہ آیت کی تفصیل ہے اس لیے کہ محبوب اور پسندیدہ چیز کے خرچ کرنے اور کھانا جو کہ پسندیدہ چیز ہے اس میں ترغیب دلائی گئی ہے اور اس کا حکم بیان کیا ہے۔ یہ علی بن عیسیٰ سے مروی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ جب ان لوگوں کی بحث ملت ابراہیم کے بارے میں گذر چکی اور وہ جس کے متعلق انھوں نے ہمارے پیغمبرؐ پر اونٹنی کے گوشت کی حلیت سے انکار کیا اور اس کی حرمت کا ابراہیمؑ کے لیے ادعا کیا کہ یہ چیز تورات میں مذکور ہے تو اللہ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے اس آیت کو نازل فرمایا۔

❁❁❁❁❁

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾
(اے نبی) آپ فرما دیجیے کہ اللہ نے سچ کہا ہے، تم ملّت ابراہیم کی پیروی کرو جو باطل سے کترا کر چلتے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے۔ (۹۵)

الفاظ ومعانی:

اِتِّبَاع: ایک دوسرے سے کسی تعلق کی وجہ سے ملحق اور وابستہ ہو جانا، قوت پہلے والے کو حاصل ہوتی ہے دوسرا اس سے طلب امداد کرتا ہے، دوسرا اتباع کرنے والا پہلے (انسان) کی تدبیر میں غور وفکر کرتا ہے، اسی غور وفکر کے سبب اپنے نفس میں تبدیلی کرتا ہے۔

حَنِیۡف کے لغوی معنیٰ استقامت (مستقیم وسیدھا ہونے کے ہیں، نقش قدم پر مائل ہونے سے تفاؤل کرتے ہوئے حَنَف سے صفت بیان کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی اصل اَلۡمَیۡل (مائل ہونا یا جھکاؤ) ہے لہٰذا حنیف کے معنیٰ حق کی طرف مائل ہونے والے شخص کے ہیں جس شریعت پر ابراہیمؑ (قائم) تھے۔

تفسیر:

ملت ابراہیمی کا اتباع

اس آیت میں خداوند عالم نے جس کے بارے میں خبر دی ہے اس کی صداقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ ((اے نبی) آپ فرما دیجیے کہ اللہ نے سچ کہا ہے) کہ ہر کھانا بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا سوائے اس کے جسے اسرائیل نے خود پر حرام کرلیا تھا یہ کہ محمدؐ دین ابراہیم پر ہیں اور آپ کا دین اسلام ہے۔

فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ (ملت ابراہیمی کا اتباع کرو) اونٹ کے گوشت اور دودھ کے مباح قرار دیے جانے میں۔ حَنِيۡفًا یعنی اس دین پر مستقیم اور سیدھے ہیں جو (ابراہیم) کی شریعت ہے، اس کے حج و قربانی اور پاکیزہ کھانے میں یہی حنیفیہ شریعت ہے۔ کہا گیا ہے کہ تمام باطل ادیان سے (کترا کر) دین حق کی طرف مائل ہے۔

وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے) اللہ نے ابراہیم کو یہود و نصاریٰ کی اس نسبت سے بری قرار دیا ہے جسے وہ اپنے گمان میں سمجھتے تھے کہ ابراہیم ان کے دین پر ہیں، اسی طرح مشرکین عرب کو خبر دی گئی ہے کہ ابراہیم مشرکین اور ان کے دین سے بری تھے۔ یہ بات صحیح یہ ہے کہ ہمارے نبیؐ گذشتہ انبیاء کی شریعتوں کے پابند نہیں تھے لیکن آپؐ کی شریعت شریعت ابراہیمی کے موافق تھی لہٰذا ارشاد ہوا: فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ ورنہ اللہ ہی نے آپ کی جانب اس کی وحی فرمائی ہے اور اسے آپ پر واجب قرار دیا ہے جو آپ کی شریعت ہے، اللہ نے شریعت اسلام میں رغبت دلائی ہے کہ وہ ملت ابراہیم ہے، اس لیے کہ جب مصالح ایسی چیز کی موافقت کریں جس پر نفس کو سکون و اطمینان حاصل ہو اور کسی زحمت کے بغیر عقل اسے قبول کرلے تو وہ رغبت کی زیادہ حق دار ہے، مشرکین کا ملت ابراہیمی کے اتباع کی طرف میلان اور جھکاؤ تھا اس لئے ان سے اس طرح خطاب کیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

سب سے پہلا گھر جو انسانوں کے لیے بنایا گیا وہ مکّے میں ہے، بابرکت اور تمام جہانوں کے لیے باعث ہدایت ہے۔(۹۶) اس گھر میں روشن نشانیاں ہیں جن میں مقام ابراہیم بھی ہے جو شخص اس گھر میں داخل ہو جائے اس کے لیے امان ہے۔ اور لوگوں پر واجب ہے کہ خوشنودی خدا کے لیے خانۂ کعبہ کا حج کریں بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو اس سے انکار کر دے تو اللہ تمام جہانوں سے بے پروا ہے۔(۹۷)

قرائت:

ابوبکر اور ابوجعفر کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے حِجُّ الْبَيْتِ حاء کے کسرہ کے ساتھ اور باقی قراء نے حاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

سیبویہ نے کہا: حَجَّ حِجًّا. ذَكَرَ ذِكْرًا کے مانند ہے۔ اس بنا پر حِجّ مصدر ہے۔ یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جنھوں نے حاء کو کسرہ دیا ہے۔

ابوزید نے کہا: الحِجَج. اَلسِّنُوْنَ (سال) کے معنی میں ہے اس کی واحد حِجّة ہے۔

ابوعلی نے کہا: اس قول پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے: ثَمَانِيَ حِجَجٍ۔ کہا: اَلْحِجَّة جس نے ایک بار خانۂ خدا کا حج کیا ہو۔

سیبویہ نے کہا: علماء نے کہا ہے: حِجّة سے انھوں نے ایک سال کا عمل مراد لیا ہے اور اسے اصل وقاعدہ

کی بنا پر نہیں لائے ہیں بلکہ وہ اسم مصدر ہے۔

سیبویہ کا یہ کہنا کہ اصل کے مطابق نہیں لائے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ اسے ایک بار کا فاعل قرار دیا ہے۔البتہ انھوں نے اسے کسرہ اس معنی کے لئے اسم قرار دینے کے لئے دیا ہے۔جیسا کہ وہ غَزَاۃ کہتے ہیں ایک ہی صورت سے عمل کے لئے اور اس میں اَلْغَزْوَۃ نہیں ہوتے ہیں جبکہ غَزَاۃ لانا قیاس کے مطابق ہے۔

الفاظ و معانی:

اَوَّلُ الشَّیْءِ یعنی اس کی ابتداء، ممکن ہے مبتدا ہو جس کا آخر ہو اور ممکن ہے اس کا آخر نہ ہو چونکہ واحد پہلا عدد ہے اس کے آخر کی کوئی انتہا نہیں ہے، اہل جنت کی نعمتوں کی اول (ابتداء و آغاز) تو ہے لیکن ان کی انتہا نہیں ہے۔

بَکَّۃ یعنی اَلْبَکّ ہے لوگوں کا ہجوم اور اژدحام۔

یُبَاکُّ النَّاسُ یعنی جب لوگ ہجوم کریں چنانچہ بَکَّۃ کے معنی یہ ہیں کہ طواف کے لیے لوگوں کا ہجوم کرنا جو مسجد الحرام کے اندر خانۂ کعبہ کے اطراف میں کیا جاتا ہے۔کہا گیا ہے کہ بَکَّۃ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہاں پر جابر و ظالم لوگوں کی گردنوں کو شکستہ کیا جاتا ہے جب وہاں وہ الحاد و کفر کرتے ہیں ظلم کے ساتھ اور انھیں ذرا مہلت نہیں دی جاتی۔وہاں پر پانی کم ہونے کی وجہ سے اسے مَکَّۃ کہا گیا ہے۔

اَلْبَرَکَۃ خیر کا ثابت ہونا اور اس کا نمو پانا ہے، اسی سے اَلْبِرْکَۃ ہے جو حوض کے مشابہ ہوتا ہے جس میں پانی کو روکا جاتا ہے۔اسی سے لوگوں کا یہ کہنا ہے: تَبَارَکَ اللّٰہُ چونکہ اس کی تنہا ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ثابت رہے گی۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی: مُبَارَکًا بربنائے حال منصوب ہے۔بِبَکَّۃ کے ظرف کی وجہ سے۔بِبَکَّۃ مُبَارَکًا کے معنی کی بنا پر۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مُبَارَکًا حال ہو وُضِعَ میں ضمیر کے لئے تو اس طرح کہا گیا ہے: وُضِعَ مُبَارَکًا اس ترکیب کی بنا پر اس طرح کہنا صحیح ہے کہ: قَدْ وُضِعَ قَبْلَہٗ بَیْتٌ لیکن پہلی ترکیب کی بنا پر ایسا کہنا جائز نہیں ہے۔

مَقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ کا منصوب ہونا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر ہے اس کی تقدیر یہ ہے: هِيَ مَقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ - یہ اخفش کا نظریہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ مَقَامُ، آيٰتٌ کا بدل ہے۔ یہ ابومسلم کا قول ہے۔

مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا محلاً مجرور ہے۔ اَلنَّاسِ کا بدل ہے اور یہ بدل البعض من الکل ہے۔

شانِ نزول:

مجاہد نے بیان کیا ہے کہ مسلمان و یہودی باہم فخر و مباہات کر رہے تھے، یہودی کہہ رہے تھے کہ بیت المقدس کعبہ سے افضل اور عظیم ہے اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ اور مقدس سرزمین ہے۔ مسلمان کہہ رہے تھے کہ کعبہ افضل ہے، اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ... الخ

تفسیر:

لوگوں کے لئے پہلا گھر

اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ یعنی سب سے پہلا گھر جو انسانوں کے لیے بنایا گیا۔ اس سے قبل کوئی تعمیر شدہ گھر نہیں تھا) اس کے نیچے سے زمین بچھائی گئی تھی، وہ پہلا مکان تھا جو پانی پر ظاہر ہوا جب اللہ نے آسمانوں کو اور اس کے نیچے زمین کو خلق فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو زمین سے دو ہزار برس قبل خلق فرمایا۔ وہ سطح آب پر سفید جھاگ کے مانند تھا۔ یہ مجاہد، قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے فرمایا: یہ سفید دُر کے مانند تھا۔ ابوخدیجہ نے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے اسے آدمؑ کے لیے جنت سے نازل فرمایا تھا جو سفید دُر (موتی) کی طرح تھا چنانچہ اللہ نے اسے آسمان پر اٹھا لیا تھا اس کی علامت باقی رہ گئی جو اس گھر کا حیولہ تھا۔ اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جو پھر کبھی نہیں پلٹیں گے۔ اللہ نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو بنیاد سے گھر کی تعمیر کا حکم دیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا۔ اس سے پہلے کوئی گھر نہیں تھا، جس محترم گھر کا حج کیا جاتا۔ اس سے پہلے بہت سے گھر تھے لیکن یہ پہلا گھر برکت اور ہدایت کے لیے تھا جسے لوگوں کے لیے قرار دیا گیا۔ یہ حضرت علی علیہ السلام اور حسن سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے پہلا گھر جس میں رغبت ہوئی اور اس سے برکت طلب کی گئی وہ مکہ ہے۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ ہمارے علما نے روایت کی

ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے زمین کی جس جگہ کو خلق فرمایا کعبہ کی جگہ اور مقام ہے پھر زمین اس کے نیچے بچھائی گئی۔ جناب ابوذر نے روایت کی ہے کہ انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے پہلی مسجد کے بارے میں سوال کیا جو لوگوں کے لیے قرار دی گئی، تو آپ نے فرمایا: مسجد الحرام پھر بیت المقدس۔

لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ (وہ مکے میں ہے) کہا گیا ہے بکۃ مسجد ہے اور مکہ تمام حرم ہے جس میں تمام مکانات داخل ہیں۔ یہ زہری اور ضمرہ بن ربیعہ سے مروی ہے۔ یہ روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ بکۃ بطن مکہ ہے۔ یہ ابوعبیدہ سے روایت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بکۃ گھر اور مقام طواف ہے اور مکہ شہر کا نام ہے۔ بیشتر کی رائے یہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بکۃ ہی مکہ ہے، عرب با کو میم سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے۔

مُبٰرَكًا (بابرکت ہے) یعنی بہت زیادہ خیر اور برکت والا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ہمیشہ عبادت ہونے کے سبب بابرکت ہے یہاں تک کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں طواف کا کبھی سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ یہاں پر عبادت کا ثواب کئی گنا ہوتا ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ اس بارے میں طولانی حدیث کی روایت کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ اس مقام میں گناہوں کی بخشش ہوتی ہے۔ اس کا تمام صورتوں پر حمل کرنا جائز و ممکن ہے چونکہ ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

ارشادِ الٰہی: وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (اور تمام جہانوں کے لیے باعث ہدایت ہے) لوگوں کے لیے اللہ کے وجود پر دلالت ہے جس ظالم و سرکش نے بھی اللہ کے گھر کو نقصان پہونچانے کا ارادہ کیا جیسے اصحاب فیل وغیرہ انھیں ہلاکت نصیب ہوئی، نیز اس کے حرم میں ہرن، کتوں اور بھیڑیوں کے ساتھ یکجا ہونا اور وہاں سے فرار نہ کرنا جبکہ دیگر شہروں میں باہم نفرت و دشمنی کے باعث ایک دوسرے سے فرار کر جاتے ہیں، کثرت رمی کے باوجود کنکریوں کا وہاں سے کا ختم نہ ہونا اگر انھیں وہاں اٹھا نہ لیا جائے تو پہاڑ کی طرح جمع ہو جاتیں۔ اس مقام پر پرندوں کا لوگوں سے مانوس ہونا، خانۂ کعبہ میں لوگوں کا شفا حاصل کرنا کعبہ کی عظمت کے پیش نظر پرندوں کا اس پر بلند نہ ہونا، اس کے علاوہ دیگر دلالتیں موجود ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ کعبہ کے ذریعہ لوگ اپنی نمازوں میں سمت کی رہنمائی حاصل کرتے ہیں یا حج و طواف کے ذریعہ جنت کی طرف راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ (اس گھر میں روشن نشانیاں ہیں) یعنی واضح اور روشن دلالتیں ہیں۔ فیہ میں ضمیرہ 'بیت' کی طرف پلٹ رہی ہے۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے فِيْهِ اٰيَةٌۢ بَيِّنَةٌ کی

قرأت کی ہے۔ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ مقام ابراہیم کو تنہا آیت (نشانی) قرار دی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اس جگہ پر جناب ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان آيَةٌ بَيِّنَةٌ روشن نشانی ہے۔ پہلے قول پر قراء کا اتفاق ہے۔ مفسرین نے مقام ابراہیمؑ سے حجر اسود، حطیم، زمزم، جملہ مشاعر، کعبہ کے ارکان، اس پر لوگوں کا اژدحام اور لوگوں کا اس کی تعظیم کرنا مراد لیا ہے۔

مقام ابراہیمؑ کا ذکر سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے حطیم کے متعلق دریافت کیا گیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ حجر اسود اور باب کے درمیان ہے۔ کہا گیا کہ اسے حطیم کیوں کہتے ہیں؟ فرمایا: چونکہ لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہیں، اسی مقام پر اللہ نے جناب آدمؑ کی توبہ قبول کی تھی، پھر حضرتؑ نے فرمایا: اسے تمھارے لیے بنایا گیا ہے تاکہ تم اپنی واجب اور غیر واجب تمام نمازیں حطیم کے نزدیک پڑھو، پس تم ایسا ہی کرو اس لیے کہ یہ روئے زمین پر سب سے افضل مقام ہے۔ اس کے بعد حجر اسود کے نزدیک نماز افضل ہے۔

ابوحمزہ ثمالی سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: ہم سے امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا: کون سا مقام افضل ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اس کا رسولؐ اور فرزند رسولؐ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تو امام علیہ السلام نے ہم سے فرمایا: سب سے بافضیلت مقام وہ ہے جو رکن و مقام کے درمیان ہے۔ اگر کوئی شخص عمر نوح کی برابر ساڑھے نوسو (۹۵۰) برس زندگی گذارے، دن کو روزہ اور شب عبادت میں بسر کرے اور وہ اسی مقام پر ہماری ولایت کے بغیر اللہ سے ملاقات کرے (مرجائے) تو اسے یہ چیزیں ذرہ برابر فائدہ نہیں پہونچائیں گی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: رکن یمانی ہمارا وہ دروازہ ہے جس سے ہم داخل جنت ہوں گے اور روایت کی گئی ہے کہ جو آب زمزم سے سیراب ہوگا شفایاب ہوگا اور مرض اس سے دور ہوگا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ انھیں آیات میں مقام ابراہیمؑ ہے اس میں داخل ہونے والا امان پاجاتا ہے، وحشی جانور درندوں سے امان میں رہتے ہیں، کوئی بندہ کعبہ پر چڑھتا نہیں ہوا مگر یہ کہ وہ آزاد ہوا، اگر بارش رکن یمانی کی جانب ہوتی ہے تو سرسبز و شادابی یمن میں ہوتی ہے، اگر شامی رکن کی طرف ہوتی ہے تو سرسبز و شادابی شام میں ہوتی ہے۔ اگر بارش پورے گھر کو گھیر لے تو تمام شہر و ممالک کے لیے سرسبز و شادابی ہوگی جنھیں ہم نے نشانیوں سے قبل بیان کیا ہے۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (جن میں مقام ابراہیم بھی ہے جو شخص اس گھر میں داخل ہوجائے اس کے لیے امان ہے۔) مقام ابراہیمؑ پر عطف ہے اور مقام ابراہیمؑ میں روشن اور واضح دلالت ہے اس لیے کہ مقام

ابراہیم نہایت سخت پتھر ہے جس میں ابراہیمؑ کے نقش قدم موجود ہیں، خدا کے علاوہ سخت پتھر کو مٹی کی طرح کوئی نرم بنانے پر قدرت نہیں رکھتا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ انھوں نے کہا: حرم سارا مقام ابراہیم ہے جو شخص مقام ابراہیم یعنی حرم میں داخل ہوا وہ امان پا گیا۔ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: اللہ نے زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے قلوب میں مہر و محبت پیدا کر دی کہ وہ اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑیں گے جو حرم میں پناہ لے لے اگرچہ اس کے گناہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور اسلام نے اس میں شدت کے علاوہ کوئی اضافہ نہیں کیا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

دوم: یہ خبر ہے، اس سے امر مراد ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس پر حد واجب ہوگئی ہو اور وہ حرم میں پناہ لے لے تو نہ ہی اسے فروخت کیا جائے، نہ ہی اس کی خریداری کی جائے، نہ ہی کسی طرح کا اس سے معاملہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ حرم سے باہر نکل جائے پھر اس پر حد جاری کی جائے۔ یہ ابن عباس اور عمر سے مروی ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی یہی روایت مروی ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہوگی: وَمَنۡ دَخَلَهٗ فَاٰمِنُوۡهُ جو حرم میں داخل ہو جائے اسے امان دو۔

سوم: جو حرم میں ان تمام چیزوں کی معرفت کے ساتھ داخل ہو جنھیں اللہ نے اس پر واجب قرار دی ہیں تو وہ آخرت میں دائمی عذاب سے امان میں ہوگا، اس کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے۔ اس بات پر اجماع امت ہے کہ جو اس مقام پر کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو حد کا موجب اور سبب ہو اس میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔

اللہ نے بیت اللہ الحرام کی فضیلت بیان کرنے کے بعد حجۃ الاسلام کے واجب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا (اور لوگوں پر واجب ہے کہ خوشنودی خدا کے لیے خانۂ کعبہ کا حج کریں بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں) یعنی لوگوں میں سے جو اس کے گھر کا حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، اللہ کی طرف سے اس پر حج واجب ہے۔ یعنی جو اپنے نفس اور مال سے بیت اللہ تک پہونچ سکتا ہو۔

استطاعت کے سلسلہ میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ زاد راہ (سفر خرچ) اور سواری مراد ہے۔ یہ ابن عباس اور ابن عمر سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اس کا مکہ تک پہونچنا ممکن ہو، جس صورت میں بھی ممکن ہو سکے۔ یہ حسن سے مروی ہے یعنی وہاں تک پہونچنے کی قدرت و طاقت رکھتا ہو۔ ہمارے

❁❁❁❁❁

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کہو! اے اہل کتاب تم آیات خداوندی کا کیوں انکار کرتے ہو جو کچھ تم کررہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔(۹۸) فرمادیجیے! اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو؟ اور دیدہ ودانستہ یہ چاہتے ہو کہ وہ بھی کج روی اختیار کریں تمھاری ان حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔(۹۹)

ترکیب:

مَنْ اٰمَنَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ تَصُدُّوْنَ کا مفعول یہ ہے اور ارشاد الٰہی: تَبْغُوْنَهَا میں کنایہ سَبِيْل کی جانب پلٹ رہا ہے۔

تفسیر:

یہ کفر اور یہ رکاوٹیں کیوں؟!

ان آیات میں اللہ سبحانہ نے اہل کتاب میں سے جھگڑا کرنے والوں کی باتوں کو دوبارہ بیان کرتے ہوئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ یہودیوں اور نصاریٰ سے کہئے نیز کہا گیا ہے کہ یہودیوں سے کہیے: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے محمد! آپ کہیے: اے اہل کتاب!

لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (تم آیات خداوندی کا کیوں انکار کرتے ہو؟) یعنی ان معجزات کا انکار کیوں کررہے ہو جو محمد کو دیئے گئے ہیں اور وہ علامتیں جو آپؐ کی صفت کے مطابق ہیں، جن کے متعلق بشارت گذر چکی ہے۔ خدا نے ان لوگوں کو اہل کتاب کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اگر چہ یہ لوگ (کتاب) پر عمل نہیں کرتے تھے۔ یہ بات اہل قرآن (مسلمانوں) کے لیے جائز نہیں ہے اس کی دو وجھیں ہیں:

اول: قرآن کتاب اللہ کا مخصوص نام ہے، لیکن اَلْکِتَاب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ: اے تحریف شدہ کتاب والو! جس میں اس کو (حقیقی) جہت سے تحریف اور تبدیلی کر دی گئی۔

دوم: ان پر کتاب کے ذریعہ احتجاج کیا گیا ہے چونکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں، گویا کہا جا رہا ہے: اے وہ (افراد) جو کتاب اللہ کے اہل ہونے کا اقرار کرتے ہو! اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟! لفظ استفہام ہے لیکن مراد سرزنش اور مذمت ہے۔ لفظ استفہام کے ذریعہ مذمت و سرزنش کرنا جائز ہے، اس اعتبار سے کہ یہ سوال ہے جو انھیں بہانا بنانے سے عاجز و درماندہ کر رہا ہے، گویا ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تمھارے امکان میں ہو تو اس بارے میں عذر پیش کرو۔

وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے) یعنی تمھارے اعمال کا محافظ و نگراں ہے تا کہ ان کی تمھیں جزا عطا کرے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان پر مطلع ہے، ان کے متعلق جانتا ہے، اس بارے میں تم پر حجت قائم کرنے کے ساتھ اس مقام پر اللہ نے ارشاد فرمایا: قُلْ يٰٓاَهْلَ اَلْكِتٰبِ (فرما دیجیے! اے اہل کتاب!) دوسرے مقام پر يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ ہے، اس لیے کہ اللہ نے ان سے اس مقام پر لطف و مہربانی سے خطاب کرتے ہوئے انھیں ایمان کی دعوت دی ہے اور ایک دوسرے مقام پر ان سے خطاب کرنے سے اعراض کیا ہے ان کے حق سے روکنے اور کا سبب ان لوگوں کو معمولی اور حقیر قرار دیتے ہوئے اللہ سبحانہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا: قُلْ اے محمدؐ (کہہ دیجئے) يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ (اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو؟) یعنی تم لوگ اس دین اسلام سے مومنین کو کیوں روکتے ہو جو اللہ کا دین اور اس کا راستہ ہے؟

اہل کتاب کے راہ خدا سے روکنے کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے: بیان کیا گیا ہے کہ اوس و خروج کے درمیان زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کو یاد دلا کر انھیں فریب دیتے تھے تا کہ ان کے اندر حمیت و عصبیت (تعصب) داخل ہو جائے اور اس طرح انھیں دین سے جدا کر دیں۔ یہ زید بن اسلم سے مروی ہے۔ اس اعتبار سے یہ آیت یہودیوں سے مخصوص ہو جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت یہود و نصاریٰ کے متعلق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کر کے کیوں رکاوٹ پیدا کرتے ہو کہ تمھاری کتابوں میں ان کی صفت موجود نہیں ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تحریف کرنے اور جھوٹ بول کر (کیوں روکتے ہو) یہ اصم سے مروی ہے۔

تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا (اور یہ چاہتے ہو کہ وہ بھی کج روی اختیار کریں) یعنی راہ خدا کے لیے حق کی جانب سے کجی تلاشتے ہو، جو گمراہی ہے۔ گویا اسی طرح کہا ہے کہ لوگوں کے درمیان شبہ پیدا کر کے انھیں گمراہ کرنا چاہتے ہو یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم راستہ کو تلاش کر رہے ہو مگر سیدھا نہیں یعنی جس طرح کا راستہ تلاش کرنا چاہئے ویسا تلاش نہیں کر رہے ہو۔

وَاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ (حالانکہ دیدہ و دانستہ ہو) اس میں دو اقوال ہیں:

اول: تم گواہ ہو کہ تمھاری کتابوں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت پہلے ہی سے دی جا چکی ہے۔ لہٰذا جو اسے تلاشنا چاہتا ہے اسے کس طرح روک سکتے ہو اور اسے تم کس طرح برگشتہ اور منحرف کر سکتے ہو؟

دوم: تم صاحبان عقل ہو جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے: اَوۡ اَلۡقَى السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِيۡدٌ یعنی عقلمند اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اس چیز کی گواہی دیتی ہے جو دین سے متعلق چیزوں میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کرتی ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (تمھاری اِن حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے) یہ ان کے کفر پر ان عذاب سے ڈرانا اور سرزنش کرنا ہے۔

❀❀❀❀❀

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوۡا فَرِيۡقًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ يَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ ؕ وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾

اے ایمان والو! اگر تم نے اہل کتاب میں سے کسی گروہ کا کہا مانا تو یہ تمھیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے۔ (۱۰۰) اور تم کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جب کہ تم کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں اور تمھارے درمیان اللہ کا رسول بھی موجود ہے۔ یاد رکھو جو بھی اللہ سے تعلّق استوار رکھے گا تو اُسے راہ راست کی ہدایت کر دی جائے گی۔ (۱۰۱)

الفاظ و معانی:

اَلطَّاعَۃ: ایسے جاذب ارادہ کی موافقت کرنا جس میں فعل کی جانب ترغیب کی گئی ہو۔

اِجَابَۃ: ایسے ارادہ کی موافقت کرنا جس میں فعل کی دعوت دی گئی ہو۔ لہٰذا اللہ کا اپنے بندے کی نسبت مجیب ہونا جائز و ممکن ہے، جب بندہ اس عمل کو انجام دے جس کی طرف بندے کو دعوت دی گئی ہو اور اللہ کا بندے کے لیے مطیع ہونا جائز نہیں ہے۔

اِعْتِصَام لغوی معنیٰ مانع ہونا اور روکنا لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللہِ (یعنی آج امر خدا سے کوئی روکنے اور بچانے والا نہیں ہے۔

اَلْعِصَام: الحبل (رسی) چونکہ اس کے ذریعہ روکا جاتا اور محفوظ کیا جاتا ہے۔

اَلْعِصَم: پناہ گاہ۔

شان نزول:

یہ آیت اوس و خزرج (قبیلوں) کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب یہودیوں کے ایک گروہ نے انھیں گمراہ کرنے کی غرض سے ان کے درمیان زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کے واقعات بیان کیے اور اس مقصد انھیں دین سے برگشتہ کرنا تھا۔ یہ زید بن اسلم اور سُدی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آیت: وَ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوتی ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

تفسیر:

اہل کتاب کی اطاعت کا انجام

اس آیت میں خداوند عالم نے مومنین کو یہودیوں کی بات قبول کرنے سے ڈراتے ہوئے ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (اے ایمان والو!) یعنی جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کی۔ یہ خطاب اوس و خزرج (قبیلوں) سے ہے۔ لفظ عام ہونے کے سبب دیگر مومنین کو بھی شامل ہے۔ اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (اگر تم نے اہل کتاب میں سے کسی گروہ کا کہا مانا) یعنی اگر تم یہودیوں کی بات

قبول کرنے اور ان کے کینوں کو پھر سے زندہ کرنے میں جو تمھارے درمیان زمانہ جاہلیت میں پائے جاتے تھے ان کی اطاعت کرو گے تو یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمٰنِكُمْ كٰفِرِیْنَ (یہ تمھیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے) یعنی تمھیں تمھارے ایمان کے بعد کفر کی حالت پر پلٹا دیں گے۔

پھر اللہ سبحانہ نے اس مسئلہ کی حساسیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا: وَ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ (اور تم کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو) یعنی تم سے کفر کس طرح پیش آسکتا ہے؟ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ (جب کہ تم کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جارہی ہیں) یعنی ان آیات الٰہی کی معرفت کے ہوتے ہوئے کفر کا واقع ہونا بہت بعید ہے جبکہ ان کے درمیان ایمان کی طرف بلانے والا بھی موجود ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تعجب کے عنوان سے ہے یعنی تمھارے لیے کفر اختیار کرنا مناسب و سزاوار نہیں ہے باوجودیکہ تم پر قرآن مجید کی ان آیات کی تلاوت کی جارہی ہے جو اللہ کی وحدانیت اور اس کے پیغمبرؐ کی نبوت پر دلالت کر رہی ہیں۔

وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ (اور تمھارے درمیان اللہ کا رسول بھی موجود ہے) یعنی تمھارے درمیان محمدؐ موجود ہیں کہ تم جن کے معجزات کا مشاہدہ کر رہے ہو اور کفر جو کہ ہر حالت میں برا ہے اور اس صورت میں تو بہت زیادہ برا ہے۔ ممکن ہے اللہ کے ارشاد وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ سے وہ خاص قوم مراد ہو جس کے درمیان پیغمبرؐ موجود تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پوری امت مراد ہو اس لیے کہ آپ کی احادیث اور معجزات (علامات) جیسے قرآن وغیرہ ہمارے درمیان موجود اور باقی ہیں اور ان چیزوں کا وجود آنحضرت کے ہمارے درمیان زندہ رہنے کے مانند ہے۔

وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ (یاد رکھو جو بھی اللہ سے تعلق استوار رکھے گا) یعنی جو اس کی کتاب اور آیات (نشانیوں) اور دین سے تمسک اختیار کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو اللہ کے ذریعہ اس کے علاوہ ہر چیز سے مانع ہو یعنی (فقط) اس کی عبادت کرے، اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے ذریعہ کفر و ہلاکت سے مانع ہوتے ہیں۔

فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (تو اُسے راہ راست کی ہدایت کردی جائے گی) یعنی انھیں روشن اور واضح راستہ کی طرف ہدایت کردی گئی جائے گی۔ قتادہ نے کہا ہے: اس آیت میں دو واضح پرچم (نشان ہدایت) ہیں: کتاب اللہ و نبی اللہ، اللہ کے نبی گذر چکے ہیں لیکن کتاب اللہ کو اس نے تمھارے درمیان باقی رکھا ہے جو اس کی رحمت اور نعمت ہے جس میں اس کے حلال و حرام ہیں، اطاعت اور معصیت کے بارے میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے خود ذات پیغمبرؐ میں بیشتر معجزات کا مشاہدہ کیا تھا ان میں سے یہ کہ جس طرح

آپ سامنے سے دیکھتے اسی طرح پس پشت سے بھی دیکھتے تھے۔ یہ کہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں آپ کا قلب نہیں سوتا تھا، آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا، آپؐ پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی، آپؐ کے جسم سے جو چیز خارج ہوتی اسے زمین نگل جاتی تھی، آپ کا فضلہ نہیں دیکھا گیا، کوئی آپؐ سے طولانی نظر نہیں آتا تھا چاہے وہ کسی قدر طویل القامت ہوتا، آپؐ کے شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی جس جگہ سے آپ کا گذر ہوتا لوگ آپؐ کی خوشبو سے پہچان لیتے تھے، شب تاریک میں آپؐ کی پیشانی سے نور نکلتا تھا، آپ ختنہ شدہ پیدا ہوئے تھے، اس کے علاوہ اور نشانیاں بھی موجود تھیں۔

❀❀❀❀❀

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور جب تمھیں موت آئے تو اس حال میں کہ تم اسلام پر باقی رہو۔ (۱۰۲) سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو اور اللہ کے احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا تو اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم تو دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے اللہ نے تمھیں اس سے بچا لیا اللہ اسی طرح اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تا کہ تم راہ راست پر آ جاؤ۔ (۱۰۳)

الفاظ و معانی:

لفظ تُقَاۃ وَقَیْتُ سے مشتق ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس میں صورتیں ہیں: تُقَاۃ، وُقَاۃ اور اُقَاۃ

اَلْحَبْل: وہ سبب جس کے ذریعہ مقصد تک پہونچا جاتا ہے، جیسے وہ اسی کہ جس سے تمسک اختیار کر کے

کنویں وغیرہ سے نجات حاصل کی جاتی ہے۔اسی سے امان کے لیے حَبْل (رسی) ہے جو کہ نجات کا باعث ہے۔اسی سے حَبَل جو شکم میں حمل کے لئے بولا جاتا ہے۔حَبْل کے لغوی معنی مفتول یعنی بٹی ہوئی رسی کے ہیں۔

شَفَا الشَّيْءِ: کسی چیز کا کنارہ۔

ترکیب:

ارشادالٰہی: وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ - جملہ حالیہ ہے۔ جَمِيْعًا بھی بر بنائے حال منصوب ہے۔یعنی اِعْتَصِمُوْا فِيْ حَالِ اجْتِمَاعِكُمْ -یعنی كُوْنُوْا مُجْتَمِعِيْنَ عَلَى الْاِعْتِصَامِ۔

وَلَا تَفَرَّقُوْا کی اصل لَا تَتَفَرَّقُوْا ہے۔دو ایک جیسے حروف کے اجتماع کے ناپسند قرار دینے کی بنا پر ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہے اور وہ دوسری تاء ہے اس لئے کہ تاء اول علامت مضارع ہے۔تَفَرَّقُوْا لاء نہی کی بنا پر مجزوم ہے اور علامت جزم نون کا حذف ہونا ہے۔

ارشادالٰہی: فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا میں ھاء کا کنایہ پلٹ رہا ہے اَلْحُفْرَة اور تَرْكِ شفاء کی جانب۔

اسی کے مانند عجاج کا یہ شعر ہے:

طُوْلُ اللَّيَالِيْ اَسْرَعَتْ فِيْ نَقْضِيْ   طَوِيْنَ طُوْلِيْ وَطَوِيْنَ عَرْضِيْ

اس شعر میں شاعر نے طول کو ترک کر کے اللیالی کی خبر دی ہے۔

شان نزول:

مقاتل نے بیان کیا ہے کہ اوس وخزرج کے دو افراد ایک دوسرے پر افتخار کر رہے تھے ثعلبہ بن غنم اوس سے اور اسعد بن زرارہ خزرج سے۔قبیلۂ اوس کے آدمی نے کہا: ہمارے قبیلہ سے ذوالشہادتین خزیمہ بن ثابت ہیں، ہمارے ہی قبیلہ سے غسیل ملائکہ حنظلہ ہیں، دین کے حامی عاصم بن ثابت بن افلح ہمارے قبیلہ سے تھے، سعد بن معاذ جن کے سبب عرش الٰہی حرکت میں آ گیا (لرز گیا) اور بنی قریظہ کے بارے میں اللہ جن کے حکم بننے سے راضی ہوا ہمارے ہی قبیلہ سے تھے۔خزرجی نے کہا: ہمارے درمیان ایسے چار افراد ہیں جنھوں نے قرآن پر محکم اور مضبوطی سے عمل کیا، اُبیّ بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت وابوزید اور ہمارے درمیان انصار کے خطیب اور سردار سعد بن عبادہ ہیں۔دونوں کے درمیان یہ گفتگو جاری رہی، دونوں ایک دوسرے پر

غضبناک ہوتے رہے اور فخر و مباہات کرتے رہے (نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ) دونوں قبیلوں کے افراد مسلح ہو کر ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑے ہوئے۔اس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچی تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر وہاں تشریف لائے۔اس وقت اللہ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں اور آپ نے ان کے سامنے ان کی تلاوت فرمائی اور دونوں قبیلوں کے درمیان صلح کرائی۔

تفسیر:

تقویٰ اور اتحاد کی دعوت

گذشتہ آیت میں خداوند عالم نے کافروں کی باتیں قبول کرنے سے نہی فرمائی اور اس آیت میں وہ بات بیان فرمائی ہے کہ جس کا قبول کرنا واجب ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: "یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) یعنی اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچاؤ یعنی اس کی اطاعت کے ذریعہ خود کو عذاب الٰہی سے بچاؤ، جیسا کہ اس کا حق ہے۔جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہونا چاہئے اس کو اللہ نے اس فقرہ میں بیان فرمایا ہے حَقَّ تُقَاتِهِ اس فقرہ میں چند وجہیں ہیں:

اول: اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے، اس کا شکر ادا کیا جائے، کفران نعمت نہ کیا جائے، اس کا ذکر کیا جائے (یاد رکھا جائے) اسے فراموش نہ کیا جائے۔یہ ابن عباس و ابن مسعود، حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔یہی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

دوم: تمام گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔یہ ابوالجبائی سے مروی ہے۔

سوم: اللہ کی راہ میں جہاد ہے کہ اس میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کی جائے اور خوف و امن میں ہر حال عدل و انصاف پر عمل کیا جائے۔یہ مجاہد سے مروی ہے۔

اس بارے میں دو مختلف اقوال ہیں:

۱۔ یہ حکم اس ارشاد سے منسوخ ہو چکا ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یہ قتادہ، ربیع اور سدیؔ سے مروی ہے۔یہی امام باقر اور امام صادق علیہم السلام سے مروی ہے۔

۲۔ یہ آیت غیر منسوخ ہے۔یہ ابن عباس و طاؤس سے مروی ہے۔جبائی نے اس آیت کے منسوخ ہونے سے انکار کیا ہے۔چونکہ اس کے نسخ ماننے میں بعض معصیت کی اباحت پائی جاتی ہے۔رمانی نے

کہا ہے کہ میرا نظریہ ہے کہ جب اَتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کی توجیہ وتفسیر اس طرح کی جائے گی کہ وہ لوگ خوف اور امن ہر حال میں قیام حق کریں۔ تو اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوگا جس کو ابو علی نے بیان کیا ہے اس لئے کہ وہ اس بات کو محال نہیں مانتے ہیں کہ پہلے مرحلہ میں ان پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ ہر حال میں تقویٰ الٰہی اختیار کریں پھر جان پر خوف کی صورت میں واجب کو ترک کرنے کی اجازت دے دی ہو جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے: اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ (سورۂ نحل، آیت ۱۰۶؛ علاوہ اس کے کہ جو کفر پر مجبور کردیا جائے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو)

وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (اور جب تمھیں موت آئے تو اس حال میں کہ تم اسلام پر باقی رہو) اس سے متعلق ہم نے سورۂ بقرہ میں ذکر کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اسلام ترک نہ کرنا اسی پر باقی رہنا یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے (موت تم سے تمھارے اسلام کی حالت میں ملاقات کرے) موت کو لفظ نہی کے ساتھ ذکر کیا ہے جبکہ موت ناگزیر و لازمی (امر) ہے تو درحقیقت اسلام ترک کرنے سے نہی کی گئی ہے کہ وہ اسلام پر رہ کر مرنے کے ممکن ہونے کے باوجود اس کا دامن چھوڑ کر نہ مریں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔ وَاَنۡتُمۡ مُّسَلِّمُوۡنَ لام کی تشدید کے ساتھ جس کے معنی مُسۡتَسۡلِمُوۡنَ کے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ لے کر آئے ہیں ان کے سامنے سر جھکا دیں۔ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ (سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو) یعنی اللہ سے متمسک اور وابستہ ہو جاؤ۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے ذریعہ خود کو غیر اللہ سے روک لو۔ حَبۡلُ اللّٰہ سے مراد کیا ہے اس بارے میں بہت سے اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: قرآن ہے۔ یہ ابو سعید الخدری، عبداللہ، قتادہ اور سُدی سے بسند مرفوع مروی ہے۔

دوم: دین اسلام ہے۔ یہ ابن عباس وابو زید سے مروی ہے۔

سوم: ابان بن تغلب نے روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ہم وہی اللہ کی رسی ہیں جس کے متعلق اس نے فرمایا ہے: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا .... الخ

حبل اللہ سے ان تمام معانی کو مراد لینا اولیٰ اور بہتر ہے۔ اس کی تائید ابو سعید خدری کی روایت کر رہی ہے جسے انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا: اے لوگو! میں تمھارے درمیان حَبۡلَیۡنِ (دو رسیاں) چھوڑے جارہا ہوں، اگر تم انھیں اختیار کرلو گے، وابستہ رہو گے میرے بعد ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، جن میں سے ایک دوسری سے بزرگ ہے، کتاب الٰہی ایسی ریسمان ہے جو آسمان سے

زمین تک وابستہ ہے اور میری عترت و اہل بیتؑ ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے مگر یہ کہ حوض (کوثر) پر میرے پاس وارد ہوں گے۔

وَلَا تَفَرَّقُوْا (اور تفرقے میں نہ پڑو) یعنی اللہ کے دین اسلام میں تفرقہ اور اختلاف پیدا نہ کرو، جس میں تمھیں حکم دیا گیا ہے کہ متحد اور اطاعت پر ثابت قدم رہو۔ یہ ابن مسعود و قتادہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اختلاف نہ کرو (جدا نہ ہو) یہ حسن سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن پر عمل نہ کر کے اختلاف نہ کرو۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (اور اللہ کے احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا) بیان کیا گیا ہے کہ اوس و خزرج (قبیلوں) کی جنگیں مراد ہیں جو ایک سو بیس برس تک جاری رہیں یہاں تک کہ اللہ نے اسلام کے ذریعہ ان کے قلوب میں الفت و محبت پیدا کر دی (ان کے قلوب باہم جوڑ دیے) اس طرح ان کا حسد و کینہ برطرف ہو گیا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرکین عرب کے درمیان طولانی جنگیں مراد ہیں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی نعمت اور احسان کو یاد کرو جو اسلام کے ذریعہ تمھارے درمیان الفت و محبت پیدا کر دی اور تمھارے درمیان پایا جانے والا تنازعہ اور اختلاف برطرف کر دیا جو تمھیں فوری طور پر حاصل ہونے والا منافع ہے اور بعد میں ثواب کثیر حاصل ہوگا جبکہ تم باہم دشمن تھے، اسلام پر تمھیں متحد کر کے تمھارے قلوب میں الفت و محبت پیدا کر دی اور تمھارے قلوب سے بغض و عداوت کو دور کر دیا۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ (تو اس کے فضل و کرم سے تم بن گئے) یعنی اللہ کی نعمت سے اِخْوَانًا (بھائی بھائی (بن گئے)) تم ایک دوسرے کے پسندیدہ محبوب دوست ہو گئے۔ جبکہ تم باہم جنگ کرنے والے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے اور تم اس طرح ہو گئے تم میں سے ہر ایک کا دوسرے سے قصد کیا جانے لگا (یعنی اس قدر ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے کہ ان میں سے جب ایک کا ارادہ کیا جاتا تو دوسرا ضرور مراد ہوتا یعنی لازم و ملزوم ہو گئے)

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (اور تم تو دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے) اے اصحاب محمد! تم جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے، تمھارے اور اس کے درمیان موت کے سوا فاصلہ نہیں تھا چنانچہ اللہ نے تمھیں اس سے نجات عطا کی کہ اس نے تمھاری طرف رسول بھیجا جنھوں نے ایمان کی طرف تمھاری

راہنمائی کی اس کی طرف دعوت دی جسے قبول کر کے تم نے آتش جہنم سے نجات حاصل کی۔ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (اللہ نے تمھیں اس سے بچالیا) ہم نے تمھیں اس سے نجات دی۔ ارشاد فرمایا ہے اگرچہ وہ (لوگ) جہنم میں موجود نہیں تھے اس لیے کہ وہ اس میں موجود ہونے والوں کے مانند تھے کہ وہ اس میں داخل ہونے کے مستحق تھے۔ ابو الجوزا نے بیان کیا ہے کہ ابن عباس نے اس طرح تلاوت کی: وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا اس وقت ایک اعرابی اسے سن رہا تھا کہنے لگا: خدا کی قسم اس نے انھیں وہاں سے نہیں نکالا بلکہ وہ اس میں ڈالنا چاہتا تھا، ابن عباسؓ نے یہ سن کر کہا اس چیز کو غیر فقیہ کی طرف سے لکھ لو۔

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ (اللہ اسی طرح اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے) یعنی اس بیان کے مانند جس کی تم پر تلاوت کی گئی ہے، اللہ تمھارے لیے دلالتیں اور حجتیں بیان کرتا ہے ان چیزوں کے متعلق جن کا تمھیں حکم دیا ہے اور جن سے تمھیں روکا ہے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ یعنی تاکہ راہ حق و ثواب کی راہنمائی حاصل کرو۔

❀❀❀❀❀

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾

اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلائے، بھلائیوں کا حکم دے، اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (۱۰۴) (اور ان لوگوں جیسے نہ بنو جنھوں نے تفرقہ انداز ی کی اور روشن دلیلیں آجانے کے بعد بھی اختلافات سے نہ بچے ایسے ہی لوگوں کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ (۱۰۵)

الفاظ و معانی:

لفظ 'اَلْاُمَّۃ' مشتق الام سے مشتق ہے جس کے معنی قصد کے ہیں۔ یہ لفظ لغت میں اس کا استعمال آٹھ معانی میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔جماعت   ۲۔انبیاء کے پیرو اس لئے کہ وہ ان کے ایک مقصد پر جمع ہوتے ہیں۔

۳۔اسوہ، نمونہ اور مقتدا اس لئے کہ کچھ لوگ اس کی اقتدا کرتے ہیں۔

۴۔دین وملت۔جیسے یہ آیت: اِنَّا وَجَدْنَا آبَآئَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ (ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی دین و ملت پر پایا)

۵۔وقت وزمانہ جیسے یہ آیت: وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ

۶۔اَلْقَامَۃ جیسے رَجُلٌ حَسَنُ الْاُمَّۃ یعنی حسن القامہ۔

۷۔نعمت   ۸۔اُمَّۃ اُمّ کے معنی میں۔

ترکیب:

مِنْکُمْ اُمَّۃٌ۔یہاں پر مِنْ اکثر مفسرین کے نزدیک تبعیض کے لئے ہے اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرد فرد پر واجب نہیں ہے۔یعنی واجب عینی نہیں ہیں بلکہ واجب کفائی ہیں۔جو گروہ بھی ان دونوں پر عمل کرلے تو دوسروں سے ساقط ہے۔

اور جن علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب عینی ہیں تو ان کے نزدیک یہاں پر مِنْ تبیین (وضاحت) کے لئے اور ساری اجناس اور نوع انسانی کو چھوڑ کر مخاطب کو مخصوص کرنے کے لئے ہے۔ جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (یہاں پر بھی مِنَ الرِّجْس کی وضاحت کے لئے ہے کہ رِجْس وہی بت ہیں) شاعر کا یہ شعر ہے:

اَخُوْ رَغَائِبَ یُعْطِیْھَا وَیَسْلُبُھَا   یَأْبَی الظُّلَامَۃَ مِنْہُ النَّوْفَلُ الزُّفَرُ

اس لئے کہ شاعر نے ممدوح کی تعریف اِعْطَاءِ الرَّغَائِب (پسندیدہ چیزیں عطا کرنے) کے ذریعہ کی ہے۔نَوْفَل: بہت زیادہ عطا کرنے والا۔زُفَر: بوجھ ڈھونے والا۔

تفسیر:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ (اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے) یعنی تم میں ایسی جماعت ہو۔جو

یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ (لوگوں کونیکیوں کی طرف بلائے) دین کی دعوت دے۔ وَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (بھلائیوں اوراطاعت کا حکم دے۔ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (اور برائیوں اور نافرمانیوں سے روکے۔ وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں) یعنی کامیاب ہیں۔کہا گیا ہے کہ ہروہ چیز جس کا اللہ اوراس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے وہ معروف ہے اور جس سے اللہ اوراس کے رسول نے روکا ہے وہ منکر ہے۔یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ معروف وہ چیز ہے جس کا حسن باعتبار عقل وشرع شناختہ شدہ ہواور منکروہ ہے جس کا عقل وشرع انکار کرے اور براما نے اس معنی کے بازگشت پہلے معنی کی طرف ہے۔امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح مروی ہے: وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اَئِمَّةٌ وَ کُنْتُمْ خَیْرَ اَئِمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم میں سے ائمہ ہیں اور تم بہترین ائمہ ہو جنھیں لوگوں کے لیے پیش کیا گیا ہے)

اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی المنکر کے واجب ہونے اور دین میں عظیم موقع ومرتبہ دلالت ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے فلاح اور کامیابی کوانھیں دونوں پر معلق ومنحصر کیا ہے۔بیشتر متکلمین کی رائے ہے کہ یہ دونوں واجب کفائی ہیں، اور بعض کا نظریہ ہے کہ واجب عینی ہیں۔یہی شیخ ابوجعفر شیخ طوسی (رحمۃ اللہ علیہ) کا نظریہ ہے۔صحیح یہ ہے کہ واجب شرعی ہے، عقل میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جواس کے واجب ہونے پر دلالت کرے مگر یہ کہ دفع ضرر کے لیے ہو۔ابوعلی جبائی نے کہا ہے: عقلی اعتبار سے واجب ہے اور آیات وروایات اس کی تائید کرتی ہے اس بارے میں وارد ہونے والی روایتوں میں سے حسن نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امر بالمعروف ونہی المنکر کرنے والا روئے زمین پر اللہ کا خلیفہ (نمائندہ) ہے، اس کے رسول کا خلیفہ (نمائندہ) ہے اوراس کی کتاب کا خلیفہ (نمائندہ) ہے۔

ابولہب کی دختر درہ سے روایت ہے وہ کہتی ہیں: ایک شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا جب کہ آپ منبر پر تھے، اس نے عرض کی: اللہ کے رسولؐ! لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لوگوں کونیکیوں کا حکم دینے والا اور برائیوں سے روکنے والا، ان میں اللہ سے سب سے زیادہ خوف کرنے والا (یا اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا) اوراسے راضی کرنے والا۔

ابودرداء نے بیان کیا ہے کہ لوگوں کونیکیوں کا حکم دواورانھیں برائیوں سے روکو ورنہ خداوند عالم تم پر ظالم بادشاہ کو مقرر کردے گا جو تمھارے بزرگوں کا احترام نہیں کرے گا، نہ ہی تمھارے چھوٹوں پر رحم کرے گا، تمھارے باشرف لوگ دعا کریں گے جو قبول نہیں ہوگی، تم امداد کے طالب ہوگے لیکن تمھاری مدد نہیں کی جائے

گی، فریاد کرو گے لیکن تمھاری فریادرسی نہیں ہوگی، تم طلب مغفرت و بخشش کرو گے لیکن تمھاری بخشش و مغفرت نہیں کی جائے گی۔

حذیفہ نے بیان کیا ہے کہ لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کے نزدیک مردار گدھا نیکیوں کا حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے والے مومن سے زیادہ محبوب ہوگا۔

پھر خداوند عالم نے متحد رہنے اور تفرقہ نہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا (اوران لوگوں جیسے نہ بنو جنھوں نے تَفَرِقَہ اَنْدَازی کی) یعنی دین میں تفرقہ کرنے والے نہ بنو جو یہود و نصاریٰ ہیں۔ وَاخْتَلَفُوا (اور اختلافات کیے) بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی بھی تَفَرَّقُوا یعنی تفرقہ کرنے کے ہیں، دونوں کا ذکر تاکید کے لیے کیا گیا ہے، دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے مانند (نہ بنو) جنھوں نے عداوت و دشمنی کی بنا پر تفرقہ کیا اور دیانت (دینداری) میں اختلاف کیا۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (یعنی روشن دلیلیں، حجتیں اور کتابیں آجانے کے بعد بھی) یعنی حجتیں دلائل اور کتب کے آنے اور (ان کے لیے) راستے کی وضاحت و بیان کرنے کے بعد۔ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (ایسے ہی لوگوں کے لیے عذاب عَظِیم ہے) یعنی آیات اور معجزات آنے کے بعد ان کے تفرقہ اور اختلاف کرنے پر ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔ یہ آیت دین میں اختلاف کرنے کے حرام ہونے پر دلالت کر رہی ہے اور یہ کہ یہ قابل مذمت اور برا (فعل) ہے جس سے ممانعت کی گئی ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

جس دن کچھ چہرے تو روشن ہوں گے اور کچھ سیاہ۔ پس جن کے منہ کو کالک لگی ہوگی ان سے سوال کیا جائے گا: تم وہی ہو نہ، جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے؟ سو اپنے کفر کی وجہ سے اب عذاب کا مزہ چکھو۔ (۱۰۶) لیکن جن کے چہرے چمک رہے ہوں گے تو وہ لوگ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۰۷)

ترکیب:

لفظ یَوْمَ میں عامل عَظِيْمٌ ہے اس کی تقدیر یہ ہے: عَظِيْمٌ عَذَابُهُمْ يَوْمَ تَبْعَضُّ وُجُوْهٌ۔ یَوْمَ میں عامل الْعَذَابَ نہیں ہوسکتا ہے اسلئے کہ وہ خود موصوف ہے، صفت اس کے اور اس کے معمول کے درمیان فاصل بن جائے گی۔ یہاں جملہ اس میں عمل کرسکتا ہے اس لئے کہ وہ يُعَذَّبُوْنَ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَلْمَالُ لِزَيْدٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اس میں یَوْمَ کو نصب دینے والا فعل تقدیری ہے اور جملہ اس کا جانشین ہے۔

قول الٰہی: فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ میں اَمَّا کے جواب میں فَيُقَالُ لَهُمْ: اَكَفَرْتُمْ (کیا تم کفر اختیار کر چکے) ہے۔ پس فَيُقَالُ لَهُمْ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ خود چہرہ کا سیاہ ہونا حال توبیخ وتنبیہ پر دلالت کرتا ہے گویا اسے بیان کرتا ہے۔ بہت سے مقامات پر قول کو حذف کر دیا گیا ہے اسلئے کہ ماقبل کے بیان کی بنا پر وہ اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْ رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا (سورہ سجدہ آیت ۱۲) یعنی يَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا اس لئے کہ مجرمین کا سروں کو نیچے جھکانا ہی ان کے سوال بخشش پر دلالت کرتا ہے اور اس کی مثال بہت ہیں۔

تفسیر:

نورانی چہرے اور سیاہ چہرے

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ (جس دن کچھ چہرے تو روشن ہوں گے اور کچھ سیاہ) اس آیت میں خداوند عالم نے اس عذاب کے وقت کی خبر دی ہے یعنی اس دن جب ان لوگوں کے لیے عذاب ثابت ہوگا۔ جس دن کی صفت یہ ہے۔ اس دن مومنین کے چہرے ان کے ایمان اور اطاعت کے ثواب کی بنا پر سفید ہوں گے اور کافروں کے چہرے ان پر کفر و گناہوں کے عذاب کی بنا پر سیاہ ہوجائیں گے۔ جس پر اس کا بعد والا ارشاد دلالت کر رہا ہے کہ: فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ (پس جن کے منہ کو کالک لگی ہوگی ان سے سوال کیا جائے گا تم وہی ہو نہ، جو کافر ہوگئے تھے؟) یعنی ان سے کہا جائے گا کیا تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا تھا۔ اس سے کون لوگ مراد ہیں اس میں اختلاف ہے، اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جنھوں نے اظہار ایمان کے بعد نفاق کے ذریعہ کفر اختیار کیا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

دوم: تمام کفار مراد ہیں اس لئے کہ انھوں نے توحید کے اس لازمی اقرار سے انحراف و روگردانی کی کہ جس کا اقرار انھوں نے خود کیا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى، ان سے کہے گا: کیا تم نے روز میثاق کے ایمان سے انکار کردیا۔ یہ اُبی بن کعب سے مروی ہے۔

سوم: اس سے مراد اہل کتاب ہیں کہ جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل آپؐ کی صفت اور تعریف پر ایمان لانے کے بعد انکار کردیا۔ یہ عکرمہ سے مروی ہے اسے زجاج اور جبائی نے بھی اختیار کیا ہے۔

چہارم: یہ لوگ اس امت کے اہل بدعت اور ہویٰ پرست ہیں۔ یہ امام علی علیہ السلام سے مروی ہے۔ اسی کے مثل قتادہ سے روایت ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ارتداد کے ذریعہ کفر اختیار کیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: قسم اس ذات کی کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ (حوض) کوثر پر میرے پاس وارد ہوں گے، جب میں انھیں دیکھوں گا تو وہ خلجانی کیفیت (گھبراہٹ کی حالت میں پریشان) میں ہوں گے، پس (اس وقت

) میں کہوں گا: یہ تو میرے اصحاب ہیں، میرے اصحاب ہیں، میرے اصحاب ہیں! تو کہا جائے گا: آپ کو نہیں معلوم انھوں نے مومن ہونے کے بعد کیا کیا حرکتیں کیں، یہ لوگ اپنے الٹے پیروں واپس پلٹ گئے تھے (مرتد ہو گئے تھے) اس روایت کو ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ ابوامامۃ الباھلی نے کہا ہے کہ یہ لوگ خوارج ہیں۔ آنحضرتؐ سے روایت کی گئی ہے یہ لوگ دین سے اس طرح خارج ہو جائیں گے جس طرح تیر چلہ کمان سے نکل جاتا ہے۔

اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے) اس جملہ میں ہمزہ استفہام کا ہے۔ لیکن سرزنش مراد ہے یعنی تم نے کفر کیوں اختیار کیا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تقریر (یعنی مقرر اور تعین) مراد ہے یعنی یقیناً تم نے کفر اختیار کیا۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (سو اپنے کفر کی وجہ سے اب عذاب کا مزہ چکھو) یعنی ذوق (ذائقہ اور چکھنا) کا لفظ مجاز کے عنوان سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دیکھو تمھارا انجام عذاب خدا کے ذریعہ کیسا ہوا جس کا تم انکار کرتے تھے یعنی تمھارے کفر کے سبب۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ (لیکن جن کے چہرے چمک رہے ہوں گے) اور وہ مومنین ہیں۔ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (تو وہ لوگ اللہ کی رحمت میں ہوں گے) یعنی اللہ کے ثواب میں ہوں گے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ کی جنت میں ہوں گے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) کلمۂ ظرف کا اعادہ کیا ہے جو کہ فِيْهَا' تاکید کے لیے ہے تاکہ اس کے معنی ذہن میں جانگزیں ہو جائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس لیے اعادہ کیا گیا ہے کہ وہ اس جملہ سے بتا رہا ہے کہ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ وہ (اللہ) انھیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا اور اس کا ارشاد هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ثواب کو رحمت کہا ہے اور رحمت نعمت ہے جو شکر کی حقدار ہے اور ہر نعمت تفضّل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ثواب کا سبب جو وہ فریضہ ہے جو خود تفضّل ہے اس طرح ثواب بھی تفضّل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس وجہ سے اس کا تفضّل ہونا صحیح ہے کہ وعدہ کو پورا کرنے کی منزل و مقام میں ہے کہ یہ تفضّل ہے جو حقدار ہے اس لیے کہ اس کی ابتدا کرنے والے کو اسے نہ کرنے کا اختیار تھا اور جب اس نے انجام دے دیا تو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ وعدہ خلافی قبیح اور برا فعل ہے اس کے باوجود بھی یہ تفضّل ہے اس لیے کہ تفضّل ہی اسے وہاں تک لے کر آیا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ چہروں کے سفید ہونے سے مراد کامیابی و کامرانی کے سبب چہروں کا چمکنا اور روشن ہونا ہے اور سرور و شادمانی کے سبب روشن ہونا ہے اور حاصل ہونے والے ثواب سے طلب بشارت کرنا ہے جیسا کہ اس کا

ارشاد ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (سورۂ عبس، آیت ۳۸-۳۹: اس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے، مسکراتے ہوئے کھلے ہوئے)

چہروں کے سیاہ ہونے سے عذاب کے ذریعہ آثار حزن کا ظہور مراد ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (سورۂ قیامت، آیت ۲۴: اور بعض چہرے افسردہ ہوں گے) وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (سورۂ عبس، آیت ۴۰: اور کچھ چہرے غبار آلود ہوں گے) اس قول میں کسی ضرورت کے بغیر لفظ کے حقیقی معنیٰ سے روگردانی ہے۔ صحیح ترین قول اول ہے۔

❀❀❀❀❀

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾
وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

یہ وہ آیات الٰہی ہیں جنھیں ہم حق کے ساتھ آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں اللہ دنیا میں بسنے والوں میں سے کسی پر ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔ (۱۰۸) آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت ہے اور تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ (۱۰۹)

تفسیر:

اللہ کی نشانیاں

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ (یہ وہ آیات الٰہی ہیں) جن کا ذکر کیا جا رہا ہے، اللہ کی حجتیں، نشانیاں اور اس کے معجزات ہیں۔ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (جنھیں ہم حق کے ساتھ آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں) یعنی اے محمدؐ! ہم آپ پر جن کی حق کے ساتھ تلاوت کر رہے ہیں اور آپ کی امت پر حق کے ساتھ تلاوت کر رہے ہیں جن سے ہم آپؐ کو واقف کر رہے ہیں اور انھیں آپ کو پہنچوا رہے ہیں اور آپ پر بیان کر رہے ہیں بِالْحَقِّ حکمت اور حق کے ساتھ۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ (اللہ دنیا میں بسنے والوں میں سے کسی پر ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا) یعنی ان پر ظلم نہیں کرتا کہ ان پر ایسا عذاب کرے جس کے وہ حق دار نہیں ہیں یا ان سے اس ثواب کو کم کرے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس لیے کہ ظلم کرنے والا اس سبب سے ظلم کرتا ہے کہ وہ ظلم کی قباحت اور برائی سے ناواقف

ہو یا دفع ضرر کے لیے ایسا کرتا ہے جس کی ضرورت و حاجت ہو اور حصول فائدہ کی غرض سے ہو، جبکہ اللہ کی ذات، جہالت، حاجت (ضرورت) اور تمام صفات نقص سے بلند و برتر ہے، وہ کسی پر ظلم کیوں کر کر سکتا ہے جو ان کا خالق اور وجود میں لانے والا اور ان کا آغاز کرنے والا ہے۔ انھیں وہ نعمتیں عطا فرمائیں جن تک ان کی ہمتوں کی رسائی ممکن نہ تھی اور ان کے لیے قدر و منزلت کے اعتبار سے (دنیاوی نعمتوں میں سے) عظیم ترین اعلی و بلند نعمتیں پیش کیں جو آخرت کی نعمتیں ہیں۔

پھر اللہ سبحانہ نے اپنی ذات کے ظلم سے مستغنی ہونے کی وجہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت ہے) (زمین و آسمان کے درمیان جو) ملکیت، ملک و اقتدار اور مخلوق ہے وہ اللہ ہی کی ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (اور تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے) اللہ کی طرف امور کی بازگشت کے سلسلہ میں اختلاف کیا گیا ہے؛ کہا گیا ہے کہ امور فنا ہو جاتے ہیں۔ اللہ انھیں جزا کے لیے پھر سے پلٹائے گا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو دنیا میں امور کا مالک بنا دیا ہے اور انھیں حق تصرف عطا کر دیا ہے۔ آخرت میں تمام (اختیارات) زائل ہو جائیں گے اور ان سب کی بازگشت اللہ کی طرف ہوگی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ارشاد الٰہی: وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ میں ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر کے آنے کے سلسلہ میں مفسرین کے دو قول ہیں: مضمر کے مقام میں مظہر کے واقع ہونے میں اس کے ارشاد: وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ میں دو اقوال ہیں:

۱۔　دونوں کلاموں میں سے ہر ایک ذاتی طور پر کافی ہو۔

۲۔　تاکہ ذکر میں بلند و بالا ہو جس کا مقام و مرتبہ بلند ہو۔ نہ کہ شاعر کے اس قول کے مانند ہو:

لَا اَرَى الْمَوْتَ يَسْبِقُ الْمَوْتَ شَيْءٌ　　يَغُصُّ الْمَوْتُ ذَا الْغِنٰى وَ الْفَقِيْرَ

اس شعر میں موت کو ضمیر کی ضرورت ہے اور آیت اس سے بے نیاز ہے۔

❀❀❀❀❀

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

تم ہی وہ بہترین امّت ہو جسے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اگر اہلِ کتاب اب بھی ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار ہیں مگر ان کے بیشتر افراد فاسق یعنی نافرمان ہیں۔(۱۱۰)

تفسیر:

بہترین امت کون؟

اللہ نے گذشتہ آیتوں میں امر و نہی بیان کرنے کے بعد اس آیت میں ان کو قیام کرنے اور بجالانے والوں کا ذکر کیا اور ان کی مدح فرمائی ہے تاکہ (لوگوں) کو ان کی پیروی کرنے میں رغبت دلائے، ارشاد فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم ہی وہ بہترین امّت ہو جسے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے پیدا کیا گیا ہے) اس میں متعدد اقوال بیان کئے گئے ہیں:

اول: تم بہترین امت ہو۔ كُنْتُمْ اس لئے فرمایا ہے کہ گذشتہ کتب میں ان (حضرات) کی بشارت دی جا چکی ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے اور اس قول کی تائید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث کر رہی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اَنْتُمْ وَفَيْتُمْ سَبْعِيْنَ اُمَّةً اَنْتُمْ خَيْرُهَا وَ اَكْرَمُهَا عَلَى اللّٰهِ، تم نے ستر امتوں کے عہد و پیمان کو پورا کیا تم ان میں اللہ کے نزدیک سب سے بہتر اور محترم ہو۔

دوم: تم اللہ کے نزدیک لوح محفوظ میں بہترین امت ہو۔ یہ فراء اور زجاج سے مروی ہے۔

سوم: كَانَ اس مقام پر تامہ ہے اور خَيْرَ اُمَّةٍ حالت نصب میں ہے، یعنی تم بہترین امت پائے گئے ہو، تم بہترین امت خلق کئے گئے ہو۔

چہارم: كَانَ زائدہ ہے، اس کا داخل ہونا اس کے خارج ہونے کے مانند ہے لیکن اس میں امر کے یقینی طور پر واقع ہونے پر تاکید ہے گویا درحقیقت یہ اس منزل و مقام میں ہے کہ واقع ہو چکا ہے۔ یہ جملہ اللہ

کے اس ارشاد کے مانند ہے کہ: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ (سورۂ انفال، آیت ۲۶؛ اس وقت کو یاد کرو جب تم مکہ میں قلیل تعداد میں تھے) دوسرے مقام پر ہے: اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ (سورۂ انفال، آیت ۸۶؛ یہ یاد کرو کہ تم بہت کم تھے خدا نے کثرت عطا کی) اسی کے مانند اس کا یہ ارشاد بھی ہے: وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اس لیے کہ واقع ہونے میں اس کی شروعاتی مغفرت گذشتہ مغفرت کے مانند ہے۔

پنجم: كَانَ صَارَ کے معنی میں ہے یعنی ہو گیا، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فخر علی الالاء توسدته و قد کان الدماء له خمارًا

یعنی تم بہترین امت بن گئے ہو میں نے تمھیں نیکیوں کا حکم کرنے، برائیوں سے روکنے اور اللہ پر ایمان لانے کے لیے خلق کیا ہے۔ اس ارشاد میں یہ صفات ان کے بہترین امت ہونے کے لیے شرط ہیں۔ بعض اصحاب سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو اس امت کا بہترین آدمی بننا چاہتا ہے وہ اس کی شرطیں پوری کرے (جو) اللہ پر ایمان لانا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔

خطاب سے مقصود و مراد کون ہے اس بارے میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ فقط مہاجرین مخاطب ہیں۔ یہ ابن عباس و سدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابن مسعود، ابیٔ بن کعب، معاذ بن جبل ابو حذیفہ کے غلام سالم کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ عکرمہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بطور خاص اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصحاب سے خطاب ہے لیکن پوری امت کو شامل ہے۔

پھر خداوند عالم نے ان حضرات کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (تم نیکی کا حکم دیتے ہو) اطاعتوں کا حکم دیتے ہو۔ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (بدی سے روکتے ہو) یعنی گناہوں سے روکتے ہو۔ یہاں سوال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ قبیح (برائی بھی) بھی معروف اور شناختہ شدہ ہوتی ہے کہ وہ برائی ہے، لہٰذا صرف حُسن کو ہی معروف کے نام سے کیوں مخصوص کیا ہے؟ اس کا جواب ہے کہ قبیح کو اس منزل و مقام میں قرار دیا ہے جو اپنی گمنامی کے باعث مشہور و معروف نہیں ہے اور حُسن کو اس کی جلیل القدر شہرت کے مقام و منزلت میں قرار دیا ہے جو اپنی شرافت و بلند مرتبہ کے سبب پہچانی جاتی ہے۔

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) اللہ کی توحید و عدل اور اس کے دین پر ایمان رکھتے ہو۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (اگر اہل کتاب اب بھی ایمان لے آتے) یعنی اگر اہل کتاب پیغمبرؐ اور

جس چیز کو پیغمبرؐ لائے تھے کی تصدیق کرتے۔ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔) ان کے لیے یہ ایمان دنیا و آخرت میں بہتر ہوتا اس لیے کہ وہ دنیا میں قتل ہونے سے بچ جاتے اور آخرت میں عذاب سے محفوظ ہو جاتے اور جنت حاصل کر لیتے۔ مِنْهُمُ اگرچہ اہل کتاب میں الْمُؤْمِنُوْنَ (کچھ لوگ ایمان دار ہیں) یعنی ان چیزوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ جن پر ان کی کتب ہمارے پیغمبرؐ کے صفات اور آپ کی بشارت پر دلالت کر رہی ہیں جیسے عبداللہ بن سلام اور اس کے یہودی دوست اور نصاریٰ میں نجاشی اور اس کے دوست و احباب۔

وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مگر ان کے بیشتر افراد فاسق یعنی نافرمان ہیں) یعنی اللہ کی اطاعت سے خارج ہو چکے ہیں کہ خدا نے ان کو فاسق کہا ہے، کافر نہیں کہا جو کہ اس سے بڑا (گناہ) ہے اس لیے کہ مقصد مطلع اور آگاہ کرنا ہے کہ یہ لوگ اس چیز سے خارج ہو چکے ہیں جس کو ان کی کتابیں ہمارے پیغمبرؐ کی نبوت کے حق کے ساتھ اقرار کرنے کو واجب قرار دے رہی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ کفار میں بدترین حالات اور صورت کی طرف خارج ہونے میں گناہ گار فاسقوں کی منزل اور مقام میں ہیں جو نہایت برا اور بدترین (عمل) ہے۔

❀❀❀❀❀

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

یہ لوگ معمولی ایذا رسانی کے سوا تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اگر یہ تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کے بھاگیں گے اور کہیں سے بھی انھیں مدد نہ ملے گی۔ (۱۱۱) (یہ اہل کتاب) جہاں بھی ہوں گے انھیں ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑے گا مگر یہ کہ وہ اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ میں آجائیں۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے اور اس لیے بھی کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے اور حد سے بڑھتے جا رہے تھے۔ (۱۱۲)

ترکیب:

اِلَّا اَذًی مستثنٰی متصل ہے۔ اَذًی تقدیر منصوب ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لَن یَّضُرُّوْ کُمْ اِلَّا ضَرَرًا یَسِیْرًا (یہ تم کو نقصان نہیں پہنچائیں گے مگر تھوڑا سا) پس اَذًی مفعول مطلق واضح ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اَذًی مستثنٰی منقطع ہے۔ اس لئے اَذًی ضرر نہیں ہے جس طرح یہ ارشاد الٰہی ہے: لَّا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا (حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا بَرْدًا وَّشَرَابًا نہیں ہے دونوں کی جنس الگ ہے) علی بن عیسٰی نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے اسلئے کہ کلام میں جب تک استثناء حقیقی ماننا ممکن ہو اسے استثناء منقطع پر حمل کرنا جائز نہیں ہے۔

وَاِن یُّقَاتِلُوْ کُمْ شرط اور یُوَلُّوْ کُمُ اس کی جزاء ہے اور دونوں میں علامت جزم نون کا ساقط ہونا ہے۔ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ بر بنائے استئنا مرفوع ہے اور عطف ہونے کی بنا پر مجزوم نہیں ہوگا اسلئے کہ اس روگردانی کا سبب قتال و جنگ ہے جبکہ مدد روکنا ایسا نہیں ہے اس لئے کہ اس کا سبب کفر ہے۔ اور دوسری وجہ مرفوع ہونے کی یہ ہے کہ وہ گذشتہ آیات کے آغاز سے زیادہ مشابہ ہے۔ اس ترکیب کی بنا پر عطف جملہ بر جملہ ہے اور ارشاد الٰہی: بحبل من الله کے باء یعنی جار و مجرور میں عامل ضُرِبَتْ ہے۔ اس معنی میں کہ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ بِکُلِّ حَالٍ۔

اِلَّا بِحَبْلٍ، فراء نے کہا: اس میں عامل محذوف ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: اِلَّا اَن یَّعْتَصِمُوْا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ۔

شاعر کا شعر ہے:

رَاَتْنِیْ بِحَبْلَیْهَا فَصَدَّتْ مَخَافَةً   وَ فِی الْحَبْلِ رَوْعَاءُ الْفُؤَادِ فَرُوْقٌ

شاعر کی مراد یہ ہے کہ رَاَتْنِیْ اَقْبَلْتُ بِحَبْلَیْهَا (اس نے مجھے دیکھا وہ اپنی دونوں رسیوں کے ساتھ سامنے آئی) شاعر نے باء میں فاعل کو حذف کر دیا ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا:

قَصِیْرُ الْخُطٰو یَحْسَبُ مَنْ رَّاٰنِیْ   وَ لَسْتُ مُقَیَّدًا اَنِّیْ بَقَیْدٍ

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اَنَّنِیْ قُیِّدْتُ بَقَیْدٍ۔

علی بن عیسٰی نے کہا: فراء نے جو کچھ کہا ہے وہ دلیلوں کی بنا پر ضعیف ہے:

(۱) اہل بصرہ کے نزدیک موصول (متعلق) کو حذف کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ جب وہ صلہ کا محتاج ہوتا ہے جو اس کی وضاحت کرے تو اس کو ذکر کر کے اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت تو اور زیادہ شدید ہوگی۔ کبھی بھی چیز کو حذف کرنا اسی وقت جائز ہے جب کسی دوسری چیز کی اس پر دلالت کے سبب خود اسے ذکر کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ اگر کوئی دوسری چیز اس پر دلالت کرے تو موصول کو اس کے صلہ کے ساتھ حذف کر دیا جائے گا اسلئے کہ دونوں شے واحد کے مانند ہیں۔

(۲) جب کلام کے معنی بغیر حذف کے صحیح ہوں تو پھر حذف کی بنا پر اس کی تاویل کرنا جائز نہیں ہے۔ اِلَّا بِحَبْلٍ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے اسلئے کہ ذلت تو ہر حال میں ان سے چسپاں ہے۔ پس یہ اس ارشاد الٰہی کے مانند ہے: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً۔ عامل اعراب یہاں موجود ہے اور استثناء منقطع کی بنا پر معنی کریں گے۔ اسی کے مانند یہ آیت بھی ہے: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا۔ ہر انقطاع میں کلام سے ملحق ہونے والے ابہام کا ازالہ ہوتا ہے جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا (وہ جنت میں لغو اور بیہودہ باتیں نہیں سنیں گے) تو اس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ وہاں کوئی لغو نہیں سنیں گے تو کوئی کلام بھی نہیں سنیں گے۔ اسی وہم و گمان کو دور کرنے کے لئے اِلَّا سَلٰمًا کہا گیا ہے۔ اسی طرح یہ ارشاد الٰہی: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ مومن کسی دوسرے مومن کو کسی بھی صورت میں قتل نہیں کرتا ہے۔ اسی وہم و گمان کو دور کرنے کے لئے اِلَّا خَطَاً کہا گیا ہے۔ اسی طرح ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ اب صلح جائز نہیں ہے۔ تو کیا کہا؟ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ (مگر یہ وہ اللہ کی رسی کو پکڑ لے) کہا گیا ہے: یہ مستثنیٰ متصل ہے اسلئے کہ مسلمانوں کی عِزَّ بِالذِّمَّة ہے اور بِالذِّمَّةِ عِزَّت کا ہونا انھیں خود اپنے نزدیک ذلت سے باہر نہیں نکالتا ہے۔

شان نزول:

مقاتل نے بیان کیا ہے کہ یہودیوں کے سردار مانند کعب و ابو رافع، ابو یاسر و کنانہ اور ابن صوریا اپنے صاحبان ایمان مانند عبداللہ بن سلام اور اس کے دوستوں پر غضبناک ہوئے اور اسلام قبول کرنے پر ان کی تنبیہ کی، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

ان مقدر ہی ذلت و رسوائی ہے

لَن يَضُرُّوكُمۡ إِلَّآ أَذٗى (یہ لوگ معمولی ایذا رسانی کے سوا تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) خداوند عالم نے مومنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے، اہل کتاب انھیں نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں پا سکتے، فقط باتوں کے ذریعہ انھیں اذیت پہونچا سکتے ہیں۔ پھر ان باتوں کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کا اللہ پر بہتان باندھنا اور کتاب خدا میں تحریف کرنا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مومنین کو اذیت پہونچانے والی بات سنانا ہے۔ وَإِن يُقَٰتِلُوكُمۡ (اگر یہ تم سے لڑیں گے) اگر یہ لوگ زبان کی اذیت سے جنگ و جدال کی طرف تجاوز کریں گے تو يُوَلُّوكُمُ ٱلۡأَدۡبَارَ پیٹھ پھیر کے بھاگیں گے شکست کھا جائیں گے۔ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ یعنی پھر کفر کے سبب کہیں سے بھی انھیں مدد نہ ملے گی۔

اس آیت میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے صحیح ہونے پر دلالت ہے اس لیے کہ جس بات کی خبر دی گئی تھی وہ آپؐ کی دی گئی خبر کے مطابق واقع ہوئی، اس لیے کہ مدینہ کے یہودی بنی قریظہ ونصیرو بنی قینقاع اور خیبر کے یہودیوں نے پیغمبرؐ اور مسلمانوں سے جنگ کی اور آپؐ کے سامنے ثابت قدم نہ رہ سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں پر سب وشتم اور طعنہ وتشنیع کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلذِّلَّةُ ((یہ اہل کتاب) انھیں ذلت وخواری کا سامنا کرنا پڑے گا) یعنی ان کے لیے ذلت ثابت اور معین کر دی گئی ہے، ان پر نازل کر دی گئی جس کے ذریعہ ان کا احاطہ کر دیا گیا، یہ خیمہ نصب کرنے اور خیمہ لگانے سے استعارہ ہے۔ یہ ابو مسلم سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے لیے ذلت لازمی قرار دے دی گئی ہے جو ان کے لیے ثابت ہوگئی جس طرح عربوں کا یہ کہنا ہے کہ ضَرَبَ فُلَانٌ ٱلضَّرِيبَةَ عَلَىٰ عَبۡدِهٖ یعنی فلاں نے اپنے غلام پر ٹیکس کو لازمی اور ضروری قرار دے دیا۔ حسن نے کہا ہے: یہودیوں کے لیے ذلت لازمی قرار دے دی گئی ہے جس سے وہ ہرگز چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے لیے جزیہ اور حقارت فرض قرار دیے گئے ہیں وہ جہاں بھی ہوں گے ان سے اسلام جزیہ وصول کرے گا اور یہودی مجوسیوں کو جزیہ ادا کریں گے۔

أَيۡنَ مَا ثُقِفُوٓاْ (جہاں بھی ہوں گے) یعنی جہاں بھی پائے جائیں گے اور کہا جاتا ہے کہ انھیں گرفتار

کیا جائے گا اور ان پر کامیابی حاصل کی جائے گی۔ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ (مگر یہ کہ وہ اللہ کی پناہ میں آجائیں) یعنی عہد الٰہی میں آجائیں۔ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (اور لوگوں کی پناہ میں آجائیں) یعنی لوگوں سے ذمہ اور امان کی دوسری صورتوں میں عہد کرلیں۔ یہ ابن عباس ومجاہد اور حسن وقتادہ سے مروی ہے۔ عہد کو 'حبل' (رسی) کے نام سے بیان کیا گیا ہے اس لیے کہ عہد کے ذریعہ امان باندھا جاتا ہے۔ جس طرح کسی چیز کو رسی سے باندھا جاتا ہے۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں) یعنی غضب الٰہی کی طرف پلٹ گئے ہیں جو اس کا عذاب اور لعنت ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے غضب کے حقدار ہو چکے ہیں۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ (ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے) ان پر ذلت کی مار پڑی ہے اس لیے کہ مسکین ذلیل ہوتا ہے اسی لئے ذلت کو مَسْكَنَة کہا گیا ہے۔ یہ ابومسلم سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے فقر و ناداری مراد ہے اس لیے کہ یہودی ہمیشہ فقیر ہی رہیں گے اگرچہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ آیت کے باقی حصہ کی تفسیر ہم سورۂ بقرہ میں بیان کر چکے ہیں۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ کامیابی کی بشارت سے متصل ہونا ہے اس لیے کہ جنگ کرنے کا حکم گذر چکا ہے اور منکر کے انکار کی بات گذر چکی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب یہ بات بیان کی جا چکی کہ اکثریت مشرکین کی ہے تو ساتھ ساتھ یہ بات بھی بیان کر دی کہ جس سے مومنین کے قلوب کو سکون حاصل ہوا اس چیز کے پلٹنے سے اور وہ اپنے نقصان سے محفوظ ہو سکیں۔

❀❀❀❀❀

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

یہ تمام اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینِ خدا پر قائم ہیں، وہ راتوں کو آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ (۱۱۳) وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں درحقیقت یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ (۱۱۴)

الفاظ ومعانی:

اَلْمُسَارَعَة: سرعت (جلدی)۔ اَلسُّرْعَة اور اَلْعَجَلَة کے درمیان فرق ہے؛ اَلسُّرْعَة یعنی ان امور میں پیش قدمی کہ جن امور میں پیش قدمی جائز ہے، یہ قابل تعریف اور لائق مدح ہے۔ اس کی ضد اِبْطَاء (سستی) ہے جو کہ قابل مذمت ہے۔

اَلْعَجَلَة یعنی ان امور میں پیش قدمی کرنا کہ جن میں پیش قدمی مناسب اور بہتر نہیں ہے۔ یہ قابل مذمت ہے۔ اس کی ضد اَلْاَنَاة ہے جو کہ قابل تعریف ہے۔

شان نزول:

اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب عبد اللہ بن سلام اور ایک جماعت نے اسلام قبول کرلیا تو یہودیوں کے احبار نے کہا: محمدؐ پر فقط ہمارے شریر افراد ایمان لائے ہیں۔ اس وقت اللہ نے لَيْسُوْا سَوَآءً سے مِنَ الصّٰلِحِيْنَ تک آیت نازل فرمائی۔ یہ ابن عباس وقتادہ اور ابن جریج سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے چالیس (۴۰) افراد، حبشہ کے بتیس (۳۲) اور روم کے آٹھ (۸) لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت عیسیٰؑ کے عہد پر باقی تھے اور انھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی تصدیق کی تھی۔ یہ عطا کا قول ہے۔

تفسیر:

اہل کتاب میں بھی سب برابر نہیں ہیں!

لَيْسُوْا سَوَآءً (یہ یکساں نہیں ہیں) اس جملہ کی تقدیر کے بارے میں اختلاف ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ یہ وقف تام ہے۔ اس کا ارشاد مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (تمام اہل کتاب) آغاز کلام ہے اور مراد یہ ہے کہ جن اہل کتاب کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ برابر و مساوی نہیں ہیں۔ وہ اہل کتاب ایمان لانے والوں کے مساوی نہیں ہیں۔ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ (ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دین خدا پر قائم ہیں) عبد اللہ بن سلام اور اس کے ساتھی اور ایمان نہ لانے والے مقام و مرتبہ میں برابر و مساوی نہیں ہیں۔ پھر از سر نو ان کے فرق کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ اس جملہ کے ذریعہ افتراق و جدائی کا بیان ہوا ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے قائل کسی گروہ یا جماعت کے متعلق خبر دیتے ہوئے کہے: بَنُوْ فُلَانٍ يَعْمَلُوْنَ كَذَا كَذَا یعنی فلاں کے فرزندان ایسا ویسا کرتے ہیں پھر کہے: لَيْسُوْا سَوَآءً سب برابر نہیں ہیں اس لئے کہ ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی قبیلہ کی کنجوسی اور بزدلی کے ذریعہ مذمت کرے اور اس کے علاوہ کوئی یہ کہے: ان میں سب برابر نہیں ہیں۔ ان میں جواد اور شجاع بھی ہیں۔ لہٰذا ان میں جواد اور شجاع کلام کی ابتدا اور آغاز ہوگا۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ اَكَلُوْنِي الْبَرَاغِيْثُ کے طرز گفتگو پر ہے اسی کے مانند اللہ کا ارشاد ہے: ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ۔

زجاج اور رمانی نے کہا ہے کہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح ابو عبیدہ نے بیان کی ہے اس لیے کہ اہل کتاب کا ذکر ہو رہا تھا تو اللہ نے باخبر کیا ہے کہ یہ لوگ مساوی نہیں ہیں اس لیے کہ اَكَلُوْنِي الْبَرَاغِيْثُ والا طرز کلام قیاس اور استعمال میں ردی اور غیر معیاری ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان میں امت قَآئِمَةٌ بھی ہے اور امت غیر قَآئِمَةٌ بھی ہے آیت میں دو فریقوں (گروہوں) میں سے ایک ہی فریق کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔

اس قول کی بنا پر امۃ کو رفع دینا فعل کے معنیٰ کی بنا پر اور تقدیر ہے کہ: لَا يَسْتَوِيْ اُمَّةٌ هَادِيَةٌ وَّ اُمَّةٌ ضَآلَّةٌ. اور پہلے قول کی بنا پر امۃ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ زجاج نے اس قول کو منظور نہیں کیا ہے

اور کہا ہے: ہمیں یہاں پر محذوف کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ فریقین کا ذکر اس آیت میں گذر چکا ہے کہ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ، پھر فرمایا ہے: لَيْسُوْا سَوَآءً اور یہاں پر اُمَّةٌ غَيْرُ قَآئِمَةٍ کو مقدر ماننے کی ضرورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان کی صفت اس آیت میں بیان کر دی ہے: يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۲؛ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو قتل کرتے ہیں)

ارشاد الٰہی: اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ میں متعدد وجہیں ہیں:

اول: اس کے معنی ایسی جماعت جو امر الٰہی پر ثابت قدم ہو۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور ربیع کا قول ہے۔

دوم: عادل جماعت ہے۔ یہ حسن، مجاہد اور ابن جریج کا قول ہے۔

سوم: ایسی جماعت جو اطاعت الٰہی پر قائم ہو۔ یہ سدی سے مروی ہے۔

چہارم: اس کی تقدیر 'ذُوْ اُمَّةٍ قَآئِمَةٍ' ہے۔ یعنی ایسی جماعت جو صراط مستقیم پر قائم ہو۔ یہ زجاج سے مروی ہے انھوں نے نابغہ کا شعر بیان کیا ہے: وَهَلْ يَأْثَمُ ذُوْ اُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ' یعنی دین راستوں میں سے ایک راستہ والا۔ علی بن عیسیٰ نے کہا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اس لیے کہ اس میں ظاہر سے روگردانی ہے اور کسی دلیل کے بغیر حذف کا حکم لگانا ہے۔

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ (کتاب الٰہی یعنی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ اٰنَآءَ الَّيْلِ (راتوں کو) شب کی ساعتوں اور اوقات میں۔ یہ حسن اور ربیع کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ درمیانی شب میں تلاوت کرتے ہیں۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے نمازِ عتمہ کا وقت مراد ہے اس لیے کہ اہل کتاب نماز عتمہ پڑھتے ہیں۔ یہ ابن مسعود سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ مغرب اور عشا کے درمیان ایک نماز ہے۔ یہ ثوری سے مروی ہے۔ اس ساعت کو سَاعَةُ الْغَفْلَة کہتے ہیں۔

وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (اور سجدہ ریز ہوتے ہیں) کہا گیا ہے کہ نماز کا سجدہ مراد ہے۔ اس اعتبار سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے ساتھ ساتھ سجدہ کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ سجدوں کے بغیر نماز پڑھتے ہیں۔ سجود سے نماز کو مراد لیا ہے اس لیے کہ سجدہ تواضع کا سب سے بلیغ رکن ہے۔ زجاج، فراء اور بلخی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: چونکہ سجود اور رکوع میں قرأت نہیں ہوتی ہے اس طرح واؤ حالیہ ہے یعنی شب میں اپنی نمازوں میں آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہی جبائی کا قول بھی ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (وہ اللہ پر ایمان

رکھتے ہیں) یعنی اللہ کی وحدانیت اور اس کے صفات پر ایمان رکھتے ہیں۔ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اور روز آخرت (پر ایمان رکھتے ہیں)) جو اس دنیا کے بعد ہے یعنی روز قیامت ۔وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (نیکی کا حکم دیتے ہیں) یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اقرار کا حکم دیتے ہیں۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (برائی سے روکتے ہیں) یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے سے (روکتے ہیں) وَيُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں) موت کے ذریعہ فوت ہونے کے خوف سے اعمال صالحہ اور فرائض کی ادائیگی میں جلدی کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اعمال کی عظمت و جلالت اور نیک انجام کے علم کے باعث کاہلی اور سستی کے بغیر اعمال نیک انجام دیتے ہیں۔

وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (درحقیقت یہی لوگ نیکوکار ہیں) یعنی نیکوکاروں میں سے ہیں۔ یہ جملہ یہودیوں کی اس بات کی رد ہے کہ وہ کہتے تھے: محمدؐ پر ہمارے شریر ترین افراد کے سوا کوئی ایمان نہیں لاتا۔

اس آیت میں اللہ کے نزدیک نماز شب کی اہمیت اور عظیم مقام و مرتبہ پر دلیل ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے: بندہ کی دو رکعت نماز جسے وہ شب کے آخری حصہ میں پڑھتا ہے دنیا اور اس کی تمام اشیاء سے بہتر و افضل ہے، اگر اس کا پڑھنا میری امت پر شاق و گراں نہ ہوتا میں انھیں ان پر فرض قرار دیتا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جن گھروں میں نماز شب، تلاوت قرآن کے ساتھ ادا کی جاتی ہے وہ اہل آسمان کے لیے اس طرح نور دیتے ہیں جس طرح زمین والوں کے لیے آسمان کے ستارے ضو فشانی کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرتؑ نے فرمایا: نماز شب کی پابندی کرو یہ تمھارے پیغمبرؐ کی سنت اور نیک لوگوں کی عادت ہے جو تم سے پہلے تھے اور تمھارے جسموں کے امراض کے لیے شفا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور وہ جو بھی عملِ خیر انجام دیں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی اور اللہ پرہیز گاروں سے خوب واقف ہے۔ (۱۱۵)

قرائت:

ابوبکر کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے اس آیت میں افعال کو یاء کے ساتھ يَفْعَلُوْا اور يُكْفَرُوْهُ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ سوائے ابوعمرو کے کہ وہ ان دونوں میں اختیار دیتے ہیں۔

حجت:

یاء کے ساتھ پڑھنے کی دلیل یہ ہے کہ کنایہ ہے ان اہل کتاب کے لئے جن کا ذکر گزر چکا ہے تا کہ ساری باتیں ایک ہی نہج اور طریقہ پر ہوں۔

اور تاء کے ساتھ پڑھنے کی دلیل یہ ہے کہ اہل کتاب کو دیگر مکلفین سے ملحق کر دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں خطاب سب کے لئے ہے کہ ان سب کا حکم ایک ہے۔

ترکیب:

وَمَا يَفْعَلُوْا۔ مَا مجازات یعنی شرط کے لئے ہے۔ يَفْعَلُوْا شرط کی بنا پر مجزوم ہے۔ شرط مَا کے ذریعہ لگائی گئی ہے كَيْفَ کے ذریعہ نہیں اس لئے کہ مَا كَيْفَ سے زیادہ مضبوط ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مَا معرفہ اور نکرہ دونوں ہوتا ہے اسلئے وہ جنس کے لئے ہوتا ہے اور كَيْفَ صرف نکرہ ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حال کے لئے ہوتا ہے اور حال صرف نکرہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فائدہ کی غرض سے ہوتا ہے۔

تفسیر:

ہر خیر کی جزا ملے گی

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ اور وہ جو بھی عملِ خیر انجام دیں گے یعنی اطاعت کریں گے۔ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ (اس کی ناقدری نہ کی جائے گی) یعنی ان سے اس کی جزا نہیں روکی جائے گی۔ جزا کے روکنے کو کفر کہا گیا ہے

مجاز ہے اس لیے کہ جزا کا روکنا اس کے انکار کرنے اور چھپانے کے مانند ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمھاری اطاعت سے انکار نہیں کیا جائے گا، نہ ہی جزا روک کر اسے چھپایا جائے گا۔ یہ اسی کے مانند ہے کہ اللہ کو شاکر کہا جاتا ہے، در حقیقت وہ اطاعت پر ویسے ہی ثواب دیتا ہے جیسے نعمت پر شکر کرنے والوں کو ثواب عطا کرتا ہے۔ پس جس طرح ثواب کے لیے شکر کا استعارہ کیا گیا ہے اسی طرح اس کی ضد ثواب سے روکنے کے لیے کفر کا استعارہ کیا گیا ہے اس لیے کہ شکر دراصل اعتراف نعمت ہے اور کفر منعم علیہ کا نعمت کا چھپانا ہے حق نعمت کو ضائع کرتے ہوئے۔

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ یعنی اللہ متقین کے حالات سے بخوبی واقف ہے انھیں جزا عطا کرے گا۔ متقین کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا ہے کہ اگرچہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے کلام متقین کی جزا کے ذکر کا مقتضی ہے۔ لہٰذا ان کی جزا کا ذکر کر کے اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ ان کے عمل میں سے کوئی چیز ضائع و برباد نہیں کرے گا چاہے مختصر ہو یا زیادہ۔ اس لئے کہ جزا دینے والا ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ کوئی بھی عمل خیر اور اطاعت ہرگز ضائع نہیں ہوگا۔ یہ اس شخص کے قول کے برخلاف ہے جو حبط اعمال کا قائل ہے۔

❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ہے تو اللہ کے مقابلے میں ان کا مال اور ان کی اولاد کچھ کام آنے والی نہیں۔ ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۱۶) وہ اپنی اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا جیسی ہے جس میں سخت سردی ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے اور اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ (۱۱۷)

تفسیر:

مال واولاد کام نہ آئیں گے

اللہ سبحانہ نے مومنین کے صفات بیان کرنے کے فوراً بعد کافروں کی حالت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ یعنی رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر اختیار کیا ہے تو ان کے کچھ کام آنے والا نہیں یعنی ان کا دفاع نہیں کرے گا اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ. ان کا مال اور ان کی اولاد اللّٰهِ شَیْـًٔا (اللہ کے عذاب کے مقابلے میں) اموال اور اولاد کے خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان ان دونوں پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے اور اس کے نزدیک تمام اشیاء میں سب کے قیمتی شے ہیں جب یہ دونوں چیزیں ہی انسان کے کسی کام نہیں آسکتیں تو دوسری چیزوں کا انسان کے کام آنا بہت بعید ہے۔ وَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں) یعنی ان کے لیے (آتش جہنم) لازمی وضروری ہے۔ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

پھر ان کے انفاق کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ (وہ جو کچھ خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا جیسی ہے) یعنی ان کے اموال خرچ کرنے کی مثال وتشبیہ۔ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (اپنی دنیاوی زندگی میں) بیان کیا گیا ہے کہ رسولؐ کی عداوت و دشمنی میں کفار جو خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے بدر و احد میں جو کچھ خرچ کیا جب انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس چیز کو یہودیوں کے پست گھٹیا اور حقیر لوگوں نے اپنے علما پر خرچ کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار کے دنیا میں خرچ کیے ہوئے تمام صدقات اور نفقات کے لیے یہ مثال دی گئی ہے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ آیت میں ایک چیز حذف ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: مَثَلُ اِهْلَاكِ مَا یُنْفِقُوْنَ كَمَثَلِ اِهْلَاكِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ یعنی انفاق کرنے والوں کی ہلاکت کی مثال ایسی ہلاک کرنے والی ہوا کے مانند ہے جس میں شدید سردی ہو۔ پس اہلاک کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ جملہ کا آخری حصہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اس میں ایک دوسری تقدیر بھی ہے کہ مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ كَمَثَلِ مُهْلِكِ رِیْحٍ یعنی ان کے انفاق کرنے کی مثال ہلاک کرنے والی ہوا کے مثل ہے۔ یہ اس انفاق کی تشبیہ (ہلاک ہونے کی نسبت) ہوا کے ذریعہ کھیتی کی ہوگی۔ فِیْهَا صِرٌّ جس میں سخت سردی ہو۔ یہ ابن عباس، حسن، قتادہ اور مفسرین کی ایک

جماعت سے مروی ہے۔ زہریلی گرم مار ڈالنے والی (ہوا) بھی کہا گیا ہے۔ یہ بھی ابن عباس سے مروی ہے۔

اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ اور وہ ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے۔ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے) یعنی جنھوں نے گناہوں اور معصیت کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے ان کا ظلم ان کی کھیتی کی بربادی کا تقاضا کرتا ہے جو ان کے لیے عذاب ہے۔ کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ انھوں نے زراعت کے مقام کے علاوہ کی اور مقام پر زراعت کی یا ناوقت زراعت کی اور ایسی ہوا چل گئی کہ فَاَهْلَكَتْهُ (اسے برباد کر کے رکھ دے) یہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے کسی بھی چیز کو اس کی صحیح جگہ کے بجائے دوسری جگہ رہنے پر تادیب وتنبیہ کی بنا پر ہے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ (اللہ نے) ان کی کھیتی کے برباد کرنے میں (ان پر ظلم نہیں کیا) اس لیے کہ وہ لوگ اپنے ظلم کے سبب اسی چیز کے مستحق بن گئے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے قتل اور اسیر ہونے میں (اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا) اس لیے کہ وہ اپنے کفر کے باعث (قتل اور اسیر ہونے) کے مستحق بنے تھے۔ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (بلکہ انھوں نے خود اپنے نفسوں پر ظلم کیا) چونکہ انھوں نے وہ کام کیا تھا کہ جس کے سبب اس سزا کے حقدار بنے تھے۔

❁❁❁❁❁

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اے صاحبان ایمان اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، کیوں کہ وہ تمھاری بربادی میں کوئی کمی نہ کریں گے اور جس قدر تمھیں تکلیف پہنچے گی اتنا ہی یہ خوش ہوں گے بغض وعداوت تو ان کی باتوں سے نظر آ رہا ہے اور جو کچھ وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے ہم نے تم کو اپنی آیتیں واضح طور سے بتا دی ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو (تو انھیں سمجھ سکتے ہو۔) (۱۱۸)

الفاظ ومعانی:

اَلْبِطَانَۃ: آدمی کے مخصوص افراد جو اس کے راز کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یہ لفظ بِطَانَۃُ الثَّوب سے مشتق ہے جو جسم سے نزدیک ہونے کے سبب اس سے ملحق رہتا ہے۔ یہ اَلظِّهَارَۃ کی ضد ہے۔ لفظ بِطَانَۃ ہی واحد، جمع اور مذکر ومؤنث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

اَلْخَبَال: شر اور فساد۔ اسی سے اَلْخَبْل ہے جنون کے معنی میں چونکہ یہ فساد عقل ہے۔ رَجُلٌ مُخَبَّلُ الرَّأي یعنی فاسد الرائی شخص۔

عَنَت کے لغوی معنی مشقت کے ہیں۔

ترکیب:

مِنْ دُوْنِکُمْ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: لَا تَتَّخِذُوْا بَعْضَ الْمُخَالِفِیْنَ فِي الدِّیْنِ بِطَانَۃً۔ یہ مِنْ صفت کی وضاحت و بیان کے لئے بھی ہوسکتا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ یہ زیادہ بہتر ہے اسلئے کہ سب کو شامل ہے اور جائز نہیں ہے کہ مومن کسی بھی حالت میں کافر کو اپنا دوست اور ساتھی بنائے۔

کہا گیا ہے کہ یہاں پر مِنْ زائدہ ہے، یہ صحیح نہیں ہے اسلئے کہ حرف کو جب فائدہ پر حمل کرنا صحیح ہو تو اس کے زائدہ ہونے کا حکم نہیں دیا جاسکتا ہے۔

خَبَالًا مفعول دوم ہونے کی بنا پر منصوب ہے اسلئے کہ اَلُوْ دو مفعولی ہے۔ یہ مفعول مطلق بھی ہوسکتا ہے اس کے معنی یہ ہوں گے: یَخْبِلُوْنَکُمْ خَبَالًا۔

ارشاد الٰہی: وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ، بِطَانَۃً کی صفت ہونے کی بنا پر محلًا منصوب ہوسکتا ہے اور جملہ مستانفہ ہونے کی بنا پر اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوگا۔

مَا عَنِتُّمْ میں مَا مصدریہ ہے اور اس کی تقدیر: وَدُّوْا عَنَتَکُمْ ہے۔

شان نزول:

یہ آیت ان مسلمانوں میں سے ان مردوں کے بارے میں نازل ہوئی جو یہودیوں سے دوستی وقرابت

داری ،ہم سائیگی و حلف (عہد و پیمان) اور رضاعت کے سبب تعلق رکھتے تھے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مومنین کے اس گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو منافقین سے دوستی رکھتے تھے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

تفسیر:

اغیار پر بھروسہ مت کرو

اس آیت میں خداوند عالم نے مومنین کو کفار کی طرف سے فتنہ کے خوف کی بنا پر ان سے دوستی اور باہمی اختلاط و وابستگی سے منع فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (اے صاحبان ایمان!) یعنی تصدیق کرنے والو!

لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ (اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ) یعنی مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور خاص مت بناؤ، ان سے اپنے راز بیان مت کرو۔

پھر خداوند عالم نے ان سے تعلق رکھنے سے منع کرنے کی سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا (کیوں کہ وہ تمھاری بربادی میں کوئی کمی نہ کریں گے) یہ تمھارے معاملہ سے متعلق بربادی میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے، نہ ہی تمھیں نقصان پہونچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ زجاج نے کہا ہے: تمھیں نقصان پہونچانے والی چیزوں سے گریز نہ کریں گے۔ نیز کہا ہے کہ خیال کے لغوی معنیٰ الخبال ذہاب الشیء کے ہیں یعنی کسی شے کا ختم ہونا۔

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ (اور جس قدر تمھیں تکلیف پہنچے گی وہ اتنا ہی یہ خوش ہوں گے) یعنی تم پر مشقت و زحمت وارد کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمھیں تمھارے دین سے گمراہ کرنے کی تمنا کرتے رہتے ہیں۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمھارے دین میں مشقت و زحمت پیدا کرنے کی خواہش و تمنا کرتے ہیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ (بغض و عداوت تو ان کی باتوں سے نظر آ رہا ہے) یعنی تمھارے بارے میں ان کی دشمنی کی علامت و نشانی ان کی زبانوں پر ان کی باتوں میں اور ان کے کلام کی ساخت میں ظاہر ہو گئی ہے۔

وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ (اور جو کچھ وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے)

یعنی جس کا اظہار وہ اپنی زبانوں سے کر رہے ہیں ان کے دلوں میں پوشیدہ اس سے بڑی چیز ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ (ہم نے تم کو اپنی آیتیں واضح طور سے بتادی ہیں) یعنی ہم نے تمھارے لیے واضح دلائل بیان کردیئے ہیں جن کے ذریعہ تم دوست و دشمن میں فرق کرسکتے ہو اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (اگر تم عقل رکھتے ہو (تو انھیں سمجھ سکتے ہو۔)) یعنی دوست و دشمن کے درمیان فاصلہ سے واقف ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ کے مواعظ اور ان کے منافع کو جانتے ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تم صاحبِ عقل ہو، لہذا اللہ نے تمھیں شافی و کافی بیان عطا کردیا ہے۔

❁❁❁❁❁

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے حالاں کہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو جب یہ لوگ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ایمان قبول کرلیا اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمھارے خلاف انگلیاں چبا چبا کر اپنے غصّے کا اظہار کرتے ہیں۔ تم ان سے کہو کہ اپنے غصّے میں جل مرو یقیناً اللہ دل کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ (۱۱۹)

الفاظ و معانی:

اَلْعَضّ: دانت سے کاٹنا۔ انسان اپنے دشمن کو دانت دشمنی کے باعث کاٹتا ہے۔

اَنَامِل: انگلیوں کے سرے۔ اس کی اصل اَلنَّمل (چیونٹی) ہے جو کہ مشہور ہے اَنَامِل باریکی اور حرکت کے ذریعہ تصرف میں چیونٹی سے مشابہ ہیں۔ اسی سے رَجُلٌ نَمِل ہے یعنی چغلی کرنے والا چونکہ یہ شخص چیونٹی کی طرح خاموشی اور کثرت سے ناگوار اور غلط باتیں ادھر سے ادھر منتقل کرتا اور پھیلاتا ہے۔

ترکیب:

زہری نے کہا: احتمال پایا جاتا ہے کہ اُولَآءِ منادی ہو گویا اس طرح فرمایا ہے: یَا اُولَآءِ۔

دوسرے عالم نے کہا: هَا تنبیہ کے لئے ہے اور اَنْتُمْ مبتدا، اُولَآءِ اس کی خبر ہے۔ تُحِبُّوْنَهُمْ حال ہے۔

زجاج نے کہا: اُولَآءِ، اَلَّذِیْنَ کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا: هَا اَنْتُمُ الَّذِیْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تُحِبُّوْنَهُمْ حال ہو اور یُؤْمِنُوْنَ، یُحِبُّوْنَ پر عطف ہو۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ هَا قَوْمُكَ اُولَآءِ اس لئے کہ ضمیر هاء تنبیہ کے لئے زیادہ حقدار ہے اس لئے کہ ضمیر عمومیت میں مبہم کے مانند ہوتی ہے جبکہ ظاہر ایسا نہیں ہے۔

تفسیر:

صاحبان ایمان سے شدید دشمنی

اس آیت میں خداوند عالم نے ان لوگوں (یہودیوں) کی مومنین سے دشمنی کو بیان کیا ہے کہ ان سے ملاقات اور دوستی کی ممانعت پر مزید زور دے کر ارشاد فرمایا:: هَآاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ (تم ان سے دوستی رکھتے ہو) اعراب کی بحث میں اس کے معنی کا ذکر گذر چکا ہے اس کی تقدیر اس طرح ہے: هَآاَنْتُمُ الَّذِیْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ یا هَآاَنْتُمْ اُولَآءِ مُحِبِّیْنَ (آگاہ ہو جاؤ کہ تم وہ ہو جو ان سے دوستی کرتے ہو، آگاہ ہو جاؤ کہ یہ تمھارے محبوب اور پسندیدہ ہیں) جیسا ہم کہیں کہ یہ حال کے معنی میں ہے یعنی تم ان سے محبت کی حالت میں آگاہ رہو یہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ اس وجہ سے کہ تمھارے درمیان دین کی مخالفت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اس لیے کہ تم ان کے لیے اسلام چاہتے ہو اور انھیں جنت کی دعوت دیتے ہو۔ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ (مگر یہ تم سے محبت نہیں کرتے) اس لیے کہ یہ تمھارے لیے کفر و گمراہی کے خواہاں ہیں کہ جس میں ہلاکت ہے۔

وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ (حالاں کہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو) اَلْكِتَاب واحد ہے، لیکن جمع کے معنی میں ہے۔ اس سے جنس مراد لی گئی ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: كَثُرَ الدِّرْهَمُ فِي اَيْدِي النَّاسِ یعنی لوگوں کے ہاتھوں میں درہم بکثرت ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اَلْكِتَاب مصدر ہو جیسا

آپ کا کہنا ہے: کَتَبۡتُ کِتَاباً (میں نے با قاعدہ لکھا) اس سے مراد وہ کتب ہیں جنھیں اللہ نے اپنے انبیاؑ پر نازل فرمایا ہے۔لفظ کِتَاب کو مفرد بیان کرنے میں ایک طرح کا اختصار کی ہے اور اعتقاد میں تفصیل کی جانب اشارہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم فی الجملہ (کتاب) کی تصدیق کرتے ہو اور بطور تفصیل اس کی تصدیق کرتے ہو اس اعتبار سے کہ تم ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ و محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام پر جو کچھ نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہو حالانکہ یہ لوگ تمھاری کتاب کی تصدیق نہیں کرتے۔

وَاِذَا لَقُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا (جب یہ لوگ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ایمان قبول کرلیا) یعنی جب یہ لوگ تمھیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تصدیق کرتے ہیں۔وَاِذَا خَلَوۡا (اور جب اکیلے ہوتے ہیں) یعنی تنہائی میں ہوتے ہیں تو عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ (تمھارے خلاف انگلیوں کے پور چبا چبا کر اپنے غصّے کا اظہار کرتے ہیں۔ مِنَ الۡغَیۡظِ غضب اور کینہ کے سبب (اپنی انگلیوں کے پور چباتے ہیں) جب وہ مومنین کی باہمی الفت و محبت، ان کا اتحاد و اتفاق اور ان کے لیے اللہ کی مدد کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ بطور مثال ہے یہاں (حقیقت میں) پوروں کا چبانا نہیں ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اِذَا رَاَوۡنِیۡ اَطَالَ اللهُ غَیۡظَهُمۡ　　عَضُّوۡا مِنَ الۡغَیۡظِ اَطۡرَافَ الۡاَبَاهِیۡم

حضرت ابوطالبؑ کا ارشاد ہے:

یَعَضُّوۡنَ غَیۡظًا خَلۡفَنَا بِالۡاَنَامِلِ

قُلۡ اے محمدؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجیے: مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ (کہ اپنے غصّے میں جل مرو) مُوۡتُوۡا صیغہ امر ہے لیکن معنی بددعا کے ہیں، گویا کہا جارہا ہے کہ خدا تمھیں تمھارے غیظ و غضب کے سبب موت دے دے! اس میں ان کی مذمت مراد ہے، اس لیے کہ ان کے لیے یہ بددعا جائز نہیں ہوتی، مگر کہ وہ یہ لوگ افعال قبیح بجا لاکر اس کے حقدار بن چکے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اسلام کی سربلندی و سرفرازی دیکھ کر تمھارا یہ غیظ و غضب دائمی ہوگیا ہے یہاں تک کہ تم مرجاؤ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (یقیناً اللہ دل کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے) یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جو غیظ و غضب چھپاتے ہیں خدا ان کے سینوں کے پوشیدہ رازوں کا جاننے والا ہے۔

❀❀❀❀❀

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۰﴾

جب تمھیں خوشیاں نصیب ہوتی ہیں تو انھیں برا لگتا ہے اور جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خوشی مناتے ہیں۔ اگر تم صبر سے کام لو اور تقویٰ پر قائم رہو تو ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔ (۱۲۰)

قرائت:

نافع، ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے راء کو بغیر تشدید اور ضاد کو کسرہ کے ساتھ لَا يَضِرْكُمْ اور باقی قراء نے راء کو تشدید اور ضاد و راء دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حسن اور ابو حاتم نے تَعْمَلُونَ تاء خطاب کے ساتھ پڑھا اور مشہور قرائت یاء کے ساتھ يَعْمَلُونَ ہے۔

حجت:

جن قراء نے لَا يَضِرْكُمْ قرائت کی ہے انھوں نے اسے ضَارَهُ يَضِيْرُهُ ضَيْرًا سے مشتق مانا ہے اور جنھوں نے لَا يَضُرُّكُمْ پڑھا ہے انھوں نے ضَرَّهُ، يَضُرُّهُ ضُرًّا سے مشتق مانا ہے۔ ضَيْر اور ضُرّ دونوں ایک معنی میں ہیں۔ قرآن کریم میں لَا ضَيْرَ بھی آیا ہے اور إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ بھی آیا ہے۔

لَا يَضُرُّكُمْ کی اصل لَا يَضْرُرْكُمْ ہے۔ پہلے راء کے ضمہ کو ضاد کو دے کر دوسرے راء میں ادغام کر دیا گیا۔ بعد اس کے راء دوم کو اتباع کی بنا پر ضمہ دے دیا گیا اس لئے کہ ضمہ قریب ترین حرکت ہے۔ عرب جزم کی جگہ پر ادغام کر دیتے ہیں اور اہل حجاز حروف مضاعف کو ظاہر کرتے ہیں یعنی ادغام نہیں کرتے۔ زجاج نے کہا: اس آیت میں دونوں لغتیں آتی ہیں۔ إِنْ يَمْسَسْكُمْ اہل حجاز کی لغت کی بنا پر اور يَضُرُّكُمْ دیگر عرب کی لغت کی بنا پر ہے۔ لَا يَضُرَّكُمْ اور لَا يَضُرِّكُمْ بھی جائز ہے۔

جس نے فتحہ دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مضاعف میں التقاء ساکنین کی صورت میں فتحہ خفیف حرکت

ہے اور جن لوگوں نے کسرہ دیا ہے تو وہ التقاء ساکین کے قاعدہ کی بنا پر ہے (کہ جب التقاء ساکنین کی بنا پر کسی حرف کو حرکت دی جائے گی تو کسرہ کی حرکت دی جائے گی)

الفاظ و معانی:

اَلْکَیْدُ وَ الْمَکِیْدَۃ: ایسا مکر ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے ساتھی کو فریب دیتا ہے تاکہ وہ زحمت میں مبتلا ہو جائے۔ کچھ کے لغوی معنیٰ مشقت و زحمت کے ہیں۔

تفسیر:

کفار کی خوشی اور غم کا معیار

اس آیت میں خداوند عالم نے مذکورہ بالا افراد کے حالات سے مطلع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِن تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ (جب تمھیں خوشیاں نصیب ہوتی ہیں) یعنی اے صاحبان ایمان! جب تمھیں اللہ کی طرف سے نعمت الفت اور اتحاد و اتفاق اور دشمن پر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ تَسُؤۡهُمۡ (تو انھیں برا لگتا ہے) اور ان پر گراں گذرتا ہے۔ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ (اور جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے) یعنی جب دشمن کی جانب سے تمھیں کوئی زحمت و تکلیف، اختلاف کلمہ اور کوئی ایسی چیز پہنچتی ہے جس سے اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو تو يَّفۡرَحُوۡا بِهَا اس سے انھیں خوشی ہوتی ہے۔ یہ حسن، قتادہ، ربیع اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا (اگر تم صبر سے کام لو) یعنی اگر تم ان کی اذیتوں پر اور اللہ و رسول کی اطاعت پر اور راہ خدا میں جہاد پر صبر سے کام لو گے۔ وَتَتَّقُوۡا (اور تقویٰ پر قائم رہو) یعنی اللہ کی نافرمانی سے خود کو روک کر اور اس کی اطاعت کر کے خوف خدا اختیار کرو گے تو اے اللہ کو ایک ماننے والو! لَا يَضُرُّكُمۡ تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی كَيۡدُهُمۡ منافقین کے مکر و فریب جن کے ذریعہ وہ تمھیں فریب دیتے ہیں۔ شَيۡـًٔا نہ مختصر نہ زیادہ اس لیے کہ خداوند عالم تمھاری نصرت کرے گا اور تم سے ان کے شر کو دور کرے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ (یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے) یعنی اللہ ہر جہت سے ان کا عالم اور واقف کار ہے، اس پر قدرت مند ہے۔ اس لیے کہ اَلۡمُحِيۡطُ بِالشَّيۡءِ کے اصلی معنی کس چیز کے اردگرد چکر لگانے والے کے ہیں اور یہ اجسام کے صفات میں سے جو اللہ کے شایان شان نہیں ہے، لہٰذا محیط کے معنیٰ عالم کے کئے جاتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقٰعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

(اے رسول) وہ وقت یاد کریں جب آپ اپنے گھر سے صبح سویرے نکل پڑے تھے اور مومنین کو لڑائی کے مورچوں پر بٹھا رہے تھے اللہ سب سے زیادہ سننے اور جاننے والا ہے۔(۱۲۱) یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے حالاں کہ اللہ ان کی مدد کے لیے موجود تھا اور مومنوں کو اللہ پر توکّل کرنا چاہیے۔(۱۲۲)

ترکیب:

اِذۡ کا عامل محذوف ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: وَ اذۡکُرۡ اِذۡ غَدَوۡتَ۔ کہا گیا ہے کہ وہ اسی سورہ کی اس آیت قَدۡ کَانَ لَکُمۡ اٰیَةٌ فِیۡ فِئَتَیۡنِ الۡتَقَتَا پر عطف ہے۔ روبرو ہونے والے دو گروہ (لشکر) میں تمھارے لئے نشانی ہے یعنی اس کم لشکر کے بڑے لشکر پر کامیاب ہونے میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح سویرے گھر سے برآمد ہوئے۔ یہ ابو مسلم کا قول ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس میں عامل ارشادِ الٰہی محیط ہے اور تقدیر یہ ہے: وَ اللّٰهُ عَالِمٌ بِاَحۡوَالِکُمۡ وَ اَحۡوَالِهِمۡ۔ وَ اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ اور تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مَقَاعِدَ (یعنی اللہ تمھارے حالات اور ان کے حالات اور جب آپ صبح سویرے گھر سے برآمد ہوئے سب کو جانتا ہے) غَدَوۡتَ میں ضمیر کے لئے حال ہے۔

تفسیر:

جنگ احد

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ اے محمد! اس وقت کو یاد کیجیے جب آپؐ مدینہ سے صبح سویرے

نکلے۔ اَلْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (اور مومنین کو لڑائی کے مورچوں پر بٹھا رہے تھے) یعنی مومنین کے لیے (جنگ) کے مقامات (مورچے) معین اور تیار کر رہے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آپ انھیں جنگ کے مورچوں پر بٹھا رہے تھے تاکہ وہ وہیں ٹھہرے رہیں اور وہاں سے ہٹے نہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے یہ کس دن کی بات ہے؟ تو کہا گیا ہے کہ جنگ اُحد کی بات ہے۔ یہ ابن عباس ومجاہد، قتادہ، ربیع، سُدی اور ابن ابو اسحاق سے مروی ہے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جنگ احزاب (جنگ خندق) تھا۔ یہ مقاتل سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جنگ بدر کی بات ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ (اللہ سب سے زیادہ سننے والا) یعنی نبی جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس کو سنتا ہے۔ عَلِیْمٌ (اور جاننے والا ہے) یعنی اللہ اس چیز کو بھی جانتا ہے جسے یہ لوگ چھپاتے ہیں اس لیے کہ وہ لوگ باہم اختلاف کر رہے تھے، ان میں سے کچھ (لوگ) مدینہ سے نکل کر جنگ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے اور کچھ لوگ مدینہ میں رہ کر۔ اس جملہ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ میں پاکیزہ انسان کی تعریف ہے اور گمراہ کو خبردار اور ہوشیار کرنا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ مشرکین کی باتوں کا سننے والا ہے جو وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کرتے ہیں اور وہ ان کے دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ہر سننے والی باتوں کا سننے والا اور ہر جاننے والی باتوں کا جاننے والا ہے۔ اِذْ هَمَّتْ (یاد کرو جب آمادہ ہوگئے تھے) جب مکمل عزم وارادہ کرلیا تھا۔ طَّآئِفَتَانِ دو گروہوں نے مِنْكُمْ (تم میں سے) مسلمانوں کے اَنْ تَفْشَلَا (بزدلی دکھانے پر) یعنی بزدلی کا مظاہرہ کرنے پر۔ وہ دونوں گروہ بنوسلمہ وبنوحارثہ دونوں انصار کے قبیلے تھے۔ یہ ابن عباس، جابر ابن عبداللہ، حسن، قتادہ، مجاہد، ربیع اور امام محمد باقر وامام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے۔ جبائی نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت مہاجرین اور انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان کی بزدلی کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ بن ابو سلول نے دونوں گروہوں کو جنگ احد میں مشرکین روبرو نہ ہوکر مدینہ واپسی کی دعوت دی تھی۔ لیکن مہاجرین و انصار بات کو سمجھ گئے اور انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا (حالاں کہ اللہ ان کی مدد کے لیے موجود تھا) یعنی اللہ دونوں کا ناصر و مددگار تھا۔ جابر بن عبداللہ سے روایت ہے انھوں نے کہا: یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور جس چیز کو پسند کیا گیا کہ وہ اس ارشاد سے نہیں ہے وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا بعض محققین نے کہا ہے کہ یہ غمگین کرنے والی بات خطرہ کی تھی نہ کہ پکے ارادہ کی اس لیے کہ اللہ نے دونوں کی مدح کی ہے اور باخبر کیا ہے کہ وہ دونوں کا ولی ہے اور اگر قصد و

ارادہ سے غم ہوتا تو ان کی مذمت ان کی مدح وثنا سے اولیٰ و بہتر ہوتی۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی مومنین کو تمام حالات اور امور میں (اللہ پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہئے)

غزوۂ اُحد کا بیان

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ غزوۂ اُحد کا سبب یہ ہے کہ جب قریش بدر سے مکہ کی جانب واپس پلٹے، قتل واسیری سے متعلق انھیں جو پیش آنا تھا پیش آیا، ان کے ستر افراد قتل اور ستر (۷۰) اسیر ہوئے۔ ابوسفیان نے کہا: اے گروہ قریش! اپنی عورتوں کو اپنے مقتولین پر گریہ نہ کرنے دینا اس لئے کہ اگر آنسو بہہ جائیں گے تو محمدؐ سے رنج وغم اور عداوت رخصت ہو جائیں گے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روز احد جنگ کی تو اپنی خواتین کو گریہ ونوحہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ مکہ سے تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل افراد نکلے جن کے ہمراہ عورتیں بھی تھیں، جب یہ خبر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ نے اصحاب کو جمع کیا اور انھیں جہاد پر آمادہ کیا۔ عبداللہ بن ابوسلول نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم مدینہ سے باہر نہ نکلیں گے بلکہ مدینہ کی گلیوں کوچوں میں جنگ کریں گے، کمزور مرد، عورت، غلام اور کنیزیں گلیوں کے دہانوں اور چھتوں سے جہاد کریں گی۔ اس طرح ہم پر کوئی بھی ظفریاب نہ ہو سکے گا اور ہم بھی اپنے محفوظ قلعوں پر بحفاظت رہیں گے اور اگر ہم اپنے دشمن کے لیے نکلے تو وہ ہم پر ظفریاب ہو جائیں گے۔ لہٰذا سعید بن معاذ اور قبیلہ اوس کے کچھ لوگ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اللہ کے رسولؐ! جب ہم مشرک تھے اور بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے تو کوئی عرب ہم میں طمع اور لالچ نہیں رکھتا تھا۔ اب جب کہ آپ ہمارے درمیان موجود ہیں کس طرح لوگ ہم سے طمع کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! یہاں تک کہ ہم ان کی طرف نکلیں اور ان سے جنگ کریں، ہم میں سے قتل ہوگا وہ شہید ہوگا، جو بچ جائے گا وہ راہ خدا کا مجاہد ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی رائے کو پسند فرمایا اور آنحضرتؐ اپنے بعض اصحاب کے ہمراہ انھیں جنگ کے ٹھکانوں کی نشاندہی کرنے کے لیے نکلے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ۔

عبداللہ بن ابوسلول (جنگ سے) بیٹھ گیا اور خزرج کی ایک جماعت نے بھی اس کی پیروی کی۔ قریش (میدان) احد پہونچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو (جنگی ٹھکانوں) پر تعینات کر رہے تھے ان کی تعداد سات سو تھی۔ عبداللہ بن جبیر کو پچاس تیراندازوں کے ہمراہ گھاٹی کے دہانے پر مقرر فرمایا۔ آپ نے عبد

اللہ بن جبیر اور اس کے ساتھیوں سے فرمایا: اگر تم دیکھو کہ ہم نے (قریش) کو شکست دے دی یہاں تک ہم انھیں مکہ بھگا دیا تب بھی تم اس جگہ سے نہ ہٹنا اور اگر تم یہ دیکھو کہ انھوں نے ہمیں شکست دے کر مدینہ تک پہونچا دیا ہے تب بھی اس مقام سے نہ ہٹنا اپنی جگہ اورٹھکانوں پر قائم رہنا۔

ابوسفیان نے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ہمراہ کمین گاہ (گھاٹی) پر مقرر کر دیا اور ان سے کہا: جب تم دیکھو ہم بھڑ چکے ہیں تو تم اس گھاٹی سے ان پر خروج کر دینا تا کہ تم ان کے پیچھے رہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مقرر فرمایا اور لشکر کا پرچم علی بن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کیا۔ انصار نے مشرکین قریش پر حملہ کر کے انھیں زبردست شکست دی۔ خالد بن ولید نے دو سو سواروں کے ہمراہ عبداللہ بن جبیر پر حملہ کر دیا، انھوں نے خالد بن ولید کا مقابلہ تیروں سے کیا چنانچہ خالد بن ولید واپس پلٹ گیا۔ عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے پیغمبرؐ کے اصحاب کو مال غنیمت لوٹتے ہوئے دیکھا تو عبداللہ بن جبیر سے کہنے لگے: ہمارے ساتھیوں نے مال غنیمت لوٹ لیا ہم تو محروم رہ گئے۔ عبداللہ بن جبیر نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اللہ سے ڈرو! اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمایا ہے ہم اس مقام سے نہ ہٹیں۔ انھوں نے عبداللہ کی ایک نہ سنی اور ایک ایک کر کے (اپنی جگہ سے) ہٹنے لگے یہاں تک کہ اس جگہ پر عبداللہ بن جبیر بارہ افراد کے ساتھ باقی رہ گئے۔ قریش کا پرچم طلحہ بن ابوطلحہ عبدی کے پاس تھا جسے علی علیہ السلام نے قتل کر دیا پھر اس پرچم کو ابوسعید بن ابوطلحہ نے بلند کیا۔ اسے بھی علی علیہ السلام نے قتل کر دیا، جب پرچم گرا تو اسے مسافع بن ابوطلحہ نے بلند کیا۔ اسے بھی علی بن ابی طالب علیہ السلام نے قتل کر دیا یہاں تک کہ آپ نے بنو عبدالدار کے نو افراد کو موت کے گھاٹ اتارا یہاں تک کہ ان کا پرچم ان کے سیاہ غلام کے پاس پہونچا جس کا نام ثواب تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کا داہنہ ہاتھ قلم کر دیا، اس نے پرچم بائیں ہاتھ میں اٹھا لیا، حضرت نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی قلم کر دیا۔ پھر حضرت علی علیہ السلام ابوسفیان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا بنو عبدالدار سے تو نے کسی کو باقی چھوڑا ہے؟ پھر آپؑ نے اس غلام کے سر پر حملہ کر کے اسے بھی قتل کر دیا۔ پھر اس پرچم کو عمرہ بنت علقمہ الکنانیہ نے بلند کیا، خالد بن ولید، عبداللہ بن جبیر کی طرف دوڑ کر آیا ان کے ساتھی فرار اختیار کر چکے تھے، بس مختصر سے افراد ان کے ساتھ باقی رہ گئے تھے جنھیں گھاٹی کے دہانے پر قتل کر دیا گیا۔ پھر خالد بن ولید مسلمانوں کی پشت کی جانب سے آیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو شکست فاش ہوئی، انھوں نے پہاڑ پر ہر طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو شکست کے سبب فرار کرتے دیکھا تو

پکار پکار کر فرمانے لگے: ادھر آؤ ادھر آؤ! میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ اور اس کے رسول سے کدھر فرار کر کے جا رہے ہو؟

ہند بنت عتبہ قلب لشکر میں موجود تھی۔ قریش کا کوئی شخص جب فرار کرتا تو اسے سرمہ دانی اور اس کی سلائی دے کر کہتی: تم عورت ہو، اس سے سرمہ لگاؤ۔ ہند نے جبیر بن مطعم کے حبشی غلام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تو نے محمدؐ یا علیؑ یا حمزہ کو قتل کر دیا تو میں تیرے لیے (ہر طرح سے) حاضر ہوں۔ حبشی غلام نے کہا: محمد کو قتل کرنا میرے بس میں نہیں، علی کو میں نے بہت زیادہ چوکنا پایا ہے، ان کے قتل میں بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے چنانچہ اس نے حمزہؓ کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو جہاد پر تشویق کر رہے ہیں۔ اس نے ان پر نیزے سے وار کیا جو ان کے جسم سے پار ہو گیا۔ ہند حمزہ کی لاش پر آئی اور آپ کا شکم چاک کر کے آپ کا کلیجہ باہر نکال لیا (قاتل حمزہ کہتا ہے) میں ہند کے نزدیک آیا اور اس سے کہا یہ تو حمزہ کا کلیجہ ہے، اس نے حمزہ کا کلیجہ چبانا شروع کر دیا جسے اللہ نے گھٹنے کی ہڈی کے مانند بنا دیا جسے اس نے اپنے منہ سے باہر نکال دیا۔ رسول اللہ نے فرمایا: اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے حمزہ کے کلیجے کو (ان کے جسم میں) اسی جگہ واپس رکھ دیا تھا، پھر ہند نے حمزہ کی لاش کا مثلہ کیا (یعنی ان کے اعضاء جسم جدا کیے) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ابو دجانہ سماک بن خرشہ اور حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ آور ہوتا علیؑ آپ کا دفاع کرتے ہوئے اس کا جواب دیتے یہاں تک کہ آپؑ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کو اپنی تلوار ذوالفقار عنایت کر دی۔ پیغمبرؐ احد کی ایک جانب چلے گئے، جہاد ایک طرف سے ہو رہا تھا۔ علی مسلسل جہاد میں مصروف تھے یہاں تک کہ آپؑ کے چہرہ، ہاتھ، پیروں اور شکم پر ستر زخم لگے۔ اسی طرح علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس وقت جبرئیلؑ نے پیغمبرؐ سے عرض کیا: اے محمد! بے شک یہی جاں نثاری ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (کیوں نہیں) علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔ جبرئیلؑ نے کہا: میں آپ دونوں سے ہوں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین و آسمان کے درمیان جبرئیل کو سونے کی کرسی پر دیکھا کہ وہ اس طرح کہہ رہے ہیں: لَا سَيْفَ إِلَّا ذُوالْفِقَارُ وَلَا فَتٰى إِلَّا عَلِيٌّ (نہیں ہے کوئی تلوار سوائے ذوالفقار کے، نہیں ہے کوئی جوان سوائے علیؑ کے)

ابن ابی اسحاق، سدی، واقدی اور ابن جریر وغیرہ نے روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا ہے: مشرکین ۳ ھ ماہ شوال روز چہارشنبہ اُحد کے میدان میں پہونچے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف جمعہ کے دن

روانہ ہوئے، جہاد نصف ماہ ہفتہ کے روز ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، آپؐ کے چہرہ پر زخم لگے پھر مہاجرین وانصار شکست کے بعد واپس پلٹے۔ مسلمانوں سے ستر (۷۰) افراد شہید ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان پر حملہ کیا یہاں تک کہ انھیں مار بھگایا۔ کفار نے مسلمانوں کا مثلہ کیا اور سب سے بری طرح جناب حمزہ علیہ السلام کا مثلہ کیا۔ سعد بن ابی وقاص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تیر اندازی کر رہے تھے اور آپ فرمار ہے تھے: تیر اندازی کرتے رہو، تم پر میرے ماں باپ فدا ہو جائیں!

نظم:

خداوند عالم نے اپنے ارشاد: وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا میں صبر کا حکم دیا ہے اس کے بعد روز بدر جہاد پر مسلمانوں کی نصرت اور صبر کا ذکر فرمایا ہے پھر اُحد کے روز ان کے امتحان اور آزمائش کا ذکر کیا ہے جس دن انھوں نے ثابت قدمی کو ترک کر دیا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی نظم (وترتیب) اس طرح ہے اگر تم صبر وثبات کرو گے تو تمھاری اس طرح نصرت کی جائے گی جس طرح بدر کے روز کی گئی تھی اور اگر تم نے صبر وثبات قدم سے کام نہیں لیا تو تم پر وہی نازل ہوگا جو اُحد کے دن نازل ہوا تھا جب تم نے رسول اللہ کی مخالفت کی تھی ابو مسلم نے بیان کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت اس آیت سے متصل ہے: قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ جس کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے۔

❁❁❁❁❁

وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّ اَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَلَنۡ يَّكۡفِيَكُمۡ اَنۡ يُّمِدَّكُمۡ رَبُّكُمۡ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُنۡزَلِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَ يَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى لَكُمۡ وَلِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُكُمۡ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱۲۶﴾

آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا جب کہ تم بہت کم زور تھے۔ تم اللہ سے ڈرو تا کہ اس کا شکر ادا کر سکو۔ (۱۲۳) یاد کرو جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتے بھیج کر تمھاری مدد کرے۔ (۱۲۴) بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس وقت تمھارا دشمن تم پر چڑھائی کرے گا اُس وقت تمھارا ربّ پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو نشان جنگ لگائے ہوئے ہوں گے۔ (۱۲۵) اور اللہ نے یہ امداد صرف تمھاری خوشی اور اطمینان قلب کے لیے کی ہے فتح و نصرت تو اللہ کی جانب سے ہے جو سب پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ (۱۲۶)

قرائت:

ابن عامر نے مُنَزَّلِیۡنَ زاء کو تشدید کے ساتھ اور باقی قراء نے بغیر تشدید کے مُنۡزَلِیۡنَ قرائت کی ہے۔
ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے مُسَوِّمِیۡنَ میں واؤ کو کسرہ کے ساتھ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ مُسَوَّمِیۡنَ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے مُنۡزَلِیۡنَ کو بغیر تشدید کے پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالُوا لَوۡلَا اُنۡزِلَ

عَلَيۡهِ مَلَكٌ وَلَوۡ أَنزَلۡنَا مَلَكًا - اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اِنۡزَال، تَنۡزِيل اور غیر تنزیل دونوں کو شامل ہے۔

اور ابن عامر کی دلیل مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِكَةَ اور تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوۡحُ فِيۡهَا ہے۔اس لئے کہ تنزیل کا مطالعہ ہے اور یہ آیت بھی دلیل ہے کہ وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةَ۔۔۔۔

ابوالحسن نے کہا: جن قراء نے مُسَوِّمِيۡنَ میں واؤ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ وہ گھوڑوں کو نشانی لگاتے تھے اور جن قراء نے مُسَوَّمِيۡنَ پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر نشانی لگائی گئی تھی۔ نیز کہا ہے: مُسَوَّمِيۡنَ یعنی مُعَلَّمِيۡنَ اور یہ مُرۡسَلِيۡنَ کے معنی میں بھی ہے (یعنی بھیجے گئے) ایسی صورت میں مُسَوَّمِيۡنَ سُوِّمَ الۡخَيۡلُ سے مشتق ہے یعنی گھوڑوں کو بھیجا اور اسی لفظ سے ساتھ بھی بنایا ہے۔

ابوعلی بن عیسیٰ نے کہا: واؤ کے کسرہ کو اختیار کرنے کی دلیل روایات میں کثرت سے یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے گھوڑوں میں علامت و نشانی لگائی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سَوِّمُوۡا فَاِنَّ الۡمَلٰٓئِكَةَ قَدۡ سَوَّمَتۡ۔ علامت لگاؤ اس لئے کہ ملائکہ نے علامت لگائی تھی۔

الفاظ ومعانی:

بَدۡر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے۔ شعبی نے بیان کیا ہے کہ اس مقام پر ایک شخص کا کنواں تھا لہٰذا مالک کے نام پر اس جگہ کا نام 'بَدۡر' پڑ گیا۔ واقدی نے کہا ہے کہ بَدۡر جگہ کا نام ہے اور ہر مکمل چیز کو بَدۡر کہتے ہیں۔ آسمان کے چاند کو اس کے مکمل ہونے کے سبب بَدۡر کہا جاتا ہے۔

اِكۡتِفَاء اور اِسۡتِغۡنَاء کے درمیان فرق ہے۔ اِكۡتِفَاء کے معنی اس چیز پر اقتصار کرنا ہے جو ضرورت کو پورا کر دے۔ اِسۡتِغۡنَاء کے معنی اس چیز میں وسعت پیدا کرنا ہے جس سے حاجت پوری ہو جائے۔

اِمۡدَاد کے معنی ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں کسی چیز کا عطا کرنا ہے۔ اَلۡمَدُّ فِي السَّيۡرِ سیر (سفر) کا جاری رکھنا ہے۔ مَدَّ النَّهۡر کہا جاتا ہے جب نہر جاری ہوتی ہے۔

اَلۡفَوۡر: دیگ کا جوش مارنا جو اس کا شدید گرمی کے سبب کھولنا ہے۔ اسی سے فَوۡرُ الۡغَضَب (یعنی غیظ وغضب کے سبب جوش مارنا) ہے۔ یہ دیگ کے جوش مارنے کی طرح ہے۔ اسی سے فَارَتِ الۡعَيۡنُ بِالۡمَاءِ پانی کے چشمہ کا ابلنا ہے جب وہ ابلے، اسی سے فوارہ ہے چونکہ یہ پانی کے ساتھ جوش مار کر ابلتا ہے جس طرح

دیگ اپنے اندر موجود چیز کے ساتھ جوش مارتی اور ابلتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلْفَوْر کسی چیز کی طرف جلدی اور تیزی سے آنا ہے۔

ترکیب:

وَ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ محلاً منصوب ہے، حال ہونے کی بنا پر۔ اَن يُّمِدَّ كُمْ رَبُّكُمْ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ يَّكْفِيَكُمْ کا فاعل ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: اَلَن يَّكْفِيَكُمْ اِمْدَادُ كُمْ۔ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا۔ هٰذَا محلاً مجرور ہے۔ فَوْرِهِمْ کی صفت ہے۔ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ. بُشْرٰى لَكُمْ پر عطف ہے اس لئے اس کی تقدیر یہ ہے: لِتُبْشِرُوْابِهٖ وَلِتَطْمَئِنَّ۔

تفسیر:

جنگ بدر میں نصرت الٰہی

ان آیات میں خداوند عالم نے جنگ بدر میں مومنین کی جس طرح مدد فرمائی اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ نَصَرَ كُمُ اللّٰهُ (آخر اس سے پہلے اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا) (اے صاحبان ایمان! اللہ نے تمھاری مدد کی) بِبَدْرٍ (جنگ بدر میں) تمھارے دلوں کو تقویت پہونچا کر، ملائکہ کی مدد کے ذریعہ اور تمھارے دشمنوں کے دلوں میں رعب پیدا کر کے۔ وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (جب کہ تم بہت کمزور تھے) یعنی تم مقابلہ کرنے سے کمزور تھے باعتبار عدد مختصر تھے (اور تمھیں شمار ابھی کم جا رہا تھا)

اَذِلَّة ذَلِيْل کی جمع ہے۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے بیان کیا: جنگ بدر میں مہاجرین کی تعداد ستر (۷۰) اور انصار دو سو چھتیس (۲۳۶) تھے۔ اس طرح کل تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی۔ جبکہ مشرکین کی تعداد ایک ہزار تھی۔ بعض موثق افراد سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے اس کی قرأت وَ اَنْتُمْ ضُعَفَآء کی ہے اور انھوں نے کہا ہے: مومنین کی صفت اَذِلَّة کے ساتھ بیان کرنا صحیح نہیں ہے حالانکہ ان کے درمیان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی موجود تھے۔ بدر کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمدار علی بن ابی طالب (علیہما السلام) تھے اور انصار کے علمدار سعد بن عبادہ تھے اور سعد بن معاذ کے لیے بھی کہا گیا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ (تم اللہ سے ڈرو) یعنی اللہ کی معصیت سے بچو اور اس کے فرائض پر عمل کرو۔ لَعَلَّكُمْ

تَشْكُرُونَ (تاکہ اس کا شکرادا کرسکو) تاکہ تم اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (یاد کرو جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے) خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے یعنی اے محمد! جب آپ اپنے صاحبان ایمان اصحاب سے کہہ رہے تھے۔

اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ (کہ کیا تمھارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتے بھیج کر تمھاری مدد کرے) اس طرح خبر دی جارہی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ کیا تمھارے لیے بدر کے دن کافی نہیں ہے تمھارے پروردگار نے تمھاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے مقرر کیے ہیں۔ ابن عباس، حسن وقتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ روز بدر فرشتوں کے ذریعہ مدد کی گئی تھی۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ جنگ بدر کے علاوہ کہیں اور فرشتوں نے جنگ نہیں کی۔ اس کے علاوہ دنوں میں بھی متعدد مرتبہ مدد کے لیے (آئے) تھے۔ حسن نے کہا ہے کہ فرشتوں کی تمام تعداد پانچ ہزار تھی۔ جس کے معنی ہیں تمھارا پروردگار تمھاری مکمل پانچ ہزار فرشتوں سے امداد کرے گا۔ ایک دوسرے صاحب نے کہا ہے کہ آٹھ ہزار فرشتوں نے مدد کی جس کے معنی یہ ہیں کہ پانچ ہزار فرشتے بعد میں آئے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کے ذریعہ مدد کا وعدہ اللہ نے ان سے کیا تھا اگر وہ لوگ صبر سے کام لیں گے تب۔ یہ عکرمہ وضحاک سے مروی ہے۔

مُنْزَلِيْنَ اللہ نے تمھاری مدد کے لیے آسمان سے فرشتوں کو نازل کیا۔ بَلٰٓى یہ وعدے کی تصدیق ہے یعنی جس طرح اس نے تم سے وعدہ کیا اسے انجام دے گا بلکہ تمھارے لیے اس میں مزید اضافہ فرمائے گا۔ اِنْ تَصْبِرُوْا (بے شک اگر تم صبر کرو) یعنی اگر تم نے جہاد اور اللہ نے جس چیز کا تمھیں حکم دیا ہے اس پر صبر کیا۔ وَتَتَّقُوْا (اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو) اور تم اللہ کی معصیت اور اس کے رسول کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا (تو جس وقت تمھارا دشمن تم پر چڑھائی کرے گا) یعنی جس وقت مشرکین تمھاری طرف پلٹ آئیں گے۔ یہ ابن عباس، حسن، قتادہ، ربیع اور سُدی سے مروی ہے۔ اس اعتبار سے کہ وہ اس جنگ کا آغاز کرنے میں بہت جلدی کریں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنے غیظ وغضب کے سبب۔ یہ مجاہد، ابوصالح اور ضحاک سے مروی ہے۔ وہ لوگ جنگ اُحد میں جنگ بدر میں اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات سے غضبناک تھے جو غیظ وغضب سے جوش کھاتا ہے۔ (یا جوش مارتا ہے)

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ (اُس وقت تمھارا ربّ پانچ ہزار فرشتوں سے

تمھاری مدد کرے گا) یعنی تمھیں نصرت و مدد عطا کرے گا۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ غزوۂ اُحد سے واپسی پر کفار شرمندہ اور نادم تھے کہ وہ مدینہ کو برباد نہیں کر سکے اور واپسی کے لیے بے چین و بے قرار تھے، چنانچہ خداوند عالم نے اپنے نبیؐ کو وحی فرمائی کہ وہ ان کی طرف واپس پلٹنے کے لیے تیار رہیں اور ان سے ارشاد فرمایا: اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۰: اگر تمھیں کوئی تکلیف چھولیتی ہے تو قوم کو بھی اس سے پہلے ایسی ہی تکلیف ہو چکی ہے) پھر ارشاد فرمایا: اگر تم نے جہاد پر صبر کیا اور کفار کی طرف واپسی کی تو اللہ تمھاری پانچ ہزار ایسے فرشتوں سے مدد فرمائے گا جن پر بہادری کی علامت اور نشانی لگی ہوگی۔ چنانچہ جہاد میں (اصحاب) شامل ہوئے اور انھوں نے کفار کا پیچھا کرنا شروع کیا جن میں زخمی بھی شامل تھے۔ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک سے گذرا اس نے مشرکین کو خبر دے دی کہ وہ تمھاری تلاش میں نکلے ہیں، مشرکین اس بات سے خوف زدہ ہو گئے اگر وہ واپس پلٹے تو غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہو جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے نعیم بن مسعود اشجعی سے شازش کی یہاں تک کہ انھیں قریش کے بڑے امر سے روک دیا اور مکہ کی طرف جانے میں انھوں نے بہت جلدی کی، اللہ نے اس سلسلہ میں مسلمانوں کی مدد فرمائی۔

واقعہ بہت مشہور ہے۔ چنانچہ مفسرین کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ تمام (فرشتے) آٹھ ہزار (۸۰۰۰) تھے۔ حسن نے کہا ہے کہ پانچ ہزار (۵۰۰۰) تھے، ان میں نازل ہونے والے تین ہزار (۳۰۰۰) تھے۔ ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جنگ بدر میں تین ہزار کے ذریعہ امداد کی گئی۔ اس لیے کہ اس کا ارشاد: اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ اس کے اس ارشاد سے مربوط ہے: وَلَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ پھر روز اُحد کا حکم از سر نو آغاز ہوتا ہے جس میں ارشاد ہے: بَلٰۤی اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَیَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ یعنی اگر وہ گروہ تمھاری جانب پلٹیں اپنے واپس چلے جانے کے بعد، تو تمھارا پروردگار تمھاری ایسے پانچ ہزار فرشتوں سے مدد فرمائے گا جن پر فتح کے نشان لگے ہوں گے۔ یہ بلخی کا قول ہے، جس کی روایت عمرو بن دینار نے عکرمہ سے کی ہے کہ جنگ اُحد ایک فرشتہ کے ذریعہ بھی امداد نہیں کی گئی، اس اعتبار سے دونوں آیتوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام (دوسری) جنگوں میں فرشتوں کے ذریعہ مدد کیوں نہیں کی گئی؟ تو اس کا جواب ہے یہ بات مصلحت کی تابع ہے جب اللہ مومنین کی امداد میں مصلحت جانتا ہے تو امداد کرتا ہے۔

مُسَوِّمِیۡنَ (جو نشان جنگ لگائے ہوئے ہوں گے) کسرہ (زیر) کے ساتھ معلمین یعنی وہ خود جانتے اور واقف ہیں اور فتح (یعنی زبر) کے ساتھ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے انھیں سکھایا اور تعلیم دی تھی (یا اللہ کے

سکھائے ہوئے تھے) ابن عباس، حسن، قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: ان کی پہچان و شناخت ان کے گھوڑوں کی پیشانی پر بالوں کے سبب ہوئی۔ عروہ نے کہا ہے کہ جنگ بدر فرشتے چتی دار گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے جن کے سروں پر زرد عمامہ تھا۔ علی و ابن عباس نے کہا ہے کہ ان کے عمامے سفید تھے جن کے سرے ان کے شانوں پر لٹکے تھے۔ سدی نے کہا ہے: مَسَوِّمِیْنَ فتحہ (زبر) کے ساتھ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ناقہ کے ہیں جسے چراہ گاہ کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

ارشاد: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ (اور اللہ نے یہ امداد صرف تمھاری خوشی کے لیے کی ہے) یعنی اللہ نے جو تمھاری امداد کی اور اس کا وعدہ کیا (تمھارے لیے خوش خبری ہے) ھَا غیر مذکور اسم کی طرف پلٹ رہی ہے جو اپنی دلالت کے سبب معلوم ہے، اس لیے کہ یُمْدِدْ امداد پر دلالت کر رہا ہے۔ بُشْرٰی لَکُمْ یعنی تمھارے لیے خوش خبری ہے تاکہ تم اس کے سبب خوشی مناؤ (خوشی حاصل کرو) وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِهٖ (اور تمھارے اطمینان قلب کے لیے) اس کے ذریعہ اپنے قلوب کو اطمینان حاصل اور سکون نصیب ہو۔ دشمنوں کی کثیر تعداد اور اپنی مختصر تعداد سے نہ ڈرو۔

ارشاد: وَمَا النَّصْرُ یعنی نصرت و مدد نہیں ہے۔ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سوائے اللہ کی جانب سے) اس سے مراد یہ ہے کہ مدد کے لیے اللہ کی حاجت و ضرورت لازمی ہے اگر وہ فرشتوں کے ذریعہ تمھاری مدد کرے، اس کی امداد سے لحہ بھر (چشم زدن) کے لیے بھی تمھارے لیے استغنا اور بے نیازی نہیں ہے۔ تمھارے دلوں کو تقویت پہونچانے اور تمھارے دشمنوں کے قلوب کو کمزور کر کے ان کو رسوا و ذلیل وغیرہ کرنے میں۔ یہ بھی کہا گیا ہے فرشتوں کی یہ نصرت و امداد نہیں ہے، بجز اللہ کی طرف سے۔

اَلْعَزِیْزِ (جو سب پر غالب ہے) وہ مسلمانوں کے ہاتھوں کفار سے انتقام لینے پر قادر ہے۔ اَلْحَکِیْمِ (اور بڑی حکمت والا ہے) وہ اپنی تدبیر میں صاحب حکمت ہے، مومنین کے لیے کائنات میں۔ یہ اس لیے ارشاد فرمایا تاکہ (مومنین) کو واقف کرا دے کہ مشرکین سے ان کی جنگ دین کے اعزاز و شرف اور عظمت کے لیے تھی۔ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اقتدار میں زبردست صاحب قدرت اور مخلوقات کی تدبیر میں صاحب حکمت ہے۔

مختصر فصل پیغمبرؐ کی غزوات کے بیان میں

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جن غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس شرکت

فرمائی ان تمام غزوات کی تعداد چھبیس (۲۶) ہے۔ سب سے پہلا غزوہ ابواء ہے، پھر غزوۂ بواط، پھر غزوہ العشیرہ، پھر غزوۂ بدر اولیٰ، پھر بدر کبریٰ، پھر غزوۂ بنی سلیم، پھر غزوۂ سویق پھر غزوۂ ذی امر، پھر غزوۂ احد، پھر غزوۂ اسد، پھر غزوۂ بنی نضیر، پھر غزوۂ ذات الرقاع، پھر غزوۂ بدر آخیرہ، پھر غزوۂ دومۃ الجندل، پھر غزوۂ بنی قریظہ، پھر غزوہ بن لحیان، پھر غزوۂ بنی قرد، پھر غزوۂ بنی مصطلق، پھر غزوۂ حدیبیہ، پھر غزوۂ خیبر پھر غزوۂ فتح مکہ، پھر غزوۂ حنین، پھر غزوۂ طائف، پھر غزوۂ تبوک۔ جن میں سے نو غزوات میں جہاد کیا، غزوۂ بدر کبریٰ جو روز جمعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ سنہ ھ کو ہوا، غزوۂ احد ۳ سنہ ھ ماہ شوال میں ہوا، غزوۂ خندق و بنی قریظہ ۴ سنہ ھ ماہ شوال میں ہوا، بنی مصطلق و بنی لحیان ۵ ھ ماہ شعبان میں ہوا، خیبر کا غزوہ ۶ سنہ ھ میں ہوا، غزوۂ فتح مکہ ۸ سنہ رمضان میں ہوا، اغزوۂ حنین وطائف ۸ سنہ ھ شوال میں ہوا۔ پہلا غزوہ جس میں آپ نے بنفس نفیس جہاد فرمایا بدر ہے اور آخری غزوہ تبوک ہے۔ البتہ سریہ کی تعداد چھتیس (۳۶) ہے۔ جو اپنے مقامات پر شمار کئے گئے ہیں۔

❀❀❀❀❀

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا۟ خَآئِبِينَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَىْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَٰلِمُونَ ﴿۱۲۸﴾

اور وہ یہ مدد تمھیں اس لیے دے گا تا کہ وہ کافروں کے ایک بازو کو کاٹ ڈالے یا ان کو ایسی ذلّت آمیز شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ (۱۲۷) (اے پیغمبر) اس معاملے میں آپ کا کوئی اختیار نہیں (اللہ کو اختیار ہے) یا تو ان کی توبہ قبول کرلے یا ان پر عذاب نازل کرے۔ بلاشبہ یہ لوگ ظالم ہیں۔ (۱۲۸)

الفاظ و معانی:

اَلْكَبْتُ: ذلیل کرنا كَبَتَ اللهُ الْعَدُوَّ (یعنی اللہ نے دشمن کو ذلیل و رسوا کر دیا) خلیل نے کہا ہے کہ اَلْكَبْتُ یعنی کسی کے سامنے (کسی) چیز کی وضاحت کرنا ہے۔ اَلْكَبْتُ کے حقیقی معنیٰ شدید کمزوری کے ہیں جو قلب میں پیدا ہوتی ہے، کبھی انسان کمزوری کے سبب منہ کے بل گر پڑتا ہے۔

اَلْخَائِبُ: ناامید۔ ناکامی امید کے بعد ہی ہوتی ہے چونکہ اَلْخَيْبَةُ امید سے مانع ہونے کا نام ہے، نا

امیدی کبھی امید سے قبل ہوتی ہے اور کبھی امید کے بعد ہوتی ہے۔

اَلْیَاس (ناامیدی) اور اَلرَّجَاء (امید) دونوں ضد ہیں جو ناکامی اور کامیابی کے مانند ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔

ترکیب:

اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ دو وجہوں سے منصوب ہے:

(۱) لِیَقْطَعَ پر عطف ہے۔ایسی صورت میں لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔جس طرح آپ کہتے ہیں: ضَرَبْتُ زَیْدًا. فَافْهَمْ ذٰلِكَ. وَ عَمْرًا۔

(۲) اَوْ، اِلَّا اَنْ کے معنی میں ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اِلَّا اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ (اس سلسلہ میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے مگر یہ کہ خدا انھیں معاف کردے یا انھیں سزا دے) ایسی صورت میں آپ کا امر امر خدا کا تابع ہے اس لئے کہ آپ ان کے سلسلہ میں خدا کی تدبیر اور اس کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

تفسیر:

نصرت الٰہی کا دوسرا رخ

لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا (اور وہ یہ مدد تمھیں اس لیے دے گا تا کہ وہ کافروں کے ایک بازو کو کاٹ ڈالے) آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کے سبب کے بارے میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ اس کے اس ارشاد سے متصل ہے: وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اللہ نے تمھیں یہ مدد اس لیے عطا فرمائی ہے اور تمھیں اس سے مخصوص کیا ہے کہ کفر اختیار کرنے والے گروہ کو اسیری اور قتل کے ذریعہ ناامید کر دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس ارشاد سے مربوط ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ یعنی اللہ نے تمھاری بدر میں یقینی مدد کی تا کہ ان کے ایک حصہ کو منقطع کردے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس تدبیر کے ذریعہ حصہ کو منقطع کردے، یعنی تا کہ ان کے گروہ کو ہلاک کردے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: تا کہ قتل اور اسیری کے ذریعہ شرک کے ارکان سے (ایک) رکن کو منہدم کردے اور جس دن خداوند عالم نے کفر اختیار کرنے والوں کے طرف

(حصہ) کو منقطع کیا، وہ بدر کا دن تھا، جس میں کفر کے صنادید و رؤسا اور ان کے سرداروں کو قتل کیا گیا۔ یہ حسن، ربیع اور قتادہ کے قول میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ احد کا دن ہے جس میں کافروں کے اٹھارہ لوگوں کو قتل کیا گیا۔

خداوند عالم نے لِيَقْطَعَ طَرَفًا فرمایا ہے یعنی ان کے ایک طرف (بازو) کو کاٹ دے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ لِيَقْطَعَ وَسَطًا مِّنْهُمْ یعنی تا کہ ان کے درمیان کو کاٹ دے اس لیے کہ (ایک) طرف (بازو) کے قطع کیے بغیر ان کے درمیان تک نہیں پہونچا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف (بازو) مومنین سے قریب ترین (حصہ) ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے: قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ اَوْ يَكْبِتَهُمْ یعنی یا انہیں اس کی ناکامی کے ذریعہ ذلیل و رسوا کر دے جس کامیابی کی وہ تم سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ قتادہ و ربیع کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (اللہ) انھیں تمھاری طرف سے شکست خوردہ واپس کر دے گا۔ یہ جبائی اور کلبی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے خدا انھیں منھ کے بل اوندھا گرا دے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے خدا تمھیں ان پر کامیابی عطا کرے گا۔ یہ مبرد سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یا اللہ ان پر لعنت کرے گا یہ سدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (اللہ) انھیں ہلاک کر دے گا۔ یہ ابوعبیدہ سے مروی ہے۔ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ (یا ان کو ایسی ذلّت آمیز شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں) جس کی وہ امید کر رہے تھے اسے ہرگز نہ پاسکیں۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ((اے پیغمبر) اس معاملے میں آپ کا کوئی اختیار نہیں (اللہ کو اختیار ہے) کہا گیا ہے کہ یہ جملہ اللہ کے اس ارشاد سے متصل ہے کہ: وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اللہ نے تمھاری نصرت و مدد کی تا کہ ان کے بازو کو منقطع اور انھیں ذلیل و خوار کر دے۔ اس مدد میں آپ کے اور کا اور کسی اور کا کوئی حصہ (چیز) نہیں ہے۔ یہ ابو مسلم سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دو جملوں کے درمیان یہ جملۂ معترضہ ہے۔

جملۂ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ (یا تو ان کی توبہ قبول کر لے) لِيَقْطَعَ طَرَفًا سے متصل ہے، جس کی تقدیر یوں ہوں گی: يَقْطَعَ طَرَفًا مِنْهُمْ اَوْ يَكْبِتَهُمْ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ، تا کہ ان کا ایک بازو کاٹ دے یا انھیں ذلیل و رسوا کر دے یا ان کی توبہ قبول کر لے یا ان پر عذاب کر دے کہ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ ان چاروں باتوں میں سے آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے۔

اس آیت کے شان نزول میں اختلاف ہے: انس بن مالک، ابن عباس و حسن، قتادہ و ربیع کا قول ہے

کہ جنگ اُحد جب مشرکین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان شہید کر دیئے اور آپؐ کو زخمی کر دیا یہاں تک کہ آپؐ کے چہرہ پر خون جاری ہوا، اس وقت آپؐ نے فرمایا: وہ قوم کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو اور باوجودیکہ وہ انھیں ان کے رب کی طرف دعوت دینے میں حریص و کوشاں ہے۔ خداوند عالم نے پیغمبر کو واقف کرادیا تھا کہ ان کی فلاح و کامیابی ان کے اختیار میں نہیں، ان کا کام فقط اللہ کا پیغام پہونچانا اور جہاد کرنا ہے، یہاں تک کہ دین کو غلبہ حاصل ہو جائے جو کہ اللہ کی طرف ہے۔

جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان شکستہ کیے اور چہرہ کو زخمی کیا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کے لیے بددعا فرمائی تھی کہ اس پر ایک برس نہ گذرے کہ وہ حالت کفر میں مر جائے۔ چنانچہ وہ ایک برس مکمل ہونے سے قبل ہی کفر کی حالت میں مر گیا۔

ہزیل (قبیلہ) کے ایک شخص عبداللہ بن قمیۃ نے آپ کا چہرہ زخمی اور لہولہان کیا تھا۔ آپؐ نے اس کے لیے بھی بددعا فرمائی تھی، اس کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ خداوند عالم نے اس پر ایک جانور مسلط کر دیا جس نے اسے اپنے سینگوں سے زخمی کر کے مار ڈالا۔

روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چہرہ کا خون صاف کرتے جاتے اور اس طرح فرماتے: پروردگارا! میری قوم کی ہدایت فرما! یہ (میرے مرتبہ) سے ناواقف و انجان ہیں۔ ممکن ہے (آنحضرتؐ کو) اس اعتبار سے ان کے عناد و دشمنی اور کفر پر اصرار کا خوف ہو۔ خداوند عالم نے آپؐ کو باخبر کیا ہے کہ (پیغمبرؐ) کی اس کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے وہ انھیں تبلیغ رسالت کرنے اور لوگوں کو ہدایت کی جانب بلانے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (سورۂ شعراء، آیت ۳؛ کیا آپ اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈال دیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احد اپنے پروردگار سے مشرکین کے لیے بددعا کرنے کی اجازت چاہی تھی، لہٰذا یہ آیت نازل ہوئی۔ آپؐ کو ان کے ہلاک کرنے والے عذاب کی بددعا کی اجازت نہیں دی گئی، اس لیے کہ بعض افراد کی توبہ کے متعلق علم تھا۔ یہ ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم نے جنگ اُحد میں اپنے ان اصحاب کے بارے میں بددعا کرنا چاہی تھی جنھوں نے میدان سے فرار اختیار کیا تھا۔ اللہ نے آپؐ کو ایسا کرنے سے روک دیا اور ان کی توبہ قبول کر لی۔ آیت نازل ہوئی لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ یعنی آپ کو ان پر لعنت اور بددعا کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ یہ بھی

بیان کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں نے آپؐ کے چچا (جناب حمزہؓ) اور اصحاب کے ساتھ (مشرکین کے وہ مظالم) دیکھے کہ ان کے ساتھ مثلہ کیا گیا ہے یعنی ان کے ناک کان اور اعضائے تناسل کاٹ کر (ان کی توہین کی گئی ہے) تو مسلمانوں نے کہا: کاش خداوند عالم ہمیں بھی ان کے ساتھ ایسا کرنے کی اجازت دے دیتا جیسا انھوں نے ہمارے لوگوں کے ساتھ کیا ہے! تو ہم بھی ان کا ایسا مثلہ کرتے کہ کسی عرب نے اس طرح کا مثلہ نہ کیا ہوگا۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ محمد بن اسحاق اور شعبی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت بئر معونہ کے مالکان کے بارے میں نازل ہوئی ستر (۷۰) لوگ تھے جو پیغمبرؐ کے قراء اصحاب سے تھے، ان کے سردار منذر بن عمرو تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں بئر معونہ کی طرف ماہ صفر ۴ھ میں بھیجا تھا تاکہ وہ لوگوں کو قرآن اور علم کی تعلیم دیں۔ ان سب کو عامر بن طفیل نے قتل کر دیا، انھیں میں حضرت ابوبکر کا غلام فہیرہ بھی تھا، جس سے رسولؐ اللہ کو شدید اذیت پہونچی تھی، آپؐ نے ان کے لئے ایک ماہ تک بددعا کی، چنانچہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ یہ مقاتل سے کا قول ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت احد میں نازل ہوئی۔ بیشتر علماء کا بھی یہی نظریہ ہے اور سیاق کلام بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہے کہ: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے اور انھیں تبلیغ کرنے کا حق ہے، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو عذاب کرنے، انھیں ہلاک کرنے اور ان کے لیے بددعا کرنے یا ان پر لعنت کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ توقع کر لیں، یہ کلام کو اختصار کے ساتھ آیا ہے، اس لئے کہ جملہ کی دلالت کے باعث اس کا مفہوم واضح ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے لیے لوگوں کی تدبیر میں اللہ کی بے شمار تدبیریں ہیں گویا اس طرح کہا جا رہا ہے۔ ان وجہوں میں سے آپ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی: أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ اس کے معنی میں دو وجہیں بیان کیا گئی ہے:

اول: یا تو ان پر لطف کرے جس کے ہمراہ ان کی توبہ واقع ہو اور لطف کے سبب اللہ ان کی توبہ قبول کر لے۔

دوم: یا جب وہ لوگ توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول کر لے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (اللہ گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے) یہ صفت اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ثواب وعذاب کے ذریعہ جزا دینے کا مالک ہے۔

اَوْ يُعَذِّبَهُمْ (یا ان پر عذاب نازل کرے) یعنی اگر یہ لوگ توبہ نہیں کریں گے تو اللہ ان پر عذاب کرے گا۔ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ (بلاشبہ یہ لوگ ظالم ہیں) یعنی اپنے ظلم کے سبب عذاب کے مستحق ہیں۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو چیز نصرت و مدد و کامیابی، توبہ کے قبول کرنے اور عذاب سے تعلق رکھتی ہے۔ان سب کا تعلق اللہ سے ہے، پیغمبرؐ سے نہیں ہے۔آپ کی ذمہ داری ہدایت اور تبلیغ ہے گویا کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے تلوار نہ اٹھایئے یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں تو خدا ان کی توبہ قبول کرلے لیا اگر وہ اپنے کفر پر باقی رہیں تو ان پر ان کے ظلم کے سبب عذاب کرے۔

❁❁❁❁❁

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٩﴾
آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک صرف اللہ ہے وہ جسے چاہے معاف کردے اور جس پر چاہے عذاب نازل کرے اور اللہ تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔(۱۲۹)

الفاظ ومعانی:

آیت میں لفظ مَا کا ذکر ہے چونکہ مَنْ سے زیادہ عام ہے۔لفظ مَا صاحبان عقل اور غیر صاحبان عقل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ وہ جنس کا فائدہ دیتا ہے۔اگر مَن فِي السَّمٰوٰتِ فرمایا ہوتا تو اس میں صاحبان عقل کے علاوہ کوئی داخل نہ ہوتا مگر یہ کہ اسے غلبہ پر حمل کیا جائے حالانکہ اس کے حقیقی معنی نہیں ہیں۔

تفسیر:

اللہ ہر چیز کا مالک

خداوند عالم نے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ کے فوراً ہی بعد ارشاد فرمایا کہ تمام امور اللہ کے لیے ہیں۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک صرف اللہ ہے) چاہے ملکیت وحکومت ہو، خلقت واقتدار ہو، ان میں وہ جس طرح چاہے ان میں تصرف کرنا، ایجاد کرنا، فنا کرنا چاہے واپس پلٹانا۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ (وہ جسے چاہے معاف کردے) مومنین میں سے جس کے گناہوں کو

چاہے معاف کردے، ان سے باز پرس نہ کرے چاہے تو ان پر عذاب نہ کرے۔ یہ اس کی رحمت اور فضل الٰہی ہے۔ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ (اور جس پر چاہے عذاب نازل کرے) یعنی کافروں پر عذاب کرنے والا ہے اور گناہ گار مومنین میں سے جنھیں وہ عذاب کرنا چاہے گا اگر وہ توبہ کیے بغیر مر گئے ہوں، اپنے عدل کے سبب (ان پر عذاب کرے گا) جس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے جس میں اس امر کی وضاحت وتفسیر کی گئی ہے: إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اگر یہ حکم نہیں ہوتا تو ہم باعتبار عقل تمام کے لیے عفو و بخشش کو جائز قرار دیتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے عذاب اور مغفرت کے معاملہ کو مبہم چھوڑ دیا ہے، وضاحت نہیں فرمائی ہے کہ کس کو بخشے گا اور کسے عذاب کرے گا تاکہ انسان خوف اور امید کے درمیان رہے نہ تو عذاب الٰہی سے بے خوف ہو جائے، نہ ہی رحمت الٰہی سے مایوس ہو (اس لیے کہ اللہ کی رحمت سے تو فقط کافروں کی قوم ہی مایوس ہوتی ہے) اسی بات کی جانب امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد متوجہ کرتا ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: اگر مومن کی امید اور خوف کا وزن کیا جائے تو دونوں میں اعتدال اور برابری ہوگی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے اپنی بخشش اور عذاب کو اپنی مشیت پر معلق فرمایا ہے اس لیے کہ اس کی مشیت اس کی حکمت کے مطابق ہے وہ نہیں چاہے گا مگر وہی جس کا اس کی حکمت کی مشیت تقاضا کرے گی۔ بعض حضرات سے سوال کیا گیا کہ خداوند عالم اپنی رحمت واسعہ کے باوجود بندوں پر کس طرح عذاب کرے گا تو ارشاد ہوا اس کی رحمت اس کی حکمت پر غالب نہیں ہے اس لیے کہ اس کی رحمت رقت قلب (نرمی قلب) کے ساتھ نہیں ہوتی جیسا کہ ہمارا رحم ہوتا ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ جسے چاہتا ہے اسے معاف کر دیتا ہے اور توبہ نہ کرنے والوں میں سے جسے چاہتا ہے عذاب کرے گا۔

❀❀❀❀❀

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۱۳۱﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۳۲﴾

اے ایمان لانے والو! سود جسے بڑھا چڑھا کر دیا جائے اسے مت کھاؤ اور اللہ ہی سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا سکو۔(۱۳۰) اور جہنّم کی اس آگ سے بچو جسے کافروں کے لیے مہیا کیا گیا ہے(۱۳۱) اور تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جا سکے(۱۳۲)

تفسیر:

سودخوری حرام ہے

خداوند عالم نے یہ ذکر فرمانے کے بعد کہ وہ جسے چاہے عذاب کرے اور جس کی چاہے مغفرت کرے، اس سے ایک نہی کو متصل فرمادیا ہے کہ اگر اسے انجام دیا تو عذاب کے مستحق ہوں گے اور وہ سود ہے ارشاد فرمایا:
يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (اے ایمان لانے والو!) یعنی جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کی۔
لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا (سود مت کھاؤ!) کھانے کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ بڑا انتفاع (فائدہ) کھانے کے ذریعہ ہی ہوتا ہے اگرچہ کھانے کے علاوہ دیگر تصرفات سے بھی روکا گیا ہے۔ سود یعنی موجودہ مدت کو ٹال کر اصل مال پر اضافی اور زیادہ (مال) لینا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زمانۂ جاہلیت کا سود ہے۔ یہ عطا اور مجاہد سے مروی ہے۔
ارشاد: أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً (جسے بڑھا چڑھا کر دیا جائے) اس کی تفسیر میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:
اول: ایک مدت سے دوسری مدت تک تاخیر کی وجہ سے مال میں زیادتی اور اضافہ کرنا۔ جب بھی ایک مدت سے دوسری مدت میں تاخیر کی جائے گی مال میں اضافہ کیا جائے گا۔
دوم: تم اس کے ذریعہ اپنے اموال میں کئی گنا اضافہ کرتے ہو۔ اس معاملہ میں ہر حرام اضافہ اور زیادتی داخل ہے، جو کئی گنا کی جہت سے ہو۔
سود کی وجہ حرمت کا سبب وہ مصلحت ہے جسے اللہ جانتا ہے، تقریب (معنی) کے اعتبار سے اس کی چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ سود اور بیع کے درمیان فرق ہے۔

۲۔ عدل کی طرف دعوت دے رہا ہے، اس پر آمادہ کر رہا ہے۔

۳۔ قرض دینے اور تنگ دست سے کسی اضافہ کے بغیر اسے مہلت دینے پر مکارم اخلاق کی طرف دعوت دے رہا ہے جس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

سورۂ بقرہ میں سود کا بیان کرنے کے باوجود اس مقام پر اس کی حرمت کو دوبارہ بیان کیا ہے جس کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ سود کی حرمت کی خبر دینے کے اس کے بعد اس سے صراحتاً منع فرمایا ہے اس لئے کہ ایسا شدت سے سود سے بچنے اور محفوظ رہنے کی غرض سے ہے۔

۲۔ اس قسم کے سود سے نہی کی تاکید کی خاطر ہے کہ جو کئی گنا ہوتا ہے۔

ارشاد: وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور اللہ ہی سے ڈرتے رہو) یعنی اس کی نافرمانی سے ڈرو! یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی معصیت ترک کر کے اس کے عذاب سے ڈرو۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (تاکہ تم فلاح پاسکو) تاکہ تم اپنی آرزو اور جنت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔

وَاتَّقُوا النَّارَ (اور جہنم کی اس آگ سے بچو) یعنی ان افعال سے بچو جو اس آتش جہنم میں جانے کا باعث ہوتے ہیں الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ جسے کافروں کے لیے مہیا کیا گیا ہے کافروں کے لیے آتش جہنم کو مخصوص قرار دینے کی وجہ ان کی ایک بڑی تعداد کا جہنمی ہونا ہے۔ لہٰذا انھیں کے لیے آتش جہنم کا مہیا اور آمادہ کیا جانا سب سے بہتر اور مناسب ہے اگرچہ ان کے علاوہ فاسقین بھی ان کے پیچھے پیچھے داخل جہنم ہوں گے۔ یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے کہ جس میں کہا گیا ہے: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ متقین کے علاوہ بچے اور دیوانے بھی داخل بہشت ہوں گے۔ حسن نے بیان کیا ہے: آتش جہنم کا کفار کے لیے مہیا کیا جانا اور انھیں مخصوص قرار دینا غیر (کفار) کی شرکت سے مانع نہیں ہے جس طرح مرتد لوگوں کے چہروں کا سیاہ کیا جانا اس میں دیگر تمام کفار کی شرکت سے مانع نہیں ہے جس کی مثالیں قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔ اصل اور حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کا ذکر سے خصوصیت سے کرنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ بقیہ باتیں اس کے برعکس اور برخلاف ہیں۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (اور تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو) اللہ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اس

کی اطاعت کرو اور جس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمھیں حکم بتلایا ہے اس کی عطاعت کرو لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (تاکہ تم پر رحم کیا جاسکے) تم پر عذاب نہ کیا جائے۔اس مقام پر جو سوال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب رسولؐ کے اطاعت اطاعت خدا ہے تو اس کی تکرار کا کیا سبب ہے؟ اس کے دو جواب ہیں:

اول: اس سے مقصد اطاعت رسول ہے ان احکام میں کن طرف آپ نے دعوت دی ہے وہ بھی اللہ کی اطاعت کے قصد کے ساتھ۔

دوم: خداوند عالم نے یہ اس لئے فرمایا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والا یہ جان لے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنے والے کے مانند ہے، پس وہ حکم خدا کے سبب اطاعت رسول کی طرف دوڑتا ہے۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل آیت سے متصل ہونے میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: اطاعت کے امر کو سودخوری کی نہی سے اتصال گویا اس طرح ہے کہ فرمایا ہے: ان احکام میں اللہ کی اطاعت کرو جس میں اس نے تمھیں نہی کی ہے جیسے سودخوری وغیرہ۔

دوم: محمد بن اسحاق بن یسار نے بیان کیا ہے کہ یہ ان لوگوں پر عتاب وعذاب ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کی اس وقت نافرمانی کی تھی جب آپ نے انھیں احد کے دن اپنی اپنی جگھوں پر پابندی سے قائم رہنے کا حکم دیا تھا، انھوں نے اس حکم کی مخالفت کی اور اموال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے تھے اور یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کی شکست کا سبب تھی۔

❁❁❁❁❁

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

(اے ایمان والو!) اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف تیزی سے دوڑو اور اس جنت کو حاصل کرنے کی سعی کرو جس کی چوڑائی تمام آسمانوں اور زمین جتنی ہے، جو متقین کے لیے بنائی گئی ہے۔(۱۳۳) وہ لوگ جو راحت و مصیبت دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں غصّے کو پینے والے ہیں، لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(۱۳۴)

قرائت:

اہل مدینہ اور اہل شام نے سَارِعُوْا کو واؤ کے بغیر سَارِعُ پڑھا ہے اور اسی طرح ان کے مصاحف (قرآن) میں بھی تحریر ہے۔ بقیہ نے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح مکہ اور عراق کے مصاحف میں بھی تحریر ہے۔

حجت:

ان دونوں کے درمیان فرق جملہ کا مستانفہ ہونا ہے جب وہ واؤ کے بغیر ہوگا اور ماقبل سے وصل ہو جائے گا جب واؤ کے ساتھ پڑھا جائے گا اس لئے کہ وہ ماقبل پر عطف ہوگا۔ واؤ کو ترک کرنا بھی جائز ہے اس لئے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ سے متصل ہے۔ واؤ کے ذریعہ عطف کرنے سے بے نیاز ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ - نیز: سَبْعَةٌ مِّنْهُمْ كَلْبُهُمْ -

الفاظ ومعانی:

الکظم کے لغوی معنی مشک کے پُر ہو جانے کے بعد اس کے دہانہ کو باندھنا ہے۔ حزن واندوہ میں

سے بھرے شخص کو کظیم و مکظوم کہتے ہیں۔اسی طرح وہ شخص بھی ہے جو غیظ وغضب سے بھرا ہوا ہو اور انتقام نہ لے۔ابو عبیدہ کی کتاب غریب الحدیث میں اوس بن ابو اوس کے واسطہ سے انه رای النبی ﷺ الیٰ کظامة قوم فتوضا و مسح علی قدمیه راوی کہتا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گروہ پر ناراض ہوئے پھر آپؐ نے وضو کیا اور اپنے دونوں قدموں پر مسح کیا۔

غَیظ اور غَضَب کے درمیان یہ فرق ہے کہ غَضَب رضا کی ضد ہے۔غضب نافرمانیوں کی وجہ سے سزا اور لعنت کے حقدار بننے والے کو سزا دینے کا ارادہ کرنا جبکہ غیظ ایسا نہیں ہے۔اس لئے کہ غَیظ نافرمانیوں کی کراہت اور نفرت پر طبیعت کا ہیجان اور جوش ہے لہٰذا اس طرح کہا جاتا ہے: غَضَبَ اللّٰهُ عَلَى الْكُفَّار اس طرح نہیں کہا جاتا: اِغْتَاظَ مِنْهُمْ۔

تفسیر:

مغفرت الٰہی کی جانب دوڑ پڑو

خداوند عالم نے عذاب کا سبب قرار پانے والے افعال سے خوف دلانے کے فوراً بعد ہی ثواب کا باعث بننے والے افعال کی انجام دہی پر آمادہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَسَارِعُوْا ((اے ایمان والو!) تیزی سے دوڑو) یعنی (سبقت) جلدی کرو۔وَاِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (اپنے پروردگار کی بخشش ومغفرت کی طرف) اس کی معصیت ونافرمانی سے پرہیز کرکے۔مراد یہ ہے کہ ان اعمال کی جانب (جلدی کرو) جو مغفرت کا باعث ہیں۔اس بارے میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ اسلام کی طرف سبقت کرو۔یہ ابن عباس سے مروی ہے۔کہا گیا ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں سبقت کرو۔یہ علی بن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے۔ہجرت کی جانب سبقت کرو، یہ ابو العالیہ سے مروی ہے۔تکبیرۃ الاولیٰ کی طرف سبقت کرو۔یہ انس بن مالک سے مروی ہے۔فرائض کی ادائیگی میں سبقت کرو۔یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے۔صلوات الخمس، پنجگانہ نمازوں کی طرف سبقت کرو۔یہ یمان سے مروی ہے۔جہاد کی طرف سبقت کرو۔یہ ضحاک سے مروی ہے۔توبہ کی طرف سبقت کرو۔یہ عکرمہ سے مروی ہے۔وَجَنَّةٍ یعنی جنت کی طرف (سبقت کرو)

عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (جس کی چوڑائی تمام آسمانوں اور زمین جتنی ہے) اس سے مراد کیا ہے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

اول: جنت کا عرض چوڑان ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کی چوڑان کے برابر ہے جب بعض کو بعض سے باہم ملا دیا جائے۔ یہ ابن عباس وحسن سے مروی ہے۔ اسی قول کو جبائی اور بلخی نے اختیار کیا ہے۔ خداوند عالم نے اس کے عرض کو اس کی عظمت کے اعتبار سے ذکر کیا ہے، طولانی ہونے کے سبب نہیں۔ جو اس پر دلالت ہے کہ لمبائی اسکے عرض سے بڑی ہے۔ اگر عرض کے بجائے طول کا ذکر کرتا تو یہ مفہوم ومعنیٰ سامنے نہ آتا۔ اس آیت کے مانند یہ آیت بھی ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ یعنی ایک نفس (انسان) کو خلق کرنے اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کے مانند ہے۔

دوم: اس کی قیمت ہے اگر جنت کو فروخت کیا جائے تو اس کی قیمت آسمانوں اور زمین کی قیمت جیسی ہوگی اگر انہیں فروخت کیا جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے: عَرَضْتُ هٰذَا الْمَتَاعَ لِلْبَيْعِ۔ میں نے اس متاع (چیز) کو فروخت کے لیے پیش کیا۔ اس سے اس کی مقدار زیادہ اور قدر و قیمت کا عظیم ہونا مراد ہے اور یہ کہ اس کے برابر کوئی چیز نہیں ہے چاہے وہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ یہ ابو مسلم اصفہانی سے مروی ہے۔ یہ اعلیٰ اور بہتر تاویل ہے مگر اس میں وضاحت نہیں ہے۔

سوم: اس سے وہ عرض مراد نہیں ہے جو طول کے برخلاف ہے بلکہ جنت کی وسعت اور عظمت مراد ہے۔ عرب جب کسی چیز کی اس کی وسعت کے اعتبار سے تعریف کرتے ہیں تو اس کی عرض کے ذریعہ کرتے ہیں۔ امرء القیس نے اس طرح کہا ہے:

بِلَادٌ عَرِيْضَةٌ وَّاَرْضٌ اَرِيْضَةٌ مَوَاقِعُ عَيْثٍ فِيْ فِضَاءٍ عَرِيْض

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جنت کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کے برابر ہے تو جہنم کہاں ہوگا؟ تو اس کا جواب ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ جب آپؐ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو شب کہاں ہوتی ہے؟

یہ معارضہ ہے، اس میں مسئلہ کو گرانا ہے۔ اس لیے کہ وہ قادر ہے شب کو جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے دن کو خلق فرماتا ہے۔

اسی طرح سوال ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ اگر جنت آسمان میں ہے تو اس کے لیے یہ عرض کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے۔ یہ انس بن مالک سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور جہنم زمین کے ساتوں طبقات کے نیچے

ہے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ جنت آسمان میں ہے تو مراد یہ ہے کہ آسمان کی طرف ہے اور اس کی سمت میں ہے نہ یہ کہ آسمان اسے گھیرے اور سمیٹے ہوئے ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کی طرح جنت کو بلندی پر خلق فرمایا ہے۔ اگر یہ روایت درست اور صحیح ہو کہ جنت چوتھے آسمان میں ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ فی الدار بستان یعنی گھر میں باغ ہے تو یہ باغ کے گھر سے متصل ہونے کے سبب اور اس کے ایک گوشہ میں ہونے کی وجہ سے اور اس کی جانب اس کا دروازہ کھلنے کے سبب کہا جاتا ہے، اگرچہ باغ گھر سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ نے جنت کے عرض میں قیامت کے دن کا ارادہ کیا ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جنت کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہوگا۔ نہ کہ فی الحال۔ یہ ابوبکر احمد بن علی سے مروی ہے جبکہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنت آسمانوں میں ہے۔

اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ (جو متقین کے لیے بنائی گئی ہے) (جنت کو) اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنے والوں کے لیے، برائیوں سے بچنے والوں اور فرائض کو انجام دینے والوں کے لیے مہیا اور آمادہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اطاعت کے ذریعہ عذاب سے محفوظ ہوجائیں۔ جنت کی نسبت متقین کی جانب اس لیے دی گئی ہے کہ جنت کا مقصود یہی لوگ ہیں، اگرچہ جنت میں ان کے علاوہ بچے اور دیوانے بھی ہوں گے تو وہ جو متابعت کے عنوان سے ہوں گے۔ یہی حکم فاسقوں کا ہوگا اگر انھیں درگذر کردیا جائے۔ انھیں معاف کردیا جائے گا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر متقین نہیں ہوتے تو جنت پیدا ہی نہ کی جاتی جس طرح کہا جاتا ہے کہ حاکم کے لیے دسترخوان بچھایا گیا یہ محاورہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آج بھی جنت خلق شدہ ہے اس لیے کہ جنت مہیا جب ہی ہوگی جب خلق ہوچکی ہوگی۔

ارشاد: اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ (وہ لوگ جو راحت و مصیبت دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں) یہ متقین کی صفت ہے۔ اَلسَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ کے متعلق دو اقوال ہیں:

اول: راحت اور تنگی مراد ہے۔ اس کی روایت ابن عباس سے کی گئی ہے یعنی مال کی کثرت اور اس کی قلت و کمی کی حالت میں۔

دوم: خوشی اور غم دونوں میں یعنی خوشی اور غم میں سے کوئی چیز بھی انھیں نیکی کی راہ میں انفاق کرنے سے نہیں روکتی۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ (غصّے کو پینے والے ہیں) یعنی جب ان کا نفس غیظ و غضب سے پر ہو جاتا ہے تو وہ اسے پی جاتے ہیں جس سے انھیں ضرر و نقصان پہنچا ہے، اس سے انتقام نہیں لیتے بلکہ اس پر صبر کرتے ہیں۔

ارشاد: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں) یعنی لوگوں سے در گذر کرتے ہیں جس سے ان کا عفو و درگذر کرنا جائز ہوتا ہے جس کے سبب حق الٰہی میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے غلاموں اور کنیزوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

ارشاد: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) یعنی مذکورہ عمل کو انجام دینے والا محسن ہے۔ اللہ اسے ثواب عطا کر کے اس سے محبت کرتا ہے۔ امکان ہے کہ احسان کی شرط کو ان شرائط سے متصل اور وابستہ کرنا مقصود ہو۔ ثوری نے کہا ہے: احسان یہ ہے کہ جو تمھارے ساتھ بدی کرے تم اس کے ساتھ حسن سلوک کرو لیکن جو تمھارے ساتھ احسان کرے تو یہ (احسان) بازار کی نقد تجارت کے مانند ہے یعنی مجھ سے لو اور مجھے دو۔

فصل

خداوند عالم نے اہل جنت کا سب سے پہلا اخلاق سخاوت کو شمار کیا ہے اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے انس بن مالک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: سخاوت جنت میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں جو اس کی شاخوں میں سے کسی شاخ سے وابستہ ہوگا وہ اسے جنت تک رہنمائی کرے گی۔ بخل آتش جہنم میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں دنیا تک پھیلی ہیں جو اس کی شاخوں سے کسی شاخ سے وابستہ ہو گیا اسے آتش جہنم تک پہونچادے گی۔

حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جنت سخی لوگوں کا گھر ہے، سخی اللہ سے نزدیک ہے، جنت سے نزدیک اور لوگوں سے نزدیک ہے اور آتش جہنم سے دور ہوتا ہے۔ بخیل جنت سے دور، لوگوں سے دور اور آتش جہنم سے نزدیک ہوتا ہے۔

پھر خداوند عالم نے اہل جنت کے اخلاق میں غیظ و غضب کا پینا شمار کیا۔ اس بارے میں وارد ہونے والی روایتوں میں سے ایک روایت ابوامامہ نے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے غیظ و غضب کو پی جائے باوجودیکہ وہ اسے انجام دینے پر قادر تھا تو خداوند عالم قیامت

کے روز اسے اپنی رضا سے مالا مال کردے گا۔

دوسری روایت میں ہے کہ خداوند عالم قیامت کے روز اسے امن وایمان سے بھر دے گا۔اسی طرح ارشاد فرمایا غیظ وغضب کا پی جانے والا خدا کی راہ میں اس کے دشمن کے مقابلہ میں تلوار چلانے والے کے مانند ہے، اللہ اس کے قلب کو اپنی رضا سے مالا مال کردے گا۔

دوسری روایت میں ہے: روز قیامت اس کے قلب کو امن وامان سے بھر دے گا۔طاقتور وہ نہیں ہے جو دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ میں رہنے اوپر کنٹرول رکھے۔

پھر خداوند عالم نے لوگوں سے درگذر کرنے والوں کا کا ذکر کیا ہے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسے افراد میری امت میں کم ہیں مگر وہی جنھیں اللہ نے محفوظ رکھا ہے گذشتہ امتوں میں زیادہ تھے مذکورہ بالا مطالب اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ گناہوں سے درگذر کرنا پسندیدہ امر مستحب ہے، اگرچہ واجب نہیں ہے۔حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص کسی ظلم وزیادتی کو ہرگز نہیں بخشتا کرتا مگر یہ کہ خداوند عالم اس کے عزت ووقار میں اضافہ فرماتا ہے۔

پھر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ حسن عمل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، محسن غیر کو نعمت عطا کرنے والے کو کہتے ہیں جو اسے بدی کے عوض انجام دیتا ہے، اسی طرح محسن اطاعت اور قربت کے لیے افعال حسنہ کا انجام دینے والے کو بھی محسن کہتے ہیں۔روایت کی گئی ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی ایک کنیز امامؑ کے لیے آب وضو لے کر آئی، پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر امامؑ کے جسم پر گر گیا جس نے امامؑ کو زخمی کردیا۔امامؑ نے اپنا سر بلند کیا، کنیز نے امامؑ سے عرض کیا: خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: وَالْكَٰظِمِينَ ٱلْغَيْظَ امامؑ نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ ضبط کرلیا۔کنیز نے پھر کہا: وَٱلْعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاسِ. امامؑ نے فرمایا: اللہ تجھے معاف کرے! کنیز نے پھر عرض کیا: وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ امامؑ نے فرمایا: جا میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کیا۔

❀❀❀❀❀

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور اگر اتفاقاً کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر ہٹ دھرمی نہیں کرتے۔(۱۳۵) ان کی جزا ان کے ربّ کی جانب سے مغفرت اور ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور عمل کرنے والوں کے لیے کتنا اچھا اجر ہے۔(۱۳۶)

الفاظ و معانی:

فَاحِشَة کی اصل اَلْفُحْش ہے اس کے معنیٰ بہت برے کام کی طرف نکل جانے یا بہت برے کام کو دیکھنے کے ہیں (یعنی بڑے گناہ کا انجام دینا ہے) اسی لئے بہت زیادہ افراط اور زیادتی کرنے والے کو کہا جاتا ہے: اِنَّهٗ لَفَاحِشُ الطَّوْلِ وَ اَفْحَشَ فُلَانٌ یعنی اس نے بری بات کہی۔

اِصْرَار کے لغوی معنیٰ شدید سردی کی وجہ سے باندھنے کے ہیں۔ الصِرّ یعنی شدید ٹھنڈک گویا یہ معنیٰ گناہ پر باقی رہنے سے رابطہ دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اصرار کے حقیقی معنیٰ کسی کام پر ثابت اور باقی رہنے کے ہیں۔

ترکیب:

وَالَّذِيْنَ، اَلْمُتَّقِيْنَ پر عطف ہے۔ کہا گیا ہے کہ مرفوع ہے بر بنائے جملہ مستأنفہ گویا جملہ کو جملہ پر عطف کیا گیا ہے۔ پہلے قول کی بنا پر یہ سب ایک گروہ ہیں اور دوسرے قول کی بنا پر دو گروہ ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شروع کے دو گروہوں کی جانب پلٹے اور مدح کی بنا پر محلاً مرفوع ہو۔

اِلَّا اللّٰهُ لفظ جلالہ اللہ معنی پر حمل کرتے ہوئے مرفوع ہو جائے گا۔لفظ پر عطف کرتے ہوئے نہیں، اس لئے کہ اس سے پہلے جحد (نفی) ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: وَ هَلْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اَحَدٌ اِلَّا اللّٰهُ یا هَلْ رُأَيَ اَحَدٌ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهَ (کیا اللہ کے علاوہ کوئی گناہوں کو معاف کرے گا یا کوئی ایسا دیکھا گیا ہے جو اللہ کے علاوہ گناہوں کو بخش دے) مراد یہ ہے کہ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهَ (اللہ کے علاوہ کوئی گناہوں کو معاف نہیں کرے گا) اس لئے کہ یہاں آیت میں استفہام (هل) نفی کی جگہ پر واقع ہوا ہے۔

وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ - یہاں پر مخصوص بالمدح محذوف ہے۔اس کی تقدیر یہ ہے: وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ اَجْرُهُمْ۔

شان نزول

روایت کی گئی ہے کہ مومنین کے ایک گروہ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: اللہ کے رسول! بنی اسرائیل ہماری نسبت اللہ کے نزدیک زیادہ محترم اور صاحب شرف تھے کہ ان میں سے جب کوئی شخص گناہ کرتا تو گناہ کے کفارہ میں اس کے دروازہ کی چوکھٹ پر اس طرح لکھ دیا جاتا تھا (اپنی ناک کاٹ لے یا اپنا کان کاٹ لے، اسی طرح انجام دے) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے۔اس وقت آیت نازل ہوئی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں اس سے بہتر بات بتاؤں؟! پھر آپ نے ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔یہ ابن مسعود سے مروی ہے۔اس میں سہولت و آسانی ہے حالانکہ اس میں بنی اسرائیل پر سختی اور شدت کی گئی تھی کہ اس کا بدل (عوض) استغفار کو قرار دیا۔یہ بھی کہا گیا ہے یہ آیت نبہان تمار (کھجور فروش) کے بارے میں نازل ہوئی۔اس کے پاس کھجور خریدنے کے لیے ایک عورت آئی تھی، نبہان نے اس سے کہا: یہ کھجوریں اچھی نہیں ہیں۔ان سے بہتر گھر پر موجود ہیں۔چنانچہ وہ عورت کو اپنے ہمراہ گھر پر لے گیا اور اسے خود سے چمٹا لیا اور بوسہ کیا۔عورت نے کہا خوف خدا کر۔نبہان نے اسے چھوڑ دیا، شرمندہ ہوا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا۔آپؐ سے ماجرا بیان کیا چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔یہ عطا سے مروی ہے۔

تفسیر:

توبہ و استغفار

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (اور اگر اتفاقاً کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے

نفسوں پر ظلم کرتے ہیں) فاحشہ اور نفس پر ظلم کرنے کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے:

کہا گیا ہے کہ فاحشہ زنا ہے اور نفس پر ظلم کرنا تمام گناہ ہیں۔ یہ سُدی اور جابر کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاحشہ گناہان کبیرہ ہیں اور نفس پر ظلم گناہان صغیرہ ہیں۔ یہ قاضی عبدالجبار بن احمد ہمدانی کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاحشہ ہر ظاہری اور باطنی گناہ کا نام ہے لیکن (زیادہ تر) گناہ کبیرہ کو کہتے ہیں۔ یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے۔ اس طرح بھی کہا گیا ہے: فَعَلُوْا فٰحِشَةً فِعلًا (یعنی برا کام کیا) اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ قَوْلًا (یعنی بری بات کہی)

ارشاد: ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (تو اللہ کو یاد کرتے ہیں) یعنی وہ اللہ کی وعید (عذاب کے وعدہ) کو یاد کرتے ہیں تو اپنے آپ کو گناہوں سے روکتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں۔ یہ استغفار بھول جانے کے بعد یاد آنے پر ہوتا ہے۔ خدا نے ان کی مدح کی ہے اس لیے کہ انھوں نے اسے یاد کرلیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ذَكَرُوا اللّٰهَ یعنی انھوں نے کہا: پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے ہم اس پر نادم اور شرمندہ ہو کر توبہ کرتے ہیں اور اس سے جدائی اور دوری اختیار کرتے ہیں۔

ارشاد الٰہی: وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ اور اللہ کے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں) اللہ کا لطیف فضل اس کا انتہائی کرم اور بے پناہ منت و احسان ہے جو گناہ گاروں کو توبہ میں انتہائی ترغیب کرنے، طلب مغفرت کرنے اور خطا کاروں کے لیے انتہائی حسن ظن فراہم کرنے اور مجرموں کی امید کی تقویت کا باعث ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی آقا اپنے خطا کار خادم سے کہے: مجھ سے معذرت کرلے میرے سوا تیری معذرت کا قبول کرنے والا کون ہے؟

اگر سوال کیا جائے کہ بندے بھی ایک دوسرے کی خطائیں بخش دیتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ گناہ جن پر عذاب کا استحقاق پیدا ہوجاتا ہے انھیں اللہ کے علاوہ کوئی نہیں بخش سکتا۔ اسی طرح اللہ سبحانہ کی مراد گناہان کبیرہ کی بخشش ہے، ہم میں سے ایک دوسرے کی خطائیں ان گناہان کبیرہ کی نسبت (گناہ) صغیرہ ہیں۔

ارشاد: وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا (اور وہ اپنے کیے پر ہٹ دھرمی نہیں کرتے) یعنی معصیت اور گناہ پر قائم نہیں رہتے، اس پر اصرار نہ کرتے اور نہ ہی اسے پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ اصرار یعنی توبہ کے بغیر گناہ کا انجام دینا ہے۔ یہ پہلے قول سے نزدیک ہے اور یہ کفایت نہیں کرتا اس لیے کہ توبہ گناہوں پر اصرار کے ساتھ فقط استغفار ہے حالانکہ استغفار گناہ پر اصرار ترک کرنے پر ہی مؤثر ثابت

ہوتا ہے (یعنی استغفار اس وقت مفید ہوگا جب گناہ پر اصرار اور اس کی تکرار نہ کی جائے)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے، آپ نے فرمایا: لَا صَغِيْرَةَ مَعَ الْاِصْرَارِ وَلَا كَبِيْرَةَ مَعَ الْاِسْتِغْفَارِ (گناہوں پر) اصرار اور تکرار کرنے سے گناہ صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا اور توبہ و استغفار کرنے پر گناہ کبیرہ کبیرہ باقی نہیں رہتا۔ ابن عباس کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے: اصرار یعنی توبہ و استغفار ترک کر کے گناہوں پر ثابت رہنا ہے۔

ارشاد: وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (دیدہ و دانستہ) اس میں متعدد وجہوں کا امکان ہے:

اول: مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کو جانتے اور انھیں یاد رکھتے ہیں، نہ تو سہو کرتے ہیں، نہ ہی انھیں فراموش کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ ایسے بندے کو بخش دیتا ہے جو اپنے گناہوں کو فراموش کر چکا ہو اگر چہ اس سے بعینہ ان گناہوں سے توبہ نہ کی ہو۔ یہ جبائی اور سدی کا قول ہے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ یہ لوگ حجت (دلیل) کے کو جانتے ہیں کہ یہ (فعل) گناہ ہے اگر نہیں جانتے تو علم کی جانب ان کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوتا تو گناہ ان اٹھالیا جاتا جیسے کوئی شخص نادانستہ طور پر رضاعی یا نسبی ماں سے شادی کرلے تو ایسی صورت میں وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ یہ عباس اور حسن کے قول کا مطلب ہے۔

سوم: مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اللہ لوگوں کے گناہوں کی مغفرت و بخشش کا مالک و مختار ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

اُولٰٓئِكَ یہ ان متقین کی جانب اشارہ ہے کہ جن کے صفات گذر چکے ہیں جو فراخی گشائش اور تنگی میں انفاق کرتے ہیں، آخر کلام تک یعنی یہ سب۔ جَزَآؤُهُمْ (ان کی جزا) یعنی ان کے اعمال اور توبہ کی جزا۔ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (ان کے رَبّ کی جانب سے مغفرت) (ان کے گناہوں کی پردہ پوشی) وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (اور ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (اور عمل کرنے والوں کے لیے کتنا اچھا اجر ہے) اس سے وہ باغات، ثواب کے اقسام اور گناہوں کی پردہ پوشی کے ذریعہ مغفرت و بخشش مراد ہے جن کے صفات بیان کیے گئے ہیں جو اس طرح قرار پا گئے ہیں گویا ان پر عذاب کرنے کے متعلق عمل ہی نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنا فضل کرتا ہے چونکہ توبہ کرنے پر عذاب کو برطرف کرنا فضل الٰہی ہے اور توبہ کے ذریعہ ثواب کا حقدار قرار پایا عقلی طور پر واجب اور لازمی ہے اس لیے کہ اگر توبہ کے بعد وہ ثواب کا حقدار نہیں

ہوگا تو اس پر توبہ کو لازم قرار دینا قبیح ہوگا چونکہ توبہ میں مشقت ہے۔

نظم:

کہا گیا ہے کہ یہ آیت اپنے ماقبل سے متصل ہے چونکہ یہ متقین کے صفات ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلکہ یہ دو گروہ اور جماعتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے بلاشبہ جنت تنگی اور فراخی میں انفاق کرنے والوں کے لیے ہے۔ آخر آیت تک اور اس شخص کے لیے ہے جس سے لغزش (گناہ) ہو پھر وہ توبہ کرلے اور اس پر اصرار نہ کرے۔

❀❀❀❀❀

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۳۷﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۸﴾
تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں زمین میں سیر کرکے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ (۱۳۷) یہ لوگوں کے لیے صاف اور واضح تنبیہ ہے اور متقین کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ (۱۳۸)

الفاظ ومعانی:

اَلسُّنَّةُ: ایسا راستہ جسے اس کی پیروی کرنے کے لیے قرار دیا جاتا ہے۔ اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔ سنت کے لغوی معنیٰ کسی سمت میں استمرار اور جاری ہونے باقی رہنے کے ہیں۔ اسی سے سَنَّ السِّكِّينَ بِالْمِسَنِّ ہے یعنی چھری کا سان پر لگانا (اسے تیز کرنا اور دھار دینا ہے) اسی سے سِنٌّ (دانت) ہے کہ جو اَسْنَان کی واحد ہے اس لئے کہ وہ ایک راستہ پر جاری وساری رہتا ہے۔

اَلسِّنَان: نیزہ۔

اَلسُّنَن: راستہ کا جاری رہنا۔

اَلْعَاقِبَة: جس کی جانب پہلا سبب پہونچتا ہے (اس کی بازگشت ہوتی ہے) جبکہ آخِرَة اس طرح نہیں

ہے۔ ممکن ہے اسی کو شمار میں پہلا قرار دیا جائے۔

اَلْمَوْعِظَة ایسی بات جس سے قلب نرم ہو جاتے ہیں اور اس میں موجود باتیں جیسے برائی سے روکنے اور اچھائی کی دعوت دینے سے تمسک کی طرف بلاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اَلْمَوْعِظَة وہ بات ہے جو برائی کے عوض، رغبت اور خوف کے ذریعہ نیکی کی دعوت دیتی ہے۔

تفسیر:

گذشتہ امتوں کی تاریخ کا مطالعہ

اللہ سبحانہ نے یہ بیان فرمایا کہ وہ دنیا و آخرت میں مومن اور کافر کے ساتھ کیا کرے گا تو اس نے واضح فرمایا کہ یہ اس کی اپنی مخلوق کے بارے میں سیرت (عادت اور طریقۂ کار) ہے قَدْ خَلَتْ گزر چکے ہیں مِن قَبْلِكُمْ (تم سے پہلے) اے اصحاب محمدؐ!، کہا گیا ہے کہ یہ جنگ اُحد میں شکست خوردہ افراد سے خطاب ہے۔ سُنَنٌ (بہت سے دور) اللہ کی طرف سے گذشتہ امتوں کے بارے میں جب وہ اس کے پیغمبروں کی تکذیب کرتیں اور ان کی نبوت کا انکار کر دیتی تھیں تو اللہ انھیں تباہ و برباد کر دیتا ہے اور عبرت و نصیحت کے لیے ان علاقوں میں ان کے آثار باقی رکھتا۔ یہ حسن اور ابن اسحاق کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سُنن یعنی مثالیں۔ یہ زید سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سُنن یعنی امتیں اور سنت امت کے معنیٰ میں بھی ہے۔ یہ مفضل سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سنن سے مراد اہل سنن ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ہے کہ ہر امت کے لیے ایک سنت اور طریقۂ کار ہے جب وہ اس کا اتباع کرتی ہے تو اللہ اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ کلبی سے مروی ہے۔

فَسِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (زمین میں سیر کر کے دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا) تاکہ تم جھٹلانے والوں واقعات اور ان پر نازل ہونے والے (عذاب) کے متعلق جان لو اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرو اور جو انھوں نے جو کچھ کیا ہے تم ان کاموں سے خود کو روکو، جھٹلانے اور انکار کرنے میں ان کی روش اختیار نہ کرو ورنہ تم پر بھی انھیں کی طرح کا عذاب نازل ہو جائے گا۔

اَلْمُكَذِّبِيْنَ سے بعثت و نشور (دوبارہ زندہ کیا جانا) اور ثواب و عذاب (کے جھٹلانے والے) مراد ہیں جنھیں اللہ دنیا میں جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا۔ هٰذَا (یہ) قرآن کی جانب اشارہ ہے۔ بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (لوگوں کے لیے صاف اور واضح تنبیہ ہے) یعنی ان تمام لوگوں کے لیے دلالت

اور حجت ہے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ گذشتہ ارشاد قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ چیز جس کا میں نے تمھارے سامنے تعارف کرایا ہے، لوگوں کے لیے بیان ہے۔ یہ ابن ابی اسحاق سے مروی ہے۔ بلخی اور طبری نے بھی اسی نظریہ کو مانا ہے۔ وَهُدًى (اور (متقین کے لیے) ہدایت ہے) علی ابن عیسی نے کہا ہے: بَیَان اور الهُدیٰ کے درمیان یہ فرق ہے کہ بیان یعنی دوسروں کے سامنے اپنے مقصود و مراد کو واضح کر دینا چاہے جو بھی ہو ھدیٰ یعنی رشد و ہدایت کا راستہ بیان کرنا ہے تا کہ وہ گمراہی کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرے۔

وَمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِينَ (اور متقین کے لیے نصیحت ہے) نصیحت کو متقین سے مخصوص کیا ہے حالانکہ قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت و موعظہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ متقین ہی قرآن کی ہدایت سے ہدایت پاتے اور اس کے موعظے سے نصیحت و عبرت کا حاصل کرتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحۡزَنُوا وَأَنتُمُ الۡأَعۡلَوۡنَ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ إِن يَمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهُۥ ۚ وَتِلۡكَ الۡأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ وَلِيَعۡلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمۡ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۰﴾

اے مومنو! دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ ایمان پر قائم رہو۔ (۱۳۹) اگر تمھیں اس وقت شکست کا زخم لگا ہے تو اس سے پہلے یہ زخم تمھارے مخالف گروہ کو لگ چکا ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں تا کہ اللہ جان لے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور وہ تم میں سے حقانیت کے گواہ بنانا چاہتا ہے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ (۱۴۰)

قرائت:

حفص کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے دونوں مقام پر قُرۡح قاف کے جملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی

طرح ارشاد الٰہی: مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ میں بھی جملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بقیہ قراء نے قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: قَرح اور قُرح ضَعف و ضُعف، کَرہ و کُرہ، دَفء و دُفء اور شَھد و شُھد کے مانند ہیں۔

ابوالحسن نے کہا: قَرِحَ یَقۡرَحُ قَرۡحًا وَ قُرۡحًا۔ یہ قول دلالت کرتا ہے کہ قَرح اور قُرح دونوں مصدر ہیں۔

اور حسن نے کہا ہے کہ قَرح جو زخم کو کہتے ہیں اور قُرح زخم کے درد و الم کو۔ تو اس کی یہ بات قبول کی جائے گی۔ جب وہ اس بارے میں کوئی روایت لائے اس لئے کہ یہ ان چیزوں سے ہے کہ جسے قیاس کے ذریعہ نہیں جانا جاسکتا ہے۔

الفاظ و معانی:

وَهۡن: کمزوری۔ وَهۡن و مُوۡهِن: رات کی ایک گھڑی۔ اَلۡاَعۡلَوۡن: اَلۡاَعۡلیٰ کی جمع ہے اور اس کا مؤنث اَلۡعُلۡیَاء ہے۔ اس کی جمع عُلۡیَات اور اَلۡعُلیٰ آتی ہے۔

لَمۡس اور مَسّ کے درمیان فرق یہ ہے کہ لَمۡس احساس کے ساتھ چپکنا ہے اور مَسّ صرف چپکنا ہے۔

اَلدَّوۡلَة: کسی جماعت کا اپنے مقصود کو حاصل کر کے واپس آنا ہے۔

ترکیب:

وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ۔ جملہ مقام حال میں ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا تَحۡزَنُوۡا عَالِیۡنَ یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں تمھاری مدد کی جائے گی۔

ایک احتمال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس کا کوئی محل اعراب نہ ہو اس لئے وہ وعدِ مؤکد کے ذریعہ جملہ معترضہ ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَهِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ مَعَ ذٰلِكَ۔

وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ-لام میں عامل محذوف ہے جس پر آغاز جملہ دلالت کرتا ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا نُدَاوِلُهَا-اس میں عامل نُدَاوِلُهَا بھی ہوسکتا ہے جو کہ لفظ ظاہر میں ہے-اس کی تقدیر یہ ہے: نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ بِضُرُوۡبٍ مِّنَ التَّدۡبِیۡرِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (اور ہم اسے انواع واقسام کی تدبیر کے ذریعہ لوگوں کے درمیان گھماتے رہیں گے تا کہ خدا ایمان لانے والوں کو جان لے)

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کی تسلی کے لیے نازل ہوئی ہے جب وہ جب جنگ احد میں قتل اور زخمی ہوئے-یہ زہری وقتادہ اور ابن ابونجیح سے مروی ہے-بیان کیا گیا ہے کہ جب گھاٹی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور خالد ابن ولید مشرکین کے لشکر کو لے کر آگے بڑھا جو پہاڑ کی جانب سے ان پر اوپر سے آنا چاہتا تھا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پروردگار انھیں ہم پر بلندی عطا نہ کرنا پروردگار ہمارے پاس تیرے سوا کوئی قوت و طاقت نہیں ہے، پروردگارا! اس علاقہ میں ان افراد کے علاوہ تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی-بعض تیراندازوں نے پہاڑ پر چڑھ کر مشرکین کے لشکر پر تیراندازی کی یہاں تک کہ انھیں شکست دی اور مسلمان پہاڑ پر چڑھ گئے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ یہ ابن عباس سے مروی ہے-یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ان لوگوں کو بلانے کا حکم دیا تھا جو جنگ میں زخمی ہوئے تھے آپ نے فرمایا: ہمارے ہمراہ وہی نکلے گا جو کل ہمارے ساتھ شریک تھا چنانچہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی-یہ کلبی سے مروی ہے، اس کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے: وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ

تفسیر:

گھبراؤ نہیں!

پھر خداوند عالم نے مسلمانوں کو مشکلات کو بخوبی سر کرنے کے لیے آمادہ کیا ہے، کمزوری اور مصائب پر غم زدہ ہونے سے منع فرمایا ہے، ان سے حال ہی میں غلبہ عطا کرنے انجام کار میں بہتر اور اچھے نتیجہ کا وعدہ فرمایا

ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَا تَهِنُوْا (اے مومنو! دل شکستہ نہ ہو) یعنی اپنے دشمن سے جہاد کرنے میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو وَلَا تَحْزَنُوْا (غم نہ کرو) یعنی تمھارے مالی اور جسم سے جو نقصان پہونچا ہے اس پر غم زدہ نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمھیں جو زخم آئے ہیں ان سے کمزوری کا اظہار نہ کرو اور تمھارے برادران کی شہادت سے تم پر جو مصائب وارد ہوئے ہیں ان پر حزن و ملال نہ کرو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمھیں جو شکست ہوئی ہے اس پر کمزوری نہ دکھاؤ اور مال غنیمت جو تم سے چھوٹ گیا ہے اس پر افسوس نہ کرو۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (تم ہی غالب رہو گے) انجام کار تم ہی ان لوگوں پر کامیابی حاصل کرو گے اور غالب آؤ گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مقام و مرتبہ کے اعتبار سے تم ہی سربلند ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (بشرطیکہ ایمان پر قائم رہو) یعنی جو مومن ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے کمزروی کا اظہار نہ کرے اور حزن و ملال نہ کرے، ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ اگر تم اپنے دشمن پر میرے وعدۂ نصرت پر تصدیق کرنے والے ہو تو نہ دل شکستہ ہو اور نہ ہی حزن و ملال کرو۔

پھر اللہ سبحانہ نے مومنین کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (اگر تمھیں اس وقت شکست کا زخم لگا ہے تو اس سے پہلے یہ زخم تمھارے مخالف گروہ کو لگ چکا ہے۔) یعنی اگر تمھیں زخم لگے ہیں اسی طرح ان کو بھی زخم لگے ہیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ احد کے دن اگر تمھیں زخم لگے ہیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی جنگ بدر میں زخم ہو گئے ہیں۔ انس ابن مالک نے بیان کیا ہے۔ علی علیہ السلام کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس حالت میں لایا گیا کہ آپؑ کے جسم پر نیزہ، شمشیر اور تیروں کے ساٹھ (۶۰) سے زیادہ زخم لگے ہوئے تھے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مس کر رہے تھے اور وہ حکم خدا سے مندمل ہوتے جا رہے تھے، گویا کہ زخم لگے ہی نہ ہوں۔ ابن عباس سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ جنگ اُحد میں ابوسفیان پہاڑی پر چڑھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پروردگارا اسے ہم پر بلند ہونے کا حق نہیں ہے۔ ابوسفیان لمحہ بھر کے لیے ٹھہرا پھر اس نے کہا: دن (لوگوں پر) بدل بدل کے آتے ہیں اور جنگ مقابلہ ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب سے فرمایا: اس کا جواب دو! اصحاب نے کہا: دونوں مساوی اور ایک جیسے نہیں ہیں، ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور تمھارے آتش جہنم میں۔ ابوسفیان نے کہا ہمارے لیے عزیٰ ہے تمہارے لئے عزیٰ نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: اللہ ہمارا مولا و سرپرست ہے تمھارا کوئی مولا و سرپرست نہیں ہے۔ ابوسفیان نے کہا ہُبل کا مرتبہ بلند

ہے۔پیغمبرؐ نے فرمایا اللہ اعلیٰ واجل ہے۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں) یعنی پلٹاتے رہتے ہیں ہم انھیں گردش دیتے ہیں ایک مرتبہ ایک گروہ کے فائدہ میں، دوسری مرتبہ اس کے نقصان کے لیے۔ یہ حسن، قتادہ، ربیع، سدی اور ابن اسحاق سے مروی ہے۔ خدا وند عالم دنوں کو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان کبھی مسلمانوں پر ان کی مشقت کو کم کر کے اور کبھی ان کی مشقت کو سخت اور دشوار کر کے گردش دیتا رہتا ہے۔ ان کے مقابلے میں کفار کی نصرت و مدد نہیں کرتا۔ اللہ مسلمانوں پر کافروں کی مدد نہیں کرتا اس لیے کہ نصرت و مدد محبت پر دلالت کرتی ہے اور اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا، اللہ نے دنیا کو منقلب (الٹے پلٹنے والا) قرار دیا ہے تا کہ مسلمان اس میں مطمئن نہ ہو جائے اس کی دنیا میں رغبت و حرص کم ہو، چنانچہ اس کی لذتیں فنا ہونے والی ہیں، اس میں قیام کرنے والا مطعون یعنی نشانہ پر ہے تا کہ آخرت کے لیے کوشاں رہے کہ جس کی نعمتیں دائمی ہیں۔ حکومت و اقتدار کو اللہ نے کبھی مسلمانوں کے نفع کے لیے قرار دیا کبھی ضرر و نقصان کے لیے تا کہ لوگ دائرۂ ایمان میں اس طرح داخل ہوں جس طرح ان کا داخل ہونا واجب ہے اور یہی حجت و دلیل کا قیام ہے۔ اگر اقتدار ہمیشہ مومنین ہی کے لیے ہوتا تو یقیناً لوگ دائرۂ ایمان میں سیدھے طور پر برکت اور نیک فال سمجھ کر داخل ہوتے جن مقامات پر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لے جاتے وہ آپ کی کامیابی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ چاہے ابتدائے امر میں یا انجام کار میں۔ لیکن یہ حالات استمرار کے طور پر نہیں رہتے تھے جس کی اللہ نے اس طرح وضاحت فرمائی: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا (تا کہ اللہ جان لے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں) يَعْلَمَ کا دوسرا مفعول محذوف ہے اس کی تقدیر اس طرح ہے: یہ ایام (دن) ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان بعض مصلحتوں اور حکمتوں کے تحت گردش دیتے رہتے ہیں تا کہ اللہ صاحبان ایمان کو ایمان کے ذریعہ دوسرا سے الگ جان لے۔ اس اعتبار سے يَعْلَمَ (جاننا) يَعْرِفُ (یعنی پہچاننے کے معنی میں نہیں ہوگا) مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ ذوات کو پہچانتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ایمان کے ذریعہ تمیز اور تشخیص دینا جانتا ہے، ممکن ہے اس کے معنی اس طرح ہوں تا کہ خداوند عالم جان لے صاحبان ایمان کو ان کے اس ظاہر ہونے والے صبر کے ذریعہ جو انھوں نے اپنے دشمنوں پر جہاد میں کیا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ ان لوگوں جیسا برتاؤ کرتا ہے جو ان کی اس حالت کو پہچانتے ہیں اگرچہ خداوند عالم انھیں ان کے اظہار ایمان سے قبل جانتا تھا، جس طرح انھیں ایمان کے بعد جانتا ہے۔ اللہ اظہار سے قبل

جانتا ہے کہ وہ عنقریب واضح اور نمایاں ہو جائیں گے جب وہ اپنے علم کا اظہار کریں گے واضح اور نمایاں ہو جائیں گے۔ تغیر معلوم میں حاصل ہوگا نہ کہ عالم میں جس طرح ہم میں سے کوئی ایک آنے والے کل کے متعلق جانتا ہے، اس معنی میں کہ عنقریب آنے والا ہے جب وہ آتا ہے تو اس کے آنے کے بارے میں جان لیتا ہے اور اس کے دن ہونے کے متعلق جان لیتا ہے نہ کہ آنے والے دن کے لیے اور جب (دن) گذر جاتا ہے اس کے گذرے ہوئے دن کے متعلق جان لیتا ہے نہ کہ موجودہ دن کے متعلق، نہ ہی آنے والے دن کے لیے اس طرح تغیر وتبدیلی ظاہر میں واقع ہوتی ہے نہ کہ عالم میں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں تا کہ اللہ اولیاء کے متعلق جان لے جو صاحبان ایمان ہیں۔ خدا نے علم کی نسبت اپنی جانب دی ہے تا کہ اسے اور عظیم بنادے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں تا کہ صبر کرنے والے کے صبر سے، بے صبری کرنے والے کی بے صبری سے اور ایمان لانے والے کے ایمان سے معلوم ظاہر ہو جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: تا کہ اخلاص اور نفاق میں سے معلوم ظاہر ہو جائے یعنی اللہ مومن و منافق کو جان لے، ایک کا ذکر کرنے سے دوسرے کا ذکر کرنے سے مستغنی ہو گیا۔

وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ (اور وہ تم میں سے حقانیت کے گواہ بنانا چاہتا ہے) اس کے مراد میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: تا کہ اُحد میں شہید ہونے والوں کا شہادت کے ذریعہ احترام واکرام کرے۔ یہ حسن، قتادہ اور ابن اسحاق سے مروی ہے۔

دوم: تا کہ تمھیں لوگوں پر گواہ قرار دے جن میں سے گناہ گار بھی موجود ہیں چونکہ تمھارے لیے (شہادت) میں جلالت قدر اور عظیم مرتبہ ہے۔ شہداء شاہد کی جمع ہے اور شہید کی بھی جمع ہے۔ ابو علی الجبائی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: شہداء (گواہ) کا یہ نام اس لیے قرار پایا کہ وہ ان اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کی وہ گواہی دیتے ہیں البتہ جمع میں شہید کی جمع شہداء تو اس لئے کہ انھوں نے میدان جنگ میں اپنی جان دے دی اور فرار نہیں کیا۔

ارشاد الٰہی: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ (اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا) اس کے معنی واضح ہیں اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس بات کی وضاحت فرما دی ہے کہ ظالموں کے لیے اللہ کی محبت ممکن نہیں ہے لیکن ایک معنی میں سے کسی ایک معنی کے لیے جن کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ مومنین کے گناہوں کو برطرف

کردے جیسا کہ بعد میں ارشاد ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾
اس آزمائش کے ذریعے اللہ مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کرنا چاہتا ہے۔(۱۴۱)

الفاظ و معانی:

اَلتَّمْحِيْص کے حقیقی معنی اَلتَّخْلِيْص، خالص کرنے کے ہیں۔ خلیل نے کہا ہے: اَلْمَحْص یعنی عیب سے خالص ہونا۔ اس طرح کہا جاتا ہے: اَللّٰهُمَّ مَحِّصْ عَنَّا ذُنُوْبَنَا پروردگارا! ہمارے گناہ دور کردے (مٹادے) اس لیے کہ برائیوں کو ڈھانپ کر نیکیوں کو خالص کیا جاتا ہے۔

اَلْمَحْق یعنی کسی چیز کا رفتہ رفتہ ختم کرنا۔

اَلْمِحَاق یعنی آخر ماہ چونکہ اس وقت میں ہلال کی روشنی رفتہ رفتہ ختم ہوجاتی ہے۔

تفسیر:

صاحبان ایمان کا امتحان

پھر خداوند عالم نے زمانے کے نشیب و فراز کو لوگوں کے درمیان گردش دینے کی مصلحت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اس آزمائش کے ذریعے اللہ مومنوں کو الگ چھانٹے) آیت کے معنی میں متعدد اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ یعنی تاکہ اللہ صاحبان ایمان کی آزمائش کرے وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ اور کافروں کو کم کرے۔ یہ ابن عباس، مجاہد اور سدی سے مروی ہے۔

دوم: تاکہ اللہ مومنین کو گناہوں سے نجات بخشے انھیں (گناہوں) سے پاک قرار دے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

سوم: اللہ صاحبان ایمان کو ابتلا اور آزمائش کے ذریعہ گناہوں سے نجات بخشتا ہے اور کافروں کو آزمائش کے وقت گناہوں کے باعث ہلاک کرتا ہے۔ یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے۔

تمحیص (چھانٹنا اور جدا کرنا) اور محق (برباد کرنا) کے درمیان تقابل کیا ہے اس لیے کہ مومنین کو ان کے گناہوں کو بخش کر خالص بنانا خود کافروں کو ہلاک کر کے آہستہ آہستہ ختم کرنے جیسا ہے۔ یہ معنی میں مقابلہ ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ خداوند عالم لوگوں کے درمیان (الٹ پلٹ) کرتا ہے تا کہ مومنین کے گناہوں کو برطرف کرے اور کافروں کو برباد کرے۔ مومنین کا چھانٹنا (دنوں کی) الٹ پلٹ کے ذریعہ دو چیزوں کے باعث ہے:

اول: انھیں چھوڑ دینا اور ان پر کافروں کو تمکن دینا ان کے صبر کی آزمائش ہے جس کے ذریعہ وہ اجر عظیم کے مستحق قرار پائیں اور ان سے بیشتر گناہوں کا بوجھ دور ہو جائے۔

دوم: اس کام میں ان کے لیے لطف ہے جو انھیں گناہوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔

❁❁❁❁❁

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ فَقَدۡ رَاَيۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۴۳﴾

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ جائزہ نہیں لیا کہ تم میں کون لوگ جہاد کرنے والے ہیں اور کون اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ (۱۴۲) تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی لو اب تمھارے سامنے آگئی اور تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ (۱۴۳)

الفاظ و معانی:

تمنّی (تمنا) اور ارادہ کے درمیان فرق ہے: ارادہ افعال قلوب میں سے ہے۔ تمنّی قائل کا اس طرح کہنا ہے: لَيۡتَ كَانَ كَذَا يَالَيۡتَ لَمۡ يَكُنۡ (کاش اس طرح ہوتا یا کاش اس طرح نہ ہوتا) کہا گیا ہے کہ تمنّی قلب میں ایک مقصود و مراد ہے جو اس قول کے مطابق ہے۔ صحیح پہلا قول ہے۔

ترکیب:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ میں اَمۡ منقطع ہے۔ اس کی تقدیر بَلۡ اَحَسِبۡتُمۡ ہے اور یہ انکار کی صورت میں استفہام ہے۔ (یعنی استفہام انکاری ہے)

لَمۡ اور لَمَّا کے درمیان فرق یہ ہے کہ لَمَّا قائل کے اس کلام کا جواب ہے کہ قَدۡ فَعَلَ فُلَانٌ۔ فلاں شخص نے ایسا کیا ہے اور اس سے وہ حال کا ارادہ کرتا ہے اور جب کہتا ہے کہ فَعَلَ فُلَانٌ یعنی فلاں نے انجام دیا تو اس کا جواب لَمۡ یَفۡعَلۡ ہے۔

لَمَّا کی اصل لَمۡ ہے ایک حرف کے ذریعہ اس کی تاکید لائی گئی ہے تو لَمَّا کے جواب میں بھی ایک حرف کے ذریعہ تاکید لائی گئی ہے۔

وَیَعۡلَمَ الصَّابِرِیۡنَ، عطف سے انصراف کی بنا پر منصوب ہے اس لئے کہ ثانی اور اول کی نفی کے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ ثانی اور اول کے اجتماع کی نفی ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: وَ اَنۡ یَّعۡلَمَ ۔ پس یَعۡلَمَ اَنۡ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مراد یہ ہے کہ جہاد کا علم اور صابرین کے صبر کا علم ابھی واقع اور حاصل نہیں ہوا ہے۔

حسن سے مروی ہے کہ انھوں نے وَیَعۡلَمِ الصابرین (میم کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے اول (لَمَّا یَعۡلَمِ) پر عطف کرتے ہوئے۔

تفسیر:

جنت میں داخلہ اتنا آسان نہیں!

خداوند عالم نے جہاد پر (لوگوں کو) آمادہ کیا اور انھیں اس طرف رغبت دلائی، بیان میں اضافہ فرمایا اور بتا دیا کہ جنت آزمائش اور امتحان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اس کے بعد ارشاد فرمایا: اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ (کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے؟) اس سے انکار مراد ہے یعنی اے صاحبان ایمان! کیا تمھارا گمان ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ (حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ جائزہ

نہیں لیا کہ تم میں کون لوگ جہاد کرنے والے ہیں اور کون اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں) یعنی جب تک تم میں سے مجاہدین جہاد نہ کرلیں اور اللہ ان کے جہاد کو دیکھ نہ لے، تم میں سے صبر کرنے والے صبر نہ کرلیں اس وقت اللہ جہاد پر ان کے صبر کو جانے گا اور ممکن ہے کہ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ ایک معنیٰ کے لحاظ سے جہاد کی نفی ہو نہ کہ علم کی اس لئے کہ اس فقرہ میں ان کے جہاد کے نہ ہونے کے سلسلہ میں ایجاز و اختصار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جہاد ہوتا تو خدا ضرور جانتا۔ اس کی تقدیر یوں ہے: جب جہاد کے متعلق معلوم نہیں ہے جسے تم پر واجب کیا ہے۔ اس لیے کہ معنی واضح ہے اس میں اشتباہ نہیں ہے۔ وَلَقَدْ كُنْتُمْ (تم تو) اے اصحاب محمد! تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ (موت کی تمنائیں کر رہے تھے) در اصل تَتَمَنَّوْنَ تھا، ایک تاء کو تخفیف کے باعث حذف کر دیا گیا۔ ماجرا یہ ہے کہ جو لوگ جنگ بدر میں شرکت کرنے سے رہ گئے تھے وہ لوگ بدر کے بعد اُحد سے قبل شہادت کے ذریعہ موت کی تمنا کر رہے تھے جب انھوں نے احد کے روز اس (موت کو) دیکھا تو ان میں سے بیشتر نے منہ موڑ لیا لہٰذا انھوں نے شکست کھائی جس پر اللہ نے ان کی سرزنش فرمائی۔ یہ حسن، مجاہد، ربیع، قتادہ سے مروی ہے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ (مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی لو اب تمھارے سامنے آگئی) تَلْقَوْهُ اور رَاَيْتُمُوْهُ کی ضمیر ہُ' موت کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی قبل اس کے کہ تم موت کے اسباب سے ملاقات کرتے جو کہ جنگ ہے جسے تم نے دیکھا ہے اس لیے کہ موت نظر آنے والی چیز نہیں ہے جیسا کہ شاعر کا شعر ہے: وَالْمَوْتُ تَحْتَ لِوَآءِ اٰلِ مَلْحَمِ موت یعنی اسباب موت؛ آل ملحم کے پرچم تلے ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر ھا جہاد کی طرف پلٹ رہی ہے۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (اور تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا) کہا گیا ہے یہ رویت (یعنی دیکھنے) کی تاکید ہے جس طرح کہا جاتا ہے میں نے اسے عینی طور پر دیکھا یعنی میں نے اسے بچشم خود دیکھا، اسے میں نے اپنے کانوں سے سنا، یہ اس لیے ہے تاکہ رؤیتِ قلب (دل سے دیکھنے) اور علم کے سننے کا توہم پیدا نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے مراد یہ ہے کہ تم اس بارے میں حال کی امید کر رہے تھے یہ کس طرح ہے۔ اس اعتبار سے نظر فکر کے معنی میں ہوگی۔ یہ بھی کہا گیا ہے، مراد یہ ہے کہ تم محمدؐ کو دیکھ رہے تھے، اس میں حذف ہے اور وہ یہ ہے کہ فَلِمَ انْهَزَمْتُمْ تم کس طرح شکست کھا گئے، یہ عتاب کا مقام ہے۔ اگر یہ کہا جائے کس

طرح مومنین اس بات کی تمنا کر رہے تھے کہ مشرکین انھیں قتل کر دیں تا کہ وہ درجہ شہادت پر فائز ہو جائے کیا مومنین کا اس طرح تمنا کرنا جائز ہے؟ تو ہم جواب دیتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے اس لیے کہ مشرکین کا انھیں قتل کرنا معصیت و گناہ ہے اور معصیت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے، جس طرح معصیت کا ارادہ جائز نہیں ہے، نہ ہی اس کا حکم کرنا جائز ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی تو وہ جہاد پر صبر کے ذریعہ تمنائے موت کر رہے تھے تا کہ انھیں شہادت نصیب ہو (تا کہ وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوں)

❀❀❀❀❀

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس اللہ کے رسول ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو بھی الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔ (۱۴۴)

الفاظ و معانی:

اسم مُحَمَّدٌ کو اَلْحَمْدُ سے مشتق ہے۔ اَلتَّحْمِیْدُ، اَلْحَمْدُ سے بلند ہے جس کے معنی تمام تعریفات کا شامل ہونا ہے چونکہ تَحْمِیْدُ کمال پر مسلط ہوئے بغیر اسے لازمی قرار نہیں دیتا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو ناموں کے ذریعہ محترم قرار دیا ہے جن دونوں ناموں کو اس نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے اور نام وہ مُحَمَّدٌ اور اَحْمَدُ ہیں جس کی طرف حسان بن ثابت نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

نَبِیٌّ اَتَانَا بَعْدَ یَأْسٍ وَّ فَتْرَةٍ مِنَ الدِّیْنِ وَالْاَوْثَانُ فِی الْاَرْضِ تُعْبَدُ

(زحمت و مشقت بھرے عرصہ اور ایک فاصلہ کے بعد اللہ نے ہمارے پاس پیغمبر کو بھیجا جو دین کا پیغام لے کر آئے اس وقت جبکہ زمین پر بت پرستی عام تھی)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَ عَبْدَهٗ بُرْهَانَهٗ وَاللّٰهُ اَعْلٰى وَ اَمْجَدُ

(کیا تم نہیں دیکھتے اللہ نے اپنے بندے (محمدؐ) کو برہان و دلیل اور معجزے کے ساتھ بھیجا ہے وہ اللہ بزرگ و بلند ترین ہستی ہے)

وَ شَقَّ لَهٗ مِنِ اسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ　　فَذُوالْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَ هٰذَا مُحَمَّدٗ

(اللہ نے پیغمبرؐ کے اسم گرامی کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے چنانچہ یہ وہ صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں)۔[1]

ترکیب:

حرف استفہام (ہمزہ) حرف شرط (اِنْ) پر داخل ہوا ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: اَتَنْقَلِبُوْنَ اِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ۔ اس لئے کہ شرط جب اس کے ذریعہ منعقد ہو جائے تو ایک جملہ اور ایک خبر بن جائے گا۔ پھر ذکر میں اسم کے فعل پر مقدم ہونے کے مانند ہو جائے گا۔ کہا گیا ہے: أَزَيْدٌ قَائِمٌ۔ اسی طرح قسم میں بھی اسم کا مقدم ہونا اور جواب قسم کے بجائے جواب شرط پر اکتفا کرنا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

حَلَفْتُ لَهٗ اِنْ تُدْلِجِ اللَّيْلُ لَا يَزَلْ　　اَمَامَكَ بَيْتٌ مِنْ بُيُوْتِيْ سَائِرُ

شان نزول:

مفسرین نے اس آیت کے شان نزول کو اس طرح بیان کیا ہے: جب یہ خبر عام ہو گئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کر دئے گئے ہیں تو بعض لوگوں نے کہا: اگر آپ پیغمبر ہوتے تو قتل نہ ہوتے۔ دوسروں نے کہا: جس بات پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاد کر رہے تھے ہم بھی اسی بات پر جہاد کریں گے یہاں تک کہ ہم آپؐ سے ملحق ہو جائیں۔ ان میں سے بعض مرتد ہو گئے تھے اور بعض نے جہاد میں جمے رہنے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ ان لوگوں کے شکست کھانے اور کمزور پڑنے کا سبب تیراندازوں کا اپنے مقام (گھاٹی) سے ہٹنا تھا جہاں سے ہٹنے سے پیغمبرؐ نے لوگوں کو منع فرمایا تھا اور عبد اللہ بن جبیر کو پچاس تیراندازوں کے ہمراہ حکم فرمایا تھا کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹنا جب تک تم اپنی جگہ پر ثابت قدم رہو گے ہم غالب اور کامیاب رہیں گے۔ خالد بن ولید قریش کے ہمراہ

---

[1] یہ شعر حضرت ابو طالبؑ کے ایک مشہور قصیدۂ لامیہ کا ہے جس قصیدہ میں آپ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیشتر اوصاف بیان فرمائے ہیں آپ کے انھیں اشعار کو علما اور مناظرین حضرات ایمان ابو طالب پر ہونے والے اعتراض کی رد میں آپ کے ایمان کے ثبوت میں پیش کرتے رہے ہیں)

دائیں جانب سے اور بائیں جانب سے عکرمہ بن ابوجہل آیا جن کے ہمراہ ڈھول بجاتی ہوئی عورتیں تھیں جو یہ اشعار گارہی تھیں:

نَحنُ بَنَاتُ طَارِقٍ نَمشِیْ عَلَی النَّمَارِقِ اِن تُقبِلُوا نُعَانِقِ اَو تُدبِرُوا نُفَارِقُ
فِرَاقَ غَیرَ وَامِقِ

ہم ستارۂ طارق کی بیٹیاں ہیں، ہم مخمل پر چلتے ہیں۔ اگر تم آگے بڑھے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گے اور اگر پیچھے ہٹے تو تم سے دور ہو جائیں گے، ایسی دوری کہ پھر ملنا نہ ہوگا۔

ابو عامر، عمرو بن صیفی کا غلام تھا جس سے مسلمانوں کی احابیش مقام پر جنگ ہوئی، اسی طرح مکہ کے غلاموں سے شدید جنگ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس تلوار کو کما حقہ کون لے گا اور اس سے دشمنوں اور غلاموں کو قتل کرے گا یہاں تک کہ تلوار ٹیڑھی ہو جائے۔ ابودجانہ سماک بن خرشہ انصاری نے وہ تلوار لے لی تلوار لیکر اپنے سر سے سرخ عمامہ باندھا اور فخریہ یہ اشعار پڑھے:

اَنَا الَّذِیْ عَاهَدَنِیْ خَلِیْلِیْ اَن لَّا اُقِیْمَ الدَّهرَ فِی الْکُیُوْلِ
اَضْرِبُ بِسَیْفِ اللهِ وَالرَّسُوْلِ

میں وہ ہوں کہ مجھ سے میرے خلیل نے عہد لے رکھا ہے کہ دشمن کی آخری صف تک کو نہ چھوڑوں۔ میں اللہ اور رسول کی تلوار سے جنگ کر رہا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ ایسی چال ڈھال ہے جسے اللہ اور اس کا رسول ناپسند کرتے ہیں بجز اس مقام کے پھر پیغمبرؐ اور آپ کے اصحاب نے مشرکین پر حملہ کیا اور انھیں شکست دی اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مشرکین کے صاحب پرچمدار کو قتل کر دیا جس کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے۔ اللہ نے مسلمانوں پر اپنی نصرت و مدد نازل فرمائی۔ زبیر نے بیان کیا ہے کہ میں نے ہند اور اس کی سہیلیوں کو پہاڑ پر دوڑتے ہوئے دیکھا جو اپنے غلاموں کو پکار رہی تھیں کہ ان کی حفاظت کریں جب تیراندازوں نے دیکھا کہ دشمن بھاگ گئے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا اور یہ دیکھا کہ آپؐ کے اصحاب مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہیں تو وہ بھی مال غنیمت لوٹنے کے لیے آگے بڑھے ان میں آپس میں اختلاف ہو گیا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی نافرمانی نہ کرو، بعض نے کہا: اب کوئی حکم باقی نہیں رہ گیا ہے۔ پھر سب کے سب لشکر سے ملحق ہو گئے۔ خالد بن ولید نے جب تیراندازوں کی مختصر تعداد اور مسلمانوں کو مال

غنیمت میں مصروف پایا اوران کی پشت کی جگہ کو خالی دیکھا تو مشرکین کو آواز دی اور اصحاب پیغمبرؐ پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور انھیں شکست دے دی۔

عبداللہ بن قمیۃ الحارثی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتھر مارا جس سے آپؐ کی ناک زخمی ہوگئی اور دانت شکستہ ہوگئے، چہرہ بھی زخمی ہوگیا، آپؐ کے اصحاب آپ سے متفرق ہوگئے۔ پھر اس نے آپؐ کو قتل کرنا چاہا اس وقت مصعب بن عمیر نے جو کہ بدر و اُحد میں آپؐ کے علمدار تھے آپؐ کی مدد کی۔ ان کے پرچم کا نام عقاب تھا، یہاں تک کہ مصعب بن عمیر کو قیمۃ نے قتل کر دیا، اس نے خیال کیا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس نے قتل کر دیا ہے چنانچہ اس نے باواز بلند کہنا شروع کیا کہ میں نے محمد کو قتل کر دیا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آواز ابلیس ملعون نے بلند کی تھی، یہ سن کر منافقین نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر محمد قتل کر دیئے گئے ہیں تو اپنے گذشتہ دین کی طرف پلٹ جاؤ! انس بن مالک کے چچا انس بن نضر نے کہا: اے لوگو! اگر محمد قتل کر دیئے گئے، پس اگر محمد قتل نہ کیے جاتے تو تم اپنی زندگی میں کیا کرتے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد؟ لہٰذا تم بھی اسی بات پر جہاد کرو جس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد کیا ہے۔ تم بھی اسی طرح شہید ہو جاؤ جس طرح وہ شہید ہوئے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا: پروردگار جو بات یہ مسلمان کہہ رہے ہیں میں اس سے تیرے حضور معذرت کا طالب ہوں اور جس بات کو یہ منافقین پیش کر رہے ہیں میں تیرے حضور اس سے برأت چاہتا ہوں۔ پھر انھوں نے تلوار بلند کی اور جہاد میں مصروف ہوگئے یہاں تک کہ جام شہادت نوش کر لیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پتھر پر بلند ہو کر باواز بلند لوگوں کو آواز دی۔ کعب بن مالک نے سب سے پہلے رسول اللہ کو پہچانا۔ وہ کہتا ہے میں نے خود کے نیچے آپؐ کی روشن آنکھوں سے پہچانا اور باواز بلند کہا: اے گروہ مسلمین تمھیں بشارت ہو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہاں موجود ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ فرمایا۔

آپؐ کے اصحاب کی ایک جماعت آپؐ کے گرد جمع ہوگئی، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے فرار کرنے پر ملامت فرمائی، انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم ہمارے باپ دادا اور ہماری مائیں آپؐ پر قربان ہو جائیں ہمیں خبر ملی تھی آپ قتل کر دیئے گئے ہیں تو ہمارے دلوں پر خوف طاری ہوگیا لہٰذا ہم واپس پلٹ گئے (اس وقت) اللہ نے آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ نازل فرمائی۔

تفسیر:

شخصیت پرستی ممنوع ہے

اس آیت میں خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ امر الٰہی کو ترک نہیں کیا جا سکتا چاہے پیغمبر لوگوں کے ساتھ موجود ہوں یا موجود نہ ہوں: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو بس اللہ کے رسول ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں) یعنی محمدؐ بشر ہیں جنھیں اللہ نے اپنی مخلوق پر رسالت کے لیے منتخب کیا ہے، آپؐ سے پہلے بھی پیغمبر گذر چکے ہیں اور انھوں نے اللہ کے پیغام کو پہونچایا اور دنیا سے رخصت ہو گئے، جن میں سے بعض قتل کر دیئے گئے۔ محمدؐ کو بھی موت آئے گی، جس طرح آپؐ سے پہلے والوں کو موت آچکی ہے۔ آپؐ کے لیے نہ تو موت ناممکن ہے، نہ ہی شہید ہونا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کی موت اور قتل کے وقت ان کے اصحاب مرتد نہیں ہوئے تھے تم لوگ بھی انھیں کی پیروی کرو۔

پھر اسی بات کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟) یعنی اگر پیغمبرؐ کو اللہ موت دے دے یا کفار قتل کر دیں کیا تم اپنے ایمان کے بعد کفر کی حالت پر پلٹ جاؤ گے۔ ارتداد (مرتد ہونا) کو پیچھے پلٹنا کہا ہے اور وہ الٹے پیروں واپس ہونا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرتد ہونا بدترین دین کی طرف جانا ہے۔ اسی طرح انقلاب بدترین روش و رفتار کی طرف نکلنا ہے (یعنی بدترین چال چلنا ہے)۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ میں ہمزہ انکار والا ہے اس کی شکل استفہام والی ہے وہ اس جملہ کے مانند ہے: اَتَخْتَارُ الْفَسَادَ عَلَى الصَّلَاحِ وَ الْخَطَأَ عَلَى الصَّوَابِ یعنی تم بگاڑ کو سدھار پر اور غلط کو صحیح پر چنتے ہو؟!

ارشاد: مَّاتَ اَوْ قُتِلَ میں اس بات پر دلالت ہے کہ موت قتل (شہادت) کے علاوہ ہے اس لیے کہ کسی چیز کہ خود اسی پر عطف نہیں کیا جاتا۔ قتل زندگی کی بنیاد اور اساس میں نقص کا وارد ہونا ہے، جبکہ موت اس اساس اور بنیاد کا فاسد ہونا ہے جس کی زندگی محتاج ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ موت ایک ایسا معنی ہے جو زندگی کی ضد ہے۔ پہلا قول درست ہے۔ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ (یاد رکھو جو بھی الٹا پھرے گا) یعنی جو اپنے دین سے مرتد ہو جائے گا۔ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا (وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا) اس لیے کہ اللہ کو نقصان پہونچانا ممکن ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کو نقصان پہونچانا خود (بندہ کی) طرف پلٹتا ہے اس لیے کہ اللہ کو ضرر و نقصان

پہونچانے والا دائمی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

وَسَيَجۡزِي ٱللَّهُ ٱلشَّٰكِرِينَ (البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا) یعنی خداوند عالم اپنی نعمت کا شکر ادا کرنے اور اعتراف کرنے والوں کو ان کے شکر کا ثواب عطا کرے گا۔ کہا گیا ہے کہ شاکرین سے اطاعت کرنے والے مراد ہیں؟ اس لیے کہ اطاعت شکر الٰہی ہے اس کی نعمتوں پر۔ یہ اپنے ماقبل سے متصل ہے جو وعد کا وعید سے کا اتصال ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا ارشاد: فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيۡـًٔا وعید کے معنی پر دلیل ہے گویا ارشاد ہو رہا ہے جو مرتد ہو جائے گا اس کا ضرر ونقصان اسی کی طرف پلٹے گا اور جو شکر کرے گا اور ایمان لائے گا اس کا نفع اسی کی طرف پلٹے گا۔

اسم محمدؐ کے متعلق فصل

کفار قریش 'مذمّم' کہہ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم مبارک کا قصد کرتے اور سب وشتم کرتے تھے۔ ابو ہریرہ نے پیغمبرؐ سے روایت کی ہے آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے نہیں دیکھا خداوند عالم نے قریش کی لعنت اور ان کی سب وشتم کو مجھ سے کس طرح پلٹا دیا کہ وہ مذمّم کہہ کر مجھے سب وشتم کرتے تھے جبکہ میں محمد ہوں۔

امام رضا علیہ السلام کی مسند روایت میں جسے آپؑ نے اپنے آباء واجداد کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جب تم اپنے فرزند کا نام محمد رکھو تو اس کا احترام کرو نشست میں اس کے لیے۔ کشائش ووسعت دو اس کے چہرے کی برائی نہ کرو۔ جو قوم اور جماعت مشورہ کرے اور ان کے درمیان محمد یا احمد نام کا کوئی شخص ہو جو اسے اپنے مشورہ میں داخل کرے گی، اسے خیر اور بہتری حاصل ہوگی اور جو دسترخوان بھی بچھایا جائے اور اس پر محمد یا احمد نام کا شخص موجود ہوگا تو وہ مکان دن میں دو مرتبہ پاک اور مقدس کیا جائے گا۔

انس ابن مالک سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار میں تھے۔ ایک شخص نے آپؐ کو یا اباالقاسم! کہہ کر پکارا، آپؐ اس کی جانب متوجہ ہوئے، اس نے کہا: میں نے آپ کو پکارا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے میرے نام سے پکارو! کنیت کے ذریعہ نہیں۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میرے نام اور میری کنیت کو

جمع نہ کرو، میں ابوالقاسم ہوں، اللہ عطا کرتا ہے میں تقسیم کرتا ہوں، پھر اس میں (نام اور کنیت جمع کرنے میں) علی اور اولاد علیؑ کو اجازت دی گئی ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں: مجھ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمھارے یہاں ایک فرزند ہوگا جس کا نام میرا نام اور کنیت میری کنیت ہوگی۔

❀❀❀❀❀

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾
کوئی ذی روح اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں مرسکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا اور مقرر ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اسے ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے لیے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ (۱۴۵)

ترکیب:

کِتٰبًا فعل محذوف کہ جس پر جملہ دلالت کررہا ہے اس کا مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اس علم و یقین کے ساتھ کہ جو کچھ ہورہا ہے، خدا نے اسے لکھ رکھا ہے۔ پس اس کی تقدیر: كَتَبَ اللّٰهُ ذٰلِكَ كِتٰبًا ہے۔

اخفش نے کہا: وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ میں لام جہاں پر داخل ہوا تھا وہاں سے ہٹا کر نفس پر لایا گیا ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: وَمَا كَانَ لَنَفْسٍ لِتَمُوْتَ یعنی لَاَنْ تَمُوْتَ۔

تفسیر:

موت، اذن پروردگار سے

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی ذی روح اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں مرسکتا،

اسی کے مانند یہ آیت ہے کہ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ یعنی اللہ اپنے لیے فرزند قرار نہیں دیتا ارشاد: وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا یعنی تم درخت نہیں اُگا سکتے ہو اس لیے کہ درخت اگانا انسانی قدرت و طاقت میں داخل نہیں ہے۔ اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ موت اذن خدا کے بغیر واقع نہیں ہو سکتی، اس میں تسلی اور اطمینان دلایا گیا ہے، اس چیز سے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے لوگوں پر وارد ہو گی، اس اعتبار سے کہ وہ اذن خدا سے ہو گی۔ مراد یہ ہے کہ اگر پیغمبر ﷺ کی وفات ہو گی تو اذن خدا اور علم خدا سے دیگر افراد کی طرح ہو گی۔ کسی شخص کے لیے آپ کی موت کے بعد دین ترک کرنے کا عذر نہیں ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس میں جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے اس طرح کہ اذن خدا کے بغیر کوئی نہیں مر سکتا یعنی قتل کے خوف سے جہاد ترک نہ کرو اس لیے کہ تمھارا یہ عمل جو موت آچکی ہے اسے ٹال نہیں سکتا، نہ ہی جہاد اس موت کو پہلے لا سکتا ہے جو ابھی نہیں آئی ہے۔ لہٰذا فرار اختیار کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

ارشاد: بِاِذْنِ اللّٰهِ میں دو امر کا احتمال ہے:

اول: علم خدا سے۔

دوم: امر الٰہی سے۔

ابو علی الجبائی نے کہا ہے کہ آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ موت پر خدا کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا جس طرح اس کی ضد حیات پر خدا کے علاوہ کوئی دوسرا قادر نہیں ہے اگر وہ غیر خدا کے اختیار میں ہوتی تو خدا کے اذن سے نہ ہوتی۔

ارشاد: كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (موت کا وقت تو لکھا ہوا اور مقرّر ہے۔) یعنی خداوند عالم نے ہر ذی حیات کے لیے اس کی حیات اور موت کا وقت معین و مقرر کر دیا ہے نہ اس سے پہلے آسکتی ہے، نہ ہی اس میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حتمی وقت اور اٹل حکم مقرر کر دیا ہے۔ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اسے ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے لیے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا) اس بارے میں متعدد اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: اس سے مراد یہ ہے کہ جو دنیا کے لیے عمل کرتا ہے تو ہم نے دنیا میں اس کے لیے جو حصہ معین کیا ہے اس سے محروم نہیں کرتے البتہ آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ یہ ابن اسحاق سے مروی ہے

یعنی وہ دنیا میں اپنی حالت سے فریب میں مبتلا نہ ہو۔

دوم: جو شخص جہاد کے ذریعہ دنیاوی ثواب چاہتا ہے مال غنیمت سے جو اس کا حصہ ہے ہم اسے عطا کریں گے۔ اس کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے دنیا کا حصول انسان کے لیے رشک کا مقام نہیں ہے اس لیے کہ دنیا تو نیک اور بد دونوں ہی کو ملتی ہے۔ یہ ابو علی الجبائی کا قول ہے۔

سوم: جو شخص مستحبات کو انجام دے کر اور گناہان کبیرہ میں پڑ کر دنیاوی اجر چاہتا ہے اسے جزا اور بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جائے گا آخرت میں نہیں چونکہ اس کے اعمال اس کے فسق کے باعث بے کار اور برباد ہو جائیں گے۔ یہ قول اس شخص کے نظریہ کے مطابق ہے جو حبط اعمال (اعمال کے اکارت اور بربادی) کا قائل ہے۔ وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا یعنی جو شخص جہاد اور اپنے اعمال سے ثواب آخرت کا خواہاں ہوتا ہے ہم اسے آخرت کا ثواب عطا کریں گے۔ لہٰذا کسی کے لیے اپنی اطاعت کے ذریعہ خدا کے ثواب کے علاوہ کچھ اور چاہنا اور طلب کرنا مناسب نہیں ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: مَن كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِي حَرْثِهٖ (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۰؛ جو انسان آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لئے اضافہ کر دیتے ہیں) (آیت) اسی سے ملتا ہوا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص آخرت کے عمل کے ذریعہ دنیا چاہتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے مِنْهَا میں لفظ 'مِنْ' احتمال ہے کہ زائدہ ہو۔ نیز یہ بھی احتمال ہے تبعیض (بعضیت) کے لیے ہو اس لیے کہ انسان اپنے عمل کے مطابق ہی ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ یعنی اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کے شکر کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس فقرہ کی تکرار میں دو اقوال ہیں:

اول: یہ فقرہ شاکرین کے بلند درجہ اور عظیم منزلت پر تاکید و اعلان ہے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ ہم عنقریب شکر کرنے والوں کو دنیا میں رزق کی جزا عطا کریں گے تاکہ یہ توہم پیدا نہ ہو کہ کافر کو دنیا میں جو نعمت عطا کی جاتی ہے شکر کرنے والا اس سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ ابان بن عثمان نے امام محمد باقرؑ کے واسطہ سے روایت کی ہے کہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں: جنگ اُحد میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کو ساٹھ زخم لگے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام سلیم وام عطیہ کو حکم دیا کہ وہ علیؑ کا علاج معالجہ کریں۔ دونوں بیان کرتی ہیں کہ ہم جس زخم کا بھی علاج کرتے دوسرا زخم اور شگاف ظاہر ہو جاتا (کھل جاتا تھا) جس سے ہم علیؑ کے بارے میں ڈر گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تشریف لائے، مسلمان حضرت علی علیہ السلام کی عیادت میں مصروف تھے فقط ایک زخم تھا جسے پیغمبرؐ اپنے ہاتھ سے مس کرتے (ہاتھ پھیرتے) جاتے اور فرماتے: جو شخص خدا کی محبت میں یہ زخم کھائے اس کا عذر قابل قبول ہے جیسے ہی اللہ کے رسولؐ نے زخم کو مس کیا زخم مندمل ہو گیا۔ علی علیہ السلام نے فرمایا: الحمد للہ نہ تو میں نے فرار کیا اور نہ ہی الٹے پیروں واپس پھرا۔

اللہ نے آپ کا دو مرتبہ شکر ادا کیا (یعنی آپؑ کے عمل کی قدر کی) جو قرآن کے دو مقامات پر ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: سَیَجۡزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیۡنَ یعنی اللہ دنیا میں روزی کے ذریعہ شاکرین کو جزا دے گا، و سَنَجۡزِی الشّٰكِرِیۡنَ۔

ابو علی الجبائی نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے انسان کی ایک ہی اجل ہے اور وہ وہ وقت ہے جس میں وہ مرتا ہے اس لیے کہ وہ قتل (شہادت) کے سبب اس مدت سے منقطع نہیں ہوتا جس کے متعلق اللہ نے خبر دی ہے کہ وہ اس کی موت کا وقت ہے۔ ابن الاخشید نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے کہ انسان کی دو مدتیں ہیں: ایک وہ وقت جس میں اسے حتمی طور پر مرنا ہے اور ایک وہ وقت جو اللہ کا عطیہ ہے اس کے باوجود بھی وہ نہیں مرتا مگر اس وقت اور مدت میں جسے اللہ نے اس کی موت کا وقت قرار دیا ہے۔ پہلا قول زیادہ قوی ہے۔

نظم:

ارشاد الٰہی وَمَا كَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ اپنے ماقبل سے مربوط ہے اس لیے کہ اللہ نے جہاد پر آمادہ کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں کے لیے تسلی ہے کہ جن پر پیغمبرؐ کی موت سے صدمہ اور غم پہونچا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں اس بات کا بیان اور وضاحت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے ان کے فریضہ میں مختلف نہیں ہوتی ہے لہٰذا آپ کے حکم سے تمسک و وابستگی آپ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی ضروری ہے۔

❁❁❁❁❁

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ‌ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۴۸﴾

اس سے پہلے بہت سے ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر خدا پرستوں نے جنگ وجدال میں حصّہ لیا۔ اللہ کی راہ میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں ان سے وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے، نہ انھوں نے کم زوری دکھائی اور نہ ہی وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔ اللہ ایسے ہی صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(۱۴۶) ان کی دعا تو بس یہ تھی کہ پروردگارا! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، اپنے امور میں اگر ہم نے حد سے تجاوز کیا ہو تو اسے معاف کر دے، ہمیں ثابت قدم رکھ، اور کافروں کے خلاف ہماری مدد کر۔(۱۴۷) آخر کار اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا اور اللہ تو ایسے ہی نیک عمل انجام دینے والوں کو پسند کرتا ہے۔(۱۴۸)

قرائت:

ابن کثیر نے كَآئِن پڑھا ہے، كَاعِن کے وزن پر اور ابو جعفر نے ہمزہ میں لین کیا ہے اور یہی حسن کی بھی قرائت ہے۔ باقی قراء نے كَاَيِّن پڑھا ہے، كَعَيِّن کے وزن پر۔

اہل بصرہ، ابن کثیر اور نافع نے قُتِلَ پڑھا ہے، قاف کے ضمہ کے ساتھ اور الف کے بغیر اور یہی ابن عباس کی قرائت ہے اور باقی قراء نے قَاتَلَ پڑھا ہے، الف کے ساتھ اور یہی ابن سعود کی قرائت ہے۔

حجت:

کَائِن کی اصل اَیٌّ ہے کہ اس پر کاف تشبیہ داخل ہو گیا ہے۔ جس طرح کَذا کے ذَا پر اور کَاَنَّ کے اَنَّ پر داخل ہوا ہے اور اس کلمہ کا استعمال زیادہ ہے۔ پس وہ کلمہ واحدہ کے مانند ہو گیا ہے اور اسے ایک کلمہ میں تبدیل کر دیا گیا تو کَیّاَنِ یاء ثانیہ کو حذف کر دیا گیا جس طرح کَیْنُوْنَة میں حذف کر دیا گیا ہے۔ تو کَیَّان پر وزن کَیْعِن ہو گیا۔ پھر یاء کو الف سے بدل دیا گیا۔ جیسے طائی میں بدل دیا گیا پس وہ کَائِن ہو گیا۔ پھر ابو جعفر کی قرائت کے مطابق ہمزہ میں لین کر دیا گیا۔ شاعر نے کہا:

وکَائِن رَدَدْنَا عنکُم مِن مُدَجَّجٍ　　　یَجِیْءُ اَمامَ القومِ یُردِی مُقَنَّعا

دوسرے شاعر نے کہا:

وکَائِنَ الیکمَ عادَ مِن راسِ فِئَیَةٍ　　　جُنودًا و امثالُ الْجبالِ کتائبُهٗ

فرزدق کے شعر میں بھی اَیٌّ سے یاء کو حذف کیا گیا ہے:

تنورت نسرًا و السما کین اَیُهما　　　عَلَیَّ مِنَ الغَیْث استهلت مواطِرُهٗ

جہاں تک قُتِلَ کی بات ہے تو ممکن ہے کہ وہ ضمیر نَبِیٍّ کی جانب مسند ہو اور جب وہ اس چیز کی جانب مسند ہو گا تو مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ کے سلسلہ میں دو احتمال پائے جائیں گے:

(۱) وہ نبی کی صفت ہو گا۔ جب آپ اس تقدیر کو فرض کریں گے تو رِبِّیُّوْنَ ظرف کی بنا پر مرفوع ہو گا بلا حذف کے اس لئے کہ ظرف جب اپنے ماقبل پر اعتماد کئے ہو تو سیبویہ کے نزدیک بھی اس مرفوع ہونا جائز ہے۔

(۲) مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ کو آپ صفت قرار نہ دیجئے بلکہ اسے قُتِلَ کی ضمیر کے لئے حال قرار دیجئے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اسم جس کی جانب قُتِلَ مسند ہے وہ رِبِّیُّوْنَ ہو۔ ایسی صورت میں معہ (ظرف) قُتِلَ سے متعلق ہو گا اور اگر حال اور صفت مانا جائے تو مَعَهٗ کا متعلق دراصل مخدوف ہو گا۔

اسی طرح جن قراء نے قَاتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ پڑھا ہے تو اس میں بھی وہی جائز ہے جو قُتِلَ پڑھنے والے کی قرائت میں جائز ہے۔

جن قراء نے قُتِلَ پڑھا ہے ان کی دلیل اَفَاِیْن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ ہے اور جنھوں نے قَاتَلَ پڑھا ہے

توان کی دلیل یہ ہے کہ قاتل (مجاہد) کی بھی تعریف کی گئی ہے اور مقتول کی بھی مدح کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے
:وَقَاتَلُوْا وَ قُتِلُوْا۔

جس نے ارشاد الٰہی: مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ صفت قرار دیا ہے كَاَيِّن جو کہ مبتدا ہے اس کی خبر کو پوشیدہ مانا ہے كَاَيِّن میں کاف جارہ اپنے مجرور سے مل کر مرفوع ہے۔ جس طرح کذا میں کاف مرفوع ہے اس میں تشبیہ کے معنی نہیں ہیں۔ جس طرح کذا میں تشبیہ کے معنی نہیں ہیں۔

الفاظ و معانی:

اَلْوَهْن: ضعف اور کمزوری۔

اَلضُّعْف: طاقت کی کمی۔

اِسْتِكَانَة کی اصل كِيْنَة ہے یعنی بدترین حالت۔

اِسْرَاف: مقدار سے تجاوز کرنا۔ اسی کے معنی میں اِفْرَاط ہے۔ اِسْرَاف کی ضد تَقْتِيْر ہے۔ نیز کہا گیا ہے کہ اِسْرَاف یعنی زیادتی اور کمی کے سبب حق سے باطل کی طرف جانا ہے۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے۔

تفسیر:

گذشتہ دور کے مجاہدین

خداوند عالم نے گذشتہ (بیان) کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ یعنی اس سے پہلے بہت سے ایسے نبی گزرے ہیں) قٰتَلَ (جنگ و جدال میں حصہ لیا) جنگ کی اور قتل کردیے گئے۔ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ (جن کے ساتھ مل کر خدا پرستوں نے) اس کی تقدیر ہم حجت کی بحث میں بیان کر چکے ہیں۔

رِبِّيُّوْن سے مراد کون افراد ہیں اس بارے میں متعدد اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: علماء اور فقہاء ہیں۔ یہ ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔

دوم: جمعیت کثیر ہے۔ یہ مجاہد و قتادہ کا قول ہے۔

سوم: رب کی جانب منسوب ہیں یعنی عبادت کے ذریعہ خدا سے متمسک اور وابستہ ہونے والے ہیں۔ اخفش کا قول ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے کہا: علم پروردگار سے منسوب ہیں۔

چہارم: رِبِّيُّوْنَ دس ہزار تھے، یہ زجاج سے مروی ہے۔ نیز یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔

پنجم: رِبِّيُّوْنَ اتباع کرنے والے ہیں، رَبَّانِيُّوْنَ والی اور حکام ہیں۔ یہ ابن زید سے مروی ہے جس نے قَاتَلَ میں موجود ضمیر کی نسبت لفظ نَبِيٍّ کی جانب دی ہے اس کے نزدیک مراد یہ ہے کہ کتنے پیغمبروں کو قتل کر دیا گیا جن کے ساتھ بڑی جماعت تھی اور ان کے اصحاب نے بعد میں قتال کیا۔

فَمَا وَهَنُوْا (اللہ کی راہ میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں ان سے وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے) اور وہ کمزور نہیں پڑے اور جس نے فعل قَاتَلَ کی نسبت رِبِّيُّوْنَ کی جانب دی ہے، نبیؐ کی طرف نہیں دی ہے تو اس کے نزدیک مراد یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کے راہ خدا میں قتل کیے جانے کے بعد باقی افراد کمزور نہیں پڑے (کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا) اس نظریہ کو حسن نے اختیار کیا ہے، اس لیے کہ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی پیغمبر معرکہ میں شہید نہیں ہوا۔ پہلے نظریہ کو اسحاق وقتادہ، ربیع اور سدی نے اختیار کیا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر مقتول ہوں گے اور ان کے ساتھیوں نے کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خداوند عالم نے وضاحت فرما دی ہے کہ اگر پیغمبرؑ قتل کر دیئے جائیں جیسا کہ جنگ اُحد میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی غلط خبر پھیلا دی گئی تھی تو واجب ولازم ہے کہ (پیغمبرؑ کے ساتھی) نہ تو کمزور پڑیں، نہ ہی اظہار بزدلی کریں جس طرح ماضی میں انبیاء کے قتل پر ان کے ساتھی کمزور نہیں پڑے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کے قتل کے سبب نہ تو کمزور پڑے، نہ ان کے دشمنوں کے سامنے بزدلی دکھائی اور جہاد میں ان پر پڑنے والی مصیبتوں کے سبب اپنے دین سے نہیں پھرے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ فَمَا وَهَنُوْا یعنی انھوں نے دشمن سے جہاد کرنے میں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وَمَا ضَعُفُوْا (نہ انھوں نے کمزوری دکھائی) یعنی کمزوری اور سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وَمَا اسْتَكَانُوْا (اور نہ ہی وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے) یعنی دشمن کے سامنے ذلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (اللہ ایسے ہی صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) یعنی جہاد میں صبر کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔ ابن الانباری نے کہا ہے: یعنی تم پر واجب ہے کہ تم اپنے نبی کے حکم سے قتال کرو اگر وہ قتل کر دیے جائیں جس طرح انبیا کی امتوں نے اپنے انبیاء کے قتل کے بعد قتال کیا اور اپنے دین سے

برگشتہ نہ ہوئے۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا (ان کی دعا تو بس یہ تھی کہ) دشمن سے سامنا کرتے وقت ان کا قول فقط یہی تھا: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا (پروردگارا! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما) یعنی ان کا قول فقط ان کا استغفار تھا یعنی ان کا صرف یہی کہنا تھا کہ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا۔ أَنْ قَالُوا، كَانَ کا اسم ہے اور قَوْلَهُمْ اس کی خبر، ایک قول کی بنا پر ضمیر نبی اور اصحاب کی جانب پلٹ رہی ہے اور دوسرے قول کے مطابق رِبِّيُّونَ کی جانب اِغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا یعنی ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما! ہمارے عذاب اور اس کی جزا کو ترک کر کے (ہمارے گناہوں کو بخش دے)

وَإِسْرَافَنَا فِيْ أَمْرِنَا (اپنے امور میں اگر ہم نے حد سے تجاوز کیا ہو تو اسے معاف کر دے) ہمارے حد سے تجاوز و تفریط اور تقصیر کرنے پر (ہم سے درگذر فرما) خداوند عالم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو رغبت دلائی ہے کہ وہ یہ دعا کریں، کوئی ایسی بات نہ کہیں جو ان کی کمزوری کی دلیل بن جائے (یا ان کی کمزوری کی طرف اشارہ کرے) کہ دشمنوں کو ان میں طمع پیدا ہو جائے۔ وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا (ہمیں ثابت قدم رکھ) دشمنوں سے جہاد میں ہمارے قلوب کو تقویت عطا کر کے اور اس لطف و کرم کے ذریعہ جن سے ثبات قدم پیدا ہوتا ہے اور شکست سے قدم متزلزل نہیں ہوتے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دین پر ثابت و قائم رکھ جس سے ہمارے قدم ثابت رہیں۔ وَانْصُرْنَا دشمن کے مقابلہ میں ہماری نصرت اور مدد فرما! عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (کافروں کے خلاف) کافروں کے قلوب میں رعب پیدا کر کے اور ملائکہ کے ذریعہ ہماری امداد فرما کر!

پھر خداوند عالم نے اس چیز کی وضاحت فرمادی جسے ان کی دعا کے بعد عطا کیا: فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ (آخرکار اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا) یعنی جس چیز کو ان لوگوں نے بیان کیا تھا اللہ نے انھیں وہ چیز عطا کر دی۔ ثَوَابَ الدُّنْيَا (دنیا کا ثواب) اور وہ ان کے دشمن پر ان کی نصرت و مدد ہے یہاں تک کہ وہ ان پر کامیاب ہوئے، ان پر فتح اور غلبہ حاصل کیا اور انھوں نے ان سے مال غنیمت حاصل کیا۔ وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ (اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا) اور آخرت کا بہترین ثواب جو کہ جنت و مغفرت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو چیز انھیں دنیا میں عطا کی گئی وہ فتح و ظفر اور نصرت و مدد ہو اور مال غنیمت کا حاصل کرنا ثواب ہو جس کے وہ اطاعت کے سبب مستحق بنے ہیں، اس میں ان کی تعظیم و تکریم اور جلالت ہے اسی لیے آپ کہتے ہیں: فریضہ کی ادائیگی پر مدح کرنا اور انھیں نیکی سے یاد کرنا بھی ثواب کا ایک حصہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ نے انھیں اپنے

فضل سے عطا کیا ہو، یا یہ کہ اس میں ان کے لیے لطف ہو۔ لطف کو ثواب کہنا مجاز ہے اور ثواب خالص نفع ہے جو تعظیم اور عظمت سے وابستہ ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ تو ایسے ہی نیک عمل انجام دینے والوں کو پسند کرتا ہے) اللہ اقوال اور افعال کے ذریعہ حسن عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ لفظ مُحْسِن، اَحْسَنَ کا اسم فاعل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ محسن وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کی اطاعت کے ذریعہ اپنے نیکی کرتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو دوسروں کے ساتھ نیکی کرتا ہے (وہ محسن ہے)

❁❁❁❁❁

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾
اے ایمان لانے والو! اگر تم کفر کرنے والوں کی اطاعت کرو گے تو وہ تم کو پچھلے پیروں پر لوٹا دیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (۱۴۹) تمھارا حامی و مددگار تو اللہ ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ (۱۵۰)

الفاظ و معانی:

اَلطَّاعَة: ارادے کی موافقت کرنا۔ جس میں فعل کی ترغیب کی جاتی ہے، طَاعَة ترغیب کی شرط کی بنا پر کے ذریعہ لفظ اجابت سے جدا ہے اگر چہ اجابت میں ارادہ کی موافقت حاصل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: اَلطَّاعَة (اطاعت) امر کی موافقت ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے؛ اس لیے کہ جو شخص بھی کوئی ایسا عمل انجام دے گا کہ جس کے واجب یا حسن ہونے کا تقاضا کرتی ہے تو وہ شخص اللہ کا مطیع ہوگا اگر چہ وہاں پر کوئی حکم نہ ہو تب بھی۔

ترکیب:

يَرُدُّوْكُمْ مجزوم ہے اسلئے کہ جواب شرط ہے۔ فَتَنْقَلِبُوْا اس پر عطف ہے۔ خَاسِرِيْنَ بر بنائے

حال منصوب ہے۔ بَل کے حقیقی معنی پہلی بات سے دوسرے بات کی جانب موڑنا ہے۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں آیت اس وقت نازل ہوئی جب انھوں نے احد کے دن مومنین سے شکست کے موقع پر کہا تھا کہ اپنے بھائیوں کی طرف پلٹ جاؤ اور اپنے دین کی جانب واپس پلٹ جاؤ۔ یہ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ حسن اور ابن جریج سے روایت ہے۔

تفسیر:

کفار کی اطاعت کا انجام

پھر خداوند عالم نے کفار کے جہاد سے باز رکھنے والے مشورہ یا ان کی فرماں برداری کے ترک کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (اے ایمان لانے والو!) یعنی جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی۔ إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا (اگر تم کفر کرنے والوں کی اطاعت کرو گے) یعنی اگر تم نے یہودیوں اور منافقین کی اس بات پر دھیان دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کردیے گئے لہٰذا اپنے خاندان کی طرف پلٹ جاؤ۔ تو يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (وہ تم کو پچھلے پیروں پر لوٹا دیں گے) یعنی کفر کی حالت پر پلٹا دیں گے جس طرح تم پہلے تھے۔

فَتَنقَلِبُوا (اور تم نامراد ہوجاؤ گے) یعنی پلٹ جاؤ گے (تو) خَاسِرِينَ خود اپنا نقصان کرو گے۔ اس سے بڑا نقصان نہیں ہوسکتا کہ تم ایمان کو کفر سے بدل دو اور جنت کو آتش جہنم سے۔ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ (تمھارا حامی و مددگار تو اللہ ہے) اللہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اور وہ تمھاری نصرت و مدد کے لیے اولیٰ ہے۔ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ (اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے) یہ اس سبب سے ارشاد فرمایا کہ اگر اس (اللہ) کے سوا کوئی اور مددگار ہوگا تو اللہ کی نصرت کے ساتھ اس کا کوئی شمار نہیں ہوگا اس کی حجت اور دلیل کے غالب آنے میں اور اگر دوسروں کی نصرت کا شمار بھی کیا جائے گا تو (اللہ) بہترین مددگار ہے، اس لیے کہ اس کے سوا کسی غیر کا غالب آنا ناممکن ہے، اگر کوئی دوسرا نصرت بھی کرتا ہے تو درحقیقت مددگار اللہ ہی ہے، اگر وہ

چاہے تو اہل زمین کے ذریعہ تمھاری نصرت کرے اور چاہے تو تمہارے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالکر تمھاری مدد کرے۔

❁❁❁❁❁

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

عنقریب ہم کفر اختیار کرنے والوں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے اللہ کے ساتھ انھیں خدائی میں شریک گردانا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ان کا ٹھکانا تو جہنّم ہے اور ظلم کرنے والوں کی آخری منزل کتنی بری ہے۔(۱۵۱)

قرائت:

ابن عامر، ابوجعفر، کسائی، یعقوب اور ابوحاتم نے الرُّعُب، راء اور عین دونوں کو پیش کیا ہے اور دیگر قراء نے عین کو ساکن پڑھا ہے۔ اس طرح کے لفظ کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔

الفاظ ومعانی:

اَلسُّلْطَان معنی یہاں پر حجت و برہان کے ہیں، اس کے حقیقی معنیٰ قوت کے ہیں، سُلْطَانُ الْمُلْك یعنی ملک کا سلطان اس کی قوت ہے، بُرْهَان کو سُلْطَان اس لئے کہتے ہیں کہ باطل کو دفع کرنے والی طاقت ہے۔

اَلسَّلَاطَة کے معنی زبان کی تیزی ہے۔

اِلْقَاء دراصل اَعْيَان میں ہوتا ہے جس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ. فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ اس کا استعمال مجاز کے عنوان سے غیر عین میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ اسی طرح اِلْقَاء کا بہتان لگانے میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اَلَّذِيْ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں۔ یہ مجاز کے اعتبار سے ہے چونکہ عین (چیز) نہیں ہے۔

اَلْمَثْوٰی کے معنی (ومقام) منزل کے ہیں۔اس کی اصل اَلثَّوَاء ہے جس کے معنی طولانی قیام کے ہیں۔

شان نزول:

سدی نے بیان کیا ہے کہ جب ابوسفیان اور مشرکین مکہ کی جانب روانہ ہوئے تو کہنے لگے: ہم نے بہت برا کیا کہ ہم نے انھیں قتل کیا، ان میں سے فقط مختصر افراد باقی بچے ہیں جنھیں ہم نے چھوڑ دیا ہے، واپس چلو انھیں بھی قتل کر دیں۔ جب انھوں نے اس کا ارادہ کیا اللہ نے ان کے قلوب میں رعب داخل کر دیا یہاں تک کہ وہ اس بات سے واپس پلٹ گئے جس کا انھوں نے ارادہ کیا تھا) یہ واقعہ عنقریب آنے والا ہے۔اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

کفار کے دلوں میں رعب [illegible]

پھر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے مومنین کی نصرت کرنے کا ایک ذریعہ مشرکین کے قلوب میں رعب داخل کرنا بھی ہے: سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (یعنی ہم عنقریب کفر اختیار کرنے والوں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے) خوف اور دہشت (پیدا کر دیں گے) بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ (کیوں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ انھیں خدائی میں شریک گردانا ہے) ان کا اللہ کے ساتھ شریک قرار دینے کے سبب اور ان کا اللہ کے بارے میں اس کا ساتھی اور شریک قرار دینے کی بات کرنا جو کہ جائز نہیں ہے۔ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا (جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند (برہان ودلیل) نازل نہیں کی یعنی اس بارے میں ان کے لیے کوئی حجت ودلیل قرار نہیں دی۔ وَمَاْوٰىهُمُ (ان کا مستقر اور ٹھکانہ) النَّارُ (آتش جہنم) ہے جس میں ان پر عذاب کیا جائے گا۔

ارشاد: وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ (اور ظلم کرنے والوں کی آخری منزل کتنی بری ہے) یعنی ظالموں کا (ٹھکانہ) آتش جہنم کس قدر برا ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ کفار مکہ میں شکست خوردہ کے مانند داخل ہوئے کہ انھیں خوف تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب ان پر پھر سے حملہ نہ کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رعب کے ذریعہ ایک ماہ کی مسافت کے برابر میری نصرت کی گئی۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ پس جب تم نے کمزوری دکھائی اور امر میں اختلاف کرنے لگے اور جس مالِ دُنیا کی محبت میں تم گرفتار تھے جوں ہی وہ تمھیں نظر آیا تو تم نے اپنے سردار کی بات ماننے سے انکار کر دیا اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار تھے اور کچھ لوگ آخرت کے خواستگار تھے۔ پس اللہ نے تمھیں کفار کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمھارا امتحان لے اور اس کے باوجود بھی اللہ نے تمھیں معاف کر دیا کیوں کہ وہ اپنے فضل کو مومنین کے شامل حال رکھتا ہے۔(۱۵۲)

الفاظ و معانی:

اَلْحِسّ: جڑ سے اکھاڑنے کے مانند قتل کرنا ہے۔ اس کی اصل اِحْسَاس ہے، قتل کو حِسّ کہا گیا ہے چونکہ قتل حس (احساس) کو باطل اور بیکار کر دیتا ہے۔ اَلْفَشَل: بزدلی۔

ترکیب:

صَدَقَ دو مفعول کی جانب متعدی ہے۔ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ میں اِذَا کے جواب کے بارے میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) محذوف ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ اُمْتُحِنْتُمْ۔

(۲) اس آیت میں واؤ زیادہ ہے اور تقدیم و تاخیر ہوئی ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: حَتّٰٓى اِذَا

تَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ فَشِلۡتُمۡ - یہ فراء کا قول ہے۔ نیز کہا ہے کہ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ - آیہ کریمہ: فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَ تَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ وَ نَادَیۡنٰہُ (صافات ۱۰۳ - ۱۰۴) کے مانند ہے۔ واؤ اس میں بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡهَا وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا (زمر آیت ۷۳) بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

حَتّٰی اِذَا قَمِلَتۡ بُطُوۡنُکُمۡ وَ رَاَیۡتُمۡ اَبۡنَاءَکُمۡ شَبُّوۡا

وَ قَلَبۡتُمۡ ظَهۡرَ المِجَنِّ لَنَا اِنَّ اللَّئِیۡمَ الۡعَاجِزُ الۡخَبُّ

اہل بصرہ اسے جائز نہیں مانتے ہیں اور فراء نے جن باتوں کو بھی شاہد کے طور پر پیش کیا ہے ان سب کی تاویل حذف کے ذریعہ کرتے ہیں اس لئے کلام میں یہی زیادہ بلیغ اور زیادہ بہتر ہے۔

شان نزول:

ابن عباس اور براء بن عازب، حسن اور قتادہ نے بیان کیا ہے کہ جس وعدہ کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے وہ جنگ احد سے متعلق ہے۔ مسلمان مشرکین کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تیر اندازوں نے اپنی وہ جگہ خالی کر دی جہاں پر ڈٹے رہنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تھا، ان کی پشت سے خالد بن ولید نے آ کر عبداللہ بن جبیر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا، پھر مشرکین نے واپس پلٹ کر ستر مسلمانوں کو قتل کر دیا اور ایک منادی نے ندا کر دی کہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا چنانچہ وہ واپس چلے گئے، اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

تفسیر:

کامیابی کے بعد شکست

پھر خداوند عالم نے وضاحت فرمائی کہ اس نے (مسلمانوں) سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا ارشاد فرمایا: وَلَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗۤ (اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا) مراد یہ ہے کہ اللہ نے تم سے کئے جس وعدہ کو پورا کر دیا وہ دشمنوں کے مقابلہ میں تمہاری نصرت و مدد تھی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: بَلٰۤی ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ یَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۲۵؛ یقیناً اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن فی الفور تم تک آ جائیں گے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعدہ (رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان تھا کہ آپ نے تیر اندازوں سے فرمایا تھا کہ اس مقام سے نہ ہٹنا۔ جب تک تم اپنی جگہ پر ثابت قدم رہو گے ہم غالب رہیں گے۔ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ (ابتدا میں تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے) بِاِذْنِهٖ (اس کے حکم سے) (اللہ) کے علم سے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا لطف وکرم سے اس لیے کہ اصل اذن کے حقیقی معنیٰ کام کے لئے آزاد چھوڑنا اور لطف یعنی کام کو آسان بنا ہے جیسا کہ اذن بھی اسی طرح ہے، لہٰذا اذن کو لطف کا نام دینا بہت بہتر ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ (پس جب تم نے کمزوری دکھائی) یعنی تم نے اپنے دشمن سے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور تم نے ان سے رخ موڑ لیا (پہلوتہی کرلی) وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ (اور امر میں اختلاف کرنے لگے) وَعَصَيْتُمْ جگہ کی حفاظت میں تم نے اپنے پیغمبرؐ کی نافرمانی کی۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ (اور جس مَالِ دُنیا کی محبت میں تم گرفتار تھے) (تمھاری پسندیدہ چیز) کفار پر تمھاری نصرت اور ان کی شکست ان پر تمھاری کامیابی اور مال غنیمت (کے دکھانے کے بعد) بیشتر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان تمام امور سے احد کا دن مراد ہے۔ ابوعلی الجبائی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تم ان سے قتال کر رہے تھے بدر کے دن یہاں تک کہ جب تم نے اُحد کے روز بزدلی کا مظاہرہ کیا، تم نے احد کے دن اختلاف کیا اور نافرمانی کی، بدر کے دن تمھاری پسندیدہ چیز دکھانے کے بعد۔ اولیٰ اور بہتر ہے کہ یہ احد کے دن کی حکایت (واقعہ) ہو جیسا کہ ہم نے وضاحت کی ہے۔

اِذَا کا جواب اس مقام پر محذوف ہے جس پر کلام دلالت کر رہا ہے جس کی تقدیر یوں ہے یہاں تک کہ جب تم نے ایسا کیا تو تمھاری آزمائش کی گئی اور امتحان لیا گیا اور تم سے نصرت ومدد اٹھالی گئی۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا (یعنی تم میں سے بعض طالب دنیا ہیں) یعنی مال غنیمت کے طلب گار ہیں، جنھوں نے اس جگہ کو خالی چھوڑ دیا جہاں پر انھیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعینات کیا تھا اور اس کی پابندی کرنے کا حکم دیا تھا (وہاں پر ثابت قدم رہنے کو واجب ولازم قرار دیا تھا)

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (اور کچھ لوگ آخرت کے خواستگار تھے) عبداللہ بن جبیر اور اس جگہ پر ثابت قدم رہنے والے افراد مراد ہیں یعنی اپنے جہاد سے اللہ کے پاس موجود چیز (اجر) کا قصد وارادہ کرتے ہیں۔ ابن مسعود سے روایت کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نہیں جانتا تھا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کوئی طالب دنیا بھی ہے یہاں تک کہ احد کے دن ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ (پس اللہ نے تمھیں کفار کے مقابلے میں پسپا کر دیا) ہم نے ذکر کیا ہے کہ ان

لوگوں کے اللہ کی جانب پلٹنے کے سلسلہ میں چند وجہیں ہیں:

اول: یہ لوگ دو گروہ تھے: ان میں سے بعض نے واپس پلٹ کرنا فرمانی کی اور بعض نے نافرمانی نہیں کی اس لیے کہ اس گروہ کے شکست کھانے کے بعد یہ لوگ کم تعداد میں رہ گئے پس یہ لوگ حکم خدا سے واپس پلٹ گیے تا کہ جہاد نہ کریں اس لیے کہ خداوند عالم نے سو افراد کے ثبات (قدم) کو دو سو کے مقابلہ میں لازم و ضروری قرار دیا تھا، جب ان کی تعداد کم ہوگئی تو ان پر (جہاد) واجب نہیں رہا۔ پس ممکن ہے کہ فریقین کا ذکر کیا گیا ہو کہ اس نے ان سے درگذر کیا اور انھیں معاف کر دیا یعنی بعض سے پلٹ گیا اور بعض سے درگذر کیا۔ ابو علی الجبائی سے روایت ہے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ تم لوگوں سے نصرت و مدد اٹھالی گئی اور تمھیں تمھارے سپرد کر دیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرنے کے سبب لہٰذا تم شکست کھا گئے۔ یہ جعفر بن حرب کا قول ہے۔

سوم: یعنی تمھیں ان سے فوری طور پر پلٹنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے (یہ اس لیے ہے) تا کہ تم پر انعام کے ذریعہ کمک کر کے تمھاری آزمائش کرے اور تم سے تخفیف کرے۔ یہ بلخی سے مروی ہے۔

لِيَبْتَلِيَكُمْ (تا کہ تمھارا امتحان لے) تمھاری آزمائش کرے یعنی تمھارے ساتھ آزمائش و امتحان میں مبتلا افراد کا معاملہ کر کے عدل کا مظاہرہ کرے یہ اس لیے ہے کہ خداوند عالم اپنے بندوں کے افعال پر انھیں جزا دیتا ہے نہ اس پر جسے وہ ان کے متعلق جانتا یا علم رکھتا ہے۔ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ (اور اس کے باوجود بھی اللہ نے تمھیں معاف کر دیا) یعنی امر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرنے کے بعد بھی (اللہ نے) تم سے درگذر کیا اور تمھیں معاف کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی پیروی کے حکم کے بعد اس نے تم سے درگذر کیا۔ بلخی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا جب یہ لوگ مقام حمراء الاسد پر پہونچے اس بارے میں ان سے درگذر کیا۔ ابو علی الجبائی نے کہا ہے: (یہ حکم) ان سے مخصوص ہے جنھوں نے واپس پلٹنے سے خدا کی نافرمانی نہیں کی بہتر ہے کہ یہ فقرہ سب کو شامل ہے اس لیے کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اللہ نے انھیں معصیت و نافرمانی کرنے پر معاف کر دیا ہو۔

وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (کیونکہ وہ اپنے فضل کو مومنین کے شامل حال رکھتا ہے) یعنی اللہ مومنین کو دنیا و دین کی نعمت عطا کر کے ان پر احسان کرنے والا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے گناہوں کا معاف کرنے والا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ویسا عذاب نازل نہیں کرے گا جیسا کہ ان سے پہلے والوں پر نازل

کر چکا ہے۔ واحدی نے اپنی سند سے سہل بن ساعدی سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں زخمی ہوئے، آپؐ کے سامنے کے دانت شکستہ ہو گئے تھے اور سر کا خود بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا، آپؐ کی دختر فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا آپ کا خون صاف کر رہی تھیں اور علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنی سپر کے ذریعہ اس پر پانی ڈال رہے تھے، جب آپ کی دختر نے دیکھا کہ خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے تو آپ نے بوریہ کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ آپؐ کے زخموں پر رکھی جس سے خون بہنا بند ہو گیا۔

❁❁❁❁❁

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾ ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٥٤﴾

یاد کرو جب تم پہاڑوں پر بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا تمھیں ہوش تک نہ تھا اور رسول تمھارے پیچھے سے تمھیں پکار رہے تھے۔ اس وقت تمھارے اس کیے کا بدلہ اللہ نے یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تا کہ آئندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے چلا جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تم ملول و حزین نہ ہو اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ (۱۵۳) اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر ایسی اطمینان کی حالت طاری کر دی کہ ایک گروہ تو

اونگھنے لگا مگر ایک دوسرا گروہ جو صرف اپنے مفادات کو مدِ نظر رکھے ہوئے تھا اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر حق کے خلاف تھے۔ یہ لوگ اب یہ کہتے ہیں کہ کیا اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصّہ ہے؟ ان سے کہو: اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ دراصل یہ لوگ دل میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں انھیں تم پر ظاہر نہیں کرتے وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر قیادت ہمارے پاس ہوتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنے مقتل تک آجاتے اور یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزما لے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔ اللہ تو دلوں کے حال خوب جانتا ہے۔ (۱۵۴)

قرائت:

عالم کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے تَغۡشٰی طَآئِفَةً کو تاء کے ساتھ اور باقی قراء نے یَغۡشٰی یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اہل بصرہ نے کُلُّہٗ لِلّٰہِ کو مرفوع اور بقیہ قاریوں نے کُلَّہٗ لِلّٰہِ منصوب پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن قراء نے یَغۡشٰی یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً - نُعَاس غَاشی ہے اسلئے کہ یَغۡشٰی النُّعَاس سے زیادہ قریب ہے۔ پس فعل کی نسبت اس کی جانب دنیا زیادہ بہتر ہے۔ کہا جاتا ہے: غَشِیَنِیۡ النُّعَاسُ وَ غَلَبَ عَلَیَّ النُّعَاسُ - لیکن غَشِیَتۡنِی الۡاَمَنَةُ نہیں بولا جاتا ہے۔

جن حضرات نے تَغۡشٰی تاء کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ النعاس اگرچہ اَمَنَة کا بدل ہے پھر بھی مبدل منہ ایسا نہیں ہے کہ کلام سے ساقط ہو جائے اور اس پر آپ کی رہنمائی عربوں کا یہ جملہ

کرے گا کہ اَلَّذِیْ مَرَرْتُ بِهٖ زَیْدٍ اَوْ عَبْدِ اللّٰہِ۔ شاعر نے کہا:

وَ کَاَنَّهٗ لَهِقَ السَّرَاةِ کَاَنَّهٗ　　وَ کَاَنَّهٗ لَهِقَ السَّرَاةِ کَاَنَّهٗ

ما حاجبَيْهِ مُغَيَّرٌ بسوادِ

پس خبر کو اَلَّذِیْ کی بنا پر قرار دیا ہے جو کہ بدل منہ ہے۔

جن قراء نے کُلَّهٗ کو نصب دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ کُلَّهٗ اَجْمَعِیْنَ کی جگہ پر ہے کہ اس میں احاطہ اور عمومیت ہے۔ پس دلیل یہ ہوئی کہ اس کے بعد عوامل نہ آئے جس طرح اس کے بعد اَجْمَعُوْنَ نہیں آئے گا۔

اور کُلُّهٗ کو رفع دینے کے سلسلہ میں ابوعمرو کی دلیل اس کا مبتدا قرار دینا ہے اگرچہ وہ زیادہ تر مقامات پر اپنی عمومیت کی بنا پر اَجْمَعِیْنَ کی جگہ پر ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کو مبتدا قرار دیا جاتا ہے۔ جس طرح دیگر اسماء کو مبتدا قرار دیا جاتا ہے۔ جیسے ارشاد الٰہی: وَ کُلُّهُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَرْدًا۔ اس آیت میں اسے مبتدا قرار دیا گیا ہے۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی اِذْ تُصْعِدُوْنَ کے اِذْ میں عامل وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ہے۔ لِکَیْلَا تَحْزَنُوْا میں لام بھی اسی سے متعلق ہے۔ کہا گیا ہے کہ فَاَثَابَكُمْ سے متعلق ہے۔ لَا تَحْزَنُوْا اَنْ کی بنا پر منصوب ہے۔ اَمَنَةً اَنْزَلَ کا مفعول ہے اور نُعَاسًا اس کا بدل ہے۔ پہلا والا لفظ طَآئِفَةً یَغْشٰی کا مفعول ہے اور دوسرا طَآئِفَةٌ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اس کی خبر یَظُنُّوْنَ ہے۔ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ صفت ہونے کی بنا پر محلہ مرفوع ہے۔ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ خبر بھی ہوسکتا ہے۔ وَ طَآئِفَةٌ میں واو حالیہ ہے۔ اس تقدیر کی بنا پر کہ یَغْشَی النُّعَاسُ طَآئِفَةً فِیْ حَالِ مَا اَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ اَنْفُسُهُمْ۔ اور پورا جملہ مقام حال میں ہوگا اور منصوب ہوگا۔ جب اسے واو عطف قرار دیا جائے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ضَرَبْتُ زَیْدًا وَّ عَمْرًا اَکْرَمْتُهٗ۔ عَمْرًا منصوب ہے اس فعل کے مضمر و پوشیدہ ہونے کی بنا پر جس کی تفسیر فعل ظاہر کر رہا ہے۔

تفسیر:

میدان جنگ سے فرار کا انجام

پھر خداوند عالم نے احد کے دن شکست خوردہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِذْ

تُصْعِدُوْنَ (یاد کرو جب تم پہاڑوں پر بھاگے جا رہے تھے) یعنی اللہ نے تم سے درگذر کیا تمھیں معاف کر دیا جب تم اُحد کی وادی میں شکست کھا کر دشمن سے بھاگے جا رہے تھے۔ یہ قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔

وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ (اور کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا تمھیں ہوش تک نہ تھا) جنگ میں جسے تم نے پیچھے چھوڑ دیا تھا وہاں ٹھہر نہیں رہے تھے، نہ ہی تم ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے، نہ ہی تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے لیے رک رہا تھا۔ وَالرَّسُوْلُ اور رسول یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ (تمھارے پیچھے سے تمھیں پکار رہے تھے) یعنی تمھارے پس پشت آواز دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

اے خدا کے بندو! واپس پلٹ آؤ! میری طرف، واپس پلٹ آؤ میری طرف، میں اللہ کا رسول ہوں۔

فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ (اس وقت تمھارے اس کیے کا بدلہ اللہ نے یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے) اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

اول: جس جگہ سے تم ثواب کی امید لگائے ہوئے تھے اسے تمھارے لیے شکست کے سبب غم قرار دے دیا اور تم پر مشرکین کو فتح وظفر نصیب ہوئی۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کر کے انھیں غم میں مبتلا کیا اور آپ کے حکم کو ضائع و برباد کر دیا، غَمًّاۢ بِغَمٍّ میں پہلا غم ان لوگوں کے لیے ہے دوسرا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے۔ اس قول کو زجاج نے اختیار کیا ہے۔

دوم: غم پر غم پہونچانے کے ہیں یا غم کے ساتھ غم دینے کے ہیں یا غم کے بعد غم دینے کے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: میں فلاں کے ساتھ وارد ہوا اور فلاں کے ساتھ آیا یہاں تک کہ اس طرح کیا اور اس طرح کہا جاتا ہے: میں زید کے ساتھ وارد نہیں ہوا یہاں تک کہ ایسا کیا یعنی زید کے ساتھ (اس طرح کیا گیا) اس سے ندامت کے سبب کثرت غم مراد ہے، غم اس چیز پر جسے انھوں نے انجام دیا ہے اور ان پر جو شدائد وارد ہوئے اور وہ نہیں سمجھ پائے کہ کس چیز کے سبب عذاب الٰہی کے مستحق قرار پائے ہیں۔

سوم: پہلا غم قتل اور زخمی ہونا ہے، دوسرا غم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی غلط خبر کا عام ہونا ہے۔ یہ قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔

چہارم: احد کے دن تمھیں غم پہونچا اس غم کے عوض جو مشرکین پر روز بدر وارد ہوا تھا۔ یہ حسن کا قول ہے۔ اس قول میں غور و فکر کی گنجائش ہے اس لیے کہ جنگ بدر میں مشرکین کو جو غم پہونچا مسلمانوں کی طرف سے وہ کرامت و بزرگی کی جزا اور بدلہ اور اجر کا باعث ہے نہ کہ غم کا۔

پنجم: مشرکین کا غم مراد ہے مسلمانوں کی طاقت وقوت نمایاں ہونے کے بعد کہ وہ مشرکین کی تلاش میں حمراء الاسد تک نکل آئے۔ اس غم کے عوض جو مسلمانوں کو مشرکین سے پہونچا تھا۔ یہ حسین بن علی المغربی کا قول ہے۔

غم کو ثواب کہا گیا ہے اس لیے کہ (ثواب کے لغوی معنیٰ ہیں جو فعل کے سبب جزا کے طور پر پلٹتا ہے اطاعت ہو یا معصیت پھر لفظ ثواب اطاعت پر جزا کے معنیٰ میں استعمال کثرت سے ہونے لگا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس چیز سے ہے جس چیز کو اس کے غیر دوسری جنگ پر قرار گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ یعنی عذاب کو بشارت کے مقام پر قرار دو جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اَخَافُ زِیَادًا اَنْ یَّکُوْنَ عَطَاؤُهٗ　اَدَاهِمُ سُوْدًا اَوْ مُدَحْرِجَةً سُمْرًا

لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصٰبَکُمْ (تا کہ آئندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے چلا جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تم ملول وحزین نہ ہو) یعنی اس نے تمھیں اس غم میں مبتلا کیا ہے تا کہ مال غنیمت میں سے جو تم سے چھوڑ گیا ہے اس پر محزون نہ ہو اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت چھوڑ و اور نہ امر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ترک کرو اور راہ خدا میں تمھیں جن سختیوں اور زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اس پر بھی تم حزن وملال نہ کرو البتہ تمھارا صرف اس بات پر ہونا چاہئے کہ تم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی ہے جس کی تقدیر یوں ہے: تمھارا حزن وملال اس برے کام پر ہونا چاہئے جو حزن تم نے دوسروں کو دیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یقیناً تم سے عفو ودرگذر کیا گیا تا کہ تم فوت ہونے والی چیز پر حزن وملال نہ کرو اس لیے کہ اللہ کی بخشش ہر طرح کے حزن وغم کو ختم کر دیتی ہے۔

وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔) اس میں اطاعت کی طرف رغبت اور معصیت سے خوف دلایا گیا ہے۔ اس کے بعد ان پر نازل کی گئی نعمت کا ذکر کیا ہے یہاں تک کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا اور آپؐ سے معذرت طلب کی لہٰذا اللہ نے ان پر اسی حالت میں نیند طاری کر دی کہ وہ زمین پر گرنے لگے اور منافقوں کو استقرار نہیں تھا (ٹھہر نہیں پا رہے تھے) یہاں تک کہ ان کی عقلیں پراگندہ اور منتشر ہو گئیں۔

ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا (اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر ایسی اطمینان کی حالت طاری کر دی) لفظ انزال مجازاً ہے مراد یہ ہے کہ اے مومنین! احد کے دن تمھیں غم حاصل

ہونے کے بعد اللہ نے تمھیں امن وسکون کی نعمت عطا فرمائی یعنی امن وسکون والی نیند۔ نُعَاسًا اَمَنَةً کا بدل اشتمال ہے چونکہ نیند اطمینان وسکون پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے کہ خائف وترساں انسان سوتا نہیں ہے۔ پھر خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ یہ اطمینان وسکون عام اور ہر ایک کے لئے نہیں تھا بلکہ مخلصین کے لیے تھا اور منافقین کے لیے خوف اور بیداری رہ گئی تھی فرمایا: یَغْشٰی طَآئِفَةً مِّنْكُمْ (ایک گروہ تو اونگھنے لگا) یعنی مومنین پر نیند طاری کردی جس کا سبب یہ تھا کہ مشرکوں نے انھیں قتال کے لیے واپسی کی دھمکی دی تھی، مسلمان دفاع کرتے ہوئے جنگ کے لیے آمادہ بیٹھے رہے۔ لہٰذا اللہ نے مومنین پر اطمینان وسکون نازل کردیا اور وہ سو گئے جبکہ منافقین کے لیے ایسا کچھ نہیں ہوا انھیں تو خوف نے زحمت ومشقت میں مبتلا کردیا کہ ان پر کفار پھر سے پلٹ آئیں گے یا انھیں مدینہ سے پراگندہ اور منتشر کردیں گے۔ وہ اس طرح کی بدگمانی کررہے تھے لہٰذا ان کی نیند اڑ گئی تھی۔ یہ ابن اسحاق، ابن زید وقتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔

وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ (مگر ایک دوسرا گروہ جو صرف اپنے مفادات کو مدِ نظر رکھے ہوئے تھا) یعنی ایک جماعت کہ جن کے نفسوں نے انھیں مشغول کردیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں غم اور بے چینی میں مبتلا کردیا تھا۔ اسی طرح عربوں کا یہ کہنا ہے: هَمُّكَ مَا اَهَمَّكَ (تمھارا غم وہ ہے جو تمھیں ہم وغم اور بے چینی میں مبتلا کردے) یعنی ان کا ہم وغم اپنے آپ کو نجات دلانا ہے۔ عرب اس لفظ کا استعمال ہر خوف زدہ انسان کے لیے کرتے ہیں جسے اس کے نفس نے اپنے آپ میں مشغول اور دوسروں سے غافل کر رکھا ہو۔

يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجٰهِلِيَّةِ (اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر حق کے خلاف تھے) یعنی وہ (منافقین) وہم وگمان کررہے تھے کہ اللہ محمدؐ اور آپ کے اصحاب کی نصرت نہیں فرمائے گا۔ ان کا یہ گمان زمانۂ جاہلیت جیسا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے گمان کی مانند تھا جو کفار اور اللہ کے وعدہ و وعید کی تکذیب کرنے والے تھے، منافقین کا گمان بھی انھیں کے گمان جیسا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ان کا گمان یہ جملہ تھا کہ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ (یہ لوگ اب یہ کہتے ہیں کہ کیا اس کام کے چلانے میں ہمارا ابھی کوئی حصہ ہے؟) یہ ان کے گمان کی تفسیر وتشریح ہے یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں: کیا ہمارے حصہ میں نصرت، فتح وظفر ہے، یہ انھوں نے تعجب اور انکار کے طور پر کہا تھا یعنی کیا ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ان سب پر غلبہ حاصل ہوگا یعنی ہمارے لئے ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں زبردستی یہاں لایا گیا ہے، اگر معاملہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم نہ آتے۔ یہ

حسن سے مروی ہے۔ یہ بات عبد اللہ بن اُبیّ اور معتب بن قشیر اور ان کے ساتھیوں نے کہی تھی۔ یہ زبیر بن العوام وابن جریج سے مروی ہے۔

قُلْ (اے محمد! کہہ دیجیے) اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں) وہ جس کی چاہے نصرت کرے اور جسے چاہے ذلیل کرے، جس کی وہ نصرت کرے اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا اور جسے وہ ذلیل کر دے اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، کبھی وہ نصرت میں تعجیل کرتا ہے اور کبھی تاخیر کرتا ہے جو اس کی حکمت کے تابع ہے اس کے یہاں وعدہ خلافی نہیں ہے۔ دونوں مقامات پر امر سے نصرت و مدد مراد ہے۔ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ (دراصل یہ لوگ دل میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں انہیں تم پر ظاہر نہیں کرتے ہیں) یعنی وہ اپنے دلوں میں شک اور نفاق کو چھپائے ہوئے ہیں کہ آپ کے سامنے اس کا اظہار کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کامیابی ہمارے پاس ہوتی) جیسا کہ ہم سے وعدہ کیا تھا تو مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (ہم یہاں مارے نہ جاتے) یعنی ہمارے ساتھی قتل نہ کیے جاتے۔ اس طرح وہ اللہ کے اس وعدہ میں شک کر رہے تھے جو وعدہ اللہ نے اپنے پیغمبر ﷺ سے مشرکین پر تسلط اور بلندی عطا کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس طرح وہ پیغمبر ﷺ کی تکذیب کر رہے تھے۔ قُلْ (اے محمد! آپ ان سے اس کے جواب میں کہہ دیجیے) لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (اگر تم اپنے گھروں اور مکانوں میں ہوتے) لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنے مقتل تک آ جاتے) اس بارے میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ اے منافقو! اے شک کرنے والو! اگر تم اپنے گھروں میں رہتے اور جنگ کرنے سے بیٹھ جاتے تو وہ مومنین جنگ کے لیے جاتے جن پر قتال (جہاد) فرض کر دیا گیا تھا، وہ اللہ کے لئے صبر کرتے ہوئے، قتال کرتے اور قتل کر دیے جاتے۔ اس کی تقدیر یوں ہے: وَلَوْ تَخَلَّفْتُمْ عَنِ الْقِتَالِ لَمَّا تَخَلَّفَ الْمُؤْمِنُوْنَ؛ اگر تم قتال سے پیچھے ہٹ جاتے تو مومنین پیچھے نہیں رہتے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو وہ لوگ نکلتے جن پر قتل ہونا واجب قرار دے دیا گیا تھا یعنی جن کی اجل اور موت لکھ دی گئی تھی (فرض کر دی گئی تھی) اور لوح محفوظ میں جس وقت میں ان کا قتل ہونا لکھ دیا گیا تھا۔ یہ بات اس علم الٰہی میں تھی (جسے اللہ جانتا تھا) یعنی اس کے علم کے مطابق لامحالہ ہو کر رہے گا

،ایسا ہرگز نہیں ہے کہ مشرکین قتال ترک کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے اس اعتبار سے کہ اللہ ان کے متعلق جانتا تھا اوران پر فرض کردیا گیا تھا اس لیے کہ جس طرح اللہ یہ جانتا ہے کہ (منافقین) اس بارے میں اختیار نہیں رکھتے اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ اس پر قادر ہیں، اگر یہ واجب اور لازمی ہوتا تو یہ بھی واجب ہوتا کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اسے انجام نہیں دے گا۔اس طرح کہنا کفر ہے۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ (اور یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے) یعنی اللہ آزمائش کرلے کہ تمھارے دلوں میں تمھارے اعمال سے متعلق کیا ہے اس لیے کہ وہ غیب کو جانتا ہے لہٰذا وہ شہادت کے بارے میں بھی جانتا ہے اس لیے کہ جزا اس چیز کے لیے واقع ہوتی ہے جو مشاہدہ کے طور پر معلوم ہو نہ کہ وہ جوان (لوگوں) کی طرف سے عمل کے بغیر معلوم ہو۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تاکہ تمہارے ساتھ آزمائش وامتحان میں مبتلا افراد جیسا برتاؤ کرے تم پر عدل کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جملہ اس ارشاد پر عطف ہے: ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ۔ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ۔

وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ (اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے) یعنی تمھیں خالص بنا دے۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب منافقین سے ہے، یعنی تمھیں کوچ کا حکم دیتا ہے اور تم کوچ نہیں کرتے اس طرح مسلمانوں سے تمھاری دشمنی ظاہر ہورہی ہے اور تمھارے رازہائے سربستہ نمایاں ہورہے ہیں چنانچہ مسلمان تمھیں اپنوں میں شمار نہیں کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تاکہ اولیائے الٰہی آزمائش کریں کہ تمھارے دلوں میں کیا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۳۳؛ خدا اور رسول سے جنگ کرنے والے) الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (سورۂ احزاب، آیت ۵۷؛ جولوگ خدا اور اس کے رسول کو ستاتے ہیں) یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ، اَمَنَةً نُّعَاسًا پر عطف ہے یعنی تاکہ ان حالات میں تمھارے باطن کی تمھارے ظاہر سے موافقت ظاہر ہو جائے اور تمھارے قلوب کی آزمائش ہو جائے کہ انھیں شک سے پاک کردے جو تمھیں (اللہ کی) عجیب و غریب صنعت کا مشاہدہ کرائے اور تمھاری نیتوں کو خالص کردے۔ یہ آزمائش مومنین سے مخصوص ہے، منافقین سے نہیں۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (اللہ تو دلوں کے حال خوب جانتا ہے) یعنی اللہ نے تمھاری آزمائش اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ معلوم کرے کہ تمھارے دلوں میں کیا ہے۔ اللہ تو اس سے واقف ہے ہی بلکہ

اس نے تمھاری آزمائش اس لیے کی تاکہ تمھارے اسرار ظاہر ہوں اور جو کچھ ظاہر ہوگا اس پر جزا ملے گی۔

❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

جب دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی تھی، تم میں سے جو لوگ اس دن پیٹھ پھرا کر چلے گئے تھے تو اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی بنا پر شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے اللہ نے انھیں معاف کر دیا بے شک اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ (۱۵۵)

تفسیر:

فرار کے پیچھے کس کا ہاتھ؟!

پھر خداوند عالم نے اُحد کے دن شکست خوردہ لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ (یعنی اے مسلمانو! تم میں سے جو لوگ اس دن مشرکوں پیٹھ پھرا کر چلے گئے تھے) یہ قتادہ وربیع سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے شکست کے موقع پر مدینہ کی جانب فرار اختیار کیا تھا۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (جب دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی تھی) مسلمانوں کی جمعیت کہ جن کے سید و آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور مشرکین کا گروہ جس کا سردار ابوسفیان تھا۔ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ (شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے) یعنی شیطان نے ان سے لغزش اور ڈگمگانے کا مطالبہ کیا۔ یہ قتیبی کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَزَلَّ (یعنی قدم ڈگمگایا اور پھسلا) اِسْتَزَلَّ (قدم ڈگمگانے کی کوشش کی) کے معنی میں ہے۔ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (ان کی بعض کمزوریوں کی بنا پر) ان کے گذشتہ گناہ جن سے ان کی بدبختی وابستہ ہوگئی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مال غنیمت سے ان کی محبت اور حیات کی بقا کے حرص ولالچ نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ یہ جبائی کا قول ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اس میں فقرہ اس چیز سے نہی کی گئی ہے جو (انسان کو) ایسے امور سے سستی اور کاہلی میں مبتلا کر دے جو اس کے لیے لازمی ہوں۔ یہ

بھی کہا گیا ہے کہ ان کے گذشتہ خطاؤں کی یاد نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے۔ لہٰذا انھوں نے اخلاص توبہ اور اپنے آپ کو اس تاریکی سے نکالنے سے قبل قتل سے کراہت و ناگواری کا اظہار کیا۔ یہ زجاج سے روایت ہے۔
وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ (اللہ نے انھیں معاف کر دیا) خداوند عالم نے عفو و درگذر کا ذکر بطور تاکید دہرایا ہے تاکہ گنہگاروں کو عفو و بخشش میں طمع اور خواہش پیدا ہو جائے اور انھیں یاس و ناامیدی سے روکا جائے اور مومنین کے گمانوں کو اچھا قرار دیا جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (بے شک اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے) اس کے معنی گذر چکے ہیں۔
ابوالقاسم بلخی نے بیان کیا ہے کہ احد کے دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تیرہ افراد کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا، جن میں پانچ مہاجرین اور آٹھ انصار تھے۔ مہاجرین میں حضرت علی علیہ السلام، ابوبکر و طلحہ، عبدالرحمٰن بن عوف و سعد بن ابی وقاص۔ حضرت علی علیہ السلام اور طلحہ کے علاوہ تمام میں اختلاف ہے۔ حضرت عمر سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں پہاڑ پر پہاڑی بکری کے مانند چڑھ رہا تھا، حضرت عثمان شکست کے تین روز بعد واپس پلٹے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا کہ تم وہاں پر (جنگ کی) کیفیت پیش کرنے چلے گئے تھے کیا!

❀❀❀❀❀

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِى الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(اے ایمان والو! تم ان کافروں جیسے نہ بنو جن کے بھائی بند اگر کبھی سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ ہی قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا

ہے۔ جلانا اور مارنا تو اللہ کا کام ہے اور وہ تمھاری ہر حرکت کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔(۱۵۶) اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاؤ یا موت کی آغوش میں چلے جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔(۱۵۷) خواہ تم مرجاؤ یا قتل کر دیئے جاؤ تم سب اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے۔(۱۵۸)

قرائت:

ابن کثیر نے اور عاصم کے علاوہ بقیہ اہل کوفہ نے بِمَا یَعْمَلُوْنَ یاء کے ساتھ اور بقیہ قراء نے تَعْمَلُوْنَ تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع نے اور عالم کے علاوہ دیگر اہل کوفہ نے مِتُّمْ میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حفص نے اس آیت کے علاوہ دیگر آیات میں ان کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے مُتُّمْ میم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حفص نے عاصم سے روایت میں مِمَّا یَجْمَعُوْنَ یاء کے ساتھ اور دیگر قراء نے تَجْمَعُوْنَ تاء کے ساتھ قرائت کی ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: تاء کے ساتھ پڑھنے والوں کی دلیل ارشاد الٰہی: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ہے اور یاء کے ساتھ پڑھنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے غائب کا صیغہ ہے اور وہ: وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اور اس کے بعد کا جملہ ہے۔ لہٰذا اس جملہ کو بھی غائب پر حمل کیا گیا ہے۔

مُتُّمْ ضم کے ساتھ زیادہ مشہور اور قیاس کے مطابق ہے۔ کسرہ کے ساتھ قیاس سے ہٹ کر ہے۔ اسی کے مانند فَضِلَ یَفْضُلُ صحیح میں ہے۔ شاعر نے کہا:

ذَكَرْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ بِدَارِ ابْنِ عَامِرٍ　وَ مَا مَرَّ مِنْ عُمْرِىْ ذَكَرْتُ وَ مَا فَضِلَ

تَجْمَعُوْنَ تاء کے ساتھ تو مراد یہ ہے کہ تَجْمَعُوْنَ اَيُّهَا الْمَقْتُوْلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ الْمَائِتُوْنَ (تم لوگ جمع کرتے ہوئے راہ خدا میں شہید ہونے والوں یا مرنے والوں) اور يَجْمَعُوْنَ کے

معنی یہ ہیں کہ بیشک اللہ کی مغفرت ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جنھیں دوسرے لوگ جمع کرتے ہیں۔

الفاظ و معانی:

اَلضَّرْبُ فِي الْاَرْضِ: زمین میں سیر کرنا۔ اس کے حقیقی معنی ہاتھ سے مارنے کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے سیر کے دوران دوڑنے کے ہیں۔

غُزّٰی غَازِی کی جمع ہے جیسے ضَارِب سے ضُرَّب، طَالِب سے طُلَّب۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی: وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ۔ اِذَا کو اِذْ کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ دو باتوں میں سے کسی ایک بات کی خاطر:

(۱) یا تو اس لئے کہ وہ لَا تَكُوْنُوْا سے متصل ہے۔ ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ کہ جب ان کے بھائیوں نے روئے زمین پر سفر کیا۔

(۲) یا تو اس لئے کہ جب وہ مبہم ہو اور غیر موقف ہو تو جزا میں جو ہے وہ اس میں ماضی مستقبل کی جگہ پر واقع ہوتا ہے۔ جیسے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورۂ حج، آیت ۲۵) مراد يَكْفُرُوْنَ وَ يَصُدُّوْنَ ہے اور یہ بھی جائز ہے: لَاُكْرِمَنَّ الَّذِيْ اُكْرِمُكَ اِذَا زُرْتُهٗ اس لئے کہ اَلَّذِيْ مبہم ہے لیکن لَاُكْرِمَنَّ هٰذَا الَّذِيْ اُكْرِمُكَ اِذَا زُرْتُهٗ صحیح نہیں ہے۔ اَلَّذِيْ کا وقت معین کرنے کے لئے، اس لئے کہ هٰذا کے ذریعہ اَلَّذِيْ کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے (اب اس اشارہ کے بعد اَلَّذِيْ مبہم اور غیر واضح نہیں رہ گیا ہے)

ارشاد الٰہی: لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ میں لام لَا تَكُوْنُوْا کے متعلق ہے۔ یعنی لَا تَكُوْنُوْا كَهٰؤُلَاءِ الْكُفَّارِ فِيْ هٰذَا الْقَوْلِ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ دُوْنَكُمْ (اس قول میں تم سب کفار کے مانند ہو کہ خدا اسی بات کو تمھارے علاوہ ان کے دلوں میں حسرت قرار دے)

کہا گیا ہے کہ یہ لام وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ سے متعلق ہے۔ ایسی صورت میں وہ لام عاقبت ہوگا۔ یہ ابو علی جبائی کا قول ہے۔

لَئِنْ قُتِلْتُمْ اس میں جواب قسم کی وجہ سے جواب جزا سے بے نیاز ہے۔ وہ جواب قسم جو ارشاد الٰہی: لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ اس آیت میں دو چیزیں (شرط اور قسم) جمع ہوگئی ہیں کہ دونوں جواب کی محتاج ہیں۔ جواب قسم کا ذکر زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ وہ صدارت طلب ہے۔ اس سے زیادہ اولیٰ ہے جو حاشیہ اور ضمن میں ذکر ہوتی ہے۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ میں لام کے سلسلہ میں دو احتمال پایا جاتا ہے:

(۱) قسم کا جانشین ہے اور لَاِلَى اللّٰهِ کا لام جواب ہوگا۔ جیسے آپ کا کہنا: وَ اللّٰهِ اِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَتُحْشَرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ۔

(۲) لام اپنے بعد والے کے لئے تاکید کرنے والا ہے جس طرح اِنَّ مابعد کی تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں دوسرا لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ لام قسم کے ساتھ فعل مضارع میں نون کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ قسم تاکید کی ہر اس چیز سے زیادہ حقدار ہوتی ہے جس پر نون داخل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ قسم کا ذکر نا اس بات پر دلیل ہے کہ وہ بھی تاکید کے مقامات میں سے ایک ہے۔ جب یہ نون کا ہونا قسم کے علاوہ امر و نہی، استفہام، عرض اور جزا میں جائز ہے تو قسم میں تو لازمی ہے اس لئے کہ قسم دوسروں سے زیادہ نون کا حقدار ہے۔

لام قسم اور لام ابتدا میں یہ فرق ہے کہ لام ابتدا اسم کو اس کی جانب موڑ دیتا ہے۔ پس ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا ہے۔ جیسے قَدْ عَلِمْتُ لَزَيْدٌ خَيْرٌ مِّنْكَ وَ قَدْ عَلِمْتُ اَنَّ زَيْدًا لَيَقُوْمُ ۔ حالانکہ لام قسم ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ اسم پر داخل نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے ان کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ جیسے قَدْ عَلِمْتُ اَنَّ زَيْدًا لَيَقُوْمَنَّ اور فعل مستقبل میں لام قسم کے ساتھ نون کا لانا لازمی ہے۔

تفسیر:

منافقین کی مفاد پرستی

پھر خداوند عالم نے مومنین کو منافقین کے اقوال و افعال کی پیروی کرنے سے نہی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا (اے ایمان والو! تم ان کافروں جیسے نہ بنو) اس سے منافقین میں عبداللہ بن ابوسلول اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔ یہ سدی و مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ (آیت) عام اور سب کو شامل ہے۔ وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ (جو اپنے بھائی بند سے کہتے ہیں) یعنی منافقین

(اپنے بھائی بند کہتے ہیں) اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ (اگر کبھی سفر پر روانہ ہوجاتے ہیں)(زمین) میں تجارت اور کسب معاش کے لیے سفر کرتے اور مرجاتے ہیں۔ یہ سدی و ابن اسحاق سے مروی ہے۔ زمین کا ذکر خصوصیت سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بیشتر سفر خشکی میں ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے خشکی کے ذکر کر کے سے سمندر کا ذکر کرنے سے اکتفا کی ہے، یہ فقرہ اس جملہ کے مانند ہے کہ: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ اَلْاَرْض، خشکی، دریا اور سمندر دونوں کو شامل ہے۔

اَوْ كَانُوْا غُزًّى (یا کسی جنگ میں شریک ہوتے ہیں) یعنی دشمن سے جنگ کرتے اور قتل کردیئے جاتے ہیں: لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ (اگر وہ ہمارے پاس قیام ہوتے تو نہ مرتے اور نہ ہی قتل ہوتے۔ اللہ اس قِسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے) یعنی انھوں نے یہ بات مومنین کو جہاد سے باز رکھنے کے لیے کہی تھی جسے مومنین نے قبول نہیں کیا اور وہ (جہاد کے لیے) نکل پڑے، چنانچہ انھوں نے عزت بھی پائی اور مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ لہٰذا منافقین کے دلوں میں حسرت رہ گئی۔ لِيَجْعَلَ میں لام، لام عاقبت وانجام کا ہے۔ لام تعلیل نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ایسا کہنے میں کفار کی طرح نہ ہوجانا کہ اللہ اس گفتگو کو ان کے دلوں میں حسرت اور حزن و غم کے لازمی ہونے کا سبب قرار دے، انھیں جو ناکامی حاصل ہوئی ہے اس موافقت کے سبب جس کی وہ امید کر رہے تھے اور جب ان سے کامیابی کی عزت اور مال غنیمت فوت ہوگئے۔

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (جلانا اور مارنا تو اللہ کا کام ہے) یعنی (اللہ) ہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سفر اور حضر میں موت آجانے پر جس (موت) کو وہ تاخیر میں ڈال دے اسے کوئی پہلے نہیں لاسکتا اور جسے وہ پہلے لے آئے اسے کوئی موخر نہیں کرسکتا اس کے فیصلہ کو کوئی رد نہیں کرسکتا، جسے وہ مقرر و معین کردے اس سے کوئی چھٹکارا نہیں دلاسکتا، یہ آیت لوگوں کو قتل کے خوف سے جہاد سے انحراف کرنے سے منع کرنے پر مشتمل ہے اس لیے کہ موت وحیات کا اختیار اللہ سبحانہ کے ہاتھ میں ہے، جس کے لیے اللہ موت مقرر و معین کردے اسے کوئی زندگی نہیں دے سکتا اور جس کے لیے اللہ حیات مقرر کردے اسے کوئی مار نہیں سکتا۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (اور وہ تمھاری ہر حرکت کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے) یعنی جو کچھ انجام دے رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جاننے والا ہے۔ یہ آیت اطاعت میں ترغیب اور معصیت سے خوف دلانے پر مشتمل ہے۔

پھر خداوند عالم نے جہاد پر آمادہ کیا اور وضاحت فرمائی کہ شہادت حاصل ہونے والے مال دنیا سے بہتر

ہے، ارشاد ہوتا ہے: وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ (یعنی اے صاحبانِ ایمان! اگر تم قتل کر دیئے جاؤ) فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (اللہ کی راہ) یعنی جہاد میں۔ اَوۡ مُتُّمۡ یعنی کفار سے جہاد کا ارادہ کرتے ہوئے (یا موت کی آغوش میں چلے جاؤ) جسے تم پر واجب کیا گیا ہے۔

لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَحۡمَۃٌ (تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصّے میں آئے گی) مغفرت گناہوں سے درگذر کرنا اور رحمت ثواب وجنت ہے، یہ دونوں خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ (وہ ان ساری چیزوں سے بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کر رہے ہیں) اموال اور دنیاوی مقاصد سے (بہتر ہیں) یہ آیت مومنین کو تسلی دینے پر مشتمل ہے اس چیز سے جو (مصائب وزحمت) ان پر راہ خدا میں وارد ہوئے ہیں، اس میں مومنین کے قلوب کے لیے تقویت ہے ان پر موت اور شہادت کو آسان اور سہل کرنا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا: وَلَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِلَی اللّٰہِ تُحۡشَرُوۡنَ (خواہ تم مرجاؤ یا قتل کر دیئے جاؤ تم سب اللہ کے حضور جمع کئے جاؤ گے) چاہے تمھیں موت آجائے یا تمھیں قتل کر دیا جائے، تمھاری بازگشت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہونے والی ہے، تمھیں دونوں پر جزا دی جائے گی، نیکی کرنے والے کو نیکی پر، بدی کرنے والے کو بدی پر جس کے وہ حقدار قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا تم وہ عمل انجام جو تمھیں اللہ سبحانہ کے نزدیک کر دے اور اس کی اطاعت وخوشنودی کا باعث ہو اور اس کی راہ میں جہاد کا سبب ہو، دنیا پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرو اسی معنی میں وہ بیت بھی ہے جو امام حسین علیہ السلام کی طرف منسوب ہے:

فَاِنۡ تَکُنِ الۡاَبۡدَانُ لِلۡمَوۡتِ اُنۡشِئَتۡ　　فَقَتۡلُ امۡرَءٍ بِالسَّیۡفِ فِی اللّٰہِ اَفۡضَل

(اگر اجسام کی خلقت مرنے ہی کے لیے ہے تو انسان کا راہ خدا میں تلوار سے شہید ہو جانا سب سے افضل اور بہتر ہے)

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کی مغفرت ورحمت اور مال دنیا کے درمیان کس طرح موازنہ کیا گیا ہے جبکہ دونوں کے درمیان بڑا فاصلہ پایا جاتا ہے، کوئی شخص اس طرح نہیں کہتا کہ اَلدُّرَّۃُ خَیۡرٌ مِّنَ الۡبَعۡرَۃِ دُر مینگنی سے بہتر وافضل ہے۔

(اس سوال کا جواب اس طرح ہے:) لوگ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں یہاں تک کہ دنیا سے بیشتر محبت اور اس میں قیام کے باعث راہ خدا میں جہاد کو ترک کر دیتے ہیں اس اعتبار سے یہ موازنہ جائز ہے۔

❀❀❀❀❀

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا
مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہیں ورنہ اگر کہیں آپ تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد و پیش سے روانہ ہو جاتے۔ ان کی خطائیں معاف کر دیجیے ان کے لیے مغفرت طلب کیجیے اور اپنے امور میں ان سے مشورہ بھی لے لیا کیجیے۔ آپ جب کسی کام کا عزم محکم کر لیں تو اللہ پر بھروسا رکھیں۔ اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۱۵۹)

الفاظ و معانی:

اَلْفَظُّ: اَلْغَلِيْظُ، جفا کار اور سنگ دل۔ اَلْفِظَاظَةُ: کلام کی درشتی اور سخت کلامی۔

اِفْتِظَاظ: طبیعت پر جفا اور زیادتی کرتے ہوئے اوجھڑی کا پانی پینا۔ فِظَاظَة کے لغوی معنیٰ جفا کے ہیں۔ اَلْفَظّ: اوجھڑی کا پانی (اس کا طریقہ یہ ہے کہ اونٹوں کو سیراب کر لیتے ہیں پھر ان کے منہ کو باندھ دیتے ہیں تاکہ جگالی نہ کرنے پائیں اور پھر جب پیاس لگتی ہے تو اونٹ کا پیٹ چاک کر کے اس کی اوجھڑی کو نچوڑ کر پانی پیتے ہیں)

عَزْم: یعنی جس کام کو انجام دینا چاہتے ہیں اس پر دل سے عہد و پیمان کرنا۔ عَزِيْمَة بھی اسی کے معنیٰ میں ہے۔

اَلتَّوَكُّل: عاجزی کا اظہار کرنا اور غیر پر اعتماد اور بھروسہ کرنا۔ اللہ پر توکل یعنی تمام امور اس کے حوالے کر دینا ہیں اور اس کے حسن تدبیر پر بھروسہ اور اطمینان کرنا۔ اس کی اصل اِتِّكَال ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان جس کام کا محتاج ہے وہ اس کی انجام دہی میں اس آدمی پر اکتفا کر لے جس پر وہ بھروسہ کرتا ہے۔ اسی سے اَلْوِكَالَة ہے چونکہ یہ نیابت کے ذریعہ کفایت پر عہد ہے۔

اَلْوَكِيْل جس کے حوالے امور کرتے ہوئے اس پر اعتماد و بھروسہ کیا جاتا ہے (اسے نگراں مقرر کیا جاتا ہے)

ترکیب:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مفسرین کا اجماع ہے کہ مَا زائدہ ہے اور اسی کے مثل عَمَّا قَلِيلٍ بھی ہے کہ مَا جملہ کی تاکید کے لئے آیا ہے۔ مَا کا آنا نظم کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ جس طرح شعر کے وزن کو برابر کرنے کے لئے مَا عنترہ کے شعر میں داخل ہوا ہے:

يَا شَاةَ مَا قَنَصٍ لِمَنْ حُلَّتْ لَهُ　　حَرُمَتْ عَلَيَّ وَلَيْتَهَا لَمْ تَحْرُمِ

فرزدق نے کہا:

نَادَيْتُ أَنَّكَ إِنْ نَجَوْتَ فَبَعْدَ مَا　　يَأْسٍ وَقَدْ نَظَرَتْ إِلَيْكَ شَعُوبُ

اور ایسا اس لئے کہ معنی ذہن میں بیٹھ جائیں۔ پس گویا یہ تکرار کے مانند ہے۔

تفسیر:

عام معافی کا حکم

پھر خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور ان سے درگذر کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث ہے اس لیے کہ اللہ ہی نے آپؐ کو صاحب لطف وکرم، مہربان اور حسن خلق والا بنایا ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ ((اے پیغمبر) یہ اللہ کی رحمت کے سبب ہے۔ لِنْتَ لَهُمْ (آپ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہیں) آپ کا لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا ان کے دین میں داخل ہونے کا باعث ہے، یہ اس لیے ہے کہ آپ ان کے ساتھ حجتوں اور دلائل کے ذریعہ بہترین اخلاق وکرم گستری سے پیش آتے ہیں۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا ورنہ اے محمدؐ! اگر کہیں آپ (تندخو) یعنی جفا کار اور بداخلاق غَلِيظَ الْقَلْبِ یعنی سنگ دل ہوتے اور رحمت ومحبت والے نہیں ہوتے۔ تو لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (یہ سب آپ کے گرد وپیش سے روانہ ہو جاتے) یعنی آپؐ کے اصحاب آپ سے متفرق ہو جاتے اور آپ کے پاس سے چلے جاتے۔ بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے فِظَاظَة اور غِلْظَة دونوں باہم جمع کر دیا ہے اگرچہ دونوں معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے نزدیک ہیں تو اس جمع کا سبب یہ ہے کہ فِظَاظَة (درشتی) کلام میں ہوتی ہے۔ لہٰذا (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی) زبان سے جفا کی اور دل سے قساوت کی نفی کی ہے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ (ان کی خطائیں

معاف کر دیجیے) یعنی آپ کے اور ان کے درمیان جو کچھ ہوا اس سے درگذر کیجیے۔
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (ان کے لیے مغفرت طلب کیجیے) (اس چیز سے) جو ان کے اور میرے درمیان ہوا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان (لوگوں) کے جنگ اُحد فرار کر جانے سے درگذر کیجیے اور ان کے اس گناہ کے لیے استغفار کیجیے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (اور اپنے امور میں ان سے مشورہ بھی لے لیا کیجیے) ان کے نظریات دریافت کیجیے تا کہ آپ کو معلوم ہو ان کے پاس کیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لوگوں سے مشورہ کرنے کے فائدہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے حالانکہ آپ وحی کے سبب بندوں کی حق اور صحیح رائے جاننے سے بے نیاز تھے، تو اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

اول: (یہ عمل) لوگوں کے نفوس کو پاکیزہ بنانے، انھیں مائل کرنے اور ان کے اقدار و مراتب کو بلند کرنے کے لیے تھا تا کہ واضح ہو جائے کہ ان میں سے کس کے اقوال پر بھروسہ اور اعتماد کیا جا سکتا ہے اور ان کے نظریات کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہ قتادہ، ربیع اور ابن اسحاق کا قول ہے۔

دوم: تا کہ آپ کی امت مشورہ کرنے میں آپ کی اقتدا اور پیروی کرے اور مشورہ کو نقص نہ سمجھے اسی لئے مشورہ کرنے والو کی مدح کی گئی ہے کہ: أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ان کا کام باہم مشورہ کرنا ہے۔ یہ سفیان بن عینیہ سے مروی ہے۔

سوم: یہ حکم دو باتوں کے تحت دیا گیا ہے:

(۱) اصحاب کو عزت دینے کے لئے۔

(۲) تا کہ امت مشورہ کرنے میں آپ کی پیروی کرے، یہ حسن اور ضحاک کا قول ہے۔

چہارم: مشورہ کے ذریعہ ان کی آزمائش کی جائے تا کہ فریب کار اور دھوکہ باز سے ناصح اور خیر خواہ واضح اور عیاں ہو جائے۔

پنجم: یہ دنیاوی امور اور جنگی فریب کاری اور دشمن سے مد مقابل ہونے کے متعلق ہے۔ اس طرح کے حالات و معاملات میں لوگوں کی آرا اور مشوروں سے مدد طلب کرنا جائز ہے۔ یہ ابوعلی الجبائی سے روایت ہے۔

فَإِذَا عَزَمْتَ (آپ جب کسی کام کا عزم محکم کر لیں) یعنی جب آپ کسی کام کی دل میں ٹھان لیں اور طے کر لیں۔ جعفر بن محمد اور جابر بن یزید سے فَإِذَا عَزَمْتُ ضمہ (پیش) کے ساتھ کی روایت کی گئی ہے لہٰذا اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ جب میں تمھارے لیے ارادہ کرلوں تم سے موافقت کروں اور تمھیں ہدایت و نصیحت

کردوں تو۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (اللہ پر بھروسا رکھیں) اللہ پر اعتماد کریں، اس پر بھروسہ رکھیں اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کردیں۔

اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) یعنی اس پر بھروسہ رکھنے والوں، اس پر اعتماد کرنے والوں اور اپنے امر کو اس کے لطف و تدبیر کے حوالے کرنے والوں دوست رکھتا ہے۔

یہ آیت ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکارم اخلاق و محاسن افعال اور آپ کے عجیب و غریب امر کے اختصاص پر دلالت کر رہی ہے کہ آپ لوگوں کو بلندی عطا کرنے کے لئے جمع کرتے تھے پھر تواضع و انکساری کے ذریعہ انھیں قریب کرتے تھے اس لیے کہ آپ باعتبار نسب لوگوں میں درمیانی، حسب کے اعتبار سے سب سے بلند، سب سے بڑی سخی، سب سے بڑے سب سے پاکیزہ اور سب سے زیادہ فصیح تھے۔ یہ تمام آپؐ کی بلندی و عظمت کے اسباب ہیں۔ آپؐ کے تواضع و انکساری کا عالم یہ تھا کہ آپؐ اپنے لباس میں پیوند لگاتے، اپنی نعلین خود سیتے، گدھے کی سواری کرتے، اونٹ کو چارہ دیتے، غلاموں اور کنیزوں کی دعوت پر لبیک کہتے، زمین پر بیٹھتے، زمین ہی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے، لوگوں کو کسی بھی غیظ و غضب و درشتی اور ترش روئی کے بغیر اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے، کسی نے آپؐ کی مدح میں کیا خوب کہا ہے:

فَمَا حَمَلَتْ مِن نَاقَةٍ فَوْقَ ظَهْرِهَا　　اَبَرَّ وَ اَوْفىٰ ذِمَّةً مِن مُحَمَّدٍ

کسی بھی ناقہ نے اپنی پیٹھ پر نہیں بٹھایا ایسے آدمی کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ نیک اور وعدہ کو وفا کرنے والا ہو۔

اس آیت میں مومنین کو خطا کاروں سے درگذر کرنے کی ترغیب ہے، اور گناہ گاروں کے لئے استغفار کرنے پر آمادہ کیا گیا ہے اور ان کے درپیش امور میں بعض کو بعض سے مشورہ کرنے پر آمادہ کیا گیا ہے اور انھیں قول میں درشت کلامی اور فعل میں زیادہ روی اور جفا کاری سے نہی کی گئی ہے، خدا پر توکل کرنے اور اپنے امور اس کے سپرد کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی طرح آیت میں اس لطف، پر بھی دلالت ہے کہ جس کے ہم قائل ہیں اس لیے کہ اللہ نے آگاہ فرمایا ہے کہ اگر اس کی رحمت نہیں ہوتی تو نرم دلی اور تواضع واقع نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ آپؐ کو قبول ہی نہ کرتے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ قابل نفرت امور سے پیغمبرؐ اور تمام انبیاء (علیھم السلام) اور ان افراد سے جو ان کے مقام و مرتبہ میں ہیں سے نفی کی گئی ہے چونکہ آپ مخلوق پر حجت ہیں۔ اسی طرح یہ امور انبیاء (علیہم السلام) کے گناہان کبیرہ سے پاک ہونے کا باعث ہیں اس

لیے کہ گناہان کبیرہ بیشتر نفرت کا سبب ہیں۔

اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ ۚ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلۡیَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

اگر نصرت خداوندی تمھارے شامل حال ہو تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمھیں بے سہارا چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کو آئے گا۔

جو سچے مومن ہیں وہ اللہ پر ہی بھروسا رکھتے ہیں۔(۱۶۰)

تفسیر:

اللہ کی مدد کافی ہے

خداوند عالم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو توکل کرنے کا حکم دینے کے بعد اللہ توکل کے واجب ہونے کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ (اگر نصرت خداوندی تمھارے شامل حال ہو) تمھارے دشمنوں پر (یعنی اگر اللہ تمھاری نصرت فرمائے) فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ (تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا) یعنی تمھارے اوپر غلبہ پر کوئی قادر نہیں ہوسکتا اگرچہ تمھارے دشمنوں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور تمھاری تعداد مختصر ہو۔ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡكُمۡ (اور اگر وہ تمھیں بے سہارا چھوڑ دے) اور وہ تمہاری نافرمانیوں کے باعث تمہاری مدد کو روک لے اور تمھیں اور دشمن کو اکیلا چھوڑ دے تو، فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ (تو پھر اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کو آئے گا) بعدہ میں 'ہ' اسم جلالہ اللہ کی طرف پلٹ رہی ہے باعتبار ظن وگمان، معنی حذف مضاف کے ساتھ ہوں گے۔ اس کی تقدیر یہ ہوگی: مِنۡ بَعۡدِ خِذۡلَانِهٖ یعنی اللہ کے تمھیں چھوڑ دینے کے بعد تمھارا کوئی ناصر و مددگار نہیں ہوگا۔ مَنۡ اس مقام پر نفی کی تاکید کے معنی میں ہے جو استفہام کی صورت میں ہے یعنی اس کے بعد تمھاری کوئی بھی مدد نہیں کرے گا۔ حرف استفہام میں نفی کے معنی ہوتے ہیں اس لئے کہ اس کا جواب نفی میں ہونا واجب ہے، پس اس کے سوال کے ذکر نے جواب کے ذکر سے بے نیاز ہے اور یہ مخاطب کے اندر معنیٰ کو بٹھانے کے لئے زیادہ بلیغ ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (جو سچے مومن ہیں وہ اللہ پر ہی بھروسا رکھتے ہیں) آیت کی مراد ظاہر اور واضح ہے یہ آیت اطاعت الٰہی کی ترغیب پر مشتمل ہے جس کے سبب نصرت و مدد کا استحقاق ہوتا پیدا ہے (آیت) معصیت الٰہی سے تحذیر (خوف دلانے، ڈرانے) پر بھی مشتمل ہے جس کے سبب انسان خذلان (ذلت و خواری) کا حقدار بن جاتا ہے نیز آیت اللہ پر توکل کو واجب قرار دے رہی ہے کہ جس کے باعث وہ اس بات سے محفوظ ہو جاتے ہیں کہ انھیں خود ان کے حوالے کر دیا جائے اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ابو علی الجبائی نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جس پر دشمنان خدا غالب آ جائیں اس کی اللہ نے نصرت نہیں کی اگر اللہ سبحانہ نے اس کی نصرت کی ہوتی تو وہ اس پر غلبہ نہیں پا سکتے تھے۔ یہ بندوں کی مصلحت کے اعتبار سے معلوم ہے کہ مومنین کے لیے قتل کے خوف کے ساتھ جہاد پر صبر کے ذریعہ نیک اور ابرار افراد کے مقام و مرتبہ کا پیش کرنا (فائز کرنا) اس اعتبار سے ہے کہ انھیں فجار (بدکاروں) کے غلبہ سے محفوظ نہیں کیا گیا۔ یہ بیان غلبہ کے ذریعہ نصرت و مدد کے بارے میں ہے البتہ حجت کے ذریعہ نصرت تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی راہ حق کی ہدایت فرما کر نصرت فرمائی ہے اس لئے کہ ان کے لیے واضح دلائل اور براہین قاطع معین فرمائے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو انھیں تکلیف دینے میں حُسن نہ ہوتا۔

ابوالقاسم بلخی نے کہا ہے: مومنین ہمیشہ منصور (مدد یافتہ) و کامیاب و کامران ہیں اگر وہ غلبہ حاصل کر لیں تو غلبہ کے ذریعہ منصور ہیں اور اگر ان پر غلبہ پا لیا جائے (یعنی مغلوب ہو جائیں) تو وہ حجت و دلیل کے سبب منصور ہیں۔ کسی بھی طور پر جائز نہیں کہ اللہ کافر کی نصرت کرے۔

جبائی نے کہا ہے کہ غلبہ کے ذریعہ نصرت ثواب ہے اس لیے کہ اللہ کا ظالموں کی نصرت کرنا جائز نہیں ہے اس لیے کہ وہ ظالموں کو ان کے ظلم کے سبب دوسروں پر سر بلندی عطا کرنا نہیں چاہتا۔

ابن اخشید نے کہا ہے کہ یہ ثواب نہیں ہے آپ نے حالت میں کس طرح تصرف کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس گروہ کی نصرت کریں جو ظلم کا شکار ہوا ہے۔ کبھی وہ ثواب کا مستحق نہیں ہوتا۔ خذلان کے متعلق اختلاف نہیں ہے کہ وہ عذاب ہے، خذلان کے معنی دشمن کی اس وقت مدد نہ کرنا جب وہ مدد کا محتاج ہو۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کی مدد و کمک نہ کرے جو اس کی مدد سے بے نیاز ہو تو یہ اس کے لیے خذلان نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ ۚ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۶۱﴾

کسی نبی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خیانت سے کام لے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا۔ پھر ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ (۱۶۱)

قرائت:

ابن کثیر، ابوعمرو اور عاصم نے اَنْ يَّغُل یاء کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ کے ساتھ اَن یُّغَل قرائت کی ہے۔

حجت:

جن قراء نے یَغل یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ یخون (خیانت) کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے:
غَلَّ فِي الْغَنِيمَةِ يَغُلُّ یعنی مال غنیمت میں خیانت کی اور اَغَلَّ بھی اسی معنی میں ہے۔ نمر بن تولب نے کہا:

جَزَى اللهُ عَنَّا جَمْرَةَ بِنْتِ نَوْفِلٍ جَزَاءَ مُغِلٍّ بِالْاَمَانَةِ كَاذِبِ
بِمَا سَأَلَتْ عَنِّي الْوُشَاةَ لِيَكْذِبُوا عَلَيَّ وَ قَدْ اَوْلَيْتُهَا فِي النَّوَائِبِ

اور جن قراء نے یُغَل پڑھا ہے تو اس کے معنی دو طرح سے ہیں:
(۱) کسی بھی نبی کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ اس کی جانب خیانت کی نسبت دی جائے یعنی اس سے یہ کہا جائے غَلَلْتَ۔ جیسے آپ کا یہ کہنا کہ اَسْقَيْتُهٗ یعنی میں نے اس سے کہا کہ سَقَاكَ اللهُ تمھیں سیراب کرے۔ ذوالرمہ شاعر نے کہا:

وَ اَسْقِيْهِ حَتّٰى كَادَ مِمَّا اَبُثُّهٗ تُكَلِّمُنِيْ اَحْجَارُهٗ وَ مَلَاعِبُهٗ

کمیت نے کہا:

وَ طَائِفَةٌ قَدْ اَكْفَرَتْنِيْ بِحُبِّكُمْ وَطَائِفَةٌ قَالَتْ: مُسِيْءٌ وَّ مُذْنِبٌ

یعنی میری جانب کفر کی نسبت دی (مجھے کافر کہا)

(۲) سزاوار نہیں ہے کہ کسی نبی کے ساتھ خیانت ہو یعنی غنیمت میں سے جو کچھ بھی اکٹھا کیا گیا ہے اس میں سے کچھ چوری ہو جائے، اچک لیا جائے۔ اس سلسلہ میں خاص طور سے نبی کا ذکر کرنا اس گناہ کو عظیم بتانے کی خاطر ہے۔ ابوعلی فارسی نے کہا: جن قراء نے اَنۡ یَّغُلَّ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس طرح کے جو فعل آتے ہیں ان میں فعل کی نسبت فاعل کی جانب دی گئی ہے۔ جیسے یہ ارشاد کہ: ما کانَ لَنا اَنۡ نُشۡرِكَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ (سورۂ یوسف، آیت ۳۸) و ما کانَ لِیَأۡخُذَ اَخَاهُ (سورۂ یوسف، آیت ۷۶) وَ ما کانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوتَ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۵) وَ مَا کانَ اللّٰهُ لِیُضِلَّ قَوۡماً (سورۂ توبہ، آیت ۱۱۵) وَ ما کانَ اللّٰهُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَى الۡغَیۡبِ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۹)۔ یہ کہنا بھی بعید نہیں ہے: مَا کَانَ لِزَیۡدٍ اَن یُّضۡرَبَ وَمَا کَانَ لِزَیۡدٍ لِیُضۡرَبَ۔ تو ان میں فعل کی نسبت مفعول کی جانب دی گئی ہے۔ اسی طرح یہ ارشاد الٰہی بھی ہے کہ وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ کہ فعل کی نسبت فاعل کی طرف دی جائے۔

مروی ہے کہ ابن عباس نے اَنۡ یَغُلَّ پڑھا تو ان سے کہا گیا کہ عبداللہ بن مسعود نے تو یُغَلَّ پڑھا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا: بَلٰی وَ اللّٰهِ وَیُقۡتَل۔

یہ بھی ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جب نبی کو قتل کیا جاتا ہے تو ان کی جانب خیانت کی نسبت کیوں نہیں دے سکتے ہیں؟

الفاظ ومعانی:

اَلۡغُلُوۡل کی اصل اَلۡغِلَل ہے۔ یعنی درختوں کے درمیان پانی کا پہنچنا۔

اَلۡغُلُوۡل یعنی خیانت کے ہیں اس لئے کہ ملکیت میں غیر حلال (ناجائز) طریقہ سے پوشیدہ طور پر جاری ہوتی ہے۔ اسی سے الغِلّ ہے جس کے معنی حقد (کینہ) کے ہیں جو غلل نفس کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اسی سے اَلۡغَلِیۡل ہے جس کے معنی پیاس کی حرارت ہے۔ اسی سے الغَلَالَة (وہ کپڑا) ہے جسے لباس کے نیچے پہنا جاتا ہے۔

شان نزول:

ابن عباس وسعید بن جبیر سے روایت کی گئی ہے کہ یہ آیت قطیفة حمراء کے بارے میں نازل ہوئی

ہے جس نے بدر کے دن اپنا بھیڑوں کا گلہ گم کر دیا تھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ شاید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لے لیا ہو۔ ضحاک کی روایت ہے کہ ایک شخص نے جنگ حنین میں ہوازن کے مال غنیمت سے ایک سوئی کی خیانت کی تھی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ مقاتل سے روایت ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے غنائم (اموال غنیمت) کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب مال غنیمت کی خواہش اور طمع میں تیراندازوں نے ٹھکانوں کو چھوڑ دیا تھا اور لوگوں نے بیان کیا تھا کہ ہمیں اس بات کا خوف تھا کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نہ کہہ دیں جو جس چیز کو لے وہ اسی کی ہے اور اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ جس طرح بدر کے دن تقسیم نہیں کی گئی تھی اور وہ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تھے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھارا خیال ہے میں خیانت کروں گا اور تمھارے درمیان مال غنیمت تقسیم نہیں کروں گا؟ چنانچہ اللہ نے آیت نازل فرمائی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مال غنیمت تقسیم کیا گیا، فوج کے ہراول دستہ کے لیے تقسیم نہیں کیا گیا، جب فوج کا وہ دستہ آیا تو انھوں نے کہا: مال فئی تقسیم کیا گیا اور ہمارے لیے تقسیم نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم سمجھانے کے لیے آیت نازل فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت وحی کی پہونچانے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اس میں مشرکین کے دین کا نقص اور ان کے خداؤں کی برائی کی گئی تھی، مشرکین نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ آپ اسے سمیٹ لیجئے (بند کیجئے) چنانچہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

ہر طرح کی خیانت حرام ہے

خداوند عالم نے امر جہاد کو مقدم فرمایا اس کے بعد اموال غنیمت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس میں خیانت کرنے سے نہی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (کسی نبی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خیانت سے کام لے) جس کی تقدیر اس طرح ہے: کسی نبی کے لیے خیانت کرنا ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کہ 'اَنْ' فعل کے ساتھ مصدر کے معنی میں ہوتا ہے یعنی نبوت اور خیانت جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ کو وحی میں سے کچھ بھی چھپانے کا حق نہیں ہے۔ یہ ابن اسحاق سے مروی ہے اس کی تقدیر اس طرح ہے: نبیؐ کے لیے ممکن نہیں ہے جو پیغام امت تک پہونچاتے ہیں اس میں خیانت کریں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام منقولہ ہے جس کی تقدیر یوں ہے: مَا كَانَ النَّبِيُّ لِيَفْعَلَ، نبی خیانت نہیں کر سکتے جیسا کہ اس کا

ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ یعنی اللہ (کسی کو) اپنا فرزند قرار نہیں دے سکتا۔ دوسری قرأت کے مطابق (معنی اس طرح ہوں گے) نبی اپنے اصحاب کے ساتھ خیانت نہیں کر سکتے یا (مال) غنیمت سے کسی چیز کا چھپانا اور پوشیدہ کرنا ہے جس کے متعلق گفتگو گذر چکی ہے۔ نبیؐ کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے اگرچہ نبی کے علاوہ امام اور مسلمانوں کے امیر کے لیے بھی خیانت کرنا جائز نہیں ہے۔ تو اس کی دو وجہیں ہیں:

اول: نبیؐ کا خیانت کرنا بہت بری بات ہے اور وہ دوسروں کی خیانت کی نسبت بہت بڑی ہے یہ اس کے اس ارشاد کے مانند ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (سورۂ حج، آیت ۳۰؛ لہٰذا تم ناپاک بتوں سے پرہیز کرتے رہو) اگرچہ ہر طرح کے رجس سے اجتناب واجب ہے۔

دوم: نبیؐ کا ذکر اس لیے خصوصیت سے کیا گیا ہے کہ آپؐ کی ذات (مال) غنیمت کے امر کو قائم کرنے والی ہے جب خیانت کرنا آپؐ کے لیے حرام ہے جو کہ صاحب امر ہیں تو دوسروں پر بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا) یعنی خائن انسان (مال خیانت کو) قیامت کے دن اپنی پشت پر لیے حاضر ہوگا جیسا کہ ایک طولانی حدیث میں روایت کی گئی ہے: خبردار! تم میں سے کوئی بھی اونٹ کے ساتھ خیانت نہ کرے ورنہ اسے وہ روز قیامت اپنی پشت پر لیے حاضر ہوگا اور وہ اپنی صدا بلند کرے گا۔ خبردار تم میں سے کوئی گھوڑے کے ساتھ خیانت نہ کرے پس وہ اسے اپنی پشت پر لیے حاضر ہوگا جو ہنہنا رہا ہوگا اور وہ کہے گا: اے محمدؐ! اے محمدؐ! میں کہوں گا: یقیناً میں نے (پیغام) پہونچا دیا، میں نے پہونچا دیا، میں تیرے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ یہ ابن عباس، ابوحمید، احمد ساعدی، ابن عمرو اور قتادہ سے مروی ہے۔ جبائی نے بیان کیا ہے کہ یہ (عمل) اس لیے ہوگا تا کہ اسے لوگوں کے سامنے رسوا کیا جائے۔ بلخی نے بیان کیا ہے: ممکن ہے کہ روایت جو بات بیان کر رہی ہے وہ بطور مثال ہو گویا جب خداوند عالم اسے روز قیامت رسوا کرے گا وہ اس جیسا ہوگا کہ وہ اسے اپنی پشت پر لادے ہوگا اور آواز بلند کرے گا۔

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منادی کو حکم دیتے کہ وہ لوگوں کے درمیان اعلان کر دے کہ دھاگے اور سوئی کو (اس کے مالک تک) پلٹا دو اس لیے کہ خیانت روز قیامت ننگ و عار کا باعث ہوگی۔ لہٰذا ایک شخص کاتے ہوئے بال لے کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں نے یہ بال اس لیے حاصل کیے تھے تا کہ اپنے اونٹ کی جھول (پالان) بناؤں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس میں

میرا حصہ تیرے لیے ہے۔ اس نے عرض کیا: جب یہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے تو اس میں میری کوئی حاجت و غرض نہیں ہے۔

بہتر اور اولیٰ یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو شخص بھی خیانت کرے گا روز قیامت وہ پورا پورا ادا کرے گا، پس اس کا خیانت کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھانا علامت و نشانی ہوگا جس سے اس کی شناخت ہوگی۔ یہ اللہ کا حکم ہر اس شخص کے لیے ہے جسے اس کی معصیت و نافرمانی کی پوری پوری جزا اور بدلہ دیا جائے گا اگر اس نے اپنے گناہ اور معصیت سے توبہ نہیں کی ہوگی یا اللہ کا ارادہ ہو کہ اس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے کہ اس کی معصیت و گناہ کو بشکل علامت ظاہر کردے جو اس کی معصیت کے مناسب ہوتا کہ اہل قیامت اس کے متعلق جان لیں اور انھیں اس کے عذاب کے استحقاق کا سبب بھی معلوم ہو جائے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ (سورۂ رحمٰن، آیت ۳۹؛ پھر اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا) اللہ کا یہی حکم ہے، ہر اس شخص کے لیے جو روز قیامت اس کی اطاعت کے ساتھ آئے گا (روز قیامت اللہ کی تمام تر اطاعت انجام دے کر آئے گا) تو اللہ اس کی اطاعت کے ذریعہ علامت ظاہر کردے گا جس کے ذریعہ وہ پہچانا جائے گا۔

ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (پھر ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا) یعنی ہر نفس کو اس کے کیے کی مکمل اور پوری پوری جزا دی جائے گی۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (اور کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا) یعنی کسی سے بھی اس ثواب کی مقدار کم نہیں کی جائے گی جس کا وہ مستحق ہوگا، نہ ہی اس کے اس عذاب کی مقدار میں اضافہ کیا جائے گا جس کا وہ حقدار ہوگا۔

اس آیت میں (فرقہ) مجبرہ کے اس قول کے باطل ہونے پر دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ اپنے اولیاء (احباب خاصان خدا) پر عذاب نازل کرے تو ظلم نہیں ہے اس لیے کہ اس نے وضاحت فرمادی ہے اگر وہ (اس فعل) کی پوری اور مکمل جزا نہ دے جو اس نے انجام دیا ہے تو ظلم ہوگا۔

❀❀❀❀❀

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو شخص اللہ کی مرضی پر چلنے والا ہو وہ اس شخص جیسے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو جو بدترین ٹھکانا ہے۔(۱۶۲) (ان لوگوں کے اللہ کے ہاں مختلف درجات ہیں اور اللہ اُن سب کے اعمال کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔(۱۶۳)

الفاظ و معانی:

بَآءَ یعنی رَجَعَ: پلٹنا۔

اَلسَّخَطُ مِنَ اللّٰهِ (یعنی عذاب الٰہی) عذاب اور لعنت کے مستحق کے لئے عذاب کا ارادہ کرنا۔ سخط غیظ کے برعکس ہے اس لیے کہ غیظ طبیعت کا ہیجان اور جوش مارنا اور نفس کا مضطرب و بے قرار ہونا ہے اور غیظ کا استعمال اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

اَلْمَصِيْر: مَرْجَع (محل بازگشت۔ اَلْمَصِيْر اور اَلْمَرْجَع کے درمیان فرق ہے: مَرْجَع کے معنی سابقہ حالت کی جانب پلٹ جانا ہے اور اَلْمَصِيْر کے معنی کسی چیز کا اس حالت کے برعکس پلٹنا ہے جس پر وہ پہلے تھی جس طرح مٹی کا ٹھیکری بن جانا۔ اس طرح نہیں کہا جائے گا رَجَعَ الطِّيْنُ خَزَفًا مٹی ٹھیکری کی طرف پلٹ گئی (مٹی ٹھیکری بن گئی) چونکہ وہ پہلے ٹھیکری نہیں تھی۔

اَلدَّرَجَة: رتبہ (مرتبہ) اَلتَّرَقِّيْ فِي الْعِلْمِ دَرَجَةٌ بَعْدَ دَرَجَةٍ یعنی علم میں ترقی درجہ کے بعد درجہ یعنی منزل کے بعد منزل ہے۔ مشہور زینہ اور سیڑھی کے مانند۔

شان نزول:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو اُحد کی طرف جانے کا حکم دیا تو منافقین کا گروہ نہیں گیا۔ مومنین نے بھی ان کی پیروی کرلی تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

رضوان الٰہی کا اتباع کرنے والا

جب خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ ہر نفس کو اس کے کیے کی پوری جزا اور بدلا دیا جائے گا، خیر ہو یا شر اس کے فوراً بعد خیر اور شر کی کمائی کرنے والے کے متعلق بیان فرمایا: اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوٰنَ اللّٰهِ (بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو شخص اللہ کی مرضی پر چلنے والا ہو) اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ کیا خیانت ترک کر کے رضائے الٰہی کی پیروی کرنے والا اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو خیانت کر کے غضب پروردگار میں گرفتار ہوگیا ہو۔ یہ حسن وضحاک سے مروی ہے۔ اسی کو طبری نے اختیار کیا ہے چونکہ یہ گذشتہ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔

دوم: کیا راہ خدا میں رضائے الٰہی کی پیروی کرنے والا كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ (وہ اس شخص جیسے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو) جہاد سے فرار کر کے اللہ کے عذاب میں مبتلا ہونے والے کے مانند ہوسکتا ہے؟! یہ زجاج اور جبائی کا قول ہے۔

وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ (اور جس کا آخری ٹھکانا جہنّم ہو) جس کا انجام و بازگشت جہنم ہو۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (جو بدترین ٹھکانا ہے) یعنی اس کا مقام و مستقر (ٹھکانہ) کس قدر برا ہے۔ آیت میں استفہام ہے لیکن مراد تقریر ہے (یعنی حکم کا معین و مقرر کرنا) ہے دونوں فریقوں کے درمیان فرق ہے یعنی رضائے الٰہی کی پیروی و اتباع کرنے والا اس کے عذاب میں گرفتار جیسے شخص کے مانند نہیں ہے۔ هُمْ دَرَجٰتٌ (ان لوگوں کے مختلف درجات ہیں) یعنی وہ صاحبان درجات (مراتب) ہیں۔ عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے یہاں) مومنین بلند درجات اور مراتب والے ہیں اور کافر پست درجات والے ہیں۔ اس کے معنی میں دو اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: اہل ثواب اور اہل عذاب کے مراتب کے اختلاف سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے (ایک کے لیے) نعمت و کرامت اور (دوسرے کے لیے) عذاب و رسوائی ہے۔ اسے درجات سے تعبیر کرنا مجاز ہے۔

دوم: دونوں فریق کے مراتب کا اختلاف مراد ہے کہ جنت کے طبقات ہیں اور ان میں سے بعض بعض سے اعلیٰ اور بلند ہیں جیسا کہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ جنتی لوگ مقام علیین والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح ستارے آسمان کی بلندی میں نظر آتے ہیں۔ جہنم کے بھی طبقات ہیں جن میں بعض بعض سے

پست ہیں۔ابن ہرمہ کے بقول اس آیت میں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (اور اللہ اُن سب کے اعمال کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے) یعنی جاننے والا ہے۔آیت میں لوگوں کے لیے رضائے الٰہی کے اتباع کی ترغیب اور اس کے عذاب اور ناراضگی کا باعث قرار پانے والے (عمل) سے ڈرایا گیا ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ بندوں کے رازہائے سربستہ اللہ کے نزدیک ظاہر و عیاں ہیں، اسی طرح آیت میں بھروسہ اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ اس کے یہاں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع و برباد نہیں جاتا اس لیے کہ اس پر ان میں سے کوئی چیز بھی مخفی و پوشیدہ نہیں رہتی لہٰذا وہ اطاعت پر ثواب اور معصیت پر عذاب دیتا ہے۔

❁❁❁❁❁

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

یقیناً اللہ نے اہل ایمان پر احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا ہے جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور انھیں کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے حالاں کہ یہ لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔(۱۶۴)

الفاظ و معانی:

اَلْمَنُّ کے حقیقی معنیٰ اَلْقَطْع کے ہیں۔اَلْمَنّ یعنی نعمت چونکہ اس کے ذریعہ آزمائش اور امتحان اور معصیت منقطع ہو جاتی ہے۔اس طرح کہا جاتا ہے: مَنَّ فُلَان عَلَيَّ بِکَذا مجھ پر فلاں نے اس طرح احسان کیا یعنی جس آزمائش میں میں گرفتار تھا اس نے مجھے اس سے بچالیا۔اَلْمَنّ کے معنی نعمت کا مکدر کرنا ہے چونکہ انسان اس کے ذریعہ وجوب شکر سے منقطع ہو جاتا ہے۔اَلْمُنَّة یعنی قوت چونکہ اس کے ذریعہ اعمال کا یقین حاصل کرتا ہے۔

تفسیر:

خدا کی بہت بڑی نعمت

پھر خداوند عالم نے ہمارے پیغمبر ﷺ کو مبعوث فرما کر مخلوقات پر اپنی عظیم نعمت کا ذکر فرمایا: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ (یقیناً اللہ نے احسان کیا ہے) یعنی اللہ نے انعام کیا عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (اہل ایمان پر کہ ان کے درمیان ایک رسول کو مبعوث کیا ہے) احسان کیے جانے والے افراد میں مومنین کا ذکر خصوصیت سے فرمایا ہے، اگر چہ آپ کو تمام مخلوقات کے لیے مبعوث کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین پر سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں اور آپؐ کے بیان و ارشاد سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کا بیان ارشاد الٰہی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں گذر چکا ہے۔

مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (انھیں میں سے) اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: اس سے پیغمبر ﷺ کی قوم و قبیلہ مراد ہے جو آپؐ کے نشو و نما، صداقت و امانت داری سے واقف ہیں۔ آپ کا اُمّی یعنی لکھنا پڑھنا نہ جاننا اس لیے تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے جو چیز آپ کو عطا کی گئی ہے وہ نازل شدہ وحی ہے جو آپؐ کے شرف اور لوگوں کو دعوت ایمان دینے کا سبب ہے۔

دوم: اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ انھیں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں ان پر آنحضرت ﷺ سے حکمت کا سیکھنا آسان ہے۔ پس یہ عربوں سے مخصوص ہے۔

سوم: تمام مومنین کو شامل ہے۔

اَنْفُسِهِمْ سے مراد انھیں کی جنس سے ہونا ہے نہ تو کسی فرشتہ کو مبعوث کیا نہ ہی کسی جن کو۔ اس میں منت و احسان کا مقام یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو ان کے درمیان مبعوث کیا جو آپ کے امر کو پہچانتے ہیں اور آپؐ کی شان سے واقف ہیں۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے) یعنی قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور انھیں کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے) اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے۔

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (حالاں کہ یہ لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے) یعنی یہ لوگ (کفار) واضح اور کھلی گمراہی میں تھے اور ان کا کفر ضلالت و گمراہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے

انھیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ نجات بخشی۔

❀❀❀❀❀

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾
یہ تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو تم کہتے ہو: یہ کہاں سے آگئی حالاں کہ جنگ بدر میں اس سے دُگنی مصیبت تمھارے ہاتھوں فریق مخالف پر آچکی ہے۔ (اے نبی) ان سے کہیے یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۱۶۵)

ترکیب:

اَوَلَمَّآ میں واؤ جملہ کو جملہ پر عطف دینے کے لئے داخل ہوا ہے۔ ہاں واؤ سے پہلے ہمزہ استفہام اس لئے آگیا ہے کہ وہ صدارت طلب ہے۔ اس واؤ نے دوسرے جملہ کو پہلے جملہ سے متصل کر دیا ہے تا کہ نشاندہی کرے کہ دوسرا جملہ معنی میں پہلے جملہ سے مربوط ہے اور وہ معنی یہ ہے کہ ایک فرقہ کے لئے لعنت کی یاد دہائی کے ذریعہ گناہ پر تنبیہ کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔

تفسیر:

جنگ احد کا ایک اور جائزہ

اللہ سبحانہ نے دوبارہ جہاد کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا (یہ تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم پر مصیبت نازل ہوتی ہے حالاں کہ اس سے دوگنی مصیبت تمھارے ہاتھوں فریق مخالف پر آچکی ہے) یعنی جب تم قتل اور زخموں سے دچار ہوئے اس طرح جب یہ مصیبت روز احد مسلمانوں پر پڑی کہ ستر مسلمان شہید کر ڈالے گئے جبکہ یہ مسلمان روز بدر مشرکین پر اس سے دوہری مصیبت ڈال چکے تھے اس لیے کہ ستر مشرکین قتل کیے گئے تھے اور ستر اسیر کیے گئے تھے۔ یہ قتادہ، عکرمہ، ربیع اور سُدی سے مروی ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تم نے بدر میں مشرکین پر دوگنی مصیبت وارد کی۔ یہ بھی

کہا گیا ہے تم نے جنگ بدر کے روز مشرکین میں سے ستر کو قتل کیے اور احد میں ستر قتل کیے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ یہ قول ضعیف ہے اس لیے کہ سیرت نگاروں کے ذکر کے خلاف ہے۔ چونکہ ان کے درمیان اس بارے میں اختلاف نہیں ہے کہ اُحد کے دن ان کے بہت کم لوگ قتل کیے گئے تھے۔ لہٰذا ان کا یہ قول جمہور کے قول کے خلاف ہے۔

قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا (توتم کہتے ہو یہ کہاں سے آگئی؟) یعنی کس وجہ سے یہ مصیبت ہم پر پڑی جبکہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے درمیان اللہ کا رسول ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے اور وہ سب مشرک ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اس لیے ناواقفیت کا اظہار کر رہے تھے (یا ناواقف امر کے متعلق دریافت کر رہے تھے) چونکہ ان سے اللہ کی نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا اگر وہ اس کی اطاعت کریں گے۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ((اے نبی) ان سے کہیے یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے) اے محمدؐ! آپؐ کہہ دیجیے تم جو شکست اور قتل سے دچار ہوئے ہو یہ خود تمھاری جانب سے ہے یعنی تم نے اپنے پروردگار کے حکم کی مخالفت کی اور اطاعت رسولؐ کو ترک کر دیا۔ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے جنگ اُحد میں جہاد کے لیے مدینہ سے باہر نکلنے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی تھی جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمادیا تھا کہ وہ مدینہ کو پناہ گاہ قرار دیں اور وہ مشرکین کو وہاں بلائیں۔ انھوں نے کہا: ہم تو اس چیز سے زمانہ جاہلیت میں بھی منع کرتے تھے، اب تو ہم اسلام پر ہیں) اے اللہ کے رسول! آپؐ ہمارے نبی ہیں اس سے روکنے کے زیادہ حقدار اور قدرت مند ہیں۔ یہ قتادہ اور ربیع کا قول ہے۔

دوم: یہ اس لیے تھا کہ ان لوگوں کو جنگ بدر میں قیدیوں کے فدیہ کا اختیار دیا گیا تھا جبکہ ان کے بارے میں قتل کا حکم تھا، ان پر شرط قرار دی گئی تھی کہ اگر تم نے فدیہ قبول کیا تو آئندہ جنگ میں اتنے ہی لوگ مارے جائیں گے جتنے آزاد ہوئے ہیں اور فدیہ لیا ہے۔ انھوں نے کہا: ہم فدیہ لینے پر راضی ہیں اس سے استفادہ کریں گے اور جب ہم سے بعد میں قتل کر دیے جائیں گے تو ہم شہید ہوں گے۔ یہ علیؑ اور عبیدہ سلمانی سے مروی ہے۔ یہی روایت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

سوم: یہ بات جنگ اُحد میں تیراندازوں کے برخلاف تھی، جب انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مراکز (ٹھکانوں) پر ڈٹے رہنے کا حکم دیا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔) اللہ بعد میں تمھاری نصرت پر قادر ہے اگرچہ تمھاری مخالفت کے سبب اس نے فی الحال تمھاری نصرت و مدد نہیں کی۔

❁❁❁❁❁

وَمَآ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیَعْلَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

لڑائی کے دن جو نقصان تمھیں اٹھانا پڑا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں مومن کون ہیں؟ (۱۶۶) اور یہ معلوم کر لے کہ منافق کون ہیں؟ جب ان سے کہا گیا: آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم دفاع کرو تو کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ لوگ جب یہ بات کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے جو باتیں کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتیں اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ (۱۶۷)

ترکیب:

فَبِاِذْنِ اللّٰهِ پر فاء اس لئے داخل ہوا ہے کہ مَا جو کہ اَلَّذِیْ کے معنی میں ہے، جواب جزا کے مانند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صلہ فعل پر معلق ہے۔ جس طرح شرط میں فعل پر معلق ہوتا ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: اَلَّذِیْ قَامَ فَمِنْ اَجْلِ اَنَّهٗ كَرِیْمٌ۔ یعنی اس کے کھڑے ہونے کی بنا پر صحیح ہے کہ وہ کریم ہے اور اس کے کرم کی وجہ سے کھڑا ہو۔

تفسیر:

مومنین اور منافقین کی پہچان

وَمَآ اَصٰبَكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ یعنی اے صاحبانِ ایمان! لڑائی کے دن جو نقصان تمھیں اٹھانا پڑا جنگ احد میں اسلام وکفر کے لشکر کے باہم مقابلہ میں تمھارے قتل ہونے والوں کے سبب جو کچھ تمھیں تکلیف واذیت ہوئی۔ فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ (وہ اللہ کے اذن سے تھا) یعنی وہ علم الٰہی میں تھا اسی سے اس کا یہ ارشاد ہے و اذان من اللہ یعنی اعلان الٰہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمھارے اور ان کے درمیان اللہ کے تخلیہ کے سبب ہے جو فعل میں اطلاق کا قائم مقام ہوتا ہے کہ اس کام کی رکاوٹوں کو برطرف کردیا اور کام انجام دینے کی قدرت دے دی جس کے ساتھ مکلف بنانا درست ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے عذاب کے باعث ہے کہ اللہ نے ہر گناہ کا عذاب قرار دیا ہے، یہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی مخالفت کرنے کا عذاب تھا۔ اس مقام پر 'اذن' سے مراد مباح قرار دینا اور چھوڑ دینا ممکن نہیں ہے جیسا کہ لفظ اسی بات کا مقتضی ہے اس لیے کہ خداوند عالم نہ تو گناہوں کو مباح قرار دیا ہے اور نہ ہی انھیں مطلق (آزاد) چھوڑتا ہے، کافر کا کسی مسلمان کو قتل کرنا گناہ عظیم ہے لہٰذا اللہ اس کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہے؟!

وَلِيَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا (اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں مومن کون ہیں؟ اور یہ معلوم کرلے کہ منافق کون ہیں؟) یعنی مومنین کو منافقین سے الگ کردے اس لیے کہ اللہ اشیاء کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی جانتا ہے چنانچہ اس وقت جاننا جائز وممکن نہیں ہے جب تک کہ وہ اس کے متعلق واقف اور عالم نہ ہو مگر یہ کہ اللہ سبحانہ نے معلوم کو مجاز اً علم کہا ہے یعنی تاکہ معلوم ظاہر وعیاں ہوجائے جیسے مومن ومنافق۔

وَقِيۡلَ لَهُمۡ (یعنی جب ان منافقین سے کہا گیا) تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو) مورخین نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی منافقین جنگ اُحد میں تین سو (۳۰۰) افراد کے ہمراہ علیحدہ ہوگئے اور کہنے لگے کہ کس چیز پر ہم اپنے آپ کو قتل کریں؟! ان لوگوں سے عبداللہ بن عمر بن حزام انصاری نے کہا: آؤ راہ خدا میں جہاد کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ چھوڑو۔

اَوِ ادۡفَعُوۡا (یا کم از کم دفاع کرو) یا اپنے حریم اور نفسوں سے دفاع کرو اگر تم راہ خدا میں قتال نہیں کر

سکتے۔کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہمارے ساتھ قیام کرو اور ہماری تعداد میں اضافہ کرو، یہ حکم اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مجاہدین کی تعداد بڑھانا بھی جہاد میں شمار ہوتا ہے اور جنگ کے مانند ہے۔ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ (تو کہنے لگے اگر ہمیں علم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے) یعنی منافقوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ کا علم ہوتا تو ہم ضرور ان سے جنگ کرتے۔انھوں نے یہ بات جنگ ترک کرنے اور مدینہ واپسی کی ملامت کو دور کرنے کے لیے عذر کے بطور کہی تھی تو ان لوگوں سے کہا: خدا تمھیں دور کرے اللہ تم لوگوں سے بے نیاز کرے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بات کے قائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جب آپؐ ان لوگوں کو جنگ کی دعوت دے رہے تھے۔یہ اصم سے مروی ہے۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ (وہ لوگ جب یہ بات کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے) یعنی وہ یہ بات کہہ کر کفر سے بہت زیادہ نزدیک ہو گئے جبکہ اس سے قبل اپنے ظاہری حالات کے اعتبار سے ایمان سے نزدیک تھے۔یہاں تک کہ انھوں نے پردہ دری کی (کفر کا حجاب چاک کر دیا) چنانچہ مومنین کو وہ باتیں معلوم ہوگئیں جو وہ نہیں جانتے تھے،لام، اِلٰی (تک) کے معنی میں ہے یعنی هُمْ اِلَى الْكُفْرِ اَقْرَبُ مِنْهُمْ اِلَى الْاِيْمَانِ جیسا کہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (شکر ہے پروردگار کا کہ اس نے ہمیں یہاں تک آنے کا راستہ بتا دیا) یعنی اِلٰی هٰذَا۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (وہ اپنی زبانوں سے جو باتیں کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتیں) اَفْوَاه (یعنی زبان) کا ذکر کرنا تاکید کے لیے ہے اس لیے کہ قول کی نسبت اسی کی طرف دی جاتی ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَفْوَاه کا ذکر زبان کی بات اور کتاب کی بات کے درمیان کا فرق کی وجہ سے کہا ہے اور اس سے مراد ان کا یہ کہنا ہے کہ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ یعنی اگر ہم جنگ کے بارے میں جانتے تو تمھاری پیروی ضرور کرتے اور ان کے دلوں میں یہ بات تھی کہ اگر جنگ ہوتی تو یہ لوگ ان کے ساتھ جنگ نہ کرتے ، نہ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت و مدد کرتے۔کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنی زبان سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایمان سے قربت کی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں۔ان کے دلوں میں فقط کفر ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ (اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے اچھی طرح جانتا ہے) یعنی اللہ ان کے پوشیدہ نفاق اور شرک سے بخوبی واقف ہے۔

❀❀❀❀❀

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۶۸﴾

یہ تو وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائی بندوں کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ (اے نبی) کہہ دیجیے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی موت کو اپنے آپ سے ٹال کر دکھاؤ۔ (۱۶۸)

الفاظ و معانی:

اَلدَّرْءُ: دفع کرنا۔ دَرَءَ عَنْهُ یعنی اس سے دور کیا۔

ترکیب:

اَلَّذِیْنَ، اَلَّذِیْنَ نَافَقُوْا کا بدل ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہوسکتا ہے اور یَكْتُمُوْنَ میں واؤ ضمیر کا بدل ہونے کی بنا پر مرفوع بھی ہوسکتا ہے اور اس تقدیر: هُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کی بنا پر مبتدا کی خبر ہونے کی بنا پر بھی مرفوع ہوسکتا ہے۔

تفسیر:

منافقین کی بے بنیاد باتیں

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا یہ تو وہی لوگ یعنی منافقین ہیں جنھوں نے کہہ دیا لِاِخْوَانِهِمْ (اپنے بھائی بندوں کے بارے میں) جو نسب میں ان کے برادر تھے نہ کہ دین میں یعنی عبداللہ بن اُبیّ اور اس کے ساتھیوں نے شہداء احد کے بارے میں کہا وَقَعَدُوْا (جو خود تو بیٹھے رہے) یعنی یہ سب کہنے والے (خود تو بیٹھے رہے کہ) یہ جابر و قتادہ، سدی اور ربیع سے مروی ہے۔

لَوْ اَطَاعُوْنَا (اگر وہ ہماری بات مان لیتے) (اگر یہ لوگ) گھر میں بیٹھتے جنگ کے لیے نہ جانے میں ہماری اطاعت کرتے تو مَا قُتِلُوْا قتل نہ کیے جاتے۔ قُلْ (اے نبی) کہہ دیجیے کہ) فَادْرَءُوْا یعنی دور کر کے اور ٹال کر دکھاؤ۔ عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنی

موت کو اپنے آپ سے) اس گفتگو میں ان کے لیے موت کا ٹالنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ممکن ہے دشمن ان کے گھروں کے اندر گھس کر انھیں قتل کر دے، اللہ نے انھیں حکم دیا ہے کہ اپنے آپ سے موت کو ٹال کر دکھائیں چونکہ ان کا یہ کہنا تھا اگر وہ نہ نکلتے تو قتل نہ کیے جاتے اس لیے کہ جو شخص قتل سے سالم رہنے کو علم غیب کے ذریعہ جانتا ہو تو اس پر ہے کہ وہ خود کو موت سے محفوظ رکھنے پر قادر ہو۔ لہٰذا قائل کو چاہئے کہ موت کو خود سے دور کر دے جو اس کے لیے زیادہ ضروری ہے۔

اس آیت میں جہاد کے بارے میں ترغیب اور اس امر کی وضاحت ہے کہ ہر شخص کو اپنی اجل (مدت) پر موت آئے گی چنانچہ اسے جہاد سے بیٹھے رہنے کے لیے عذر نہیں کرنا چاہئے اس لیے کہ کبھی مجاہد بچ جاتا ہے اور بیٹھ جانے والا مر جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ پر توکل اور بھروسہ کرنا واجب ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رَبّ کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔(۱۶۹) اللہ نے انھیں جو فضل عطا کیا ہے وہ اس پر خوش و خرم ہیں اور اس بات سے مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان سے ملحق نہیں ہوئے ہیں ان کے لیے بھی کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہے۔(۱۷۰) وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں ہیں اور اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتا۔(۱۷۱)

قرائت:

ابن عامر نے قُتِّلُوْا تشدید کے ساتھ اور بقیہ نے بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔ صرف کسائی نے اِنَّ اللّٰهَ

لَا یُضِیعُ میں اِنَّ کے ہمزہ کو مکسور اور بقیہ نے مفتوح پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے قُتِلُوْا بغیر تشدید کے پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ بغیر تشدید کے پڑھنا قلیل و کثیر (کم اور زیادہ) دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ قَتَلْتُ الْقَوْمَ۔ اس میں کثیر (زیادہ) کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔ جیسے آپ کا یہ کہنا: ضَرَبْتُ زَیْدًا ضَرْبَۃً ۔ یہ قلت کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

اور تشدید کے ساتھ پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ شہداء زیادہ ہیں اور فَعَّلَ (باب تفعیل سے) کثیر سے مخصوص ہے، قلیل سے نہیں۔

اَنَّ کو فتحہ دینے کی دلیل یہ ہے کہ مراد یہ ہے: یَسْتَبْشِرُوْنَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجْرَھُمْ وَیُوَفِّرُ عَلَیْھِمْ وَ یُوْصِلُہٗ اِلَیْھِمْ مِنْ غَیْرِ نَقْصٍ وَّ بَخْسٍ۔ وہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ خدا ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس میں اضافہ کرے گا اور بغیر کسی کمی اور کٹوتی کے ان تک پہنچائے گا۔ اور اِنَّ پڑھنے کی دلیل اس کا جملہ مستانفہ (نیا جملہ) ہونا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْبَشَارَۃ کی اصل بَشَرَۃ (جلد) ہے چونکہ مسرت و شادمانی جلد پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی سے اَلْبَشَر ہے چونکہ اس سے بَشَرَۃ (جلد) ظاہر ہوتی ہے۔

کہا گیا ہے لَحِقَتْ وَ اَلْحَقَتْ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو ایک ہی معنی میں ہیں، دعا میں اس طرح وارد ہوا ہے: اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ

نِعْمَۃ وہ منفعت اور فائدہ ہے جس پر شکر کا استحقاق ہوتا ہے جب وہ قبح اور برائی کی وجہوں سے خالی ہو اس لیے منفعت کی دو قسمیں ہیں:

اول: فریب وحیلہ کی منفعت۔

دوم: وہ منفعت جو برائی کے شائبہ سے خالی ہو۔

نعمت غیر منعم کے فعل سے عظیم ہوتی ہے جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت اس شخص کے لیے جسے آپ نے

لا یُضَیِّعُ میں اِنَّ کے ہمزہ کو مکسور اور بقیہ نے مفتوح پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے قُتِلُوْا بغیر تشدید کے پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ بغیر تشدید کے پڑھنا قلیل و کثیر (کم اور زیادہ) دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ قَتَلْتُ الْقَوْمَ۔ اس میں کثیر (زیادہ) کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔ جیسے آپ کا یہ کہنا: ضَرَبْتُ زَیْدًا ضَرْبَةً ۔ یہ قلت کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

اور تشدید کے ساتھ پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ شہداء زیادہ ہیں اور فَعَّلَ (باب تفعیل سے) کثیر سے مخصوص ہے، قلیل سے نہیں۔

اَنَّ کو فتحہ دینے کی دلیل یہ ہے کہ مراد یہ ہے: یَسْتَبْشِرُوْنَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَھُمْ وَیُوَفِّرُ عَلَیْهِمْ وَ یُوْصِلُهٗ اِلَیْهِمْ مِنْ غَیْرِ نَقْصٍ وَّ بَخْسٍ۔ وہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ خدا ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس میں اضافہ کرے گا اور بغیر کسی کمی اور کٹوتی کے ان تک پہنچائے گا۔ اور اِنَّ پڑھنے کی دلیل اس کا جملہ مستأنفہ (نیا جملہ) ہونا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْبَشَارَۃ کی اصل بَشَرَۃ (جلد) ہے چونکہ مسرت و شادمانی جلد پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی سے اَلْبَشَر ہے چونکہ اس سے بَشَرَۃ (جلد) ظاہر ہوتی ہے۔

کہا گیا ہے لَحِقَتْ وَ اَلْحَقَتْ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو ایک ہی معنی میں ہیں، دعا میں اس طرح وارد ہوا ہے: اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ

نِعْمَۃ وہ منفعت اور فائدہ ہے جس پر شکر کا استحقاق ہوتا ہے جب وہ قبح اور برائی کی وجہوں سے خالی ہو اس لیے منفعت کی دو قسمیں ہیں:

اول: فریب و حیلہ کی منفعت۔

دوم: وہ منفعت جو برائی کے شائبہ سے خالی ہو۔

نعمت غیر منعم کے فعل سے عظیم ہوتی ہے جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت اس شخص کے لیے جسے آپ نے

اسلام کی دعوت دی اور اس نے قبول کر لیا چونکہ اس کی دعوت دو وجہوں سے زیادہ مفید ہے:

اول: حق کی جانب دعوت دینے میں حسن نیت تاکہ اسے قبول کرلے۔

دوم: حق کی دعوت کا قصد کرنا جس کے بارے میں جانتا ہے کہ جسے دعوت دی گئی ہے وہ اسے قبول کرلے گا۔

ترکیب:

اَحْیَآءٌ مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی بَلْ هُمْ اَحْیَآءٌ حال کی بنا پر اسے نصب دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ایسی صورت میں اس کی تقدیر یہ بنے گی: بَلْ احسبهُمْ اَحْیَآءً۔ حالانکہ مراد یہ ہے کہ بَلْ اِعْلَمْهُمْ اَحْیَآءً (انھیں زندہ گمان کرنے کی بات نہیں ہے بلکہ ان کو زندہ ماننے اور یقین رکھنے کی بات ہے)

یُرْزَقُوْنَ: محلہ مرفوع ہے اس لئے کہ اَحْیَآءٌ کی صفت ہے اور فَرِحِیْنَ، یُرْزَقُوْنَ کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ فَرِحِیْنَ کا منصوب ہونا اس کو بَلْ اَحْیَآءٌ پر عطف کرکے رفع دینے سے زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ نصب بتاتا ہے کہ ایک ہی حالت میں رزق اور فرح (خوشی) دونوں جمع ہیں۔ اگر نیا جملہ ہونے کی بنا پر اسے رفع دیا جاتا تب بھی جائز ہوتا۔

خلیل نے کہا: اَنْ لَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ یاء کے محلہ مجرور ہے اس تقدیر کی بنا پر کہ بِاَنْ لَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ۔
دیگر علماء نے کہا ہے کہ یہ جملہ محلہ منصوب ہے۔ اس بنا پر کہ جب حرف جر حذف ہو گیا اور فعل اس سے متصل ہو گیا تو فعل نے اسے نصب دے دیا جیسا کہ کہا گیا ہے: اَمَرْتُكَ بِالْخَیْرِ۔

ایک ظرف یہ بھی ہے کہ اَنْ لَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ الی آخر محلا مجرور ہے اس لئے کہ وہ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا کا بدل ہے اور یہ بدل اشتمال ہے۔ جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت شہداء بدر کے بارے میں نازل ہوئی جو چودہ افراد تھے جن میں آٹھ (۸) انصار اور چھ (۶) مہاجرین تھے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ شہداء احد کے بارے میں نازل ہوئی جو ستر افراد تھے۔ چار (۴) مہاجرین حمزہ بن

عبدالمطلب، مصعب بن عمیر، عثمان بن شماس اور عبداللہ بن جحش، بقیہ سب انصاری تھے۔ یہ ابن مسعود، ربیع اور قتادہ سے روایت ہے۔

امام باقر علیہ السلام اور بیشتر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت بدر و احد دونوں کے مقتولین کو شامل ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بئر معونہ کے شہدا کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا سبب وہ ہے جس کی روایت محمد بن اسحاق بن یسار نے اپنی سند سے انس بن مالک وغیرہ سے کی ہے، انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے: بنی عامر بن صعصہ کا سردار ابو براء بن عامر بن مالک بن جعفر جس کا لقب مُلَاعِبُ الْاَسِنَّة (یعنی نیزوں سے کھیلنے والا) تھا وہ بنی عامر بن صعصہ کا سردار تھا وہ مدینہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہدیہ پیش کیا۔ آپؐ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا: اے ابو براء! میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرا ہدیہ قبول کروں تو اسلام لے آ۔ آپؐ نے اس پر قرآن کی تلاوت فرمائی۔ اس نے اسلام قبول نہیں کیا اور کہنے لگا: اے محمد! جس چیز کی طرف آپؐ دعوت دے رہے ہیں وہ اچھی اور بہتر ہے، اگر آپؐ اپنے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کو اہل نجد کی طرف بھیجیں جو لوگوں کو آپؐ کے دین کی جانب دعوت دیں تو مجھے امید ہے وہ آپؐ کی بات قبول کر لیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں ان کے متعلق اہل نجد سے ڈرتا ہوں۔ ابو براء نے کہا: میں ان کا ہمسایہ ہوں، آپؐ انھیں بھیجئے تاکہ وہ لوگوں کو آپ کے دین کی طرف دعوت دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی ساعدہ کے منذر بن عمرو کو ستر (۷۰) بہترین مسلمانوں کے ہمراہ بھیجا، جن میں حارث بن صمہ، حرام بن ملحان، عروہ بن اسماء بن صلت سلمی، نافع بن بدیل بن ورقاء خزاعی، عامر بن فہیرہ غلام ابوبکر جیسے افراد تھے۔

یہ واقعہ ماہ صفر ۴ھ میں پیش آیا۔ تمام افراد بئر معونہ پر وارد ہوئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ پانی کے مالکان تک تم میں سے کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہونچائے گا؟ حرام بن ملحان نے کہا: میں پہونچاؤں گا۔ لہٰذا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریر (پیغام) لے کر عامر بن طفیل کے پاس گئے۔

عامر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام نہیں دیکھا، پھر حرام نے بئر معونہ والوں سے کہا: میں تمھاری طرف رسول اللہ کا قاصد بن کر آیا ہوں (اور کلمہ پڑھا) اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ (اسی دوران) ایک شخص نے ان کے پہلو میں نیزہ مارا جو دوسری جانب پار ہو گیا۔ اس وقت حرام نے کہا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ! فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو

گیا) پھر عامر بن طفیل نے بنی عامر کو مسلمانوں کے خلاف بلند آواز میں پکارا جسے انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے: ہم براء سے کئے عہد و پیمان اور امان کو نہیں توڑیں گے۔

پھر اس نے مسلمانوں کے خلاف بنی سلیم کے قبائل عصیہ، رعلا اور ذکوان کو باآواز بلند پکارا جسے انھوں نے قبول کرلیا اور مسلمانوں کو چہار جانب سے گھیر کر قتل کر ڈالا فقط کعب بن زید کو زخمی حالت میں مقتولین کے درمیان سے میدان جنگ سے اٹھالائے اس وقت ان کی سانس چل رہی تھی۔ اس کے بعد وہ زندہ رہے اور جنگ خندق میں شہید ہوئے۔ عمرو بن امیہ ضمیری اور انصار کے ایک شخص عمر بن عوف کو ان کے ساتھیوں کی اس مصیبت سے کسی نے آگاہ و متوجہ نہیں کیا سوائے پرندوں کے جو لشکر کے گرد گردش کر رہے تھے جنھیں دیکھ کر کہنے لگے: بخدا ان پرندوں کیا حالت ہے؟! دونوں جب آگے بڑھے دیکھا کہ (اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خون میں نہائے زمین پر پڑے ہیں۔

یہ ماجرا دیکھ کر انصاری نے عمرو بن امیہ سے کہا: اس بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا: میری رائے ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس سے مطلع کر دیں۔ انصاری نے کہا: میں اس جگہ سے نہیں جاؤں گا جہاں منذر بن عمرو کا قتل کیا گیا ہو، پھر انھوں نے دشمن سے قتال کیا اور قتل کر دیے گئے۔ عمرو بن امیہ کو اسیر کرلیا جب انھوں نے بتایا کہ وہ قبیلہ مضر سے ہیں تو عامر بن طفیل نے انھیں آزاد کر دیا اور غلام و اسیر کے عنوان سے ان کی پیشانی کو داغ دیا پھر انھیں چھوڑ دیا۔ عمرو بن امیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورے واقعہ سے مطلع کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ کام ابو براء کا ہے، مجھے پہلے ہی سے اس بارے میں خوف تھا۔

یہ خبر ابو براء تک پہنچی تو عامر بن طفیل کی بے وفائی اس پر بہت شاق گذری کہ اس کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مصائب وارد ہوئے۔ حسان بن ثابت نے عامر بن طفیل کے خلاف ابو براء کو تحریص (برانگیختہ) کرتے ہوئے یہ اشعار کہے:

بَنِیْ اُمِّ الْبَنِیْنَ اَ لَمْ یَرُعْکُمْ　وَ اَنْتُمْ مِنْ ذَوَائِبِ اَهْلِ نَجْدٍ
تَهَکُّمَ عَامِرٌ بِاَبِیْ بَرَاء　لِیَخْفِرَهٗ وَ مَا خَطَأٌ کَعَمْدٍ
اَلَا اَبْلِغْ رَبِیْعَةَ ذَا الْمَسَاعِیْ　فَمَا اَحْدَثْتُ فِی الْحَدَثَانِ بَعْدِیْ
اَبُوْكَ اَبُو الْحُرُوْبِ اَبُوْ بَرَاء　وَ خَالُكَ مَاجِدٌ حَکَمُ بْنُ سَعْدٍ

کعب بن مالک نے کہا:

لَقَدْ طَارَتْ شُعَاعًا کُلَّ وَجْه خَفَارَةٌ مَا اَجَارَ اَبُوْ بَرَآء

بَنِیْ اُمِّ الْبَنِیْنَ اَ مَا سَمِعْتُمْ دُعَاءَ الْمُسْتَغِیْثِ مَعَ النِّسَآء

وَ تَنْوِیَةَ الصَّرِیْخ بَلٰی وَ لٰکِنْ عَرَفْتُمْ اَنَّهٗ صِدْقُ اللِّقَآء

جب حسان اور کعب کے یہ اشعار ربیعہ بن ابو براء کو معلوم ہوئے تو اس نے عامر بن طفیل پر حملہ کر دیا اور نیزہ مار کر گھوڑے سے گرا دیا اور اس نے کہا: یہ ابو براء کا کام ہے اگر میں مر گیا تو میرا خون میرے چچا پر ہوگا اور اگر میں بچ گیا تو میں اس میں غور و فکر کروں گا۔ (راوی کہتا ہے کہ) اللہ نے بئر معونہ کے شہدا کے بارے میں قرآن نازل فرمایا: بَلِّغُوْا عَنَّا قَوْمَنَا اَنَّا قَدْ لَقِیْنَا رَبَّنَا فَرَضِیَ عَنَّا وَ رَضِیْنَا عَنْهُ، ہماری جانب سے ہماری قوم تک پہنچا دو ہم نے اپنے پروردگار سے ملاقات کر لی وہ ہم سے راضی ہو گیا اور ہم اس سے راضی ہیں پھر یہ آیت ہماری تلاوت کے بعد منسوخ ہوگئی اور اٹھالی گئی اور اللہ نے آیت: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ نازل فرمائی۔

تفسیر:

زندۂ جاوید

خداوند عالم نے مومنین کو جہاد سے روکنے کے لیے شہداء کے بارے میں منافقین کے قول کی حکایت کے فوراً بعد شہداء کی عظمت و کرامت اور دار آخرت میں ان کے لئے مہیا نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ (اور گمان نہ کرو) خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے یا مراد یہ ہے کہ اے سامع! ہرگز ایسا گمان نہ کرنا یا اے انسان تو ایسا گمان نہ کرنا کہ۔ اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جو لوگ اللہ کی راہ میں یعنی جہاد و نصرت دین میں قتل کر دیئے گئے ہیں) اَمْوَاتًا یعنی مردہ (تصور نہ کرنا) ویسا مردہ (گمان نہ کرنا) جو جہاد راہ خدا میں قتل نہ ہوا ہو۔ بَلْ اَحْیَآءٌ بلکہ یہ زندہ ہیں، اس کی تفسیر سورۂ بقرہ کی آیت: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَات کے موقعہ پر گذر چکی ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ (اپنے ربّ کے پاس سے) اس سلسلہ میں دو وجہیں ہیں:

اول: ان کے پروردگار کے علاوہ کوئی بھی ان کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے، عند سے مسافت کہ نزدیکی مراد نہیں ہے اس لئے کہ مسافت کی نزدیکی اجسام کی صفت ہے جو کہ اللہ کے لیے محال و ناممکن ہے۔

دوم: شہداء اپنے پروردگار کے یہاں زندہ ہیں اس طرح کہ وہ انھیں زندہ جانتا ہے لیکن لوگ یہ بات نہیں جانتے۔ یہ ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔

ابن عباس وابن مسعود اور جابر سے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تمھارے برادران احد میں شہید ہوئے تو ان کی ارواح کو خداوند عالم نے سبز پرندوں کے سینوں میں قرار دیا جو جنت کی نہروں میں آمد ورفت کرتے اور اس کے پھل کھاتے ہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے جعفر بن ابی طالب علیہما السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جن کی شہادت جنگ موتہ میں ہوئی تھی: میں نے خواب میں دیکھا کہ جعفر کے دو پر ہیں جن سے وہ ملائکہ کے ہمراہ جنت میں پرواز کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے حدیث ارواح سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ روح عرض ہے جس کے لیے نعمت سے استفادہ ممکن نہیں ہے، یہ اس لیے درست نہیں ہے کہ روح جسم لطیف اور ہوائی ہے جو لفظ ریح (یعنی ہوا) سے مشتق ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ روح جسم سے خارج ہوتی ہے اور اس میں واپس ہوتی ہے اور وہی احساس کرنے والی اور فعال شے ہے، جسم نہیں ہے اس میں کوئی زندگی نہیں ہوتی اس لیے کہ حیات کی ضد موت ہے جبکہ روح ایسی نہیں ہے۔ یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے۔ یُرۡزَقُوۡنَ (رزق پا رہے ہیں) یعنی صبح و شام نعمات جنت سے رزق حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنی قبروں میں نعمتوں سے رزق حاصل کر رہے ہیں۔

ارشاد: فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ (اللہ نے انھیں جو فضل عطا کیا ہے وہ اس پر خوش و خرم ہیں) یعنی اللہ نے جو انھیں قسم قسم کی نعمتیں جنت میں عطا فرمائی ہیں وہ ان سے خوش حال ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اپنی قبروں میں نعمتیں پا رہے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انھیں شہادت کے ذریعہ جو مرتبہ اور جزا ملی ہے وہ اس سے خوش ہیں۔

وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ (اور اس بات سے مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان سے ملحق نہیں ہوئے ہیں) یعنی اپنے ان برادران کے لیے مسرور و خوش حال ہیں جن سے ان کی مفارقت ہو چکی ہے اور وہ (ابھی تک) دنیا میں زندہ ہیں، ایمان اور جہاد کی راہ پر قائم ہیں، انھیں معلوم ہے جب وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوں گے تو انھیں سے ملحق ہو جائیں گے اور وہ بھی اللہ کی کرامت میں اسی طرح ہوں گے جس طرح انھیں اللہ کی کرامت حاصل ہوئی ہے اور اس طرح کہتے ہیں کہ

ہمارے برادران بھی اسی طرح شہید ہوں گے جس طرح ہم شہید ہوئے ہیں اور اسی طرح نعمتوں سے مالا مال ہوں گے جس طرح ہم ہو چکے ہیں۔ یہ ابن جریح اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شہید کو کتاب (نوشتہ) عطا کی جائے گی جس میں اس کے گذشتہ برادران کا ذکر ہوگا جس سے وہ مسرور ہو جائے گا اور اس طرح خوش ہو جائے گا کہ جس طرح دنیا میں غائب افراد کے دوبارہ آنے سے خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ یہ سُدی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان سے فضیلت میں ملحق نہیں ہوئے ہیں مگر یہ کہ ان کی تصدیق وایمان کے سبب ان کے لیے فضل عظیم ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔

أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (ان کے لیے بھی کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہے) یعنی وہ اس بات پر خوش ہوں گے کہ (خوشیاں منا رہے ہیں) کہ ان کے لئے کوئی خوف نہیں ہے، یہ اللہ کے اس ارشاد کا بدل ہے بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اس لیے کہ جو لوگ ان سے ملحق ہونے والے ہیں وہ محزون نہ ہونے والوں میں شامل ہیں۔ یہاں پر خوشی اس بات پر ہوگی کہ ان سے ملحق ہونے والوں کے لئے کوئی خوف کا واقع نہ ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ ان کی اولاد میں جو بعد میں آنے والے ہیں، ان کے لیے کوئی خوف نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے (یا انھیں اقتدار وحکومت عطا کرے گا) اور انھوں نے جو اموال چھوڑے ہیں ان پر وہ محزون وغمزدہ نہیں ہوں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو عوض اور بدلہ عنایت کیا ہے وہ بہت بڑی عطا اور بخشش ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس شہادت کو انھوں نے پیش کیا ہے اس پر انھیں کوئی خوف نہیں ہے۔ اللہ نے ان کی شہادت کے سبب ان کے گناہوں کو مٹا دیا ہے، وہ دنیا کی جدائی پر محزون و غمگین نہ ہوں گے آخرت سے خوش حال ہونے کے سبب۔

يَسْتَبْشِرُونَ (وہ شاداں ہیں۔) یعنی جو لوگ راہ خدا میں شہید ہوئے ہیں جن کی اللہ نے اس طرح تعریف کی ہے کہ وہ رزق پا رہے ہیں وہ اس پر خوش وخرم ہیں جسے اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ (اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر) فضل اور نعمت دو لفظ ہیں جن سے ایک ہی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کی تکرار میں دو اقوال ہیں:

اول: اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نعمت بقدر کفایت نہیں ہوتی جس کے سرور ولذت میں زیادتی و اضافہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ ہے جس کے وقت اپنی اطاعت کی بنا پر حقدار بنے ہیں اور وہ ہے جو آخرت میں ان کے لئے کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے۔

دوم: یہ تکرار تاکید کے لیے اور ذہن میں معنی کے جاں گزیں کرنے اور مبالغہ کے لیے ہے۔

وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (اور اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتا) یعنی ان کی جزا میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ اس لیے ذکر کیا ہے اگرچہ دوسرے لوگ بھی اس بات کو جانتے ہیں اس لیے کہ وہ موت کے بعد اسے یقینی اور بدیہی طور پر جائیں گے حالانکہ اسے دار تکلیف میں استدلال کے ذریعہ جانتے ہیں اور استدلال مشاہدہ کے مانند نہیں ہے، نہ ہی خبر معاینہ کے مثل ہے اس لیے کہ یقینی طور پر بچشم خود دیکھنے سے سرور و مسرت کئی گنا بڑھ جائے گا، اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ ثواب مل کر رہے گا جسے اللہ تعالیٰ یقیناً باطل نہیں کرے گا، ثواب کا عطا کیا جانا فقط اللہ ہی کی طرف سے ممکن ہے اسی لئے اس نے اجر کے ضائع نہ کرنے کی نسبت اپنی جانب دی ہے۔

شہداء کے ثواب سے متعلق جو اخبار و روایات بیان کی گئی ہیں، وہ شمار سے کہیں زیادہ ہیں، ان میں سند کے اعتبار سے بلند ترین وہ روایت ہے جسے امام علی رضا علیہ السلام نے حسین بن علی (علیہما السلام) سے نقل کیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: حضرت علیؑ لوگوں سے خطاب کے دوران انھیں جہاد پر تحریص اور آمادہ کر رہے تھے، اسی دوران ایک جوان نے کھڑے ہو کر کہا: اے امیر المومنین! آپؑ مجھے راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کے فضل و شرف کے متعلق بتلائیں! آپؑ نے فرمایا: میں ناقہ عضباء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب تھا، اور ہم غزوہ ذات سلاسل سے واپس پلٹ رہے تھے۔ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی سوال کیا جو تم نے مجھ سے کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا: جب مجاہدین جہاد کا ارادہ کرتے ہیں تو اللہ ان کے لیے آتش جہنم سے نجات فرض کر دیتا ہے اور جب جہاد کے لیے آمادہ ہوتے ہیں تو اللہ ان کے ذریعہ ملائکہ پر فخر و مباہات فرماتا ہے اور جب ان کے اہل و عیال انھیں رخصت کرتے ہیں تو ان پر مکانات اور در و دیوار گریہ کرتے ہیں اور وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جاتے ہیں جس طرح سانپ اپنی کینچل سے نکل جاتا ہے۔ ہر شخص پر خداوند عالم چالیس چالیس فرشتوں کو موکل و مقرر فرماتا ہے جس کی یہ فرشتے سامنے اور پیچھے سے دائیں اور بائیں سے حفاظت کرتے ہیں، جو نیکی بھی یہ انجام دیتے ہیں ان کے لیے کئی گنا کر دی جاتی ہے اور ان کے لیے ہر دن ایک ہزار مردوں کی عبادت لکھ دی جاتی ہے جو اللہ کی ایک ہزار برس عبادت کرتے ہیں اور ہر برس تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے، دن عمر دنیا کے مانند ہوتا ہے اور جب (کوئی مجاہد) اپنے دشمن کے مدمقابل ہوتا ہے تو ان کی نسبت دنیا والوں کا علم، ثواب الٰہی سے منقطع ہو جاتا ہے اور جب نیزہ و تیر کے ساتھ اپنے دشمن کے روبرو ہوتے ہیں اور

مرد مرد کے سامنے ہوتا ہے تو فرشتے (مجاہدین) پر اپنے پروں کا سایہ کرتے ہیں، ان کی نصرت اور ثبات قدم کے لیے اللہ سے دعا کرتے ہیں ایک منادی ندا دیتا ہے: **اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ**؛ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔

پس شہید کے لیے نیزہ کا وار اور تلوار کی ضرب موسم گرما میں آب سرد کے پینے سے زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔ جب کوئی شہید اپنے گھوڑے سے کسی ضربت کے سبب گرتا ہے تو وہ زمین تک نہیں پہونچ پاتا یہاں تک کہ اللہ حور العین سے اس کی زوجہ کو بھیجتا ہے جو اسے اللہ کی مہیا کردہ کرامت و بزرگی کے متعلق بشارت دیتی ہے اور جب زمین پر پہونچتا ہے تو زمین اس سے کہتی ہے اے روح پاک! تجھے مبارک ہو جو پاکیزہ بدن سے خارج ہوئی ہے، تجھے بشارت ہو تیرے لیے وہ سب کچھ ہے جسے نہ آنکھ نے دیکھا ہے نہ کانوں نے سنا ہے، نہ ہی انسانی قلب میں اس کا تصور وخیال گذرا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: میں اس کے اہل میں اس کا خلیفہ (نگراں ومحافظ) ہوں۔ جس نے انھیں راضی کیا اس نے مجھے راضی کیا، جس نے انھیں ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا، اللہ سبحانہ شہید کی روح کو سبز پرندوں کے سینوں میں قرار دیتا ہے، جنت میں جہاں چاہتا ہے چلا جاتا ہے، جنت کے پھلوں کو کھاتا ہے اور سونے کی قندیلوں میں سکونت پذیر ہوتا ہے جو عرش پر معلق ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کو فردوس کے حجروں میں سے ستر حجرے عطا کیے جاتے ہیں، ہر حجرہ کی (دوسرے حجرے سے) دوری مقام صنعا سے شام کے فاصلہ کے برابر ہے جو نور سے معمور ہوں گے۔ ہر حجرے کے ستر دروازے ہوں گے اور ہر دروازہ کے ستر پٹ سونے کے ہوں گے، ہر دروازے پر ستر حجرے ہوں گے، جن پر پردے پڑے ہوں گے، ہر حجرے میں ستر خیمے ہوں گے، ہر خیمے میں سونے کے ستر تخت ہوں گے، جن کے پائے موتیوں اور زمرد اور زبرجد کی چھڑیوں سے مزین ہوں گے، ہر تخت پر چالیس دبیز پردے ہوں گے، ہر فرش چالیس ہاتھ کا ہوگا، ہر فرش پر (شہید) کے لیے نوخیز دوشیزہ زوجہ حور العین ہوگی۔

راوی نے عرض کیا: امیر المومنین! آپؑ مجھے **اَلْعُرُوْبَةُ عُرُبًا اترابًا** نوخیز جوان حور العین کے بارے میں بتلائیں! آپؑ نے فرمایا: یہ ناز ونخرہ والی اطاعت گذار اور بار بار خواہش کرنے والی ہوگی جس کے ستر ہزار نوخیز لڑکے خدمت گذار اور ستر ہزار کنیزیں ہوں گی، زرد زیور اور سفید چہرہ ہوں گے (سر پر) موتیوں کا تاج، ان کی گردنوں میں رومال اور ہاتھوں میں ساغر وجام لیے ہوں گی، جب روز قیامت ہوگا تو اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ان (شہداء) کی راہ میں انبیاء ہوں گے تو (سبب احترام) ان

کے ہمراہ پیدل چلیں گے، جب ان کے وقار و عظمت کا مشاہدہ کریں گے یہاں تک کہ انھیں جواہرات کے دسترخوان پر لایا جائے گا جس پر یہ بیٹھیں گے۔ ان میں سے ہر شخص اپنے اہل خانہ اور ہم سایہ کے ستر ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا یہاں تک کہ دو ہم سائے جو باہم اختلاف رکھتے ہوں گے ان میں سے جو باعتبار ہم سایہ نزدیک ترین ہو گا وہ میرے اور ابراہیمؑ کے ساتھ جنت کے دسترخوان پر بیٹھیں گے جو اللہ عزوجل کی طرف صبح و شام دیکھیں گے۔

❀❀❀❀❀

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾
جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہی ان میں سے جو لوگ نیکو کار اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ (۱۷۲) یہ وہ ہیں جن سے لوگوں نے آ کر کہا کہ تمھارے لیے بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا: ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ (۱۷۳) آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل سے پلٹ آئے اور ان کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا اور انھیں رضائے خداوندی پر چلنے کا شرف بھی حاصل ہو گیا اور اللہ تو صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔ (۱۷۴)

الفاظ و معانی:

اِسْتَجَابَ اور اَجَابَ کے ایک ہی معنی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اِسْتَجَابَ طلب اِجَابَة (قبولیت) ہے اور اَجَابَ فعل اَجَابَة ہے۔

اَلْقَرْح: زخم۔اس کے حقیقی معنیٰ تکدر سے خالص ہونا ہے۔اس سے مَاءٌ قَرَاحٌ یعنی آب خالص ہے۔اَلْقَرَاحُ مِنَ الْاَرْضِ، وہ زمین کہ جو نمکین وغیرہ سے خالص ہو۔

اِحْسَان: اچھا فائدہ اور نفع۔ اِفْضَال: کمتر مقدار پر زیادہ فائدہ۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ یعنی اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔اس کی اصل حساب ہے اس لیے کہ کفایت حاجت و ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔اسی سے حُسْبَان ہے جس کے معنیٰ ظن اور گمان کے ہیں۔

اَلْوَكِيْل کے معنی محافظ و نگراں کے ہیں۔کہا گیا ہے کہ وہ (اللہ) (وکیل) ولی ہے، اس کی اصل تدبیر کا انجام دینا ہے۔صفات الٰہی میں وکیل کے معنی اللہ کا اپنی مخلوق کی تدبیر کرنا اور اسے انجام دینا ہے چونکہ وہ ان کا مالك اور رحیم (رحم کرنے والا) ہے۔یہ غیر کی صفت میں ہے جو وکیل بنانے میں شمار ہوتی ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِيْنَ کے محل اعراب کے بارے میں تین احتمال پائے جاتے ہیں:

(۱) مجرور ہے اس لئے کہ مومنین کی صفت ہے۔

(۲) زیادہ بہتر اور آیت سے زیادہ مشابہ یہ ہے کہ وہ محلہ مرفوع ہو، مبتلا ہونے کی بنا پر اور اس کی خبر یہ جملہ ہے: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔

(۳) مدح کی بنا پر منصوب ہو سکتا ہے، اس کی تقدیر یہ ہے: اَعْنِي الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا اِذَا ذُكِّرُوْا۔

یہی قول دوسری آیت کے اَلَّذِيْنَ کے بارے میں بھی ہے اس لئے کہ یہ دونوں ایک موصوف کی صفت ہیں۔

لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ بربنائے حال محلاً منصوب ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے:

فَانْقَلِبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ سَالِمِيْنَ۔اس میں عامل فَانْقَلِبُوْا ہے۔

شانِ نزول:

جب ابوسفیان اور اس کے ساتھی اُحد سے واپس پلٹے اور مقام روحا پر پہونچے تو اپنے واپس پلٹنے پر مسلمانوں سے شرمندہ ہوئے اور ایک دوسرے کی ملامت کرنے لگے اور اس طرح کہنے لگے محمد کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی عورتوں کو کنیز بنایا۔تم انھیں قتل کرتے رہے اور جب چند لوگ بچے تو چھوڑ کر چلے آئے۔واپس جاؤ اور

انھیں جڑ سے اکھاڑ دو۔

یہ خبر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچ جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے رسولؐ نے چاہا کہ دشمن کو خوف زدہ کریں، انھیں اپنی اور اپنے اصحاب کی طاقت کا مشاہدہ کرا دیں۔ لہٰذا آپؐ نے ابوسفیان کو تلاشنے کے لیے اپنے اصحاب کو بلایا اور فرمایا: کیا کوئی گروہ ہے جو امر خدا کے لئے محکم و طاقتور ہو اور شدت سے عمل کرے دشمن کا پیچھا کرے اور یہ کام دشمن کو رسوا و ذلیل کرنے والا ہے۔

ایک گروہ نے آپ کی آواز پر لبیک کہی۔ جن کے ہمراہ وہ زخمی بھی تھے، جنھیں جنگ احد میں زخم لگے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منادی نے ندا دی خبردار! فقط وہی جائے گا جو کل موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لیے نکلے تاکہ انھیں یہ پیغام پہونچا دیں کہ آپؐ ان کی تلاش میں نکلے ہیں اور وہ آپ کی قوت و طاقت کا اندازہ کرلیں یہ کہ ان کے دشمن سے جو انھیں زخم لگے ہیں انھوں نے انھیں کمزور نہیں کیا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ستر افراد کے ہمراہ نکلے اور مقام حمراء الاسد پر پہونچے، جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

علی بن ابراہیم بن ہاشم نے اپنی تفسیر میں اس طرح بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کون ہے جو ہمارے لیے اس گروہ کی خبر لے کر آئے؟ کسی نے جواب نہیں دیا، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں ان لوگوں کی خبر لے کر آؤں گا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جاؤ اگر وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوں اور ان کے پہلو میں اونٹ ہوں تو ان کا ارادہ مدینہ کا ہے اور اگر اونٹ پر سوار ہوں اور گھوڑے ساتھ ہوں تو ان کا ارادہ مکہ کا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام زخمی اور شدید تکلیف کے باوجود روانہ ہوئے، یہاں تک کہ آپؑ اس گروہ سے نزدیک ہو گئے، آپؑ نے دیکھا کہ وہ اونٹوں پر سوار ہیں اور گھوڑے ان کے ہمراہ ہیں۔ آپؑ واپس پلٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ آپؑ نے فرمایا: ان کا ارادہ مکہ کا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو جبرئیلؑ نازل ہوئے اور انھوں نے کہا: اے محمدؐ! خداوند عالم آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ نکلیئے اور آپؐ کے ہمراہ زخمی کے علاوہ کوئی نہ نکلے۔ آپؐ نے یہ حکم قبول کرلیا۔ چنانچہ وہ لوگ اس حالت میں نکلے کہ ان کے زخموں کی سکائی اور علاج و معالجہ کیا جا رہا تھا لہٰذا خداوند عالم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (سورۂ نساء، آیت ۱۰۴: اور خبردار کفار کا پیچھا کرنے میں سستی سے کام نہ لینا۔ اگر تمھیں رنج پہنچتا ہے تو تمھاری طرح انھیں بھی تو رنج پہنچتا ہے اور تمھیں اللہ

سے جو امیدیں وابستہ ہیں وہ انھیں حاصل نہیں ہیں اور اللہ ہر ایک کی نیت سے باخبر اور صاحب حکمت ہے۔)

چنانچہ یہ لوگ زخمی اور شدید تکلیف کی حالت میں نکلے یہاں تک کہ مقام حمراء الاسد پر پہونچے۔

محمد بن اسحاق بن یسار نے عبداللہ بن خارجہ بن زید بن ثابت کے واسطہ سے ابو سائب سے روایت کی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی جس کا تعلق بنو اشہل سے تھا جو اُحد میں موجود تھا وہ کہتا ہے: اُحد میں میں اور میرا برادر موجود تھا۔ ہم زخمی حالت میں پلٹے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد نے دشمن کی تلاش میں نکلنے کے لیے اعلان کیا، تو ہم نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ہمارا جہاد فوت نہ ہو جائے، خدا کی قسم! ہمارے پاس سوار ہونے کے لیے سواری ہے، ہمارے ساتھ شدید زخمیوں کے سوا کوئی نہ تھا لہٰذا اپنے اپنے بھائی کو خود پر لادا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مقام حمراء الاسد تک پہونچ گئے۔

تفسیر:

جنگ حمراء الاسد

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہی) یعنی جنھوں نے اللہ کی اطاعت اس کے اوامر میں اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کی۔ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (زخم کھانے کے بعد بھی) یعنی جنگ اُحد میں زخمی ہونے کے بعد۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ (ان میں سے جو لوگ نیکوکار ہیں) جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرتے ہوئے جہاد کے لیے لبیک کہا وَاتَّقَوْا (اور پرہیزگار ہیں) اللہ کی معصیت اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں ان کے لیے اَجْرٌ عَظِيْمٌ (ان کے لیے بڑا اجر ہے) یعنی بہت زیادہ ثواب ہے۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ (یہ وہ ہیں جن سے لوگوں نے آکر کہا)

الناس سے مراد کے بارے میں تین اقوال ہیں:

اول: وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ ابوسفیان نے مسلمانوں کی نسبت سازش کی تھی تاکہ وہ مسلمانوں کے اُحد سے واپس پلٹتے وقت ان میں بزدلی پیدا کر دیں جب وہ ان کی جانب پلٹنے کا ارادہ کریں۔ یہ ابن عباس وابن اسحاق کا قول ہے۔ اس کا واقعہ گذر چکا ہے۔

دوم: الناس سے نعیم بن مسعود اشجعی مراد ہے۔ یہ امام باقر وامام جعفر صادق علیہما السلام کا ارشاد ہے۔

سوم: سُدی کا قول ہے کہ اس سے منافقین مراد ہیں۔

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ (کہ تمھارے لیے بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں) بیشتر مفسرین کے نزدیک اس سے مقصود ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں یعنی تمھارے لیے بڑی بھاری تعداد جمع کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (جنگی) آلات اور لوگوں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ لفظ واحد کے ذریعہ تمام سے تعبیر کیا ہے اس ارشاد کہ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ میں دو سبب سے:

اول: وہ ان کے پاس لوگوں کی طرف سے آیا تھا لہٰذا ابوسفیان کے کلام کو لوگوں کے کلام کا قائم مقام قرار دیا ہے اور ان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

دوم: شان کی عظمت کے پیش نظر۔

فَاخْشَوْهُمْ (ان سے ڈرو) پھر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ اس بات نے ان لوگوں کے ایمان اور ان کے دین پر ثبات قدمی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت پر باقی رہنے میں اضافہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا: ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے) یعنی اللہ ہمارے لیے کافی ہے، وہ ہمارا ولی ومحافظ اور ہمارے امر کا نگراں ہے۔ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ یعنی بہت اچھا کفایت کرنے والا اور معتمد اور ایسی پناہ گاہ ہے جس کی جانب امور کی بازگشت ہوتی ہے۔ (جملہ امور کی بازگشت اسی کی جانب ہے)

فَانْقَلَبُوْا (آخرکار وہ پلٹ آئے) یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب واپس پلٹ گئے۔ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ (اللہ کی نعمت اور فضل سے) یعنی برائی سے عافیت اور نفع بخش تجارت کی جانب۔ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (اور ان کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا) یعنی قتل نہیں ہوئے۔ یہ سُدی اور مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہاں نعمت سے مراد اطاعت الٰہی میں ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے اور فضل سے تجارت میں نفع مراد ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مختصر ترین (چیز) جسے اللہ انجام دیتا ہے وہ نعمت ہے جو اس سے زیادہ ہو اس کی صفت فضل کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔ نعمت اور منفعت میں فرق یہ ہے نعمت فقط حسنہ (نیکی اور اچھائی) ہوتی ہے البتہ منفعت کبھی حسنہ (اچھائی) ہوتی ہے اور کبھی قبیحہ (برائی) ہوتی ہے اس لیے کہ نعمت کے ذریعہ شکر کا استحقاق پیدا ہوتا اور قبیح کے ذریعہ شکر کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا ہے۔

وَاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ (یعنی اور دشمنی سے مقابلہ کے لئے نکلنے سے انھیں رضائے خداوندی پر چلنے کا

شرف بھی حاصل ہوگیا) وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ (اور اللہ تو صاحب فضل عظیم ہے) اللہ مومنین پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

آیت میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس کسی کو کوئی گھیر لے تو اسے ان کلمات کے ذریعہ فریاد کرنا چاہئے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے صحیح روایت میں وارد ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو خائف وترساں ہو کہ وہ اللہ کے اس ارشاد کے ذریعہ فریاد کیوں نہیں کرتا کہ: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ اس لیے کہ میں نے سنا ہے کہ اس کے فوراً بعد خدا ارشاد فرماتا ہے: فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ ابن عباس سے مروی ہے انھوں نے کہا: جناب ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا جارہا تھا ان کا آخری کلام حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ تھا اور تمھارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی طرح فرمایا ہے۔ پھر آپ نے انھوں نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

❀❀❀❀❀

إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۷۵﴾
وہ تو شیطان تھا جو تمھیں اپنے دوستوں کا خوف دلا رہا تھا لہٰذا آئندہ ان سے نہ ڈرنا اور صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہنا اگر تم صاحب ایمان ہو۔ (۱۷۵)

ترکیب:

ذٰلِكُمْ میں كُمْ خطاب محض کے لئے ہے، ضمیر کے لئے نہیں ہے، لہٰذا اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔ يُخَوِّفُ دو مفعول کی جانب متعدی ہے۔ کہا جاتا ہے: خَافَ زَيْدٌ الْقِتَالَ (زید جنگ سے ڈر گیا) وَخَوَّفْتُهُ الْقِتَالَ (میں نے اسے جنگ سے ڈرا دیا)

تفسیر:

شیطان کا کام ڈرانا ہے

پھر خدا نے ذکر کیا ہے کہ جہاد سے خوف دلانا اور روگردانی کرنا شیطانی عمل ہے ارشاد فرمایا: إِنَّمَا

ذٰلِکُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَہٗ (وہ تو شیطان تھا جو تمھیں اپنے دوستوں کا خوف دلا رہا تھا) یہ وہ خوف دلانا تھا جو کہ نعیم بن مسعود کی جانب سے تھا وہ شیطان کا کام اور اس کا گمراہ کرنا تھا کہ شیطان کے ساتھی مومنین میں خوف پیدا کراتے ہیں۔ یہ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے: مومنین کو کافروں کے ذریعہ خوف زدہ کرتا ہے۔ زجاج اور ابو علی الفارسی وغیرہ نے کہا ہے: اس کی تقدیر یوں ہے: یُخَوِّفُکُمۡ اَوۡلِیَآءَہٗ یعنی مِنۡ اَوۡلِیَآئِہِ الشَّیۡطَانُ تمہیں اپنے دوستداروں سے ڈراتا ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: فَلَا تَخَافُوۡھُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (لہٰذا آئندہ ان سے نہ ڈرنا اور صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہنا اگر تم صاحب ایمان ہو) یعنی اگر تم اللہ کی تصدیق کرنے والے ہو تو میں تمھیں بتلا دوں کہ میں ان کے مقابلہ تمھاری نصرت و مدد کروں گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ شیطان منافقین کو خوف زدہ کرتا ہے۔ یہ منافقین کے اولیاء سرپرست اور احباب ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس کے خوف دلانے سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کے اندر وسوسہ پیدا کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں دشمنوں کی بات کو بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں لہٰذا یہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنے سے بیٹھ جاتے ہیں جبکہ مسلمان اس سے خوف زدہ نہیں ہوتے اس لیے کہ وہ اس نصرت و امداد پر بھروسہ رکھتے ہیں جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی نظیر اس کا یہ ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَیۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَكَّلُوۡنَ (سورۂ نحل، آیت ۹۹؛ شیطان ہرگز ان لوگوں پر غلبہ نہیں پا سکتا جو صاحبان ایمان ہیں اور جن کا اللہ پر توکل اور اعتماد ہے) صاحبان ایمان اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرنے والوں پر شیطان کا کوئی اختیار اور زور نہیں چل سکے گا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

(اے پیغمبر) جو لوگ تیزی سے کفر کی راہ پر گام زن ہیں ان کی سرگرمیاں آپ کو آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب موجود ہے۔(۱۷۶) اور جن لوگوں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر کا سودا کر لیا ہے، تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر رہے ہیں اور ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے۔(۱۷۷)

قرائت:

نافع نے پورے قرآن میں یُحْزِنْ یاء پر پیش اور زاء پر زیر کے ساتھ پڑھائے ہے سوائے آیت کریمہ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ کے کہ یاء کے فتحہ اور زاء کو ضمہ دیا ہے۔ باقی قراء نے پورے قرآن میں یاء کو فتحہ اور زاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابوجعفر نے نافع کے برخلاف پورے قرآن میں یاء کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ اور آیت کریمہ لَا يُحْزِنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ میں یاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا ہے کہ سیبویہ نے کہا: آپ فُتِنَ الرَّجُلُ وَفَتَنْتُهُ اور حَزِنَ الرَّجُلُ وَحَزَنْتُهُ کہتے ہیں۔ خلیل نے یہ گمان کیا ہے کہ جب آپ فَتَنْتُهُ اور حَزَنْتُهُ کہتے ہیں تو آپ کا مقصد یہ کہنا نہیں ہوتا ہے کہ جَعَلْتُهُ حَزِيْنًا وَّ جَعَلْتُهُ فَاتِنًا ۔ جس طرح آپ جب اَدْخَلْتُهُ کہتے ہیں تو مقصود یہ ہوتا ہے کہ جَعَلْتُهُ دَاخِلًا بلکہ آپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جَعَلْتُ فِيْهِ حُزْنًا وَّ فِتْنَةً جس طرح آپ كَحَلْتُهُ کہتے ہیں تو مقصود جَعَلْتُ فِيْهِ كَحْلًا اور دَهَنْتُهُ یعنی جَعَلْتُ فِيْهِ دُهْنًا ۔ آپ فَعَلْتُهُ کو علاحدہ لاتے ہیں اور

یہاں پر فَعَلْتُهٗ سے اپنے جملہ حَزِنَ وَفُتِنَ کو بدلنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ اگر آپ ایسا ارادہ کرتے تو اَحْزَنْتُهٗ اور اَفْتَنْتُهٗ کہتے۔ خلیل نے کہا: بعض عرب نے کہا ہے: اَفْتَنْتُ الرَّجُلَ وَ اَحْزَنْتُهٗ یعنی میں نے فَاتِنٌ اور حَزِیْنٌ قرار دیا۔ تو انھوں نے فعل کو بدل دیا ہے۔

ابو علی نے کہا: میں نے بعض عرب سے جس بات کی حکایت کی ہے وہی نافع کی دلیل ہے اور لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ کی قرائت تو یہ شبیہ ہے کہ اس نے اثر کا اتباع کیا ہو یا دونوں وجھوں کو اپنانا چاہا ہو۔ (کہ دونوں طرح سے پڑھ سکتے ہیں)

ترکیب:

شَيْئًا منصوب ہے اس لئے کہ مفعول مطلق کا نائب واقع ہوا ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یاء (حرف جر) کے حذف ہونے کی بنا پر منصوب ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: بِشَيْءٍ مِمَّا يَضُرُّ بِهٖ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: مَا ضَرَرْتُ زَيْدًا شَيْئًا مِنْ نَقْصِ مَالٍ وَلَا غَيْرِهٖ۔

تفسیر:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی

خداوند عالم نے مومنین کو بتلا دیا کہ شیطان کے خوف زدہ کرتے وقت ان کے لیے کیا مناسب اور بہتر ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خصوصی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ ((اے پیغمبر) آپ کو آزردہ نہ کریں) يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ (جو لوگ تیزی سے کفر کی راہ پر گام زن ہیں ان کی سرگرمیاں آپ کو آزردہ نہ کریں) یعنی منافقین۔ یہ مجاہد وابن اسحاق کا قول ہے اور ابو علی جبائی کا قول یہ ہے کہ مراد عربوں کا ایک گروہ ہے جو اسلام سے مرتد ہو گیا تھا۔ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا (یہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) یہ لوگ اپنے کفر ونفاق اور ارتداد سے اللہ کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہونچا سکتے اس لیے کہ اللہ کو نفع اور نقصان پہونچانا ممکن نہیں ہے۔ اللہ نے یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کی خاطر فرمایا ہے اس لیے کہ پیغمبرؐ پر ان لوگوں کا کفر گراں تھا اور ان کا ایمان نہ لانا بھی آپؐ پر گراں تھا۔ بعید نہیں ہے کبھی آپؐ کے قلب وفکر میں یہ آتا رہا ہو کہ ان لوگوں کا کفر کی طرف تیزی سے بڑھنا اور ایمان قبول نہ کرنا آپ کی کوتاہی کی بنا پر تو نہیں ہے؟! خداوند عالم نے اس خیال سے آپ کو اطمینان دلایا اور آپ کو مطلع کیا کہ ان کے کفر کا ضرر ونقصان خود ان کی جانب پلٹ رہا

ہے اور انھیں پر منحصر ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَۃِ (اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصّہ نہ رکھے) یعنی اللہ چاہتا ہے ان کے لیے جنت میں کوئی حصہ قرار نہ دے۔ جب ارادہ اس چیز سے متعلق ہے جس کا حادث ہونا درست ہے اور جو چیز موجود نہ ہو اس سے متعلق نہیں ہوگا تو کلام میں حذف ماننا لازمی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ (اللہ) ان کے ثواب سے محروم کرنے کے حکم کا ارادہ کرتا ہے جو ان کو مکلف بنانے کے لیے قرار دیا گیا تھا اور آخرت میں انھیں ان کے کفر اور نفاق کی جزا میں ان پر عذاب کرے گا وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب موجود ہے) یہ ظاہری معنی ہیں اور یہ مجبرہ (فرقہ) کے نظریہ کے بطلان پر دلالت کر رہے ہیں اس لیے کہ خداوند عالم نے کفر کی جانب سرعت سے کوشاں ہونے کی نسبت انھیں کی طرف دی ہے اور جب ایسا ہے تو جیسے اس نے ان میں خلق کیا ہے تو کفر کی نسبت ان کی جانب دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

پھر خداوند عالم نے از سر نو اخبار کا آغاز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو ایمان کے بدلے میں کفر کو خرید لے کہ اس صفت سے تمام کفار متصف ہیں۔ ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ (اور جن لوگوں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر کا سودا کر لیا ہے) یعنی ایمان کو کفر سے تبدیل کر لیا۔ ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں کہ اس پر اَلشِّرَاء (بیچنے) کے لفظ کا اطلاق و استعمال مجاز کے اعتبار سے ہے۔ خدا نے ایمان کو کفر سے تبدیل کرنے کی تشبیہ جنس کے قیمت کے ذریعہ خریدنے سے دی ہے۔ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْـًٔا (تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر رہے ہیں) یہ اس لیے ہے کہ پہلی آیت میں علت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو گمراہی کی طرف مسارعت کرنے پر تسلی کے لیے واجب ہے اور موجودہ آیت میں علت بیان کی گئی ہے کہ نقصان۔ عاصی (گناہ گار) سے مخصوص ہے نہ کہ اس سے جس کی نافرمانی کی جائے) مَضَرَّۃ (نقصان) اور اِسَائَۃ (برائی) میں فرق یہ ہے اِسَائَۃ (برائی) فقط برائی اور بدی ہی ہوتی ہے، مَضَرَّۃ (نقصان) کبھی بہتر اور اچھا بھی ہوتا ہے جب استحقاق کے طور پر ہو یا لطف کے عنوان سے ہو یا اس میں نفع ہو جسے پورا کیا جائے یا بڑے ضرر کے دور کرنے کے لیے ہو۔

وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ اور ان کے لیے تو دردناک اور تکلیف دہ عذاب ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۷۸﴾

ہم جو انھیں ڈھیل دے رہے ہیں کافر اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ زیادہ سے زیادہ گناہوں کا بوجھ سمیٹ لیں اور ان کے لیے تو نہایت ذلت آمیز سزا ہے۔(۱۷۸)

قرائت:

ابن کثیر اور ابوعمرو نے لَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا، وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ، وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ، ان سب میں یاء اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح فَلَا يَحْسِبُنَّهُمْ کو باء کے ضمہ، یاء اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حمزہ نے ان سارے مقامات پر تاء کے ساتھ سین اور باء کے فتحہ اور تَحْسَبَنَّهُمْ پڑھا ہے۔ البتہ اہل مدینہ، اہل شام اور یعقوب نے انھیں یاء کے ساتھ پڑھا ہے، البتہ اہل مدینہ اور یعقوب نے سین کو کسرہ دیا ہے یعنی يَحْسِبَنَّهُمْ، اور اہل شام نے فتحہ دیا ہے یعنی يَحْسَبَنَّهُمْ۔

عاصم کسائی اور خلف نے اس سورہ میں ہر جگہ تاء کے ساتھ پڑھا ہے سوائے دو حروف کے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اور وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ کہ یہ دونوں یاء کے ساتھ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عاصم نے سین کو فتحہ دیا ہے اور کسائی نے اسے کسرہ دیا ہے۔

حجت اور ترکیب:

جن قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک الَّذِينَ اس آیت میں محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ فاعل ہے اور جب الَّذِينَ فاعل ہوگا اور حَسِبَ دو مفعول چاہے گا یا ایک ایسا مفعول چاہے گا جو دو مفعول کا قائم مقام ہو جیسے حَسِبْتُ أَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ وَ حَسِبْتُ أَنْ يَقُومَ عَمْرٌو، پس ارشاد الٰہی إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ، یہ جملہ دو مفعوم کا قائم مقام ہے جن کا تقاضا يَحْسَبَنَّ کر رہا ہے۔

مَا کے سلسلہ میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

(۱) اَلَّذِیْ کے معنی میں ہے۔ پس تقدیر یہ ہوگی: لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّ الَّذِیْ نُمْلِیْهٖ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ۔

(۲) مَا نُمْلِیْ اِمْلَاء کے جگہ پر ہے۔ ایسی صورت میں مصدر ہوگا جب مَا مصدر یہ ہوگا تو اپنی جانب پلٹنے والی ضمیر کا تقاضا نہیں کرے گا۔

مبرد نے کہا: جن حضرات نے لَا یَحْسَبَنَّ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے انھوں نے اَنَّ کو فتحہ دیا ہے اور یاء کے ساتھ کسرہ دینا قبیح ہے حالانکہ قبیح ہونے کے باوجود جائز ہے اس لئے کہ حُسْبَان فعل حقیقی نہیں ہے۔ اِنَّ مکسورہ کے ساتھ اس کا عمل باطل ہوجاتا ہے جس طرح لام کے ساتھ باطل ہوجاتا ہے۔ جس طرح حَسِبْتُ لَعَبْدُ اللهِ مُنْطَلِقٌ جائز ہے اسی طرح حَسِبْتُ اَنَّ عَبْدَ اللهِ مُنْطَلِقٌ بھی جائز ہے۔

ابوعلی نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ اس سے قسم مل جاتی ہے جس طرح لام ابتداء سے ملتی ہے اور یہ دونوں مبتدا و خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَلْاٰخِرَةُ خَیْرًا لَّهُمْ۔

حمزہ کے تَحْسَبَنَّ کو تاء کے ساتھ اور اَنَّ کو فتحہ کے ساتھ پڑھنے کو اہل بصرہ نے غلط ٹھہرایا ہے اس لئے ایسی صورت میں معنی یہ ہوں گے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِمْلَاءَنَا، یہ صحیح نہیں ہے۔ البتہ زجاج نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ کے بدل کے طور پر جائز ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوں گے: وَلَا تَحْسَبَنَّ اِمْلَاءَنَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا خَیْرًا لَّهُمْ اسی کے مثل شعر میں بھی آیا ہے:

وَ مَا کَانَ قَیْسٌ هَلْکُهٗ هَلْكَ وَاحِدٍ وَلٰکِنَّهٗ بُنْیَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

ابوعلی نے کہا: یہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ جب آپ اِنَّ کو اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا بدل قرار دیں گے تو آپ پر لازم ہوگا کہ خَیْرًا کو مفعول ثانی کے عنوان سے نصب دیجئے جبکہ کسی ایک قاری نے بھی اسے نصب نہیں دیا ہے۔ جب بدل صحیح نہیں ہے تو اِنَّ کے ہمزہ کو کسرہ کے علاوہ کوئی دوسری حرکت دینا صحیح نہیں ہے۔ اس بنا پر کہ اِنَّ اور اس کی خبر تَحْسَبَنَّ کا مفعول ثانی ہے۔

الفاظ و معانی:

اِمْلَاء مدت کو طولانی کرنا۔ اَلْمَلِیُّ: طویل وقت اور زمانہ۔ اَلْمَلَاَ: زمانہ۔ اَلْمَلَوَان: شب و روز اس لئے کہ (طویل عرصہ سے) ایک کے بعد ایک کا آتا ہے۔

شان نزول:

یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ مقاتل کا قول ہے۔ عطا کا قول یہ ہے کہ یہ آیت (قبیلہ) قریظہ اور نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ عطا سے روایت ہے۔

تفسیر:

چھوٹ کا نتیجہ

پھر خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ کافروں کو مہلت دیا جانا ان کے لیے مفید نہیں ہے جب کہ یہ مہلت دینا انھیں عذاب کی طرف لے جانے کا سبب ہو چنانچہ ارشاد فرمایا: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنفُسِهِمْ (ہم جو انھیں ڈھیل دے رہے ہیں کافر اسے اپنے حق میں بہتر (نہ سمجھیں)) یعنی (کافر یہ نہ سمجھیں) کہ ہمارا انھیں طول عمر عطا کرنا، انھیں مہلت دینا احد میں راہ خدا میں قتل ہونے سے بہتر و افضل ہے اس لیے کہ شہدا کی شہادت انھیں جنت تک لے جائے گی اور ان لوگوں کا کفر پر باقی رہنا انھیں عذاب تک پہونچا دے گا۔

پھر خداوند عالم نے آغاز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ (ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں) یعنی ہم جو انھیں طولانی عمر عطا کر رہے ہیں اور ان کے عذاب میں عجلت کو ترک کر رہے ہیں۔ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا (کہ یہ زیادہ سے زیادہ گناہوں کا بوجھ سمیٹ لیں) تا کہ ان کا انجام کار ان کے گناہوں میں اضافہ کا باعث ہو۔ یہ لام، لام عاقبت ہے جیسا کہ اس کے اس ارشاد میں لام ہے: فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا. آل فرعون نے (موسیٰ) کو اس لیے حاصل کیا تھا تا کہ وہ ان کے لیے سبب مسرت اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرار پالیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ وہ عمر کے آخری حصہ میں دشمن اور حزن کا باعث ہوں گے تو کہا اسی طرح ہوگا۔

اس لام کا لام ارادہ غرض (لام تعلیل) ہونا صحیح نہیں ہے اس کی دو وجہیں ہیں:

اول: قبیح (برائی) کا ارادہ کرنا قبیح ہے اور اس کی ذات خدا سے نفی کی جاتی ہے۔

دوم: اس لیے کہ اگر لام ارادہ ہوتا تو کفار کا پروردگار کا مطیع و فرماں بردار ہونا لازم و ضروری ہوتا اس

لیے کہ انھوں نے وہی کیا جو اللہ کے ارادہ کے موافق تھا اور یہ بات اجماع کے خلاف ہے اس لیے کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (سورۂ ذاریات، آیت ۵۶؛ اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۂ نساء، آیت ۶۴؛ اور ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا ہے مگر صرف اس لئے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے) وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ (سورۂ بینہ، آیت ۵؛ اور انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خدا کی عبادت کریں) قرآن کا بعض حصہ اس کے بعض حصہ کی تصدیق کرتا ہے، اس اعتبار سے اس آیت کو ان سے مخصوص ہونا چاہئے جن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اس لیے کہ اگر یہ آیت ایمان لانے والوں کے بارے میں ہو تو یہ مخصوص وعید ان کی جانب متوجہ نہیں ہوگی۔ ابوالقاسم بلخی نے بیان کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ کفار یہ گمان ہرگز نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے افعال سے راضی ہونا اور ان کا قبول کرنا ہے۔ بلکہ یہ ان کے لیے شر ہے اس لیے کہ ہم انھیں مہلت دے رہے ہیں اور وہ اپنے گناہوں میں اضافہ کر رہے ہیں جس کے سبب وہ دردناک عذاب کے مستحق ہوں گے جو اس آیت کے مانند ہے کہ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ یعنی ہم نے جن وانس کی بیشتر مخلوقات کو خلق کیا ہے جو اپنے برے افعال کے سبب عنقریب داخل جہنم ہوں گے یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے ایک شخص کسی دوسرے سے کہتا ہے جب اسے نصیحت کرتا ہے اور وہ اسے قبول نہیں کرتا: میری نصیحت نے تمھارے اندر بجز شر کے اور میرے وعظ نے سوائے فساد کے اضافہ نہیں کیا اسی کے مانند اس کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ (سورۂ مومنون، آیت ۱۱۰؛ یہاں تک کہ اس مذاق نے تمہیں ہماری یاد سے بالکل غافل بنا دیا) یہ معلوم ہے کہ رسولوں نے حقیقت میں لوگوں کو یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرایا اور رسولوں کو فقط تذکیر اور یاد دہانی اور آگاہ کرنے کے لیے ہی مبعوث کیا گیا ہے، فراموش کرانے کے لیے نہیں۔ بھلانا اور فراموش کرانا انبیا کا فعل نہیں ہے لہٰذا ان کی جانب اس کی نسبت دینا جائز نہیں ہے ہاں ان کی طرف اس لیے نسبت دی گئی ہے کہ رسولوں کا لوگوں کو دعوت دینا ان کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکا، نہ ہی انھیں گناہوں سے واپس پلٹا سکا۔ چنانچہ فراموش کرانے کی نسبت ان کی طرف دی گئی ہے، انھیں معنی میں وہ ارشاد الٰہی بھی ہے جس میں جناب نوح علیہ السلام کی جانب سے حکایت کی گئی ہے: فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْۤ اِلَّا فِرَارًا (سورۂ نوح، آیت ۶؛ پھر بھی میری دعوت کا کوئی اثر سوائے اس کے نہ ہوا کہ انہوں نے فرار اختیار کیا) ابوالحسن اخفش اور اسکافی سے روایت کی گئی ہے کہ دونوں نے بیان کیا ہے: آیت میں مقدم اور موخر ہے جس کی

تقدیر اس طرح ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا اِثْمًا اَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ (کفار ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ ہمارا انھیں مہلت دینا اس لئے ہے کہ وہ گناہوں میں اضافہ کریں بلکہ ہمارا انھیں مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے) یہ (تقدیر) بعید ہے اس لیے کہ اگر اس طرح ہوتا تو آخری اِنَّمَا کی ہمزہ کو مفتوحہ ہونا چاہئے چونکہ یہ يَحْسَبَنَّ کا معمول ہے اس قول کی بنا پر اور پہلے والے اَنَّمَا کی ہمزہ کو مکسورہ ہونا چاہئے تھا اس لیے کہ اس قول کے مطابق وہ مبتدا ہے، تقدیم وتاخیر سے اعراب متغیر نہیں ہوسکتا اپنے استحقاق سے اور یہ چیز رائج قرأت کے برخلاف ہے اس لیے کہ دوسرے 'اِنَّمَا' کے ہمزہ کے مکسور ہونے پر تمام قاریوں نے اتفاق کیا ہے اور بیشتر کی رائے پہلے والے ہمزہ کے فتح پر ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (اور ان کے لیے تو نہایت ذلت آمیز سزا ہے) یعنی آتش جہنم میں رسوا کن عذاب ہوگا۔

❀❀❀❀❀

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۹﴾

اللہ تعالیٰ مومنین کو ہرگز اس حالت میں نہیں رہنے دے گا جس میں اس وقت تم لوگ ہو۔ وہ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تمھیں غیب سے مطلع کر دے لیکن اللہ غیب کی باتیں بتانے کے لیے رسولوں میں سے جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے۔ پس تمھیں چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو اور اگر تم ایمان کا حق ادا کرو اور نفاق سے بچو تو تمھارے لیے بڑا اجر ہے۔ (۱۷۹)

قرائت:

اہل حجاز، اہل شام، ابوعمرو اور عاصم نے حَتّٰى يَمِيزَ اور لِيَمِيزَ بغیر تشدید کے اور باقی قراء نے تشدید اور پہلی یاء کو ضمہ کے ساتھ حَتّٰى يُمَيِّزَ اور لِيُمَيِّزَ پڑھا ہے۔

حجت:

مَازَ یَمِیْزُ ایک مفعولی فعل ہے۔ اس طرح مَیَّزَ بھی ایک مفعول فعل ہے۔ کہا جاتا ہے: مُزْتُهٗ فَلَمْ یَتَمَیَّزْ وَزُلْتُهٗ فَلَمْ یَتَزَلْ۔

مَازَ کو باب تفعیل میں لے جانا اسے متعدی بنانے اور نقل کی خاطر نہیں ہے جس طرح عَوَّضَ باب تفعیل میں لے لانا عَاضَ سے نقل کی خاطر نہیں ہے اس لئے کہ عَاضَ پہلے ہی سے دو مفعول ہے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

عَاضَهَا اللهُ غُلَامًا بَعْدَ مَا شَابَتِ الْاَصْدَاغ والضرس نَقِد

اگر عَاضَ کو باب تفعیل میں لے جانا اسے تین مفعولی بنانے کی خاطر ہوتا تو عَوَّضَ اور عَاضَ دو الگ الگ کلمے ہوتے جو کہ ایک ہی معنی میں ہوتے جیسے مَیَّزَ اور مَازَ ہیں۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین نے حضرت ابوطالب علیہ السلام سے کہا: اگر محمدؐ صادق اور سچے ہیں تو وہ ہمارے بارے میں خبر دیں ہم میں سے کون ایمان لائے گا اور کون کفر اختیار کرے گا۔ اگر ہم انھیں اس خبر کے مطابق پائیں گے جیسا کہ وہ خبر دیں گے تو ہم ان پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے اس بات کا تذکرہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا چنانچہ اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہ سُدی اور کلبی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مومنین نے مطالبہ کیا کہ انھیں ایسی علامت عطا کی جائے جس سے وہ مومن اور کافر کے درمیان فرق کر سکیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ ابوالعالیہ اور ضحاک سے مروی ہے۔

تفسیر:

مسلمانوں کی تطہیر

مَا كَانَ اللهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (اللہ تعالیٰ مومنین کو ہرگز اس حالت میں نہیں رہنے دے گا) یعنی اللہ مومنین کو نہیں چھوڑ سکتا عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ (جس میں اس وقت تم لوگ ہو) اے کافرو! جس ابہام میں ہو اور مخلص کو منافق سمجھ رہے ہو، حکم الٰہی میں جائز و ممکن نہیں کہ وہ انھیں ان حالات میں چھوڑ دے جن پر تم بعثت

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے بلکہ تمھیں فرماں بردار بنائے گا حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (وہ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا) یعنی کافر کو مومن سے الگ کر دے گا۔ یہ قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں تک کہ جنگ اُحد میں منافق کو مخلص سے الگ کر دے گا جیسا کہ اس کی شرح سابق میں گذر چکی ہے۔ یہ مجاہد، ابن اسحاق اور ابن جریج سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب مومنین سے ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے اے گروہ مومنین! اللہ تمھیں اس حالت پر نہیں چھوڑ سکتا جیسا کہ تم مومن اور منافق کے درمیان مشتبہ تھے اس اعتبار سے خبر سے خطاب کی جانب بازگشت ہوگی، جیسا کہ اُس کا ارشاد ہے:
حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ (سورہ یونس، آیت ۲۰؛ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں تھے اور پاکیزہ ہوائیں چلیں) اس بارے میں اختلاف ہے کہ طیب و پاک اور خبیث و ناپاک میں کس چیز کے ذریعہ (تمیز پیدا کرے گا) انھیں الگ الگ کرے گا؟ تو کہا گیا ہے کہ امتحان و آزمائش کے ذریعہ اور فریضۂ جہاد کے سبب اور اسی کے مانند۔ جیسا کہ حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح جنگ اُحد میں مومنین ثابت قدم رہے اور منافقین نے روگردانی کی۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان آیات اور دلالتوں کے ذریعہ جن کے ذریعہ ان پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ مومنین کی نصرت کرتا ہے، ان کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے اور دین کو قوت و عزت عطا کرتا ہے، کافروں اور منافقوں کو ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ یہ ابومسلم سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واجبات کو فرض قرار دیتا ہے مومن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے جو اپنے الٹے پیروں واپس پلٹ جاتا ہے (سابقہ دین کی طرف) اللہ اس سے جدا کر دیتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَیْبِ (اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تمھیں غیب سے مطلع کر دے) یعنی اللہ تم میں سے کسی کو اپنے غیب پر مطلع کرنا نہیں چاہتا کہ تم (لوگوں کے) دلوں کی باتیں جاننے لگو کہ یہ مومن ہے اور یہ منافق ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (لیکن اللہ غیب کی باتیں بتانے کے لیے رسولوں میں سے جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے) یعنی جسے چاہتا ہے اس کا انتخاب کر لیتا ہے، اسے علم غیب پر مطلع کر دیتا ہے یعنی اسے علم غیب پر کامیابی عطا کر دیتا ہے اور اسے علم غیب دے دیتا ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (پس تمھیں چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو) جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا (اور اگر تم ایمان کا حق ادا کرو) یعنی اگر تم تصدیق کرو۔ وَتَتَّقُوْا یعنی اور اس کے عذاب سے ڈرو، اس کے امر کی پابندی کرو اور اس کی نہی سے اجتناب و پرہیز کرو تو فَلَكُمْ اس میں تمھارے لیے اَجْرٌ عَظِیْمٌ (بڑا اجر ہے)

کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے ان کا انتخاب کرتا ہے جس کے لیے بہتر ومناسب ہوتا ہے (جس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے) اور اسے غیب پر مطلع نہیں کرتا۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی جماعت اس کی رسالت (پیغامبری) کی صلاحیت رکھتی ہو چنانچہ وہ ان میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کرلیتا ہے۔ یا تو اس لیے کہ وہ زیادہ مناسب اور بہتر ہو اور پیغام رسانی کے اعتبار سے زیادہ معتدل اور نفرت کی جانے والی اشیاء سے بہت دور ہو لیکن اگر وہ (پیغمبر) تمام وجوہات کے اعتبار سے مساوی اور برابر ہوں تو اللہ سبحانہ ان میں سے جسے چاہتا ہے اس کا انتخاب کرلیتا ہے۔ اس لیے کہ نبوت کسی کا حق نہیں ہے، نہ ہی جزا ہے۔ آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ ایمان اور تقویٰ کے ذریعہ ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، یہ بات اس کے برخلاف ہے جس نے کہا ہے کہ (نبوت یا ثواب) تفضّل ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

اللہ نے جن لوگوں پر اپنا فضل وکرم کیا ہے اگر وہ بخل سے کام لیتے ہیں تو وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے بھلی ہے بلکہ یہ تو ان کے حق میں نہایت بری ہے وہ لوگ کنجوسی کر کے جو کچھ جمع کر رہے ہیں وہ روز قیامت ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین وآسمان کی میراث تو اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (۱۸۰)

قرائت:

یَحْسَبَنَّ کے بارے میں اختلاف کو بیان کر چکے ہیں۔ جنھوں نے یَحْسَبَنَّ یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی نظر میں اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ، یَحْسَبَنَّ کا فاعل ہے۔ لفظ سے مفعول اول محذوف ہے اس لئے کہ خود لفظ یَبْخَلُوْنَ اس پر دلالت کرتا ہے۔ یہ آپ کے اس جملہ کے مانند ہے: مَنْ کَذَبَ کَانَ شَرًّا لَهٗ یعنی کَانَ الْکَذِبُ شَرًّا لَهٗ اور اسی طرح آیت کریمہ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتَاھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

(اَلْبُخْلَ) هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۔هُوَ ضمیر فصل کے عنوان سے داخل ہوا ہے اس لئے کہ يَبْخَلُوْنَ کا پہلے آنا اَلْبُخْل کے مقدم ہونے کے مانند ہے۔

جنھوں نے تاء کے ساتھ تَحْسَبَنَّ پڑھا ہے تو اس میں فاعل مخاطب اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ، تَحْسَبَنَّ کا مفعول اول ہے اور خَيْرًا لَّهُمْ مفعول ثانی ہے اور جملہ میں ایک چیز حذف ہے اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ يَا مُحَمَّدُ بُخْلَ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ خَيْرًا لَّهُمْ - هُوَ ضمیر فصل ہے۔

آپ کو اس حذف کے ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ مفعول ثانی معنی میں وہی مفعول اول ہو اس لئے کہ یہ افعال (قلوب) مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ جب خبر مفرد ہو تو واجب ہے کہ وہ معنی کے لحاظ سے مبتدا ہو۔ بُخْل یعنی واجب کو ادا نہ کرنا اس لئے کہ اس پر عذاب کی دھمکی دی گئی ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔ بُخْل کے لغوی معنی عطا کرنے میں زحمت و مشقت کے ہیں۔

ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے يَعْمَلُوْنَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ کی جانب کنایہ کرتے ہوئے اور باقی قراء نے تَعْمَلُوْنَ تاء کے ساتھ حاضر کا صیغہ پڑھا ہے۔

تفسیر:

قید و بند کا بھاری طوق

وَلَا يَحْسَبَنَّ ہرگز گمان نہ کریں اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ بخل کرنے والے کہ اللہ نے جن لوگوں پر اپنا فضل و کرم کیا ہے اگر وہ بخل سے کام لیتے ہیں) یعنی اللہ نے جنھیں اموال عطا کیے ہیں لہٰذا وہ ان میں سے واجبی حقوق ادا کرنے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں تو یہ بخل ہے۔ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ (یہ بخیلی ان کے لیے بھلی ہے بلکہ یہ تو ان کے حق میں نہایت بری ہے) دوسری قرأت کے مطابق لَا تَحْسَبَنَّ اَيُّهَا السَّامِعُ اَوْ لَا تَظُنَّنَّ يَا مُحَمَّدُ (اے سامع! تو گمان نہ کرنا یا اے محمد! تم گمان نہ کرنا) خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مراد دیگر افراد ہیں، جو لوگ بخل کرتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں یہ ان کے لیے بہتر ہے بلکہ ان کے لیے شر (نہایت بری چیز) ہے یعنی اس طرح نہیں ہے جیسا کہ ان کا گمان ہے بلکہ یہ بخل ان کے لیے شر ہے۔

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (وہ لوگ کنجوسی کر کے جو کچھ جمع کر رہے ہیں وہ روز قیامت ان کے گلے کا طوق بن جائے گا) اس سے مراد کیا ہے اس میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ جس مال میں وہ

بخل کرے گا وہ اس کی گردن میں طوق بنا دیا جائے گا، یہ آیت زکوٰۃ نہ دینے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ یہی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ ابن مسعود، ابن عباس، سدی اور شعبی وغیرہ کا یہی قول ہے۔

حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ جو شخص بھی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا روز قیامت مال اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا: کوئی ایسا صاحب رحم قرابتدار نہیں جو اپنے قرابتدار کے پاس آئے اور اس سے اللہ کے عطا کردہ فضل کے متعلق سوال کرے۔ چنانچہ اگر اس نے بخل سے کام لیا ہوگا تو خداوند عالم اس کے لئے جہنم سے ایک سانپ نکالے گا کہ وہ اس کے گلے میں طوق کی طرح لپٹ جائے گا، پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن اس کی گردن میں آگ کا طوق ڈالا جائے گا۔ یہ نخعی سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انھیں مکلف اور ذمہ دار قرار دیا جائے گا کہ قیامت کے دن اپنے وہ اموال لے کر آئیں جن میں انھوں نے بخل سے کام لیا تھا۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے: يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ (سورۂ توبہ، آیت ۳۵: جس دن وہ سونا چاندی آتش جہنّم میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا) مراد یہ ہے کہ طوق قرار دیا جائے گا جس کے ذریعہ ان لوگوں کو عذاب کیا جائے گا۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ (اس مال کا) وبال وعذاب انھیں کی طرف پلٹایا جائے گا جو ان کی گردنوں کا طوق بن جائے گا جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (سورۂ اسراء، آیت ۱۳: اور ہم نے ہر انسان کے نامۂ اعمال کو اس کی گردن میں آویزاں کر دیا ہے) ابو مسلم نے کہا ہے: عرب رقبہ وعنق (یعنی گردن) سے پورے جسم کو تعبیر کرتے اور مراد لیتے ہیں، کیا آپ نے اللہ کا ارشاد نہیں دیکھا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اسی طرح ابن عباس سے مروی ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت اور فضل کا بیان کرنے میں کنجوسی کرتے ہیں اور وہ تورات ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت موجود ہے، آیت کے سیاق سے پہلی صورت زیادہ مناسب ہے۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمین وآسمان کی میراث تو اللہ ہی کے لیے ہے۔) یعنی زمین وآسمان میں جو کچھ بھی ہے اسے موت اور فنا ہے فقط اللہ جل جلالہ کی ذات باقی رہے گی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، ہر مالک کا ملک واقتدار باطل وفنا ہو جائے گا سوائے ملک خدا کے۔ آیت میں انفاق کرنے پر

آمادہ کیا گیا ہے اور مال کو روکنے سے نہی کی گئی ہے جبکہ اموال زوال اور فنا کے نشانہ پر ہیں یا تو موت کے سبب یا کسی اور آفت اور مصیبت کی وجہ سے، لہٰذا عقل مند کے لیے بہت بہتر یہی ہے کہ وہ مال خرچ کرنے میں بخل نہ کرے، نہ ہی اسے روکنے میں حرص وطمع کرے کہ وہ اس کے لیے گناہ اور دوسرے کے لیے نفع اور فائدہ ہوگا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (اور تم جو کچھ کررہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے) یہ مال خرچ کرکے اجر وثواب حاصل کرنے اور گناہ سے محفوظ رہنے میں وعدو وعید پر تاکید ہے۔

نظم:

موجودہ آیت کے ماقبل آیت سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح لوگوں نے جہاد کرنے میں بخل کیا اسی طرح کار خیر میں انفاق کرنے اور زکوٰۃ دینے سے بخل کرتے ہیں۔ یہ علی بن عیسیٰ سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے جیسا کہ ان کے حالات میں گذر چکا ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملہ کو چھپایا اور اس کے بیان کرنے میں بخل سے کام لیا۔

❁❁❁❁❁

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾
اللہ نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پیشتر وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے، ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذابِ جہنّم کا مزہ چکھو۔(۱۸۱) یہ سب کچھ تمھارا اپنا کیا دھرا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں ڈھاتا۔(۱۸۲)

قرائت:

حمزہ نے سَيُكْتَبُ کو یاء کے ضمہ کے ساتھ وَقَتْلُهُمْ کو رفع کے ساتھ اور يَقُوْلُ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

بقیہ سارے قراء نے سَنَكْتُبُ نون کے ساتھ، وَقَتْلَهُمْ کو نصب کے ساتھ اور نَقُوْلُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے سَنَکْتُبُ نون کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر نون ایک ایسے اسم کے بعد آیا ہے جسے غائب کے لئے وضع کیا گیا ہے اور اس ارشاد الٰہی کے مانند ہے: بَلِ اللهُ مَوْلاَکُمْ - پھر فرمایا: سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ - اگر سَیُکْتَبُ یاء کے ساتھ کہتا تو وہ مفرد ہونے میں وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ اور کَتَبَ اللهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ کے مانند ہوتا- وَ نَقُوْلُ، سَنَکْتُبُ پر عطف ہے۔

حمزہ کی قرائت کی وَقَتْلُهُمْ کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اسے مَا قَالُوْا پر عطف کیا ہے جو کہ محلاً مرفوع ہے۔

جن قراء نے قَتْلَهُمْ پڑھا ہے انھوں نے بھی اسے مَا قَالُوْا پر ہی عطف کیا ہے اور وہ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ مفعول بہ ہے (سَنَکْتُبُ کا)

الفاظ ومعانی:

سَمِعَ یَسْمَعُ سَمْعًا اس وقت کہا جاتا ہے جب کان سے کسی چیز کو درک کیا جائے۔ اللہ کسی ذریعہ سماعت (کان) کے بغیر درک کرتا ہے۔

اَلسَّمِیْعُ: وہ ذات کہ جو اس حالت میں ہو کہ جو سنی جانے والی باتوں کو سنے اگر وہ باتیں پائی جائیں۔

اَلسَّامِعُ: سننے والا۔ محققین نے بیان کیا ہے کہ اللہ سبحانہ سَمِیْعٌ یعنی ہمیشہ سے سننے والا ہے اور سامع ہے جب سنی جانے والی باتیں کی موجود ہوں۔ خدا کا سَمِیْع و بَصِیْر ہونا اس کے حیؑ (زندہ) ہونے پر صفت زائد نہیں ہے (بلکہ عین ذات ہے) اس کا مدرک ہونا، اس کے حی و عالم ہونے پر صفت زائد نہیں ہے اور اس کا سَامِع و مُبْصِر ہونا اسی سَمِیْع و بَصِیْر کے معنیٰ میں ہے۔ ابوالقاسم بلخی نے کہا ہے: اس کے سَمِیْع و بَصِیْر ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ مَسْمُوْعَات (سنی جانے والی اشیاء) اور مُبْصِرَات دیکھی جانے والی اشیاء کو جانتا ہے اور یہ قدیم ذات الٰہی کے لیے صفت ادراک کو ثابت نہیں کرتے ہیں۔ خلیل نے بیان کیا ہے: ہر ناخوش گوار چیز جو انسان پر وارد ہوتی ہے وہ اس کا مزہ چکھتا ہے البتہ یہ مجاز ہے۔ روایت میں وارد ہوا ہے: حَتّٰی تَذُوْقِیْ مِنْ عُسَیْلَتِهٖ وَ یَذُوْقَ مِنْ عُسَیْلَتِكِ، اس کے ذریعہ جماع سے کنایہ کیا گیا ہے۔ یہ نہایت ملیح و حسین کنایات سے ہے۔ اَلْحَرِیْقُ: آگ، حَرَق اور حَرْق مصدر ہے۔

ترکیب:

بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ میں جار ومجرور محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے اور مبتدا ذٰلِكَ ہے اور جار ومجرور اِسۡتَقَرَّ سے متعلق ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے: ذٰلِكَ اسۡتَقَرَّ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ. اَنَّ مفتوح ہے اس لئے کہ اس پر عطف ہے جس میں یاء نے عمل کیا ہے گویا اس طرح ہے: وَ بِاَنَّ اللّٰهَ پس وہ محلاً مجرور ہے۔

شانِ نزول:

جب آیت مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا (سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۵؛ کون ہے جو خدا کو قرض حسن دے) نازل ہوئی تو یہودیوں نے کہا: بلا شبہ اللہ فقیر ہے جو ہم سے قرض کا مطالبہ کر رہا ہے اور ہم دولت مند ہیں۔ یہ بات حی بن اخطب نے کہی تھی۔ یہ حسن ومجاہد سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بکر کے ذریعہ ایک پیغام لکھ کر (قبیلہ) بنی قینقاع کے یہودیوں کی طرف بھیجا۔ آپ نے اس میں انھیں قیام نماز اور زکوٰۃ کی ادائے گی اور قرض حسنہ دینے کی دعوت دی تھی۔ ابو بکر وہ پیغام لے کر یہودیوں کے بیت مدارس (مراکز علمی) میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے فنحاص نامی شخص کے نزدیک بہت سے لوگوں کو دیکھا۔ حضرت ابو بکر نے انھیں اسلام، نماز اور زکوٰۃ کی دعوت دی۔ فنحاص نے ان سے کہا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر سچ ہے تو اللہ فقیر ہے اور ہم ثروت مند ہیں اور اگر اللہ غنی و مالدار ہے تو ہم سے ہمارے اموال میں سے کیوں قرض لے رہا ہے؟ حضرت ابو بکر غضبناک ہوئے اور اسے ایک طمانچہ رسید کیا چنانچہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ عکرمہ، سدی، مقاتل اور محمد بن اسحاق سے مروی ہے۔

تفسیر:

یہود کی بے بنیاد باتیں اور سیاہ کارنامے

خداوند عالم نے یہودیوں کی لائق مذمت صفات سے ایک دوسری صفت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیۡرٌ (اللہ نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے) بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ (اللہ) نے ان کی بات کا ادراک کر لیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان باتوں کو جانتا ہے۔ یہ بلخی سے مروی ہے اِنَّ اللّٰهَ فَقِیۡرٌ یعنی صاحب حاجت (ضرورت مند) ہے چونکہ وہ ہم سے

قرض طلب کر رہا ہے۔ وَنَحۡنُ اَغۡنِيَآءُ (اور ہم غنی ہیں) ہم حاجت سے بے نیاز ہیں باوجودیکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ قرض طلب نہیں کر رہا ہے بلکہ انفاق کی طرف دعوت دینے میں اس کا لطف و کرم ہے۔ یہ بات انھوں نے اپنے عوام کو دھوکہ دینے کے لیے کہی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے جو کہا کہ اللہ فقیر ہے یعنی وہ ہم پر رزق تنگ کر رہا ہے اور ہم اغنیاء ہیں چونکہ ہم اپنے اہل (قرابت داروں) پر رزق میں وسعت دے رہے ہیں۔

سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا (ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے) کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے ہم اس کو محفوظ کرلیں گے۔ کتابت حفاظت کرنے سے کنایہ ہے اس لیے کہ یہ حفاظت کا طریقہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم ان کے نامۂ اعمال میں اس بات کو لکھنے کا حکم دیں گے، ایسا نافرمانی سے روکنے میں مبالغہ کے لئے کیا جاتا ہے اس لیے کہ جب مکلف کو معلوم ہوگا کہ اس کے افعال واعمال نامۂ اعمال میں لکھے جا رہے ہیں جنھیں یقیناً اس کے روبرو پیش بھی کیا جائے گا اور روز قیامت تمام لوگوں کے سامنے (ان اعمال وافعال) کا پڑھا جائے گا تو اسے گناہوں سے روکنے اور جرائم کے ارتکاب سے منع کرنے میں زیادہ بلیغ اور رسا ہوگا۔

وَقَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ (اور اس سے پیشتر وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔) یعنی ان کے بزرگوں کا انبیاء کو قتل کرنا اور اس پر ان لوگوں کا راضی رہنا بھی ہم عنقریب لکھ لیں گے۔ ہر ایک کو ہم اس کے کیے کی جزا اور بدلہ دیں گے۔

آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ فعل قبیح پر راضی رہنا اس جرم کے انجام دینے کے مانند ہے اس لیے کہ جن یہودیوں کا ذکر انبیاء کے قتل کرنے کے ساتھ کیا گیا ہے تو اسے انھوں نے خود انجام نہیں دیا تھا بلکہ ان کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ گویا وہ بھی اس مقام ومنزل میں ہیں کہ جیسے انھوں نے خود اس عظیم جرم کو انجام دیا ہو۔ وَنَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ (ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذاب جہنّم کا مزہ چکھو) یعنی جلانے والی آگ کا مزہ چکھو۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ معلوم ہو جائے جس آگ سے عذاب کیا جائے گا وہ جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ ہے اس لیے کہ جب تک بھڑکے گی نہیں اسے حَرِيۡقًا (جلانے والی) نہیں کہیں گے، کبھی عذاب آگ کے بغیر بھی ہوتا ہے ارشاد الٰہی ذُوۡقُوۡا یہ بتاتا ہے کہ تم اس سے نجات نہیں پاؤ گے، کہا جاتا ہے کہ ذُقۡ هٰذَا الۡبَلَآءَ یعنی تم اس بلا سے نجات پانے والے نہیں ہو۔ ذٰلِكَ (یہ سب کچھ) گذشتہ کی طرف اشارہ ہے یعنی عذاب۔ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (تمھارا اپنا کیا دھرا ہے) یعنی جس چیز کو تم نے خود انجام دیا ہے اور اپنے آپ پر ظلم وزیادتی کی ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ (اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں

ڈھاتا) یعنی اللہ اپنے بندوں میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

گناہ کی نسبت ید (ہاتھ) کی طرف دی گئی ہے اگرچہ تمام اعضا و جوارح سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، یہ بات عام ہے اس لیے کہ انسان جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے وہ ہاتھ کے ذریعہ ہی حاصل کرتا ہے، اسی لیے یہ عادت جاری وساری ہے کہ انسان کے اعمال جن انجام دیتا ہے ان کی نسبت ہاتھ ہی کی طرف دی جاتی ہے اگرچہ دیگر اعضاء و جوارح سے بھی کسب کرتا اور انجام دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی عادت کے مطابق خطاب فرمایا ہے۔ اس آیت میں نظریۂ مجبرہ کے بطلان پر دلالت ہے آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر بندہ سے سرزد ہوئے گناہوں کے بغیر اس پر عذاب ہوتا تو یہ ظلم ہوتا، یہ بات نظریۂ مجبرہ کے خلاف ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم کفار کو گذشتہ میں سرزد نہ ہونے والے گناہوں پر عذاب کرتا ہے یہ کہ (اللہ) لوگوں کے اندر کفر کو خلق فرماتا ہے پھر ان پر عذاب کرتا ہے اسی لیے کہ اس سے بڑا ظلم نہیں ہوسکتا۔ خدا نے لفظِ ظلام کا ذکر کیا ہے جو اللہ سے ظلم کی نفی کی بیشتر تاکید ہے۔

❁❁❁❁❁

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

جو لوگ یہ کہتے ہیں اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی کو اس وقت تک رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھالے ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو روشن نشانیاں لے کر آئے تھے اور وہ بھی جس کا تم ذکر کرتے ہو پھر اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو تم نے ان رسولوں کو کیوں قتل کیا۔ (۱۸۳) (اے محمد) اب اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا جاچکا ہے جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ (۱۸۴)

قرائت:

صرف ابن عامر نے بِالزُّبُرِ باء کے ساتھ پڑھا ہے اور شام کے مصاحف میں ایسا ہی ہے اور سورۂ فاطر میں بھی یہی ہے اور باقی قراء نے بغیر باء کے الزُّبُرِ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے باء کو حذف مانا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ واؤ عطف نے عامل (باء) کی تکرار سے بے نیاز کر دیا ہے اور جس نے باء کو ثابت مانا ہے اس نے عامل کی تاکید کی خاطر اس کی تکرار کی ہے اور دونوں حسن اور بہتر ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْقُرْبَان عُدْوَان اور خُسْرَان کے وزن پر مصدر ہے۔ کبھی اَلْبُرْهَان اور اَلسُّلْطَان کی طرح اسم بھی ہوتا ہے۔

اَلْقُرْبَان ہر وہ نیکی ہے جس سے بندہ اللہ سے نزدیک ہوتا ہے۔

الزُّبُر زَبُوْر کی جمع ہے، ہر وہ کتاب جس میں حکمت ہو وہ زَبُوْر ہے۔

الزُّبْرَة: شیر کے شانوں پر موجود بال۔

الزِّبْر کے معنی عقل کے ہیں۔ خدا نے اس آیت میں زُبُر اور کتاب دونوں کو باہم جمع کر دیا ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں، اس لئے کہ دونوں کی اصل مختلف ہے، کتاب وہ ہے جس کے بعض حروف بعض حروف سے متصل ہوتے ہیں۔ زبور یعنی جس میں حق کے خلاف سرزنش اور مذمت ہو۔ داؤدؑ کی کتاب کو اس میں بکثرت موجود وعظ و نصیحت اور نہی کے سبب زبور کہا گیا ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا محلاً مجرور ہے۔ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ کی جانب پلٹاتے ہوئے اس تقدیر کی بنا پر کہ وَسَمِعَ قَوْلَ الَّذِيْنَ۔۔۔

شانِ نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن میں کعب بن اشرف، مالک بن ضیف، وہب بن یہودا اور فنحاص بن عازورا شامل تھے۔ جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا: اے محمد! اللہ نے توراۃ میں ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آسمانی آگ کھا جائے، اگر آپ کا خیال ہے کہ اللہ نے آپ کو ہماری طرف بھیجا ہے تو آپ ہمارے لیے وہ چیز لے کر آیئے تاکہ ہم آپ کی تصدیق کریں۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ کلبی سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو توراۃ میں حکم دیا تھا کہ اگر تمھاری طرف ایسا (شخص) آئے جس کا خیال ہو کہ وہ پیغمبر ہے، تو اس کی تصدیق نہ کرنا جب تک کہ وہ ایسی قربانی پیش نہ کردے جسے آگ کھا جائے یہاں تک کہ تمھارے پاس عیسیٰؑ اور محمدؐ آئیں پس جب وہ تمھارے پاس آئیں تو دونوں پر قربانی کے بغیر ایمان لے آنا۔

تفسیر:

یہود کی بہانہ بازی

پھر خداوند عالم نے اہل کتاب کی دوسری بات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا یعنی جن لوگوں نے نبی خدا سے کہا: اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ (اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے) یعنی اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی کتابوں میں رسولوں کی زبانی ہمیں حکم دیا کہ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ (کہ ہم کسی کو اس وقت تک رسول تسلیم نہ کریں) یعنی ہم اس دعوے میں کسی بھی رسول کی تصدیق نہ کریں جو یہ کہے کہ وہ اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہے۔ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ (جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے) یہاں تک کہ وہ ہمارے لیے ایسی چیز لے کر آئے جو اللہ سے قربت کا ذریعہ ہو صدقہ ہو یا نیکی جو اس سے قبول کرلی جائے۔

تَاْكُلُهُ النَّارُ (جسے آگ کھالے) قبولیت کی علامت اور نشانی کا بیان ہے یعنی ان کی قربانی کی قبولیت کی نشانی اور علامت یہ ہوتی تھی کہ آسمان سے آگ آتی تھی جو اسے کھا جاتی تھی یہی اس کے دعوائے

صداقت سے قریب کرنے والی دلیل ہوتی تھی، جس کا وہ دعویٰ کرتا تھا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ قُلْ یعنی اے محمد! ان یہودیوں سے کہہ دیجئے: قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي (مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں) یعنی مجھ سے قبل تمہارے بزرگوں کے پاس بہت سے رسول آچکے ہیں بِالْبَيِّنٰتِ (جو روشن نشانیاں لے کر آئے تھے) یعنی ایسی حجتیں اور دلائل لے کر آئے تھے جو ان کی سچائی، ان کی نبوت کے صحیح ہونے اور ان کے قول کی حقیقت پر دلالت کرتی تھیں۔ جس کی تم ان سے پیش کش کرتے اور مطالبہ کرتے تھے۔ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ (اور وہ بھی جس کا تم ذکر کرتے ہو) مراد یہ ہے کہ جس قربانی کے متعلق تم نے کہا ہے۔ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ (پھر تم نے ان رسولوں کو کیوں قتل کیا؟) اس سے مراد زکریاؑ و یحییٰؑ اور وہ تمام انبیاءؑ ہیں جنھیں یہودیوں نے قتل کر دیا تھا یعنی تم نے انھیں کس لیے قتل کیا باوجودیکہ تم اس بات کا اقرار کرتے ہو جس چیز کو وہ لے کر آئے تھے وہ ان کی جانب سے تم پر حجت تھی۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اگر تم سچے ہو) اس بارے میں جس کا تم سے عہد لیا گیا ہے، جس کا تم نے دعویٰ کیا ہے۔ اس میں ان کی بات کی تکذیب ہے اور ان کے عناد و دشمنی کی دلیل ہے اور یہ کہ اگر پیغمبرؐ ان کے پاس مقبول قربانی بھی لے کر آتے جس طرح وہ چاہتے تھے تب بھی یہ لوگ آپ پر ایمان نہ لاتے جس طرح ان کے آباء و اجداد ان پیغمبروں پر ایمان نہیں لائے تھے جو ان کے پاس مقبول قربانی اور دیگر معجزات (لے کر آئے تھے) خداوند عالم نے ان کے اس عذر کو منقطع نہیں فرمایا جس کا انھوں نے اس قربانی کا مطالبہ کیا تھا جسے آگ کھا جاتی، اللہ کو معلوم تھا کہ ایسی قربانی کے پیش کرنے میں ان کے لیے مفسدہ ہے جب کہ معجزات مصالح کے تابع ہوتے ہیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ((اے محمد) اب اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے) اس میں کفار کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب پر آپ کی دلداری اور تسلی ہے یہ کہ خداوند عالم نے باخبر فرمایا ہے کہ آپ پیغمبروں میں پہلے نہیں ہیں جنھیں جھٹلایا گیا ہے بلکہ آپؐ سے قبل (دیگر) پیغمبروں کو بھی جھٹلایا گیا ہے۔ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ جو کھلی ہوئی نشانیاں یعنی واضح معجزات لے کر آئے تھے۔ وَالزُّبُرِ (صحیفے) یعنی وہ کتب جن میں حکمت آمیز باتوں اور محرمات کا بیان تھا۔ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (اور روشن کتاب (لے کر آئے تھے)) کہا گیا ہے اس سے تورات و انجیل مراد ہیں چونکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی لائی ہوئی انجیل کی تکذیب کی اور جناب موسیٰ علیہ السلام

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق جو صفات بیان کر گئے تھے، انھوں نے ان میں تحریف کر دی تھی اور آنحضرت سے متعلق جس چیز کا عہد لیا گیا تھا انھوں نے اسے بدل دیا تھا۔ اسی طرح نصاریٰ نے انجیل میں موجود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و توصیف کا انکار کر دیا اور اس کے حکم کو انھوں نے بدل دیا تھا۔ مُنِیر وہ چیز ہے جو اس شخص کے لیے حق کو روشن اور واضح کر دے جس پر حق مشتبہ اور مشکوک ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ منیر یعنی حق کی طرف ہدایت و رہنمائی کرنے والا۔

❀❀❀❀❀

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم سب کو پورا پورا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو جہنّم کی آگ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیاوی زندگی تو یہ محض دھوکے کا سرمایہ ہے۔ (۱۸۵)

الفاظ و معانی:

ہر وہ شخص جو ہلاکت سے نجات پا جائے اور ہر وہ شخص جو خوش ہونے والی چیز کو حاصل کر لے اس کو فَازَ کہتے ہیں۔ 'فَازَ' کی تاویل یہ ہے کہ انسان ناپسندیدہ (ناخوشگوار) چیز سے دور ہو جائے اور پسندیدہ چیز حاصل کر لے۔

تفسیر:

موت کا اٹل قانون

پھر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ تمام مخلوقات کی بازگشت اس کی جانب ہے، وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو ان کے اعمال پر جزا اور بدلہ دے گا اس طرح کہ اس نے اپنی تمام مخلوقات پر موت کو حتمی اور لازمی قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) یعنی

ہر نفس پر موت لازمی اور حتمی طور پر وارد ہوگی گویا ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر نفس موت کے مقدمات، اس کی سختیاں اور شدائد اور کیفیات کا ذائقہ چکھے گا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ (سورۂ انعام، آیت ۶۱: یہاں تک کہ جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے) اسی بنیاد پر امام علیہ السلام کے ارشاد میں وارد ہوا ہے کہ اپنے مردوں کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت کی تلقین کرو۔ یہ حکم بظاہر اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھتا ہے اگرچہ وہ مقتول ہی کیوں نہ ہو اور قتل اس موت سے جدا نہیں ہے جو کہ فعل الٰہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں پر موت سے مراد حیات کا ختم ہونا ہے اور مقتول کی حیات بھی قتل کے ذریعہ ختم ہوجاتی ہے۔ پس مقتول بھی اس آیت میں داخل ہے۔

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور تم سب کو پورا پورا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا) یعنی تمھارے اعمال کی پوری پوری جزا دی جائے گی، اگر نیک اعمال ہوں گے تو اس کا بدلہ خیر اور ثواب ہوگا اور برے اعمال ہوں گے تو اس کی جزا بھی شر اور عذاب ہوگی، دنیا مقام جزا نہیں ہے، دار عمل ہے، جبکہ آخرت دار جزا ہے، دار عمل نہیں ہے۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ (جو جہنّم کی آگ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کردیا جائے) یعنی جسے آتش جہنم سے دور رکھا جائے اسے نجات دے دی گئی، اور داخل جنت کردیا گیا۔

فَقَدْ فَازَ (وہ کامیاب ہوگیا) انھوں نے اپنی مراد پالی، مقصد حاصل کرلیا اور ہلاکت سے نجات پاگئے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (رہی یہ دنیاوی زندگی تو یہ محض دھوکے کا سرمایہ ہے) یعنی یہ دنیاوی لذات وشہوات اور اس کی زینتیں جن سے تم استفادہ کرتے ہو فریب اور دھوکہ کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ غیر مستقل اور ناپائدار اشیاء ہیں۔ وقت آزمائش ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لیے کہ تم ان سے لذت اندوز ہوتے ہو، پھر ان کا عذاب اور سزا تمھاری جانب پلٹتی ہے۔ ان پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا، ان سے فریب نہ کھانا، یہ ایسا فریب ہے جس میں مبتلا ہونے والا فریب خوردہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فریب کی پونجی ابر کے مانند ہے، جس کی اصل اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے بقا نہیں ہے۔ یہ عکرمہ سے مروی ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ آخرت کی مختصر ترین نعمت تمام نعمات دنیا سے بہتر ہے، اسی لیے امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے: جنت میں تازیانہ رکھنے کی جگہ دنیا اور دنیا میں موجود تمام اشیاء سے بہتر ہے۔

آیت میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ ہر زندہ کو موت آئے گی، اگر اس بارے میں آیات وروایات وارد نہ بھی ہوتیں تو باعتبار عقل ممکن تھا کہ لوگوں کی زندگی ان کے وقت جزا تک متصل رہتی، اگر اس طرح کہا

جائے کہ کیا تمہارا یہ کہنا نہیں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کی حالت اور جزا کی حالت کے درمیان یقیناً لازمی و ضروری ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قطع ممکن ہے کہ زندگی کی بقا کے ساتھ حاصل ہو۔ اس آیت میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ مقتول کو بھی موت آتی ہے۔ موت کے متعلق ابو علی اور ابو ہاشم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابو علی کے نزدیک موت یعنی زندگی کی ضد۔ ابو ہاشم کے نزدیک موت یعنی عدم حیات۔ دونوں نظریوں کے مطابق مقتول کو موت آنا ممکن ہے۔

❀❀❀❀❀

لَتُبۡلَوُنَّ فِيۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ مِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾

مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں سے آزمایا جائے گا اور تم اُن لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان حالات میں تم صبر سے کام لو اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ (۱۸۶)

ترکیب:

لَتُبۡلَوُنَّ میں لام تاکید ہے اور اس میں قسم کے معنی ہیں اور نون، نون قسم ہے۔ لَتُبۡلَوُنَّ میں واؤ کو ضمہ دیا گیا ہے۔ التقائے ساکنین کی بنا پر کسرہ نہیں دیا گیا ہے اس لئے کہ واؤ ضمیر کو وہ حرکت دی گئی ہے جو اس سے پہلے ہونی چاہئے تھی اور وہ ضمہ ہے۔ اسی کے مانند اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى ہے۔ اگر واؤ حرف اعراب ہوتا تو اسے فتحہ دیا جاتا جیسے هَلۡ تَغۡزُوَنَّ زَيۡدًا۔

شان نزول:

یہ آیت کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی ہجو کرتا اور مشرکین کو آپؐ کے خلاف بھڑکاتا تھا اور مسلمانوں کی عورتوں کے حسن و جمال کے متعلق باتیں کرتا تھا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابن اشرف کے مقابل میں میری حمایت کون کرے گا؟ محمد بن سلمہ نے کہا: اللہ کے رسولؐ میں۔ چنانچہ محمد بن سلمہ اور ابو نائلہ ایک جماعت کے ساتھ نکلے جنھوں نے اس کا قتل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سر پیش کیا۔ اس وقت آخر شب میں آپ نماز میں مصروف تھے۔ یہ زہری سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی قینقاع کے سردار فنحاص یہودی کے بارے میں نازل ہوئی، جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر کو مدد طلب کرنے کے لیے اس کے پاس بھیجا اور اس کے لیے تحریر بھی لکھی، اس نے تحریر پڑھ کر ابوبکر سے کہا: تمھارا پروردگار ایسا محتاج ہو گیا ہے کہ ہم اس کی امداد کریں؟! حضرت ابوبکر نے چاہا کہ اسے ماریں لیکن انھیں پیغمبرؐ کا یہ ارشاد یاد آ گیا کہ کسی طرح کا فتنہ نہ کرنا یا اپنی رائے پر عمل نہ کرنا) یہاں تک کہ تم پلٹ آؤ، پس ابوبکر رک گئے۔ یہ عکرمہ اور مقاتل سے مروی ہے۔

تفسیر:

یقینی امتحان

پھر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا مشقت اور آزمائش کا مقام ہے، یہاں مومنین کی آزمائش کی جا رہی ہے تاکہ وہ صبر کریں اور اجر کے مستحق قرار پائیں۔ ارشاد فرمایا لَتُبۡلَوُنَّ (مسلمانو! تمھیں آزمایا جائے گا) یعنی تمھیں مشقتوں اور دشواریوں سے دوچار کیا جائے گا۔ فِيٓ أَمۡوَٰلِكُمۡ (مال کے ذریعہ) اموال کے خاتمہ اور ان میں کمی واقع کر کے۔ وَأَنفُسِكُمۡ (اور تمھاری جان کے ذریعہ) یعنی اے ایمان والو! قتل و مصائب کے ذریعہ (تمھاری آزمائش کی جائے گی) جس طرح تم پر جنگ احد میں قتل و مصائب وارد ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہاد اور دیگر فرائض و واجبات کے ذریعہ جن کا ہم نے حکم دیا ہے اس کام کا نام بَلۡوَىٰ (آزمائش و ابتلا) بطور مجاز رکھا ہے اس لیے کہ درحقیقت اللہ کے لیے اختبار و آزمائش اور تجربہ کرنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ وہ اشیا کے متعلق ان کے وجود میں آنے سے قبل ہی جانتا ہے۔ اللہ یہ عمل اس لیے کرتا ہے تاکہ حق پرست اور باطل پرست الگ الگ ہو جائیں۔ یہ ابوعلی جبائی سے مروی ہے۔

وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ مِن قَبۡلِكُمۡ (اور تم اُن لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے، سے بہت سی باتیں سنو گے) وَمِنَ ٱلَّذِينَ أَشۡرَكُوٓاْ (اور مشرکین سے) یعنی کفار مکہ وغیرہ سے۔ أَذٗى كَثِيرٗا (تکلیف دہ) یعنی انھوں نے (یہود و نصاریٰ اور کفار مکہ سے) جو

کچھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کے متعلق سنا اور وہ باتیں سنیں جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غم میں مبتلا کر دیا تھا۔

وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا (اگر ان حالات میں تم صبر سے کام لو اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو) یعنی اگر تم نے اس پر صبر کیا اور اطاعت سے وابستہ رہے اور اس طرح رنج و افسوس کا اظہار نہیں کیا جو گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔

فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ (تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے) یعنی جس (بات) کی رشد و ہدایت نمایاں اور حق واضح ہو عقل مند پر اس کا مستحکم ارادہ کرنا واجب ہے۔ کہا گیا ہے کہ عزم الامور سے مراد محکم اور مضبوط امور ہیں۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾

آپ اس وقت کو یاد کریں جب خدا نے ان لوگوں سے عہد لیا تھا جن کو کتاب عنایت کی گئی تھی کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے لوگوں کے سامنے واضح طور سے بیان کرنا اور اسے پوشیدہ نہ رکھنا۔ مگر انھوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور بہت معمولی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ انھوں نے کتنا برا سودا کیا ہے۔ (۱۸۷)

قرائت:

ابن کثیر، ابو عمرو اور ابو بکر نے عاصم سے لِيُبَيِّنُنَّهٗ یاء کے ساتھ اور لَا يَكۡتُمُوۡنَهٗ کو بھی یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ان دونوں کو تاء کے ساتھ قرائت کی ہے۔

حجت:

جن قراء نے تاء کے ساتھ قرائت کی ہے ان کی دلیل ارشاد الٰہی: وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اسی طرح ارشاد الٰہی: وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ ہے۔ اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

اور جن قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس جملہ کو غائب پر حمل کیا ہے اس لئے کہ

جن کا ذکر ہوا ہے وہ غائب ہیں۔

تفسیر:

اہل کتاب سے عہد و پیمان

اس آیت میں خداوند عالم نے ان لوگوں کی پیغمبروں کی تکذیب کے بعد ان کے عہد و پیمان توڑنے کے متعلق ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (آپ اس وقت کو یاد کریں جب خدا نے ان لوگوں سے عہد لیا تھا جن کو کتاب عنایت کی گئی تھی) کہا گیا ہے کہ اس سے بطور خاص یہودی مراد ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جسے کتاب کا کچھ بھی علم عطا کیا گیا ہے۔

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ (کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے لوگوں کے سامنے واضح طور سے بیان کرنا) یعنی تاکہ تم لوگوں کے لیے اس کا اظہار کرو۔ سعید بن جبیر اور سدی کے قول کے مطابق 'ہٗ' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پلٹ رہی ہے۔ چونکہ اہل کتاب کی کتاب میں لکھا ہے محمدؐ اللہ کے رسول اور دین اسلام ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر 'ہٗ' کتاب کی طرف پلٹ رہی ہے پس اس کتاب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بیان داخل ہے چونکہ وہ کتاب کے اندر ہے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (اور اسے پوشیدہ نہ رکھنا) یعنی حاجت وضرورت کے وقت اسے چھپانا نہیں۔ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (مگر انھوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا) یعنی انھوں نے اسے ضائع و برباد کر دیا، اسے پس پشت ڈال دیا اور اس پر عمل نہیں کیا اگرچہ وہ اس کا اقرار کر رہے تھے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ شخص جو کسی چیز کو پھینک دے اور اس کی پرواہ نہ کرے، اسے رَمَاهُ بِظَهْرِهٖ کہا جاتا ہے۔

وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور بہت معمولی قیمت پر اسے بیچ ڈالا) یعنی انھوں نے عہد و پیمانِ الٰہی کو مختصر فانی مال دنیا سے تبدیل کر لیا اپنے لیے کھانے کی اشیا، رشوت و ہدایا لے کر جنھیں وہ اپنے بزرگوں سے حاصل کرتے تھے۔ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (انھوں نے کتنا برا سودا کیا ہے) کس قدر بری چیز ہے جس کے سبب یہ دردناک عذاب کے حقدار بن رہے ہیں اگرچہ یہ جلد حاصل ہونے والا نفع اور فائدہ ہے۔ یہ آیت اظہار حق کے واجب ہونے اور اسے چھپانے کی حرمت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس میں دین و احکام، فتاویٰ اور

شھادات (گواہیوں) کا بیان ہے اور اس کے علاوہ وہ امور بھی ہیں جو علماء سے مخصوص ہیں۔ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں حسن بن عمارہ کی سند سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں زہری کے پاس آیا جبکہ وہ روایت کرنا ترک کر چکے تھے، میں نے ان سے ان کے دروازہ پر ملاقات کی اور ان سے کہا: آپ میرے لیے حدیث بیان کریں، انھوں نے کہا کیا تمھیں نہیں معلوم ہے میں نقل حدیث و روایت ترک کر چکا ہوں؟ میں نے ان سے کہا: یا تو آپ مجھ سے حدیث بیان کریں یا میں آپ سے حدیث بیان کروں۔ انھوں نے کہا: تم حدیث بیان کرو۔ میں نے کہا: مجھ سے حکم بن عینیہ نے نجم الجزار کے واسطہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے علی بن ابی طالب (علیہما السلام) کو فرماتے سنا: خداوند عالم نے جہلاء سے تحصیل علم کا اس وقت تک عہد نہیں لیا جب تک کہ اہل علم سے لوگوں کو تعلیم دینے کا عہد نہیں لے لیا حسن بن عمارہ نے کہا: زہری نے مجھ سے چالیس احادیث کی روایت کی۔

❀❀❀❀❀

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾
جو لوگ اپنے کرتوتوں پر پھولے نہیں سما رہے ہیں انھیں عذاب سے محفوظ نہ سمجھو، وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی تعریف کی جائے جو انھوں نے انجام نہیں دیے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ حقیقت میں ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ (۱۸۸)

قرائت:

تَحْسَبَنَّ اور تَحْسَبَنَّهُمْ کے سلسلہ میں قراء کے اختلاف کو پہلے بیان کر چکے ہیں۔

حجت:

ابو علی نے کہا: جنھوں نے لَا یَحْسَبَنَّ کو یاء کے ساتھ اور فَلَا یَحْسَبَنَّهُمْ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک اَلَّذِیْنَ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ یَحْسَبَنَّ کا فاعل ہے اور یَحْسَبَنَّ کسی شے پر واقع نہیں ہوا ہے۔ ابو الحسن نے کہا: جنھوں نے پہلے فعل (یَحْسَبَنَّ) کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی قرائت مجھے اچھی نہیں لگتی ہے اس لئے کہ

اس نے کسی چیز پر واقع نہیں کیا ہے (یعنی اس کا مفعول قرار نہیں دیا ہے) اور ہم جانتے ہیں کہ حسب کو معتدی نہ قرار دیا جائے تو یہ اچھی بات نہیں ہے اسلئے کہ وہ قسم کے مانند ہے جیسے عَلِمَ اللهُ لَاَفْعَلَنَّ۔

ولقد علمت لتاتِیَن منیتی ۔ وَظَنُّوْا مَالَهُمْ مِنْ مَّحِيْصٍ۔

جس طرح اس وقت تک قسم کھانا صحیح نہیں ہے جب تک کہ اس کو مقسم علیہ (جس چیز کی قسم کھائی جارہی ہے) پر معلق و موقوف نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ظَنَنْتُ اور عَلِمْتُ بھی ویسا ہی ہے نیز عربوں کے کلام میں لغو بھی آیا ہے اور جہاں پر لغو ہوگا وہاں پر مفید جملوں کا حکم نہیں ہوگا۔

اسی لئے شعر میں اس طرح آیا ہے:

وَ مَا خِلْتُ اَبْقَیْ بَیْنَنَا مِنْ مَوَدَّةٍ عِرَاضِ الْمَذَاکِی الْمُسْنِقَاتِ الْقَلَایِصَا

دراصل اس طرح تھا: وَاِنَّمَا هُوَ وَمَا اَبْقٰی بَیْنَنَا ۔

اس قرائت کی دلیل یہ ہے کہ حَسِبْتُ کو اس کے دو مفعولوں کی جانب متعدی نہیں کیا گیا ہے جن کا وہ تقاضا کر رہا ہے اس لئے حَسِبْتُ اس ارشاد الٰہی: فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ میں چونکہ اول کا بدل قرار دیا گیا ہے اور دو مفعول کی جانب متعدی کیا گیا ہے لہٰذا دوسرا والا تَحْسَبَنَّ پہلے والے تَحْسَبَنَّ کے دو مفعول کی جانب متعدی ہونے کی وجہ سے خود دو مفعول کی جانب متعدی ہونے سے بے نیاز ہو گیا ہے جس طرح اس شعر میں بے نیاز ہو گیا ہے:

بِاَیِّ کِتَابٍ اَوْ بِاٰیَةِ سُنَّة تَرٰی حُبَّهُمْ عَارًا عَلَیَّ وَ تَحْسَبُ

اس شعر میں دو افعال قلوب میں سے پہلا فعل تَرٰی دو مفعول کی جانب معتدی ہوا ہے اور دوسرا فعل تَحْسَبُ دو مفعول کی جانب متعدی ہونے سے بے نیاز ہو گیا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ میں فاء زائدہ ہے، تقدیر یہ ہے: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اُتَوْا بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ۔

البتہ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ باء کے ضمہ والی قرائت تو یہاں پر فعل تَحْسَبَنَّ کا فاعل اپنی ضمیر کی جانب متعدی ہوا ہے اور واؤ ضمیر کو نون ثقیلہ کے داخل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ پس تَحْسَبُوْنَ سے واؤ کو کیوں حذف نہیں کیا گیا اور اسے باقی رکھا جس طرح تُمُوْدَّ بِالثَّوْبِ اور اَتُحَاجُّوْنِّي میں باقی رکھا۔ اس کے علاوہ دیگر افعال ہیں کہ جہاں التقائے ساکنین ہیں اس لئے کہ

ساکن اول میں مد زائد ہے جو حرکت کا قائم مقام ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں بات یہ ہے کہ حذف کہا جاتا ہے جس طرح نون خفیفہ کے ساتھ حذف کیا جاتا ہے۔جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر آپ نے لَا تَحْسَبَنَّ زَيْدًا ذَاهِبًا کہا تو آپ پر واؤ کو حذف کرنا لازم ہے۔پس اس سلسلہ میں نون ثقیلہ کا وہی حکم ہے جو نون خفیفہ کا ہے۔

ارشاد الٰہی: بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ ،مفعول ثانی کے مقام میں ہے اور اس میں مفعول اول کا ذکر ہے اور اس باب (افعال قلوب) میں فاعل کا فعل خود اپنے ہی ضمیر کی جانب متعدی ہوتا ہے۔جیسے ظَنَنْتُنِي أَخَاكَ۔اس لئے کہ یہ افعال جب مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں تو اِنَّ اور اخوات اِنَّ کے مبتدا اور خبر پر داخل ہونے کے مشابہ ہوجاتے ہیں۔جیسے ان افعال کا مبتدا اور خبر پر داخل ہونا۔جیسے آپ کا یہ کہنا: ظَنَنْتُنِي ذَاهِبًا۔جیسے آپ یہ کہیں کہ اِنِّي ذَاهِبٌ۔اور اس مطلب پر جو بات دلالت کرتی ہے وہ ان افعال پر "نفس" کے داخل ہونے کا قبیح ہونا ہے۔اگر آپ یہ کہیں: أَظُنُّ نَفْسِي تَفْعَلُ كَذَا تو یہ اچھا نہیں ہے جس طرح أَظُنُّنِي فَاعِلًا اچھا ہے۔

نافع، ابوجعفر اور ابن عامر کی قرائت: لَا يَحْسَبَنَّ یاء کے ساتھ اور فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ تاء اور باء کے فتحہ کے ساتھ۔تو وہ ابن کثیر اور ابوعمرو کی قرائت کے مانند ہے سوائے فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ کے۔لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ میں يَحْسَبَنَّ کو جن دو مفعولوں کی ضرورت ہے وہ محذوف ہیں تو اس لئے کہ اس کا ذکر بعد میں ہوا ہے۔یہاں پر بدل قرار دینا جائز نہیں ہے۔جس طرح وہاں جائز تھا اس لئے کہ دونوں کے فاعل کے الگ الگ ہونے کی بنا پر دو الگ الگ فعل ہیں۔

حمزہ کی قرائت کہ دونوں جگہ تاء کے ساتھ پڑھا ہے تو وہاں پر تَحْسَبَنَّ کے مفعول ثانی کو حذف کر دیا گیا ہے جس کا وہ تقاضا کر رہا تھا اس لئے کہ بعد میں جو ارشاد الٰہی: فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ آیا ہے وہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

تَحْسَبَنَّهُمْ کو تَحْسَبَنَّ (اول) کا بدل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔پس فاء زائدہ ہے۔جس طرح اس مصرعہ میں زائدہ ہے:

فَإِذَا هَلَكْتُ فَعِنْدَ ذٰلِكَ فَاجْزَعِي

شان نزول:

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے چونکہ وہ لوگوں کی طرف سے ان کے عزت واحترام

کرنے اور علم کی طرف نسبت دینے سے خوش ہوتے تھے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ جہاد کرنے سے روگردانی (یا پیچھے رہ جانے) میں متحد ہو جاتے تھے اور جب واپس پلٹتے تو عذر خواہی کرتے تھے اور اس بات کو پسند کرتے تھے کہ ان کا عذر قبول کیا جائے اور ایمان پر نہ ہونے کے باوجود خواہاں رہتے تھے کہ ان کی مدح وثنا کی جائے۔ یہ سعید خدری اور زید بن ثابت سے مروی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خیبر کے یہودی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر کہنے لگے: ہم آپ کو پہچانتے ہیں، آپ پر ایمان رکھتے ہیں۔ جبکہ ان کے دلوں میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے ان کی تعریف کی۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

خود پسندی

خداوند عالم نے یہودیوں کی ایک اور مذموم صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا (جو لوگ اپنے کرتوتوں پر پھولے نہیں سما رہے ہیں انھیں عذاب سے محفوظ نہ سمجھو) یعنی وہ خوش ہونے والے جو اپنے نفاق پر خوش ہیں۔ وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی تعریف کی جائے جو انھوں نے انجام نہیں دیئے) یعنی ایمان (جو کہ ان کے پاس موجود نہیں ہے) اس پر ان کی تعریف کی جائے اسے پسند کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس سے وہ یہودی مراد ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات کو پوشیدہ رکھنے پر خوش ہوتے تھے اور اس بات کو پسند کرتے تھے ان کی تعریف کی جائے کہ وہ راہبر، سربراہ اور قائد ہیں جبکہ وہ ایسے نہیں ہیں اور آپ اس کے معنی تا اور یا کی قرأت میں سابقاً حجت کے بیان میں جان چکے ہیں۔ لہٰذا اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابو القاسم بلخی نے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا تھا: ہم اللہ کے فرزندان، اس کے دوست، نماز اور روزہ (ادا کرنے) والے ہیں حالانکہ وہ یہ لوگ اللہ کے اولیاء اور اس کے دوست نہیں ہیں، نہ ہی نمازی اور روزہ دار ہیں بلکہ یہ مشرک اور منافق ہیں۔ یہی روایت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ پسند کرتے ہیں کہ ان کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات کو باطل قرار دینے اور آپ کی تکذیب کرنے پر تعریف کی جائے۔ اقویٰ یہ ہے کہ آیت کی مراد یوں ہو کہ خداوند عالم نے ان کے متعلق جو خبر دی ہے کہ اس نے ان سے عہد و پیمان لیا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات کو بیان کریں گے، اسے

چھپائیں گے نہیں۔ یہی نظریہ بیشتر اہل تاویل وتفسیر کا ہے۔ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ (تم یہ نہ سمجھو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے) یعنی تم انھیں نجات یافتہ اور آتش جہنم سے دور گمان نہ کرنا۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ حقیقت میں ان کے لیے دردناک واذیت ناک سزا تیار ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾
آسمانوں اور زمین کا اقتدار اللہ کے قبضے میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۱۸۹)

تفسیر:

اللہ ہر شے پر قادر ہے

خداوند عالم نے گذشتہ آیت میں گناہوں پر خوش ہونے والوں اور جو کام نہیں کیا اس پر اپنی تعریف پسند کرنے والوں کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ نے باخبر فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے اس کے عذاب سے نجات نہیں ہے، ارشاد ہوتا ہے: وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین کا اقتدار اللہ کے قبضے میں ہے) یعنی وہ آسمانوں اور زمین میں موجود تمام اشیاء کا مالک ہے یعنی (اللہ) دونوں (آسمانوں اور زمین) کی تدبیر (نظام) کا مالک ہے۔ دونوں میں تمام جہتوں میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے، اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے، جب صورت حال یہ ہے تو اس سے نجات کی طمع (امید) کس طرح کی جاسکتی ہے؟!

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) اس آیت میں اس بات پر توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ جسے ہلاک کرنا چاہتا ہے اس کے ہلاک کرنے پر قدرت رکھتا ہے، اسے جس طرح خلق کرنا چاہے اور ہلاک کرنا چاہے وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔

❀❀❀❀❀

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ
لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی
جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا
خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ
مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾
رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭ۖ
رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ
﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ
الۡقِیٰمَةِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۱۹۴﴾

زمین و آسمان کی تخلیق اور رات اور دن کی تبدیلی میں صاحبان عقل کے لیے بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔(۱۹۰) جو اٹھتے بیٹھتے اور کروٹ کے بل ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و خوض کرتے ہیں ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں: پروردگارا! تو نے یہ سب کچھ فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے تو پاک ہے۔ پس اے ہمارے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔(۱۹۱) بارالہا! جسے تو نے دوزخ میں ڈالا درحقیقت اسے بڑی رسوائیوں میں ڈال دیا اور پھر ایسے ظلم کرنے والوں کا کوئی حامی نہ ہوگا۔(۱۹۲) پروردگارا! ہم نے ایک پکارنے والے کی صدا سنی جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے پس اے پروردگار تو ہمارے گناہوں سے درگذر فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیکوکار لوگوں کے ساتھ کر۔(۱۹۳) اے ہمارے رب تو نے جو وعدے اپنے رسولوں سے کیے ہیں تو انھیں پورا کر دے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ ہونے دینا، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔(۱۹۴)

آیت کی فضیلت:

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں محمد بن حنفیہ کے واسطہ سے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب (علیہما السلام) سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شب میں (نماز کے لیے) کھڑے ہوتے تو آسمان کی طرف نظر کر کے: اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ....اِلٰی فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ آیت کی تلاوت فرماتے تھے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشہور روایت میں وارد ہوا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:۔۔۔ افسوس ہے ایسے شخص پر جو فقط خوش طبعی کے ساتھ اپنے جبڑوں کو حرکت دیتا ہے اور اس میں موجود امور پر کسی طرح کا غور وفکر نہیں کرتا۔

ائمہ علیہم السلام سے نماز شب اور نماز فجر کی دو رکعتوں کے بعد ان پانچ آیات کی تلاوت کا حکم وارد ہوا ہے۔ محمد بن علی بن محبوب نے عباس بن معروف کے واسطہ سے عبداللہ بن مغیرہ سے انھوں نے معاویہ بن وہب سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے امام صادق علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بستر پر باوضو اللہ کی مشیت کے مطابق سوتے تھے، جب بیدار ہوتے تو بیٹھ جاتے اور آسمان کی طرف دیکھتے اور سورۂ آل عمران کی آیتوں: اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ.. کی تلاوت فرماتے پھر وضو کرتے اور مصلے پر جاتے اور رکوع بجالاتے اور چار رکعت نماز ادا کرتے، آپؐ کا رکوع، آپؐ کی قرأت کے مطابق ہوتا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ آپؐ اپنے سر کو کب بلند کریں گے اور سجدہ کریں گے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے آپ اپنا سر کب بلند کریں گے پھر آپ بستر پر جاتے اور اللہ کی مشیت کے مطابق سوتے پھر جب بیدار ہوتے بیٹھتے اور آل عمران سورہ کی آیتوں کی تلاوت فرماتے اور آسمان کے بارے میں غور وفکر فرماتے پھر باوضو ہو کر جانماز پر جاتے، چار رکعت نماز ادا کرتے جس طرح آپؐ نے پہلے پڑھی تھی پھر آپؐ بستر پر جا کر مشیت الٰہی کے مطابق سوتے پھر بیدار ہوتے اور سورۂ آل عمران کی ان آیتوں کی تلاوت کرتے اور آسمان میں نظر فرماتے پھر باوضو ہو کر مصلے پر تشریف لے جاتے (نماز) وتر ادا کرتے، دو رکعت نماز ادا کرتے پھر نماز (صبح) کے لیے مسجد تشریف لے جاتے تھے۔

الفاظ ومعانی:

اَللُّبّ: عقل۔ عقل کو لُبّ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ انسان کے اندر سب سے بہتر چیز ہے۔

کسی بھی شے کا لُبّ اس کا بہترین اور خالص حصہ ہے۔

سُبْحَانَكَ یعنی تیری ذات اس سے پاک وپاکیزہ ہے کہ تو نے دونوں (آسمان اور زمین) کو باطل اور بیکار خلق کیا ہو اور تیری ذات اس سے مبرا ہے جو تیرے صفات کے شایان شان نہیں ہے۔

اَبْرَار جمع ہے بِرّ کی یہ وہ نیک (انسان) ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت کے سبب نیک قرار دیتا ہے یہاں تک کہ اس سے راضی وخوشنود ہو جاتا ہے۔ اَلْبَرّ کے حقیقی معنی اِتِّسَاع (وسعت) کے ہیں۔ چنانچہ اَلْبَرّ زمین کا وسیع حصہ ہے جو اَلْبَحْر (سمندر) کے برعکس ہے۔ اَلْبِرّ: صلۂ رحمی۔ البِرّ: عمل صالح۔ البُرّ: گندم۔

اَبَرَّ الرَّجُلُ عَلٰی اَصْحَابِہٖ یعنی اپنے ساتھیوں پر اضافہ کرنا۔

ترکیب:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ محلاً مجرور، لِاُولِی الْاَلْبَابِ کی صفت ہے۔ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا بر بنائے حال منصوب ہے۔ وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ بھی حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے اسی لئے وہ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا پر معطوف ہے۔ (عَلٰى جُنُوْبِهِمْ) یعنی مُضْطَجِعِيْنَ اس لئے کہ ظرف (جار ومجرور) معرفہ کے لئے حال ہوتا ہے اور نکرہ کے لئے صفت۔ اس لئے کہ اس میں استقرار کے معنی ہوتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: مَرَرْتُ بِرَجُلٍ عَلَى الْحَائِطِ یعنی مُسْتَقِرٌّ عَلَى الْحَائِطِ (میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو دیوار پر بیٹھا تھا) اسی طرح مَرَرْتُ بِرَجُلٍ فِي الدَّارِ بھی ہے۔ نیز آپ کہتے ہیں: اَنَا اَصِيْرُ اِلٰى فُلَانٍ مَاشِيًا وَّ عَلَى الْفَرَسِ۔ یہاں پر عَلَى الْفَرَسِ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ اَصِيْرُ میں ضمیر انا کے لئے حال ہے۔

ارشاد الٰہی: مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ یعنی يَقُوْلُوْنَ: مَا خَلَقْتَ هٰذَا الْخَلْقَ بَاطِلًا اس لئے هٰذِهٖ اور هٰؤُلَاءِ نہیں کہا ہے۔ بَاطِلًا مفعول ثانی کی بنا پر منصوب ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی تقدیر یہ ہے: لَا خَلَقْتَ هٰذَا بِالْبَاطِلِ یا لِلْبَاطِلِ۔ پھر حرف جر کو حذف کر کے فعل کو بَاطِلًا سے ملا دیا گیا ہے۔

اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ میں اِنَّ کی خبر جملہ ہے جو کہ شرط وجزاء سے مرکب ہے۔ شرط

وجزاء میں اصل یہ ہے کہ دونوں الگ الگ جملے ہوتے ہیں جو فعل وفاعل سے مل کر بنتے ہیں اس لئے کہ مَنْ، تُدْخِلِ کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ مفعول بہ ہے۔

اَنْ اٰمِنُوْا ۔احتمال پایا جاتا ہے کہ اَنْ مفسرہ ہو، اَیْ کے معنی میں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ فعل کونصب دینے والا ہواس لئے کہ اس طرح اَنْ پر باء کا داخل ہونا صحیح ہے جیسے: یُنَادِیْ بِاَنْ اٰمِنُوْا۔

تفسیر:

آیاتِ الٰہی کی اہمیت

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کا اختیار واقتدار اس کے پاس ہے، پھر اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمین وآسمان کی تخلیق) یعنی زمین و آسمان کے ایجاد اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے میں عجائبات پائے جاتے ہیں۔ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ (اور رات اور دن کی تبدیلی میں) روز وشب کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں لَاٰیٰتٍ (بے شمار نشانیاں موجود ہیں) اللہ کی توحید اور اس کے بلند صفات کی نشانیاں ہیں لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (صاحبان عقل کے لیے) صاحبان بصیرت واہل عقل کے لیے۔

آسمانوں اور زمین کی خلقت میں دلالت کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا وجود حادثہ کے پیش آنے اور (اس سے متاثر ہونے) پر مشتمل ہے جو حادث سے جدا نہیں ہوتا ہے وہ اسی کے مانند حادث ہوتا ہے۔ مُحْدَث (جو حادثہ سے متاثر ہو) کے لیے ایک مُحدِث (جو کسی چیز میں تغیر پیدا کرے) اور موجد کا ہونا لازمی ہے، جو اسے وجود عطا کرتے (زمین وآسمان) کا وجود اور ان کا حدوث دلالت کر رہا ہے کہ ان کا کوئی مُحدِث ہے جو قادر ہے اور ان دونوں کے ایجاد اور ان کے درمیان عجیب وغریب امور کے وجود میں لانے پر قادر ہے جو انتہائی نظم و نسق کے ساتھ جاری ہیں اور یہ کہ ان کا وجود میں لانے والا عالم وواقف کار ہے اس لیے کہ محکم اور منظم فعل عالم کے علاوہ کوئی دست نہیں ہوسکتا اسی طرح کسی چیز کا ایجاد کرنا کہ قادر کے علاوہ کوئی دوسرا ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔

اسی طرح یہ بات اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ (آسمانوں اور زمین) کا خالق قدیم ہے جو ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اس لیے کہ اگر وہ مُحدَث ہوتا تو پھر کسی دوسرے مُحدِث کا محتاج ہوتا اور اس سے تسلسل لازم آتا۔

رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے کی دلالت کی وجہ اس طرح ہے دونوں کا ایک معلوم

مقدار کے مترادف (ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آنا) ہوتا ہے نہ تو دونوں میں اضافہ ہوتا ہے نہ ہی دونوں میں اس سے نقصان اور کمی واقع ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا دوسرے سے کم ہونا ایک حالت میں اور دونوں میں سے ایک کا زیادہ ہونا دوسرے کے نقصان اور کمی کی مقدار بھر اس امر پر ظاہری دلالت کر رہا ہے کہ ان کا کوئی خالق ہے جو قادر و حکیم ہے جس پر نہ عاجزی طاری ہوتی ہے، نہ وہ سہو و نسیان سے دوچار ہوتا ہے۔

پھر خداوند عالم نے صاحبان عقل کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (جو اٹھتے بیٹھتے اور کروٹ کے بل ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی وحدانیت پر اس کے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے سبب استدلال کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھے اور لیٹ کر ذکر الٰہی کرتے ہیں یعنی تمام حالات میں ذکر خدا کرتے ہیں اس لیے کہ مکلفین کے حالات ان تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتے اور ان تمام حالات میں ذکر الٰہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنی صحت و مرض کی حالت میں بقدر امکان اللہ کے لیے نمازیں ادا کرتے ہیں، صحت مند انسان کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں اور مریض بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں (اسی طرح) لیٹ کر پہلو پر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کو ذکر کہا گیا ہے، اس کی روایت علی ابن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں کی ہے، دونوں تفسیروں کے درمیان کسی قسم کی منافات نہیں ہے اس لئے کہ نماز کی حالت میں بھی ان کو ذاکر اور اللہ کا یاد کرنے والا کہنا محال نہیں ہے۔ یہ ابن جریج اور قتادہ کا قول ہے۔

ارشاد: وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و خوض کرتے ہیں) صاحبان عقل کی صفت یہ ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں تا کہ وہ اللہ کی وحدانیت، اس کے کمال قدرت اور علم و حکمت پر استدلال کریں۔ پھر وہ اس طرح کہتے ہیں: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں: پروردگارا! تو نے یہ سب کچھ فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے) یعنی تو نے اس مخلوقات کو عبث اور بیکار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ باطل کے ذریعہ اور باطل کے لیے (خلق نہیں کیا ہے) بلکہ تو نے انھیں غرض صحیح حکمت اور مصلحت کے لیے پیدا کیا ہے تا کہ تیری وحدانیت کی دلیل اور تیرے کمال حکمت کی حجت قرار پائے۔

پھر اس چیز سے اللہ کی پاکیزگی اور تنزیہ اس بیان کرتے ہیں جو اس کے صفات کے شایان شان نہیں ہیں یا (اس سے) خدا کی ذات کوئی نقص وارد ہوتا ہے اور اس طرح کہتے ہیں: سُبْحٰنَكَ (تو پاک ہے) یعنی

تیرے لیے پاکیزگی ثابت ہے اس چیز سے جو تیرے لیے جائز و ممکن نہیں ہے تو نے آسمانوں اور زمین کو بیکار اور انھیں لغو خلق نہیں فرمایا بلکہ حصول ثواب اور عذاب سے امن کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (پس اے ہمارے ربّ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے) اپنے لطف و کرم سے جس کے ذریعہ تیری اطاعت سے تمسک اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کفر کہ، برائیاں (گناہ) اور گمراہی اللہ تعالیٰ کی خلق کردہ شئے نہیں ہیں چونکہ یہ تمام چیزیں باطل ہیں۔ اس میں اختلاف نہیں ہے خداوند عالم نے اس کی نفی صاحبان عقل کی حکایت کے ذریعہ فرمائی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی باتوں سے (اللہ) راضی ہے یہ کہ ان میں کوئی باطل نہیں ہے جسے اللہ نے خلق کیا ہے جس سے اس چیز پر قطع و یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ کسی بھی برائی کی نسبت اس کی طرف نہیں دی جاسکتی اور جن کی اس کی ذات سے نفی کی گئی ہے جو کچھ ظالم (اللہ کی نسبت) کہتے ہیں، اللہ کی ذات اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔

پھر خداوند عالم نے صاحبان عقل کی جانب سے حکایت کرتے ہوئے ان کی صفت بیان فرمائی کہ وہ اس طرح کہتے ہیں: رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (بارالٰہا! جسے تو نے دوزخ میں ڈالا درحقیقت اسے بڑی رسوائیوں میں ڈال دیا) اس آیت کی تفسیر میں متعدد وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ تو نے انھیں رسوا کر دیا اور ان کی توہین و اہانت کی جو کہ اَلْخِزْی سے منقول ہے جس کی مثال اس کا یہ ارشاد ہے: وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ

دوم: مفضل کا قول ہے مراد یہ ہے کہ تو نے انھیں ہلاک کر دیا اور بطور مثال یہ شعر پیش کیا ہے:

اَخْزَى الْاِلٰهُ مِنَ الصَّلِيْبِ اِلٰهَهٗ　وَاللَّابِسِيْنَ مَلَابِسَ الرُّهْبَان

سوم: تو نے انھیں اس محل و مقام اور اس موقف میں قرار دیا جس سے شرم و حیا کی جاتی ہے، اس طرح اَلْخِزَايَة کے معنی اِسْتِحْيَاء حیا کرنے کے ہیں۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے: انس ابن مالک، سعید بن مسیب، قتادہ اور ابن جریج سے روایت کی گئی ہے کہ اَلْاِخْزَاء آتش جہنم میں ہمیشہ رہنے کی جگہ ہوگی۔ یہ ان لوگوں سے مخصوص ہوگی جو آتش جہنم سے نہیں نکلیں گے۔ جابر بن عبد اللہ نے کہا ہے: ''اَلْخِزْی' یعنی رسوائی آتش جہنم میں داخل ہونے کے سبب ہوگی، ان سے عمرو بن دینار اور عطا نے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: اس سے بڑی رسوائی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسے آتش جہنم میں جلا دیا اگرچہ اس سے کم بھی رسوائی ہے۔ یہی قول اقویٰ ہے اس لیے کہ

(خِزۡی) رسوائی رسوا کیے جانے والے کی ذلت اور فضیحت ہے۔ جسے خداوند عالم اس کے گناہوں کے سبب عذاب کرتا ہے اسے رسوا کردیتا ہے۔ یہ ہمارے اس نظریہ کے منافی نہیں ہے جسے ہم نے گناہ گاروں کے متعلق ان کی بخشش کے امکان کے بارے میں اختیار کیا ہے اس لیے کہ اس کے قول کے مطابق جس کا یہ کہنا ہے کہ خزی (رسوائی) آتش جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے ذریعہ ہے، لہٰذا اللہ جسے بخش دے تو وہ اس کی رسوائی نہیں ہوگی اگرچہ اسے آتش جہنم میں داخل کردے پھر اسے عذاب پورا ہونے کے بعد آتش جہنم سے باہر نکال دے لیکن اس کے قول کے مطابق جس نے خزی فقط جہنم میں داخل ہونے کو قرار دیا ہے تو اگرچہ یہ بھی رسوائی ہے مگر یہ کفار کی رسوائی کے مانند نہیں ہے چنانچہ اس ارشاد الٰہی: یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ کو دونوں صورتوں پر حمل کرنا جائز وممکن ہے اور اس کے قول کے مطابق جس نے یُخۡزِی کو 'خِزَایَۃ' یعنی 'اِسۡتِحۡیَاء' سے قرار دیا ہے پس مومنین کے اخزاء کو اِسۡتِحۡیَاء پر حمل کیا جائے گا اور کافروں کے اخزاء کو ان کی اہانت وتوہین اور ان کے ہمیشہ آتش جہنم میں رہنے پر حمل کیا جائے گا۔

ارشاد الٰہی وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (اور پھر ایسے ظلم کرنے والوں کا کوئی حامی نہ ہوگا) یعنی غلبہ اور قہر کے اعتبار سے انھیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں اس لیے کہ ناصر منصور سے غلبہ کے ذریعہ دفع (ضرر) کرتا ہے۔ یہ تفسیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء کا گناہان کبیرہ انجام دینے والوں کی شفاعت کرنے سے منافات نہیں رکھتی ہے اس لیے کہ شفاعت اللہ سے درخواست کرنا اور خضوع وتضرع کرنا اس میں کوئی نصرت نہیں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح روایت میں وارد ہوا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: (بعض) گروہوں کی ان کے گناہوں سے شفاعت کی جائے گی جنھیں آتش جہنم سے نکالا جائے گا جنھیں جنت کے لوگ جہنمی (اہل جہنم) کہیں گے۔ اس کی روایت بخاری نے اپنی سند سے صحیح بخاری میں انس بن مالک سے کی ہے۔ ابوسعید خدری نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (لوگوں کو آتش جہنم سے) نکالا جائے گا، پھر انھیں آگ میں جلایا جائے گا پھر انھیں کھولتے پانی میں پلٹایا جائے گا، پھر انھیں اس نہر میں ڈالا جائے گا جس کا نام نہر حیات ہے۔ فرمایا: پھر انھیں دانہ کے مانند اُگایا جائے گا جس طرح دانہ کو بہترین پانی میں اگایا جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم نے بھی صحیح میں اس کی روایت کی ہے اسی کے مانند بے شمار روایتیں ہیں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کی بخشش کے بارے میں صریح اور واضح ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا (پروردگارا! ہم نے ایک پکارنے والے کی صدا سنی) کہا گیا ہے کہ ندا

کرنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ یہ ابن عباس، ابن مسعود اور ابن جریج سے مروی ہے۔ جبائی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے قرآن مراد ہے۔ یہ محمد بن کعب القرظی اور قتادہ سے مروی ہے۔ اسی کو طبری نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے چونکہ ہر ایک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کو نہیں سنا ہے، نہ ہی ہر ایک نے آپ کو دیکھا ہے البتہ اس نے بھی قرآن سنا ہے جس نے آپ کو دیکھا ہے اور جس نے آپ کو نہیں دیکھا جیسا کہ جنوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے کہا ہے: اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو رشد کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

جس نے قول اول کی مدد (تائید) کی ہے وہ اس طرح کہتا ہے کہ جس تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اور آپ کا پیغام پہونچا اس کے لیے یہ کہنا جائز و ممکن ہے کہ ہم نے ندا دینے والے کو سنا اگرچہ اس میں مجاز کاری ہے۔

سَمِعۡنَا مُنَادِیًا کے معنی مُنادی کی ندا (یعنی پکارنے والے کی آواز) ہے اس لیے کہ منادی سنا نہیں جاتا۔

ارشاد: یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ (جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا) یعنی ایمان کی طرف جیسا کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ہے یعنی اِلٰی ھٰذا، اس کی جانب۔

اسی کے مانند اللہ کا یہ ارشاد ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا۔

سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ... سے مراد یہ ہے کہ پروردگار ہم نے اس منادی و داعی کو سنا جو تجھ پر ایمان اور تیری تصدیق، تیری وحدانیت کے اقرار، تیرے رسول کے اتباع اور ان کے امر و نہی کی پیروی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ (اور کہتا تھا کہ اپنے رَبّ پر ایمان لے آؤ) اَنۡ اٰمِنُوۡا یعنی بِاَنۡ اٰمِنُوۡا باء کو حذف کر دیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس نے ہم سے کہا ہے: اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ! (فَاٰمَنَّا) (لہٰذا ہم ایمان لے آئے) یعنی ہم نے دعوت دینے والے کی تصدیق کی جس کی طرف اس نے دعوت دی جیسے توحید اور دین وغیرہ اور ہم نے اس بات پر لبیک کہی۔

فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا (پس اے پروردگار تو ہمارے گناہوں سے درگذر فرما) یعنی ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما، گناہوں کے سبب قیامت کے دن لوگوں کے سامنے عذاب کر کے ہمیں رسوا نہ کرنا۔ وَكَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا (اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے) یعنی ہم پر اپنے فضل و رحمت سے ہمارے گناہوں کو محو فرما۔ وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ (اور ہمارا خاتمہ نیکوکاروں کے ساتھ کر) یعنی ہمیں اپنی بارگاہ میں نیکوکاروں میں

قرار دیتے ہوئے اٹھا اور ان کے ہمراہ محشور فرما!

اگر یہ کہا جائے کہ اس ارشاد: وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا کے کیا معنی ہیں حالانکہ: فَاغْفِرْ لَنَا ہی کافی ہے؟ تو اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں:

اول: ابتدائی طور پر توبہ کے بغیر ہمارے گناہ بخش دے اگر ہم توبہ کریں ہم سے اپنے فضل و رحمت سے ہمارے گناہوں کو محو فرما!

دوم: یعنی توبہ کے سبب ہمارے گناہ بخش دے اور گناہان کبیرہ کے اجتناب اور پرہیز کے ذریعہ ہمارے گناہ محو فرما دے! اس لیے کہ بخشش کبھی ابتدا میں ہوتی ہے اور سبب کے ذریعہ ہوتی ہے اور تکفیر (گناہوں کا محو ہونا) نہیں ہوگا جب تک کہ بندہ کوئی عمل انجام نہ دے۔ پہلی صورت ہمارے نظریہ کے بہت زیادہ مناسب ہے۔

ارشاد: رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ (اے ہمارے رَبّ تو نے جو وعدے اپنے رسولوں سے کیے ہیں تو انھیں پورا کردے) یہ حکایت ہے ان افراد کی جانب سے جن کی تعریف گذر چکی ہے کہ وہ کہتے ہیں: پروردگارا! ہمیں وہ ثواب عطا فرما جس کا وعدہ تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے کیا ہے۔ وَلَا تُخْزِنَا یعنی ہمیں رسوا نہ کرنا یا ہمیں ہلاک نہ کرنا۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (قیامت کے دن بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا) یہاں سے کلام کا ازسرنو آغاز کیا گیا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اِنَّ مکسورہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ تو نے اپنے اوپر ایمان لانے والوں سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ وعدہ پورا کرنے کے دعا کی وجہ کیا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ (اللہ) اپنا وعدہ لازمی اور یقینی طور پر پورا کرتا ہے؟ تو اس کے جواب کی متعدد وجہیں ہیں:

اول: یہ اللہ کی بارگاہ میں تضرع اور تعبد (انتہائی عاجزی و انکساری اور فرمابرداری) کی وجہ سے ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَقٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ترجمہ علی بن عیسیٰ اور جبائی کا بھی یہی نظریہ ہے۔

دوم: کلام کو دعا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ مراد خبر ہے۔ یعنی ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ اٹھایا، ہمیں وہ چیز عطا کیں جن کا تو نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ہم سے وعدہ کیا اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہیں کیا تمام لوگ جانتے ہیں جس چیز کا اللہ نے وعدہ کیا ہے وہ حق ہے جسے وہ لازمی طور پر پورا کرتا ہے۔

سوم: مراد درخواست اور دعا ہے کہ اللہ انھیں ان افراد میں قرار دے جنھیں اس نے وہ سب کچھ عطا

کیا ہے جس کرامت وعزت کا خدا نے اپنے پیغمبروں کی زبانی وعدہ کیا ہے اس لیے کہ یہ لوگ اللہ کے نزدیک ذاتی طور پر کرامت و بزرگی کے حق دار بن گئے ہیں۔ پھر انھوں نے خدا سے دعا کی کہ انھیں وہ چیزیں عطا کردے جن کا ان سے وعدہ کیا ہے ان کے اپنے ذاتی طور پر استحقاق کے علم کے بعد اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو انھوں نے اپنے نفسوں کو پاک کیا ہوتا اور اس بات کی گواہی دیتے کہ وہ کرامت الٰہی کے حق دار بن چکے ہیں۔ یہ صفت مومنین میں اہل فضل کے لیے مناسب نہیں ہے۔

چہارم: انھوں نے یہ دعا اللہ کی جانب رغبت کے سبب کی ہے کہ انھیں ان کے کافر دشمنوں پر نصرت عطا فرمائے اور باطل پر کلمۂ حق کو بلندی عطا فرمائے جس کا اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے لیے اس میں تعجیل فرمائے اس لیے کہ جائز نہیں ہے اللہ نے جو ان کی صفت بیان فرمائی ہے اس پر وہ اعتماد اور یقین نہ کرنے والے بن جائیں یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا پس انھوں نے اس کی تعجیل میں رغبت کی البتہ ان سے نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا جو انھیں اس وقت عطا نہیں کیا گیا تھا (یا ان کے لیے وقت معین نہیں کیا گیا تھا) لہٰذا انھوں نے اس کی تعجیل میں رغبت کی جس کی کامیابی میں ان کے لیے مسرت تھی۔ اسی بات کو طبری نے اختیار کیا ہے۔ طبری نے کہا ہے: آیت ان مہاجر اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے جو اپنے دشمنوں پر نصرت کی تعجیل میں راغب وکوشاں تھے اور اس طرح کہہ رہے تھے: ہمیں آپ کے حلم و بردباری پر صبر کرنے کا چارہ نہیں ہے۔ اس کی تائید بعد والی آیت سے ہو رہی ہے جس میں ارشاد ہے: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ ....الخ اس کی جانب ابوالقاسم بلخی نے بھی اشارہ کیا ہے۔

❀❀❀❀❀❀

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

تو جواب میں ان کے ربّ نے فرمایا: تم میں سے جو بھی عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت مَیں کسی کا عمل ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ تم ایک ہی جیسے ہو پس جن

لوگوں نے میری خاطر ہجرت کی اور جو لوگ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں انھیں ستایا گیا اور انھوں نے میرے لیے قِتال کیا اور قتل کردیئے گئے، میں ان سب کے قصور معاف کردوں گا اور ان لوگوں کو ایسی جنت میں داخل کردوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ سب کچھ اللّٰہ کے پاس سے بطور جزا انھیں ملے گا اور اللّٰہ کے پاس تو بہترین جزا موجود ہے۔ (۱۹۵)

قرائت:

حمزہ، کسائی اور خلف نے قُتِلُوْا وَ قَاتَلُوْا فعل مجہول کو پہلے اور فعل معلوم کو بعد میں پڑھا ہے اور تشدید کے بغیر پڑھا ہے۔ باقی قراء نے قَاتَلُوْا کو قُتِلُوْا پر مقدم کیا ہے۔ ابن کثیر اور ابن عامر نے قُتِّلُوْا کی تاء کو تشدید دی ہے۔

حجت:

قَاتَلُوْا کو قُتِلُوْا پر مقدم کرنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قِتَال، قَتْل سے پہلے ہے اور تشدید دینا حسن ہے اس لئے کہ فعل کی تکرار ہوئی ہے۔ یہ اس آیت کے مانند ہے کہ مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ۔

جنھوں نے قُتِلُوْا کو بغیر تشدید کے پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فَعَلُوْا کثیر اور قلیل دونوں کے لئے بولا جاتا ہے حالانکہ تشدید کے ساتھ یعنی فُعِّلُوْا کثیر سے مخصوص ہے۔

قُتِلُوْا کو قَاتَلُوْا پر مقدم کرنا تو واؤ کے ذریعہ معطوف میں معنی میں اول ہوسکتا ہے۔ اگرچہ لفظ میں مؤخر ہو۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کیا گیا تو انھوں نے جنگ کی اور جو قتل ان پر آن پڑا تھا اس میں نہ انھوں نے کوئی سستی کی اور نہ ہی کسی کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ۔

الفاظ و معانی:

اِضَاعَة: اِهْلَاك (ہلاک کرنا) جب کوئی چیز ہلاک و برباد ہوجائے تو اس طرح کہا جاتا ہے: ضَاعَ الشَّيْءُ يَضِيْعُ ضِيَاعًا۔ اَضَاعَ و ضَيَّعَ کے ایک ہی معنی ہیں، اسی سے اَلضَّيْعَة ہے جو قریہ کے معنی میں ہے۔ عربوں کے اس محاورہ كُلُّ رَجُلٍ وَّضَيْعَتُهٗ میں اَلضَّيْعَة حرفت اور پیشہ کے معنی میں ہے۔

اَلْهِجْر (جدائی) وَصْل کی ضد ہے۔ هَاجِر، اَلْهِجْر کا فاعل ہے اور وہ وَصْل کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ هَاجَرَ الْقَوْمُ مِنْ دَارٍ اِلیٰ دَارٍ یعنی کچھ لوگوں نے پہلے گھر کو دوسرے گھر کی خاطر چھوڑ دیا۔ تَهَجَّرَ الرَّجُلُ یعنی آدمی مہاجرین سے مشابہ ہوا۔

ترکیب:

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی میں مِنْ، مِنْكُمْ کی تفسیر وتوضیح کے لئے ہے۔ یعنی تم میں سے مردوں اور عورتوں میں سے عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ یہ مِنْ جس کی جانب عمل کی نسبت دی گئی ہے اس کی جنس کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ کہا گیا ہے: یہ مِنْ، لَا اُضِيْعُ میں نفی کے معنی کی تاکید کرنے والا ہے یعنی لَا اُضِيْعُ عَمَلَ ذَكَرٍ وَ اُنْثٰى مِنْكُمْ۔

بَعْضُكُمْ مبتدا اور مِنْ بَعْضٍ محلاً مرفوع خبر ہے۔ ثَوَابًا مصدر مؤکد ہے اس لئے کہ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ کے معنی وَ لَاُثِيْبَنَّهُمْ کے ہیں۔ اس کے مانند ارشاد الٰہی: كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اس لئے کہ اس ارشاد الٰہی: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ کے معنی كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ هٰذَا۔ پس كِتٰبَ اللّٰهِ مصدر مؤکد ہے۔

شان نزول:

روایت کی گئی ہے کہ جناب ام سلمہؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ ہجرت کے بارے میں مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا؟ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ بلخی نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت اور اس سے قبل والی آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار اور آپؐ کے ساتھ ہجرت کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر یہ آیت مسلمانوں میں سے ان حضرات کی راہ اختیار کرنے والوں (نقش قدم پر چلنے والوں) کے لیے قرار پا گئی۔

تفسیر:

صاحبان عقل کے اعمال کا نتیجہ

پھر اللہ سبحانہ نے مومنین کی دعا کی قبولیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ (تو جواب میں ان کے ربّ نے فرمایا) یعنی اللہ نے ان مومنین کی دعا کو قبول کرلیا جن کے متعلق گذشتہ آیت

میں خبر گذر چکی ہے۔ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ (میں کسی کا عمل ضائع و باطل نہیں ہونے دوں گا) عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی (تم میں سے جو بھی عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت) بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ نصرت اور دین اور محبت (اور دوستی) میں لہٰذا تم سب کے متعلق میرا ایک ہی حکم ہے، یعنی میں تم میں سے کسی کے عمل کو بھی ضائع اور برباد نہیں کروں گا۔ ایمان میں تمھارے متفق ہونے کے باعث۔ یہ چیز ان دعاؤں کی پابندی کرنے پر آمادہ کر رہی ہے جنھیں گذشتہ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دعاؤں کے ذریعہ اللہ کی پرستش کی جاتی ہے اور اس کی بارگاہ میں گریہ وزاری اور انابت کی جاتی ہے اس لیے کہ یہ اس کی قبولیت پر مشتمل ہے جو وہ دعا کرتا ہے۔

ارشاد: فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا (پس جن لوگوں نے میری خاطر ہجرت کی) یعنی جنھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اپنی کافر قوم سے جدائی اور علیحدگی اختیار کی۔ وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ (اور جو لوگ اپنے گھروں سے نکالے گئے) یعنی مشرکین نے انھیں مکہ سے نکال دیا وَاُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ (اور میری راہ میں انھیں ستایا گیا) یعنی انھیں میری اطاعت وعبادت اور میرے دین (کی پابندی اور اس پر عمل کرنے کے سبب) ستایا گیا اس لیے کہ یہ اللہ کی راہ ہے چنانچہ انھوں نے دین کی وجہ سے اذیتیں برداشت کیں۔ وَقٰتَلُوۡا (اور انھوں نے میرے لیے قتال کیا) یعنی انھوں نے راہ خدا میں قتال (جہاد) کیا وَقُتِلُوۡا (اور خدا کی راہ میں قتل کر دیئے گئے) لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ (میں ان سب کے قصور معاف کر دوں گا) یعنی میں ان کے گناہوں کو مٹا دوں گا اور اپنے عفو و درگذر اور اپنی بخشش و رحمت کے ذریعہ ان پر فضل کروں گا۔ یہ فقرہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ عذاب کا برطرف کرنا فضل الٰہی ہے۔

ارشاد: وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (اور ان لوگوں کو ایسی جنت میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی) یعنی ایسے باغات اور درخت جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ثَوَابًا (یہ سب کچھ بطور جزا انھیں ملے گا) یہ ان کی جزا ہوگی۔ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (اللہ کے پاس سے) یعنی اللہ کی طرف سے ان کے اعمال پر۔ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ (اور اللہ کے پاس تو بہترین جزا موجود ہے) یعنی ان کے اعمال پر اللہ کی طرف سے ایسی بہترین جزا ہے جس تک اوصاف اور خوبیاں بیان کرنے والوں کے اوصاف کی رسائی ممکن نہیں ہے، نہ ہی اس کی تعریف کرنے والوں کی تعریف اس کا ادراک کر سکتی ہے جسے نہ تو آنکھ نے دیکھا ہوگا نہ ہی کسی کان نے سنا ہوگا، نہ ہی کسی انسانی قلب میں اس کا گذر ہوا ہوگا۔ کہا گیا

ہے کہ حُسن ثواب (بہترین ثواب) اس کے دائمی اور اس کے ہر طرح کے نقص اور تکدر (کھوٹ اور ملاوٹ) سے سالم اور محفوظ ہونے میں ہے۔

❀❀❀❀❀

لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

(اے نبی) دنیا کے ملکوں میں کافروں کی سیر وسیاحت تمھیں کسی فریب میں مبتلا نہ کرے۔(۱۹۶) یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر ان سب کی پناہ گاہ جہنّم ہے جو بدترین ٹھکانا ہے۔(۱۹۷) اس کے برعکس جو لوگ اپنے ربّ سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان باغوں میں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ اللہ کی طرف سے یہ ان کے لیے سامان ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اسی میں نیکوکار لوگوں کے لیے بہتری ہے۔(۱۹۸)

قرائت:

یعقوب نے رویس اور زید سے روایت میں: لَا یَغُرَّنْكَ وَلَا یَحْطِمَنْكُمْ وَ لَا یَسْتَخِفَنْكَ، اِمَّا نَذْهَبَنْ بِكَ اور اَوْ نُرِیَنْكَ، سب کو نون خفیفہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ان سب کو نون ثقیلہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے لٰكِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا میں نون کو مشدد پڑھا ہے اور باقی قراء نے لٰكِنِ کو بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔

الفاظ ومعانی:

اَلْغُرُوْر: خوشی ومسرت کا وہم وگمان اس چیز کے بارے میں جو اس طرح کی خوشی والی باتوں سے خالی ہو۔ ہر وہم غرور نہیں ہے، اس لئے کہ وہم کبھی خوف کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور وہ خوف کا وہم کرتا ہے تو اس سے

گریز کرتا ہے۔ اَلْغَرَر مانند خَطَر ہے البتہ دونوں کے درمیان فرق ہے۔ غَرَر تمام کا تمام قبیح ہے چونکہ یہ اس چیز کے متعلق یقین کا ترک کرنا ہے جس پر اطمینان اور بھروسہ کرنا ممکن ہو جبکہ خطر بعض وجہوں سے اچھا ہوتا ہے چونکہ یہ عُظْم سے ہے جیسا کہ عربوں کا قول ہے: رَجُلٌ خَطِیْر یعنی رَجُلٌ عَظِیْمٌ۔

اَلْمَتَاع وہ نفع ہے جس سے جلد لذت حاصل ہوتی ہے یا تو لذت اس کے وجود کے سبب یا اس چیز کے ذریعہ جس سے لذت حاصل ہوتی ہے جس طرح عظیم مال، ملکیت، اولاد، برادران۔

اَلْمِهَاد وہ جگہ جس میں انسان سکونت اختیار کرتا ہے (یا سکون پاتا ہے) اور اسے بطور فرش بچھاتا ہے۔

ابرار برّ یا بارّ کی جمع ہے۔

ترکیب:

فعل مضارع نون تاکید کے ساتھ مبنی ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ اسم کو اسم کے ساتھ ملا دینے کے مانند ہوتا ہے جیسے: خَمْسَةَ عَشَرَةَ وغیرہ۔

مَتَاعٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: تَقَلُّبُهُمْ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ۔ مبتدا محذوف ہے اس لئے کہ پہلے جو گزر چکا ہے وہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

بِئْسَ الْمِهَادُ مخصوص بالذم کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ جو گزر چکا ہے وہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: بِئْسَ الْمِهَادُ جَهَنَّمُ۔

نُزُلًا بھی مصدر موکد (مفعول مطلق تاکید) ہے اسی طرح جو اس ارشاد میں گزر چکا ہے کہ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللهِ اس لئے کہ جنت میں ان کا ہمیشہ رہنا جنت میں ان کو اتارنا ہے، گویا اس طرح فرمایا: نَزَّلُوْهَا نُزُلًا۔ اور وہ اَنْزَلُوْهَا اِنْزَالًا کے معنی میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ نُزُلًا تفسیر کی بنا پر منصوب ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: هُوَ لَكَ هِبَةً اَوْ صَدَقَةً (یہ آپ کے لئے ہبہ کے طور پر یا صدقہ کے طور پر ہے) یہ فراء کا قول ہے۔

خَالِدِيْنَ فِيْهَا، بربنائے حال منصوب ہے۔ یعنی مُقَدَّرًا لَّهُمُ الْخُلُوْدُ فِيْهَا (اس حالت میں کہ ان کے لئے جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کو مقدر و معین کر دیا گیا ہے)

شان نزول:

یہ آیتیں مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو اللہ کی نعمتوں سے استفادہ کر رہے

تھے۔ بعض مسلمانوں نے کہا کہ دشمنان خدا عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہم بھوک سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ فراء نے بیان کیا ہے کہ یہودی زمینی سفر کے دوران اموال جمع کر تے تھے۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

تکلیف دہ پہلو

لَا یَغُرَّنَّکَ اے محمد! (آپ کو فریب میں مبتلا نہ کرے) خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مراد دوسرے افراد ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اے انسان یا اے سامع! تجھے دھوکہ نہ دے تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (کافروں کی سیر وسیاحت) کفار کی آمد ورفت۔ فِی الْبِلَادِ (دنیا کے ملکوں میں) سلامتی اور عیش وآرام اور سکون کی حالت میں ان کے جرائم پر مواخذہ وگرفت کے بغیر ان کی آمد ورفت تو خداوند عالم نے بتلایا اور جتلایا ہے ایسے لوگوں پر رشک کرنا نہیں چاہئے اس لیے کہ ان کا ٹھکانا اور انجام ان کے کفر کے باعث آتش جہنم ہے۔ اس خیر میں کوئی خیر نہیں جس کے بعد آتش جہنم ہو۔

ارشاد: مَتَاعٌ قَلِیْلٌ (یہ محض چندروزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے) یعنی شہروں میں ان کا گھومنا پھرنا اور نعمتوں سے استفادہ کرنا نہایت مختصر پونجی ہے۔ یعنی اس سے بہت کم استفادہ کریں گے پھر یہ زائل اور فنا ہو جائے گی۔ اسے متاع (پونجی) اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے دنیا میں استفادہ کر رہے ہیں۔ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (پھر ان سب کی پناہ گاہ جہنم ہے) ان کا انجام اور ان کی بازگشت جہنم کی جانب ہے۔ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (جو بدترین ٹھکانا ہے) یعنی بہت بری جگہ ہے۔

پھر خداوند عالم نے بتلایا کہ جس کا مقصود ومطلوب اللہ ہو اور وہ اس سے ڈرتا ہو اس کے لیے جنت ہے، ارشاد فرمایا: لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ (اس کے برعکس جو لوگ اپنے ربّ سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں) لکن استدراک کے لیے ہے جو گذشتہ معنی کہ کافروں کا انجام بخیر نہیں ہے، کے برخلاف ہے۔ اچھا انجام اور عاقبت بخیری ان مومنین متقین کے لیے ہے جو اطاعت کر کے اور گناہوں کو ترک کر کے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (ان کے لیے ایسے

باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان باغوں میں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ اللہ کی طرف سے یہ ان کے لیے سامان ضیافت ہے) خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ جولوگ دائمی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے وہ نیک اور ابرار کے لیے مہیا اور آمادہ کی گئی ہیں۔ النزل وہ چیز ہے جو نیک محترم اور مکرم مہمان کے لیے طعام اور شربت مہیا کیا جاتا ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ (اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے) ثواب، کرامت وفضیلت۔ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ (اسی میں نیکوکار لوگوں کے لیے بہتری ہے) اس (چیز) سے جس سے کافر استفادہ کرتے ہیں اس لیے کہ یہ عنقریب کفار سے زائل اور فنا ہونے والی ہے اور جو چیز اللہ کے پاس ہے وہ دائمی ہے اسے زوال نہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: کوئی بھی نیک نفس اور فاجر نہیں ہے مگر یہ کہ موت اس کی زندگی سے بہتر ہے البتہ ابرار کے لیے اللہ نے فرمایا ہے: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ اور فجار کے لیے ارشاد الٰہی ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (آل عمران:۱۷۸)

(ہم جو انھیں ڈھیل دے رہے ہیں کافر اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ زیادہ سے زیادہ گناہوں کا بوجھ سمیٹ لیں اور ان کے لیے تو نہایت ذلت آمیز سزا ہے۔) نفس فاجرہ کے متعلق ابن مسعود کا یہ کہنا کہ: اِنَّ الْمَوْتَ خَيْرٌ لَّهَا اس سے وہ نفس مراد ہے جو اپنے فسق وفجور پر مسلسل باقی رہے۔

❁❁❁❁❁

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں اور اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی اور جو کتاب خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی اس پر بھی ان کا ایمان ہے وہ اللہ کے آگے جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تھوڑے سے فائدے کے لیے آیات الٰہی کا سودا نہیں کرتے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ بے شک اللہ بہت تیزی سے حساب کرے گا۔ (۱۹۹)

الفاظ و معانی:

اَلْخُشُوْع کے حقیقی معنیٰ اَلسُّھُوْلَۃ کے ہیں۔عربی زبان میں اَلْخُشْعَۃُ ریت کے ٹیلہ کو کہتے ہیں۔

خَاشِع وہ زمین ہے جس تک راستہ نہ مل سکے چونکہ ریت آثار کو مٹا دیتے ہیں۔

اَلْخَاشِع: نظروں کو جھکانے والا۔

اَلْخُشُوْع تَذَلُّل (انکساری) ہے جو تَصَعُّب (سخت ہونے) کے برعکس ہے۔

ترکیب:

خَاشِعِیْنَ، یُؤْمِنُ میں مستتر ضمیر کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور وہ ضمیر مَنْ کی جانب پلٹ رہی ہے۔کہا گیا ہے: خَاشِعِیْنَ، اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ میں ضمیر ھُمْ جو کہ اِلٰی کی وجہ سے مجرور ہے اس کے لئے حال ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

شان نزول:

اس آیت کے شان نزول میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔کہا گیا ہے کہ بادشاہ حبشہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی جس کا نام اَصْحِمَۃ تھا جو عربی زبان میں عَطِیَّہ ہے۔جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے غم کی خبر جبرئیلؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے انتقال کے روز دی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: تم جاؤ اور اپنے برادر کی نماز میت پڑھو! جس نے تمھاری سرزمین کے علاوہ ایک دوسری سرزمین پر انتقال کیا ہے۔لوگوں نے کہا: وہ کون ہے؟ فرمایا: نجاشی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیع کی جانب روانہ ہوئے جہاں مدینہ سے حبشہ کی زمین آپؐ کے لیے منکشف اور ظاہر ہوگئی، آپؐ نے نجاشی کے تابوت کو دیکھا اور اس پر نماز پڑھی۔منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ انھیں دیکھو جنھوں نے کافر حبشی نصرانی کی نماز میت پڑھ دی، جسے کبھی دیکھا تک نہیں، نہ ہی وہ آپ کے دین پر تھا۔اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ جابر بن عبد اللہ، ابن عباس، انس اور قتادہ سے مروی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے یہ آیت اہل نجران کے بنی الحرث بن کعب (قبیلہ) کے چالیس افراد کے بارے میں نازل ہوئی، جن میں سے بتیس (۳۲) سرزمین حبشہ سے اور آٹھ روم سے تھے۔یہ سب حضرت عیسیٰؑ کے دین پر تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔یہ عطا سے مروی ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی

جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جن میں عبد اللہ بن سلام اور اس کے ساتھی اسلام لے آئے تھے۔ یہ ابن جریج، ابن زید اور ابن اسحاق سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت تمام اہل کتاب مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ آیت کسی سبب سے نازل ہوتی ہے اور وہ ہر اس آدمی کو شامل ہوتی ہے جو اس میں شامل ہو جائے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔

تفسیر:

سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں

خداوند عالم نے اہل کتاب کی مذمت فرمائی جس کا بیان گذر چکا ہے اور اس آیت میں ان میں سے ایک گروہ کے ایمان اور حق وصدق کے اظہار پر ان کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ (اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے ہیں) لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ (جو اللہ کو مانتے ہیں) یعنی اللہ کی تصدیق اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ اے صاحبان ایمان! اور اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل کی گئی یعنی قرآن وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ (اور جو کتاب (تورات وانجیل) خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی اس پر بھی ان کا ایمان ہے)۔ خٰشِعِيۡنَ لِلّٰهِ (وہ اللہ کے آگے جھکے ہوئے نظر آتے ہیں) یعنی اطاعت کے سبب اللہ کی بارگاہ میں خضوع وانکساری کرتے ہیں۔ ابن زید نے کہا ہے خاشع منکسر اور خوف زدہ کو کہتے ہیں۔ حسن نے کہا ہے کہ خشوع ایسا خوف خدا جو ہمیشہ اور ہر وقت دل سے چپکا رہتا ہے۔

لَا يَشۡتَرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا (تھوڑے سے فائدے کے لیے آیات الٰہی کا سودا نہیں کرتے) یعنی تحریف کتاب اور حق کو پوشیدہ کرنے میں رشوت اور کھانے کے لیے مختصر عوض نہیں لیتے جیسا کہ ان لوگوں نے کیا ہے جن کے متعلق اللہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى لیکن (یہ لوگ) حق کا اتباع کرتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور جس چیز سے انھیں نہی کی ہے اس سے خود کو روکتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا: اُولٰٓئِكَ یعنی وہ (لوگ) جن کی ہم نے تعریف وتوصیف کی ہے لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ (ان کا اجر ان کے ربّ کے پاس ہے) ان کے لیے ان کے اعمال کا ثواب اور اطاعت کا اجر اللہ کے یہاں ذخیرہ ہے جسے وہ قیامت کے دن پورا پورا عنایت فرمائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (بے شک

اللہ بہت تیزی سے حساب کرلے گا) حساب کی صفت سریع لائی گئی ہے چونکہ خداوند عالم طویل حساب کے سبب مستحق جزا کو جزا دینے میں تاخیر نہیں کرے گا اس لیے کہ بندوں کے اعمال میں سے کوئی چیز بھی اللہ پر مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے قبل اس کے کہ وہ اسے انجام دیں اوران کے عمل کرنے کے بعد اسے عدد و شمار کرنے کی کوئی ضرورت وحاجت نہیں ہے کہ شمار کرنے میں تاخیر پیش آئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ تمام مخلوقات کا ایک ساتھ حساب کرے گا۔ لہٰذا جب ایک کا حساب کرلے گا تو سب کا حساب کرلے گا چونکہ وہ لوگوں سے ایک حالت میں ہی کلام کرنے پر قادر ہے۔ ہر ایک سے ویسی ہی گفتگو کرتا ہے جو اسی سے مخصوص ہے اس لیے کہ وہ اس پر ذاتی طور پر قادر ہے۔ یہ ابوعلی الجبائی سے روایت ہے۔ خداوند عالم نے اس گروہ کو وعدہ سے مخصوص کیا ہے تا کہ واضح کردے کہ ان کے اعمال کی جزا ان کے لیے بہت زیادہ مقدار میں موجود ہے ان میں سے کفر اختیار کرنے والوں کا کفر انھیں ذرا بھی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

❀❀❀❀❀

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر سے کام لو، دوسروں کو برداشت کی تعلیم دو، جہاد کے لیے کمر کس لو، اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ تم فلاح پاجاؤ گے۔ (۲۰۰)

الفاظ و معانی:

اَلرِّبَاط کے حقیقی معنی دشمن کے لیے گھوڑوں کا آمادہ کرنا ہے۔ اَلرَّبط یعنی باندھنا، جیسا کہ عربوں کا یہ کہنا کہ رَبَطَ اللّٰہُ عَلٰی قَلْبِہٖ بِالصَّبْرِ اللہ نے اس کے قلب کو صبر کے ذریعہ مضبوط و مستحکم کردیا پھر اس لفظ کا استعمال ملک کی سرحد پر ہر بسنے والوں اور قیام کرنے والوں اور اپنے پیچھے والوں کی حفاظت اور دفاع کرنے والوں کے لیے کیا جانے لگا تا کہ وہ اپنے پیچھے والوں کا ان لوگوں سے دفاع کریں جو انھیں نقصان پہونچانا چاہتے ہوں۔

تفسیر:

تقویٰ، کامیابی کا ضامن

خداوند عالم نے گذشتہ آیتوں میں مومنین اور کافروں کے اقوال بیان کرنے کے بعد اطاعت پر صبر

کرنے نیز راہ خدا میں جہاد کرنے پر دین کی پابندی کرنے پر آمادہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو) یعنی جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (صبر سے کام لو، دوسروں کو برداشت کی تعلیم دو اور جہاد کے لیے کمر کس لو) اس سے مراد کیا ہے اس میں مختلف چند وجہیں ہیں:

اول: مراد یہ ہے کہ اپنے دین پر ثابت قدم رہو اور کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہو اور راہ خدا میں جہاد کے لیے کمر کس لو۔ یہ حسن، قتادہ، ابن جریج اور ضحاک سے مروی ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوں گے کہ اطاعت الٰہی پر صبر کرو اور اس کی معصیت کرنے پر صبر اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرو) اس کے دشمنوں سے قتال کرو اور ان سے حق پر قتال کرنے پر ثابت قدم رہو جس طرح وہ لوگ تم سے باطل پر قتال کرنے پر اڑے ہوئے ہیں۔

پروردگار اس مقام پر وَصَابِرُوْا کی لفظ لایا ہے اس لیے کہ فَاعَلَ (باب مفاعلہ) وہاں لایا جاتا ہے جہاں (فعل) دو کے درمیان ہوتا ہے یعنی مشارکت ہوتی ہے۔ رِبَاط مُرَابَطه ہے۔ یہ بھی دو کے درمیان ہوتا ہے یعنی ان سے جہاد کے لیے گھوڑے آمادہ اور مہیا رکھو جس طرح وہ تمھارے لیے آمادہ رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ.

دوم: اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے دین پر ثابت قدم رہو میں نے جو تم سے وعدہ کیا ہے اس پر صبر کا مظاہرہ کرو، میرے اور اپنے دشمنوں کے ساتھ مرابطہ کرو (یعنی جہاد کے لیے کمر کس لو) یہ محمد بن کعب قرظی سے مروی ہے۔

سوم: اس سے مراد ہے کہ جہاد پر صبر کرو۔ یہ زید بن اسلم سے مروی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رَابِطُوْا سے مراد رَابِطُوا الصَّلَوٰاتِ ہے یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرو اس لیے کہ اس طرح مرابطہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی روایت علی ابن ابی طالب (علیہما السلام) اور جابر بن عبد اللہ، ابو سلمہ اور عبد الرحمٰن سے مروی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ سے افضل اعمال کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: سردی کی صبح وضو کرنا اور جماعت کے لیے اقدام کرنا اور نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا یہی تمھارے لیے رباط ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: مراد یہ ہے کہ مصائب پر صبر کرو، اپنے دشمنوں کے سامنے ڈٹے رہو اور اپنے دشمنوں سے مرابطہ (یعنی ان سے مقابلہ کے لیے آمادہ رہو) یہ قول اول کے نزدیک ہے۔

ارشاد: وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ تم فلاح پا جاؤ گے) یعنی

اللہ کے حکم کی مخالفت سے ڈرو تاکہ دائمی نعمت کے ذریعہ فلاح اور کامیابی حاصل کرو۔ کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی پابندی کرکے اور اس کی نہی سے اجتناب کرکے عذاب الٰہی سے ڈرو تاکہ امیدوں کے حصول اور کامیابی تک رسائی اور اس کے طلب کرنے میں کامیابی حاصل کرلو اور یہی حقیقی کامیابی ہے۔

یہ آیت مکلف کے جملہ حالات و کیفیات (نیز جملہ امور) پر مشتمل ہے اس لیے کہ لفظ وَاصْبِرُوْا عبادات کی پابندی اور محرمات سے اجتناب کو شامل ہے اور لفظ صَابِرُوْا ان امور سے مربوط ہے جو دوسروں کو شامل ہیں۔ جس طرح جن و انس سے جہاد کرنا اور اس سے بڑی چیز جہاد نفس ہے۔ لفظ رَابِطُوْا میں مسلمانوں سے دفاع اور دین کی حمایت شامل ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ تمام منہیات یعنی ان تمام چیزوں کو شامل ہے جن سے روکا اور منع کیا گیا ہے) اور جملہ اوامر کی پابندی پر مشتمل ہے پھر ان تمام امور کے بعد فلاح و کامیابی ہے۔